ترکِ وفا

نایاب جیلانی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام



ناولٹ

ترکِ وفا

نایاب جیلانی

یہ ایک سرد سہ پہر کا منظر تھا۔ سرما کے آغاز سے بارشوں اور برف باری کا سلسلہ قریب قریب شروع ہو چکا تھا۔ جس کے باعث فضا خوشگوار مگر شہر بہت غلیظ ہو جاتا تھا۔ انتہائی بھیگا اور غلیظ...... اسے گیلی کیچڑ زدہ سڑکوں سے نفرت تھی۔ اسے احمق، بے وقوف اور جاہل لوگوں سے نفرت تھی۔ اسے آنسوؤں سے نفرت تھی گیلی آنکھیں، گیلے چہرے اور گیلی پلکیں...... اس کا دل چاہتا تھا وہ گیلی آنکھوں والے

چہروں کو جھپٹا مار کر نوچ لے۔ گیلے غلیظ شہر اور گیلی غلیظ آنکھیں...... اس کا دماغ گرما دیتی تھیں۔

مگر اب ایسا نہیں تھا، گیلے چہرے اب اسے مقناطیس کی طرح کھینچتے تھے۔ گیلی آنکھوں میں اسے اب کہانیاں تیرتی نظر آتی تھیں۔ گیلے شہروں میں اب اسے امان نظر آتی تھی...... سکون نظر آتا تھا۔

اس نے سفید جالی دار نائیلون کا مہین سا پردہ ہٹا کر دیکھا۔ خلافِ توقع آج شہر گیلا نہیں تھا۔ دھوپ چمک رہی تھی۔ کیا آج کچھ عجیب ہونے والا تھا؟ بادل اوٹ میں کھسک گئے تھے۔ مرغابیاں بیلے کی طرف بھاگ گئیں۔ سنہری پریاں تالاب سے اڑ گئیں...... تو کیا سچ میں آج کچھ عجیب ہونے والا تھا۔

☆☆☆

وہ اپنے شبستاں سے نکل کر لاؤنج کی گلاس وال کے قریب آرکی تھی پھر جیسے اس کے ذہن اور دل میں گھنٹی سی بجی تھی۔ دماغ کو برقی رو کے ذریعے ایک پیغام ملا تھا۔ کوئی کوندا سا لپکا۔ اس کے خون کی گردش تیز ہوگئی تھی۔ چہرے پر گرماہٹ بکھر گئی تھی۔ اس کی نس نس میں انگڑائیاں لیتا انتظار مچل، مچل کر رائل روڈ پر پھسل رہا تھا۔ کوئی اس کے کان میں چپکے، چپکے جیسے سرگوشیاں کر رہا تھا۔

''کیا وہ ڈوچ لینڈ...... پہنچ گیا؟'' اس کی گیلی آنکھوں میں خواب اتر آئے تھے پھر دیکھتے ہی دیکھتے عذاب اتر آئے تھے۔ شاہین لمبی اڑان بھر کر آرہا تھا۔ شاہین اس کے خوابوں اور عذابوں کا حساب کرنے آرہا تھا۔ شاہین جیسے اپنا شکار ڈھونڈنے آرہا تھا۔ شہنشاہ شاہین...... ادھیراج، خاقان، سلطان...... شکاریوں کا بادشاہ اپنے شکار کی تلاش میں بالآخر پہنچ گیا تھا۔

☆☆☆

کئی ساعتیں چپکے سے کھسک گئی تھیں۔ لمحے دبے قدموں نکل رہے تھے۔ معاً بھاری بوٹوں کی آہٹ نے اسے چونکا دیا تھا۔ اس نے گیلی آنکھوں کو رگڑ کر دیکھا۔ دو تین اجنبی چہرے نظر آئے تھے۔ وہ گیلی آنکھوں کو رگڑتی رہی۔ یہ آنسو، یہ پانی...کسی سزا کی طرح اس کی آنکھوں سے پھوٹ پڑا تھا۔ آنسوؤں کا ایسا چشمہ جو سات آٹھ منٹ بعد خود بخود امڈ آتا۔

وہ جیسے اجنبی چہروں کو پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کا حافظہ ہرگز بھی کمزور نہیں تھا نہ اس کی یادداشت ہلکی تھی۔ اس نے ان چہروں کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اگر ایک دفعہ دیکھ لیتی تو پھر کبھی نہ بھولتی۔ وہ مہذب، باوقار اور تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ خوش پوشاک اور ذہین آنکھوں والے...... اسمارٹ، خوش شکل۔ لمحے کے آخری حصے سے گزر کر جیسے وہ ان کی آمد کا مقصد جان چکی تھی۔ شاید اسی لیے اس کی پیشانی پر سلوٹوں کا جال اُبھر آیا تھا۔ ان تین لوگوں کی آنکھوں میں تجسس تھا، کچھ کھوجنے، جاننے اور پرکھنے کی آرزو تھی۔ جیسے وہ کسی کی تلاش میں آئے تھے۔ وہ کس کی تلاش میں آئے تھے؟ یہ جاننا ضروری نہیں تھا کیونکہ نیلی آنکھوں والی لڑکی ان لوگوں کی آمد کا مقصد جانتی تھی۔ وہ ان کی تلاش کا مقصد بھی جانتی تھی۔

''گرس گوڈ......'' ان تینوں میں سے ایک نے سلام جھاڑا تھا۔ انداز میں شائستگی نمایاں تھی اور آنکھوں میں ڈھیروں تجسس تھا۔

''تاگ...... (ہیلو)'' اب کے دوسرے نے بھی ہونٹ ہلائے تھے۔ وہ لوگ بڑی مشتاق نظروں سے مورگن روک میں لپٹی گیلی آنکھوں والی لڑکی کو دیکھ رہے تھے۔ جس کا چغہ پیروں کو چھوتا تھا۔ روک کی فرل جگہ جگہ سے اُدھڑی تھی۔ بالوں کا گھونسلا گردن کے پیچھے لٹک رہا تھا اور گھر کی حالت ایسی تھی جیسے کسی کباڑ خانے میں غلطی سے آنے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہ تینوں معنی خیزی سے الٹ پلٹ ہوتی ایک، ایک چیز کو دیکھ رہے تھے پھر ان میں سے ایک نے گفتگو کی ابتدا کی تھی۔

''آپ کا تعلق بیدی نوتگ سے ہے؟'' وہ اپنی ذہین آنکھوں کو اس کے چہرے پر جما کر سوال کر رہا تھا۔ بیدی نوتگ کا نام سن کر اس کا چہرہ لٹھے کے مانند سفید پڑ گیا۔ وہ اپنی آئندہ زندگی میں بھی دوبارہ بیدی نوتگ کا نام نہیں سننا چاہتی تھی۔

''نہیں......'' اس نے روکھے اور انتہائی کھردرے لہجے میں جواب دیا تھا۔ اس کی گیلی آنکھوں میں غصہ بھر گیا تھا۔

''اوہ......!'' ان تینوں کو جیسے سخت مایوسی ہوئی تھی۔

''ہم لوگ شوت لانٹ اسکاٹ لینڈ سے آئے ہیں۔ پولی سیت بیامتے (پولیس افسر) ہیں۔ ان میں سے ایک اسپیشل فورسز کا بندہ ہے۔ ہماری جس اوفی سیل ایجنسی سے پیغام جاری ہوا ہے۔ اس میں سرِفہرست مون حسیب کا نام آیا ہے، وہ بیدی نوتگ (ادارہ) چلاتی تھیں۔ ہم ان کو ایک کیس کے لیے ہائر کرنا چاہتے ہیں...... ایجنسی ان کو شوت لانٹ کا ریٹرن ٹکٹ دے گی اور دیگر مراعات کا شمار کوئی نہیں...... انہیں ہمارے ساتھ معاہدے کے تحت کام کرنا ہوگا......'' ان میں سے ایک آفیسر اپنے آنے کا مدعا بیان کر رہا تھا...... تب اس نے انتہائی درشتگی کے ساتھ اپنی گیلی آنکھیں پونچھتے ہوئے بات کاٹ کر کہا۔ وہ جانتی تھی یہ لوگ اسی مون حسیب کا پوچھ رہے تھے جو خداداد غیر مادی قوتِ متحرکہ کی مالک تھی۔

''مون حسیب نہیں ہے۔'' اس کے تیور غضبناک ہوگئے تھے۔ تب آفیسر جیسے اور بھی حلیمی کے ساتھ کہنے لگے۔

''محترمہ......! آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔ برائے مہربانی مون حسیب کو بلا دیں...... آپ کو شاید مون حسیب کا پتا نہیں۔ وہ جو mental telegraphy اور clairvoyance کی ماہر ہیں۔ وہ جو انسانی پوشیدہ......'' آفیسر نے لجاجت سے التجا کی تھی جب گیلی آنکھوں والی لڑکی بھڑک کر فرش پر لڑھکا کانچ کا گلاس اٹھاتے ہوئے چیخی۔

''نہیں ہے، مون حسیب، بھاگ جاؤ یہاں سے ورنہ جان نکال لوں گی تمہاری۔'' وہ جنونی انداز میں فرش پر پڑی ایک، ایک چیز اٹھا کر ان پر حملہ کرتی دہاڑ رہی تھی اور وہ جیسے اس حملے پر تیار نہیں تھے۔ ایک دم خوفزدہ ہو کر الٹے قدموں بھاگنے لگے۔

''ارے...... بھاگ چلو، یہ تو پاگل ہے۔'' وہ چیختے ہوئے باہر کی طرف دوڑ رہے تھے۔ جب گیلی آنکھوں والی لڑکی اذیت سے مسکرا دی۔

''میں پاگل نہیں...... میں تو منکشے ہوں...... ڈوچ لینڈ پر قدم رکھنے والے شاہین کی منتظر......''

☆☆☆

یہ ایک چمکتی ہوئی دھوپ سے گُندھی دوپہر تھی...... سورج بہت دنوں بعد جوبن پر نظر آرہا تھا۔ آغازِ اگست کی یہ سویر یورپ میں بہت خوشگوار تھی۔

افراہیم کی lexus ایک سو ساٹھ کلومیٹر فی گھنٹا کی رفتار سے من ہائیم کو جانے والی آٹو بان پر دوڑ رہی تھی۔ فرینکفرٹ سے جنوب کے رخ جانے والی اس آٹو بان کا اختتام ایک گھاٹی کے اس پار ہرے، پیلے، نیلے، اودے پھولوں اور سبزے کے تمکٹ تک ہوجاتا تھا۔ دور کہیں سبزے کے ٹیلے اور پُرشکوہ ڈھلان پوری آٹو بان سے دکھائی دے رہے تھے۔ ڈھلانی سطحوں والے ہرے اور بھورے کھیت جن میں کسانوں کی جگہ کہیں کہیں ٹریکٹر اور مشینیں کھڑی دکھائی دیتی تھیں۔ سرخ اور سفید انڈے جیسی ٹائل کی ڈھلوان چھتوں والی آبادیاں، دور آسمان کی بلندیوں میں اڑنے والی مرغابیاں اور طویل پہاڑوں کے بلند سلسلوں پر چھائے نیلے کے جھنڈ جو پلک جھپکنے سے پہلے ہی نگاہوں کی اوٹ سے اوجھل ہوتے پھر کچھ اور نئے مناظر کے ساتھ نمودار ہوتے...... گویا فطرت کا حسن آنکھ مچولی کا کھیل مچا رہا تھا۔ بائیں سرے پر ایک سڑک کسی ناگن کی

طرح بل کھاتی ہوئی آٹوبان کی بلندی سے اتری اور اس راستے پر آپڑی جو من ہائیم شہر کی طرف جاتا تھا۔

درختوں، شاخوں اور بلند اونچی عمارتوں کی چوٹیوں پر وہاں کے معتدل مزاج سورج کی شعاعیں اب ہلکی سنہری پڑ رہی تھیں۔ شہر میں داخلی شاہراہ کے آس پاس، دائیں، بائیں بھورے اور گلابی پتھر کی اونچی دیو ہیکل عمارتیں کس شان سے کھڑی تھیں۔ عمارتوں کی زیادہ تعداد بینک، انشورنس کمپنیوں، تجارتی فرموں، پوسٹ آفسز، سپر اسٹورز وغیرہ کی تھیں۔ دو رویہ سڑکوں کے درمیان سبزہ، پھول اور قد آور سرو کے درخت ترتیب سے لگے ہوئے تھے۔ اس ایونیو کے اختتام پر افراہیم کی lexus نصف دائرے کے محیط پر آنکلی۔ جس کا مرکز زرد پتھر کی نقاشی کا اعلیٰ ترین، خوب صورت اور بلند و بھاری بھرکم مینار آب تھا۔

پھر اس سے کچھ اور آگے نصف دائرے کے نشیب میں ایک ایسا طلسماتی منظر دکھائی دے رہا تھا گویا اسے پھولوں کے ساتھ گوندھ دیا گیا ہو۔ ایک وسیع و عریض پھلواری جس کے چہار اطراف سرخ، سنہری، نیلے، پیلے پھولوں کے تختے دمکتے تھے اور ان کے درمیان ان گنت فواروں کی آبشاریں چمک رہی تھیں۔ پھولوں کے جانے کتنے دہکتے رنگ تھے..... اور پانی کی لہروں میں جانے کیسی قوسِ قزح بہتی تھی۔ ایک ایک منظر نگاہ کو مبہوت کر دینے کے لیے کافی تھا مگر وہ یہاں اپنی آنکھوں کو فطری حسن سے مبہوت کر دینے کے لیے تو ہرگز نہیں آیا تھا، نہ مغربی جرمنی کے حسن سے متاثر ہونے آیا تھا۔ وہ تو یہاں ایک نصب العین لے کر آیا تھا۔ ایک عظیم ترین مقصد لے کر آیا تھا۔ اسے کسی کا گریبان پکڑنا تھا۔ کچھ پرانے حساب کتاب تھے کچھ پچھلے دفتر تھے، جنہیں کھولنے آیا تھا۔ ماضی کی گرد دھول جھاڑ کر بھولی بسری ایک کہانی میں پھر سے رنگ بھرنے آیا تھا۔ حالانکہ وہ کہانی کوئی بہت پرانی تو نہیں تھی۔ صرف تین سال پہلے کا تو قصہ تھا۔ ابھی تین سال ہی تو گزرے تھے مگر یہ تین سال بھلا بھلائے جا سکتے تھے؟ تین سال پہلے اس کے دل اور گھر پر قیامت کا وقت آیا تھا۔ تین سال پہلے شاید اپنی پوری زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے دکھ، غم اور اذیت کے زہر سے آشنائی حاصل کی تھی۔ اسے پہلی مرتبہ پتا چلا تھا کہ دکھ دراصل ہوتا کیا ہے؟ غم کے گھاؤ کہتے کسے ہیں؟ مرد بھلا روتے کیسے ہیں؟ اور مرد کیا روتے بھی ہیں؟ وہ تو ان تین سالوں میں کئی مرتبہ رویا تھا کبھی گھٹ گھٹ کر، کبھی سب سے چھپ کر اور کبھی سرِ محفل..... وہ جب جب مالا کو دیکھتا تھا اس کے وجود میں دوڑتا خون جوش کھانے لگتا..... اس کی خاموشی خون کے آنسو رُلاتی تھی۔ اس کی پتھرائی بے رنگ آنکھوں کا حُزن اس کے سب گھر والوں کی نیندیں اڑا چکا تھا۔ مالا کے غم نے ان سب کو بے حال اور نڈھال کر رکھا تھا۔

وہ پچھلے کئی سالوں سے خاموش تماشائی بنا ہوا تھا۔ مالا کے غم، خاموشی اور تنہائی کا زہر چپکے، چپکے جانے کیسے اس کی رگوں میں خود بخود اترنے لگا تھا۔ پچھلے تین سال وہ لمحہ بہ لمحہ ایک عہد کو اپنے وجود کے اندر مضبوط کرتا رہا تھا اور یہ وہی عہد تھا جس کی مقناطیسی قوت اور طاقت اسے کھینچ کر من ہائیم لے آئی تھی۔ اس میں کوئی بہت سوجھ بوجھ یا دانائی نہیں تھی مگر یہاں وہ ایک جامع منصوبہ لے کر آیا تھا۔ ایک طویل پلاننگ کے تحت آیا تھا۔ وہ مالا کے مجرم کا گریبان پکڑنے آیا تھا۔ وہ ظلم کرنے والے اس ظالم کے اس حسین شہر کی سرزمین پر انتقام کے گرم اور زہریلے جذبات لے کر آیا تھا۔

وہ جانتا تھا مالا کے مجرم تک پہنچنے کے لیے اسے اپنی بھرپور طاقت، زور، اختیارات کا استعمال کرنا ہوگا۔ اور وہ اپنا سارا زور، طاقت، قوت اور اختیارات کا استعمال کر کے مالا کے مجرم کو اس کے

انجام تک پہنچانے کا بھرپور ارادہ رکھتا تھا۔ وہ یہاں سے ناکام لوٹ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہ ناکام ہونے اور شکست خوردہ ہو کر لوٹنے کے لیے آیا بھی نہیں تھا۔ آرام دہ اس بہترین سپر لگژری lexus میں بیٹھ کر بھی اس کی سوچیں اپنے پیارے گھر کی طرف بہہ رہی تھیں مگر اس کی زہریلی سوچوں کو بریک تب لگے تھے جب افراہیم کی شگفتہ سی آواز سنائی دی تھی۔

”ذی شاہ.....! تم کیوں اتنے اپ سیٹ دکھائی دے رہے ہو؟ اتنا حسن بھی کسی کو اپنی طرف متوجہ نہ کر پائے تو اس حسن کا بھلا کیا فائدہ......؟“ افراہیم نے اس کا کندھا بھی ہلا دیا تھا۔ تب وہ کچھ چونک کر ذرا خفیف سا ہو گیا۔ گزشتہ سوچوں اور کچھ تکلیف دہ مناظر سے دامن چھڑا کر وہ افراہیم کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

”ایسی بات نہیں۔“ ذی شاہ نے اس کے خیال کی فوراً تردید کی تھی۔ وہ اس کی سوچ کو جھٹلا رہا تھا۔ در پردہ وضاحت کر رہا تھا کہ اس کا دھیان آس پاس کی خوب صورت طلسماتی دنیا کی طرف نہیں تھا۔

”تو پھر کیسی بات ہے؟“ افراہیم نے مصنوعی خفگی سے کہا۔ یقیناً وہ اس کی طویل خاموشی سے اکتا گیا تھا۔ ظاہر ہے جہاز سے اترنے کے بعد سے لے کر اب تک وہ منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھا ہوا جانے کیا کچھ سوچ رہا تھا۔ افراہیم کے لیے اس کی خاموشی اچنبھے کا باعث تھی۔

”میں سوچ رہا ہوں، تمہارا من ہائیم بہت خوب صورت ہے۔“ ذی شاہ کو بروقت اپنی خاموشی کا جواز سوجھ گیا تھا تب افراہیم اس کے لہجے کی گہرائی میں اترے بغیر اس کی تعریف پر کھل اٹھا۔

”صد شکر کہ تمہیں میرا شہر پسند تو آیا...... ویسے تمہاری فرم کا صدر مقام بھی من ہائیم ہے، ایکچوئلی جس فرم کی طرف سے تمہیں دعوتی خط ملا تھا اس کی دو اور برانچیں فرینکفرٹ اور نیورن برگ میں بھی ہیں۔ من ہائیم سے زیادہ شہرت والے یہ دو شہر ہیں مگر چونکہ تم من ہائیم فرم کی طرف سے دعوتی خط کے ذریعے بلائے گئے ہو سو تمہیں یہیں رہنا ہے۔ میرے لیے خوشی کی بات یہ ہے کہ تمہیں یہ مقام پسند آگیا......“ افراہیم نے جذباتی سے انداز میں گفتگو آگے بڑھائی تھی۔ دراصل وہ اپنے شہر کے لیے ایسے ہی جذباتی تھا۔ پچھلی دو نسلوں سے جرمنی میں افراہیم کا خاندان مقیم تھا۔ وہ یہیں پیدا ہوا اور پلا بڑھا تھا تاہم اس کے آباؤ اجداد کا تعلق پاکستان سے تھا۔ وہ خود کو پاکستانی کہلوانا پسند کرتا تھا۔

افراہیم سے اس کی دوستی خاصی پرانی تھی۔ وہ پاکستان گھومنے پھرنے اور سیاحت کا شوق پورا کرنے آیا تھا۔ جب لارنس کالج آف گھوڑا گلی کی رائل روڈ پر ان دونوں کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ پھر یہ ملاقات طویل تر دوستی میں بدل گئی۔ وہ دونوں یک جان دو قالب ہو گئے۔ افراہیم واپس آنے کے بعد بھی ہمیشہ اس سے رابطے میں رہا تھا۔ بہت سالوں سے ان دونوں کا ٹیلی فونک رابطہ قائم تھا۔

پھر جب ذی شاہ نے جرمنی بزنس کی غرض سے اپنی پلاننگ افراہیم سے شیئر کی تو وہ بے ساختہ خوش ہو گیا تھا۔ اس کا پیارا دوست ایک ڈیڑھ سال کی مختصر مدت کے لیے جرمنی آ رہا تھا وہ بھلا کیونکر خوش نہ ہوتا۔ ذی شاہ کے آنے سے پہلے ہی افراہیم نے اپنے گھر میں اس کے رہنے کا بڑا شاہانہ قسم کا بندوبست کر دیا تھا تاہم ذی شاہ نے اس کے گھر مستقل رہنے سے معذرت کر لی تھی۔ جس پر افراہیم اس سے سخت خفا ہو گیا تھا اور یہ افراہیم کی ناراضی کا خوف تھا جس کی بدولت اس نے کچھ دن قیام کرنے کے لیے حامی بھر لی تھی کم از کم تب تک کے لیے جب تک اس کی رہائش کا کوئی مناسب بندوبست نہ ہو جاتا۔

افراہیم نے اسے کچھ یوں ڈرا دیا تھا کہ یہاں ہیرلخ فرم کے قرب و جوار میں جتنے بھی ہوٹلز تھے

اگرچہ رہائش وقیام کے لیے بہت اعلیٰ بہترین تھے، پُرسکون، آرام دہ اور آسائشات سے لبریز، تاہم زیادہ قریب مک تھا جو انتہائی عمدہ، اعلیٰ اور شاندار ”ہوٹل گارنی“ تھا یعنی ہوٹلوں کی اس قسم میں سے تھا جہاں سونے کا کمرا اور صبح کے ناشتے کا بندوبست ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں لنچ اور ڈنر کے لیے مارا مارا پھرنا پڑتا ہے۔ سوذی شاہ نے خود ہی ہوٹل میں رہائش رکھنے پر لعنت بھیج دی تھی مگر وہ زیادہ دن تک افراہیم کے کندھوں پر بھی سوار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس نے افراہیم کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ وہ جلد از جلد اس کے لیے علیحدہ رہائش کا انتظام کردے...... افراہیم نے کچھ ناک بھوں چڑھا کر حامی بھرلی تھی کیونکہ وہ جانتا تھا اگر ذی شاہ نے بات ایک دفعہ کہہ دی تو بس کہہ دی۔

من ہائیم کے خوب صورت شہر میں ہنگاموں سے ہٹ کر افراہیم کا ذاتی انتہائی خوب صورت مکان تھا۔ جب اس کی شاندار lexus شیڈ کے نیچے آکر رکی تب ایک طویل تھکن آمیز سانس خارج کر کے ذی شاہ گاڑی سے باہر آنکلا تھا۔ وہ اپنی گردن کو ہولے ہولے جھٹک کر گویا سابقہ تمام زہریلی یادوں اور سوچوں کو کچھ دیر کے لیے پس پشت ڈال رہا تھا۔ وہ برے موڈ اور روڈ انداز میں افراہیم کے گھر والوں سے پہلی ملاقات نہیں کرنا چاہتا تھا اور اس کی تمام سوچیں اور زہریلی یادیں غیر محسوس انداز میں اس کے چہرے کی تمام تازگی اور شگفتگی کا رس نچوڑ لیتی تھیں۔ وہ جانتا تھا جب مالا کا چہرہ اس کے تصور میں اپنا عکس چھوڑتا ہے تب اس کے اندر یا ہر اذیت بھرے سناٹے گونجنے لگتے تھے۔

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مالا کی یادوں سے خود کو لہولہان کرنے لگا تھا جب اس کی نگاہ روڈ کے پار ذرا اونچی پہاڑی پر شان سے کھڑے اس مکان کی طرف اٹھی تھی پھر لمحے بھر کے لیے گویا پلٹنا بھول گئی۔

اردگرد گھاٹیوں کے پار سبزے کے جُھنڈ اور پھولوں کے ڈھلان تھے۔ جن پر سنہری تتلیاں رقص کر رہی تھیں۔ دور مرغابیوں کے غول دکھائی دے رہے تھے۔ سورج کا زعفرانی عکس ہر پھول کے رنگ پر چمک رہا تھا۔ فضا میں کائی پھل کی باس رچی تھی۔ اودے رنگ کا پہاڑی پھل درختوں کی شاخوں سے جھلک دکھلا رہا تھا۔ ایک حسین تر اور نگاہ کو مبہوت کر دینے والا منظر تھا مگر ذی شاہ کے دل کو دھڑکانے اور نگاہ کو منجمد کر دینے والا منظر پھولوں، پتھروں اور آس پاس کی ایک، ایک شے سے قطعاً ہٹ کر بالکل الگ اور منفرد تھا۔ ذی شاہ کی زندگی گویا پہاڑی کے اس کنارے پر ختم ہوگئی تھی۔ حالانکہ زندگی ختم کہاں ہوئی تھی! زندگی کی تو شروعات ہی اب ہوئی تھی یا پھر ہونے والی تھی۔

افراہیم کے ڈبل اسٹوری گھر کے بالکل سامنے ہی وہ مکان تھا انتہائی خوب صورت پتھروں سے آراستہ، جس کے سنہری کنگروں پر دھوپ چمک رہی تھی۔ سفید مرغابیاں اس کے آس پاس رقص کرتی تھیں۔ احاطے میں چھوٹا سا حوض تھا۔ کبھی کبھار کوئی مرغابی اس حوض کے شفاف پانی میں چونچ مارنے آسمان سے اتر آتی تھی۔

شفاف شیشے کی کھڑکیوں کے سامنے سے لے کر داخلی لکڑی کے اونچے منقش دروازے تک پھولوں سے لدی ٹوکریاں ایک عجیب رنگ دکھا رہی تھیں۔ دراصل یہ ٹوکریاں یقیناً مٹی سے بھرے گملے تھے مگر بظاہر ٹوکری کی شکل میں نظر آتے تھے اور پھولوں سے پور پور بھرے ہوئے تھے۔ ذی شاہ نے ایسی حسین ٹوکریاں آج تک نہیں دیکھی تھیں مگر اسے ان ٹوکریوں نے ٹھٹکایا نہیں تھا۔ حوض کے کنارے ایک پری وش حسینہ بیٹھی تھی۔ اس کی سوتی اسکرٹ میں ڈھیروں پھول تھے جنہیں پتی پتی کر کے وہ پانی میں پھینکے جا رہی تھی۔ وہ اس کام میں اتنی محو تھی کہ کسی کی پُرشوق و حیران نگاہوں کا ارتکاز بھی اسے

چونکانے کا باعث نہیں بن رہا تھا۔ ذی شاہ کو اس لڑکی کے حسن نے بھی اتنا مبہوت نہیں کیا تھا جس قدر اسے لڑکی کے چہرے پر پھیلے حزن و ملال اور عجیب سے کرب نے ٹھٹکایا تھا۔ دراصل لمحے بھر کے لیے اسے لڑکی کا چہرہ بالکل مالا جیسا لگا تھا۔ ویسا ہی حزن کے سایوں سے اٹا ہوا، ویسے ہی دکھ کی دھول سے غبار آلود...... لمحے بھر کے لیے اسے لڑکی کے چہرے پر مالا کا گمان ہوا تھا۔ حالانکہ وہ مالا تو نہیں تھی مگر اس پل ذی شاہ کو مالا ہی نظر آرہی تھی۔ سب سے زیادہ حیران وہ تب ہوا جب اس لڑکی کا بھیگا چہرہ نگاہوں کی زد میں آیا۔ وہ بے آواز رو رہی تھی۔ اس کے شفاف آنسو حوض کے پانی میں بارش کے قطروں کے مانند بوند، بوند گر رہے تھے۔ جانے وہ کس اذیت اور دکھ میں مبتلا تھی۔

لمحے کے ہزارویں حصے میں ذی شاہ کو اس لڑکی پر ڈھیروں ترس آنے لگا۔ اس نے اپنے دل میں اس انجان روتی ہوئی لڑکی کے لیے ڈھیروں ہمدردی محسوس کی تھی۔ جانے ابھی وہ اور کون، کون سے جذبات اجنبی سی اس لڑکی کے لیے محسوس کرتا کہ وہ ایک دم سارے پھول حوض میں اچھال کر پانی کو گھورتی ہوئی زیرلب بڑبڑاتی نظر سے اوجھل ہوگئی۔ وہ جو آنکھیں پھاڑے منجمد کھڑا اب خالی حوض کے کنارے کو گھور رہا تھا افراہیم کی بے ساختہ ہنسی کی آواز سن کر چونک گیا پھر اس نے نگاہیں موڑ کر شیڈ کے نیچے کھڑے افراہیم کو دیکھا تھا۔ وہ اس کا سارا سامان کار کی ڈگی میں سے نکال کر جانے کب اندر پہنچا آیا تھا اور اب اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھتا ہوا ہنس، ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ اسے بے تحاشا ہنستے دیکھ کر ذی شاہ قدرے خفت زدہ رہ گیا تھا مگر اس کی ہنسی پھر بھی تھم نہیں رہی تھی۔ جب وہ شرمندگی کی دلدل میں گوڈے، گوڈے ڈوب چکا تھا افراہیم نے پیٹ پکڑ کر سنبھلتے ہوئے سرخ

چہرے پر ہاتھ پھیرتے بہ مشکل کہا۔

”تیرا بھی کوئی قصور نہیں دوست! جرمنی میں ایسا حسن اور ایسا خبطی آئٹم کہیں نہیں ملے گا نہ نظر آئے گا۔ تو جی بھر کے دیکھ لیتا...... اب دوبارہ جانے یہ کب نظر آئے گی۔ ایک دم خبطی اور پاگل ہے۔“ افراہیم کو پھر سے ہنسی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ یقیناً وہ اس کی نظروں کے ارتکاز کو انجوائے کر رہا تھا۔ اسے پاگلوں کی طرح ہنستے دیکھ کر ذی شاہ نے اپنی خفت مٹانے کے لیے فوراً جواب دیا تھا۔

”فی الحال تو، تو مجھے اس آئٹم سے بڑھ کر پاگل دکھائی دے رہا ہے۔“ وہ اسے گھورتا ہوا اب بڑی ڈھٹائی کے ساتھ اسی منقش دروازے کو دیکھنے لگا جہاں سے وہ خبطی لڑکی گزر کر اندر کی طرف غائب ہوئی تھی۔

”ہاہاہا...... ابھی ایک نظر دیکھ کر یہ حال ہے...... یعنی اپنے جگری یار کو پاگل کہہ دیا۔“ افراہیم اور بھی نہ جانے کون کون سے چٹکلے چھوڑتا مگر اس کے چٹکلوں کو افراہیم کی موتر یعنی ماں نے بریک لگا دیے تھے۔ وہ اسے ڈپٹتے ہوئے بڑے بھرپور انداز میں ذی شاہ کو ویلکم کہہ رہی تھیں۔ جانے وہ کب اندرونی حصے سے باہر آئی تھیں۔

”خوش آمدید بیٹے! اندر آؤ...... اس احمق کی باتیں تو پوری رات ختم نہ ہوں گی اور تمہیں یہ یہیں کھڑا رکھے گا۔“ افراہیم کی جرمن مدر جو اَب آدھی سے بھی زیادہ پاکستانی نظر آتی تھیں اسے بازو سے تھام کر اندر لے گئیں۔

جب وہ داخلی دروازے سے اندر آیا تب اس کے اوپر کوئی نرم نرم خوشبودار چیز کسی پھوار کے مانند گری تھی۔ ذی شاہ نے غور کیا تو پتا چلا کہ ایک مستطیل قسم کی پھولوں سے لدی ٹوکری دروازے کے اوپر اس رخ سے لگائی گئی تھی کہ جب کوئی مہمان پہلی مرتبہ گھر میں داخل ہوتا یہ پھول جھک کر اس کا استقبال کرتے۔ اپنے اتنے بہترین استقبال پر وہ کچھ پل کے لیے تو مبہوت رہ گیا تھا۔ پھر اسے ایک ”این سیل سیمر“ میں بٹھایا گیا تھا۔ یہ نہایت دیدہ زیب فرنیچر سے سجا کمرا تھا۔ بہت آرام دہ دیوان سجے تھے۔ یہاں بھی اسے جگہ جگہ پھول نظر آ رہے تھے۔ کرسٹل کے گلدان سے لے کر دروازے کے پاس رکھی ڈسٹ بن کی ٹوپی تک میں تازہ پھول سجے تھے۔ وہ ابھی اردگرد کا ٹھیک طرح سے جائزہ بھی نہیں لے پایا تھا جب اسے ٹھنڈے مشروبات پیش کیے گئے۔ انگور، کائی پھل اور ناریل کا مشروب تھا۔ ذی شاہ کو ناریل کا مشروب پسند تھا۔ اس نے دو بلوریں لمبے پتلے گلاس اطمینان سے خالی کر دیے تھے۔ مشروب پیش کرنے والی موتر خود تھیں تاہم کھانے کے لیے اسے ایک دبلی پتلی انتہائی سفید لڑکی بلانے کے لیے آئی تھی۔ اس کے بال اخروٹی رنگ کے تھے۔ شکل میں وہ موتر جیسی لگتی تھی۔ نیلی آنکھیں، سرخ ہونٹ اور گوری رنگت انہوں نے بتایا یہ ان کی بیٹی ایمل تھی...... اور ایمل بہت باتونی تھی، اسے انگریزی نہیں آتی تھی، اردو ٹوٹی پھوٹی بول سکتی تھی۔ تاہم اپنی مادری زبان ڈچ فراٹے سے بول رہی تھی چونکہ ذی شاہ کو ترکش اور اطالوی زبان کی سمجھ بوجھ نہیں تھی سو بس وہ ایمل کے ہلتے بھرے بھرے سرخ ہونٹوں کو ٹرین کی سی رفتار میں ہلتے دیکھ رہا تھا پھر شاید موتر نے تنگ آ کر ایمل کو ڈپٹا تھا۔

”برائے مہربانی آہستہ بولو۔“ ان کے ڈپٹنے پر وہ چابی والی گڑیا کی طرح بالکل ساکت ہو گئی تھی پھر کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ایک مرتبہ پھر سابقہ انداز میں بولتے ہوئے اٹھ گئی۔

”آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔“ وہ ماں کی خفگی کا تاثر مٹاتی اب خاصی مدبر لگ رہی تھی۔ ذی شاہ اس کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کر سکا تھا کیونکہ وہ جلدی اٹھ گئی تھی یقیناً مزید ڈانٹ سننا نہیں

چاہتی تھی۔ ذی شاہ کو محسوس ہوا تھا اسے ماں کا ٹوکنا کتنا برا لگا ہے۔ وہ اسے کچھ باتونی اور جذباتی سی لگی تھی۔ اس کی چھوٹی بہن بندیا کی طرح...... وہ بھی چھوٹی چھوٹی باتوں پر اسی طرح برا منا لیتی تھی۔

ایمل کے جاتے ہی موتر نے اسے بہت محبت سے کہا تھا۔

”پہلے تم فریش ہو جاؤ...... پھر کھانا لگاتی ہوں۔“ انہوں نے اس کی تھکن کے خیال سے کہا تھا۔ افراہیم کی ماں بہت نرم مزاج، شائستہ اطوار اور بیٹے سے بڑھ کر مہمان نواز تھیں۔ افراہیم شکل صورت میں ان سے مختلف تھا۔ یقیناً اپنے والد جیسا تھا۔ گندمی رنگت، کالی آنکھیں اور کالے بال رکھتا تھا جبکہ مزاج اس کا ماں کی طرح تھا۔ وہ گھر والوں کے مزاج پر غور کرتا موتر کی ہمراہی میں ایک انتہائی پُرتعیش ماسٹر بیڈ روم میں آ گیا تھا۔ بیڈ روم کیا تھا...... گویا کسی ہوٹل کا آرام دہ کمرا تھا۔ اس کے پیروں تلے بھلتے ہوئے عنابی رنگ کا انتہائی نرم قالین بچھا تھا۔ فرنیچر کے ہم رنگ سفید چمکیلی بیڈ روم چیئر بھی تھی۔ دیوار گیر الماری بھی سفید رنگ کی تھی۔ بیڈ شیٹ کا کلر بھی سفید تھا۔ ایسی اجلی بے داغ چادر بچھی تھی کہ ذی شاہ کچھ تذبذب کا شکار ہو گیا۔ بھلا اتنے اجلے شفاف، بے سلوٹ بستر پر سو کر اسے خراب کیا جا سکتا تھا...... کمرے میں یہاں بھی سفید مستطیل ٹوکری موجود تھی، جس میں رنگا رنگ گلاب سجے تھے۔ بہت بھینی اور معطر خوشبو نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی۔ ایسا رومانوی ماحول تھا اور اس کی سجاوٹ میں کسی آرٹسٹک ذہن کا کمال نظر آتا تھا۔ ذی شاہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ اِک طائرانہ نظر میں ہی اس نے پورے کمرے کا جائزہ لے لیا تھا۔

اس نے دیکھا تھا، کمرے کی واحد کھڑکی کے شیشے بھی سفید تھے جس کے آگے پردہ تھا سفید نائیلون کی مہین نازک سی جالی کا...... ذی شاہ نے مڑ کر غیر ارادی طور پر داخلی دروازے کو دیکھا تھا جس پر خوش خط تحریر میں کچھ لکھا تھا۔ کیا لکھا تھا؟ یہ ذی شاہ کو ہرگز سمجھ نہیں آیا۔ تاہم وہ تحریر کی طرف دیکھے بنا نہ رہ سکا تھا۔

”ویلکم ان من ہائیم......“ بہت زیادہ غور کرنے کا اسے وقت نہیں مل سکا تھا۔ موتر نے اس کی مشکل کو آسان کر دیا تھا۔ وہ اس کی نگاہوں کا ارتکاز محسوس کر کے خود ہی بتانے لگی تھیں۔

”افریشم نے تمہیں من ہائیم میں خوش آمدید بولا ہے۔“ وہ اسے وضاحتی انداز میں بتا کر واش روم کا ہینڈل گھما کر مزید بتا رہی تھیں۔ کمرے کے ایک کونے میں بادے سیمر یعنی غسل خانہ تھا۔ ویسا ہی شفاف، صاف چمکتا ہوا...... لشکارے مارتا ٹب اور اینمل شیشوں کی جگمگاہٹ کے ساتھ ٹھنڈے اور گرم پانی کی سہولت بھی میسر تھی۔ وہ موتر کے ”افریشم نے تمہیں من ہائیم میں خوش آمدید بولا ہے۔“ جیسے جملے پر غور کرتا سب سے پہلے فریش ہونے کے لیے واش روم چل دیا تھا۔ سفر کی تھکن نہا دھو کر اتارنے کے بعد وہ آئینے کے سامنے کھڑا بال بناتے ہوئے اپنا اگلا لائحہ عمل سوچ رہا تھا۔ اسے کیا کرنا تھا...... کس طرح کرنا تھا؟ اور کیسے اپنے مجرم کے گریبان تک پہنچنا تھا؟ بہت ساری باریکیوں پر غور کرتا وہ غیر محسوس انداز میں کمرے کی اس واحد کھڑکی کے پاس آ کھڑا ہوا تھا جس کے سامنے سفید نائیلون کی مہین جالی کا پردہ پڑا تھا۔ اس نے چٹکی کی مدد سے پردہ پیچھے کھسکا کر سلائنڈ ہٹا دیے۔ سامنے دور تک سنہری زعفرانی حسین شام کا حسن بکھرا پڑا تھا...... سفید مرغابیوں کے غول بیلے کی طرف رواں دواں تھے۔ اس کی کھڑکی کے بالکل سامنے وہی دو منزلہ انڈے جیسا سفید اور خوب صورت مکان تھا۔ جس کے بیرونی دروازے پر (ولیس ہاؤس) کی تختی آویزاں تھی۔ حوض کے کنارے خالی تھے۔ وہ روتی ہوئی غمزدہ

اجنبی لڑکی وہاں نہیں تھی۔ مستطیل ٹوکریوں میں سفید گلاب نمایاں تھے۔ منظر پہلے کی طرح بھرپور اور مبہوت کردینے والا تھا تاہم کہیں دور خالی پن ضرور محسوس ہوتا تھا...... یہ خالی پن کیوں تھا......؟ یہ ادھورا پن کیوں تھا؟ شاید وہ سفید روئی جیسی حسین لڑکی اب کہیں نہیں تھی۔

وہ ولیس ہاؤس سے نگاہ ہٹا کر ڈھلوانوں پر بکھرے سبزے اور ہریالی کو دیکھنے لگا تھا۔ تب نہ جانے کہاں سے اس کی آنکھوں میں چمکیلا پانی اُمڈنے لگا تھا۔ نادیدہ ریت اس کی آنکھوں کو چندھیا گئی تھی۔

وہ آسمان پر اڑتی سفید مرغابیوں کو دیکھ کر...... زیرِلب بڑبڑایا۔

''تو بالآخر میں یہاں پہنچ گیا......علی عیسیٰ میں تمہارے من ہائیم بالآخر پہنچ ہی گیا......اب مجھے بس تمہارے گریبان تک پہنچنا ہے......'' ولیس ہاؤس کی ساری خوب صورتی پس منظر میں چلی گئی تھی۔ موترے، آشیں اور شاہ بلوط کے درخت بکھرے پڑے تھے۔ رومان جو اس شہر کی فضا میں بسا تھا۔ دھیرے دھیرے سانس لے رہا تھا۔ محبت جو اس کی رگوں میں لہو بن کر بھی دوڑ رہی تھی۔ اب صنوبر کے گھنے جنگلات کے تاریک سائے میں سسک رہی تھی۔ (دریا کے کنارے پر پھیلا جنگل) تین سال پہلے عیسیٰ اور مالا کی محبت کے فنا ہونے پر کس طرح سے رُلایا تھا۔ یہ بات ذی شاہ کو پتا نہیں تھی، وہ اس حقیقت سے بے خبر تھا اور وہ تو بے شمار سچائیوں سے اب بھی بے خبر تھا۔

☆☆☆

تین چار ماہ پہلے جب اچانک ذی شاہ نے جرمنی جانے کے متعلق اپنا خیال ظاہر کیا تو اس کے گھر میں محاورتاً نہیں حقیقتاً بھونچال آگیا تھا۔ ممی نے سنا تو دل تھام لیا تھا۔

''ذی! تو جرمنی ہرگز نہیں جائے گا۔ ارے، اُدھر جا کر کوئی واپس آیا ہے؟ یہ خیال تیرے دل میں آیا ہی کیسے؟'' ممی کے لیے ذی شاہ کا یہ فیصلہ دھچکے سے کم نہیں تھا۔ وہ اسے اپنی نظروں سے اوجھل کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھیں مگر ذی شاہ چونکہ فیصلہ کرچکا تھا سو اپنے اس فیصلے سے محض آگاہ کررہا تھا وہ ان سے مشورہ ہرگز نہیں مانگ رہا تھا۔ دراصل اسے جرمنی جانے سے تقریباً گھر کے ہر، ہر فرد نے روکا تھا۔ ممی سے لے کر بندیا تک......اس کا بڑا بھائی ذیشان تو ناراض بھی ہوگیا تھا اور عینی بھابی نے بھی خوب واویلا کیا...... اصل میں ذی شاہ کے جرمنی چلے جانے سے عینی بھابی کی بہن کا مستقبل تھوڑا خدشات میں لپٹ رہا تھا سو عینی کو بھی اس کا فیصلہ قطعاً بھایا نہیں تھا۔ ذی شاہ کو سوائے ممی کے کسی اور کے واویلا کرنے کی پروا ہرگز نہیں تھی۔ اس نے ایک مرتبہ فیصلہ کرلیا تھا اب اس فیصلے پر عمل کرنے کا... بھرپور ارادہ رکھتا تھا۔ ممی کے ہزار دفعہ سمجھانے اور رونے چلاّنے پر اس نے محض ایک دلیل سے انہیں خاموش کروادیا تھا۔ وہ اس کا ارادہ اور دلیل سن کر بالکل خاموش ہوگئی تھیں...... شاید پہلے انہوں نے سوچا تک نہیں تھا کہ ذی شاہ اس کام کے لیے بھی جرمنی جاسکتا ہے۔ جب اس نے ممی کو قائل کرلیا تو پھر بھائی کی اسے پروا نہیں تھی البتہ بندیا کے آنسوؤں نے اسے پسیجا ضرور تھا۔ اسے ڈھیروں دلاسے اور یقین دہانی کروانے کے بعد جب اس نے اپنا ارادہ نہ بدلنے کی وضاحت کی تھی تب بندیا کو بھی خاموش ہوجانا پڑا۔ اس سارے قصے میں سب سے زیادہ خاموش کردار مالا کا تھا۔ وہ گھر میں ہونے والی چہل پہل، کچھ کچھ بدمزگی اور جھگڑے کی فضا محسوس کرکے بھی اپنے خول میں بند تھی۔ گویا اسے کسی جھگڑے، لڑائی، فساد اور بدمزگی نے اپنی طرف متوجہ نہیں کیا تھا۔ تین سال پہلے جو روگ اس کے دل کو لگا تھا اس کی چاٹ نے مالا کی قوتِ گویائی کو سلب کردیا تھا۔ وہ سب کچھ دیکھتی تھی، محسوس کرتی تھی،

سمجھتی اور سوچتی بھی تھی مگر بولنے کی کوشش نہیں کرتی تھی۔ اس کی زبان کو گویا زنگ لگ چکا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر قفل تھا اور یہ قفل کبھی نہ کھلنے کے لیے اس نے جان بوجھ کر اپنے لبوں پر لگالیا تھا۔ وہ طویل ترین اور مہنگے ترین علاج سے اگرچہ صحت مند ضرور ہوگئی تھی تاہم اس نے کسی سے بھی بولنا ترک کردیا تھا۔ وہ اپنی ذات کے قید خانے میں دبک کر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے خود کو خاموشیوں کے جال میں مقید کرلیا تھا۔ گویا ایک چپ نے اسے ہر سوال کرتی نگاہوں سے بچالیا تھا۔ وہ اپنی ذات کے اس قید خانے میں مطمئن اور پُرسکون ہوچکی تھی۔ شاید اس نے قسمت کے لکھے پر صبر کرلیا تھا اور اپنی بدبختی پر شاکر ہوچکی تھی مگر ذی شاہ بھلا کیسے صابر اور شاکر ہوجاتا...... وہ کس طرح مالا کو ایک چپ کا عذاب بھگتتے دیکھ کر پُرسکون رہتا؟ پچھلے تین سالوں سے مالا کو ایک قید خانے میں مقید تو دیکھ رہا تھا۔ بھلا اور کتنے سال اسے گھٹ گھٹ کر مرتے دیکھتا رہتا.........

ذی شاہ اس کی زندگی سے اس حبس کو ختم کردینا چاہتا تھا پھر جب اس نے اپنے فیصلے سے گھر والوں کو آگاہ کیا تو سب سے پہلے ذیشان اور عینی نے ہنگامہ مچادیا۔

''ذی! تم پاگل ہوگئے ہو......وہ قصہ تین سال پہلے ختم ہوچکا......اب گڑھے مُردے اکھاڑنے سے کچھ حاصل نہیں......تمہارا جانا بیکار ہوگا......'' ذیشان کھولتا ہوا چیخ رہا تھا۔ اسے اپنے چھوٹے بھائی سے ایسی بے عقلی کی امید نہیں تھی۔ یقیناً وہ اپنی بیوی کی زبان بول کر ذی شاہ کو اس کے خطرناک ارادوں سے باز رکھنا چاہتا تھا۔ اُدھر عینی جلے پیر کی بلی بنی ہوئی تھی۔ وہ کسی نہ کسی طریقے سے اسے باہر جانے سے روک دینا چاہتی تھی مگر کوئی ٹھوس حل مل کر نہیں دے رہا تھا۔ شوہر کو سمجھا بجھا کر اس نے ذی شاہ کے پاس بھیجا تھا اور اب خود بھی اس کے پیچھے کمرے میں چلی آئی تھی۔ اس وقت سٹنگ روم میں ممی، بندیا اور ذی شاہ کے برابر ذیشان بیٹھا تھا جو برابر اسے لتاڑ رہا تھا۔

''تم احمق مت بنو...... مالا اپنے حالات سے سمجھوتا کرچکی ہے۔ تمہیں جرمنی جا کر آگ میں ہاتھ ڈالنے کی کیا ضرورت ہے؟ ممی آپ اسے سمجھاتی کیوں نہیں۔'' ذی شاہ کو لعن طعن کرتا وہ خاموش بیٹھی ممی کو بھی بیچ میں گھسیٹ لایا تھا۔ ممی جو چپ چاپ ان دونوں کی تکرار سن رہی تھیں محض ایک گہری سانس خارج کرکے رہ گئیں۔ وہ جانتی تھیں کہ ذی کو اس کے ارادے سے باز رکھنا آسان نہیں۔ وہ فیصلہ کرچکا تھا اب اس سے ہٹ نہیں سکتا تھا پھر اس نے کون سا محض تفریح پر جانے کا یا ہنی مون منانے کا پروگرام بنایا تھا۔ انہیں یقین تھا ذی شاہ کچھ غلط فیصلہ ہرگز نہیں کرے گا نہ وہ کچھ الٹا سیدھا کرنے کی اس سے امید رکھتی تھیں۔ وہ بہت معاملہ فہم اور سمجھدار تھا...... یقیناً بہت سوچنے کے بعد اس نے کوئی پلان بنایا تھا تاہم حقیقت تو یہ تھی ممی خود بھی دل سے اسے جرمنی بھیجنے پر تیار نہ تھیں۔ اندر کہیں بہت سارے خدشات سانس لے رہے تھے۔ بھلا منحوس سا مغربی جرمنی ان کے خاندان کو کبھی راس آیا تھا؟

''ممی مجھے کیا سمجھائیں گی؟ میں خود بہت سارے معاملات کا ازسرِنو جائزہ لے کر فیصلہ کرچکا ہوں۔ سو اب اپنے ارادے توڑ نہیں سکتا...... رک نہیں سکتا...... تم اپنی انرجی ضائع مت کرو۔'' ذی شاہ نے ہاتھ اٹھا کر تیز لہجے میں کہا تھا۔ ذیشان کا رنگ اس کے ان الفاظ پر تیزی سے بدل گیا۔ اس کے چہرے پر دبا دبا غصہ جھلکنے لگا...... بہ مشکل اپنے بگڑے تاثرات پر قابو پاتے ہوئے اس نے مزاج ترش کرنے سے روکا۔

''تم بھلا کون سے معاملات کا جائزہ لے چکے ہو؟'' ذیشان نے عینی کا اشارہ پا کر خود کو بھڑکنے سے روکا تھا۔ حالانکہ ذی شاہ کے الفاظ اسے آگ بگولا

کررہے تھے مگر عینی نہیں چاہتی تھی کہ دونوں بھائی لڑائی کو بڑھادیں۔ اگر دونوں میں تکرار بڑھ جاتی تو ذی شاہ نے بول چال بند کردینی تھی پھر عینی کے ہاتھ سے اگلے معاملات بھی چپکے سے پھسل پڑتے......سو وہ شوہر کو کول ڈاؤن رہنے کا مسلسل اشارہ کررہی تھی۔ اسے پتا تھا اول تو ذی شاہ کو غصہ نہیں آتا مگر جب غصہ آجائے تو پھر اتنی آسانی سے اترتا نہیں...... تین چار سالوں میں وہ اپنے بانکے سجیلے دیور کا مزاج خوب سمجھ گئی تھی۔ پھر وہ جانتی بھی تھی ذی کو جو بات پیار و محبت سے سمجھائی جائے اسی کا وہ اثر بھی لیتا ہے۔ غصے کے بدلے غصہ الٹنے میں اسے قطعاً دشواری نہیں ہوتی...... اب بھی ذیشان کا سوال سن کر ... ذی شاہ کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔ وہ اپنی خوابناک خوب صورت آنکھوں میں ڈھیروں خشونت بھر کے بڑے بھائی کو دیکھ رہا تھا۔ گویا اس کے سوال کی چبھن نے ذی شاہ کو تکلیف دی تھی۔

''بات تو تم ایسے کررہے ہو، گویا تمہیں کچھ پتا ہی نہیں...... لٹی پٹی بہن کے نصیب پر شاکر ہو کے بیٹھ جانے والے، کیا تمہیں اتنی توفیق بھی نہیں ہوئی تھی اپنی بہن کے مجرم سے فون پر ہی کچھ حساب کرلیتے...... کم از کم اتنا تو اس بے غیرت سے پوچھتے، کس جرم کی پاداش میں اس معصوم کو ایسی سزا سنائی ہے؟ آخر کون سی خطا مالا سے سرزد ہوئی تھی؟ آخر اتنا پوچھنے کا حق تو تم رکھتے تھے ناں......؟'' ذی شاہ ... کے غضبناک لہجے میں عجیب دکھ ہلکورے لے رہا تھا۔ اس کے الفاظ نے جہاں ذیشان کو مشتعل کیا تھا وہیں عینی کی گوری رنگت دہک اٹھی تھی...... وہ جو کب سے بھیگی بلی بنی بیٹھی تھی ایک دم بھڑک اٹھی۔

''تمہارے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جو کچھ بھی مالا کے ساتھ ہوا، وہ ہم نے کروایا؟'' عینی کی بکواس نے ممی سمیت ذی شاہ کو بھی بھڑکا دیا تھا۔ اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی ممی پُرنم اور دھیمی آواز میں بول پڑی تھیں۔

''بہو! تم بات کو غلط رنگ مت دو، اچھی طرح سمجھ رہی ہو جو کچھ ذی شاہ کہہ رہا ہے......اور ذی غلط نہیں کہہ رہا۔'' ممی کے الفاظ نے جہاں عینی کا منہ بند کروایا تھا وہیں ذیشان پھر سے بھڑک اٹھا۔

''ممی......! آپ ذی کی حمایت کررہی ہیں، یہ کیا ٹھیک کہہ رہا ہے؟ تین سال پہلے آخر حالات کیسے تھے جو میں حساب کتاب لینے اس بے غیرت کے پاس جرمنی بھاگتا، جس کی شکل تک ہم نے دیکھی نہیں...... پھر جب مالا لٹی پٹی واپس آئی تھی تب اس کے حالات جان کر ڈیڈی کو ہارٹ اٹیک ہوگیا تھا...... بعد میں مالا کی بیماری کے ساتھ ڈیڈی کی موت کا اچانک ملنے والا دھچکا سہتے ہوئے کسے جرمنی جانے کا ہوش رہا تھا پھر ذی بھی تو کراچی سے واپس آچکا تھا یہ کیوں نہ مالا کے مجرم سے دو دو ہاتھ کرنے گیا......؟ اب جب وقت بدل گیا ہے، ساعتیں گزر گئی ہیں، غم کی بھاری گھڑیاں کھسک گئی ہیں، ہمیں بھی صبر آگیا ہے پھر گڑے مردے اکھاڑنے کا فائدہ......؟ اس کا جانا سراسر بیکار ہے، یہ کس طرح جرمنی جائے گا؟ پھر اس ذلیل کو ڈھونڈے گا کیسے......؟ ہمارے پاس تو اس ذلیل کی ایک تصویر بھی نہیں...... ہم میں سے کسی نے اس بے غیرت کو دیکھا تک نہیں تو اس کے گریبان تک کیسے پہنچ پاتے...... اور جس نے اسے دیکھ رکھا ہے، وہ کچھ بولنے سے ہی معذور ہوچکی ہے۔ جانے اس معصوم پر کیا بیتی تھی۔ سوچتا ہوں تو خون کھولنے لگتا ہے۔'' ذیشان کی آواز حقیقت میں بھرّا گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں گرد اُڑنے لگی تھی...... اجڑی بہن کی حالت پر صبر شکر کرنا آسان نہیں تھا مگر وہ بھی کیا کرتا......؟ کئی طرح کی بیڑیوں میں جکڑا تھا۔ اور ایک بیڑی تو عینی کی صورت میں تھی۔ وہ اسے تنہا بھلا کہیں جانے دے سکتی تھی؟ خصوصاً جرمنی تو وہ کسی صورت نہ ذیشان کو بھیجتی، بھلا جرمنی جاکر کوئی واپس آیا تھا؟ اس کی ساس خود بتاتی تھیں ان کا دیور سالوں پہلے جرمنی گیا تو وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ پیچھے ماں مری باپ مرا...... بڑی بہن مرگئی مگر جانے والا کبھی نہ لوٹا...... حالانکہ سمندر پار بیٹھ کر اپنوں کی یاد میں رونے والے کی روح تو نہیں کہیں کُرلا رہی تھی پھر بیچ میں کئی سال گزر گئے تھے کہ اچانک ان کا دیور واپس لوٹ آیا مگر چہرے پر پہلے سی جوانی نہیں تھی، بہار نہیں تھی، وقت نے آزما آزما کر جوانی کا رس نچوڑ لیا تھا...... بالوں میں چاندنی اتر آئی تھی۔ مضبوط چوڑے کندھے جھک گئے تھے۔ بڑھاپے کا موسم بڑا اداس کردینے والا تھا۔

پھر بھلا کیا ہوا تھا؟ کس طرح سے ہوا تھا؟ تین سال پہلے کا تو قصہ تھا۔ اس نے کئی راویوں کی زبان سے سنا تھا...... مگر ہر دفعہ سنتے ہوئے الگ ہی جذبات ہوتے۔ کبھی افسردگی، کبھی لطف، کبھی رشک، کبھی کرب.. وہ تین سال پہلے کے واقعات... ازسرِنو ذہن میں تازہ کررہی تھی جب اچانک ذی شاہ کی آواز اسے اپنی طرف متوجہ کرگئی۔

''تین سال سے اسے کھوج رہا ہوں، تین سال سے اس کے گریبان تک پہنچنے کی پلاننگ کررہا ہوں۔ یہاں بیٹھ کر سوائے سوچنے کے ہم کچھ نہیں کرسکتے، سو میں نے جرمنی جانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔'' ذی شاہ غیر جذباتی، ٹھوس اور مستحکم لہجے میں بولا تھا تب ذیشان حد سے زیادہ بے چین ہوگیا اور پہلو تو عینی نے بھی بدلا تھا۔

''آخر فائدہ کیا ہوگا......؟ جو اس ظالم ناپاک، غلیظ گدھ نے کرنا تھا کردیا، تمہارے اس سفر سے حاصل کیا ہوگا؟'' ذیشان کا سوال بہت کڑوا اور حقیقت سے قریب تر تھا۔ سو ممی سمیت بندیا کی خاموش نظریں بھی ذی شاہ کے چہرے کا طواف کررہی تھیں۔ وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد سنجیدگی سے بولا۔

''کم از کم اندر لگی آگ تو بجھ جائے گی۔ انتقام کے شعلوں پر چھینٹے پڑ جائیں گے اور سب سے بڑی بات میں کچھ حقائق ضرور جان لوں گا۔ آخر ہنستے بستے گھرانے میں اچانک آگ کیسے لگ گئی تھی؟ کیا تم لوگوں کے ذہنوں میں سوال نہیں اٹھتے؟ ہماری بہن شادی کے چھ مہینے اپنے شوہر کے ساتھ خوش باش رہتی ہے اور پھر اچانک ایک رات سب کچھ بدل جاتا ہے؟ آخر اس رات ہوتا کیا ہے؟ مجھے اس رات تک پہنچنا ہے؟ مجھے حقائق ڈھونڈنے ہیں؟ مالا کے مجرم کو انجام تک پہنچانا ہے۔'' اس کے لہجے سے شعلے لپک رہے تھے۔ آنکھ سے سرخی بہہ رہی تھی۔ اس کے ارادے چٹان کی طرح مضبوط تھے۔ ان ارادوں کو بھلا ذیشان توڑ سکتا تھا مگر وہ اسے روک تو سکتا تھا۔ سمجھا تو سکتا تھا۔

''ہم نے پہلے مالا کو جرمنی بھیج کر کتنا نقصان اٹھایا ہے۔ اب تمہیں بھیجنے کا حوصلہ نہیں...... خود سوچو، اگر تم مالا کے مجرم سے انتقام لے بھی لیتے ہو تو اس سے ہمیں کیا حاصل ہوگا؟ نہ مالا کی خوشیاں لوٹیں گی، نہ اس کے ماتھے پر لگا بدنما داغ دھل جائے گا۔ پھر بھلا کیا فائدہ اتنے عذاب سہنے کا۔'' ذیشان نے ٹوٹے پھوٹے لہجے میں کہا تھا۔ وہ کسی بھی طرح ذی کو وہاں جانے سے روکنا چاہتا تھا۔ کچھ عینی کی طرف سے مجبور تھا اور کچھ چھوٹے بھائی کی فطرت سے بھی آگاہ تھا۔ وہ جس کام کے پیچھے پڑ جاتا اسے کبھی ادھورا نہیں چھوڑتا تھا پھر تو یہ مالا کے لیے، اس کی خوشی اور زندگی کے قاتل سے حساب لینے کا معاملہ تھا۔ وہ بھلا رک سکتا تھا؟

''میں فائدہ اور نقصان سوچ کر تو ہرگز نہیں جارہا...... میں نے خسارے اٹھائے ہیں...... اور نقصان، ذلت اور کرب ہی اس کی جھولی میں ڈالوں گا۔ اگر ہماری جان پچھلے تین سال سے سولی پر لٹکی ہے تو علی عیسٰی بھی سکھ نہیں پائے گا۔ یہ میرا خود سے

وعدہ ہے۔ اس کی زندگی بھی جہنم بنا کر آؤں گا۔'' اس نے گویا بات ختم کردی تھی۔ وہ مزید، اس موضوع پر نہیں بولنا چاہتا تھا۔ سو اٹھ کر باہر چلا گیا تھا۔ ذی شاہ کے جاتے ہی عینی کو زبان لگ گئی تھی۔ وہ ذیشان پر غصہ کر رہی تھی اور ساس کو کھری کھری سنا رہی تھی۔ اسے بھی تو اپنا غصہ الٹنا تھا۔

''اس کے دماغ میں آپ نے خناس بھرا ہے۔ آپ کے آنسو، سسکیاں، آہیں اور مالا کے لیے ہر وقت کے رونے نے آج ذی سے یہ فیصلہ کروایا ہے۔ یہ سارا کیا دھرا آپ کا ہے۔ نہ آپ اپنے روز روز کے رونے کو اس کے کانوں میں انڈیلتیں نہ وہ مجبور ہو کر علی عیسٰی سے انتقام لینے کا سوچتا، آخر مالا کی نحوست کون کون سا دن دکھائے گی۔ اگر ذی شاہ باہر چلا گیا تو جانے کب لوٹے گا۔ میری بہن کے معاملے کو آپ نے لٹکا رکھا ہے، میں آپ سے کہے دیتی ہوں، ذی کے باہر جانے سے پہلے آپ کو کوئی فیصلہ کرنا ہوگا۔'' عینی کی اصل کھولن کا سبب کھل کر سامنے آ گیا تھا۔ اسے اپنی بہن آنیہ کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ اتنے عرصے سے ماں بہن کو ذی کے حوالے سے امید دلا رکھی تھی۔ اب اس کے اچانک جرمنی جانے کے فیصلے نے گویا معاملہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ ذی شاہ کو جرمنی جانے سے روکنا تو آسان نہیں تھا تاہم وہ ذیشان کو مجبور کر کے کچھ اور تو سوچ سکتی تھی مگر اس کی سوچ کی خوشگواریت کو بندیا کی تلخ آواز نے ختم کردیا تھا۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

''بہت خود غرض ہیں بھابی آپ! میری دکھی اور بیمار بہن کو تو آپ نے کبھی بخشا ہی نہیں اب ممی کو براہِ راست مجرم قرار دے دیا...... بہت گندی سوچ ہے آپ کی...... اور ذیشان بھائی......! آپ سے تو ہمیں کوئی امید نہیں رکھنی چاہیے...... بجائے بیوی کا منہ توڑنے کے نہ جانے کس سوچ میں گم بیٹھے ہیں۔''

بندیا کے تلخ الفاظ نے عینی کو تو آگ لگائی ہی تھی ذیشان کو بھی اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ وہ جو ذی شاہ کے بارے میں سوچ رہا تھا ایک جھٹکے کے ساتھ بندیا کی طرف متوجہ ہوا...... پھر ماحول کی کثافت محسوس کر کے اس نے عینی کو سخت نگاہوں سے گھورا تھا۔

''کیا بدتمیزی ہے یہ! اٹھ کر جاؤ یہاں سے، ذرا ادب لحاظ چھو کر نہیں گزرا......'' ساس، نند کی موجودگی میں اپنی اس عزت افزائی پر جلتی کلستی، ذیشان کو تیور دکھاتی وہ اٹھ کر پیر پٹختے ہوئے چلی گئی تھی پھر ذیشان بھی اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بندیا کو گھورتے ہوئے بولا تھا۔

''تم بھی ذرا اپنی زبان کنٹرول میں رکھا کرو، بڑے چھوٹے کی تمیز ہی نہیں۔'' ذیشان کے گھُرکنے پر بندیا پھٹ پڑی تھی۔

''وہ ممی کو اتنی باتیں سنا گئی ہیں...... ممی اس کی چھوٹی بہن ہیں ناں......'' اس نے تڑختے ہوئے جتلایا تھا پھر تن فن کرتی ممی کے ڈپٹنے پر وہاں سے پیر پٹختی چلی گئی۔ اس کے پیچھے ممی، ذیشان کو منمناتے ہوئے صفائی پیش کر رہی تھیں۔

''چھوٹی ہے بیٹا......! درگزر کر دیا کرو......''

ممی کی صفائی نے ذیشان کو کچھ اور بھی شیر کر دیا تھا۔

''سمجھایا کریں اسے، عینی سے منہ ماری نہ کیا کرے۔'' وہ الٹا ممی کو مشورہ دیتا دھپ دھپ کرتا کمرے سے نکل گیا تھا۔ اسی کمرے کے ایک کونے میں موجود وہ خاموش سی لڑکی بس ٹکر ٹکر ماں کے چہرے پر پھیلی بے بسی کو دیکھ رہی تھی پھر جانے کہاں سے اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا تھا...... اب وہ سر جھکائے بے آواز رو رہی تھی۔ رونا اس کے نصیب میں جو لکھ دیا گیا تھا۔

☆☆☆

گھر کی فضا میں امن قائم نہیں رہ سکا تھا۔ امن قائم رہتا بھی کیسے......؟ ایک تو ذی شاہ باہر جا رہا تھا

اور دوسرے ان دنوں اس کا مزاج آسمانوں کو چھو رہا تھا۔ پہلے پہل جو عینی نے ذی شاہ کے ساتھ دوستی گانٹھ رکھی تھی اس کا خاتمہ بھی بالآخر اس دن ہو گیا تھا جب بندیا اور عینی کی تکرار ذی شاہ نے اپنے کانوں سے سن لی تھی۔ تب کا بدگمان ہوا ذی دوبارہ عینی کے ساتھ دوستانہ رویہ قائم نہیں رکھ سکا تھا۔ سو عینی کے مزاج میں اور بھی تلخی آ گئی تھی۔ ساس نند کو تو وہ لگی لپٹی رکھے بغیر کھری کھری سنا دیتی تھی تاہم ذی شاہ کے سامنے ہمیشہ مظلوم اور مسکین بن جاتی۔ دراصل وہ دیور کو بدگمان نہیں کرنا چاہتی تھی...... مگر اس کے سوچنے سے پہلے کون سا کچھ بہتر ہو رہا تھا۔ جواب اس کی پلاننگ حسبِ منشا رزلٹ لے آتی...... وہ اپنی بہن کے لیے جتنی راہیں ہموار کر رہی تھی، معاملات اتنے ہی الجھتے جا رہے تھے۔ گھر کا ماحول بندیا کے فساد کی وجہ سے خراب ہو چکا تھا۔ اس نے آنیہ کے متعلق جب سے سنا تھا تب سے شعلہ جوالہ بنی ہوئی تھی۔ ممی کو بھی اس نے باور کروا دیا تھا کہ وہ عینی کی بہن کو اس گھر میں لانے کے لیے ہرگز مت سوچیں۔ وہ لوگ تو پہلے ہی عینی کی صورت میں ایک عذاب بھگت رہے تھے...... اب دوسرا عذاب اپنے سر پر مسلط کرنے کا ہرگز بھی رسک نہیں لے سکتے تھے۔ یہ تو بس بندیا کی دلیری تھی جو وہ عینی کے سامنے تن گئی تھی ورنہ عینی، ممی اور مالا کو تو کسی خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ اس نے بالا ہی بالا ممی اور ذیشان کو رضامند کر لیا تھا۔ اس کی خواہش تھی ممی ذی شاہ کے کانوں میں بھی بات ڈال دیں کہ وہ عینی کی بہن کو اپنی دوسری بہو بنانے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ عینی کو پورا یقین تھا ممی کی بات کو ذی شاہ... قیامت تک ٹال نہیں سکتا تھا نہ نظر انداز کر سکتا تھا سو وہ اس لحاظ سے کچھ مطمئن تھی مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اس کی تیز طرار نند نے آنیہ کا نام سن کر کیسا فساد مچا دینا ہے۔ دراصل مالا کی طرف سے تو اسے کوئی خدشہ لاحق ہی نہیں تھا۔ مالا تین میں تھی نہ تیرہ میں تھی جبکہ بندیا کو وہ اس قابل ہی نہیں سمجھتی تھی جس کے اعتراض کی طرف گھر والے دھیان دیتے لیکن آندھی اسی جہت سے اٹھی تھی جس طرف عینی کا گمان ہی نہیں تھا۔ فی الحال ذی شاہ کے جرمنی جانے کو بھلا کر بندیا اس نئے غم میں مبتلا ہو گئی تھی۔

''مالا اب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھتی ہو، کچھ سنا تم نے، عینی بھابی ذی شاہ بھائی کے لیے اپنی بہن آنیہ کو لانے والی ہیں دیکھنا کل کو زرشام بھائی کے لیے اپنی کسی بھانجی کو اٹھا لائیں گی۔'' بندیا نے غضبناک ہو کر ہاسٹل میں مقیم اپنے تیسرے بھائی کا ذکر بھی کیا جو تعلیم کے حصول کی خاطر ہاسٹل میں رہ رہا تھا مگر یہ ذکر مالا کو کون سا بولنے پر اکسا سکتا تھا۔ وہ اب بھی بے دھیانی سے ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھی۔ گویا اس کی باتیں سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ حالانکہ سمجھ تو اسے آ رہی تھی مگر وہ جواب دینا یا بولنا نہیں چاہتی تھی...... اسے خاموشی کی چادر اوڑھنا تھی مگر یہ بندیا بھلا ماحول کو خاموش اور پُرسکون رہنے دے سکتی تھی۔

''میں عینی بھابی کی ایک بھی آرزو کو پورا نہیں ہونے دوں گی۔ نہ ذی شاہ بھیا کو اس آنیہ کے ہتھے چڑھنے دوں گی نہ اپنے زرشام بھائی کو ان چڑیلوں کے حوالے کروں گی، ان کی ساری پلاننگ دھری کی دھری رہ جائے گی۔ دیکھو، میں کرتی کیا ہوں۔'' وہ ہاتھوں کی انگلیاں مروڑتی سخت بے چین تھی۔ اس کی بے چینی مالا خوب سمجھتی تھی مگر وہ اتنی بے بس تھی کہ کچھ کر نہیں سکتی تھی۔ بس اندر ہی اندر کُھل ضرور سکتی تھی، آنسو بہا سکتی تھی مگر بندیا کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔ حالانکہ وہ بندیا سے پوچھنا چاہتی تھی کہ اس کے ارادے کیا ہیں؟ وہ کیا کرے گی؟ اور وہ کچھ ایسا بھی نہ کرے جو اُن کی ماں کو تکلیف دے یا ان کے تینوں بھائیوں میں پھوٹ پڑ جائے۔

''عینی بھابی کی چالاکی اور مکاری کی کوئی حد بھی ہے، اپنی بہن لے آئیں گی تو ہمیں اسٹور روم

میں گھسنا پڑے گا...... اور میں ایسا ہرگز نہیں کروں گی۔" بندیا تھک ہار کر بیڈ پر ڈھے گئی تھی پھر اس نے سیل فون اٹھا کر ذی شاہ کا نمبر ڈائل کیا تھا۔ یقیناً وہ اکیلے بول بول کر تھک چکی تھی...... اور اپنی بھڑاس کے جواب میں کسی کی آواز سننا چاہتی تھی۔ ذی شاہ کا نمبر بند تھا، بندیا کا مزاج پھر برہم ہوگیا...... تھوڑی دیر بعد اس نے پھر سے ٹرائی کیا تھا...... اب کہ نمبر آن ہو چکا تھا مگر کال پک نہیں کی گئی تھی۔

"ذی بھائی! اللہ تمہیں پوچھے بندہ کبھی تو فون وقت پر سن لیتا ہے۔" بندیا زیرِ لب بڑ بڑا رہی تھی جب اس کا موبائل ایک دم بجنے لگا تھا۔ ذی شاہ کے بجائے ہاسٹل سے زرشام کی کال آ رہی تھی۔ اس نے جھٹ فون کان سے لگا لیا۔

"بندریا ڈیئر...... کیسی ہو؟" وہ اسے بندیا کے بجائے بندریا کہہ کر چھیڑتا تھا کچھ وہ تھی بھی بھوری سی، صاف رنگت، بھوری آنکھیں، بھورے بال، شامی اسے بندریا ہی کہا کرتا تھا...... اور وہ اس طرزِ تخاطب پر آگ بگولا ہو جاتی تھی۔ زرشام بھی اسے چھیڑنے سے باز نہیں آتا تھا۔ جیسا کہ اب بھی چھیڑ رہا تھا۔

"بکواس بند کرو...... میرا دماغ پہلے سے تپا ہوا ہے۔" بندیا دہاڑی تھی اور دہاڑنے کی وجہ سے اس کے گلے میں خراشیں پڑ گئی تھیں۔ اسے کھانستے سن کر زرشام چہک کر کہہ رہا تھا۔

"ہاؤ فنی...... تمہارے دماغ کب تپا ہوا نہیں ہوتا......" شامی کھلکھلا کر بولا تھا۔ دراصل ان دونوں بہن بھائی کی خوب چلتی تھی مگر مسئلہ یہ تھا کہ سال کے کئی مہینے شامی کو گھر سے باہر رہنا پڑتا تھا۔ سو یہ اپنی چونچیں فون پر لڑا لیتے تھے۔

"کوئی ڈھنگ کی بات ہے تو کرو مجھے ذی شاہ... بھائی سے کچھ ارجنٹ کہنا ہے۔" اس نے بہت بے چینی سے گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔ ذی شاہ ابھی تک گھر نہیں آیا تھا۔ اس کی بات سن کر دوسری طرف شامی فوراً ٹھٹک گیا تھا۔

"خیریت تو ہے ناں......؟" اس نے فکرمندی سے پوچھا...... ساری چونچالی وہ لمحوں میں بھول گیا تھا کیونکہ بندیا کی آواز خاصی سنجیدہ اور متفکر تھی۔ سو وہ پریشان کیوں نہ ہوتا۔

"خیریت کہاں ہے، عینی بھابی بھلا خیریت رہنے دے سکتی ہیں۔" اس نے جلے کٹے انداز میں عینی کی سازش سے شامی کو بھی آگاہ کر دیا تھا۔ اُدھر شامی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"یہ منگنی کا شوشا کس نے چھوڑا ہے؟ ذی تو جرمنی جا رہا ہے ناں میرا نہیں خیال وہ فی الحال اس جھنجٹ میں پڑے گا۔" شامی نے متفکر سے انداز میں اپنا خیال ظاہر کیا تھا تب بندیا نے بھرائی آواز میں کہا۔

"عینی بھابی ذی بھیا کی منگنی کروا کر ہی دم لیں گی۔ مجھے تمہاری سپورٹ چاہیے۔ میں اس منگنی کو نہیں ہونے دوں گی۔ ممی اور مالا تو کچھ بھی نہیں کریں گی جو کچھ کرنا ہے مجھے ہی کرنا ہے۔ تم ہی گھر آ جاؤ تو ہم کچھ نہ کچھ کر لیں گے۔" بندیا کی سوں سوں نے شامی کو بے قرار کر دیا تھا۔ وہ عینی کی سازشوں سے خوب واقف تھا۔ جس طرح ذیشان کو ورغلا کر زبردستی ان کی زندگیوں میں گھسی تھیں یہ سب کچھ ڈھکا چھپا تو نہیں تھا۔ ممی تو عینی کی تیزی طراری کے باعث انہیں بہو بنانا ہی نہیں چاہتی تھیں۔ یہ تو ذیشان کی ضد کے باعث بیل منڈھے چڑھی تھی۔ ذیشان نے بابنگِ دہل اعلان کر دیا تھا کہ وہ عینی کے علاوہ کسی اور سے شادی نہیں کرے گا۔ تب ڈیڈی کی اچانک وفات کا غم بھی تازہ تھا اور مالا کے دکھ بھی ہرے تھے، زخم بھرے نہیں تھے۔ ابھی تو بہن کو اُجڑے چھ ماہ بھی نہیں گزرے تھے جب عینی کے گھر والوں نے شادی کا دباؤ ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ بقول عینی کی ماما "مالا نے تو اب اسی روگ کے ساتھ عمر گزارنی ہے سو وہ اپنی بیٹی کو مالا کے زخم سلنے تک گھر

نہیں بٹھا سکتیں۔" ایسی تکلیف دہ باتیں سن سن کر اندر سے مرے ہوئے یہ لوگ عینی کو دلہن بنا کر گھر لے آئے تھے پھر عینی کوئی غیر بھی نہیں تھی ان کے اکلوتے ماموں کی بیٹی تھی۔ ممی نے دل پر پتھر رکھ کے ذیشان کی شادی کر دی حالانکہ لوگوں نے خوب باتیں بھی بنائی تھیں۔ ابھی تو ڈیڈی کا کفن بھی میلا نہیں ہوا تھا اور نہ مالا کی طرف سے ملنے والا گھاؤ ہلکا ہوا تھا جو شادیانے بھی بجانے شروع کر دیے تھے۔ تب ذی شاہ نے تو نہیں البتہ شامی نے سخت برہمی کا اظہار کیا تھا۔

"چند مہینے شادی اور بھی تو ڈلے ہو سکتی تھی۔ ابھی تو مالا اسپتال سے ڈسچارج بھی نہیں ہوئی۔" شامی کی خفگی بجا تھی۔ مالا کی نازک کنڈیشن کے پیشِ نظر اسے اسپتال ایڈمٹ کروا دیا گیا تھا۔ اس کو شدید ہیجانی دورے پڑنے لگے تھے پھر اس کا دوسری مرتبہ بھی نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا۔ مالا اسپتال میں ہی تھی جب نئی دلہن گھر بھی آ گئی۔ تب ذی شاہ پورا دن اسپتال میں مالا کے پاس رہا کرتا تھا ان دنوں عینی بھی گھر والوں کے دلوں میں جگہ پانے کے لیے بھاگ بھاگ کر اسپتال جایا کرتی تھی مگر یہ اخلاقی کارروائیاں محض دنوں پر ہی محیط تھیں...... پھر اس نے اپنے رنگ ڈھنگ دکھانے شروع کر دیے تھے یہ اور بات تھی کہ وہ ذیشان اور ذی شاہ کے سامنے کوئی اور ہی روپ لے کر آتی تھی۔ ان دونوں کے سامنے وہ خود کو بہت مظلوم و معصوم ثابت کیا کرتی تھی البتہ بندیا اور شامی اس کی ہر، ہر چالاکی سے واقف تھے۔ شامی ماں اور بہنوں سے ذی شاہ اور ذیشان کی نسبت زیادہ قریب تھا۔ ہاسٹل میں رہنے کے باوجود وہ بہن سے رابطے میں رہتا تھا جبکہ ذی شاہ بھی پہلے بورڈنگ میں رہنے اور پھر حصولِ تعلیم کی غرض سے زیادہ عرصہ گھر والوں سے دوری کے باعث اتنا قریب نہیں تھا۔ وہ زیادہ اپنے کام سے ہی تعلق رکھتا تھا اور محض سونے کے لیے آتا۔ ڈیڈی کے بعد وہ کچھ زیادہ ہی بزنس کو وقت دینے لگ گیا تھا۔ جب سے مالا صحت یاب ہو کر دوبارہ گھر آئی تھی اس کے بعد سے ذی شاہ نے دوبارہ آفس کی مصروفیات میں پناہ ڈھونڈ لی تھی مگر اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ مالا سے غافل ہو گیا ہے یا بندیا کی ضروریات سے نگاہ چرا گیا ہے۔ وہ پہلے سے بڑھ کر ممی اور بہنوں کا خیال رکھتا تھا بلکہ ذیشان سے بھی زیادہ ان پر توجہ دیتا تھا مگر... اسے گھریلو معاملات میں انوالو ہونا پسند نہیں تھا۔ اگر بندیا اور عینی کی لڑائی ہو رہی ہوتی تو وہ ان کی لڑائی پر دھیان نہیں دیتا تھا۔ ہر گھر میں نند بھاوج کی معمولی تکرار ہوتی ہے سو وہ ان کی لڑائیوں پر کیا غور و فکر کرتا، وہ جانتا تھا بندیا مزاج کی تیز ہے پر یہ نہیں جانتا تھا عینی بھی مزاج کی تیز ہے۔ اس کے سامنے تو وہ کوئی اور ہی کیئرنگ قسم کا روپ لے کر آتی تھی پھر صبح سے لے کر شام تک گھر سے باہر رہنے والے مردوں کو گھریلو سیاست کا بھلا کیا پتا ہو سکتا تھا۔

انہی حالات کے دوران ایک دن اچانک مالا کو لان کے الگ تھلگ اور تاریک گوشے میں بیٹھا دیکھ کر کچھ الگ قسم کی سوچیں ذی شاہ کے دل و دماغ کو جکڑ گئی تھیں۔ اس کی بہن اس وقت اکیس سال کی تھی۔ تین سال پہلے ڈیڈی نے اچانک اس کی شادی اپنے بھتیجے سے کر دی تھی۔ ان کے بھائی عرصہ دراز سے جرمنی میں مقیم تھے۔ ایک دن اچانک پاکستان لوٹ آئے۔ تب ذی شاہ کراچی میں تھا۔ ایک صبح ڈیڈی کی فون کال آئی تھی۔ وہ اپنے بھائی کے ہمراہ جرمنی جا رہے تھے اور ان کے ساتھ مالا نے بھی جرمنی جانا تھا۔ ذی شاہ، مالا کے جانے کا سن کر کچھ حیران تھا بھلا مالا کو ڈیڈی ساتھ کیوں لے جا رہے تھے...... تب مالا اٹھارہ، انیس سال کی معصوم بھولی بھالی سیدھی سادی لڑکی تھی۔ وہ ہوشیار، چالاک تو جرمنی میں چھ ماہ کے قیام کے بعد بھی نہیں ہوئی تھی۔ خیر مالا کے جرمنی

جانے کا سن کر ذی شاہ کو بہت حیرت ہوئی تھی مگر وہ ڈیڈی سے سوال جواب نہیں کر سکا تھا۔ ڈیڈی نے اسے خود ہی بتا دیا تھا۔ وہ مالا کی شادی کرنے جرمنی جا رہے تھے اور حسیب چاچو اپنی بہو لینے پاکستان آئے تھے۔ ڈیڈی کو بھلا وہ تینوں بھائی کیسے روکتے! ڈیڈی خود گھر کے سربراہ تھے، مالا کے باپ تھے اور اس کے لیے بہترین ہی سوچ سکتے تھے حالانکہ یہ عجیب سی شادی ذی شاہ کے اندر کہیں وسوسے ضرور جگا گئی تھی۔ اس کی معصوم سی، کچھ کچھ دبو، تھوڑی تھوڑی ڈرپوک بہن کو نکاح کے بعد ڈیڈی جرمنی چھوڑ کر خود پاکستان خوش باش لوٹ آئے تھے۔ تب ڈیڈی کی آنکھوں میں مسرت کے دیے روشن تھے۔ گویا وہ مالا کو محفوظ ہاتھوں میں تھما کر خود سرشار تھے اور ان کے چہرے پر ایسی چمک تھی جو ایک بیٹی کے باپ کو اپنی بیٹی کے مستقبل کو محفوظ دیکھ کر مسرور کیے رکھتی ہے۔ وہ اپنی بیٹی کی سسرال سے بھی خوب مطمئن تھے۔ چاچو کی جرمن بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ ایک بیٹا تھا، ایک بیٹی تھی البتہ ڈیڈی کے منہ سے چاچو کی بیٹی کا ذکر کم کم ہی سنا گیا تھا تاہم علی عیسیٰ کے تو ڈیڈی دیوانے بن کر آئے تھے۔ اس کی تعریفوں کے لیے انہیں الفاظ نہیں ملتے تھے۔ وہ ایسے چلتا ہے، وہ اتنا میٹھا بولتا ہے۔ وہ اتنا بااخلاق ہے۔ اس کا مزاج ایسا ہے۔ ڈیڈی کے لیے اپنے بھتیجے کی تعریفوں کے لیے وقت ہی وقت تھا۔ یقیناً حسیب چاچو پاکستان آئے ہی اس مقصد کے لیے تھے کچھ انہوں نے خود اپنے بیٹے کی تعریفیں کر کے ڈیڈی کو قائل کر رکھا تھا اور کچھ وہ خود اپنے داماد اور بھتیجے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آئے تھے۔ ڈیڈی کو یہاں آ کر رہ رہ کر افسوس ہوتا تھا کہ حسیب چاچو نے کیسے ہیرے سے بیٹے کو ان لوگوں سے دور کر رکھا تھا۔ ڈیڈی سے اتنی تعریفیں سن کر ذیشان نے مذاقاً کہا تھا۔

''ڈیڈی وہ صرف میٹھا بولتا، اخلاق جھاڑتا اور باتیں ہی مٹھارتا ہے اس کی شکل صورت کیسی ہے؟ کم از کم ایک آدھ تصویر ہی لے آتے۔'' ذیشان نے کافی عقلمندانہ سوال اٹھایا تھا۔ دراصل اپنے بہنوئی کی تصویر تو وہ بھی دیکھنا چاہتا تھا مگر ڈیڈی اتنی شاندار شادی کی تصویروں والے البمز اور مووی ادھر ہی بھول آئے تھے۔ ڈیڈی نے بتایا تھا چاچو نے اپنے اکلوتے بیٹے کی بہت دھوم دھام سے شادی کی تھی۔ پورے من ہائیم کی ہائی جنٹری کو بلوایا تھا۔ بہت شاندار ولیمہ کیا تھا مگر ان خوب صورت لمحات کی فوٹو والا بیگ وہ اُدھر ہی بھول آئے تھے پھر اس کے بعد بھی جب جب بندیا کی مالا سے فون پر بات ہوتی تھی۔ وہ علی عیسیٰ کی تصویروں کے لیے اصرار کرتی۔ اُدھر مالا حامی بھی بھر لیتی تھی مگر اسے پھر یہ چھوٹا سا کام یاد ہی نہیں رہتا تھا۔ وہ اپنی زندگی میں بہت خوش اور بہت مگن تھی۔ ممی کے توسط سے مالا کی خوشحال زندگی کا اور اس کے سکھی شاد ہونے کا پتا چلتا رہتا تھا۔ ایک بھائی ہونے کے ناتے مالا کی بھرپور زندگی کا سن کر اس کا دل خوشی کے احساس سے معمور تھا۔ اس کی چھوٹی سی بہن اپنے گھر میں بہت خوش تھی۔ کبھی کبھار ذی شاہ سے بھی مالا کی بات ہو جاتی تھی۔ اس نے ہمیشہ مالا کو خوش اور مسرور ہی محسوس کیا تھا۔ وہ کھلکھلاتے لہجے میں بات کرتی تھی۔ بولتی بعد میں تھی پہلے ہنستی تھی پھر اس ہنستی مسکراتی مالا کو اچانک جانے کیا ہو گیا تھا۔ صرف چھ ماہ بعد ذی شاہ نے اسے اجڑی حالت میں حال سے بے حال دیکھا تھا۔ یوں کہ وہ کسی سے کلام نہیں کر رہی تھی۔ تاہم اس نے ایک بھیانک رات کا ذکر ضرور کیا تھا۔ اس بھیانک رات کیا ہوا تھا؟ یہ سب مالا نے نہیں بتایا تھا۔ وہ بہت کچھ بتائے بغیر خاموشی کی بکل مارے سر نیہوڑائے رہتی۔ پچھلے تین سال سے وہ لوگ مالا کی خاموشی کے ساتھ سمجھوتا کر رہے تھے مگر اب ذی شاہ کے ضبط کی طنابیں چھوٹ گئی تھیں۔ اسے اپنی بہن کی خوشیاں دوبارہ واپس لانی تھیں۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ لانی تھی۔ اسے پھر سے شاد و آباد دیکھنا تھا مگر اس سے بھی پہلے ذی شاہ کو اس بھیانک رات کی کھوج کے لیے نکلنا تھا۔ آخر اس رات کیا ہوا تھا؟ علی عیسیٰ اور مالا کے درمیان آخر کیا ہوا تھا جو اُن کا ہنستا بستا گھر ٹوٹ گیا تھا۔ مالا کس طرح لٹی پٹی واپس آئی تھی؟ اس کی بہن کے ساتھ آخر علی عیسیٰ نے کیا، کیا تھا وہ ہنسنا بھول گئی تھی۔ وہ بولنا بھول گئی تھی۔ اس کی پیاری سی بہن زندگی جینے کا قرینہ بھول گئی تھی۔

ذی شاہ کو ایک پُل صراط سے گزرنا تھا۔ اسے اپنے اور اپنی بہن کے مجرم تک پہنچنا تھا۔ اسے مالا کی خوشیاں دوبارہ لے کر آنی تھیں اور اس کے لیے وہ ہر آزمائش اور ہر حد سے گزر سکتا تھا۔

پہلی مرتبہ ذی شاہ کو احساس ہوا تھا کہ مالا کی خاموشی کے ساتھ سمجھوتا کر کے وہ لوگ اس کے ساتھ کچھ ٹھیک نہیں کر رہے۔ وہ محفلوں سے دور تو رہتی تھی اپنے بہن بھائیوں سے بھی دور رہنے لگی تھی۔ ایک الگ تھلگ کونے میں، ایک تنہا گوشے میں نم آنکھیں لیے جانے کس کس تکلیف دہ منظر کو سوچتی رہتی تھی۔ تب پہلی مرتبہ ذی شاہ کے دل کو گہری ٹھیس پہنچی تھی پھر یہ ٹیس وقتاً فوقتاً اٹھتی رہتی۔ مالا کو دیکھ کر اس کا دل کرب کی اتھاہ میں گرنے لگتا تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا وہ لوگ مالا کے دکھ کی تہہ کو کھوج ہی نہیں سکتے۔ اس کے غم کا بار اٹھا ہی نہیں سکتے۔ اس کے کرب کے ذائقے کو چکھ ہی نہیں سکتے۔ جو مالا اذیت محسوس کرتی تھی اس اذیت کو سمجھنا آسان کہاں تھا۔

☆☆☆

عینی کی سالگرہ والے دن جب اس کے میکے سے سب افراد آئے تھے۔ ذیشان کے کچھ دوست اور ان کی فیملیز بھی تھیں۔ خاندان کے کچھ لوگ بھی مدعو تھے۔ اس دن بڑا رومینٹک ماحول تھا۔ لان میں باربی کیو کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ دھیما دھیما میوزک ماحول کو سحر انگیز کر رہا تھا پھر تالیوں کی گونج میں عینی نے کیک کاٹا۔ شیفون کی سرخ ساڑی میں اس کا بجلیاں گراتا حُسن ذیشان کو کتنا گھائل کر رہا تھا۔ یہ تو ساری محفل کے لوگ جانتے تھے۔ اتنے پُرفسوں ماحول میں آنیہ کی دلنشین مسکراہٹوں کو نظرانداز کرتا وہ جانے کیوں اتنا بے کل ہو رہا تھا۔ تب اچانک ہی اس کا جی اچاٹ ہو گیا۔ طبیعت پر بیزاری چھا گئی تھی۔ دل میں اتنی اداسی ایک دم پھیلی تھی کہ ذی شاہ کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس ہنگامے سے کہیں دور بھاگ کر چلا جائے۔ آنیہ کی مسکراہٹوں سے لے کر محفل کی دلکشی تک وہ سرتاپا ...بیزاریت میں لپٹ گیا تھا۔ تبھی کزنز کے جھرمٹ سے نکل کر وہ اندرونی حصے کی طرف آیا تو اس کے پیچھے ہی عینی بھاگتی ہوئی چلی آئی۔

''تم کیوں چلے آئے ہو، طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟'' وہ متفکری برابر اُسے دیکھے جا رہی تھی۔ اسے ذی شاہ کا اتنی بھرپور محفل کو چھوڑ... کر آنا پسند نہیں آیا تھا۔ عینی متفکر تھی کہ جانے ذی شاہ کو کون سی بات بری لگی ہے۔ وہ اس کے اُدھر آنے کی وجہ معلوم کرنا چاہ رہی تھی۔ دراصل اسے ماما اور آنیہ نے بھیجا تھا۔ وہ دونوں بھی ذی شاہ کے اچانک اٹھ آنے پر متفکر تھیں۔ خصوصاً آنیہ کو تو اپنی تمام تر تیاری بیکار محسوس ہو رہی تھی۔ جس کے لیے وہ بن سنور کر آئی تھی وہ اٹھ کر گھر کے اندرونی حصے میں گھس گیا تھا۔ عینی کو تسلی دیتا وہ سر درد کا بہانہ کر کے سیڑھیاں چڑھ رہا تھا جب عینی کی متفکر آواز ایک مرتبہ پھر اس کے پیچھے آئی۔

''تم آرام کرو ذی، میں تمہارے لیے کڑک سی چائے بھجواتی ہوں۔'' عینی اپنا اخلاق اس پر نچھاور کرتی چلی گئی۔ تب ذی شاہ سر جھٹکتا کاریڈور میں سے گزر رہا تھا جب آخری سرے پر موجود جالی والے دروازے کے اس پار اسے زرشام اور بندیا کی آواز سنائی دی تھی۔ وہ دونوں نیچے محفل میں بھی نہیں تھے۔ دراصل یہی ایک بے کلی تھی جسے محفل میں محسوس کرتا وہ

اچانک اٹھ آیا تھا۔ اس کے بہن بھائی وہاں موجود نہیں تھے سوائے محفل میں جان اور رنگ نظر نہیں آرہا تھا۔ بس ممی وہاں مارے باندھے بیٹھی ہوئی تھیں۔

وہ کچھ سوچتا ہوا جالی کا دروازہ کھول کر ٹیرس پر نکل آیا تھا۔ تب اسے دیکھ کر بندیا اور شامی کچھ متحیر رہ گئے تھے۔

''تم یہاں......؟'' یقیناً وہ دونوں بھی حیران تھے کہ ذی شاہ اتنی بھرپور محفل کیسے اور کس طرح چھوڑ آیا تھا۔ ان کی حیرت بجا تھی۔ ذی شاہ کو تو جانِ محفل سمجھا جاتا تھا۔ اس قسم کی پارٹیز کے پلان ذی شاہ کے لیے تو بنائے جاتے تھے۔ وہ کوئی بھی پارٹی، فنکشن چھوڑتا ہی کہاں تھا پھر اس وقت اپنے ہی گھریلو فنکشن کو چھوڑ کر اس کا اوپر آنا دونوں کو حیران کر گیا تھا۔

''ہاں میں یہاں...... کیا میں تم لوگوں کے پاس نہیں آسکتا؟ یہاں بیٹھ نہیں سکتا؟'' اس کی نظریں گم صم بیٹھی مالا کے ویران چہرے پر جمی تھیں جو دنیا بھلائے ریلنگ کی درزوں میں سے کھلکھلاتی عینی کو دیکھ رہی تھی جو ذیشان کے کندھے پر جھکی جانے اس کے کان میں کیا کہنا چاہ رہی تھی۔ اس نے اپنے اندر ٹیس سی اٹھتی محسوس کی تھی۔ اس نے مالا کے چہرے پر حسرت جھلکتی دیکھی تھی۔ اس نے مالا کے چہرے پر عجیب سا کرب دیکھا تھا گویا لان کا منظر اسے ماضی کا کوئی حسین لمحہ یاد دلا گیا تھا۔ مالا کو دیکھ کر ان دنوں اس پر یاسیت کے دورے پڑتے لگے تھے۔ ذی شاہ کو دنیا کی ہر خوب صورتی اپنی بہن کے کرب میں ڈوبی نظر آتی تھی۔ اسے لگتا تھا، مالا کا غم اسے پگھلا کر رکھ دے گا۔ شاید یہی بے کلی، اذیت اور بے چینی تھی جو اسے اٹھا کر اپنے بہن بھائیوں کے درمیان لے آئی تھی۔ وہ اپنے بھائی اور دونوں بہنوں کو مس کر رہا تھا اور مالا کی یہی نظریں لان میں بھی اسے مضطرب کر رہی تھیں۔

اس کی نظروں کا ارتکاز بھی مالا کو اس کی طرف متوجہ نہیں کر پایا تھا۔ تب ذی شاہ کے اندر نہ جانے کیسا سکوت اتر آیا تھا۔ اسی سکوت اور اضطراب کو جھٹکتے ہوئے اس نے شامی کو مخاطب کیا تھا۔

''تم نیچے کیوں نہیں آئے؟'' وہ مالا کے برابر بیٹھ گیا تھا اور اس کی نظریں بھی مالا کے چہرے پر تھیں جو ابھی تک لان کے اسی جگمگاتے گوشے پر نگاہ جمائے بیٹھی تھی جسے تابناکی عینی کے حسن نے بخش رکھی تھی۔ ذی شاہ کے دل کو کچھ ہونے لگا تھا۔ اس کی چھوٹی سی بہن جانے کس کس اذیت سے صبح شام گزر رہی تھی۔ وہ جو مالا کے بارے میں مسلسل سوچ رہا تھا شامی کے کٹیلے سے لہجے پر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''میں خود غرض لوگوں کی محفلوں کو پسند نہیں کرتا۔'' شامی بہت زہریلے لہجے میں بول رہا تھا۔ یقیناً بندیا نے اسے عینی اور اپنی تمام تر جھڑپوں کے بارے بتا دیا تھا۔ وہ بندیا کے ساتھ بیٹھ کر گھریلو سیاست پر روشنی ڈال لینے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتا تھا۔ ابھی اس کے پاس وقت تھا۔ وہ ممی اور بندیا کو بہت ٹائم دیتا تھا مگر چند ماہ تک اس کے فائنل ایگزامز ہونے والے تھے۔ بعد میں اسے عملی زندگی میں قدم رکھنا تھا پھر وہ بھی ذیشان اور... ذی شاہ کی طرح مصروف ہو جانے والا تھا اور اس کی مصروفیت کے ساتھ ہی وقت کی قلت کا مسئلہ شروع ہو جانا تھا پھر وہ اپنی بہنوں کے لیے وقت نکال نہیں پائے گا۔ یہ بات شامی نہیں جانتا تھا مگر ذی شاہ اچھی طرح سے جانتا تھا۔ بندیا کو پھر شامی سے بھی بہت شکوے ہو سکتے تھے مگر بندیا کے لیے کڑھنے جلنے کے علاوہ اور بھی مصروفیات تھیں۔ ایک آدھ سال تک اس کی شادی ہو جاتی۔ اس کے بعد مالا کتنی تنہا ہو سکتی تھی، ابھی تو بندیا اسے گھسیٹ کر باہر لے آتی تھی مگر پھر بھلا مالا کا کون خیال رکھتا۔ کون اسے باہر گھسیٹ کر لاتا، کون اسے توجہ دیتا؟

ان تمام سوچوں نے ذی شاہ کو کتنا بے کل کر دیا تھا.

اس نے اپنی تمام تر مصروفیات پس پشت ڈال دی تھیں۔ دراصل ڈیڈی کے بعد اس پر دُہری ذمے داریاں آپڑی تھیں۔ اسے گھر اور آفس دونوں کو توجہ دینا ان کے ڈیڈی ذوالفقار احمد کا ذاتی بزنس تھا۔ ان کا شمار اچھے سرمایہ داروں میں ہوتا تھا اور انہوں نے اپنی محنت کے بل بوتے پر اپنی فرم کی ایک اچھی ساکھ بنائی تھی۔

ڈیڈی اور چاچو بس دو ہی بھائی تھے۔ حسیب احمد تعلیم کی غرض سے جرمنی گئے تھے پھر عمر بھر کے لیے وہیں رہ گئے۔ انہوں نے شادی بھی وہیں کی پھر بائیس تئیس سال تک واپس پلٹنے کا نام نہیں لیا تھا۔ حسیب احمد کے صرف دو ہی بچے تھے جنہیں محض نام کی حد تک یہ لوگ جانتے تھے۔ علی عیسیٰ اور اس سے چھوٹی موِن۔ اکثر ڈیڈی ہی ان کا ذکر کیا کرتے تھے۔ انہیں علی عیسیٰ سے خصوصی محبت ہو گئی تھی۔

ذوالفقار احمد پر اولاد اور دولت کے حوالے سے قدرت بہت مہربان رہی تھی۔ اللہ نے انہیں پانچ بچوں سے نوازا تھا۔ ذیشان، ذی شاہ اور زرشام کے بعد مالا اور بندیا تھیں۔ ان کے بچے بہت لائق، ذہین اور خوب صورت تھے۔ تعلیم کے میدان میں ہمیشہ آگے آگے رہے۔ اپنی اولاد میں انہیں سب سے زیادہ ذی شاہ اور مالا سے محبت تھی۔ ذی شاہ تو زیادہ تر بورڈنگ میں رہا تھا تاہم مالا ان کے بہت قریب تھی۔ اسے پڑھنے کا بہت شوق تھا اور ماں نے اسے گھریلو امور میں بھی طاق کر رکھا تھا۔ وہ بہت سلجھی ہوئی، نرم مزاج، موم میں ڈھلی لڑکی تھی۔ تبھی جب باپ نے اپنے بھتیجے سے رشتہ طے کر دیا تو چپکے چپکے باپ کے بن دیکھے بھتیجے سے عشق کرنے لگی۔ اس نے علی عیسیٰ کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی نہ باپ کے فیصلے پر اعتراض کرنے کی۔ باپ نے جیسا کہا جو کہا اس پر سر جھکا دیا۔ انٹر سے پہلے اس کی شادی کر دی گئی تھی اور وہ اپنی زندگی کے اس حسین موڑ پر

غزل

قصہ ابھی حجاب سے آگے نہیں بڑھا
میں آپ، وہ جناب سے آگے نہیں بڑھا
مدت ہوئی کتابِ محبت شروع کیے
لیکن میں پہلے باب سے آگے نہیں بڑھا
لمبی مسافتیں ہیں مگر اس سوار کا
پاؤں ابھی رکاب سے آگے نہیں بڑھا
لوگوں نے سنگ و خشت کے قلعے بنا لیے
اپنا محل تو خواب سے آگے نہیں بڑھا
طولِ کلام کے لیے میں نے کیے سوال بہت
وہ مختصر جواب سے آگے نہیں بڑھا

مرسلہ: لاریب، ماہ زیب، چونیاں ضلع قصور

پوری طرح خوش بھی نہیں ہوئی تھی جب زندگی نے اس کے ساتھ اتنا بھیانک مذاق کر دیا۔

دراصل مالا کے اجڑنے کی خبر نے سب سے زیادہ ذی شاہ کو شاکڈ کیا تھا۔ ابھی وہ مالا کے دکھ پر ہی متحیر تھا جب اچانک ڈیڈی بھی چل بسے تھے مگر ڈیڈی کے مرنے اور مالا کے اجڑنے سے پہلے جرمنی میں مقیم ان کے اکلوتے چاچو بھی تو فوت ہو گئے تھے۔ اگر ذی شاہ زیادہ غور کرتا تو اسے لگتا کہ چاچو کی وفات کے فوراً بعد مالا کی زندگی طوفان اور آندھیوں کی زد میں چلی گئی تھی۔ جب تک چاچو زندہ رہے تھے تب تک سب کچھ ٹھیک تھا تو پھر جو کچھ بھی ہوا تھا چاچو کی وفات کے بعد ہوا تھا اور علی عیسیٰ ان لوگوں کے اصرار پر بھی چاچو کی ڈیڈ باڈی پاکستان نہیں لے کر آیا تھا۔ بقول اس کے پاپا کی وصیت تھی ان کو مما کے ساتھ دفنایا جائے۔ یہ بات اس نے ڈیڈی کو فون پر بتائی تھی۔ علی عیسیٰ سے ان لوگوں کی تو کبھی فون پر بھی بات نہیں ہو سکی تھی۔ وہ اکثر ڈیڈی کو کال کیا کرتا

تھا۔ چاچو کی فوتگی اور تدفین کا بتانے کے بعد پھر علی عیسیٰ کی کوئی اور کال نہیں آئی تھی۔ مالا بتاتی تھی وہ بہت اپ سیٹ ہے۔ چاچو کی موت کے صدمے کو بُھلا نہیں پا رہا۔ مالا سے باقاعدگی کے ساتھ ممی اور بندیا کی بات ہوا کرتی تھی۔ وہ علی عیسیٰ کے لیے بہت پریشان تھی۔

پھر کچھ ہی مہینے گزرے تھے کہ مالا اجڑ کر واپس وطن لوٹ آئی۔ یہ صدمہ بہت اذیت ناک تھا۔ مالا کے اجڑنے کا دکھ ایک طرف...... ڈیڈی اس غم کے بوجھ تلے دب کر ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے انہیں چھوڑ گئے تھے۔ مالا بیمار تھی، ممی بجھ کر رہ گئی تھیں۔ بندیا پہلے سے زیادہ تلخ ہو گئی تھی۔ زرشام کم کم گھر آنے لگا تھا گھر کا سوگوار ماحول ذی شاہ کے اندر بھی حبس بھر دیتا تھا۔ سو اس نے بھی مصروفیات میں پناہ ڈھونڈ لی تھی اور وہ بے چاری بے بس سی سر جھکا کر آنسو بہانے لگتی۔ وہ آنسو بہانے کے علاوہ کچھ اور کر بھی تو نہیں سکتی تھی جبکہ ذی شاہ کو اب مالا کے آنسو ہی تو خشک کرنے تھے۔ اس کے چہرے پر پھیلی بے بسی کو ختم کرنا تھا۔ مالا کے چہرے پر مسکراہٹ سجانا تھی اور اس.. کام کے سلسلے میں وہ کچھ عملی قسم کے اقدام کرنے والا تھا۔

اس نے اپنے دن بھر کے شیڈول میں کچھ خاص اوقات مقرر کر لیے تھے۔ اسے ان اوقات میں مالا کو بھرپور وقت دینا تھا۔ اسے گھمانے لے جانا، ہوٹلنگ، شاپنگ اور کچھ ہلا گلا...... وہ اس کی زندگی پر چھائے جمود کو توڑنے کا بھرپور ارادہ رکھتا تھا۔ مگر فی الحال اسے شامی اور بندیا کی بدگمانی دور کرنا تھی جو یقیناً اسے بھی ذیشان کی طرح کچھ کچھ... خودغرض سمجھتے تھے۔ فی الوقت کچھ تلخ سوچوں کو جھٹک کر وہ شامی اور بندیا کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

"تم ذیشان سے اتنے بدگمان کیوں ہو......؟" اس نے براہِ راست شامی کو مخاطب کیا تھا جو نیچے سے منگوائے گئے تکے کباب مالا کو پکڑاتا گھوم کر ذی شاہ کی طرف دیکھنے لگا تھا پھر اس کی بات سمجھ کر استہزائیہ انداز میں بولا۔

"اس لیے کہ ذیشان انتہائی سیلفش ہے، ہمیشہ اپنے بارے میں سوچتا ہے، اسے ماں اور بہنوں کی کوئی فکر نہیں۔" شامی کی آواز میں ذرا غصہ اور عجیب سا دکھ بھی ہلکورے لے رہا تھا۔ بندیا بھی سر جھکائے یقیناً شامی کے بولے گئے الفاظ کی تائید کر رہی تھی۔ وہ کچھ دیر کے لیے ان دونوں کو بغور دیکھتا رہا تھا پھر سر جھٹک کر شامی کی بات کا جواب دینے لگا۔

"ذیشان سیلفش کیسے ہے......؟ اگر وہ.. خودغرض ہے تو مجھے کیوں نہیں لگتا۔" اس کے جواب میں بھی ایک سوال تھا اور ذی شاہ کا سوال خاصا تیکھا تھا۔ تبھی شامی بھی قدرے چبھتے لہجے میں ذرا بھڑک کر کہنے لگا۔

"تم ذیشان کے ہاتھ نہیں لگے ابھی...... دراصل اس میں ذیشان کا بھی قصور نہیں...... ماموں کی ساری فیملی کا اس پر اثر ہے اور چونکہ ماموں کی فیملی پر خودغرضی ختم ہے سو ذیشان پر بھی ان کا اثر پڑ چکا ہے اور ویسے بھی اپنی خوب صورت بیوی کے ناز اٹھانے کے ساتھ ساتھ اسے عینی بھابی کی زبان میں گفتگو کرنا پسند ہے اور عنقریب تمہیں بھی ذیشان کے ہاتھ لگنے والے ہیں۔ تبھی کہہ رہا ہوں، ذرا بچ کر رہنا۔" شامی کا انداز آخر میں معنی خیز ہو گیا تھا۔ تب ہی ذی شاہ کچھ الجھ گیا۔ اس کی پوری بات سمجھ لینے کے باوجود شامی کے آخری الفاظ اسے کچھ ٹھٹکا گئے تھے۔

"میں بچ کر رہوں؟ مگر کیوں......؟ ذیشان کے کیا ارادے ہیں کہ جن سے میں بے خبر ہوں؟" ذی شاہ نے حیرت سے پوچھا۔ وہ سیخ کباب کی پلیٹ واپس رکھ کے کچھ سنجیدہ ہو گیا تھا۔ اسے شامی کے معنی خیز انداز چونکا رہے تھے۔ اسی طرح بندیا بھی کچھ کچھ بے چین بیٹھی تھی گویا ذی شاہ

سے اسی موضوع پر بات کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

"وہ تمہاری منگنی اپنی سالی سے کروانا چاہتا ہے اور تم ایسے انجان ہو گویا کچھ اتا پتا نہیں۔" شامی نے کلس کر ٹکڑا لگایا تھا۔ وہ اپنے اندر کی کھولن نکال رہا تھا۔ یقیناً ذیشان کے اس خیال اور سوچ نے بندیا اور شامی دونوں کو تپا رکھا تھا...... اور وہ دونوں ہی... ذی شاہ سے اپنی کھولن بیان کرنا چاہتے تھے۔

"ارے...... کیا سچ......؟" ان کی توقع کے عین مطابق ذی شاہ کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔ گویا ذیشان کے نیک ارادوں کی بھنک ابھی تک اس کے کانوں میں نہیں پڑی تھی۔

"لو جی...... یہاں تو کمال کی بے خبری ہے۔" شامی کلس کر پہلو بدل گیا۔ اب کہ بندیا بھی لب کشائی کیے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

"عینی بھابی کی بھرپور کوشش ہے وہ آنیہ کو ہمارے سروں پر ضرور مسلط کر کے رہیں گی۔" اس کو اپنے دکھ یاد آ رہے تھے۔ وہ جانتی تھی عینی بھابی کی کوششیں اگر رنگ لے آئیں تو اس گھر میں سانس لینا بھی محال ہو جائے گا۔ وہ دونوں ذی شاہ کو نہ صرف خبردار کرنا چاہتے تھے بلکہ اسے آنیہ سے منگنی رکوانے پر مجبور بھی کرنا چاہتے تھے۔

"یہ بھلا ممکن ہے، آنیہ کے بارے میں ایسا ہرگز میں نے کبھی نہیں سوچا......" ذی شاہ کے الفاظ جہاں شامی اور بندیا کو مطمئن کر چکے تھے وہیں اندر کی کچھ کچھ بے چینی انہیں مزید بولنے پر بھی اکسا رہی تھی۔

"تم نہ بھی سوچو تو عینی بھابی زبردستی تمہیں آنیہ کو سوچنے اور آنیہ کے لیے سوچنے پر مجبور کر دیں گی۔" شامی نے جل بھن کر کہا تھا۔ وہ جو کچھ اسے سمجھانا یا بتانا چاہتے تھے، بتا چکے تھے۔ ذی شاہ کو الرٹ تو کر دیا گیا تھا اب وہ خود ہی اپنی جنگ لڑ سکتا تھا اور ان دونوں کے اطمینان کے لیے یہی کافی تھا کہ ذی شاہ کے دل میں آنیہ کے لیے کوئی جذبہ نہیں تھا۔

"عینی کی ایسی مجال، میری مرضی کے بغیر کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔" ذی شاہ نے غصے سے کہا تھا فی الحال تو وہ اپنے بارے میں ایسا کچھ سوچنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا...... اسے سب سے پہلے مالا کے لیے سوچنا تھا پھر بندیا کی شادی کے بعد ہی وہ اپنے لیے کوئی فیصلہ کر سکتا تھا۔ اس سے پہلے اپنی زندگی کے لیے وہ قطعاً کسی خوشگواریت کے متعلق نہیں سوچ سکتا تھا۔

"اب اپنی باتوں اور لفظوں کی لاج رکھ لینا۔ یہ نہ ہو ذیشان تمہیں مجبور کرے اور تم سہرا سجانے پر تیار ہو جاؤ۔" شامی نے ذرا متفکر لب و لہجے میں یقین دہانی چاہی تھی۔ وہ اپنے خدشات ڈھکے چھپے لفظوں میں ذی شاہ پر ظاہر کر چکا تھا۔ تب ذی شاہ نے خاصی ناگواری بھرے ٹھوس لہجے میں وضاحت کی تھی۔

"میں تو نادان سا بچہ ہوں ناں...... ذیشان میرے ہاتھ میں لولی پاپ پکڑا کر اپنی مرضی سے مجھے استعمال کر لے گا جیسے......" وہ چڑ کر خفگی سے بولا تھا تب بندیا اور شامی کے دلوں میں ڈھیروں چین اتر آیا...... وہ ذی شاہ سے ایسی ہی دلیری کی امید رکھتے تھے...... اب چونکہ ان دونوں کی تسلی ہو چکی تھی سو وہ دونوں چین کی بانسری بجا سکتے تھے۔

"مجھے تم سے ایسی ہی بہادری کی امید تھی......" شامی اس کا کندھا تھپک کر دلار سے بولا۔

"میں سرحد پر لڑنے جا رہا ہوں کیا......؟" اس کی بات سمجھ کر ذی شاہ ذرا مسکرا کر ماحول کا تناؤ کم کر رہا تھا مگر ساتھ ساتھ اسے ذیشان کی سوچ پر سخت تاؤ آ رہا تھا۔ وہ بالا ہی بالا اس کی مرضی، پسند اور خواہش جانے بغیر کیسے اس کی زندگی کا فیصلہ اپنے ہاتھ میں لے سکتا تھا...... اگرچہ آنیہ خوب صورت تھی، اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی مگر اس کا یہ مطلب نہیں تھا ذی شاہ اس سے بغیر اپنی ممی کی مرضی جانے منگنی یا شادی کر لیتا...... اسے شادی تو کرنا تھی مگر آنیہ سے ہرگز نہیں...... وہ لاکھ گھر کے معاملات سے بے نیاز رہتا

تھا مگر وہ اتنا ضرور جانتا تھا عینی اچھی بیوی ہونے کے ساتھ ساتھ نہ اچھی بہو ہے نہ بھابی ہے۔ اس کی بہنوں کے ساتھ تو عینی کا رویہ بہت ہتک آمیز ہوتا تھا۔ ممی یا بندیا اسے کچھ نہیں بتاتی تھیں اس کے باوجود وہ عینی کے مزاج کو سمجھ گیا تھا پھر عینی کی بہن کو بھلا اس گھر میں کیسے لے آتا؟ ویسے بھی وہ مالا اور بندیا کے بارے میں بہت حساس ہو رہا تھا اور ان دونوں سے پہلے اپنی زندگی کا کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''ذیشان اور عینی بھابی سے ٹکر لینا آسان نہیں...... سمجھو تو اس گھر میں نیا محاذ کھلنے والا ہے۔'' شامی نے معنی خیزی سے آنکھیں پٹپٹائی تھیں۔ تب ذی شاہ نے چھوٹے بھائی کو بھرپور تسلی دینے والے انداز میں مسکرا کر بڑے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا تھا۔

''اور مجھے محاذوں پر لڑنا اور فتح پانا آتا ہے، تم بالکل فکر نہ کرو، میں عینی بھابی جیسی ایک خوب صورت بلا کو اپنی پیاری بہنوں کے سروں پر مسلط ہرگز نہیں کروں گا۔'' اس نے شرارتی انداز میں بندیا کو چھیڑا تھا۔ وہ دونوں ہی کچھ جھینپ کر ہنس پڑے تھے، ذی شاہ .... قدرے پرسکون ہوگیا تھا۔ وہ اپنے بھائی اور بہن کے دل سے بدگمانی کو دور کر چکا تھا۔ وہ انہیں یقین دلا چکا تھا کہ وہ ذیشان کی طرح خود غرض نہیں...... نہ وہ کبھی انہیں چھوڑنے کی کوشش کرے گا۔ اس خوب صورت تاروں سے ڈھکی رات میں ان تینوں کے درمیان اعتماد، اعتبار اور خلوص کی اک نئی فضا قائم ہوئی تھی۔ وہ ایک دوسرے سے اب بالکل کھل کر ہر بات ڈسکس کرنے لگے تھے۔ مالا کی تکلیف اور دکھوں سے لے کر عینی کی سازشوں تک ایک، ایک بات تینوں کے درمیان شیئر ہونے لگی تھی۔ مالا چونکہ ان باتوں میں حصہ نہیں لیتی تھی تاہم ذی شاہ زبردستی اسے کھینچ گھسیٹ کر باہر لے آتا تھا۔ بندیا کو بھرپور تسلی مل چکی تھی۔ اب آنیہ نام کا عفریت ان کو چمٹنے والا نہیں تھا...... مگر وہ لوگ یہ نہیں جانتے تھے۔ ذی شاہ کا انکار کس طرح ان کے گھر کی دیواروں کو ہلا گیا تھا۔ رشتوں میں کتنی بڑی بڑی بدنما دراڑیں پڑ گئی تھیں تاہم ذی شاہ اپنے فیصلے سے ایک انچ بھی نہیں ہٹا تھا۔ وہ ثابت قدم مضبوط اور مستحکم رہا تھا۔ وہ ذیشان کی بے جا ضد کے سامنے جھکا ہرگز نہیں تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ اسے رشتوں کی قربانیاں ضرور دینی پڑی تھیں۔

☆☆☆

ان دنوں وہ آفس سے جلدی اٹھ آتا تھا۔ اس کا زیادہ وقت مالا کے ساتھ گزرتا تھا۔ وہ مالا کو بہت ٹائم دینے کی کوشش کرتا تھا۔ مالا کے لیے رنگ رنگ کے رسائل لے آتا۔ خوب صورت میگزین اور اخباروں کے ڈھیر لگا دیتا۔ اسے باقاعدگی سے واک پر لے جاتا۔ کبھی لانگ ڈرائیو کا پروگرام بنا لیتا...... کبھی شاپنگ کا اور کبھی بلاوجہ ہی سڑکوں پر نکل جاتا۔ اکثر بندیا بھی ان کے ہمراہ جاتی تھی۔ وہ بھی ان دنوں بھائی کی توجہ پا کر بہت خوش تھی اور ممی ان کو خوش دیکھ کر خوش ہوتی رہتی تھیں۔

ذی شاہ کی یہ نئی روٹین عینی کے لیے سخت تکلیف دہ تھی۔ وہ اس سے بات کرنے کی کوشش کرتی تو ذی شاہ مصروفیت کا بہانہ بنا دیتا۔ اسے مالا کے ناز اٹھانے سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ عینی کو یہ صورتِ حال دیکھ کر خفقان ہونے لگا تھا مگر وہ ... ذی شاہ کو روک بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ اپنی بہنوں کے ساتھ وقت گزارتا تھا عینی اسے کس بل بوتے پر روکتی یا منع کرتی؟ پھر وہ اس کے کہنے میں آنے والا بھی نہیں تھا۔ ان دنوں عینی سے خاصا اکھڑا اکھڑا رہتا تھا۔ یہ حالات عینی کے لیے خاصے تشویش ناک تھے۔ وہ کسی نہ کسی طریقے سے ذی شاہ کے گرد پرانا حصار قائم کرنا چاہتی تھی اور خوش قسمتی سے اسے موقع بھی مل گیا۔ اس دن بھی صبح، صبح وہ میز پر ذی شاہ کے لیے ناشتا سجا کر بڑی لگاوٹ سے بولی تھی۔

''ذی! مجھے ماما کی طرف تو لے جاؤ، بہت دن سے چکر نہیں لگا۔'' وہ ملک شیک کا جگ اس کے سامنے رکھ کر بڑی مصروف نظر آرہی تھی۔ گویا اس گھر کے ڈھیروں کاموں میں الجھ کر اسے میکے جانے کا وقت نہیں مل پاتا تھا۔ اور آج اس نے بڑی مشکلوں سے وقت نکالا تھا۔ بظاہر وہ کچھ ایسا ہی جتانے پر تلی ہوئی تھی مگر چونکہ غیر محسوس انداز میں عینی کی اصلیت اس پر کھل چکی تھی سو اب وہ اس کی شیریں بیانی کے جال میں نہیں پھنس سکتا تھا۔

''آئی ایم سوری...... عینی بھابی...... ! آپ ذیشان کے ساتھ ہی چلی جائیں...... میرے پاس اتنا وقت نہیں...... میں آل ریڈی لیٹ ہو چکا ہوں۔ مائنڈ مت کیجیے گا، شام کو وقت ہوا تو سوچوں گا۔ ویسے میرے لارے پر مت رہیے گا۔ گاڑی اور ڈرائیور آفس پہنچ کر بھیج دوں گا۔ ٹھیک ہے ناں...... آرام سے جائیں، آرام سے آئیں۔'' وہ بھی جواباً شیریں بیانی دکھاتا اخبار ایک طرف رکھ کر ملک شیک پینے کے بعد کوٹ اور چابیاں اٹھاتا عجلت میں باہر نکل گیا تھا اور عینی گویا پتھر کا مجسمہ بن گئی تھی۔ آج سے پہلے کب ذی شاہ نے اسے میکے لے جانے اور واپس لانے کی ڈیوٹی سے انکار کیا تھا پھر اب اسے کیا ہوا تھا؟ وہ کچھ بدلا بدلا نظر آرہا تھا۔ یقیناً ہاتھوں سے نکلنے والا تھا۔ عینی کے آس پاس خطرے کے الارم بج رہے تھے۔ اسے سو فیصد یقین تھا ذی شاہ کے کان ممی اور بندیا نے بھرے ہیں۔ اسے اپنی دانست میں مکار پھوپی جو اس کی ساس بھی تھیں پر سخت تاؤ چڑھ رہا تھا اور پھر بندیا جیسی کٹنی نند کی گردن مروڑنے کو بھی دل چاہ رہا تھا۔ جانے کیوں اسے لگ رہا تھا کہ آنیہ کو اس گھر میں لانے کا خواب ادھورا ہی رہے گا...... کبھی تعبیر نہیں پائے گا۔

ذی شاہ کے کورے جواب نے اسے دھچکا پہنچایا تھا۔ اپنی صدموں کی ماری...... اجڑی، ویران بہن کے لیے اس کے پاس وقت ہی وقت تھا اور عینی کے لیے پندرہ بیس منٹ بھی ضائع نہیں کرسکتا تھا۔ عینی کو اتنا غیظ چڑھا کہ اس نے غصے میں دو تین گلاس توڑ ڈالے تھے۔ کانچ کے گلاس ٹوٹنے کی آواز سن کر ممی اور بندیا دوڑی دوڑی آئی تھیں۔ ان کے پیچھے ہراساں سی مالا بھی کھڑی تھی جو عینی کے غضبناک تیور دیکھ کر تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس کا چڑیا جتنا دل لڑائی جھگڑے سے بہت سہم جاتا تھا مگر یہاں مالا کے خوف کی بھلا کسے پروا تھی۔ عینی کی تیوری چڑھی دیکھ کر ممی نے ہی لب کشائی کی کوشش کی تھی۔ دوسرے معنوں میں بھڑوں کے چھتے پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ ان کے استفسار کرنے پر عینی چیخ پڑی۔

''یہ سب کیا دھرا آپ کا ہے، میری زندگی سے آپ سب نے سکون ختم کردیا ہے۔ تم تینوں میری جان کو چمٹی ہوئی ہو...... اس گھر میں میری سانس بند ہونے لگی ہے۔'' وہ لال بھبھوکا چہرہ لیے آنسو بھی... برسا رہی تھی۔ جانے اسے اچانک ہوا کیا تھا۔ ممی سمیت بندیا بھی حواس باختہ ہوگئی۔ تاہم عینی کے الفاظ نے اسے اور بھی بھڑکا دیا تھا۔

''اس گھر میں آپ کی سانس بند ہوتی ہے تو چلی جائیں یہاں سے۔ شوہر سے کہیں آپ کو الگ گھر دے دے...... وہ تو ویسے بھی آپ کی ہر بات پر آنکھیں بند کیے عمل کیے جاتا ہے۔'' بندیا نے بے دھڑک جواب دے کر عینی کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ ممی اسے برابر چپ رہنے کا اشارہ کررہی تھیں مگر وہ بندیا ہی کیا جو چپ کر جاتی۔

''میں کیوں نکلوں یہاں سے، تم ماں بیٹیاں تو چاہتی یہی ہو، ذیشان مجھے چھوڑ دے۔ گھر سے نکال دے۔'' بندیا کی بات کو الٹ انداز میں لیتی عینی نے بھاں بھاں کر کے رونا شروع کردیا تھا۔ جانے یہ کیسی کھولن تھی جسے وہ بندیا پر نکال رہی تھی۔

''ہم کیوں ایسا چاہیں گے، اپنے جیسا...

خودغرض مت سمجھو ہمیں......اپنے بھائی کا گھر ہم کیوں برباد کرنے کا سوچیں گے۔'' بندیا کے کھرے جواب نے ایک مرتبہ پھر عینی کو لاجواب کر دیا تھا۔ وہ بندیا کا منہ توڑ دینا چاہتی تھی مگر بے بس اتنی تھی کہ اپنی جگہ سے ہل نہیں پا رہی تھی۔

''بہت مکار ہو تم ماں بیٹیاں......شامی اور ذی کے کان بھر رکھے ہیں میرے خلاف، ذیشان آتے ہیں تو انہیں بتاتی ہوں۔'' جب کچھ اور نہ سوجھا تو وہ اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئی تھی۔ بندیا اس کی بکواس پر اور بھی سیخ پا ہو گئی تھی۔

''جھوٹی تو آپ خود ہیں عینی بھابی......! جو مرضی کہہ دیں ذیشان بھائی سے...... میں نہیں ڈرتی ورتی......'' اس نے حلق پھاڑ کر ایک مرتبہ پھر عینی کو لاجواب کر دیا تھا۔ یعنی بندیا کے اطوار نے اسے متوحش کر دیا تھا۔ آج تو وہ اس کی کسی بات کو خاطر میں نہیں لا رہی تھی۔ پہلے کی طرح ڈرنے، دبکنے کے بجائے مقابلے پر اتر آئی تھی۔ عینی کا منہ کچھ اور کھل گیا تھا۔ یقیناً ذی شاہ اور شامی کی سپورٹ پا کر وہ اتنی بہادر اور منہ پھٹ بنی ہوئی تھی کہ عینی کو ایک مرتبہ پھر ذی شاہ پر بھی تاؤ آ گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ذی کی سپورٹ نے بندیا کو اتنا دلیر کر رکھا ہے۔

''میں تم تینوں کو گھر سے نکلوا دوں گی۔'' عینی کی آخری حد بس یہیں تک تھی۔ وہ فوراً اپنی اوقات پر اتر آتیں۔ ہمیشہ لڑائی میں اختتام تک آتے، آتے وہ آخری ہتھکنڈا ضرور استعمال کرتی تھیں۔ اپنے تئیں عینی نے بندیا کا منہ بند کروا دیا تھا مگر بندیا کا منہ بھلا بند ہو سکتا تھا۔ اس کے جواب نے عینی کے چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔

''عینی بھابی! سنبھال کر رکھیں اپنی گندی زبان کو...اور اتنی اونچی اڑان بھی مت بھریں کہ واپس آنے میں دشواری ہو......ہمیں آپ کس برتے پر نکالیں گی۔ اس گھر میں ذی شاہ بھائی اور شامی کا بھی حصہ ہے۔ ہم آپ کے گھر میں نہیں رہتے......ڈیڈی کے بعد اپنے بھائیوں کے گھر میں رہتے ہیں۔ ڈیڈی کے بزنس میں بھی شاہ بھائی اور شامی برابر کے حصے دار ہیں۔ ہم آپ کے شوہر کی خیرات نہیں کھاتے۔ آئندہ سوچ سمجھ کر بولیے گا۔ میں ذی شاہ بھائی کو آپ کی بکواس کا سلیس ترجمہ سنا دوں گی۔'' بندیا کے مفصل جواب نے اسے حواس باختہ کر دیا تھا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ بندیا جیسی ڈرپوک اور دبو لڑکی کے سامنے لاجواب ہونا پڑے گا۔ مارے اہانت اور غضب کے وہ لال انگارہ ہو گئی تھی۔ بندیا کی بک بک نے اس کا فشارِ خون بلند کر دیا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ الٹے ہاتھ کے دو چار اس کے منہ پر لگا دے مگر یہ سب وہ محض سوچ سکتی تھی اس پر عمل نہیں کر سکتی تھی۔ وہ جوابی بھڑاس نکالنا چاہتی تھی مزید منہ کی کھا کر غضب ناک ہو گئی تھی۔ اسے بندیا کو کرارا سا جواب دینا تھا۔ جسے سن کر اسے آگ لگ جاتی۔

کچھ دیر کی سوچ بچار کے بعد دروازے سے چپکی تھر تھر کانپتی مالا کو دیکھ کر اس نے انتہائی زہر میں بجھے الفاظ منہ سے باہر نکالے تھے۔

''بہت لمبی زبان ہے تمہاری...... سسرال جاؤ گی تو کاٹ کر ہاتھ میں پکڑا دیں گے۔ پھر یاد رکھنا، تمہارا انجام بھی مالا سے الگ نہ ہو گا۔ اس کی طرح اجڑ کر ہمارے سروں پر سوار ہو جاؤ گی۔'' عینی اپنی کہی زہریلی باتوں سے ٹھیک طرح لطف بھی نہ لے پائی تھی جب ذی شاہ کی دہاڑ نے اس کے حواس گم کر دیے تھے۔ ذی شاہ اچانک گھر آ گیا تھا۔ وہ بالکل دبے قدموں گھر میں داخل ہوا تھا۔ یقیناً اس کی گاڑی گیٹ سے باہر تھی اور وہ کوئی فائل وغیرہ لینے نہیں آیا تھا۔ وہ تو عینی کو اس کے میکے تک چھوڑنے کے لیے دوبارہ گھر آیا تھا۔ دراصل اسے جواب دے کر اس کا ضمیر خاصا بوجھل ہو گیا تھا۔ فطرتاً وہ صاف نیت کا بندہ تھا پھر بڑی بھابی کا یہ معمولی سا کام اتنا بڑا بھی نہیں تھا جو وہ دوٹوک انکار کر آیا تھا۔ کچھ ذیشان

کے حوالے سے عینی قابلِ احترام تھی۔ بس انہی نزاکتوں کو سوچتا وہ واپس گھر آیا تھا جب اچانک عینی کی بکواس کو سن کر اس کا دماغ گھوم گیا تھا۔ یقیناً بندیا اور عینی کے درمیان تکرار ہو رہی تھی مگر تکرار کی نوعیت اتنی فضول اور بے ہودہ ہو گی یہ ذی شاہ نے ہرگز نہیں سوچا تھا۔ عینی کے الفاظ نے اسے مشتعل کر دیا تھا۔ وہ اس کی بہنوں کے بارے میں اتنا غلط اور غلیظ سوچتی تھی یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

''بہت خوب، بہت اعلیٰ۔'' ذی شاہ نپے تلے قدم اٹھاتا عینی کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے دو ٹوک کٹیلے الفاظ نے عینی کو حواس باختہ کر دیا تھا۔ وہ لٹھے کے مانند سفید پڑ گئی تھی......اور گھبرا تو ممی کے ساتھ بندیا بھی گئی تھی۔

''آپ میری بہنوں کے لیے اتنا بہترین سوچتی ہیں عینی بھابی...! آج سے پہلے میں جان ہی نہیں سکا۔'' ذی شاہ کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ اس کے بھینچے لہجے میں بلا کا غیض ابل رہا تھا۔ عینی کی تو روح فنا ہو گئی تھی۔

''میری باتیں تم نے سن لی ہیں۔ بندیا کی بکواس نہیں سنی۔'' وہ خاموش رہ کر خود کو کمزور ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے اپنی صفائی پیش کرنا تھی، ذی شاہ کی بدگمانی دور کرنا تھی۔ وہ اسے ہاتھوں سے نہیں نکالنا چاہتی تھی۔ عینی کی جلد بازی نے بنا بنایا معاملہ بگاڑ دیا تھا۔ زبان سے نکلے الفاظ اگرچہ واپس نہیں آ سکتے تھے تاہم وہ اپنی چکنی چپڑی باتوں سے ذی شاہ کی بدگمانی کم ضرور کر سکتی تھی۔

''مجھے جو سننا تھا سن لیا......آپ کی سوچ اور ذہن کی گندگی جان کر بڑا افسوس ہوا ہے، تاہم آپ کی اصلیت واضح ہو گئی۔ سو یہ اچھا ہی ہوا۔'' اس نے ہاتھ اٹھا کر عینی کو مزید بولنے سے روک دیا تھا۔ اسے مزید کوئی وضاحت یا صفائی نہیں چاہیے تھی۔ تبھی عینی پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ اس نے رونے دھونے والا حربہ استعمال کرنا شروع کر دیا......وہ ہر صورت ذی شاہ کے دل پر اچانک جمنے والی میل کو کھرچنا چاہتی تھی۔

''ذی......! بندیا بہت بد زبان ہے، یقین کرو، مجھے اتنا کچھ......'' وہ تیز لہجے میں بولتی ہوئی اچانک رک گئی تھی۔ ممی کی مداخلت نے اسے مزید بولنے نہیں دیا تھا۔

''یہ تو روز کا قصہ ہے بیٹا! تم کب تک عدالت لگاؤ گے۔ جانے دو، اب تو عادت ہو چکی ہے۔'' وہ مالا اور بندیا کو لے کر کمرے میں چلی گئی تھیں۔ ممی اس لمحے کتنی اداس، ویران اور تھکی تھکی لگ رہی تھیں۔ گویا مردوں کی غیر موجودگی میں گھر کا ماحول ایسے ہی تکلیف دہ، پُر اذیت ہوا کرتا تھا۔ عینی کو بھلا کیا پروا ہو سکتی تھی۔ وہ آگ لگا کر میکے چلی جاتی تھی یا سیر سپاٹوں پر نکل جاتی۔ اس کا تو یہ معمول تھا۔ عینی نے اسی طرح بد زبانی کے جوہر دکھا کر سب پر تسلط قائم کر رکھا تھا۔ پہلے پہل بندیا بھی ممی کی طرح چپ کی بکل اوڑھ لیتی تھی۔ عینی کی ہر زیادتی پر خاموش رہتی مگر پھر آہستہ، آہستہ عینی کا بڑھتا دباؤ محسوس کر کے اس نے بھی کھرے کھرے جواب دینے شروع کر دیے تھے۔ ورنہ عینی تو ان کی ناک میں دم کیے رکھتی تھی۔ بلاوجہ اسے کچن میں گھسا دیتی۔ نوکروں کی موجودگی میں بھی اس سے فضول کام کرواتی، کپڑے دھلواتی، استری کرواتی، یہاں تک تو ٹھیک تھا، اس نے ذرا کام خراب ہونے پر اس کی بے عزتی بھی کرنا شروع کر دی تھی پھر وہ بے ضرر سی مالا کو بھی بے نقط سناتی تھی۔ جب اس نے مالا پر طنز کرنے اور اسے ایذا دینی شروع کی تھی تب سے بندیا بھی عینی کو دو بدو جواب دینے لگی تھی۔ مالا نے پلٹ کر کچھ کہا جو نہیں تھا۔ تبھی عینی سر چڑھتی جا رہی تھی۔ اب چونکہ بندیا کو دونوں بھائی خود سپورٹ کر رہے تھے تب سے وہ خاصی دلیر ہو گئی تھی۔

اُدھر ذی شاہ کے لیے عینی کی بدزبانی ہضم کرنا سہل نہیں تھا۔ عینی کو مزید کچھ کہے بغیر وہ واپس آفس آگیا تھا مگر اس نے ذیشان سے اپنی ٹینشن ضرور شیئر کی تھی۔ وہ اسے گھر کے ماحول سے آگاہ کرنا چاہتا تھا مگر ذیشان کے اُلٹے جواب نے کچھ پل کے لیے اسے متحیر کر دیا تھا۔

''وہ بہت ڈپریشن کا شکار ہے یار! تبھی بندیا کو کچھ کہہ دیا ہوگا۔ بڑی بھابی ہے، بندیا کو ذرا کچھ کہہ دیا تو کیا ہوگیا؟ بات بڑھانے کا کیا فائدہ۔'' ذیشان نے بڑے سکون سے بیوی کے ڈپریشن پر روشنی ڈالنی شروع کی۔ ذی شاہ قدرے ہونق سا اپنے بدھو بھائی کو دیکھ رہا تھا۔ جس کی سُدھ بُدھ عینی سے بیاہ کے بعد کھو چکی تھی۔ اس کی ساری بکواس ذیشان کے سر پر سے گزر چکی تھی اور وہ آرام سے عینی نامہ کھول کر بیٹھ گیا تھا۔

''تم نے بھی تو معاملہ لٹکا رکھا ہے، کچھ اپنے بارے میں بھی سوچ لو...... تبھی عینی کی ٹینشن بھی ختم ہوگئی۔'' ذیشان گھما پھرا کر مطلب کی بات تک آگیا تھا۔ وہ تو کب سے موقع کی تلاش میں تھا۔ کب یہ ذکر چھڑے اور کب وہ عینی کی تمنا ذی شاہ کے کانوں میں انڈیلے۔ بیوی کا ڈپریشن اسے نظر آتا تھا۔ معصوم بہن کی اجڑی صورت اسے دکھائی نہیں دیتی تھی۔ یہ تھے خون کے رشتے، خودغرضی میں لپٹے ہوئے...... وہ ذیشان کو ہزار مرتبہ بتا چکا تھا۔ جب تک مالا کی زندگی کا کوئی فیصلہ نہیں ہوجاتا تب تک وہ ہرگز بھی شادی، منگنی کے جھنجٹ میں پڑنے والا نہیں تھا...... مگر ذیشان کی بک بک کے تار پھر عینی کے ڈپریشن سے جُڑتے ہوئے اس کی منگنی پر آپہنچے تھے۔ وہ ذیشان کو کس طرح سمجھاتا......؟ کس طرح مطمئن کرتا؟ وہ بغیر کسی بدمزگی کے دوٹوک انکار کرنا چاہتا تھا مگر سمجھ نہیں آتی تھی بات کا آغاز کیسے کرے...... اِدھر ذیشان نے اپنی تان لگا رکھی تھی۔

''دیکھو یار......! شادی تو تم نے کرنی ہی ہے تو پھر ٹال مٹول سے کام کیوں لے رہے ہو...... آنیہ میں کمی کیا ہے؟ پھر اپنے رشتے دار بھی ہیں۔ عینی کی خواہش ہے......'' ذیشان ابھی بہت میٹھے لہجے میں گفتگو کا آغاز کرنے کی کوشش کر ہی رہا تھا جب ایک دم ذی شاہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا تھا...... وہ اس موضوع پر کھل کر بات کرنے کا ارادہ کر چکا تھا۔ ویسے بھی وہ ذیشان کی غلط فہمی کو دور کرنا چاہتا تھا۔ یہ لوگ خواہ مخواہ اس سے امیدیں وابستہ کر رہے تھے جبکہ وہ آنیہ تو کیا کسی میں بھی انٹرسٹڈ نہیں تھا اور نہ ہی شادی کی فی الحال خواہش رکھتا تھا۔

''مجھے فی الحال نہ منگنی کرنی ہے نہ شادی......'' ذی شاہ نے دوٹوک لہجے میں انکار کر دیا تھا۔ ''اور آنیہ کے ساتھ تو بالکل نہیں...... میرا اور آنیہ کا مزاج ہی نہیں ملتا......'' اس نے بھی آج صاف صاف بات کرنے کی ٹھان لی تھی۔ ذیشان کی رنگت پل پل بدل رہی تھی، وہ ہکا بکا اپنے چھوٹے بھائی کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اسے ذی شاہ سے ایسے کھرے جواب کی توقع نہیں تھی۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ ذی شاہ آنیہ کے لیے انکار کر دے گا۔ وہ تو اپنے تئیں تمام معاملے نمٹا چکا تھا۔ سب کچھ طے کیے ہوئے تھا۔ اسے تو صرف آگاہ کرنا تھا مگر ذی شاہ نے تو بازی ہی الٹ دی تھی۔ ذیشان کو بھلا غصہ کیوں نہ آتا۔

''مزاج تو شادی کے بعد مل ہی جاتے ہیں۔ تمہیں اعتراض کس بات پر ہے؟'' بہت سنبھل کر ذیشان نے تیز لہجے میں پوچھا تھا۔ ذی شاہ کو امید نہیں تھی وہ اس کے انکار پر بھی جرح کرنے لگے گا۔

''بس میں آنیہ کے لیے اس انداز میں نہیں سوچ سکتا۔'' ذی شاہ نے نہایت ناگواری سے یہ مشکل جواب دیا تھا۔ وہ اسے کس چیز کا احساس دلاتا چاہتا تھا اور ذیشان بات کو کسی اور طرف گھما پھرا کر لے گیا تھا۔ اپنے گھریلو ماحول کی کشیدگی کو وہ ذی شاہ

کی شادی کے سلسلے سے منسوب کر رہا تھا۔ اسے بہنوں سے بھی زیادہ سالی کی فکر کھا رہی تھی...... نہ بیمار بہن کی پروا تھی۔ نہ چھوٹی بہن کی شادی کے لیے متفکر تھا۔ فکر تھی تو بس لاڈلی بیگم کی نازک اندام بہن کی...... ذی شاہ کا دل کچھ اور بھائی کے رویّے سے کھٹا پڑ گیا تھا۔

''تو اب سوچ لو......'' ذیشان اسے اکسا رہا تھا۔ کچھ لہجے کو نرم کر کے اس کا دل موم کرنا چاہ رہا تھا مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ ذی شاہ کا دل موم کرنا آسان نہیں ہے۔ وہ اپنے دل کی رہ گزر سے کسی کو گزرنے ہی نہیں دیتا تھا۔

''مجھے فی الحال اپنے بارے میں کچھ نہیں سوچنا...... پہلے مالا اور بندیا کے لیے سوچوں گا۔'' اس نے دوٹوک انداز میں ذیشان پر بہت کچھ واضح کر دیا تھا مگر چونکہ ذیشان نے آنکھیں اور کان بند کر رکھے تھے سو وہ کچھ سمجھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اب بھی اس کے انکار کی اصل وجہ پر توجہ دیے بغیر وہ ایک دم بھڑک اٹھا تھا۔ یقیناً وہ اس انکار کو انا کا مسئلہ بنا رہا تھا...اور عینی نے بھی اسے ذی شاہ کے انکار کو سن کر بعد والی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے پہلے سے ہی تیار کر دیا تھا۔

''یعنی تم انکار کر رہے ہو؟'' ذیشان نے بہت دیر کی خاموشی کے بعد زہریلے لہجے میں کہا تھا۔ وہ بہت سنجیدہ اور اکھڑ نظر آنے لگا تھا۔ ذی شاہ نے قدرے تحمل سے کہا۔

''یقیناً میں انکار ہی کر رہا ہوں۔'' اس کے لہجے میں بھی خاصی ناگواری تھی۔ اسے ذیشان کے اکھڑ تیور بہت برے لگ رہے تھے۔ وہ کیونکر اپنے فیصلے اس پر ٹھونس سکتا تھا۔ پھر جب اس نے واضح لفظوں میں انکار کر دیا تھا تب اس کا اصرار فضول تھا۔

''تم اپنے لیے اچھا نہیں کر رہے......'' ذیشان نے بھینچی بھینچی آواز میں تلخی سے کہا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر جانے لگا تھا۔ یقیناً وہ بہت غصے میں تھا۔ اب اسے اگلے لائحہ عمل کی فکر تھی۔ چونکہ ایک بات تو طے تھی کہ وہ ذی شاہ کو دھمکا کر بھی آنیہ سے منگنی پر مجبور کرنے کا ارادہ رکھتا تھا اور اسے یقین تھا کہ ذی شاہ اس کی پلاننگ پر چاروں شانے چت گر جائے گا۔

''میں اپنے ساتھ اچھا کروں یا برا، تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' ذی شاہ نے فائل پر نگاہ جما کر ذیشان کو رک جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ نہ صرف رکا تھا بلکہ پلٹ بھی آیا تھا۔

''یہ تو وقت آنے پر پتا چلے گا۔'' ذیشان نے چبا چبا کر اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا تھا تب وہ تلخی سے سر جھٹک کر زہرخند ہوا۔

''تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟'' ذی شاہ کا دماغ گھوم کر رہ گیا تھا۔ اسے بھائی سے ایسی بکواس کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ وہ غضبناک تیور لیے اسے گھور رہا تھا۔

''یہی سمجھ لو۔'' ذیشان سرخ آنکھیں لیے اسے گھورتا ہوا دروازہ ایک دھماکے سے بند کرتا باہر نکل گیا تھا جبکہ ذی شاہ بے بس سا بند دروازے کو دیکھتا رہ گیا تھا پھر اس نے سر جھٹک کر کمپیوٹر اسکرین کی طرف اپنی توجہ مبذول کر لی تھی۔ اسے ذیشان کی بکواس پر کڑھنا نہیں تھا مگر وہ اس کی سوچوں کو منتشر ضرور کر چکا تھا۔ اب اس کا خاک کام میں دل لگنا تھا۔ اپنے گھریلو حالات کو سوچتا وہ مالا کے لیے بہت رنجیدہ ہو رہا تھا اور ابھی مالا کے لیے اس نے کچھ سوچا ہی نہیں تھا...... جو...... اب ذیشان اور عینی نے نیا محاذ کھول لیا تھا۔ اسے پورا یقین تھا ذیشان کو عینی نے اپنی باتوں میں لگا رکھا تھا۔ اور وہ بھی بیوی کی بتائی ایک، ایک لائن کو پوری جانفشانی کے ساتھ دُہراتا تھا مگر چونکہ ذی شاہ ان دونوں کی نیت کا کھوٹ سمجھ چکا تھا سو وہ قیامت تک بھی ذیشان کی خواہش پوری نہیں کر سکتا تھا۔

(باقی آئندہ)



ناولٹ

ترکِ وفا

نایاب جیلانی

دوسرا حصہ



اس کا انکار کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا جو گھر کی فضا پُر امن رہ جاتی۔ عینی تک اس کا انکار من و عن پہنچ چکا تھا سو اس کے تیور بگڑتے دیر نہیں لگی تھی۔ اس نے اپنے تئیں کھلم کھلا اعلانِ جنگ کر دیا تھا۔ پہلے مارے باندھے کچن میں چلی جاتی تھی اب اعلانیہ طور پر بائیکاٹ کر چکی تھی۔ اور بات صرف کھانا بنانے تک محدود نہیں تھی۔ اس نے کچھ دن بعد کچن الگ کرنے کا بھی شوشا چھوڑ دیا۔ وہ اوپر

والے پورشن میں الگ ہونے کا ارادہ رکھتی تھی۔ ابھی بات صرف ممی کے کانوں میں اس نے انڈیل دی تھی۔ فی الحال اس پر عمل کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی۔ چونکہ وہ ذی شاہ کو آخری حد تک منانے کی کوشش کرنا چاہتی تھی اور ذی شاہ تو گویا ان لوگوں سے قطعاً بے نیاز ہو چکا تھا۔ آفس کے علاوہ اس کی صرف ایک ہی مصروفیت تھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ وقت مالا کے ساتھ گزارتا تھا۔ اس سے بے معنی ڈھیروں باتیں کرتا، اسے لطیفے سناتا، بار بار ہنساتا...... اور وہ بہت ہنستی بھی تھی، اس کی باتوں کو انجوائے بھی کرتی تھی مگر بولتی پھر بھی نہیں تھی۔ ذی شاہ کے پاس مالا کی پچھلی زندگی سے متعلق کوئی تصویریں، مووی وغیرہ نہیں تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ مالا سے اس کی گزشتہ زندگی کی باتیں کرے۔ اسے پچھلی باتیں یاد دلائے... تاکہ مالا کچھ ردِعمل ظاہر کرے...... وہ اس سے باتیں کرنے کی کوشش کرے...... اپنی زبان کے زنگ اتارے...... کچھ نہیں تو اپنے سگے بھائی سے کچھ دل کے دکھ کہے...... اپنے دل کا سارا حبس، گھٹن اور زہر باہر نکال دے۔ اندر کے غبار کو، آنسوؤں کو لفظوں میں بہا دے مگر وہ کچھ بولتی ہی نہ تھی۔

اس دن بھی ذی شاہ، مالا کو زبردستی ایک قریبی پارک میں لے آیا تھا۔ یہاں چھوٹے، چھوٹے بچوں نے ہنگامہ مچایا ہوا تھا۔ بے فکر خوش باش چہرے، ہنستے کھلکھلاتے لوگ تھے۔ شاید ان لوگوں کو غم چھو کر بھی نہیں گزرا تھا۔ مالا بہت ترسی ہوئی نظروں سے ان معصوم بچوں کو دیکھ رہی تھی۔ خصوصاً اس بچے کو جو پرام میں لیٹا قلقاریاں مار رہا تھا۔ اس کی ماں قریب ہی خوش گپیوں میں مصروف تھی۔ مالا ایک ٹک اس معصوم سے بچے کو دیکھ رہی تھی جو بار بار اپنی ماں کی طرف ہمکتا تھا۔ بچے کے چہرے کو پیاسی نظروں سے دیکھتی مالا کی آنکھوں میں حسرت کُرلا رہی تھی۔

ذی شاہ سے یہ منظر دیکھا نہیں گیا۔ اس نے اپنی نگاہوں کا رخ موڑ لیا تھا پھر اس نے مالا کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

"کیا دیکھ رہی ہو مالا! یہ بچہ تمہیں اچھا لگ رہا ہے! چلو میں تھوڑی دیر کے لیے اسے تمہارے پاس لے آتا ہوں۔" وہ ایک دم اپنی جگہ سے اٹھ کر ذرا فاصلے پر موجود اس بچے کی ماں تک آیا تھا۔ مالا کے چہرے پر جو ممتا سی لپک رہی تھی، گویا وہ بچے کو گود میں اٹھانا چاہتی تھی کم از کم اس کے تاثرات سے ذی شاہ یہی اندازہ لگا پایا تھا جیسے ہی وہ مالا کی دلی خواہش کو جان چکا تو اس نے عمل کرنے میں لمحے بھر کی دیر نہیں کی تھی۔ مالا حیران آنکھوں سے اسے اٹھ کر بچے کی ماں کے قریب جاتا دیکھ رہی تھی پھر اس نے اپنے بھائی کو اس اجنبی عورت سے ہم کلام ہوتے دیکھا تھا۔ وہ اس عورت سے بہت ہی لجاجت کے ساتھ گویا تھا۔

"میں کچھ دیر کے لیے آپ کا بچہ لے جاؤں؟ صرف اس سامنے والی بینچ تک۔ میری بہن کچھ وقت آپ کے بچے کے ساتھ گزارنا چاہتی ہے۔" جانے وہ اسے کون سے جواز دے رہا تھا۔ وہ عورت کچھ دیر تو ذی شاہ کو حیرت سے دیکھتی رہی پھر شاید اس کی پرسنالٹی، شائستگی اور باوقار انداز سے متاثر ہوگئی تھی۔ اس نے ذی شاہ کی التجا پر غور کرتے ہوئے ذرا فاصلے پر موجود اس بینچ کی طرف دیکھا جہاں ایک بہت ہی کامنی سی کچھ کچھ کھوئی لڑکی ایک ٹک پرام کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ بچے کی ماں نے کچھ تذبذب کے عالم میں سر ہلا کر بچہ پرام میں سے نکال کر ذی شاہ کے ہاتھوں میں تھما دیا پھر جب وہ بچہ لے کر مالا کی طرف آیا تو اس کی آنکھوں میں ایک الگ سی جوت اِک عجیب سی چمک دکھائی دینے لگی تھی۔ اس نے بچہ مالا کی گود میں ڈالا تو وہ بے قرار نظروں سے بچے کے نقش کھوجنے لگی۔ گویا بچے کے

معصوم نقوش میں کچھ تلاش رہی تھی۔ کچھ دیر مالا کی بے قراری کا مشاہدہ کرنے کے بعد ذی شاہ نے بہت پیار سے اسے مخاطب کیا تھا۔

"مالا! تمہیں بچے اچھے لگتے ہیں؟" مالا کو بہت ہی مضطرب سے انداز میں بچے کو والہانہ پیار کرتے دیکھ کر وہ پوچھ رہا تھا۔ مگر ظاہری بات تھی، مالا نے اس کی بات کا جواب نہیں دینا تھا لیکن اس نے اثبات میں سر ہلا کر جو ردِعمل ظاہر کیا تھا مالا کے اندر اس تحریک نے ذی شاہ کی آنکھوں میں امید کے دیے، ستارے روشن کر دیے تھے۔ وہ صحت مندی کی طرف تو پلٹ چکی تھی تاہم نارمل لوگوں کی طرح اب ردِعمل بھی ظاہر کرنے لگی تھی۔ منہ سے اب بھی اگرچہ نہیں بولتی تھی تاہم وہ اس کے تاثرات سے اندر کا حال جان لیتا تھا...... وہ مالا کے مزاج کو بہت اچھی طرح سے سمجھنے لگا تھا۔ بن کہے اس کے دل کی خواہش کو جان لیتا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں کے تاثرات کو بھی پڑھنے لگا تھا۔ اسے افسوس ہوتا تھا پچھلے تین سال سے انہوں نے مالا کو اس کے حال پر چھوڑ کر اچھا نہیں کیا تھا۔ اپنے اندر کے غموں کو اس نے کبھی اپنی ماں سے بھی شیئر نہیں کیا تھا اور اب ذی شاہ کا دل چاہتا تھا کہ وہ اپنے اندر کے غبار، دھند، کرب و اذیت کو اسے اپنی ماں، بہن، دوست، بھائی سب کچھ سمجھ کر شیئر کرے...... اسے اپنے اوپر بیتی اذیت کی کہانی سنائے۔

اس وقت ایک اجنبی بچے پر والہانہ پیار لُٹاتی مالا کو وہ کس کرب کے عالم میں دیکھ رہا تھا، ذی شاہ کے دل میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں.... وہ دکھ کی جانے کون سی منزلوں سے گزر رہی تھی۔ یقیناً یہ ممتا کا پل صراط تھا۔ وہ جسے کھو چکی تھی، اس کے غم کو اس بچے کی صورت میں تازہ کر رہی تھی۔ کیسا پُر اذیت، تکلیف دہ منظر تھا۔ ذی شاہ کی آنکھوں کی سطح گیلی ہونے لگی۔ تب اسے اپنے پیچھے ایک ہلکی سی آواز سنائی دی تھی۔ یقیناً وہ بچے کی ماں تھی جو ان لوگوں پر ہی نگاہیں جمائے کھڑی تھی۔ اب بچے کو لینے یقیناً ان کے قریب آئی تھی۔

"کیا میں اپنا بچہ لے سکتی ہوں؟" اس نے ذی شاہ کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا تھا تب وہ نگاہوں کا رخ موڑ کر بچے کی ماں کو دیکھنے لگا جو مضطرب سی اپنا بچہ واپس لینے آئی تھی۔ یقیناً بچہ بھی ماں کو سامنے دیکھ کر اس کی طرف ہمکنے لگا تھا۔ ذی شاہ نے مالا کی گود سے بچہ لے کر بے قرار کھڑی خاتون کو تھما دیا تھا جو بچے کو گود میں لے کر کچھ... پُرسکون ہوگئی تھی۔ وہ اپنے فطری تجسس کی بدولت کچھ پوچھے بنا رہ نہیں سکی۔

"آپ کی بہن کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے کیا......؟" اس نے مضطرب سی مالا کو دیکھ کر ذی شاہ سے سوال کیا تھا جو مالا کی بے قرار نگاہوں کا ارتکاز محسوس کر چکنے کے باوجود بھی کچھ بے نیاز کھڑا تھا۔ یقیناً وہ بچے کی ماں سے اس کے بچے کو دوبارہ نہیں لے سکتا تھا۔

"بس یہی سمجھ لیں۔" وہ مبہم سے انداز میں بولا تھا۔

"کیا ان کے بچے نہیں ہیں؟" خاتون کی یقیناً

سنہری کرنیں

☆ پریشان ہونا انسان کے انسان ہونے کی دلیل ہے لیکن پریشان رہنا انسان کے اللہ پر یقین نہ ہونے کی دلیل ہے۔

☆ ہمیشہ قدر کریں، ان تین چیزوں کی۔ اعتبار، وعدہ اور رشتہ۔ یہ سب جب ٹوٹتے ہیں تو کوئی شور سنائی نہیں دیتا مگر دل میں ایک گہری خاموشی اتر جاتی ہے۔

از: عروبہ ناز، کوٹلی

تشفی نہیں ہوئی تھی۔ وہ مزید سوال کرنا چاہتی تھی۔ اس کے چہرے پر مالا کے لیے ہمدردی تھی جو ذی شاہ کو اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

”نہیں......“ اس نے ایک لفظی جواب دے کر ٹالنا چاہا تھا مگر یہ خاتون فی الحال ٹلنے والی نہیں تھی۔ اب وہ اسے مالا کے علاج کا مشورہ دے رہی تھی، اس کے شوہر کا پوچھ رہی تھی۔ کسی مایہ ناز گائنا کالوجسٹ کا ذکر کر رہی تھی۔ ذی شاہ عجیب مصیبت میں پھنسا جھنجلا رہا تھا۔ اس نے خاتون کو تحمل سے جواب دیا۔

”آپ کے نیک مشوروں کا بہت شکریہ۔“ وہ بہت نرمی سے ہم کلام تھا کیونکہ خاتون اس کی محسنہ تھی۔ کچھ دیر پہلے اس نے ذی شاہ پر احسان کیا تھا سو وہ اپنے لب ولہجہ کو سخت نہیں کرنا چاہتا تھا مگر اس کا انداز یقیناً جان چھڑوانے والا تھا۔ سو وہ معذرت کر کے جلد ہی مالا کو ساتھ لیے وہاں سے اٹھ گیا تھا مگر اس نے محسوس کیا تھا کہ مالا پہلے کی نسبت آج کافی خوش اور پُرجوش نظر آ رہی تھی گھر آ کر بھی وہ پہلے کی طرح کمرے میں بند نہیں ہوئی تھی بلکہ بندیا کے پاس کچن میں کھڑی سلاد کے لیے سبزی وغیرہ کاٹنے لگی تھی۔ اس کے چہرے پر سجی الوہی سی مسکراہٹ ذی شاہ کو اگلی صبح تک بھی دکھائی دیتی رہی تھی اور شاید مالا کے رویّے میں پہلی مرتبہ تبدیلی محسوس کر کے ممی اور بندیا بھی بہت پُرامید ہو چکی تھیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اگلی سہ پہر مالا بغیر کسی کے کہے لان میں بیٹھی ذی شاہ کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ زندگی کی طرف دھیرے دھیرے ہی سہی لوٹنے لگی تھی اور یہ خوش آئند عمل تھا۔

اس سے اگلے دن ذی شاہ مالا کو پارک لے جانے کے بجائے شاپنگ کے لیے لے آیا تھا مگر مالا بجائے بوتیکس کی طرف ٹوائے شاپس کو دیکھ، دیکھ کر ان کی طرف بڑھ رہی تھی کچھ سوچ کر وہ اسے ٹوائے شاپ کی طرف لے آیا تھا تب مالا نے کتنے ہی جوش اور جذبے کے ساتھ ڈھیروں کھلونے خرید لیے تھے...... اب وہ چھوٹے چھوٹے کپڑے خرید رہی تھی۔ چوسنیاں اور فیڈر لے رہی تھی۔ ڈول ہاؤس اور پپی ہاؤس پیک کروا رہی تھی۔ آج وہ عام دنوں سے ہٹ کر بہت خوش تھی۔ اس کی سرخ رنگت میں عجیب سی چمک نظر آ رہی تھی۔ چمکیلی آنکھیں خوشی سے دمک رہی تھیں...اور ذی شاہ بہن کو خوش دیکھ کر اندر تک خود ہی سرشار ہو رہا تھا۔ اس کی کوششیں رنگ لا رہی تھیں۔ جب وہ ڈھیروں شاپنگ بیگ کے ساتھ مالا کو لیے گھر واپس آیا تب اس کی پہلی مڈبھیڑ عینی سے ہوئی تھی۔ وہ اس کی طنزیہ نظروں سے بے نیاز اپنے کمرے میں چلا گیا تھا جبکہ بندیا بہت جوش کے عالم میں عینی کو نظر انداز کر کے مالا کی شاپنگ دیکھ رہی تھی مگر ایک، ایک چیز کو شاپر سے نکالتے ہوئے اس کا چہرہ فق ہو رہا تھا جبکہ عینی اس کی حالت سے لطف اندوز ہوتی تمسخرانہ انداز میں ہنس رہی تھی۔

”تمہاری بہن ابھی تک ان لوگوں کے سحر سے نہیں نکلی...... ابھی تک ان لوگوں کے سحر میں گرفتار ہے جن لوگوں نے اسے کتے کی طرح دھتکار دیا، انہی کی یاد میں دن رات مرتی ہے۔“ عینی کے چبھتے ہوئے الفاظ نے بندیا سمیت مالا کو بھی متوحش کر دیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے کبھی عینی کو اور کبھی چھوٹے چھوٹے کھلونوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں ریت چبھنے لگی تھی۔ ان ننھے منے کھلونوں سے خون ٹپک رہا تھا۔

”اسے یقین دلاؤ، کس کے خواب وخیال میں گم ہے یہ......؟ اور جو اتنے پیسے اجاڑ کر یہ ڈھیر اٹھا لائی ہے آخر کس کے لیے......؟ اسے تم لوگ احساس کیوں نہیں دلاتے؟ وہ بچہ تو کب کا مر چکا...... جس کے لیے ابھی تک خریداری کرتی پھرتی ہے۔“ عینی کے سفاک جملوں نے اور زہریلے لہجے نے سیڑھیاں اترتے ذی شاہ کو بھی جامد کر دیا تھا۔ لمحے بھر کے لیے تو وہ بھونچکا رہ گیا تھا۔ اسے عینی کے منہ سے نکلے شعلوں کا سارا عکس مالا کے چہرے پر دکھائی دے رہا تھا۔ مالا جو اَب بھی ساکت کھڑی عینی کو دیکھ رہی تھی۔ عینی کے الفاظ دہکتے انگارے معلوم ہو رہے تھے۔ وہ گویا کسی بھڑکتے گڑھے پر کھڑی تھی جس میں عینی نے اسے دھکا دے کر گرا دیا تھا۔ اب وہ منہ کے بل گری کراہ رہی تھی، چلّا رہی تھی، چیخ رہی تھی۔ اس کے وجود پر چھالے ابھر رہے تھے۔ آنکھوں سے خون نکل رہا تھا۔ دل درد کے احساس سے پھٹ رہا تھا۔ وہ اذیت کی انتہا پر کھڑی تھی۔ اس کی نگاہیں جانے کون، کون سا دردناک منظر دیکھ رہی تھیں۔ شاید وہ ایک مرے ہوئے نومولود کو دیکھ رہی تھی یا اپنے محبوب شوہر کو دیکھ رہی تھی۔ یا ایک خوفناک آنکھوں والی حسینہ کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایسی خوفناک آنکھیں کسی کی نہیں دیکھی تھیں۔ اس نے زندگی میں آج تک اتنی برفیلی اور روح تک کو خوف میں مبتلا کر دینے والی آنکھیں نہیں دیکھی تھیں۔ وہ ایسی ہی خوف وہراس میں مبتلا کر دینے والی آنکھیں تھیں۔ اس نے بڑی، بڑی خوب صورت آنکھیں دیکھی تھیں۔ غزالی آنکھیں، خوابناک آنکھیں، تابناک آنکھیں، خمار آلود آنکھیں، گہری آنکھیں، لمبی آنکھیں، بولتی آنکھیں مگر اتنی سرد اور برفیلی آنکھیں کسی کی نہیں دیکھی تھیں۔

علی عیسٰی کی بہن کے چہرے پر ایسی ہی آنکھیں سجی تھیں۔ روح کو سنسنا دینے والی، خوف میں جکڑ دینے والی، اندر تک کو کھوج لینے والی، جاسوس آنکھیں، کھوجتی آنکھیں، ذہنوں میں گھس جانے والی، سوچ کو کھرچ دینے والی، مقابل کو اندر تک پڑھ لینے والی آنکھیں۔ وہ کسی کی سوچ کو اندر سے نوچ لانے کی صلاحیت رکھتی تھی، اس کو ذہن کھوجنے کا چسکا تھا مالا نہیں جانتی تھی علی عیسٰی کی بہن کو ذہنوں اور سوچ میں گھسنے کا اسم آتا تھا۔ ان آنکھوں کا خوف اور برفیلی لہر آج تین سال گزر جانے کے بعد بھی مالا کے دل کو دہلا گئی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ عینی کے چہرے پر بھی ویسی ہی آنکھیں سج گئی ہیں مگر مون کی آنکھوں جیسی یہ آنکھیں نہیں ہو سکتی تھیں۔ اس نے اپنی آنکھیں میچ کر کانوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے۔ وہ اس منظر سے بھاگنا چاہتی تھی، وہ کسی تنہا گوشے کی طرف لپکنا چاہتی تھی۔ وہ خود کو ایک کمرے میں بند کر لینا چاہتی تھی مگر وہ کچھ بھی نہیں کر پائی۔ وہ اپنے بھائی کو قریب آنے سے بھی روک نہیں پائی تھی۔ وہ اسے اونچا بولنے سے بھی منع نہیں کر پائی تھی۔ حالانکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ذی شاہ، عینی پر چلّائے، اس پر غصہ کرے...... عینی نے کچھ غلط نہیں کہا تھا۔ عینی شاید ٹھیک ہی کہتی تھی۔ مالا ابھی تک انہی لوگوں کے حصار میں تھی جن لوگوں نے اسے کتے کی طرح دھتکار دیا تھا۔ وہ عینی کے تلخ مگر سچے الفاظ کو تسلیم کرنے کے باوجود بہت اذیت میں تھی۔ عینی نے آج اس کے ہر زخم سے کھرنڈ جو اتار دیا تھا۔ عینی نے آج تین سال پہلے کی ساری اذیتوں کو اس کی آنکھوں میں بھر دیا تھا۔

اس نے غم آلود آنکھوں سے اپنے بھائی کو دیکھا جو اس کے اندر کے اضطراب اور ٹوٹ پھوٹ کو محسوس کر کے بھابی پر چلّا رہا تھا۔ وہ اسے ٹوٹتا بکھرتا دیکھ کر تحمل کا مظاہرہ نہیں کر سکا تھا۔ وہ عینی پر الٹ پڑا تھا۔

”میری بہن کو کچھ ہوا تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ وہ مالا کی پتلیاں الٹتے دیکھ کر چلّا رہا تھا۔ وہ عینی کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔ عینی، دیور کو اچانک آتا دیکھ کر خفت زدہ رہ گئی تھی۔ اسے اپنی صفائی میں بولنے کے لیے کوئی الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ ذی شاہ کو اب کوئی وضاحت بھی نہیں چاہیے تھی۔ وہ بہن کی

بگڑی حالت کو دیکھ کر مزید زہر پھونکنا ترک کر کے اس کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔ مالا کا سہا دل ان بھاری لفظوں کی اذیت نہ سہتے ہوئے مدھم پڑ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اب بھی کچھ بھولے بسرے مناظر کھوج رہی تھیں۔ کبھی اِک مرا ہوا نومولود سامنے آجاتا۔ کبھی علی عیسیٰ کا مسکراتا چہرہ دل دھڑکا دیتا...... کبھی ہون کی برفیلی نگاہیں اسے خوف میں مبتلا کر دیتیں اور کبھی اسے اپنے بھائی کا چہرہ اپنی طرف متوجہ کرلیتا۔ وہ آج بھی بہت دن پہلے کی طرح سے مالا سے التجا کرتے کہہ رہا تھا۔

''تو اپنے دکھ مجھ سے کیوں نہیں کہتی؟ مجھے بتا، تیرے ساتھ علی عیسیٰ نے کیا، کیا تھا؟ آخر تین سال پہلے کیا ہوا؟ مجھے بتا مالا......! میں تیرے سارے دکھوں کا مداوا کروں گا، میں تیرے مجرم کو انجام تک پہنچاؤں گا۔'' اس کا بھائی آج بھی سوال کر رہا تھا، مالا آج بھی خاموش تھی، وہ اسے کیا بتاتی؟ وہ اپنے بھائی کو بھلا کیا بتا سکتی تھی اسے کسی کی برفیلی نگاہوں نے منجمد کر دیا تھا۔ وہ کسی کی خوفناک ترین آنکھوں کی دہشت میں مبتلا ہوگئی تھی۔ اسے زندگی میں پہلی مرتبہ کسی کی حسین تر آنکھوں سے بھی خوف آیا تھا۔

کیا خوب صورت آنکھیں بھی کسی کو سہا سکتی ہیں؟ کیا حسین چہرے بھی دہشت زدہ کر دیتے ہیں؟ شاید ایسا نہیں ہوتا...... مگر مالا کے ساتھ ایسا ضرور ہوا تھا۔ وہ ایک ملکوتی حسن رکھنے والی اپنی ہی ہم عمر ایک لڑکی سے پہلے ہی روز ہراساں ہوگئی تھی۔ مالا کو اس لڑکی کے سحر انگیز حسن نے خوفزدہ کر دیا تھا۔ وہ اس لڑکی کی آنکھوں کے سہا دینے والے تاثر سے پہلی ملاقات میں ہی دہشت زدہ رہ گئی تھی۔

اسے زندگی میں پہلی مرتبہ ایک حسین آنکھیں رکھنے والی لڑکی نے خوف کے قعر میں گرا دیا تھا۔ وہ تین سال گزر جانے کے بعد بھی اس لڑکی کی آنکھوں کے اس پہلے تاثر کے حصار سے نکل نہیں پائی تھی شاید اس لڑکی نے مالا کے وجود پر کوئی اسم پڑھ کر پھونک دیا تھا۔ اس لڑکی نے مالا کے ساتھ کیا اچھا کیا تھا؟ وہ اپنے بھائی کو بھلا کیا بتاتی؟ وہ اپنے بھائی کو کس طرح بتاتی......

اسے دودھ جیسے بگولوں میں بھیگتی اس شام کا ایک ایک منظر یاد تھا جب لاہور سے اڑنے والا جہاز من ہائیم کی سرزمین سے پہلے فرینکفرٹ کے نواحی جنگلات پر اڑ رہا تھا۔ اس دن کچھ دیر کے لیے آسمان صاف ہوگیا تھا۔ زمین پر ہریالی بکھری تھی۔ اور سبزے کے چوکور ٹکڑے فرش پر جلوہ افروز تھے۔ جنگلات کا رنگ سیاہی مائل تھا، مرغزار ہرے تھے اور کھیتوں کی طویل چادر بھی پھیلی تھی۔ دور کہیں پہاڑوں کے بیچ چاندی کی لہریں پھوٹ رہی تھیں۔ یہ شاید آبشاریں تھیں۔ کہیں پانی کی وسیع ٹکڑے دریاؤں کے مانند نظر آ رہے تھے۔ سرزمینِ جرمن یوں لگتی تھی گویا سبزے کا کوئی وسیع کھیت ہو جس میں بھوری، سبز، سنہری، زعفرانی، بسنتی فصل کی تر و تازہ کٹائی ہوئی ہو...... سبزے میں گھرے سفید مکانوں والے دیہات اور شہری آبادیاں سرخ بتیوں کے مانند نظر آتی تھیں۔ جہاز بلندی سے پستی کی طرف آ رہا تھا۔ منزل بہت قریب تھی، گویا دو ہاتھ کا درمیان میں فاصلہ ہو...... چہار سو دھنکی ہوئی روئی دکھائی دیتی تھی۔ سفید نرم نرم گولے اڑ رہے تھے۔ اس اجنبی دیس کی فضا میں بھی اپنائیت بھری مہک رچی تھی۔ یہ مہک نہ جانے کہاں سے اٹھ رہی تھی۔ یہ نرم نرم محبت بھری باس کہاں سے آ رہی تھی۔ شاید دریاؤں کے قریب ''بیلے'' پر بہار رُت کا موسم گزر رہا تھا۔ رنگِ رنگ کے پھول لہرا رہے تھے۔ خوشبو کی مہکار میں محبت کہاں سے گوندھی گئی تھی۔

یہ نگر کسی شاعر کا خواب اور کسی مصنف کی کہانی کا مرکزی کردار بن سکتا تھا۔ اسی من ہائیم میں جانے کیسی، کیسی محبت کی کہانیاں پروان چڑھی تھیں۔ محبت اس شہر کی نس نس میں سانس لیتی تھی اور میرین چرچ کے اونچے نوکیلے کلس پر سسکاریاں لے لے کر دم توڑ دیتی تھی۔

یہ علی عیسیٰ کا من ہائیم، وائن ہائیم تھا۔ من ہائیم سے بارہ میل پر واقعی یہ چھوٹا سا پہاڑی شہر تھا۔ وائن ہائیم یعنی شراب کے نشے میں مخمور یہاں انسان نہیں، طلسماتی رومانوی کردار بسا کرتے تھے۔ کالی چمکتی سڑکوں پر چلتے پھرتے نظر آیا کرتے تھے۔ اس شہر کی فضا میں محبت رچی ہوئی تھی۔

سرمئی سڑکوں پر خوش پوشاک خوب صورت لوگ چلتے تھے...... اور شیشوں کی دکانوں میں چینی کی گڑیا جیسی سیلز گرلز راہ چلتوں کو اپنی طرف متوجہ کرلیتی تھیں۔ اس شہر کے پس منظر میں بلند پہاڑوں کی سرمئی چوٹیاں تھیں اور انہی پہاڑوں پر کہیں کہیں سفید خوب صورت مکان... جانے ان پتھروں پر یہ مکان کھڑے کیسے تھے۔

کسٹم سے فارغ ہو کر جب وہ ڈیڈی اور چاچو کی ہمراہی میں ائرپورٹ کی جگمگاتی دنیا سے باہر آئی تو آس پاس وہی اپنائیت بھری مہک چکراتی ہوئی اس کے نتھنوں سے ٹکرائی تھی۔ کچھ بولتی کچھ کہتی، کچھ مدہوش کرتی خوشبو...... اس نے نگاہ اٹھا کر سامنے دیکھا تو وہ اپنائیت بھری مہکار مجسم انسانی روپ میں دکھائی دینے لگی تھی۔ وہ ایک دم متحیر رہ گئی تھی۔ اس کی نگاہوں نے پہلی مرتبہ علی عیسیٰ کو دیکھا تھا۔

وہ اس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد تھا۔ اس نے اپنے باپ اور بھائیوں کے بعد علی عیسیٰ کو دیکھا تھا، وہ اسے دیکھ کر مایوس ہرگز نہیں ہوئی تھی جبکہ مایوس تو علی عیسیٰ بھی اسے دیکھ کر نہیں ہوا تھا۔ اس نے باپ اور تایا کی موجودگی میں صرف ایک مرتبہ مالا کی طرف دیکھا تھا۔ اسے مالا بہت ڈری سہمی نظر آئی تھی۔

ان کے درمیان باقاعدہ بات چیت کا آغاز کچھ دیر بعد ہوا تھا۔ تعارفی مرحلے کی ضرورت تو نہیں

تھی تاہم حسیب چاچو نے یہ رسم پھر بھی نبھائی تھی۔ وہ بہت تفاخر سے اپنے لاڈلے بیٹے کو دیکھ کر ڈیڈی سے کہہ رہے تھے۔

”میں ناں کہتا تھا عیسٰی ضرور آئے گا۔ چاہے کتنا بھی مصروف کیوں نہ ہو۔ ساری میٹنگز بھاڑ میں جھونک کر بھی چلا آئے گا۔ میرا یقین کچھ غلط نہیں تھا۔“ وہ بیٹے سے گلے مل کر اب بہت جوش سے ڈیڈی کو بتا رہے تھے۔ ڈیڈی اپنے بھائی کے یقین پر ان کے اس بھروسے کی تکمیل پر مسکرا رہے تھے۔

اسے حسیب چاچو کچھ جذباتی سے لگے تھے تاہم علی عیسٰی ان سے بہت مختلف تھا۔ اس میں بہت ضبط، تحمل اور ٹھہراؤ نظر آ رہا تھا۔ وہ سنجیدہ نہیں تھا تاہم بہت سلجھا ہوا نظر آتا تھا۔ جلد باز نہیں تھا، ٹھہر ٹھہر کر گفتگو کرتا تھا جبکہ چاچو نہ صرف تیز گفتار تھے بلکہ کچھ جلد باز بھی نظر آتے تھے۔ ہر کام عجلت اور جلد بازی میں کرنے والے تھے...... مگر اپنی ان خامیوں سے الگ بہت شفیق اور محبت کرنے والے باپ تھے...... اور مالا کو لگتا تھا وہ علی عیسٰی کے عشق میں گرفتار تھے۔

پورے سفر کے دوران اور اب تک وہ علی عیسٰی کے گیت گانے میں ہی مصروف تھے۔ ڈیڈی اس کی تعریفوں پر بہت خوش نظر آ رہے تھے تاہم وہ اپنے باپ کے بے لاگ تبصروں پر کچھ جھینپا جھینپا بیٹھا ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ وہ انہیں خود لینے آیا تھا اور بہت اہم میٹنگ چھوڑ کر آیا تھا حالانکہ چاچو نے اسے منع بھی کیا تھا اگر وہ بہت مصروف ہے تو نہ آئے مگر علی عیسٰی ان کے منع کرنے کے باوجود بھی چلا آیا تھا۔

”بھائی جان! آپ کو میرا بیٹا کیسا لگا؟ یقین مانیں پورے مشرق سے لے کر مغرب تک میرے بیٹے جیسا فرمانبردار داماد آپ کو کہیں نہیں ملے گا۔ میں دعوے سے کہہ رہا ہوں۔“ چاچو مڑ مڑ کر ڈیڈی کو مخاطب کر رہے تھے۔ ان کی گفتگو اردو میں ہو رہی تھی۔ مالا کو لگا، علی عیسٰی اردو سمجھتا ہے اور وہ ان کی باتوں کو زیر لب مسکرا کر انجوائے بھی کر رہا تھا مگر وہ چاچو کی طرح مڑ مڑ کر دیکھنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ تاہم جب چاچو مسکراتے ہوئے اپنی عجلت پسندانہ فطرت کے باعث اگلا لائحہ عمل بھی دہرانے لگے تھے تب علی عیسٰی نے کچھ چونک کر پیچھے ایک نظر دیکھا تھا۔ وہ مرر میں دیکھنے کے بجائے گردن موڑ کر دیکھنے کے بعد دوبارہ سے سیدھا ہو گیا تھا جبکہ چاچو اپنی دھن میں مگن کہہ رہے تھے۔

”کل کا دن آپ کا ریسٹ ہوگا...... پرسوں شام کو نگاہ جما کر میرے بیٹے کا تفصیلی ایکسرے ملاحظہ کر کے نکاح کا وقت مقرر کر لیجیے گا۔“ وہ بہت ہلکے پھلکے لہجے میں کہتے ہوئے اچانک سنجیدہ ہو گئے تھے اور مالا کی تو چاچو کی جلد بازیاں دیکھ کر سانس تک رک گئی۔ تبھی علی عیسٰی نے بھی مڑ کر دیکھا تھا پھر چاچو کی طرف متوجہ ہو گیا جو اسے ڈپٹتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

”تم نے کارڈ چھپوائے یا نہیں؟“ یہ اہم بات پوچھنے کا انہیں اب خیال آیا تھا اور جوں ہی انہیں خیال آیا وہ ساری باتیں بھلا کر علی عیسٰی کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

”یہ کام میں بھول سکتا تھا کیا......؟“ اس نے زیر لب مسکرا کر باپ کو مطمئن کرنا چاہا تھا مگر وہ مطمئن ہرگز نہیں ہوئے تھے۔

”کارڈ چھپ گئے تھے تو انہیں تقسیم بھی کروا دیتے۔ یہ کام تم نے سوزن کے ذمے لگا دینا تھا۔ ویسے تو سارے زمانے میں پھرتی رہتی ہے۔“ انہوں نے اس کی خالہ زاد بہن کا ذکر کیا تھا۔ سوزن اس کی کزن اور موون کی بیسٹ فرینڈ تھی۔ عموماً انہی کے گھر میں رہتی تھی۔ آج کل نہ جانے کہاں غائب تھی۔ سننے میں آیا تھا کہ اپنے باپ سے ملنے گئی ہے۔

”یہ کام بھی ہو چکا ہے۔“ علی عیسٰی نے باپ کو تسلی دی تھی۔ یقیناً وہ ان سے بھی زیادہ عجلت پسندی کا مظاہرہ کر چکا تھا۔ مالا ان باپ بیٹے کی عجلت پسندی

پر سخت حیران تھی۔ کچھ دیر پہلے والی علی عیسٰی کے متعلق اس کی رائے بھی بدل چکی تھی۔ یقیناً وہ اپنے باپ کی طرح ہی عجلت پسند تھا مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی وہ فرمانبردار بھی بہت تھا...... باپ کے حکم کو کیسے نظر انداز کر دیتا جبکہ وہ اس کی شادی طے کرنے سے پہلے ہی کارڈ چھپوانے کا حکم نامہ جاری کر چکے تھے۔

”ویٹس ویری گڈ میری جان......! تم نے آدھی فکر میری مُکا دی ہے۔“ اب وہ ایک مرتبہ پھر پرانی جون میں آ چکے تھے۔ مگر علی عیسٰی کے چہرے پر خاصی فکرمندی نظر آ رہی تھی۔ وہ کچھ پریشان اور مضطرب تھا۔ مالا نے پہلے بیٹھ کر کن انکھیوں سے علی عیسٰی کے چہرے پر پھیلے تفکر کا اندازہ لگا لیا تھا۔ جانے وہ ایک دم پریشان کیوں ہو گیا تھا اور جانے اسے پریشان دیکھ کر مالا کا دل کیوں بجھنے لگا تھا۔ اسے علی عیسٰی کا پریشان ہونا پریشان کر رہا تھا۔ اسے اس کے چہرے کی بے چینی مضطرب کر رہی تھی۔ وہ مسکراتا ہوا ایک دم متفکر کیوں ہو گیا تھا۔ مالا کتنی بے بس تھی، وہ علی عیسٰی کو براہِ راست مخاطب نہیں کر سکتی تھی مگر کچھ دیر بعد چاچو کے پوچھنے پر علی عیسٰی نے اپنی فکر اور پریشانی کو ظاہر کر دیا تھا۔ وہ چاچو سے انتہائی خفا لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”آپ نے جو کارڈز پر ڈیٹ لکھوانے کو کہا تھا، وہ کل کی ہے جبکہ نکاح آپ پرسوں کریں گے۔ حد ہے پاپا! تایا جان نے جو ایکسرے پرسوں کرنا ہے وہ آج ہی کر لیں تاکہ نکاح اپنے وقت پر ہو جائے۔“ وہ بالکل چاچو جیسا ہی تھا سنجیدگی سے بولتا ہوا کہیں کہیں مزاحیہ انداز میں گفتگو کو موڑ دیتا ہوا۔ اب بھی بہت سنجیدگی سے بات کرتے ہوئے آخر میں وہ تھوڑا شرارتی سا ہو گیا تھا۔ اس کی انتہائی شستہ رواں اردو کو سن کر جہاں مالا کی جان میں جان آئی تھی وہیں ڈیڈی اور چاچو بھی بے ساختہ ہنس پڑے تھے۔

”تمہارا بھی کوئی جواب نہیں حسیب......“ ڈیڈی نے مسکرا کر چاچو کو چھیڑا تھا۔ وہ ان کی جلد بازی پر مالا کی طرح کچھ کچھ متحیر بھی تھے تاہم مالا کو لگتا تھا وہ دونوں بھائی پاکستان میں ہی سب کچھ طے کر کے آئے تھے۔

”تایا جان! میں نے پاپا سے کہا تھا کہ آپ لوگ آ جائیں پھر باقی کے معاملات دیکھ لیں گے مگر پاپا کی ایک ہی ضد تھی۔ اگر میرے آنے تک کارڈز نہ چھپوائے...... تو تمہیں جرمنی سے بے دخل کروا دوں گا۔“ علی عیسٰی کی مسکراتی آواز ایک مرتبہ پھر انہیں اپنی طرف متوجہ کر چکی تھی۔ تمام سفر بہت ہلکی پھلکی گفتگو کے دوران کٹا تھا۔ چاچو اور اس کی چھیڑ چھاڑ نوک جھوک میں ذرا بھی اجنبیت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اسی سفر کے دوران اسے پتا چلا تھا کہ کل شام اس کا نکاح ہے۔ یہ ایک عجیب سی شادی تھی۔ کم از کم مالا کو تو بہت عجیب لگ رہی تھی۔ جس میں ایک دلہن اپنے دولہا کے پاس سمندر پار سے آئی تھی۔ حالانکہ اس میں کچھ عجیب نہیں تھا مگر ایسے تجربے سے وہ پہلی مرتبہ گزر رہی تھی سو سب کچھ بہت نیا، الگ اور عجیب نظر آ رہا تھا۔

اسی سفر میں علی عیسٰی نے دو چار مرتبہ خود ہی اسے مخاطب بھی کیا تھا۔ ڈیڈی اور چاچو کی موجودگی میں وہ کچھ جھینپ رہی تھی تاہم اسے ہوں، ہاں میں جواب تو دینا ہی تھا۔ وہ نہ بھی بولتی تب بھی چاچو نے زبردستی ہر بات میں اسے گھسیٹ لینا تھا۔ اس پورے سفر کے دوران میٹھا میٹھا نہایت شیریں انداز میں بولتا علی عیسٰی ڈیڈی کو ہی نہیں بلکہ مالا کو بھی اپنا گرویدہ کر چکا تھا۔ چاچو نے صحیح کہا تھا ان کے بیٹے کو دیکھ کر وہ دونوں باپ بیٹی اس کے عشق میں مبتلا ہو چکے تھے۔ وہ ایسا ہی تھا جسے دیکھ کر بس اس سے محبت کی جاتی۔

سرمئی سڑک پر فراٹے بھرتی اس کی لاڈلی

benz ایک بہت ہی خوب صورت مکان کے سامنے آرکی تھی۔ benz سے عشق کی بھی ایک الگ کہانی علی عیسٰی نے اسے سنائی تھی۔ دورانِ سفر بہت کم گفتگو ان دونوں کے درمیان ہوئی تھی اس کے باوجود جب گیراج سے ڈیڈی اور چاچو نکل کر اندر چلے گئے اور وہ ان لوگوں کا سامان ڈگی میں سے نکال رہا تھا تب مالا ایک دم رک گئی تھی۔ اسے منہ اٹھا کر اندر چلے جانا کچھ مناسب نہیں لگا تھا وہ بھی اس صورت میں جب اتنا ڈھیر سامان وہ اکیلے ہی ڈھونے ... والا تھا۔

تب مالا نے سوچا، وہ کچھ سامان اٹھانے میں اس کی مدد کرے گی، اسے رکتا دیکھ کر وہ کچھ ٹھٹک گیا تھا۔ مگر سامان اٹھا کر اندر لے جانے سے پہلے اس نے اپنی پیاری benz کی ونڈ اسکرین بہت اچھی طرح چمکا دی تھی حالانکہ اس کی گاڑی پر ذرا سی گرد بھی نہیں تھی اس کے باوجود ...... دلجمعی سے گاڑی صاف کر کے مالا کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

”تمہارے آنے سے پہلے میری زندگی میں بس benz تھی۔ مجھے اس سے لافانی محبت ہے مگر اب میں اس محبت کرنا چھوڑ کر بس تم سے محبت کروں گا۔ مجھے تم بہت اچھی لگی ہو، ایک دم معصوم اور دلنشین...... لگتا ہے، تمہاری سوچ پر کسی کے نام کی ہلکی سی بھی گرد نہیں پڑی۔ میں جوہر شناس ہوں ڈیئر......! اتنا حیران کیوں ہوتی ہو...... چلو تم اندر آؤ...... میں سامان اٹھاتا ہوں...... benz کو تو چمکا دیا ہے...... اب یہ صبح آفس جانے کے لیے تیار ہے...... خیر، آفس سے تو کل چھٹی کروں گا۔ آفٹر آل، اتنی دور سے مہمان آئے ہیں۔ ان کو ٹائم دینا تو بنتا ہے، مہمان بھی چونکہ خاص الخاص ہیں...... سو وقت بھی زیادہ دینا ہوگا۔ میری باتیں تو ختم نہ ہوں گی۔ چلو اندر چلتے ہیں...... تم بھی کیا سوچتی ہوگی، گاڑی میں کیسا بیبا بنا ہوا تھا۔“ وہ بغیر رکے بولے گیا۔

”دراصل تایا جان کی موجودگی میں ذرا کم بول رہا تھا۔ حالانکہ ہم دونوں باپ، بیٹا بہت منہ پھٹ اور باتونی ہیں۔ تم ہماری باتیں سن سن کر کبھی بور نہیں ہوگی۔ میں یہ دعوے کے ساتھ کہتا ہوں۔“ علی عیسٰی اپنی benz سے زیادہ تیز بولنے والا تھا۔ مالا نے فی الفور ایک مرتبہ پھر اپنی رائے بدل لی تھی۔ وہ منہ کھولے حیرانی سے اسے بولتا سن اور دیکھ رہی تھی۔ اسے علی عیسٰی کا بولنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ بہت نرم ملائم لہجے میں بولتا تھا...... بہت میٹھا اور دل آویز انداز ...... اسے دلوں میں گھر کرنا آتا تھا۔ اسے مالا کے دل میں گھر بنانا تھا۔ اسے دلوں میں گھر بنانا اور دلوں میں بسنا آتا تھا۔ وہ مالا کے دل میں ہمیشہ کے لیے رچ بس گیا تھا۔ وہ عمر بھر کے لیے سمندر پار سے آئی اس چھوٹی سی لڑکی کے دل میں ٹھہر گیا تھا۔ وہ اس لڑکی کی آنکھ کا پہلا خواب تھا۔ وہ benz سے محبت چھوڑ کر سمندر پار سے اپنے بہت پیاروں کو چھوڑ کر آئی اس ڈری سہمی لڑکی سے محبت کرنے لگا تھا۔ وہ benz سے محبت مذاقاً نہیں کرتا تھا۔ اسے اپنی گاڑی سے بہت پیار تھا اور وہ اس کی حفاظت بھی بہت کرتا تھا۔ مالا کو اچھی طرح یاد تھا۔ ایک دن کسی جذباتی لمحے کی قید میں اس نے مالا سے کہا تھا۔ ”خدانخواستہ تم میری زندگی سے چلی گئیں تو یہ benz بھی میرے ساتھ نہیں رہے گی۔“ وہ جو کہتا تھا ٹھیک ہی کہتا تھا اور اکثر اپنی کہی باتوں پر عمل بھی کر دکھاتا تھا۔ اس نے سچ کہا تھا۔ مالا اس کی کمپنی میں کبھی بور نہیں ہوئی تھی...... اور نہ وہ اس کی کہی بات کو کبھی جھٹلا پائی تھی۔

اس بھیگتی سرمئی شام محض گیراج سے لے کر اندرونی حصے تک کے دوران علی عیسٰی نے کتنی ..... بے تکلف فضا قائم کر لی تھی۔ اجنبیت کی گویا ایک، ایک دیوار کو ہمیشہ کے لیے گرا دیا تھا۔

یہاں آتے ہوئے جتنے اس کے دل میں خدشے تھے سب ایک، ایک کر کے فنا ہو گئے تھے۔

اگلی صبح اتنی چمکیلی، تابناک اور روشن تھی کہ مالا کی زندگی میں ایسی کوئی سحر آج سے پہلے طلوع نہیں ہوئی تھی۔ علی عیسٰی کے خوب صورت گھر میں یہ اس کی پہلی سویر تھی انتہائی دلنشین اور جگمگاتی ہوئی...... آج ڈیڈی اور چاچو بھی بے انتہا خوش تھے۔ رات کو شادی کی تقریب تھی تاہم یہ گھر شادی والا ہرگز نہیں لگ رہا تھا۔ یہاں ڈیڈی، چاچو اور علی عیسٰی کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ وہ حیران تھی، رات سے اس نے چاچو کی اکلوتی بیٹی مون کو نہیں دیکھا تھا۔ نہ وہ ان لوگوں سے ملنے آئی تھی۔ جب وہ صبح اٹھ کر نیچے آئی تب بہت ہی اشتیاق سے جگمگ کرتے کچن میں علی عیسٰی کھڑا ناشتا بنا رہا تھا۔ وہ بہت ہی مصروف نظر آرہا تھا اور اس کے برابر یقیناً کلینر (ملازمہ) کھڑی تھی۔ وہ علی عیسٰی کی ناشتا بنانے میں مدد کر رہی تھی اور یقیناً علی عیسٰی اس کے ناشتے بنانے سے مطمئن نظر نہیں آرہا تھا۔ تبھی اسے مختلف قسم کی ہدایات دیتا خود بھی کام میں لگا ہوا تھا۔ اسے موجود پا کر وہ کچھ حیران سا مڑا۔

”اتنی جلدی اٹھ گئیں تم، میں تو سوچ رہا تھا کہ لنچ ٹائم تک اٹھو گی۔ اِدھر بریک فاسٹ کم لنچ ریڈی ہو رہا ہے۔“ وہ مسکراتا ہوا اس کی معلومات میں اضافہ کر رہا تھا۔ گویا ناشتے کے بجائے لنچ کرتا تھا۔

”میں بھوک کی کچی نہیں، ڈنر تک کا بھی انتظار کر سکتی ہوں۔“ مالا نے کندھے اچکا کر علی عیسٰی کی طرف دیکھ کر کہا۔ وہ کچن میں جائزہ لینے نہیں آئی تھی... بلکہ مختلف پکوانوں کی خوشبو کا پیچھا کرتی علی عیسٰی کو تلاش رہی تھی۔ کچن تک آنے میں اسے دشواری نہیں ہوئی۔ وہ علی عیسٰی کی آواز پہچان چکی تھی۔ یقیناً وہ ملازمہ کے ساتھ کسی اور زبان میں بات کر رہا تھا۔ اب چونکہ وہ کچن میں آچکی تھی سو فارغ بیٹھنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ وہ دو قدم کا فاصلہ مٹاتی کوکنگ رینج تک آگئی۔ تب اس جرمن ملازمہ نے مسکرا کر اسے خوش آمدید کہا تھا۔ وہ چھبیس ستائیس سال کی لڑکی تھی۔ ذرا موٹی سی مگر خاصی خوش اخلاق تھی اس سے مسکرا کر اپنی زبان میں پوچھنے لگی۔ مالا جو اس کی عمر کا اندازہ کر رہی تھی کچھ چونک سی گئی۔

اس کا اخلاق لہجے سے چھلک رہا تھا۔ بہت میٹھے لہجے میں نہ جانے کیا بول رہی تھی۔ مالا ہونق سی علی عیسٰی کا منہ تکنے لگی۔ تب اس نے فرائنگ پین میں آلو کے قتلے فرائی کرتے ہوئے اسے بتایا تھا۔

”نینی تمہارا حال پوچھ رہی ہے۔ اسے تم سے مل کر بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے۔“ علی عیسٰی کے وضاحتی انداز کو ملاحظہ کر کے جواباً مالا نے بھی خاصے جوش کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ اخلاق کے بدلے... بداخلاقی نہیں دکھا سکتی تھی۔ اس کے نرم رویے کو محسوس کر کے نینی کچھ اور پھیلتی نہ جانے پھر کون سی رگت مت کرنے لگی تھی۔

اب کہ نینی نے بولتے ہوئے سنگترے کا جوس اس کے سامنے کیا تھا۔ مالا نے یہی سمجھا وہ اس سے پوچھ رہی ہے کہ جوس لوگی یا نہیں۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا تب ایک مرتبہ پھر علی عیسٰی نے مداخلت کی تھی۔

وہ اسے بغیر شرمندہ کیے بہت نرمی سے بتا رہا تھا۔

”نینی پوچھ رہی ہے تم کیا کھانا پسند کرو گی؟“ علی عیسٰی گویا ان دونوں کے درمیان گفتگو بڑھانے کا سبب بن گیا تھا۔ اس نے مالا کو بتایا تھا نینی کو انگلش نہیں آتی، وہ صرف اپنی مادری زبان میں بات کر سکتی تھی۔ تب مالا کو لگا اسے دیواروں سے ہی زیادہ ہم کلام ہونا پڑے گا۔ ظاہری بات تھی چند دن تک علی عیسٰی گھر میں تھا بعد میں اسے دفتر بھی جانا تھا۔ تب نہ جانے اس کا کیا بنتا......؟ مگر وہ بعد کی باتوں کو ابھی سے نہیں سوچنا چاہتی تھی۔ کچھ دیر بعد نینی نے جوس اور فرائی شدہ قیمہ سلائس میں سجا کر اس کے سامنے رکھا تھا۔

”لنچ بس تیاری کے آخری مراحل میں ہے تب

تک تم جوس اور سینڈوچ کھالو۔'' علی عیسیٰ، نینی کو برتن لگانے کا کہہ کر اس کے سامنے رکھے اسٹول پر بیٹھ گیا تھا۔ اب وہ اس کے سامنے بھلا کیسے کھاتی؟ جو ایک گھونٹ جوس کا بھرا تھا۔ وہی حلق میں پھنس گیا تھا۔ اسے لگا، وہ کبھی اس کے سامنے کچھ کھا نہیں سکے گی۔ وہ بہت پُرشوق نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ مگر شاید وہ اسے نہیں سینڈوچ کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے سینڈوچز کو چکھا تک نہیں تھا۔

''کیا تمہیں پسند نہیں آیا؟ آج تو سب کچھ دیسی بنایا ہے، تم اسے چکھو تو سہی۔'' اب وہ اتنے پیار سے مجبور کر رہا تھا تب مالا کو سینڈوچ چکھنا ہی پڑا۔ وہ تو شاید اسے پورا سینڈوچ کھلا کر اٹھنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ سو مالا نے اس کا دھیان بٹانے کی غرض سے کہا۔

''مون کہاں ہے؟ وہ نظر نہیں آئی؟'' مالا کو موضوع بدلنے کے لیے اتنا اچھا مون کے علاوہ ٹاپک نہیں مل سکتا تھا۔ اس کا سوال سن کر علی عیسیٰ قدرے بجھ سا گیا تھا۔ اس کے چہرے کی جوت بھی ہلکی پڑ گئی تھی۔ وہ اتنا اداس اور مضطرب نہ جانے کیوں ہو گیا تھا۔ اس نے سوچا وہ اپنا سوال پھر سے دُہرائے مگر اس کے سوال دُہرانے سے پہلے ہی علی عیسیٰ نے بہت بجھے لہجے میں بتایا تھا۔

''مون ہماری نانی کی طرف ہوتی ہے۔ ممی کے بعد اسے نانی نے اپنے پاس رکھ لیا تھا پھر بعد میں پاپا اسے لے آئے مگر اب وہ پھر نانی کے گھر چلی گئی ہے۔ ہماری گرینی موسٹ بہت نائس ہیں۔'' علی عیسیٰ نے مون کے متعلق بتاتے ہوئے شاید بہت ساری باتوں کو چھپا لیا تھا۔ اس نے مالا کو یہ نہیں بتایا تھا مون اِن باپ، بیٹے کے ساتھ لڑائی کر کے گئی ہے اور وہ ان دونوں سے ناراض تھی۔ علی عیسیٰ نے مزید مون کے متعلق بات کرنے سے گریز کرتے ہوئے نینی کے بلانے پر اسے باہر آنے کا اشارہ کیا تھا۔ کچھ دیر بعد ڈیڈی اور چاچو بھی آگئے تھے۔ کھانا بہت ہی خوشگوار ماحول میں کھایا گیا تھا۔ جانے کون کون سی ڈشز تھیں۔ ان کے نام جانے بغیر کھانے کی لذت اور ذائقے کو انجوائے کرتے ہوئے وہ علی عیسیٰ اور چاچو کی مزیدار گفتگو سن رہی تھی۔ تب چاچو نے مالا کو دیکھ کر شرارتی انداز میں کہا۔

''تم بہت خوش ہو رہی ہو ناں...... کہ جرمن فوڈ دیسی کھانوں جیسا ملا جلا ہے تو بیٹا...... ! زیادہ خوش فہمی میں مبتلا مت ہونا...... یہ تو آج میرے بیٹے نے خاص الخاص تم لوگوں کے لیے ہاٹل براتن، سوپن، گے میش تر سالات، اور دوت کوہل جیسے آئٹم بنوائے ہیں۔ بالکل دیسی کھانوں جیسی لذت اور ذائقہ ہے تاکہ تم آتے ساتھ فاقے کرنے نہ لگ جاؤ۔'' چاچو کی شرارتی نظریں محسوس کر کے مالا کچھ جھینپ گئی تھی جبکہ علی عیسیٰ نے فوراً مالا کی طرف داری کی تھی۔

''پاپا! یہ ہمارے کھانے بھی اتنے ہی ذوق شوق سے کھائے گی مجھے پورا یقین ہے۔'' علی عیسیٰ نے نہ جانے کس رو میں اس کی طرفداری کرتے ہوئے اتنا بڑا دعویٰ کر لیا تھا۔ اِدھر تو چاچو فوراً اس کا امتحان لینے پر تیار ہو چکے تھے۔ وہ شاید بیٹے کا دعویٰ بودا ثابت کرنا چاہتے تھے۔ وہ تو ہاٹل براتن کو بہ مشکل نگل رہی تھی...... اب وہ ان باپ بیٹے کی گفتگو سن کر مزید دہل گئی۔ چاچو نے ایک پیالے میں ڈھیروں کریم سے گندھی ایک میٹھی چیز ڈال کر مالا کی طرف بڑھا دی تھی۔ سفید کریم میں لتھڑی وہ کوئی ناخ تیش تھی شاید برفی یا گلاب جامن کی موٹی سی گولی۔ مالا میٹھا بہت کم کھاتی تھی اور یہ عجیب سی سویٹ ڈش تو اس کے حلق سے نیچے اتر ہی نہیں سکتی تھی مگر چونکہ چاچو نے علی عیسیٰ کو چیلنج دے دیا تھا سو وہ علی عیسیٰ کی ہتک کیسے گوارا کر سکتی تھی۔

اس نے بہت خوشگوار انداز میں (دل ہی دل میں نہایت تکلیف اور مشقت سے) چمچ بھر کے منہ میں رکھ لیا تھا...... اور مالا کی یہ کوشش علی عیسیٰ کو مسکرانے

پر مجبور کر گئی تھی، اب وہ دوسرا اسپون بھر کر منہ میں رکھ رہی تھی۔ اسے یہ کرسٹل کی شیوسل (پیالہ) خالی کرنا تھی جو ناخ تیش کی گولی اور ڈھیرے، اناس، یفیر زرخ اور کریم سے بھری ''کے پک'' سے تیار اور لبالب بھری تھی۔ اتنی مٹھاس کو ہضم کرنا آسان نہیں تھا...... مگر وہ علی عیسیٰ کے ٹہوکے دینے اور منع کرنے کے باوجود بھی مسلسل کھائے جا رہی تھی۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ مالا سے اتنا میٹھا بہ مشکل کھایا گیا ہوگا مگر وہ اس کے منع کرنے کے باوجود بابا کا چیلنج پورا کر چکی تھی۔ اس نے علی عیسیٰ کے کہے لفظوں کی لاج رکھ لی تھی۔ ڈائننگ ٹیبل پر موجود سب افراد حیران تھے۔ تب چاچو نے فوراً اسے انعام کے طور پر ایک بوسے کے ساتھ کچھ بڑے نوٹ بھی دیے تھے۔ وہ اس انعام پر ایک مرتبہ پھر جھینپ گئی تھی تاہم اگلے تین ماہ تک چاچو مالا کو اسی بات پر چھیڑتے رہے تھے۔

اسی خوشگوار اور گلابی شام وہ علی عیسیٰ کی زندگی میں شامل ہو گئی تھی۔ نقرئی آبشاروں کے درمیان موجود اس سرخ ہوٹیل میں ان کی شادی اور نکاح کی تقریب بہت دھوم دھام سے انجام پائی تھی۔ سیکڑوں لوگوں نے شادی میں شرکت کی تھی۔ نہ جانے چاچو کے کس کس بندے سے گہرے مراسم تھے۔ یہاں تو رنگ و بو کا سیلاب اتر آیا تھا۔ حسین تر جگمگاتے ملبوسات میں تتلیاں اڑتی پھر رہی تھیں۔

یہاں کلاسیکی موسیقی کا ایک پروگرام بھی ہونے والا تھا۔ علی عیسیٰ کے کئی دوست سُر سنگیت کی تانیں لگا رہے تھے۔ ماحول بہت خوشگوار تھا۔ تبھی مشرقی لبادے میں لپٹی سرخ لہنگے کو زیب تن کیے مالا نے محسوس کیا تھا کہ علی عیسیٰ اس کے آس پاس کہیں نہیں ہے۔ جانے وہ نکاح کے بعد کہاں چلا گیا تھا؟ مالا کے دل میں کہیں دور بے چینیاں چٹکیاں بھر رہی تھیں۔ یہ سحر انگیز محفلِ موسیقی بھی اس کا دل خوش نہیں کر پا رہی تھی۔ اس کے دل کی ہر خوشی علی عیسیٰ کے ساتھ ہی تو جُڑی تھی۔ اس کی سوچیں وسوسوں کے گرد چکر کھا رہی تھیں۔ جب ایک دم پورا ہال اندھیرے میں ڈوب گیا تھا۔ اس کا دل لمحے بھر کے لیے رک سا گیا تھا پھر کچھ دیر بعد ہوٹل کا ہال موم بتی کی مدھم روشنیوں سے سحر انگیز طور پر روشن ہو گیا تھا۔ ویٹرز اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے کچھ موم بتیوں کو روشن کر رہے تھے۔

پھر مالا کی آنکھوں نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا تھا۔ انٹرنس ڈور سے داخل ہوتا علی عیسیٰ ریڈ کارپٹ پر کسی کا ہاتھ تھامے چل رہا تھا۔ اس کے برابر ریشمی روک پر سیاہ موتیوں سے بھری شرٹ پہنے ایک بہت خوب صورت لڑکی سج، سج کر قدم اٹھا رہی تھی۔ اس کے بال بہت لمبے تھے، اتنے لمبے اور سرخ تھے گویا ریشم کی سرخ آبشار ہو...... اس نے بالوں کی بہت اونچی پونی کر رکھی تھی اور اس پونی میں نگینے جڑے تھے۔ سر پر یاقوت اور ہیرے سے سجا...... کراؤن پہن رکھا تھا۔ اس لڑکی کا سر جھکا ہوا تھا۔ اور وہ اسٹیج تک سر جھکائے ہی آئی تھی۔ اس کے بالوں کی لمبائی دیکھ کر مالا کو اپنے گھنے، لمبے سیاہ بال کچھ چھوٹے محسوس ہونے لگے تھے اور اس کے کراؤن سے نکلتی روشنیوں کا کوئی انت نہیں تھا۔

علی عیسیٰ اس لڑکی کو بالکل اس کے سامنے لے آیا تھا۔ اب وہ بہت خوشگوار موڈ میں اس لڑکی کا مالا سے تعارف کروا رہا تھا۔

''یہ مون ہے میری چھوٹی بہن۔'' علی عیسیٰ کے لہجے میں اپنی بہن کے لیے بہت محبت تھی تو گویا وہ مون کو منا کر بالآخر لے ہی آیا تھا۔ جانے وہ اس کے ساتھ آ کیسے گئی تھی؟ مالا نے سنا تھا، وہ بہت ضدی اور ہٹ دھرم ہے، اپنی کہی بات سے پیچھے نہیں ہٹتی۔ وہ بہت غصہ ور اور عجیب سا مزاج رکھتی تھی۔ اتنی مختصر سی دیر میں بھی مالا اس کے بارے میں بہت کچھ جان گئی تھی۔ اسے مون بہت نخریلی محسوس ہوئی تھی۔ ایک دم مغرور سی، کچھ کچھ اکھڑ اور بہت ہی عجیب...... وہ

عجیب کیوں تھی؟ پہلی ملاقات میں ہی وہ مالا کو بہت عجیب لگی تھی۔ دراصل وہ بہت ہی عجیب تھی۔ مالا کو وہ ساحرہ یا جادوگرنی لگی تھی۔ وہ تھی ہی کوئی ..... جادوگرنی۔ اس نے اپنے باپ اور بھائی پر کوئی جادو پھونک رکھا تھا...... وہ ان سے لڑتی جھگڑتی، غصہ کرتی مگر وہ دونوں اس کے سامنے مٹی کا بت بن جاتے تھے۔ وہ جو مرضی کہتی، بولتی، باتیں سناتی، دل کی بھڑاس نکالتی کبھی چاچو اور علی عیسیٰ کی مون کے سامنے بولنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ وہ اس کے سامنے سانس تک روک لیتے تھے۔ کبھی پلٹ کر جواب نہیں دیتے تھے۔ مون کے سامنے ان دونوں کے تمام الفاظ گم ہو جاتے تھے۔ یہ ساری چیزیں اس نے کچھ ہی عرصے میں شدت سے نوٹ کر لی تھیں۔

یہ باتیں اگرچہ بہت معنی رکھتی تھیں، مون کا رویہ نظر انداز کیے جانے والا تو کبھی نہیں رہا تھا تاہم جس چیز نے پہلی مرتبہ مالا کو ٹھٹکایا تھا، وہ مون کی جھکی آنکھیں تھیں۔ مون اپنی آنکھوں کو اٹھاتی ہی نہیں تھی۔ وہ کسی کی طرف بھی نہیں دیکھتی تھی۔ اس نے سر جھکا رکھا تھا۔ وہ اپنی پلکیں اوپر اٹھا کر کسی کی سمت نہیں دیکھتی تھی۔ اس نے مالا پر ایک اچٹتی سی سرسری نگاہ تک نہیں ڈالی تھی۔ تب مالا کو پہلی مرتبہ بہت عجیب سا محسوس ہوا تھا۔ گویا وہ اس قابل تھی ہی نہیں کہ مون اپنی اکلوتی بھابی کو عام سی نگاہ سے ہی دیکھ لیتی۔ وہ اتنی مغرور تھی کہ اپنے سامنے کسی کو انسان ہی نہیں سمجھتی تھی۔ اسے سرسری لہجے میں بھی اس کا احوال دریافت کرنا نہیں آیا تھا اور دیکھنے کی بات تو بہت دور تھی۔ مالا کو مون کا انداز ا نارمل نہیں لگا تھا۔ دراصل وہ نارمل تھی ہی نہیں۔ اس کی حرکتیں، انداز بہت عجیب تھے مگر جب اس نے مدھم روشنیوں سے سجے ہال میں وائلن بجانا شروع کیا تو یوں لگا گویا ویوالدی وینس کے سان مارکو گرجے میں وائلن بجا رہا ہے۔ موسیقی کی زبان اسے سمجھ ضرور آتی تھی مگر

مون نے آلاتِ موسیقی سے جانے کون، کون سے سُر نکالے تھے۔ اس نے پورے ہال کو منجمد کر دیا تھا کہ کونے سے ہلکی سی آواز تک سنائی نہیں دیتی تھی۔ گویا مون نے ویوالدی کے سُروں کا سحر پھونک دیا تھا کسی متنفس کی آواز تک کانوں میں سنائی نہیں دیتی تھی۔ کہیں کہیں چمکیلے فنجانوں، بلوریں گلاسوں کی کھنک فضا میں ارتعاش پیدا کرتی تھی۔

سفید رنگت والی دل آویز مسکراہٹوں کو رنگے ہوئے ہونٹوں پر سجائے ویٹریسز مختلف اور مہنگے ترین مشروب کے جام لیے اِدھر اُدھر گھوم رہی تھی جو مہمانوں کو ٹیسٹ، ذائقے، لذت اور خواہش کے مطابق فوراً فراہم کیا جا رہا تھا۔ یہ بہت بڑے پیمانے پر تقریب تھی۔ اتنے مہمانوں کا مالا نے تصور بھی نہیں کیا تھا گھر میں تو کوئی زیادہ لوگ نہیں تھے۔ تاہم ہوٹل میں رنگ، رنگ اور نسل، نسل کے لوگ اکٹھے ہوئے تھے اور یہ لوگ ویوالدی کے سُروں کی محبت میں مبتلا تھے۔ کچھ مون کو فن کا مظاہرہ کرنے میں مہارت بھی بہت تھی۔ وہ سر جھکائے لانبی پلکوں کی جھالر تانے اپنی دُھن میں مگن تھی۔ اس کا یاقوت اور ہیروں سے سجا کراؤن سرخ بالوں کی جگمگاہٹ بڑھا رہا تھا۔ یہ طلسم تب ٹوٹا جب اس نے ویوالدی کے بعد اگلے کچھ نمبر باخ موسیقاروں کے سُروں کی لے میں سنائے۔ باخ باپ اور باخ بیٹے کی موسیقی کا ذائقہ بھی ہومر اور ہیرنگ جیسا تھا۔ بوڑھے باخ کے سُر الگ رنگ رکھتے تھے، الگ سُر، ذائقہ اور لذت رکھتے تھے جبکہ جوان باخ کے سُروں کی لذت کچھ اور تھی۔

مالا نے غور کیا تو اسے اندازہ ہوا یہاں سب موسیقی کے دلدادہ بیٹھے تھے۔ موسیقی کے دیوانے اور موسیقی کے عشق میں گرفتار حاضرینِ محفل کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ یہ لمحاتی طلسم تب ٹوٹا جب مون نے وائلن بجانا ترک کیا اور ریکارڈ پلیئر سے سُر ایک مرتبہ پھر بکھرنے لگے تھے۔ موسیقی میں کتنی غذائیت

تھی یہ پہلی مرتبہ مالا نے یہاں آ کر جانا تھا۔

مالا کو اس تقریب میں مون کی شمولیت بس یوں لگی گویا وہ انہیں وائلن کے سُر سنانے آئی تھی۔ ڈنر سے پہلے ہی وہ اپنے بھائی کو جانے کون سے جواز دے کر چلی گئی تھی تاہم علی عیسیٰ کی تانتے (خالہ) کافی دیر تک رکی...... وہ بھی اگرچہ اپنی بھانجی کی طرح خاصی اکھڑی، اکھڑی تھی البتہ وہ تقریب کو چھوڑ کر گئی نہیں تھی جبکہ مون تو یوں لگتا تھا گویا جان چھڑا کر بھاگ گئی ہے۔ یہ علی عیسیٰ کی لاڈلی بہن سے مالا کی پہلی عجیب تر ملاقات تھی اور اس نے مون کی تانتے کے ہمراہ ایک اور چہرہ بھی دیکھا تھا جانے وہ کون تھی؟

☆☆☆

مون سے اس کی اگلی ملاقات شادی کے دو ہفتے بعد ہوئی تھی۔ یہ دو ہفتے کتنے خوشگوار گزرے تھے۔ مالا ان کو لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی تھی۔ ڈیڈی واپس چلے گئے تھے جبکہ وہ علی عیسیٰ کی ہمراہی میں گویا بادلوں کے رتھ پر سوار تھی۔ چاچو نے کہا تھا علی عیسیٰ مالا کو پورا من ہائیم، وائن ہائیم گھما کر لائے۔ دراصل یہ ان کا ہنی مون پیریڈ تھا۔ علی نے کہا تھا وہ جتنا مرضی اس کی فراغت سے فائدہ اٹھا لے کیونکہ اگلے بہت سارے دنوں میں وہ ڈھیر سارا مصروف ہونے والا تھا مگر یہ دن اس نے مالا کے نام کر دیے تھے تب ہیروں کے مانند دمکتی مالا کا رنگ روپ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ عیسیٰ اسے اکثر چھیڑتا۔

''اسم بامسمّیٰ ہو تم، سچ میں میرے گلے کا ہار بن گئی ہو۔'' اس کے نام کا حوالہ علی عیسیٰ کی چھیڑ تھا۔ وہ کبھی اسے ہار سنگار کہتا، کبھی گلوبند، کبھی موتیوں کی مالا...... کبھی گلابوں کی مالا، کبھی موتیے اور جوہی کی مالا۔

ان دو ہفتوں میں عیسیٰ نے اسے سوپر مارکیٹ سے لے کر کونڈی تورے، پارفیومیری، کاؤف ہاؤس تک ایک، ایک جگہ دکھا دی تھی۔ مالا کو ان بڑے بڑے ڈیپارٹمنٹل اسٹورز میں سے جو جگہ سب سے بڑھ کر پسند آئی تھی وہ شپیل وارن لادن تھی یعنی کھلونوں کی دکان...... شیشے کے چمکتے شیلف پر سجے رنگ، رنگ کے کھلونے، چینی کی گڑیا، کانچ کی مورتیاں، اس کا دل چاہ رہا تھا وہ کھلونوں کا پورا ڈھیر خرید لے۔ اس نے بے شمار کھلونے خریدے تبھی عیسیٰ کچھ حیران تھا۔ اس کی کھلونوں سے دلچسپی عیسیٰ کو متحیر کر رہی تھی۔ جب وہ شاپنگ بیگز لے کر کاؤف ہاؤس سے نکل رہے تھے تب عیسیٰ نے حیرت بھرے لہجے میں مالا سے پوچھا تھا۔

''کیا پاکستان میں تمہارے بھائی کے بچے ہیں؟ میرا مطلب ہے، یہ کھلونے......؟'' وہ خاصا حیران تھا، گویا اس کے خیال میں مالا یہ کھلونوں کی شاپنگ اپنے بھتیجے، بھتیجیوں کے لیے کر رہی ہے مگر مالا نے اس کا خیال غلط ثابت کر دیا تھا۔

''میرے تو کسی بھائی کی شادی نہیں ہوئی۔'' اس نے فوراً عیسیٰ کی حیرانی دور کی تھی۔ وہ کھلونوں کے ڈھیر کو اب بھی محبت پاش نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ تب علی عیسیٰ نے حیرت سے کہا تھا۔

''تو پھر یہ سب......؟'' یقیناً اس کی الجھن دور نہیں ہو رہی تھی۔ اگرچہ مالا خاصی کم عمر تھی مگر پھر بھی کھلونے اکٹھے کرنے اور گڑیا کھیلنے کی عمر سے تو نکل چکی تھی پھر اس ڈھیر کو خریدنے کا نہ جانے کیا مقصد تھا۔

''یہ تو میں نے اپنے لیے......'' مالا کچھ بولتے ہوئے دانتوں تلے زبان کو داب چکی تھی۔ یقیناً وہ کچھ انہونی بولنے والی تھی مگر بروقت احساس ہو جانے پر یک دم چپ کر گئی تھی مگر علی عیسیٰ اس کی ادھوری بات کا مفہوم بھی سمجھ چکا تھا۔ تبھی ایک معنی خیز تبسم اس کے چہرے کو انتہائی روشن کر گیا تھا پھر وہ جانے کتنی دیر تک ہنستا رہا۔ اپنی لاڈلی benz میں بیٹھ کر بہت پیار سے ڈرائیونگ کرتا ہوا اب بھی وہ مسلسل مسکرا رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ بہت کھلی، کھلی، تر و تازہ اور چمکیلی سی تھی۔ وہ پیار بھری نظروں سے مالا کو دیکھ رہا تھا۔ گویا

اس کے کہے گئے الفاظ کو انجوائے کر رہا تھا۔ اس کے لہجے کے معصومانہ پن سے محظوظ ہو رہا تھا۔ اس کی بے ساختگی اور سادگی سے حظ اٹھا رہا تھا۔ اس کی برجستگی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اسے مسلسل اپنی طرف دیکھتا پا کر مالا بہت کنفیوز ہو گئی تھی۔ وہ اس کی ..... بے باکانہ نظروں سے گھبرا جاتی تھی۔ عیسیٰ کو یک ٹک اپنی طرف دیکھتا پا کر اس نے بہت بونگی سی دلیل دی تھی۔

''مجھے کھلونے اچھے لگتے ہیں، اسی لیے خریدے ہیں۔'' مالا جانتی تھی اس کا جواز بوگس ہے...... اس کی دلیل ہلکی ہے اور الفاظ ایسے نہیں جو علی عیسیٰ کو قائل کر لیں۔ وہ ابھی تک مسکرا رہا تھا مگر اس کی وضاحت ملاحظہ کر کے کھلکھلا کر ہنس پڑا تھا۔

''میں نے تم سے وضاحت تو نہیں مانگی۔'' عیسیٰ نے بہ مشکل مسکراہٹ سمیٹ کر کہا تھا۔ وہ اب بھی معنی خیز نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا تب وہ کچھ جھنجلا گئی تھی۔

''تو پھر......؟'' اس کا اشارہ اس کی معنی خیز مسکراہٹ کی طرف تھا۔ وہ بہت جھنجلاہٹ کا شکار ہو رہی تھی۔ بہت کنفیوز ہو رہی تھی۔ تب عیسیٰ نے سابقہ کھلکھلاتے لہجے میں اسے ایک مرتبہ پھر چھیڑا تھا۔

''تم تو پاپا اور مجھ سے بھی زیادہ فیوچر پلاننگ کے لیے اتاولی ہو...... اتنی تیز رفتاری...... ایسی عجلت پسندی...... اتنی دور اندیشی...... ویسے یہ کھلونے ایک دو سال تک مہنگے نہیں ہونے والے تھے۔'' اب وہ اس کے جملوں کو پکڑ کر کتنا ستائے گا، یہ بات مالا پہلے سے سوچ نہیں پائی تھی اور اسے یہ بھی خبر نہیں تھی۔ عیسیٰ نہ صرف اسے تنگ کرے گا بلکہ چاچو کو بھی اس کی دور اندیشانہ شاپنگ کی تفصیل سنا دے گا۔ بالا تو اتنے پیارے، پیارے کھلونے لا کر پچھتائی تھی۔ اِدھر چاچو بھی گویا عیسیٰ کی تفصیل سن کر بہت پُرجوش ہو گئے تھے۔

''آخر میری بھتیجی ہے، نہایت سمجھدار اور..... دور اندیش...... میں تمہارے لیے رشتہ مانگنے جانے سے پہلے کارڈ تک چھپوانے کی بات کر گیا تھا پھر وہ میری عقلمندی سے متاثر کیوں نہیں ہوتی۔'' چاچو اور عیسیٰ کے درمیان نوک جھوک چلتی رہی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بہت بے تکلف تھے جبکہ مالا کچھ جھینپ کر وہاں سے اٹھ گئی تھی مگر عیسیٰ نے اس کی اگلے بہت سارے دن تک بھی گت بنائے رکھی تھی۔ کبھی وہ اتنی سنجیدہ گفتگو کے درمیان اچانک کہتا۔

''یار مالا! تم نے بے بی ڈریسز تو لیے ہی نہیں۔ بس کھلونے اٹھا لائیں...... کسی دن پھر چکر لگاتے ہیں۔'' اس قسم کے جملے ہمہ وقت عیسیٰ کی زبان پر رہتے...... وہ اسے تنگ کرنے، زچ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا...... اکثر بہت اہم دفتری فائل کا مطالعہ کرتے ہوئے چونک کر اسے مخاطب کرتا، وہ جو سمجھتی تھی شاید اسے کوئی ضروری بات یاد آ گئی ہے مگر عیسیٰ کی ضروری بات سن کر بھنّا اٹھتی تھی۔ وہ بہت معصومیت بھرے لہجے میں اسے جتاتا۔

''اب کے کچھ فیڈر اور چوسنیاں بھی لے آنا۔'' عیسیٰ کی معصومیت بھری شرارت محسوس کر کے وہ زچ ہو اٹھتی تھی پھر خود ہی بھنّا بھنّا کر کھلکھلا کے ہنس پڑتی۔ عیسیٰ کی ہمراہی میں ایک دن بھی اس کی پلکیں شبنمی قطروں سے بھیگی نہیں تھیں۔ وہ اپنے بھائی، بہن کو یاد کرنے کے بہانے بھی روئی نہیں تھی۔ دراصل عیسیٰ اسے اتنا مصروف رکھتا تھا کہ مالا کو اپنے گھر والوں کو یاد کرنے کا وقت ہی نہیں ملتا تھا۔

☆☆☆

ایک دن عیسیٰ اسے ہوہن موس کا جنگلاتی میلا دکھانے لے آیا تھا۔ جنگل میں سے کئی راستے گزرتے تھے جو ایک چھوٹی سی آبادی کی طرف لے جاتے تھے۔ جنگل میں سے گزر کر اس آبادی تک جانا مالا کو خاصا خوفناک لگ رہا تھا۔ مگر عیسیٰ کی تسلیاں، دلاسے اسے بہادر بنائے ہوئے تھے۔ عیسیٰ نے بتایا

تھا کہ آبادی کی طرف جانے والے رستے شہری سڑکوں کی طرح ہر قسم کے نشانات اور اشاروں سے مزین ہیں۔ رات کو بھی سفر دشوار نہیں تھا۔ سڑکوں پر گہرے رنگوں کے تیر بنے ہوئے تھے جو رات کو لشکارے مارتے تھے۔ یعنی سفر کٹھن نہیں آرام دہ تھا۔ اور دیہی علاقوں میں ایسی سہولیات مالا کے لیے حیران کن تھیں۔

وہ لنچ کے بعد گھر سے نکلے تھے پھر طویل جنگل کی سرنگ سے نکل کر کھلے آسمان تلے آئے گویا مالا کی جان میں جان آئی تھی۔ اسے پورے رستے یہی خوف لاحق رہا تھا کہ جنگلی جانور کہیں سے نکل کر ضرور بدمزگی پھیلائیں گے اگر زیادہ غصیلے ہوتے تو انہیں چیر پھاڑ بھی سکتے تھے مگر یہ محض مالا کے اندیشے تھے۔ سارے سفر میں ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ آبادی کے قریب ہی ہوہن موس کے گرجا گھر کی گھنٹیاں سنائی دینے لگی تھیں۔ جانے یہ کس قسم کا میلا تھا۔ مالا کے ذہن میں تو پاکستان میں مختلف علاقہ جات میں ہونے والے میلے گھوم رہے تھے مگر یہاں ویسا کچھ بھی نہیں تھا۔ پان والوں کے اسٹال تھے نہ قلفی والوں کی پکار، نہ جھولے، نہ جانوروں کے کرتب...... یہاں بہت رش ضرور تھا۔

''اتنے لوگ قطار در قطار کہاں جا رہے ہیں؟'' مالا نے حیرانی سے عیسیٰ کو مخاطب کیا۔ اس کی حیرت بجا تھی۔ وہ مختلف ٹولیوں میں موجود لوگوں کو ڈھلوان سے اترتے دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔ جانے یہ لوگ کہاں جا رہے تھے؟

''آج کورپس ڈینسٹ ہے ناں......'' عیسیٰ کے بتانے پر وہ ہکا بکا سی اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ پھر اس کی آنکھوں میں ڈھیروں ناگواری اتر آئی تھی۔ اس کی سفید پیشانی بل دار ہو گئی...... ہونٹ ایک دوسرے میں بھینچ گئے۔

''مگر ہمارا یہاں کیا کام......'' وہ بہت چاہ کر

WWW.PAKSOCIETY.COM

بھی اپنے غصے اور کرخت تاثرات پر قابو نہیں پا سکی تھی۔ عیسیٰ اس کا غصہ، کرختگی اور ناراضی کی وجہ گویا لمحوں میں سمجھ گیا تھا۔ تب اس نے بڑے پیار سے سمجھایا۔

''ہم تو ہوہن موس کی ہریالی دیکھنے آئے ہیں مگر یہاں کا گرجا گھر بہت مشہور ہے۔ لوگ کرنے تک جارہے ہیں۔ تمہیں گرجا گھر کی عمارت بھی دکھاؤں گا...... ارے، تم کیا سمجھ رہی ہو۔ پاگل ہو تم بھی۔ یار......! میں پکا مسلمان ہوں۔ تم کچھ غلط گمان میں نہ پڑو۔'' عیسیٰ کی تسلی نے مالا کو لمحوں میں پُرسکون کردیا تھا۔ اس کے ذہن میں کیسے غلط، غلط خیال آرہے تھے۔ بھلا عیسیٰ کا کسی چرچ میں کیا کام تھا؟ وہ بھی جانے کس وہم میں پڑ گئی تھی حالانکہ اپنی آنکھوں کے سامنے کئی مرتبہ عیسیٰ کو نماز پڑھتے دیکھ چکی تھی۔ عیسیٰ اس کا غصہ دیکھ کر وضاحت دینے کے بعد اب بڑے لطف لینے والے انداز میں کہہ رہا تھا۔

''تم غصے میں بہت اچھی لگتی ہو۔'' وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔ وہ ہوہن موس شالی کی جانب پہاڑی جنگل کے کنارے پر بہت بھیگی اور پھیلی ہوئی آبادی کو دیکھ رہی تھی۔ جنگل کا فسوں ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ حالانکہ ان کی گاڑی کھلے آسمانوں تلے آچکی تھی۔ نیلگوں آسمان کا حسن کھلا پڑ رہا تھا۔ ہر طرف سبزے سے گندھے کھیت تھے۔ بیچ میں سُرمے جیسی سڑک بل کھاتی تھی۔ بھیگے بھیگے ملائم فطری منظر میں مقناطیسی کشش تھی۔ سورج کی کرنیں پہاڑیوں پر پگھل رہی تھیں۔ خوش خرام ندی کہیں دور میگھ ملہار کا کوئی گیت گارہی تھی۔ یہ روح کو شاد کردینے والے، آنکھوں کو خیرہ کردینے والے مناظر تھے۔

کچھ دور ایک پہاڑ کی چوٹی پر اسے سرخ مکان کی چھت نظر آئی تھی۔ یہ مکان آبادی کے دوسرے گھروں کی طرح بہت خوب صورت تھا۔ اتنا خوب صورت کہ مالا مبہوت رہ گئی تھی۔ من ہائیم سے لے کر یہاں تک ان بے شمار خوب صورت گھروں میں ایک مماثلت ضرور تھی۔ ان تمام گھروں کی ونڈوز ایک ہی طرز کی تھیں۔ عیسیٰ کے گھر سے دیہی علاقے کے ان گھروں تک ایک ہی طرز کی کھڑکیاں اور ان کے سامنے نائیلون کی جالی والے پردے...... اور سب سے متاثر کُن پھولوں سے لدی ٹوکریاں تھیں جو کھڑکیوں سے لے کر دروازوں تک ایک ہی انداز میں لٹکائی گئی تھیں۔ تقریباً جالی والے پردوں سے لے کر پھولوں کی ان ٹوکریوں تک کہیں بھی بدلاؤ نظر نہیں آیا تھا۔ جانے یہ ان لوگوں کے کلچر کا کوئی حصہ تھا...... پھولوں کی ٹوکریوں سے سجے اس سرخ چھت والے گھر کی طرف اشارہ کرکے مالا نے علی عیسیٰ کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔

''وہ گھر کتنی حسین لوکیشن پر ہے...... ایک طرف پہاڑ سے پھوٹتا چشمہ، ایک طرف پھولوں کے وسیع کھیت اور اس بالکونی میں کھلتا بیڈ روم کا دروازہ...... نہ جانے یہ گھر کس خوش نصیب کا ہے؟'' مالا کے لہجے میں کتنی حسرت سموگئی تھی۔ وہ اس گھر کو قریب سے دیکھنے کے لیے مچل اٹھی تھی۔ تب عیسیٰ نے بہت ٹھہرے رواں لہجے میں اسے بتایا تھا۔

''یہ گھر امون کا ہے...... اور یہ گھر نانی اور نانے کا ہے...... میں تمہیں اپنی ماں کے آبائی علاقے میں لے کر آیا ہوں۔'' عیسیٰ کے لہجے میں اپنی ماں اور نانی کے لیے ڈھیروں محبت تھی جبکہ مالا اس انکشاف پر دم بخود رہ گئی۔

''کیا سچ......؟'' وہ متحیر رہ گئی تھی پھر اس نے بہت مچلتی نگاہ سرخ چھت والے مکان پر اچھالی تھی گویا وہ اس مکان کو قریب سے دیکھ سکتی تھی۔ کچھ دیر فطری حسن کی دلکشی محسوس کرنے کے بعد علی عیسیٰ اسے ایک مسیحی عبادت کدے میں لے آیا تھا۔ صدر دروازے سے گزر کر وہ ایک وسیع ہال میں چلے آئے تھے۔ عیسیٰ اسے گرجے کی قدامت اور اس کی تاریخ کے متعلق بتارہا تھا۔ وہ اس کے فنِ تعمیر کی چیدہ، چیدہ

باتیں مالا کو بتا رہا تھا۔ یقیناً مالا کو تاریخ جاننے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو اردگرد کے ماحول کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ کوئی چرچ دیکھا تھا۔ ہال میں داخل ہونے کے بعد ایک بوجھل سی کثیف خوشبو نتھنوں سے ٹکرائی تھی۔ بہت ہی قدامت لیے تاریخی پُررونق پس منظر تھا۔ قدرے پُرجلال اور نیارا سا تھا۔ ہال تقریباً بھرا ہوا تھا۔ یہاں ہر طرح کے لوگ موجود تھے، تہذیب یافتہ، تعلیم یافتہ، مہذب، باوقار اور بن مانس ٹائپ کے بھی...... وہ چھت کی کڑیاں گنتی پُرہجوم منظر میں خود کو عجیب محسوس کررہی تھی۔ یقیناً یہی کیفیات علی عیسیٰ کی بھی تھیں چونکہ وہ لوگ ہال میں داخل ہوچکے تھے سو اٹھ کر جانا مناسب نہیں تھا۔ مالا بھی علی عیسیٰ کی پیروی میں ایک الگ تھلگ کونے میں ذرا سا ٹک گئی تھی۔

وہ پادری کے وعظ سننے کے بجائے علی عیسیٰ کے بتانے پر سامنے دیوار پر عیسائی ولیوں کی بڑی، بڑی تصویریں دیکھ رہی تھی۔ علی عیسیٰ نے اسے کچھ دوسری دیواروں کی طرف بھی متوجہ کیا تھا جن پر سفید کتبوں کا کوئی شمار نہیں تھا۔ جانے ان کی تعداد کتنی تھی۔ مالا اس گنتی میں نہیں پڑی تھی۔ وہ تو عقب میں موجود مقدس مریم اور یسوع مسیح کی شبیہیں دیکھ رہی تھی۔

وہ اس گرجے میں بیٹھے تھے جو ہزاروں سال پرانا تھا۔ جس کے مینار کا نوکدار کلس سونے کی آبشار میں نہایا ہوا تھا۔ اب سروس بھی شروع ہوچکی تھی۔ جانے یہ پروگرام کتنا طویل تھا۔ مالا کے اندر تو ہول اٹھنے لگے تھے۔ اس نے سوچا وہ علی عیسیٰ کو ٹہوکا دے کر اٹھاتی ہے مگر وہ کسی اور کونے میں موجود ہجوم کی طرف متوجہ تھا۔

اہلِ بواریا کی مذہبی رگ پھڑک اٹھی تھی۔ یقیناً یہ لوگ نہایت عقیدت مند اور مذہبی تھے۔ بہتی آنکھوں کے ساتھ وعظ سن رہے تھے۔

روسٹر پر ایک کیتھولک پادری مقدس عبا اور چوگوشیہ ٹوپی پہنے ڈچ زبان میں کتابِ مقدس سے کچھ پڑھ کر سنا رہے تھے۔ وہ کیا پڑھ رہے تھے؟ مالا کو ذرا سمجھ نہیں آرہی تھی اور جسے سمجھ آرہی تھی وہ ایک دوسرے کونے میں موجود ہجوم میں سے نہ جانے کس چہرے کو کھوج رہا تھا۔ اسے علی عیسیٰ کے چہرے پر بے انتہا ناگواری نظر آرہی تھی۔ جانے وہ کسے دیکھ رہا تھا؟ مالا نے نگاہیں موڑ کر ایک مرتبہ پھر پورے ہال کی خواتین کو کھوجنا شروع کردیا تھا۔ اسے تمام مرد اور عورتیں بہت رقیق القلب نظر آرہی تھیں۔ لکڑی کے جنگلوں میں بنی ہوئی جُھریوں میں گھٹنے نیچے کیے، سر جھکائے بہتی آنکھوں کے ساتھ وعظ سننے والے لوگوں میں مالا کو ایک کم عمر دوشیزہ نے بری طرح سے چونکا دیا تھا۔ وہ لڑکی اسی کی ہم عمر ہوگی، اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ رنگت سپید تھی۔ بال اسکارف میں چھپے تھے۔ بالوں کا رنگ وہ دیکھ نہیں سکی تھی۔ یقیناً سنہرا یا بھورا تھا۔ اس کے گال کچھ ابھرے ہوئے سرخ تھے اور پھولے پھولے سرخ گالوں پر موٹے موٹے آنسو پھسل رہے تھے، مالا گویا دم بخود رہ گئی تھی۔ اس لڑکی کو مالا نے پہلے بھی کہیں دیکھا تھا۔ یقیناً اپنے ابھرے سرخ گالوں کی وجہ سے وہ مالا کی یادداشت میں زندہ رہ گئی تھی۔ مالا نے اسے کہاں دیکھا تھا؟ بہت سوچنے کے باوجود وہ یاد نہیں کرپائی تھی۔ تاہم اس کے پھولے گال مالا کو ابھی تک نہیں بھولے تھے اور یقیناً اس کے سر کا رومال بھی، جس میں اس نے اپنے بالوں کو باندھ کر چھپا رکھا تھا۔ اس کے ابھرے گال اور سر کا رومال مالا کی یادداشت کا حصہ بن چکا تھا مگر اس وقت مالا کے ٹھٹکنے کی وجہ اس لڑکی کے موتیوں کی طرح پھسلتے آنسو تھے۔ جو جاڑے کی مینہ کے مانند لگاتار گر رہے تھے، برس رہے تھے۔

اتنی کم عمری میں، ایسی بالی عمریا میں ایک مغربی لڑکی کا اتنا خشوع سے عبادت میں رونا اسے ٹھٹکا گیا تھا۔ سیفور سے ڈھکے رومال کو اس نے سر کے پچھلی

طرف موڑ کر باندھا ہوا تھا۔ سیفور کو باندھنے کا اسٹائل بھی بڑا منفرد سا تھا۔ مالا نے اس اسٹائل میں تو کبھی اسکارف نہیں لیا تھا۔ حالانکہ اس نے آج تک سر بھی ننگا نہیں کیا تھا۔ تاہم اس لڑکی کے سیفور لینے کا اسٹائل مالا کو بہت اچھا لگا تھا۔ پھر اس کے دونوں کان بھی سیفور میں چھپے نہیں تھے۔ اس نے دونوں کانوں میں سفید گول، گول او ہر بنگے (بالیاں) پہن رکھی تھیں جس کے نیچے موٹا سا سنہری موتی لٹک رہا تھا۔

وہ اس لڑکی سے نگاہ تب ہٹا پائی تھی جب علی عیسیٰ اسے اٹھا کر ایک ہجوم کی طرف لے آیا تھا۔ یہاں شیشے کے بڑے، بڑے صندوقچے نصب تھے۔ کیمیائی پانی سے بھرے ہوئے...... اس کیمیائی واٹر میں انسانی ڈھانچے کھڑے تھے۔ قدیم زمانے کے کچھ بڑے بڑے عظیم پادریوں کی ہڈیاں اور ڈھانچے تھے۔ اتنا ہیبت ناک منظر دیکھ کر وہ عیسیٰ کے روکنے، بلانے اور آوازیں دینے پر بھی رکی نہیں تھی جبکہ اسے الٹے قدموں باہر نکلتے دیکھ کر علی عیسیٰ بھی اس کے پیچھے چلا آیا تھا۔ تب مالا کو ایک جگہ ہال میں رکتے دیکھ کر وہ خود بھی رک گیا تھا۔ اس نے مالا کی نظروں کا ارتکاز محسوس کر لیا تھا۔ وہ ایک روتی ہوئی سیفور ڈھکے سر کو جھٹکتی لڑکی کو دیکھ رہی تھی۔ علی عیسیٰ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اس کے قریب آ گیا تھا پھر اس نے مالا کے چہرے پر پھیلتے تاسف کو دیکھ کر کہا۔

"یقیناً تم اب اس لڑکی سے رونے کا سبب پوچھنا چاہتی ہو؟" وہ مالا کی رقیق القلبی اور نرم دلی سے اتنی کم مدت میں ہی واقف ہو گیا تھا۔ وہ بہت نرم دل تھی۔ بہت سادہ فطرت رکھتی تھی۔ بہت نرم مزاج رکھتی تھی۔ بہت حلیم الطبع تھی۔ وہ کسی کو بھی تکلیف میں دیکھ کر آگے بڑھ جانے والوں میں سے نہیں تھی۔

"یہ لڑکی......" مالا کو اس لڑکی کے رونے نے تکلیف دی تھی۔ جانے وہ کب سے یہاں بیٹھی رو رہی تھی۔ دورانِ سروس بھی روتی رہی تھی۔ اب پورا ہال خالی ہو جانے کے بعد بھی تنہا بیٹھی رو رہی تھی۔ تب اس کی نگاہوں کا ارتکاز محسوس کر کے عیسیٰ نے بتایا تھا۔

"یہ لڑکی سوزن ہے، تانتے کی بیٹی...... شادی میں بھی آئی تھی۔ شاید تمہیں یاد نہیں۔" سانس کھینچ کر اسے متحیر کرتا وہ آگے بڑھ گیا تھا۔ تعارف کے بعد سوزن کی طرف بڑھا تھا نہ ہی اس کی خیریت دریافت کرنے کی اس نے ضرورت محسوس کی تھی۔ اسے عیسیٰ کا رویہ عجیب لگا تھا۔ بھلا ایسی بھی کیا بے مروتی......؟ بندہ رشتے داری کا تقاضا ہی نبھا لیتا ہے۔ اب جبکہ وہ اس کی کزن کو دیکھ چکی تھی سو آگے بڑھ جانا کچھ مناسب نہیں تھا مگر جب علی عیسیٰ نے سلام دعا کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی تو پھر مالا کیسے رک جاتی۔ حالانکہ سوتی روک میں ملبوس اس لڑکی کے آنسوؤں نے مالا کو قدرے بے چین ضرور کیا تھا مگر وہ رک کر اس لڑکی سے رونے کا سبب نہیں پوچھ سکتی تھی پھر اس لڑکی کی زبان اس کے پلے پڑنے والی نہیں تھی۔ سو ہمدردی کا جذبہ اس نے دل میں ہی دبا لیا تھا۔

"سوزن رو کیوں رہی تھی......؟" علی عیسیٰ کے برابر چلتی مالا کا دل تاریخی تہ خانے نما گرجے کے ہال میں روتی ہوئی سوزن میں اٹکا ہوا تھا...... اس کے بے تکے سوال نے علی عیسیٰ کو خاصا بیزار کر دیا تھا۔ شادی کے بعد اتنی کم مدت میں پہلی مرتبہ مالا کے کسی سوال پر علی عیسیٰ بیزار ہوا تھا۔

"مجھے اس کے من کی کیا خبر......؟ اللہ جانے کیوں رو رہی تھی۔ شاید عبادت کے دوران آخرت کے خوف سے روئی ہوگی۔" اس کا انداز سراسر ٹالنے والا تھا اور وہ سوزن پر مزید بحث نہیں کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی سوزن کے رونے پر روشنی ڈالنا چاہتا تھا۔ اسے بیزار دیکھ کر مالا چپ کر گئی تھی۔ یعنی وہ اس کا بدلتا موڈ دیکھ کر اچھی بیویوں کی طرح سمجھ گئی تھی کہ اسے اس

ٹاپک پر مزید نہیں بولنا۔ کچھ دیر کی معنی خیز خاموشی کے بعد علی عیسیٰ نے خود ہی بتانا شروع کر دیا۔

"سوزن کے ساتھ مون بھی آئی تھی۔ شاید تم نے اسے نہیں دیکھا۔ وہ مجھے دیکھ کر فوراً یہاں سے چلی گئی تھی۔" اس کے ایک دوسرے انکشاف نے مالا کو ہکا بکا کر دیا تھا۔

"مون کا یہاں کیا کام تھا؟" اس نے بہت تیز لہجے میں بے ساختہ پوچھا تھا۔ اسے مون کا چرچ آنا بہت عجیب لگا تھا۔ وہ مسلمان تھی اور ایک مسلمان کی بیٹی تھی پھر گرجے میں کیا کر رہی تھی؟ یہ بھی نہیں تھا کہ وہ ان لوگوں کی طرح محض چرچ دیکھنے آئی تھی۔ وہ اس علاقے میں رہتی تھی یہ عمارت تو اس نے سیکڑوں مرتبہ دیکھ رکھی ہوگی پھر یہاں کیا لینے آئی تھی؟ اس کا چبھتا سوال سن کر علی عیسیٰ نے بہت تکلیف دہ لہجے میں کہا۔

"وہ سوزن کے ہمراہ ہر اس جگہ پہنچ جاتی ہے جہاں اس کا جانا مناسب نہیں ہوتا۔ اسے سوزن سے محبت جو بہت ہے۔" مالا کو علی عیسیٰ کے لہجے میں دبا، دبا غصہ اور عجیب سی ناگواری محسوس ہوئی تھی۔

"مون اتنے دنوں سے گھر بھی نہیں آئی؟" اس نے قدرے حیرانی سے کہا تھا۔ یہ سوال تو جانے کب سے اس کی نوکِ زبان پر مچل رہا تھا۔ آج موقع پا کر اس نے بالآخر پوچھ ہی لیا۔ اندر سے وہ کچھ ڈری بھی تھی شاید علی عیسیٰ کو اس کے سوال پر غصہ آ جائے مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ علی عیسیٰ کو اس کے سوال پر غصہ نہیں آیا تھا۔

"مون کچھ عرصے پہلے پاپا اور مجھ سے لڑ جھگڑ کر گھر چھوڑ گئی ہے...... اب وہ کم، کم ہی واپس آتی ہے، میں ہی اسے مجبور کر کے واپس لاتا ہوں۔ وہ ٹھہرنے کے لیے نہیں بس گھڑی دو گھڑی کے لیے آتی ہے۔" اس کے انکشاف پر مالا ایک مرتبہ پھر دم بخود رہ گئی تھی تو گویا مون گھر چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ مگر کیوں......؟ آخر وجہ کیا تھی؟ بہت چاہنے کے باوجود بھی مالا اس سے یہ سوال نہیں پوچھ پائی تھی پھر کچھ دیر بعد علی عیسیٰ نے موضوع بدل دیا تھا۔

"ہم کچھ دیر تک گروس موتر کی طرف چلتے ہیں۔" وہ سنجیدہ سا اپنی لاڈلی benz کی طرف بڑھ گیا تھا۔ یقیناً اسے کھانے پینے کا سامان ڈگی میں سے نکالنا تھا۔ مالا بھی سر جھٹک کر علی عیسیٰ کے پیچھے چلی آئی تھی۔

☆☆☆

سورج اپنے پگھلے سونے کو دوبارہ سمیٹ رہا تھا۔ آلپس کے پہاڑوں پر مرغابیاں اب کہیں نہیں تھیں۔ یقیناً جنگل کی طرف رواں دواں ہو چکی تھی۔ گرجے کا سنہرا عکس اب رات کے جھٹپٹے کی زد میں تھا۔ ماحول کچھ کچھ ہیبت ناک ہو رہا تھا۔ مالا کا ننھا سا دل سہم رہا تھا۔ حالانکہ ڈرنے یا خوف زدہ ہونے کی کیا بات تھی؟ علی عیسیٰ اس کے ہمراہ تھا مگر وہ رات کو واپسی کے سفر کی وجہ سے کچھ پریشان تھی۔ پھر اس کی پریشانی محسوس کر کے علی عیسیٰ نے مالا کو بتایا تھا۔

"ہم آج کی رات یہیں رکیں گے۔ واپسی کل سویرے ہوگی۔" عیسیٰ کے بتانے پر مالا کچھ ہونق پن سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

"ہم کیا اس جنگل میں رات بسر کریں گے؟" جنگلی جانوروں کے خوف سے اس نے ایک بے تکا سوال کیا تھا تب علی عیسیٰ کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔ یقیناً مالا کے سوال کو اس نے بہت انجوائے کیا تھا۔ پھر وہ اسے ہوہن موس کے جنگلاتی میلے کے متعلق بتانے لگا تھا پھر اس کے واپس جانے کی رٹ سن کر ملائمت سے بولا۔

"تو کیا تم میلا دیکھے بغیر چلی جاؤ گی؟ میں تمہیں یہاں لایا کس لیے ہوں۔" اس کے نرمی سے ڈپٹنے پر وہ ایک مرتبہ پھر ہونق ہو گئی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

''میلا دیکھنا ابھی باقی ہے؟ مگر یہ میلا لگا کہاں ہے؟'' مالا کے برجستہ ہونق پن کے مظاہرے کو دیکھ کر علی عیسیٰ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔ اسے مالا کی... بے ساختگی بہت بھائی تھی۔ وہ اس کی باتوں کو بہت انجوائے کرتا تھا۔

''ابھی میلا آپ نے دیکھا کہاں ہے محترمہ؟'' کھانے کے برتن سمیٹ کر وہ مالا کو لیے ایک ایسی کھلی جگہ پر آیا تھا جہاں رات جگمگا رہی تھی۔ یقیناً وہ پہلے بھی یہاں آتا رہتا تھا کیونکہ اسے دیکھ کر بہت سے جرمن نوجوان ملنے کے لیے آئے تھے۔ یہ درختوں کے جھنڈ میں کوئی وسیع جگہ تھی۔ ایک اونچا لکڑی کا اسٹیج بنایا گیا تھا۔ جس کے چہار اطراف میزیں اور کرسیاں لگی تھیں۔ پیچھے ایک مکان نما عمارت تھی جس کی بالکونی میں بینڈ گروپ، انتہائی نفیس یونیفارم میں ملبوس چاق و چوبند بیٹھا تھا۔ تانبے کے بگل اور ٹرامبون کے ساتھ نفیریاں، ہر قسم کے ڈرم وغیرہ بھی نظر آرہے تھے۔ مالا کو سب سے زیادہ پُرکشش اس تمام منظر میں بینڈ والوں کے نیلے پیلے، ربن اور سبز رنگ کے ہیٹ لگے تھے۔ ان لوگوں نے وائٹ شرٹس پہن رکھی تھیں نیچے نیلے رنگ کی شنیل کی برجیس تھیں۔ اس رنگیلے بینڈ کا لباس اتنا کلرفل، یونیک اور جھالروں سے مزین تھا کہ نظر ان سے ہٹ نہیں رہی تھی۔ تو یہ ہوہن موس کا جنگلاتی میلا تھا۔ پاکستان کے تقریباً ہر میلے سے ہٹ کر...... یہاں قلفی والوں کی پکار نہیں تھی نہ کوئی اسٹال تھا نہ ٹھیلا...... بڑا سحر انگیز خوابناک ماحول تھا۔ کہیں کہیں موسیقی کی ہلکی گونج سناٹے کو چیر دیتی تھی۔ خصوصاً اسٹیج کو مصنوعی روشنیوں نے اجالا بخش رکھا تھا۔ طلسماتی روشنیوں میں نیلی لہریں عکس چھوڑ رہی تھیں۔ لوگ جوق در جوق میلے میں شرکت کرتے آرہے تھے اور انہی لوگوں میں مالا نے تقریباً دو ہفتے بعد ایک مرتبہ پھر اس جھکی آنکھوں والی لڑکی کو دیکھا تھا۔ اس نے نیلی روک پر موتیوں سے بھری شرٹ پہن رکھی تھ اس کی اونچی پونی سے بالوں کی سرخ آبشار و ہوتی نظر آرہی تھی۔ اس کے سر پر آج بھی یاقوت ہیرے سے سجا کراؤن تھا۔ انتہائی روشنیوں میں کے کراؤن سے چمکدار لہریں نکل رہی تھیں۔ ا کے سرخ بال روشنی میں بے انتہا چمکیلے نظر آر تھے۔ آج وہ سرخ بالوں والی لڑکی اکیلی نہیں تھ اس کے ہمراہ تاریخ کے تہ خانے میں دبے اس کے فرش پر بیٹھ کے زار زار روتی لڑکی بھی سج چلی آرہی تھی۔ ویسا ہی سیفور اس کے سر پر بندھا وہ سوتی فراک میں ملبوس تھی اور اس کے فراک فرل زمین کو چھو رہی تھی۔ آج بھی اس کے کانو میں وہی ائیر رنگ جھول رہے تھے۔

وہ دونوں مالا کے قریب سے گزر کر ایک دوسری ٹیبل پر بیٹھ گئی تھیں۔ تب علی عیسیٰ کی نگاہ نے ان دونوں کو فوراً کھوج لیا تھا۔ یقیناً وہ دونوں بھی اس ورلڈ فیسٹ کو دیکھنے آئی تھیں۔ کچھ دیر بعد علی عیسیٰ ان دونوں کی طرف مڑ گیا تھا۔ یقیناً وہ اپنی بہن سے ملنے گیا تھا۔ اسے دیکھ کر ان دونوں لڑکیوں کے چہروں پر جگمگاہٹ آگئی تھی کچھ غور کرنے پر مالا کو تھا جگمگاہٹ صرف سوزن کے چہرے پر تھی۔ مون پہلے کی طرح بے نیازی پلکیں جھکائے بغیر زمین کو دیکھتی، علی عیسیٰ سے محوِ کلام تھی۔ یقیناً اس کی گفتگو کا اسٹائل ہی یہی تھا۔ وہ مقابل کو دیکھے بغیر گفتگو کرتی تھی۔ اسے مون کا طرزِ کلام کچھ عجیب نہیں بے انتہا عجیب لگا تھا۔ یقیناً وہ لڑکی بہت ہی عجیب تھی۔

ایک مرتبہ پھر وہ مالا کو نظر انداز کر چکی تھی۔ وہ مالا کو نظر انداز کیوں کرتی تھی؟ اس کا مالا کے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ سفید گلاب اور سوسن کے پھولوں سے گندھی مالا کی آنکھوں میں شبنمی قطرے امڈ آئے تھے۔ اسے اپنی اکلوتی نند کے کٹھور رویے نے ٹھیس پہنچائی تھی۔ اس کا ننھا سا دل بجھ گیا تھا۔ آخر وہ اس

کے ساتھ اتنی اکھڑی کیوں تھی؟ جب بواریا کی مٹیارنیں ایک جیسے لباس میں اپنے حسن کے جلوے بکھیرتی تمام مہمانوں کو شراب کے بلوریں جام پیش کر رہی تھیں تب مالا چپکے، چپکے اپنے دوپٹے کے کونے سے آنسو پونچھ رہی تھی۔

دیہات کے صحت مند ماحول میں پروان چڑھی یہ لڑکیاں بہت تر و تازہ اور دلفریب تھیں۔ وہ مالا کے پاس بھی وہسکی کے گلاس لے کر آئیں۔ اس نے فوراً بدک کر انکار کر دیا تھا۔ کچھ دیر بعد ایک گوری دوشیزہ علی عیسیٰ کو بھی مشروب دینے پہنچ گئی تھی۔ علی عیسیٰ نے بھی شکریہ کے ساتھ انکار کر دیا تھا۔ کچھ ایسا ہی انکار مون اور سوزن کے چہروں پر بھی لکھا تھا۔ ان کے چہروں پر وہسکی کی طلب یا چاہ نہیں تھی۔ کچھ فاصلے پر موجود مالا کے دل کو جانے کیوں اطمینان محسوس ہوا تھا۔

تھوڑی دیر بعد بوارین مردوں نے باقاعدہ ڈانس کر کے محفل کا آغاز کیا تھا پھر لوگوں کے ہجوم پر سکتہ طاری ہو گیا۔ یہ لوگ ہر کام بڑے نظم و ضبط سے کرتے تھے۔ چاہے عبادت تھی یا رقص و سرود کی محفل...... اب بھی ماحول پر سناٹا طاری ہو چکا تھا۔ وہ لوگ اپنے محبوب رقص، شوہ پلاتر کو انجوائے کر رہے تھے۔ بینڈ کے سُر بھی گونج رہے تھے۔ یقیناً ان لوگوں کے لیے یہ محفل بہت معنی رکھتی تھی مگر مالا کا جی اچاٹ ہو چکا تھا۔ کچھ دیر بعد علی عیسیٰ واپس آ گیا تھا۔ اس نے بتایا تھا مون اور سوزن واپس چلی گئی ہیں اگرچہ وہ کوئی بہانہ کر کے گئی تھیں تاہم مالا جانتی تھی وہ محض اس کی موجودگی اور علی عیسیٰ کو دیکھ کر محفل ادھوری چھوڑ کر چلی گئی تھیں مگر یہ بات وہ علی عیسیٰ سے کہہ نہیں سکتی تھی۔ اس نے ان دو مختصر ملاقاتوں میں ہی مون کے رونے کی وجہ کھوج لی تھی۔ یقیناً وہ علی عیسیٰ کی مالا کے ساتھ شادی پر ناخوش تھی۔

بواریا مردوں کے بعد دوشیزاؤں کا رقص جاری تھا۔ علی عیسیٰ خاصی دلچسپی لیے زمین تک چھوتے فراک پہنے لڑکیوں کے رقص کو دیکھ رہا تھا۔ جو قابلِ اعتراض حد تک کھلے گلے پہنے ہوئے تھیں۔ مالا کو علی عیسیٰ کی یہ دلچسپی کچھ بھائی نہیں تھی مگر وہ اس کی آنکھوں پر پٹی نہیں باندھ سکتی تھی۔ کچھ دیر بعد اسٹیج سے کسی نے اعلان کیا...... مالا کے پلے کچھ نہیں پڑا تھا تاہم اس کا ترجمان قریب ہی بیٹھا تھا سو فوراً اسے رقص کے کسی اگلے آئٹم کے متعلق بتانے لگا تھا۔ علی عیسیٰ یہاں آ کر بہت انجوائے کر رہا تھا۔ کم از کم مالا نے تو یہی محسوس کیا تھا۔ یہ علاقائی رقص ان لوگوں کے محبوب ترین ڈانس میں شمار ہوتا تھا۔

کچھ دیر بعد جب محفل کا رنگ کچھ اور بدلا تو مالا نے علی عیسیٰ کو اٹھنے کے لیے اصرار کرنا شروع کر دیا تھا پھر جب وہ روشنیوں سے اٹھ کر ایک دم اندھیرے میں آئے تب مالا کچھ سہم گئی تھی۔

”اگر کسی جنگلی درندے کے ہتھے چڑھ گئے ہم تو ہمارا کفن دفن بھی کوئی نہیں کرے گا۔“ مالا کی خوفناک بات سن کر علی عیسیٰ نے مصنوعی خوف بھرے لہجے میں کہا۔

”اللہ کی بندی......! ڈراؤ مت، ویسے میں ہوں ناں تمہارے ساتھ...... کسی درندے کی جرأت نہیں اِدھر نگاہ ڈالے۔“ وہ اس کی طرف جھک کر شرارتی لہجے میں بولا تھا۔ تب اس کا رومینٹک موڈ ملاحظہ کر کے مالا نے قدرے مسکرا کر کہا۔

”آپ مجھے بیوہنے پر ناچتی فرولائن تو نہیں سمجھ رہے......؟“ اس کی نوک جھوک اور ہلکی پھلکی گفتگو علی عیسیٰ کا موڈ کچھ اور خوشگوار کر گئی تھی۔ وہ باتوں کے دوران ہی سرخ چھت والے اس خوب صورت مکان تک پہنچ گئے تھے جس کے دروازوں اور کھڑکیوں کے سامنے پھولوں سے لدی ٹوکریاں آویزاں تھیں۔ ایک طرف پہاڑ کے قعر سے آبشار پھوٹ رہی تھی اور دوسری طرف سفید گلابوں کے

وسیع باغ تھے۔

"تم بھلا بیوہنے پہ ناچتی کوئی فرولائن ہو سکتی ہو؟ تم تو علی عیسیٰ کی محبت ہو اور علی عیسیٰ کی محبت بیوہنے پر ناچے یہ اسے تصور میں بھی گوارا نہیں ہوسکتا۔" ڈوربیل پر ہاتھ رکھنے سے پہلے علی عیسیٰ نے کسی قدر سنجیدگی سے کہا تھا۔ یوں کہ مالا اس خوب صورت اظہار پر اندر تک سرشاری ہوگئی تھی۔ ایک دن علی عیسیٰ نے اسے بتایا تھا کہ وہ بہت عرصے پہلے سے مالا کے تصور اور اس کے ان دیکھے وجود سے محبت کرنے لگا تھا۔ پاپا نے اس کے ذہن میں مالا کا جو تصور قائم کیا تھا وہ ہو بہو ویسی تھی۔ علی عیسیٰ کو مالا جیسی لڑکیاں متاثر کرتی تھیں اور اس نے مالا سے محبت اسے بغیر دیکھے کی تھی۔ وہ اظہار میں جھجکتا نہیں تھا۔ نہ فضول سی انا کا شکار ہوتا تھا۔ وہ اسے اپنے فطری اور دلی جذبات کے متعلق سچ بتا دیتا تھا۔ علی عیسیٰ کی محبت میں مالا نے بہت شدت پائی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ وہ کچھ شدت پسند ہے۔ وہ ٹوٹ کر چاہنے والا بیٹا، بھائی اور شوہر تھا۔ مالا کو لگتا تھا اگر اس نے ذرا سی بھی علی عیسیٰ کو ٹھیس پہنچائی تو وہ ٹوٹ جائے گا۔

اپنی گروس موتر کے گھر آکر وہ بہت خوش تھا۔ اس نے مالا کو بتایا تھا کہ وہ ہر چھٹیاں یہیں گزارتا تھا۔ اسے اپنے گروسی کے گھر سے والہانہ محبت تھی۔ اس گھر میں علی عیسیٰ کی ماں کا بچپن گزرا تھا۔ اسے اپنی ماں اور نانی دونوں سے بہت محبت تھی اور پاپا سے تو عشق تھا۔

گروسی، مالا سے بہت محبت اور والہانہ انداز میں ملی تھیں۔ البتہ تانتے کا رویہ موِن جیسا سرد تھا جبکہ سوزن تو سامنے آئی ہی نہیں تھی۔ گروسی نے بتایا تھا۔ سوزن عبادت کررہی ہے۔ یہ ایک مذہبی گھرانا تھا۔ گروسی خود بہت مذہبی خاتون تھیں۔ گروسی کے بتانے پر اسے خبر ہوئی تھی۔ سوزن کسی سنڈیکیٹ کی کارکن بھی تھی اور تبلیغ کے لیے شہر، شہر گھومتی تھی۔

گروسی کے بتانے پر ہی اسے سوزن کچھ اچھی [illegible] موِن حد سے زیادہ بری لگی تھی۔

وہ لوگ چونکہ کھانا کھا چکے تھے سو صرف [illegible] پی کر سونے چل دیے۔ دن بھر کی آوارہ گردی [illegible] انہیں خاصا تھکا دیا تھا۔ گروسی ان کی تھکاوٹ [illegible] پیش نظر انہیں آرام کرنے کا مشورہ دے رہی تھی [illegible] حالانکہ علی عیسیٰ کو ابھی اپنی نظروں سے دور کر [illegible] انہیں خواہش نہیں تھی۔ وہ اس سے بہت ساری [illegible] کرنا چاہتی تھیں مگر اس کی تھکن کا خیال غالب [illegible] تھا۔ علی عیسیٰ، گروسی کو بہت پیار سے گوتے نا [illegible] بول کر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ وہ اس گھر [illegible] چپے، چپے سے واقف تھا سو کسی کی رہنمائی اور [illegible] دکھانے کے لیے کسی گائڈ کی اسے ضرورت نہیں [illegible] وہ اس کے ہمراہی میں بیڈروم میں آگئی تھی۔ ایک دو بیل بیسر تھا۔ کسی گاؤں کا کمرا تو دکھائی دے رہا تھا۔ اعلیٰ ترین فرنیچر سے مزین، انتہائی [illegible] اور صاف ستھرا...... کھڑکی کے سامنے وہی جالی [illegible] نائیلون کا پردہ تھا جس کے کُنڈے پر پھولوں [illegible] ٹوکری ٹنگی تھی۔

عیسیٰ تو لباس تبدیل کیے بغیر اسے لاڈ [illegible] رات کا سلام دے کر نیند میں گم ہوگیا تھا۔ [illegible] وہ بہت تھک چکا تھا تاہم مالا کو اس اجنبی گھر میں [illegible] بھی نیند آنے والی نہیں تھی۔ حالانکہ تھکن سے انگ [illegible] انگ ٹوٹ رہا تھا مگر نیند کروٹیں بدلنے پر بھی [illegible] آنے والی تھی۔ یہاں پاکستان سے ہزاروں میل [illegible] دور، ایک اجنبی گاؤں کے پُرتعیش بیڈروم میں لیٹ [illegible] وہ اپنی گزشتہ زندگی کو سوچ رہی تھی۔ اسے اپنی ممی اور [illegible] ڈیڈی یاد آنے لگے تھے۔ اپنے پیارے بھائی [illegible] ذیشان، ذی شاہ اور زرشام یاد آرہے تھے۔ لاڈ [illegible] سی نٹ کھٹ بہن بندیا کی یاد پلکوں کو بھگونے لگی تھی۔ حالانکہ یہ لوگ کبھی بھولتے تو نہیں تھے مگر مشرقی بیٹی [illegible] ہونے کی وجہ سے اپنی سسرال آکر اسے پچھلوں [illegible]

[illegible] بھلانا ہی تھا۔ اسی بات کا درس دے کر ماں نے اسے سمندر پار بھیجا تھا۔ اسے ماں کے لفظوں کی لاج رکھنا تھی۔ اسے سسرال کو آباد کرکے میکے کو بھلانا ہی تھا۔

چپکے چپکے ڈھیر سارا رو لینے کے بعد من کو ہلکا کر کے وہ بستر سے اٹھ گئی تھی۔ نیند تو چونکہ آنے والی نہیں تھی۔ سو وہ کمرے میں موجود ایک دوسرا دروازہ کھول کر باہر آگئی تھی۔ یقیناً یہ بالکونی میں کھلتا تھا۔ رات کو بوارِیا کا حسن کالی چادر کی بغل میں چھپ گیا تھا۔ پہاڑ کے قعر سے پھوٹنے والا چشمہ بھی نظر نہیں آتا تھا اور گلابوں کے کھیت بھی خاموش اور اندھیرے میں گم تھے۔ بس پھولوں کی دلفریب خوشبو فضا میں رچی تھی۔ مالا کو لگ رہا تھا وہ خوشبو کے کسی دیس میں بھول کر آگئی ہے۔ اتنی سحر انگیز گلابوں کی مہک تھی جی چاہ رہا تھا کہ بالکونی سے چھلانگ مار کر پھولوں کے کھیت میں گھس کر چادر تانے وہیں آنکھیں موند کر لیٹ جائے وہ گویا تصور میں گلابوں کی پُرنم پتیوں پر ٹہل رہی تھی جب اچانک اس کے پیچھے کوئی چپکے سے آکھڑا ہوا تھا۔ مالا نے گردن موڑ کر دیکھا تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا...... اس کے بیڈروم کا بند دروازہ کھول کر وہ کمرے میں سے گزرتی ہوئی بالکونی تک آنے والی موِن کو دیکھ رہی تھی۔ بھلا موِن نے لاکڈ دروازہ کیسے کھول لیا تھا اور ہلکے سے کھٹکے کی آواز بھی نہیں آئی تھی پھر موِن کی اس قدر غیر اخلاقی حرکت پر مالا کو بہت غصہ بھی آیا تھا۔ وہ اپنے بھائی کے کمرے میں بِنا اجازت رات کی تاریکی میں گھس آئی تھی یا تو اس کمرے کی ایکسٹرا چابی اس کے پاس تھی یا پھر دروازے کے لاک کھولنے کا فن اسے آتا تھا۔ جو بھی تھا، یہ قطعاً غیر اخلاقی حرکت تھی۔ مالا کا دل چاہا، وہ اسے اتنی گھٹیا حرکت پر باتیں سنائے...... مگر اسے ڈچ آتی نہیں تھی۔ دوسرے وہ مالا کی بات شاید اردو میں سمجھ نہ پاتی مگر یہ بھی مالا کی سراسر بھول تھی۔ سارے ماحول پر چھائی سامنے کھڑی یہ لڑکی کوئی فنکارہ تھی یا

یادیں

تم نے مجھ سے مجھے جدا کرکے
شیشۂ دل کو آئینہ کرکے
عکس اس میں اتار کر اپنا
رکھ دیا بھولی بسری چیزوں میں
وقت کی ادھ کھلی درازوں میں
کسی بے نام سے گماں کے پاس
اِک ادھوری داستان کے پاس
جس جگہ
گمشدہ خطوں میں چھپے
آنسوؤں کی طرح چمکتے ہوئے
یاد کے بے شمار جگنو ہیں
درد کے بے حساب پہلو ہیں
خشک پھولوں کی پتیوں میں کہیں
کسی برسات کی نمی ہے جہاں
زندگی کی بہت کمی ہے جہاں
ٹوٹی چوڑی کے ساتھ رکھی ہوئی
اِک دسمبر کی شام کے ہمراہ
کچھ خزاں کے بھی دن پڑے ہیں کہیں
خواب کی دھجیوں سے لپٹے ہوئے
چاندراتوں کے سلسلے ہیں کہیں
اور کچھ عہد وفا نہ ہوئے
قرض سانسوں کے
جو ادا نہ ہوئے
اتنی چیزوں کے بیچ رکھا ہوا
آئینہ ٹوٹ بھی تو سکتا ہے
بچ بھی جائے تو آئینے پہ پڑی
سیکڑوں غم زدہ خراشوں میں
کوئی صورت کہاں ابھرتی ہے
سانس کا کیا ہے چلتی رہتی ہے

شاعرہ: ناہید قمر
مرسلہ: مہرین کنول، لیہ

جادوگرنی......؟ مالا سمجھ نہیں پائی تھی تاہم اس کے الفاظ نے مالا کے پیروں تلے سے زمین کھسکا دی تھی۔

"تم بہت جلد علی عیسیٰ کی زندگی سے جانے والی ہو اور میرا بھائی عنقریب تمہیں طلاق دے گا یہ مت بھولنا، مون کے کہے گئے لفظ کبھی غلط نہیں ہوتے۔" وہ بہت شُستہ اور رواں اردو میں مالا کے پورے وجود کو پتھر کر رہی تھی۔

☆☆☆

مون حسیب اس کی زندگی میں انتہائی پُر اذیت موڑ لے کر آئی تھی۔ وہ عجیب لڑکی تھی، عجیب باتیں کرتی تھی۔ عجیب باتیں منواتی تھی اگر غور کیا جاتا تو اس عجیب لڑکی کی زندگی ایک لفظ عجیب سے گندھی تھی۔ اس کی چال ڈھال، بول چال، دیکھنے، تکنے، تاڑنے کا ہر طریقہ "عجیب" تھا اور خصوصی طور پر مالا سے گفتگو کرتے ہوئے وہ اور بھی عجیب لگتی تھی۔ وہ اس کی زندگی میں اچانک آئی تھی اور اس کی ہر ملاقات اچنبھے کا باعث تھی۔ وہ اچانک آتی تھی، یعنی جہاں اس کے آنے کا کوئی گمان بھی نہیں ہوتا وہ وہاں کسی جن زادی کی طرح ٹپک پڑتی تھی۔

مون کی آمد اسے ہمیشہ خوف کے عذاب میں دھکیل دیتی تھی۔ یہ ایسا خوف تھا جسے بہت چاہ کر بھی وہ علی عیسیٰ سے شیئر نہیں کر سکتی تھی حالانکہ گروی کے گھر اس گہری شب بلی کی چال چلتی مون چپکے سے لاکڈ دروازہ کھول کر اس کے پیچھے ٹیرس پر آ کھڑی ہوئی تھی تب بھی ایک بھیانک خوف اس کے معصوم دل کو پنجوں میں جکڑ چکا تھا اور اس خوف کے جڑ پکڑنے سے لے کر مون کی انتہائی غیر اخلاقی حرکت پر برہمی محسوس کرنے کے باوجود اس کی ہمت نہیں پڑی تھی وہ مون کی شر انگیز بکواس کا ایک لفظ بھی علی عیسیٰ کو بتا سکے۔ کیا وہ اس کی بات کا یقین کرے گا؟ کیا وہ مان لے گا کہ رات کے دوسرے پہر اس کی بہن بے دھڑک اس کے کمرے میں گھس آئی تھی تو پھر مالا کو اپنی بات کہہ کر گنوانی ہی تھی۔ ابھی ان کی شادی کو دو ہفتے ہوئے تھے اور یہ اتنی کم مدت تھی کہ علی عیسیٰ کیا اس پر اعتبار کر سکتا تھا؟ مون کے کہے الفاظ پر یقین کر سکتا تھا؟ وہ الفاظ جو نیزے کی انی تھے یا ہتھوڑے کی ضرب تھے۔ ان الفاظ کی تکلیف محض مالا محسوس کر سکتی تھی۔ سمندر پار سے آئی دو ہفتوں کی بیاہی چھوٹی سی لڑکی جسے اس کی ہم عمر ایک لڑکی بڑے کروفر سے دھمکا رہی تھی۔

"تم بہت جلد علی عیسیٰ کی زندگی سے جانے والی ہو......" ان الفاظ کی بازگشت نے پوری رات مالا کو ہراساں رکھا تھا۔ رات بھر ایک گھڑی کے لیے بھی پلکیں آپس میں نہیں جڑی تھیں...ایک لمحے کے لیے بھی نیند مہربان نہیں ہوئی تھی۔ ساعت بھر کے لیے بھی چین نے دل کو نہ چھوا تھا۔ ان دو ہفتوں میں پہلی مرتبہ اسے شدید خوف اور تنہائی کا احساس ہوا تھا۔ یہ خوف مون کے الفاظ کا مرہونِ منت تھا۔ بھلا وہ علی عیسیٰ کی زندگی سے نکل کر کہاں جائے گی؟ بھلا وہ علی عیسیٰ کے بِنا کیسے رہ پائے گی؟

صرف دو ہفتوں میں کوئی اتنا رگِ جان کے قریب ہو جاتا ہے؟ کوئی اتنا عزیز ہو جاتا ہے؟ کیا محبت اس کو کہتے ہیں؟ کسی سے کبھی نہ جدا ہونے کا احساس، کسی کو بِن دیکھے چاہے چلے جانے کا احساس...... اگر محبت یہی تھی تو پھر مالا ذوالفقار کو علی عیسیٰ سے شدید ترین محبت ہو گئی تھی۔ جانے کب سے؟ جانے کس وقت سے، جانے کس گھڑی، کس ساعت وہ پھولوں سے گندھی مالا کے دل کی سلطنت پر ہمیشہ کے لیے قابض ہو گیا تھا اور اب اسی علی عیسیٰ کی بہن اسے دھمکا رہی تھی کہ عنقریب اسے علی عیسیٰ کی زندگی سے نکلنا ہو گا مگر کیوں......؟ کس لیے......؟ آخر اس کا قصور کیا تھا؟ اس کی غلطی کیا تھی؟ اس کا جرم کیا تھا؟ اسے کون سے گناہ کی پاداش میں وہ کٹھور، پتھر دل فرعون کا عکس لیے متکبر لڑکی دھمکا رہی تھی۔

یہ اس کا چپکے چپکے بہنے والا درد تھا...... یا بے آواز سسکاریوں کی جھنکار جس نے علی عیسیٰ کی نیند ختم کر دی تھی۔ وہ سر اٹھائے بغیر آنکھیں کھولے کمرے کے خاموش ماحول میں کسی کی سانسوں کا شور محسوس کر رہا تھا۔ پھر کئی منٹ دبے پاؤں گزر گئے، علی عیسیٰ نے مالا کو آواز نہیں دی تھی مگر وہ جان چکی تھی عیسیٰ جاگ رہا ہے تبھی اس نے اپنی سانس تک روک لی تھی...... حالانکہ علی عیسیٰ کے سونے سے لے کر مالا کے اٹھ کر ٹیرس تک جانے اور پھر واپس آنے تک اس نے بہت احتیاط برتی تھی۔ یقیناً یہی احتیاط مون نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اور پھر اس کے حواسوں پر بجلی گرانے کے بعد چپکے سے واپس جاتے ہوئے بھی برتی تھی اور تب کا سویا علی عیسیٰ اس کی ہلکی سی سسکاری کو سن کر اٹھ گیا تھا۔ یقیناً تھکن نے اس پر نیند طاری کر دی تھی اور اب اس کی نیند پوری ہو چکی تھی تبھی وہ اٹھ گیا تھا۔ حالانکہ اٹھا تو وہ مالا کی آواز سن کر تھا۔ جانے کب ضبط کا دامن چھوٹ گیا تھا اور تمام احتیاطیں بکھر گئیں...... ورنہ وہ کبھی عیسیٰ کی نیند خراب نہ کرتی...... اور عیسیٰ نہ صرف اٹھا تھا بلکہ اس نے لائٹس بھی آن کر دی تھیں...... تب مالا کا دل دھک سے رہ گیا۔ یقیناً اب وہ روشنی میں اس کا چہرہ دیکھ لے گا...... اس کا بھیگا چہرہ اور روئی آنکھیں...... وہ اپنے رونے کا کیا جواز پیش کرے گی؟ کون سی دلیل دے گی؟ کون سا جواب گڑھے گی؟ اس پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی تھی جبکہ عیسیٰ نے اٹھنے اور لائٹس آن کرنے کے بعد بھی اسے مخاطب نہیں کیا تھا جانے وہ کیا کر رہا تھا؟ مالا نے عیسیٰ کے اٹھتے ہی درمیان میں سجاوٹ کے لیے رکھا انتہائی نرم، ملائم سفید فر والا کشن اٹھا کر اپنے منہ پر رکھ لیا تھا۔ یہ قطعاً بے اختیارانہ قسم کی حرکت تھی۔ وہ کسی بھی طرح اپنے تاثرات علی عیسیٰ سے چھپا لینا چاہتی تھی مگر کیا وہ اس میں کامیاب ہو گئی تھی؟

کمرے میں رنگ، رنگ کی روشنیاں عکس چھوڑ رہی تھیں...... اس نے کشن ہٹا کر پلکوں کی جھری میں سے دیکھا۔ علی عیسیٰ چھت پر لگے فانوس اور لیمپ کو بھی آن کر رہا تھا۔ جب پورا کمرا روشنی سے بھر گیا تب اس نے ساکت لیٹی مالا کو مخاطب کیا تھا۔ وہ یقیناً اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ اس کی آواز ہمیشہ کی طرح نرم تھی۔ نیند ٹوٹنے پر اس کا مزاج برہم نہیں تھا۔

"رونا ہر مسئلے کا حل نہیں ہوتا۔" اسے علی عیسیٰ کی آواز اب کچھ ہی فاصلے پر سے سنائی دی تھی۔ یقیناً وہ اس کے قریب آ کھڑا ہوا تھا پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر نرم فر والا سفید کشن اس کے چہرے سے ہٹا دیا۔ غیر واضح چیزیں واضح ہونے لگی تھیں۔ سرخ چہرہ، بھیگی پلکیں، کپکپاتے ہونٹ...... وہ ابھی ضبط اور صبر کی منزل سے کوسوں دور تھی۔ اسے ضبط کے مرحلے سے گزرنا آسان نہیں لگ رہا تھا۔ یقیناً اسے ضبط کی رمزیں سمجھنا ابھی نہیں آتا تھا پھر بھی وہ خود پر جبر کرتے ہوئے ضبط کر رہی تھی۔ اس کی یہ کیفیت علی عیسیٰ کے لیے نئی تھی تاہم اسے خود پر جبر کرتے دیکھ کر وہ گہری سانس کھینچ کر بولا تھا۔

"پھر بھی اگر دل بہت بھر آئے تو کھل کر رو لینا چاہیے...... تم میرے سامنے بہ آسانی اور بخوشی رو سکتی ہو...... میں تمہیں روکوں گا نہیں...... مگر اتنا ضبط نہ کرو...... خود پر جبر نہ کرو......" کشن کی نرم فر کو چھوتا وہ حلیم لہجے میں کہہ رہا تھا۔ اس نے مالا سے رونے کی وجہ نہیں پوچھی تھی۔ وہ دل ہی دل میں اس بات پر اللہ کا شکر ادا کر رہی تھی اگر وہ وجہ پوچھ لیتا تو مالا بھلا کیا بتاتی؟ عائلی زندگی کی شروعات میں ہی بدگمانیاں، نجی جھگڑے اور گھریلو سیاست پر مبنی باتیں...... پھر اس کے رونے کی ہر کڑی تو مون کی گفتگو سے جا ملتی تھی جبکہ مون کی باتیں اس کے بھائی کے سامنے دُہرانے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔

وہ بھلا مالا کے بارے میں کیا سوچتا؟ اس کی کوئی چالاکی، عیاری، مکاری یا کوئی چال......؟ کم از کم ایک بات تو طے تھی اس نے مون کے بارے میں کچھ بھی سن کر مالا پر اعتبار ہرگز نہیں کرنا تھا۔ گویا پہلے روز ہی مالا نے یہ خود سے فرض کرلیا تھا سو وہ دل کو سمجھا رہی تھی کہ اسے مون کی ہر بات کو چپکے سے سہہ جانا ہوگا بنا چاچو اور علی عیسٰی کو بتائے...... اور کیا اس کا یہ فیصلہ ٹھیک تھا؟

''رونے سے دل کا بوجھ ہلکا ہوجاتا ہے۔'' وہ اپنی قمیص کے کف فولڈ کررہا تھا۔ اس کے سفید بازوؤں کا رُواں واضح تھا۔ اس کی بات کا مفہوم بھی واضح تھا۔ وہ دھک سے رہ گئی تھی۔ کیا وہ جانتا تھا کہ اس کے دل پر کوئی بوجھ ہے؟

''دل پر بوجھ ہو تو رونا آتا ہے، بلاوجہ تو کوئی نہیں روتا۔'' علی عیسٰی گویا اس کے چہرے کا ایک، ایک تاثر بہت غور سے پڑھ رہا تھا۔ وہ ایک مرتبہ پھر دھک سے رہ گئی تھی۔ تو کیا وہ اس سے بدگمان ہوگا؟ رات کے آخری پہر...... شوہر کے پہلو میں لیٹ کر چپکے، چپکے رونے والی بیوی...... اسے اپنی فاش غلطی کا فوراً احساس ہوگیا تھا کم از کم اسے رونا نہیں چاہیے تھا۔ رات کے اس پہر بالکل نہیں...... اور وہ رونے کے لیے باتھ روم میں بھی تو جاسکتی تھی۔ اس نے پہلے کیوں نہ اس پہلو پر غور کیا؟ وہ خود کو ملامت کرنے لگی تھی اور وہ جانے کب تک خود کو ملامت کرتی رہتی۔ علی عیسٰی کی آواز نے اسے چونکا دیا تھا۔

''رونا کوئی بڑی غلطی یا نادانی نہیں...... جس پر پچھتایا جائے...... ویسے میرے پاپا کہتے ہیں، نرم دل والوں کی ہی آنکھیں بہتی ہیں۔'' علی عیسٰی کے الفاظ اس کی سماعتوں کو پھر سے منجمد کرگئے تھے تو گویا وہ اس کا چہرہ پڑھ رہا تھا یا پھر یہ دونوں بہن بھائی جادوگر تھے؟ بھلا کوئی کسی کی سوچ میں کیسے اتر سکتا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے؟ اس نے تو آج تک کسی کے تاثرات جانچ کر کچھ بھی ٹھیک سے اندازہ نہیں لگایا تھا مگر یہ دونوں بہن بھائی اس کے ذہن میں بلا اجازت گھس آتے تھے۔ اسے ماننا ہی پڑا...... یہ دونوں بلا کے ساحر تھے اور وہ دھیرے دھیرے ہی سہی ان دونوں بہن بھائی کے سحر میں گرفتار ہونے لگی تھی۔

''تم محبت کو جادو سمجھتی ہو؟'' اس کے کان اس کی آنکھیں اور حتیٰ کہ اس کا منہ بھی کھل گیا تھا... وہ ہڑبڑا کر اپنی جگہ سے اٹھ گئی تھی۔ اسے لگا، وہ دوسری سانس بھی نہیں لے سکے گی۔ تو کیا اس کی سوچیں کتاب کے لفظ تھے جو چہرے پر آنسوؤں کی صورت بکھرے تھے جسے کوئی بھی پڑھ سکتا تھا یا پھر یہ خاص ہنر محض علی عیسٰی کے پاس تھا؟ اور اس کی بہن کے بھی تو پاس تھا؟ وہ ساکت رہ گئی تھی اور ٹھوڑی پر اترے آنسو بھی پونچھ نہیں پائی تھی۔ اسے اپنی طرف ایک ہیجان آمیز حیرانی میں مبتلا دیکھتے پا کر علی عیسٰی اب کے ذرا سا مسکرا دیا تھا۔

''تم...... تم اتنا حیران کیوں ہوتی ہو...... موتیوں کی سفید مالا......!'' وہ اب ہنستا ہنستا پائنتی کی طرف بیٹھ گیا تھا۔ سفید فر والا کشن اس نے اپنے بازوؤں میں دبوچ رکھا تھا اور وہ اسی طرح سہولت سے ٹانگیں نیچے لٹکائے بیڈ پر نیم دراز ہوگیا...... مگر اس نے ہنسنا ترک نہیں کیا تھا...... اور ہنستے ہنستے اس کی خوب صورت آنکھوں کے کنارے شفاف پانی سے بھر آئے تھے...... وہ اس لمحے مالا کو اتنا حسین لگا کہ اس کی نگاہ ہٹ نہ پائی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے دل کے چھوٹے سے ٹکڑے میں علی عیسٰی کی ساری محبت کو پور پور بھر لے۔

مالا اور علی عیسیٰ کے بیچ کیا ہوا......؟ کیا ذی شاہ جلد از جلد اس کی کھوج لگانے میں کامیاب ہو جائے گا؟ ترکِ وفا کا سبب کون بنا......؟ یہ سب جاننے کے لیے پڑھیے اگلا حصہ

ناولٹ



نایاب جیلانی

تیسرا حصہ

''پتا ہے، تم مجھے کبھی، کبھی کیا لگتی ہو؟'' علی عیسٰی نے مسکراہٹ روک کر اپنا چہرہ اس کی طرف موڑ لیا تھا...... مالا کا دل پھر سے دھک، دھک کرنے لگا...... قاتل کی ساری ادائیں ہی قتل کرنے والی تھیں۔ اس کا معصوم دل سہہ نہ پاتا...... یہ توجہ کے انداز، یہ چاہتوں بھرے جام پھر اس کی نرم گفتار، شیریں کلام، وہ مٹھاس کا دریا تھا اور مالا اس شیرے میں ڈوبنے والی جل پری .... وہ کرم





شب تاب تھا اور مالا اس کی دیوانی...... کبھی جو علی عیسٰی کی صبیح پیشانی پہ ناگواری کے جتھے ابھرتے تب بھلا مالا ذوالفقار کا کیا بنتا......؟ شاید اس کا دل ہی بند ہو جاتا...... مگر وہ تب کی بات اب کیوں سوچ رہی تھی؟ اس نے جلدی سے دونوں ہاتھ چہرے پر رگڑ ے...... شاید خود کو سنبھالنے کی ننھی سی کوشش تھی۔

''آپ...... آپ مجھے ہونق، بدھو، احمق اور بے وقوف ہی نہیں خبطی بھی سمجھتے ہوں گے۔ کیا میں آپ کو پاگل، پاگل لگتی ہوں؟'' اس نے بڑی معصومیت سے منا سا سوال کیا تھا۔ اتنی دیر سے علی عیسٰی اکیلے ہی بولے چلا جا رہا تھا۔ اسے مالا کی لب کشائی نے ڈھارس سی پہنچائی تھی۔ اس کا بولنا علی عیسٰی کو بہت اچھا لگا اور مالا خوش تھی کہ اس کا دھیان اس کے رونے سے ہٹ گیا ہے جبکہ علی عیسٰی کچھ وضاحت دے رہا تھا۔

''میں نے یہ کب کہا......؟'' علی عیسٰی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں ایسا ہرگز نہیں سمجھتا۔'' وہ ایک مرتبہ پھر اس کا چہرہ حرف بہ حرف پڑھنا چاہتا تھا۔ مالا کچھ جھنجلا گئی...... اب وہ اسے اپنا چہرہ پڑھنے نہیں دینا چاہتی تھی۔ ایک تو عیسٰی کو اس کا چہرہ پڑھنے کا کچھ زیادہ ہی شوق ہو چکا تھا۔ شاید وہ چلتی پھرتی کوئی کتاب تھی۔

''میں تمہیں نہ پڑھوں تو کسے پڑھوں؟'' مالا کے دائیں طرف سے آواز ابھری۔ وہ پھر سے اچھل پڑی تھی یعنی چہرہ موڑ کر بیٹھنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس کے قریب بیٹھا بندہ غضب کا قیافہ شناس تھا۔ ایسے تکے اور اندازے لگاتا کہ مالا دھک سے رہ جاتی۔

''ہائے میرے اللہ جی! یہ بندہ ہے یا......؟'' وہ ذرا سا گھبرا گئی۔ ''ان کے قریب بیٹھ کے تو سوچنا بھی نہیں چاہیے۔'' آج اس نے ایک دوسرا فیصلہ بھی کر لیا تھا۔ پہلا فیصلہ یہ تھا کہ وہ مون کی باتیں چاچو اور عیسٰی کو نہیں بتائے گی اور دوسرا فیصلہ ابھی ابھی...... اسے علی عیسٰی کے قریب بیٹھ کر کچھ نہیں سوچنا تھا مگر وہ اپنے اس دوسرے فیصلے پر زیادہ دیر تک قائم رہنے والی نہیں تھی۔

''اچھا تو...... میں تمہارے رونے کی وجہ...... پوچھ سکتا ہوں......؟'' عیسٰی کے سوال پر اس کی سانسیں یہیں کہیں حلق میں اٹک گئی تھیں تو کیا وہ بات کو گھما پھرا کر وہیں پر لے آیا تھا جہاں سے بات کی ابتدا ہوئی تھی۔

''ہائے وجہ؟ بھلا کیا وجہ بتاؤں گی؟'' وہ حق دق رہ گئی، چہرے پر سراسیمگی پھیل گئی تھی اور مون کی آواز لہروں کی صورت میں ایک مرتبہ پھر اسے سرسوں کا پھول بنا گئی۔ مون کو سوچنا ہی اس کا خوف بڑھا دیتا تھا۔ مون کیا تھی؟ مون کیسی تھی؟ مون ایسی کیوں تھی؟ بھلا مون کی شخصیت اور انداز کی کوئی تشریح کر سکتا تھا؟

''مم...... مجھے ممی اور ڈیڈی یاد آ رہے تھے اور میرے بھائی، بہن سب......'' اس کے پاس اتنی مضبوط دلیل تھی۔ عیسٰی کو مطمئن ہو جانا چاہیے تھا...... مگر وہ مطمئن نہیں ہو پایا تھا...... مالا کی دلیل نے اسے مطمئن نہیں کیا تھا، گویا دلیل کمزور تھی...... حالانکہ دلیل کمزور نہیں تھی...... لہجہ کمزور تھا...... تاثرات سراسیمگی میں کھوئے تھے۔ وہ جھوٹ بول رہی تھی۔ عیسٰی نے اس کا جھوٹ پکڑ لیا تھا۔ اسے جھوٹ پکڑنے آتے تھے، مالا کو جھوٹ بولنے نہیں آتے تھے۔

''کیا ہیمل (آسمان) کے شیترن (ستارے) بھی جھوٹ بولتے ہیں؟'' علی عیسٰی کا لہجہ ناراض نہیں تھا۔ تاہم جتانے والا ضرور تھا۔ مالا کی پلکیں جھک گئیں۔ شادی کے دو ہفتوں میں اس کا پہلا جھوٹ کھلا تھا جو پکڑا بھی گیا۔ وہ عموماً جھوٹ نہیں بولتی تھی۔ اسے سکھایا بھی یہی گیا تھا، جھوٹ بولنا ہلاکت ہے۔ جھوٹ ہلاک کر دیتا ہے مگر کبھی کبھی مصلحتاً

جھوٹ...... اس میں بھلا حرج کیا تھا؟ گر سچ بتا دیتی تو اس میں نقصان تھا۔ علی عیسٰی کی پہلی بدگمانی کا نقصان...... اور وہ ایسا خسارہ اٹھا نہیں سکتی تھی۔ وہ اس کی بات پر یقین نہ کرتا...... کر بھی لیتا تو مون سے ضرور باز پرس کرتا...... اگر مون مکر جاتی تو پھر مالا کا سچ کہاں جاتا؟...... وہ نتائج کا سوچ رہی تھی۔ وہ حد سے زیادہ بے وقوف تھی۔ بھلا امتحان سے پہلے کیا نتیجہ آ سکتا تھا؟ اور نتیجے کے لیے امتحان دینا ضروری تھا۔ وہ امتحان دیے بغیر نتیجے سے خوفزدہ ہو گئی تھی۔ وہ انتہا کی احمق تھی۔ وہ سچ بولنے سے خوفزدہ تھی۔ حالانکہ سچ میں کتنا سکون تھا۔ وہ جھوٹ بول کر بھی سراسیمہ تھی عجیب دوراہا تھا۔ وہ جھوٹ اور سچ کے درمیان لٹک گئی۔

''میں نے سیل بر (چاندی) کے بیلد سولے (بت) پر زنگ جمتے دیکھا۔ مجھے یہ دیکھنا پسند نہیں آیا۔'' کچھ دیر بعد علی عیسٰی کی بہت سنجیدہ آواز ابھری تھی۔ وہ کیا بات کہہ رہا تھا؟ وہ کتنی مشکل بات کہہ رہا تھا...... مگر حیرانی یہ تھی علی عیسٰی کی مشکل بات پہلی مرتبہ مالا آسانی سے سمجھ گئی تھی پھر اس کا سر بھی جھک گیا۔ اس کا اشارہ اس کے جھوٹ کی طرف تھا۔ جھوٹ بولنا بہت تکلیف دہ امر ہے۔ جھوٹ پکڑا جائے تو اس سے بھی تکلیف دہ المیہ بن جاتا ہے۔

''تم تایا جان یا گھر والوں کو یاد کر رہی تھیں تو یاد کرنے سے بہتر تھا ہاتھ بڑھا کر سائڈ ٹیبل پر رکھا میرا سیل فون اٹھاتیں اور انہیں کال کرتیں، فون آدھی ملاقات ہوتا ہے۔ بات کرنے سے یاد مٹتی نہیں کم ضرور ہو جاتی ہے مگر تم نے ایسا نہیں کیا...... میں جب شہر سے یا ملک سے باہر ہوتا ہوں تو اپنے پاپا کو بہت مس کرتا ہوں اور جب انہیں مس کرتا ہوں تو فوراً کال کرتا ہوں...... میرے دل کو سکون مل جاتا ہے۔ ماں باپ کی آواز ائر فریشونگن ہے۔ تازگی، مٹھاس، سکون، اطمینان، کیف، سرور تو پھر تم نے انہیں فون کیوں نہیں کیا......؟ اس تازگی سے خود کو محروم کر کے روتی رہیں...... رونا مسئلے کا حل نہیں ہوتا...... مگر مجھے لگتا ہے تمہیں یہ بات پریشان نہیں کر رہی...... بات کچھ اور ہے اور میرا اندازہ غلط نہیں ہوتا...... ہم کتنے بجے گروہی کے گھر میں آئے، سورج ڈوبنے کے بعد یعنی گہری رات نیچے ہوئی...... تب تمہارا موڈ بہت خوشگوار تھا...... کمرے میں آنے کے بعد بھی خوشگوار رہا...... پھر میں سو گیا، تم جانے سوئی یا نہیں...... جب میری آنکھ کھلی تب رات کے تین بج رہے تھے۔ تم ضبط کرتے، کرتے بھی رو رہی تھیں۔ کوئی بلاوجہ نہیں روتا...... اور تم ان دو ہفتوں میں تو بلاوجہ نہیں روئیں پھر اس وقت کیوں......؟ میں تمہارے لیے فکر مند ہوں اور تمہیں اس بات کا احساس ہے مگر تمہیں جرمنی اور پاکستان کے اوقات کا نہیں پتا...... ہمارے تمہارے وقت میں چار گھنٹے کا فرق ہے۔ یہاں تین بجے ہیں تو پاکستان میں صبح کے سات...... اور یہ وقت کال کرنے کے لیے غیر مناسب نہیں مگر میں جانتا ہوں تم تایا جان کے لیے اتنی اداس نہیں...... تو پھر یہ رونا اور اداسی کیوں......؟ یعنی جو کچھ بھی ہوا میرے سونے کے بعد...... بیچ کے ان چند گھنٹوں میں......؟ یعنی میری نیند کے دوران، کیا تم تنہائی محسوس کر رہی تھیں یا تمہیں اجنبی جگہ پر نیند نہیں آ رہی تھی؟ یا ڈر لگ رہا تھا؟ ایک خیال تو بالکل غلط ہے۔ یعنی تمہیں کسی نے کچھ کہا ہوگا۔ یہ ممکن نہیں...... سب اس وقت سو رہے ہیں۔ کسی سے ملاقات کا تو سوال ہی نہیں پھر کمرا میں نے سونے سے پہلے خود چیک کیا تھا، دروازہ لاکڈ تھا۔ کوئی آ بھی نہیں سکتا پھر کیا؟ کیا اب بھی نہیں بتاؤ گی؟ مجھے لگتا ہے تم ضرور ڈر گئی ہو؟'' سارے آپشن ایک، ایک کر کے دھڑا دھڑ گراتے ہوئے وہ جس آخری بات پر اٹکا تھا مالا کی گویا وہیں سانس بحال ہونا شروع ہو گئی تھی۔ تاہم دل میں پھانس سی چبھی تھی۔ تو گویا کمرا

اس نے خود لاکڈ کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ کوئی کمرے میں نہیں آیا...... کسی نے مالا کو کچھ نہیں کہا، کوئی کمرے میں آکر اتنی غیر اخلاقی حرکت بھی نہیں کرسکتا تھا۔ خصوصاً اس کی فیملی کے لوگ...... تو پھر مالا کیا احمق تھی جو علی عیسیٰ کو سچ بتا کر بھی جھوٹی پڑتی؟ اس کی بہن اچانک اس کے کمرے میں آئی، چھکے سے اسے دھکا بھی گئی مگر وہ ایسی بے بس تھی کہ اصل حقیقت بتا ہی نہیں پائی۔ بتا دیتی تو کیا حرج تھا؟ علی عیسیٰ بس یقین نہ کرتا اور جب وہ مالا کی بات پر یقین نہیں کرتا تو وہ کانچ کے بت کی طرح ٹوٹ جاتی۔ چاندی کے بت پر زنگ آ بھی جاتا تو خیر تھی اگر چاندی کا بت ٹوٹ جاتا تو علی عیسیٰ بھلا اسے کیسے جوڑ پاتا؟ اتنی سی تو بات تھی، وہ غضب کا قیافہ شناس اور سو فیصد درست اندازے لگانے والا اتنی سی بات ہی نہ سمجھ پایا۔

''بولتی کیوں نہیں ہو مالا! کیوں پریشان کر رہی ہو؟'' اس کی آواز میں مالا کے لیے تفکر تھا...... مالا کی جان کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ اسے مالا کی فکر تھی اور وہ گہری نیند سے مالا کی خاطر اٹھ آیا تھا۔ کیا یہ کم تھا؟ کیا اتنی محبت...... اتنی چاہت اور اتنا احساس کم تھا؟ اس کا قناعت پسند دل تو علی عیسیٰ کے اتنے احساس اور محبت پر ہی لبالب بھر گیا۔

''میں ڈر رہی تھی...... مجھے جنگلی جانوروں کی آواز نے خوفزدہ کیا......'' اس نے سر جھکا کر اعتراف کیا۔ ''وہ آواز بہت تکلیف دہ تھی، بہت عجیب اور بھیانک، مجھے لگا دل کے ٹانکے اُدھڑ جائیں گے۔'' مالا نے خود کو بے خیالی میں پھر سے ٹیرس پر پایا تھا اور اس کے سامنے کھڑی موت...... اس نے سچ بتایا مگر انداز اور تھا...... علی عیسیٰ شاید سمجھا نہیں...... وہ بات کی تہ میں اترا نہیں تاہم اس کے خوف کو وہ خوب سمجھ گیا تھا۔

''میں جان گیا تھا تم خوفزدہ ہو، تمہارے چہرے پر خوف لکھا ہے، تمہیں ڈرنا نہیں چاہیے تھا۔ جنگلی جانور آبادی کی طرف آتے ضرور ہیں مگر گھروں میں داخل نہیں ہوسکتے۔ اس نکتے پر سوچتیں تو کبھی نہ ڈرتیں اور اگر تھوڑا مزید ذہن پر زور ڈالتیں تو نائیلون کا پردہ ہٹا کر ونڈوز کی سلائنڈ کے ہک ہٹا دیتیں، کھڑکی بند ہوجاتی تو کوئی آواز بھی اندر نہیں آسکتی تھی۔'' وہ بہت نرم لہجے میں بولتا ہوا اٹھا تھا پھر اس نے نائیلون کا پردہ ہٹا کر کھڑکی کا ہک ہٹا دیا۔ کھڑکی خود بخود بند ہوگئی تھی۔ علی عیسیٰ واپس آنے کے بجائے اپنا ہینڈ کیری بیڈ کے نیچے سے گھسیٹ کر اسے کھول کر بیٹھ گیا۔ وہ ہکا بکا اس کی کارروائیاں دیکھ رہی تھیں۔ اب وہ کیا کرنے والا تھا؟ بلکہ کیا کر رہا تھا۔ اس نے گردن اچک کر علی عیسیٰ کے ہینڈ کیری کو دیکھا اس نے اپنی پیکنگ خود ہی کی تھی بلکہ وہ اپنے کام بھی خود کرنا پسند کرتا تھا۔ سو مالا دیکھ نہیں سکی تھی اس نے ہینڈ کیری میں کیا رکھا تھا؟ سو اب تفصیل سے دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر کے لیے اس کا ذہن ہر گزشتہ خوف اور باتوں سے ہٹ گیا تھا۔ اس کے ذہن سے موت کا خیال بھی محو ہوگیا۔ بس یاد تھا تو اتنا کہ گھٹنوں کے بل کارپٹ پر بیٹھا یہ بہت مصروف سا علی عیسیٰ اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ مالا کو بھلا اور کس چیز کی چاہ تھی؟ کسی کی بھی نہیں...... اسے زمانے مل گئے تھے علی عیسیٰ کی صورت میں خزانے مل گئے تھے۔

وہ بڑی دلچسپی سے گردن اچکا اچکا کر دیکھ رہی تھی۔ علی عیسیٰ نے شاید کوئی باکس نکالا تھا۔ اس میں جانے کیا تھا۔ سیاہ رنگ کا خوب صورت باکس پھر اس نے کچھ اور تلاش کرنے کے چکر میں سارا سامان الٹ دیا۔

''ایں...... یہ کیا کر رہے ہیں؟'' مالا حیران رہ گئی۔ وہ سارا سامان الٹنے کے بعد زیر لب بڑ بڑا رہا تھا۔

''ہاؤ شو......؟'' اس نے جھنجلا کر اپنے

کپڑے اٹھا، اٹھا کر ہینڈ کیری میں پٹخے...... مالا کو اس کے جھنجلانے کی وجہ سمجھ نہیں آئی تھی مگر ہاؤ شو کی خوب سمجھ آگئی۔

''اوہ، تو یہ اپنا لیپ ٹاپ ڈھونڈ رہے ہیں...... یقیناً اب اس پر کچھ کام کرنا ہوگا...... کام بھلا کیا کرنا ہوگا؟ کوئی شو، مووی وغیرہ دیکھنا ہوگی...... اب نیند جو نہیں آئے گی۔ اللہ کرے نہ ہی ملے یہ رقیب میرا...... اس پر نظر جما کر تو زمانہ بھول جاتا ہے انہیں...... پھر فرولائنوں کے سارے کنسرٹ اور شوز جی جان سے پسند ہیں۔ واہیات عورتیں نہ ہوں تو...... ناچتی، گاتی، اٹھلاتی...... ہونہہ......'' مالا نے منہ بنا کر گویا جرمن کی فرولائنوں کو بے نقط سنائیں مگر دل میں...... لیکن بھلا ہو علی عیسیٰ کی غضب کی سماعتوں کا...... اس کا بدبدانا بھی سن لیا۔

''یہ تم کیا تسبیح پڑھ رہی ہو......؟ ابھی تک سوئی نہیں، فٹافٹ سو جاؤ اب۔'' اس نے پچکار کر اسے بنا دیکھے ہی اپنا کام جاری رکھا تھا تب مالا سے اس کی جھنجلاہٹ دیکھی نہ گئی۔

''آپ جو چیز ڈھونڈ رہے ہیں، یہاں ملنے والی نہیں۔ گھر بھول آئے ہیں شاید۔'' مالا کی مداخلت پر اس نے گردن اثبات میں ہلا کر گویا تائید کی تھی۔

''یقیناً میں گھر ہی بھول آیا ہوں...... حالانکہ میں اپنی چیزیں بھولتا ہرگز نہیں......'' وہ متفکر سا تھا یقیناً لیپ ٹاپ کے بغیر صبح ہونے تک کا وقت گزارنا مشکل لگ رہا تھا اسے...... مالا کو ذرا ہمدردی محسوس نہ ہوئی۔ وہ دل ہی دل میں خوش تھی۔ چاچو بھی مالا کی طرح اس کے لیپ ٹاپ سے خوب چڑتے تھے۔ دراصل وہ فارغ اوقات میں اسی سے جو چمٹا رہتا تھا۔

''اں...... تم پھر بول پڑیں، سوئی نہیں ابھی تک...... آنکھیں بند کرو اور سو جاؤ...... نیند پوری نہ ہوئی تو طبیعت بوجھل ہوجائے گی پھر کل سفر کیسے کروگی؟'' سیاہ رنگ کا خوب صورت باکس اٹھا کر اب وہ باہر جانے لگا تھا جب مالا نے فوراً ایک مرتبہ پھر مداخلت کی۔

''آپ...... آپ کہاں جا رہے ہیں؟'' اس کا دل کپکپا سا گیا۔ کمرے میں تنہا رہنے کا احساس فوراً سابقہ خوف جگا گیا تھا۔ علی عیسیٰ جاتے جاتے رک گیا۔

''میں ایک منٹ میں آیا......'' اسے تسلی دے کر وہ پھر باہر نکلنے لگا تھا جب مالا بستر سے اٹھ کر اس کے سامنے آگئی۔

''آپ لیپ ٹاپ لینے جا رہے ہیں؟ اگر ایک دن اس کے بغیر گزاریں گے تو قیامت نہیں آجائے گی، میرے رقیب کو خبردار جو اٹھا کر لائے......'' اس کا انداز اتنا بے ساختہ اور دلفریب قسم کا تھا کہ علی عیسیٰ رک سا گیا۔ اسے مالا کی یہ دھونس بھری بے تکلفی بہت پسند آئی تھی۔ گویا وہ دھیرے، دھیرے اپنے خول سے نکل کر بے تکلف ہو رہی تھی۔ یہ بہت خوش آئند عمل تھا۔

''سوت...... میرا مطلب ہے اچھا، اچھا یعنی رقیب؟'' وہ گویا اس کی بات سمجھ کر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا پھر ہنستا ہی چلا گیا۔ اس کی ہنسی رک ہی نہیں رہی تھی۔ اسے برابر ہنستا دیکھ کر مالا خفیف سی ہوگئی۔ گویا اس نے بے ساختگی میں کچھ الٹا سیدھا بول دیا تھا۔ وہ شرمندہ تھی، عیسیٰ اسے شرمندہ نہیں دیکھ سکتا تھا مگر وہ اسے تنگ ضرور کرنا چاہتا تھا اور وہ تھوڑا زچ بھی ہو رہی تھی۔

''تو لیپ ٹاپ رقیب ہی ہوا ناں...... ہر وقت اس کے ساتھ لگے رہتے ہیں۔'' مالا نے اپنی خفت مٹانی چاہی۔

''سو تو ہے...... پر تمہیں کس نے کہا میں لیپ ٹاپ لینے جا رہا ہوں؟'' وہ بڑی شرارتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ستاروں کی سی

چمک تھی۔

''آپ نے خود۔'' مالا زور دے کر بولی۔

''مگر میں تو سلیپر لینے جا رہا ہوں، ہاؤ شو یعنی جوتے...پر جوتے تمہارے رقیب کیسے ہوئے؟'' وہ ڈھیروں ڈھیر شرارت آنکھوں میں بھر کے معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔ مالا کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ خفت زدہ رہ گئی تھی۔

''کک......کیا......؟'' اس کے منہ سے پھنسی، پھنسی آواز نکلی۔ وہ بے انتہا شرمسار تھی۔ بغیر سمجھے بولنے کی عادت...... ڈھیروں خفت اٹھانی پڑی۔

''جی ہاں، میں جہاں بھی جاتا ہوں اپنے سلیپر تک ساتھ لے کر جاتا ہوں، مجھے دوسروں کی استعمال شدہ چیزیں پسند نہیں۔ گروی اور تاتنے بھی جانتی ہیں......تبھی اس روم میں سلیپر موجود نہیں...... انہیں پتا ہے، میں اپنے جوتے ساتھ لے کر آتا ہوں۔ مگر جانے کیسے بھول ہوگئی۔'' اسے شرمندہ دیکھ کر وہ زیادہ دیر مالا کو تنگ نہیں کرسکا تھا۔ وہ اسے خفت زدہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ یقیناً ڈچ میں بڑبڑایا تھا اور مالا کو سمجھ کہاں آتی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا مالا کو لینگویج کورس ضرور کروائے گا۔ یہاں رہنے کے لیے ڈچ سمجھنا اس کے لیے بہت ضروری تھا۔

''تو اب میں جوتے لے آؤں......؟'' وہ اجازت چاہ رہا تھا۔ ہونٹوں پہ اب بھی مسکراہٹ تھی۔ مالا نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔ وہ کچھ دیر کے لیے علی عیسیٰ کی شرارتی نظروں سے بچنا چاہتی تھی پھر جب وہ سلیپر لے کر واپس آیا تب تک مالا کمبل میں غروب ہوچکی تھی۔ عیسیٰ نے اطمینان محسوس کیا۔ وہ رات بھر سے جاگ رہی تھی، کچھ دیر سو جاتی تو اس کے حق میں بہتر تھا۔

وہ دبے قدموں باکس اٹھا کر واش روم میں گھس گیا تھا۔ اب جانے وہ کیا کرنے والا تھا۔

پندرہ منٹ بعد بھی اس کی واپسی نہ ہوئی تب مالا کو خفت بُھلا کر اٹھنا ہی پڑا تھا۔ وہ بھی دبے قدموں واش روم کی طرف آگئی۔ دروازہ کھلا ہی تھا اس نے جھری میں سے جھانکا تب اس کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔ وہ چیخنا چاہتی تھی مگر چیخ نہ پائی۔ رات کے تیسرے پہر اس کا شوہر بڑے اطمینان کے ساتھ منہ پُرراز پر کریے یعنی شیونگ کریم ملے بڑے موڈ میں شیو بنانے کی فل تیاری میں تھا۔ اسے تانکا جھانکی کرتے عیسیٰ نے دیکھ لیا تھا اب کے آنکھیں کھولنے کی باری علی عیسیٰ کی تھی۔ وہ اسے حیرانی سے دیکھ رہا تھا جو بجائے دیکھے جانے پر خفت زدہ ہونے کے ڈھٹائی سے کھڑی تھی۔

''ایں...... تم پھر بھی نہیں سوئیں؟ کمال ہے۔'' وہ موشیل کی طرح رگڑ رگڑ کر شیو بناتا حیرت سے بولا۔

''کمال ہے، یہ کام صبح نہیں ہوسکتا تھا؟'' مالا نے بھی اسی کے انداز میں کہنا چاہا تھا۔ تب عیسیٰ نے ابرو اُچکا کر اسے چھیڑا۔

''غالباً آپ مجھ پر طنز کرنے کی کوشش کررہی ہیں۔'' اس کا انداز تپانے والا تھا تب واش روم کے دروازے کو پورا کھول کر مالا نے جتایا۔

''غالباً نہیں، یقیناً میں آپ پر طنز کررہی ہوں۔'' اس نے بھرپور طنزیہ لہجہ اپنانا چاہا تھا مگر وہ اس...کوشش میں ذرا بھی کامیاب نہیں ہوسکی تھی۔ علی عیسیٰ نے قہقہہ لگایا مگر بے احتیاطی کی وجہ سے کریم تھوڑی منہ میں چلی گئی۔ اب وہ نل کھول کر برابر کلی کیے جا رہا تھا۔ مالا کی ہنسی نکل گئی۔

''توبہ، آپ اور چاچو تو کمال کے بندے ہیں۔ کل کے کام آج اور آج کے کام ایک دن پہلے کرلیتے ہیں۔'' اس نے بہ مشکل ہنسی روک کر کہا تھا۔

''اس میں سہولت بھی تو ہوتی ہے۔'' وہ منہ دھو کر تاول اٹھاتا لشکارے مارتے چہرے کے ساتھ

باہر آگیا تھا۔ مالا بھی اس کے پیچھے، پیچھے باہر آئی۔ علی عیسیٰ نے اپنا سامان دوبارہ ترتیب سے ہینڈ کیری میں سیٹ کرلیا۔ وہ چیزوں کی ترتیب اگر غصے یا جذباتیت میں بگاڑ لیتا تب بعد میں سکون کے ساتھ بگڑی ترتیب کو درست بھی کرلیتا تھا، یہ بھی اس کا کوئی اصول تھا جس کے بارے میں وہ مالا کو چیزیں درست کرتے ہوئے بتا رہا تھا۔

''تو آپ ترتیب بگاڑا ہی نہ کریں...... جب آپ کو پتا تھا ہاؤ شو کیری میں رکھے ہی نہیں تو پھر ترتیب کیوں الٹی؟'' مالا نے اس کی پوری بات سن کر رسان سے جواب دیا تھا۔ تب وہ اس کی سمجھدارانہ بات سن کر قائل سا ہوگیا۔

''وقتی طور پر مجھے غصہ آگیا تھا، آخر میں جوتا ہی کیوں بھولا؟ بس یہی غصہ چیزوں پہ اتار دیا۔'' اس نے گویا اپنی غلطی تسلیم کرلی تھی۔ اسے ترتیب نہیں بگاڑنی چاہیے تھی۔ غصے کو خود پر حاوی نہیں ہونے دینا چاہیے تھا مگر وہ اپنے مزاج کا کیا کرتا؟ اپنی جذباتیت اور جلد بازی کا کیا کرتا؟ اسے عجلت پسندی اپنے باپ سے وراثت میں ملی تھی۔

''لیکن یہ بھی تو دیکھو ناں، اگر آج میں جوتے نہ بھولتا تو کل کے لیے محتاط کیسے ہوتا؟ مجھے اپنی چیزوں کو بھول جانا گوارا نہیں، یہ میں کبھی برداشت نہیں کرسکتا، کسی قیمت پر بھی نہیں۔'' وہ سامان سیٹ کرنے کے بعد بڑے مستحکم اور ٹھوس لہجے میں اپنا نقطۂ نظر اس پر واضح کررہا تھا۔ مالا نے مزید علی عیسیٰ سے بحث نہیں کی تھی۔ ماں نے شروع سے ایک بات گھٹی میں پلادی تھی، باپ اور بھائیوں سے بحث نہیں کرتے اور شوہر سے تو بالکل بھی نہیں، سو ماں کے اتنے پرانے پڑھائے سبق کو وہ جرمنی آکے چار دن میں بھلا تو نہیں سکتی تھی۔

☆☆☆

''گروی! رات بھر مالا ڈرتی رہی، بیلے کے

جانوروں کی خوفناک آوازوں سے۔'' اس کے برابر بیٹھا علی عیسیٰ مقامی زبان میں گروسی سے مخاطب ہوا تھا۔ اس کے بات کرنے کا انداز ایسا تھا کہ گروسی نے بھی گردن موڑ کر مالا کو دیکھا تھا یوں مالا کو خود بخود محسوس ہوگیا تھا کہ علی عیسیٰ نے اسی کے متعلق بات کی ہے۔ تاہم وہ ان کی گفتگو سمجھ نہیں پائی تھی۔ ناشتے کی میز پر آنے والے وہ دونوں پہلے افراد تھے۔ ان کے بعد گروسی اور تاتنے آئی تھیں۔ سوزن، مالا سے خاصی گرم جوشی سے مل کر اب ان کے لیے ناشتا بنا رہی تھی۔ وہ کل سے آج بہت بہتر لگ رہی تھی۔ کل والی سوگواریت آج اس کے چہرے پر نہیں تھی۔ وہ اپنی ماں سے بہت مختلف تھی، مالا کو سوزن بہت حلیم الطبع محسوس ہوئی تھی جبکہ تاتنے سخت، کرخت مزاج عورت تھیں۔ البتہ مالا نے ایک چیز نوٹ کی تھی، علی عیسیٰ کو سوزن خاص پسند نہیں تھی۔ ان کے درمیان بس ہیلو ہائے تک بات چیت کے علاوہ طویل گفتگو نہیں ہوتی تھی، سوزن شاید اس کا حال احوال پوچھنا چاہتی تھی مگر علی عیسیٰ کی رکھائی دیکھ کر پلٹ کر کچن میں چلی گئی تھی تاہم مالا نے اس کے چہرے پر خفت کی ہلکی سرخی ضرور محسوس کرلی تھی۔

علی عیسیٰ سوزن کے چلے جانے کے بعد گروسی کو مالا کے ڈرنے کا احوال بتا رہا تھا تب گروسی نے اسے ساتھ لگا کر بہت پیار سے کہا۔

''واقعی......؟''

اب وہ علی عیسیٰ سے حیرانی کے عالم میں پوچھ رہی تھیں۔ ان کے خیال میں علی عیسیٰ مذاق کررہا تھا مگر وہ مذاق میں بات نہیں کررہا تھا۔

''مجھے افسوس ہے۔'' گروسی نے پریشانی سے کہا۔ انہیں افسوس تھا، مالا پہلی مرتبہ ان کے گھر آئی تھی اور ساری رات بے آرام رہی...... وہ علی عیسیٰ کو ڈپٹ رہی تھیں۔ ناراض ہورہی تھیں۔

''تمہیں چاہیے تھا اس کے ساتھ رہتے، جاگتے اور خیال رکھتے۔'' وہ خفگی سے کہہ رہی تھیں تب علی عیسیٰ نے ان کی بات درمیان سے اچک کر برجستہ کہا۔

''میں اس کے ساتھ تو تھا، البتہ جاگنا اور خیال رکھنا ذرا مشکل کام تھا۔'' مالا کی طرف شرارت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے وہ برابر مسکرا بھی رہا تھا۔ تب گروسی کی خفگی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

''تم اپنے باپ جیسے اچھے شوہر ثابت نہیں ہورہے۔'' گروسی کی جھاڑ پر علی عیسیٰ کا منہ اتر گیا تھا۔

''میں پاپا جیسا نہیں ہوں مگر اُن جیسا بننے کی کوشش ضرور کروں گا۔'' اس نے ذرا ٹھوس لہجے میں اپنا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ تب گروسی کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی تھی۔ یہ مسکراہٹ علی عیسیٰ کی فرمانبرداری کے لیے تھی۔ وہ بہت اچھا، بہت نیک اور فرمانبردار بیٹا تھا۔ اس بات سے کوئی بھی ناواقف نہیں تھا۔ وہ اپنے باپ سے بے انتہا محبت کرتا تھا۔ اس سچائی سے بھی کوئی ناواقف نہیں تھا۔

کچھ دیر بعد سوزن کچن سے نکل آئی تھی پھر رفتہ رفتہ اس نے میز کو انواع واقسام کے کھانوں سے بھر دیا تھا۔ مالا کی خواہش تھی وہ سوزن کے ساتھ کچن میں کام کروائے...... کم از کم برتن ٹیبل تک پہنچا دے مگر علی عیسیٰ نے اسے اٹھنے ہی نہیں دیا تھا۔

''چپ کرکے بیٹھی رہو۔'' علی عیسیٰ نے اسے اشارے سے منع کردیا تھا تب وہ چپ چاپ دوبارہ بیٹھ گئی تاہم اُن کے اشارے گروسی کی نظر میں ضرور آگئے تھے پھر انہوں نے علی عیسیٰ سے اشاروں کنایوں میں وجہ پوچھی تھی، علی عیسیٰ نے وجہ بتا دی۔ تب انہیں مالا پہ ٹوٹ کے پیار آگیا تھا۔

''تمہاری بیوی بہت اچھی ہے۔'' وہ برملا تعریف کررہی تھیں، اسے ساتھ لگا رہی تھیں۔ تاتنے کو محبت کے یہ مظاہرے سخت برے لگ رہے تھے تاہم وہ علی عیسیٰ کے سامنے کچھ بولنا نہیں چاہتی تھیں۔ کچھ ایسا جو بھانجے کو بہت برا لگتا۔ تبھی ایک بڑی طشتری میں ہن خن کا سالن نکال کر سوزن باہر نکل آئی۔ اس نے تاتنے کی بات سن لی تھی۔ اس کے چہرے پر بڑی نرم اور پیاری مسکراہٹ چمکنے لگی۔ اس نے جوس کا جگ اور طشتری بیچ میں جگہ بنا کر رکھی پھر جاتے، جاتے وہ مالا پر نرم نگاہ ڈال کر واپس مڑ گئی۔

''این فاخ......'' سوزن نے ایک لفظ میں گویا مالا کی تعریف مکمل کردی تھی۔ اس کے گلابی بھرے بھرے سرخ کچھ پھولے گالوں میں ڈمپل ابھر آئے تھے۔ اس کی آواز سن کر جہاں تاتنے کا موڈ مزید بگڑ گیا تھا وہیں علی عیسیٰ کے لبوں پر پہلی مرتبہ سوزن کے لیے نرم مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔ پھر یوں ہوا کے ناشتے کا دور پورا ہونے کے بعد بھی علی عیسیٰ کا موڈ بہت خوشگوار رہا تھا۔ جانے سوزن نے کون سا لفظ مالا کے لیے بولا تھا جو عیسیٰ کا موڈ اتنا خوشگوار ہوگیا تھا۔

مالا نے سوزن کو بہت غور سے دیکھا تھا، اس کا سر سیفور سے آج بھی ڈھکا ہوا تھا، ابھرے ابھرے سرخ گال بہت نمایاں تھے، سفید گول، گول اوہریگے (بالیاں) جن کے نیچے موٹا سا سنہری موتی لٹک رہا تھا۔ اس نے آج بھی سوتی روک (چوغہ) پہن رکھا تھا، لمبا سا پیروں کو چھوتا ہوا... مجموعی طور پر وہ بہت نرم خو، باوقار، مہذب، شائستہ اطوار لڑکی تھی اور مذہب کے معاملے میں بہت پکی...... بہت عبادت گزار اور نیک۔ پہلی نظر میں ہی بہت سلیقہ مند اور سگھڑ دکھائی دیتی تھی۔ مون کے مقابلے میں وہ بہت اچھی تھی بلکہ بہت ہی اچھی تھی۔ مون ایک خوب صورت بلا تھی جبکہ سوزن کوئی نیک دل پری، اگر اس کے نام کا آخری حرف ہٹا دیا جاتا تو اس کی پوری شخصیت ایک لفظ سوز سے عبارت تھی۔ سوز و گداز سے گندھی، اداسیوں کی مٹی سے تخلیق کی گئی نہایت حلیم، مہربان، شفیق، خلیق!...... وہ اس نگر نہ جانے کہاں سے بھول کر آگئی تھی۔ پہلی دفعہ جب اس نے سوزن کا ذکر چاچو کے منہ سے سنا تھا تب وہ اسے کچھ اچھی نہیں لگی تھی، وہ ذکر بھی سرسری سا تھا، سننے اور دیکھنے میں ویسے بھی بڑا فرق ہوتا ہے، یہ فرق آج اسے بہت واضح محسوس ہورہا تھا۔

ناشتے کے بعد جب تاتنے پیشانی پر بل ڈالے اٹھ گئیں اور ان کے پیچھے گروسی بھی اپنے پالتو جانوروں کو دیکھنے چلی گئیں۔ تب مالا نے فوراً عیسیٰ کو مخاطب کیا تھا۔ اس کے لہجے میں دبی دبی بے چینی اور جوش واضح تھا۔

''سوزن نے میرے بارے میں کیا کہا تھا، جسے سن کر آپ مسکرا دیے تھے حالانکہ اسے پہلے گھور، گھور کر دیکھ رہے تھے۔'' مالا نے جس بے ساختہ انداز میں بات کا آغاز کیا تھا عیسیٰ کو اچھو لگتے، لگتے رہ گیا۔ وہ انناس کا جوس پی رہا تھا بلکہ پی کیا رہا تھا پورا جگ چڑھا چکا تھا۔ اب تو کچھ قطرے ہی جگ میں بچے تھے۔ وہ جس شوق سے جوس پی رہا تھا مالا کو اندازہ ہوگیا، اسے انناس کا رس بہت پسند تھا اور مالا تھی کہ چپکے، چپکے عیسیٰ کی پسند ناپسند کو نوٹ کرتی جارہی تھی۔ یہ کام بھی اس کے لیے بڑا ہی دلچسپ تھا۔ عیسیٰ کی ایک، ایک چیز کو نوٹ کرنا، ویسے تو وہ ویجی ٹیرین تھا تاہم اسے اتنی کم مدت میں بھی اندازہ ہوچکا تھا وہ چوزے کا سالن شوق سے کھاتا ہے اور اسی حساب سے مالا کو یہ بھی پتا چل گیا تھا وہ چاچو اور گروسی سے بے انتہا محبت کرتا ہے۔ سوزن اسے اتنی پسند نہیں تھی نہ جانے اسے ناپسند کرنے کی وجہ کیا تھی؟ اور مون سے اس کا کوئی جھگڑا چل رہا تھا۔ مون واحد شخصیت تھی جس کے بارے میں عیسیٰ بہت کم بات کرتا تھا اور سوزن کے حوالے سے تو بات ہی نہیں کرتا تھا مگر اس وقت وہ سوزن کے ذکر پر مسکرا دیا۔

''اچھا تو تمہارا دھیان میری طرف تھا؟ ویسے میں نے کب سوزن کو گھور، گھور کر دیکھا ہے؟'' وہ

بڑے بھولپن سے پوچھ رہا تھا۔ گویا حد سے زیادہ معصوم بننے کی کوشش کررہا تھا...... اس کی چالاکی پروہ قدرے برہم ہوگئی تھی۔

''جیسے میری آنکھوں پرتو پٹی بندھی تھی۔ وہ بے چاری جتنی مرتبہ میز پر ڈشز رکھنے آئی، آپ نے اسے کڑی نگاہوں سے گھورا، وہ خفت زدہ سی پلٹ جاتی تھی، بس آخری مرتبہ اس نے کچھ ایسا کہا، جس پرآپ مسکرادیے تھے۔'' مالا نے گزشتہ منظر کا کچھ اس طرح سے نقشہ کھینچا تھا کہ عیسٰی کو مانتے ہی بنی پھروہ فوراً گفتگو کارخ بدل گیا تھا۔

''وہ تمہاری تعریف کررہی تھی اور تمہاری تعریف اس کے منہ سے سن کر مجھے بہت اچھا لگا تھا۔'' عیسٰی نے گھوریوں پر روشنی ڈالے بغیر مالا کو بالکل سچ، سچ بات بتائی تھی مگر وہ پھر بھی کچھ مشکوک ہوگئی تھی۔

''کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟''

''علی عیسٰی کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔'' وہ مسکراکر بڑے مستحکم لہجے میں وضاحت دے رہا تھا تب مالا بھی دھیرے سے مسکرادی تھی۔ اس لمحے اسے سوزن کچھ اور بھی اچھی لگی تھی۔

''اس نے میری کیا تعریف کی؟'' مالا نے چمکتی آنکھوں سے پوچھا۔

''یہ میں ہرگز نہیں بتاؤں گا۔'' علی عیسٰی نے صاف جواب دے دیا۔ مالا کا منہ اس جواب پراتر سا گیا۔

''مگر کیوں؟'' اس نے الجھ کر پوچھا۔

''تمہیں خود کھوجنا ہوگا، ڈچ کو سمجھنا ہوگا، لوگوں کے لفظوں پر غور کرنا ہوگا تاکہ تمہیں پتا چل سکے لوگ تمہارے بارے میں کیا بات کررہے ہیں۔'' عیسٰی کے الفاظ نے اسے حواس باختہ کردیا تھا۔

''مگر یہ تو بہت مشکل کام ہے۔'' وہ گویا رو دینے کو تھی۔ ایسی کچ مچ قسم کی زبان تھی۔ اس کے پلّے تو کچھ نہیں پڑتا تھا۔

''مشکل کام میں ہی تو مزہ آتا ہے، دیکھو، مالا! میں ہروقت تو تمہارے ساتھ نہیں رہوں گا۔ آفس جاؤں گا، آفیشل ٹورز پر جاؤں گا اور تمہیں جگہ، جگہ کسی ترجمان کی ضرورت محسوس ہوگی۔ میں چاہتا ہوں تم اطالوی اور ترکش کی بھی تھوڑی بہت سمجھ بوجھ رکھو تاکہ مشکل وقت پر آسانی ہوجائے۔ یہاں کی سرکاری زبان ڈچ ہے۔ تمہیں جگہ، جگہ مشکل پیش آئے گی۔ یہاں مشکل سے ہی لوگ انگریزی سمجھتے ہیں۔'' عیسٰی کے سمجھانے پر اس کا نفی میں ہلتا سر قدرے اثبات میں ہل گیا۔ حالانکہ وہ جانتی تھی اسے کبھی ڈچ زبان نہیں آسکتی۔ اسے دنیا کی سب سے مشکل زبان یہی لگ رہی تھی۔ وہ خود کو ان لوگوں کے درمیان گونگا، بہرہ سمجھتی تھی اور ویسے بھی اسے انگریزی کہاں آتی تھی۔ بس گزارہ ہوجاتا تھا۔

''میں جلد ہی تمہارا کسی انسٹی ٹیوٹ میں ایڈمیشن کروادوں گا۔'' عیسٰی اپنے ارادے... ظاہر کررہا تھا اور مالا کا دل ابھی سے گھبراہٹ میں مبتلا ہورہا تھا مگر وہ اپنی گھبراہٹ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ تبھی بات بدل گئی۔

''اچھا، ابھی تو بتادیں، سوزن نے میرے بارے میں کیا کہا؟'' وہ ذرا بضد ہوئی تو عیسٰی نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

''کچھ اور پوچھوگی تو بتادوں گا، یہی کہ گروی اور میرے درمیان جو باتیں ہوئیں وہ بھی تمہارے متعلق تھیں لیکن یہ بات ہرگز نہیں بتاؤں گا، اسے تم خود کھوجنا، معنی ڈھونڈنا، مطلب نکالنا، اس سے تمہیں ڈچ سیکھنے کا شوق بھی ہوگا۔'' عیسٰی کے پچکارنے پر وہ چپ کرگئی تھی۔ اب یہ عیسٰی کی خواہش تھی وہ بھلا کیسے ٹال جاتی؟

''اور ہاں! تم سوزن سے کچھ بھی پوچھ لینا، کم ازکم اس لفظ کے معنی نہ پوچھنا، یوں سمجھو اس نے ایک لفظ میں تمہاری پوری شخصیت کو اجاگر کردیا ہے اور تم یوں بھی سمجھو کہ بس تمہاری اسی ایک خوبی نے مجھے عمر بھر کے لیے تمہارا اسیر کردیا ہے۔'' عیسٰی کیا کہہ رہا تھا؟ کیا بول رہا تھا؟ مالا کو کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔ بس اسے اتنی خبر تھی وہ دھیرے، دھیرے ہوا کے رتھ پر سوار ہورہی ہے...... اس کے ہاتھ نرم بگولوں کو چھورہے تھے یا ریشم کے لچھے اس کے رخساروں کو چوم رہے تھے۔ کبھی اسے لگتا وہ پھولوں کی پھلواری میں سے گزررہی ہے۔ کبھی اسے لگتا وہ ہوا میں تیررہی ہے اور کبھی وہ آلپس کے پہاڑوں کی طرف رواں دواں ہونے لگتی۔ وہ سنہری خوابوں کے دیس رستہ بھٹک کے آگئی تھی۔ وہ کانچ کے شہر بھول کر آگئی تھی۔ وہ علی عیسٰی کے من ہائیم آگئی تھی۔ وہ من ہائیم جہاں محبت سانس لیتی تھی بیلے (دریا کے کنارے موجود جنگل) میں دم لیتی تھی۔ جہاں خوش پوشاک بے فکرے لوگ چہلیں کرتے تھے۔

یہ خوابوں کا دیس تھا۔ یہ سنہرے ریشم جیسے لوگوں کا دیس تھا۔ جہاں دھوپ میں چشمے پھوٹتے تھے، جہاں رات میں بلوے کھلتے تھے، خوش نما، خوشبو میں مہکتے، جہاں ''ساخابوں'' میں کنول کھلتے تھے۔

وہ خواب کے اتنے حسین اور مختصر سفر کو طے کرتے ہوئے خاردار جھاڑی میں الجھ گئی تھی تب اس کی بے ساختہ چیخ امڈ آئی۔ اس نے آنکھ کھول کر ذرا حواسوں میں آکر دیکھا تو علی عیسٰی فکرمند سا اسے جھنجوڑ رہا تھا۔

''ارے لڑکی! تمہیں کیا ہوا؟'' وہ حددرجہ متفکر تھا اور اسے کھڑے کھڑے سوتا دیکھ کر سخت جھنجلایا بھی تھا۔

''میں نے کہا تھا ناں...... نیند پوری کرلو، دو تین گھنٹے سولو مگر تمہیں تو میری جاسوسی کرنا تھی، اب چلتے چلتے نیند پوری کرنا......'' وہ خفگی سے کہہ رہا تھا، اب کہ مالا فل حواسوں میں آچکی تھی اور اپنی بے

سالگرہ کا تحفہ

کوئی دکان ایسی ہوتو بتاؤ بہنو
جہاں چوری کا زیور ملتا ہو
ہاتھ میں میرے ہیں صرف دو ہزار روپے
اور اپنی بھابی کو سیٹ دینا ہے

شاعرہ: عظمٰی آفاق سعید

مرسلہ: عرشیہ جنید، کراچی

خبری اور سابقہ کیفیت پر حد سے زیادہ شرمندہ تھی۔

''میں سو تو نہیں رہی تھی۔'' اس نے وضاحت دینا ضروری سمجھا تھا مگر یہ وضاحت نری بیکار گئی تھی۔ وہ اسے ساتھ لیے اسی ڈبل روم میں آیا تھا جو رات سے ان کی خواب گاہ رہا تھا۔ وہ بغیر اس کے کچھ کہے سمجھ گئی تھی کہ عیسٰی اسے یہاں کیوں لایا ہے۔

''اب تم آرام سے سوتی رہو، کوئی بھی ڈسٹرب نہیں کرے گا۔'' عیسٰی نے نرمی سے کہتے ہوئے نائیلون کا پردہ ہٹا کر ایک مرتبہ پھر گلاس ونڈو کی سلائڈ بند کردی تھی جو صبح کھول لی گئی تھی۔ اپنے تئیں وہ اس کے لیے بڑا پرسکون ماحول بنا کر گیا تھا۔ باہر سے دروازہ بھی اچھی طرح بند کرگیا تھا مگر ڈبل روم میں تنہا بستر پر لیٹے، لیٹے وہ پسینہ، پسینہ ہوگئی تھی۔ دراصل اسے رات کے تکلیف دہ منظر نے گھبراہٹ میں مبتلا کردیا تھا۔ جب وہ اپنے بھائی کی موجودگی میں رات کو اندر کمرے میں آگئی تھی تو پھر اسے اکیلا پاکر بھلا کیوں نہ آتی؟ حالانکہ مالا نے اسے ناشتے کی میز پر دیکھا نہیں تھا اور نہ ہی کسی نے اس کا ذکر کیا تھا۔ جانے وہ رات بھر سے کہاں تھی؟ مون کے بارے میں سوچتے ہوئے اس نے کروٹ لی تو اسے اپنے دماغ پر عجیب سا بوجھ محسوس ہوا تھا۔ یہ بوجھ کسی بھاری وزن سے مشابہ تھا۔ جیسے

ہتھوڑے کا بھار یا چکی کے پاٹ...... کچھ دیر بعد اسے اپنی آنکھوں میں چبھن محسوس ہوئی تھی۔ یہ چبھن جنگلی کانٹوں سے مشابہ تھی۔ اسے بے حد تکلیف محسوس ہوئی۔ مالا کو لگ رہا تھا دماغ کے اوپر والے حصے میں کوئی چپکے سے گھس آیا ہے، اسے لگ رہا تھا وہ عجیب ترین آنکھیں اس کے دماغ میں گھس گئی ہیں۔ وہ ان آنکھوں کو اپنے دماغ میں سے نکالنا چاہتی تھی مگر اس کی یہ کوشش بیکار تھی۔ اس کی ہر کوشش بیکار تھی۔ اس کے وجود پر نیند طاری ہو رہی تھی۔

اگرچہ وہ کمرے میں سونے کے لیے آئی تھی۔ اسے نیند نہ بھی آتی تب بھی وہ علی عیسٰی کا حکم کہاں ٹال سکتی تھی؟ حالانکہ اس نے کوئی حکم تو نہیں دیا تھا۔ بڑے پیار سے اسے سونے کی تاکید کر کے گیا تھا مگر وہ علی عیسٰی کے منہ سے نکلے ہر لفظ کو اپنے لیے حکم کا درجہ دیتی تھی۔ گویا یہ اس کی محبت اور فرمانبرداری کی انتہا تھی۔

علی عیسٰی چاہتا تھا کہ وہ آرام کر لے تاکہ سفر کے لیے فریش ہو کر نکلے۔ سو مالا نے اس کی بات مان لی تھی حالانکہ تب نیند اس کی آنکھوں میں کہیں نہیں تھی...... مگر اب...... اب جانے کیا ہو رہا تھا؟ وہ بستر پر پہلے کی طرح کروٹ کے بل لیٹنا چاہتی تھی مگر کسی معمول کی طرح سلیپر پہنے اٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں نیم وا تھیں۔ وہ سونا چاہتی تھی مگر چل رہی تھی۔ ڈبل روم کے دروازے کا لاک کھول کر وہ واپس اپنی جگہ آنا چاہتی تھی مگر اس کا پیر اپنے ہی دوپٹے میں الجھ گیا تھا۔ بس ساعت بھر کے لیے یوں لگا، اس کے ذہن نے بہت زور سے جھٹکا کھایا ہو، مالا کو لگا وہ دو عجیب ترین اور حسین ترین آنکھیں بہت عجلت میں اس کی کھوپڑی میں سے نکل گئی ہیں۔ الجھے دوپٹے نے اسے منہ کے بل کارپٹ پر گرا دیا تھا۔ فرش کی سطح مخملی کارپٹ کی وجہ سے گداز تھی تبھی اسے چوٹ نہیں آئی۔ اور وہ اپنے دونوں گھٹنوں پر زور ڈال کر اٹھتے ہوئے حیرت سے سوچ رہی تھی۔

''ارے...... میں تو بیڈ پر سوئی تھی پھر فرش پر کیسے گری؟'' اسے اپنے ہی سوال کا جواب پھر بھی نہیں ملا تھا اور حیرت کی بات یہ تھی کہ مالا کو بھی یاد نہیں آیا/وہ بیڈ سے فرش پر کیسے گری؟ اسے لگا، شاید وہ کارپٹ پر ہی سو رہی تھی۔ وہ اپنے ہی جواز پر مطمئن ہو گئی...... حالانکہ یہ عجیب نیند تھی، جس نے اسے فریش کرنے کے بجائے پژمردہ کر دیا تھا۔ اس کے منہ کا ذائقہ بھی بدل گیا تھا۔ تب وہ اٹھ کر باتھ روم میں چلی گئی۔ نہانے سے طبیعت کچھ بہتر ہوئی تو وہ دوپٹا اچھی طرح اوڑھ کر نیچے چلی آئی حالانکہ اس کے ذہن میں نہانے سے لے کر نیچے آنے تک ایک کشمکش چھڑی ہوئی تھی۔ ایک دبی دبی جنگ جاری تھی۔

''میں بیڈ پر سوئی تھی یا کارپٹ پر؟'' اس کے ذہن سے یہ سوال کبھی محو نہیں ہو سکتا تھا۔ دراصل وہ آج تک کبھی نیچے نہیں سوئی تھی۔ بچپن سے لے کر اب تک تو پھر ایک اجنبی جگہ پر کیسے نیچے سو گئی تھی؟ پھر اسے خیال آیا شاید وہ بہت تھک گئی تھی تبھی نیچے ہی سو گئی۔ ایسے ہی سوالوں میں الجھتی جب وہ نیچے آئی تب اچانک شیمپئر سیال (ڈائننگ روم) سے عیسٰی نکلتا دکھائی دیا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گیا پھر اس کی نگاہ اپنی رسٹ واچ پر پڑی...... مالا نے واضح طور پر عیسٰی کی سفید پیشانی پر جھنتے بڑھتے دیکھے تھے، اس کا دل لمحے بھر کے لیے سکڑ گیا تھا۔ وہ عیسٰی کے بولنے کا انتظار کر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ بالآخر بول ہی پڑا۔

''تم ایک ضدی لڑکی ہو، ذرا بھی بات نہیں مانتیں...... میں نے کہا تھا کہ دو تین گھنٹے سو لینا اور تم دو تین منٹ بھی نہیں سوئی ہو گی، نہا کر نیچے آ گئیں...... یعنی دو تین منٹ واش روم میں گزر گئے اور تم لحہ بھر کے لیے بھی نہیں سوئیں۔'' عیسٰی کے لہجے میں خفگی نمایاں تھی.... گویا اسے مالا کا بات نہ ماننا برا لگا تھا...... یقیناً اسے برا لگا تھا۔ وہ اس کا اتنے خلوص

اور پیار سے خیال رکھ رہا تھا جبکہ مالا شاید اپنا خیال رکھوانا نہیں چاہتی تھی۔ شاید عیسٰی کے ذہن میں آنے والا خیال یہی تھا مگر مالا اس کی خفگی پر حیران رہ گئی تھی۔ وہ کیوں بلا وجہ خفا ہو رہا تھا؟ جبکہ مالا دو تین گھنٹے سو کر نیچے آئی تھی۔

''میں تو کب سے سو رہی تھی، کیا اب بھی نہ اٹھتی؟'' اس نے بوجھل آواز میں صفائی دینے کی کوشش کی تھی۔ علی عیسٰی نے چبھتی نظر سے اسے دیکھا۔

''کب سے سو رہی تھی؟ کیا دو تین دن گزر گئے؟'' اس نے چبا، چبا کر اس کی سرخ بوجھل آنکھوں کو دیکھ کر کہا تھا۔ وہ مضمحل اور پژمردہ نظر آ رہی تھی۔ بجھی بجھی اور تھکی، تھکی عیسٰی کم از کم اس روپ میں اسے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ تبھی چاہتا تھا کہ وہ آرام کر لے پھر اسے خیال آیا شاید وہ رات کی طرح اکیلے ہونے کے خوف سے سو نہیں پائی۔ یقیناً یہ خیال قوی تھا۔ تبھی اس کا بگڑتا مزاج معتدل ہو گیا۔ ان دونوں کی گفتگو خاصی بلند آواز میں ہو رہی تھی اسی لیے سوزن کاریڈور سے گزرتی ان تک آ گئی۔

''کیا ہوا؟'' سوزن نے فکرمندی سے پوچھا، وہ عیسٰی کی طرف دیکھ رہی تھی جبکہ مالا کی نظر اس کے پھولے، پھولے سرخ گالوں پر تھی۔ اس کے گال دور سے ہی بہت نمایاں نظر آتے تھے، روئی جیسے نرم مگر ابھرے، ابھرے اس کے چہرے پر ان دونوں کے لیے فکرمندی تھی، جو بہت بھلی نظر آ رہی تھی پھر عیسٰی نے نہ جانے سوزن سے کیا کہا تھا، وہ اثبات میں سر ہلا ہلا کر گویا اسے کوئی یقین دہانی کروا رہی تھی۔

''ماخت نشتس......'' سوزن نے نرمی سے مالا کے چہرے کی طرف دیکھ کر عیسٰی سے کہا تھا پھر وہ دونوں اسی کچ پچ زبان میں جانے کون سے مذاکرات کرنے لگے تھے۔ ایک تو ان کی باتیں اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی، دوسرا اس پر جانے کیوں جھنجلاہٹ سوار تھی۔ کہاں علی عیسٰی صاحب سوزن کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے اور کہاں اب چار منٹ سے بغیر رکے گفتگو جاری تھی۔ اللہ، اللہ کر کے بات ختم ہوئی تو عیسٰی اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''گروسی اور سوزن کی خواہش ہے، ہم دوپہر کا کھانا کھا کر یہاں سے جائیں، اتنی دیر تک میں تمہیں اپنی ماں کا یہ علاقہ دکھاتا ہوں۔'' وہ گزشتہ خفگی بھلائے سابقہ نرمی سے بات کر رہا تھا۔ عیسٰی کو وہ اپنی گفتگو کے دوران بھی چپ، چپ سی لگی تھی، یقیناً نیند کی کمی کا شکار اور بے آرامی کے باعث پژمردہ تھی۔ تاہم عیسٰی نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ وہ مزید یہاں رکنے کا سن کر کچھ مضطرب ہو گئی ہے۔

''ہم گھر واپس کب جائیں گے؟'' اس نے فی الفور اپنے من کی بات کہہ دی تھی، یقیناً اجنبی جگہ پر خود کو بے آرام محسوس کر رہی تھی۔

''انشاء اللہ سہ پہر تک، میں گروسی سے وعدہ کر چکا ہوں، ورنہ ابھی نکل جاتے۔'' یقیناً وہ اس کے تاثرات کا مطالعہ کر چکا تھا۔ مالا کو ذرا مسکرانا ہی پڑا۔ وہ مزید بوجھل پن کا مظاہرہ کر کے عیسٰی کو مشکوک نہیں کرنا چاہتی تھی نہ اس سے ڈانٹ کھانا چاہتی تھی اسی لیے خود کو ہشاش بشاش ظاہر کر رہی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ عیسٰی کی ہمراہی میں اس جادو نگری سے باہر آ گئی تھی۔ یہ خوب صورت مکان جسے دور سے دیکھنے کے بعد وہ مچل سی گئی تھی، قریب آ کر کچھ پُراسرار سا لگا تھا۔ حالانکہ مکان پُراسرار نہیں تھا۔ اس مکان میں رہنے والی وہ عجیب سی لڑکی جسے مالا نے دوبارہ اس رات کے علاوہ گھر میں نہیں دیکھا تھا حد سے زیادہ پُراسرار اور عجیب تھی اور مالا کی خواہش تھی وہ دوبارہ کبھی نہ اسے دیکھ پاتی لیکن بعض خواہشیں پوری کہاں ہوتی ہیں؟

وہ اس وقت عیسٰی کی ہمراہی میں موت کو ہرگز بھی سوچنا نہیں چاہتی تھی سو عیسٰی کے پیچھے سفید گلابوں کے باغ میں سے گزر رہی تھی۔ عیسٰی اسے اپنے بارے میں

بتا رہا تھا۔ اس کے بچپن کی ہر چھٹیاں یہاں گزرتی تھیں، اس کے پاپا اور مما کی لو میرج تھی۔ مما نے اسلام قبول کیا پھر پاپا سے شادی کی، تاہم اس کی گروسی نے ان سے ملنا جلنا نہیں چھوڑا تھا۔ عیسٰی نے بتایا تھا کہ اس کے پاپا نے یہاں آ کر بہت محنت کی تھی، حالانکہ پاکستان میں وہ ایک خوشحال گھرانے کے فرد تھے، پاپا نے جو کچھ بھی کمایا تھا اپنی محنت اور ایمانداری کی بدولت کمایا تھا، ان کا آج بزنس کمیونٹی میں ایک نام ایک مقام تھا۔ سچائی، ایمان داری اور انتھک محنت اس کے باپ کا سب سے بڑا وصف تھا اور یہی وصف انہوں نے عیسٰی کے اندر گھول کر ڈال رکھا تھا، عیسٰی بتا رہا تھا کہ اس کا حلقۂ احباب اتنا وسیع نہیں، گنتی کا بھی کوئی دوست نہیں، وہ آفس کے بعد کا وقت گھر میں گزارتا تھا، اسے پارٹیز، کلب، ہنگامے، شور وغل پسند نہ تھے۔

ان چند گھنٹوں میں مالا کو عیسٰی کی تمام پسند ناپسند ازبر ہو چکی تھیں۔ وہ اس کی ایک، ایک بات سن کر حفظ کر رہی تھی، اسے عیسٰی کو سننا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ عیسٰی کا بولنا اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس کے لفظوں میں کتنی مٹھاس تھی، کتنی چاشنی تھی، وہ سحر زدہ سی سن رہی تھی۔ اسے لمحے بھر کے لیے بھی خیال نہیں آیا تھا، وہ عیسٰی سے پوچھتی تو سہی، اتنے محبت کرنے والے والدین کے اتنے فرمانبردار بیٹے کی اکلوتی بہن اتنی باغی کیوں لگتی ہے؟ مون ایسی کیوں لگتی ہے؟ وہ اتنی اکھڑ یا پُراسرار کیوں تھی؟ وہ اپنے گھر کیوں نہیں رہتی؟ آخر جھگڑے کی نوعیت کیا تھی؟

پھولوں کی رہ گزر سے سُبک قدموں اور کسی بہت اپنے کی ہمراہی میں گزرتا ایک دلنشیں خواب کا کوئی حسین منظر تھا۔ وہ حقیقتاً ایک جادونگری میں آ گئی تھی۔ اس نے ڈیڈی اور بھائیوں کے ہمراہ بس مری وغیرہ کا علاقہ دیکھا تھا، سوات، کاغان کی طرف جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا، دیکھا جائے تو وہ ایک گھریلو سی لڑکی تھی، کالج اور گھر کے علاوہ کوئی اور مصروفیت نہیں تھی، کچھ ذیشان بھائی کو لڑکیوں کا گھومنا پھرنا پسند نہیں تھا۔ کبھی کبھی شامی آؤٹنگ کا موڈ ہوتا تو لے جاتا، ڈیڈی سے زیادہ بھائیوں کی روک ٹوک انہیں ایک حد میں رکھا کرتی تھی۔ خصوصاً ذیشان بھائی کو تو کچھ زیادہ ہی ان دونوں بہنوں کے بگڑنے کا خدشہ تھا، ہر وقت کا غصہ اور بلاوجہ روک ٹوک نے مالا کو کچھ زیادہ ہی خاموش طبع بنا دیا تھا، بند یا فطرتاً کچھ مختلف تھی اور شاید کچھ منہ پھٹ بھی۔

وہ لڑکی جسے تنہا مارکیٹ تک جانے کی اجازت نہیں تھی صرف ایک بندے سے رشتہ بدلنے کی بدولت کہاں ایک دوسرے دیس میں چھوٹے سے گاؤں میں گھوم رہی تھی...... یہ قدرت کے کیسے کرشمے تھے...... اس کے ہونٹوں پر مسکان سی چمک گئی تھی، علی عیسٰی نے مڑ کر اسے دیکھا اور مسکرا دیا۔

''تم چپکے، چپکے اس لیے مسکراتی ہو تاکہ میں تمہیں نظر نہ لگا دوں۔'' وہ مالا سے کچھ آگے نکل گیا تھا، اب دوبارہ اس کے برابر چل رہا تھا۔ مالا ایک مرتبہ پھر مسکرا دی۔ وہ اس کی ہمراہی پر فخر کر رہی تھی۔

علی عیسٰی اسے ایک الگ بستی میں لے آیا تھا، جہاں سے ایک سرخ عمارت بہت واضح نظر آ رہی تھی۔ یہ خوب صورت عمارت اپنی انفرادیت کے باعث مالا کی نگاہ میں آ گئی، وہ ایک مرتبہ پھر اس عمارت کی خوب صورتی سے متاثر ہو کر اندر سے دیکھنے کے لیے مچل گئی تھی، حالانکہ وہ ایک مرتبہ پھر غلطی کر رہی تھی، اس نے پہلے بھی ایک خوب صورت مکان کو دیکھ کر اندر سے نظارہ کرنے کی خواہش دل میں پالی تھی۔ وہ ایک مرتبہ پھر ویسی ہی خواہش دل میں رکھتی تھی۔ اس کے اصرار پر علی عیسٰی نے قدرے برہم سے لہجے میں کہا۔

''ضروری نہیں، جو چیز باہر سے اتنی خوب صورت ہو، اندر سے بھی ویسے ہی اٹریکٹ کرے۔''

☆☆☆

بواریا کا آسمان آن کی آن میں بادلوں کے گہرے بگولوں سے ڈھک گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا بوندیں اب برسیں کہ تب برسیں۔

مالا کا ننھا سا دل سہم گیا جبکہ عیسٰی کو قطعاً پروا نہیں تھی۔ وہ ایسے موسموں کا عادی تھا۔

''موسم خراب ہو گیا ہے۔ ہم گھر واپس کیسے جائیں گے؟'' اسے من ہائیم واپس جانے کی بے چینی تھی، وہ کم از کم ایک اور رات یہاں گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی اور عیسٰی جو اتنے آرام سے ٹہلیں کر رہا تھا مالا کو پورا گمان ہونے لگا تھا وہ آج کی رات بھی یہیں رہے گا۔

''گھر ہی تو جا رہے ہیں۔'' عیسٰی نے اطمینان سے کہا تھا، وہ ٹراؤزر کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اس کے برابر چل رہا تھا۔ مالا اس کا اطمینان ملاحظہ کر کے خفگی سے بولی۔

''اس گھر کی نہیں، میں تو اپنے گھر کی بات کر رہی ہوں۔'' مالا قدرے جتا کر بول رہی تھی عیسٰی اس کے جتانے پر چونکا۔

''اپنا گھر......!'' اس کے لبوں پر مسکان چمک اٹھی تھی تو گویا وہ عیسٰی کے گھر کو اپنا گھر تسلیم کر چکی تھی۔ اس کے لیے مالا کے یہ الفاظ بہت قیمتی تھے۔

''مگر اب تو موسم خراب ہو چکا ہے۔ ہم صبح ہی نکل سکیں گے۔'' گروسی کے گھر تک پہنچ کر عیسٰی نے بے چارگی سے کہا تھا۔ تبھی آسمان سے ٹپ ٹپ موٹی، موٹی بوندیں گرنے لگی تھیں۔ مالا کا چہرہ پھیکا سا پڑ گیا۔ وہ لوگ آگے پیچھے لاؤنج میں داخل ہوئے تھے۔ اسی اثنا میں گروسی اٹھ کر ان کے قریب آ گئیں۔ وہ بہت پریشان اور متفکر لگ رہی تھیں اور انہوں نے جو بات عیسٰی کو بتائی تھی اسے سن کر وہ ایسا پریشان ہوا کہ لمحے بھر کے لیے بھی یہاں ٹھہرنے والا نہیں تھا پھر اس نے اپنا سیل فون جیب سے نکالا۔ وہ بے احتیاطی کی وجہ سے آف پڑا تھا، اس نے فون آن کر کے کان سے لگایا۔ اب وہ جانے کس سے تیز لہجے میں بات کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کوئی اور نمبر پریس کیا، تقریباً پندرہ منٹ تیز لہجے میں انتہائی غصے سے چنگھاڑتا رہا تھا پھر اس نے فون بند کر دیا۔ اب وہ اپنے کمرے میں جا رہا تھا۔ benz کی چابی اور بریف کیس اٹھا کر جب وہ تیز تیز قدم اٹھاتا نیچے آیا تب سوزن نہ جانے کس کونے سے نکل کر اس کے سامنے آ گئی تھی۔

''کیا میں تم سے کچھ پوچھ سکتی ہوں؟'' وہ قدرے پریشان تھی اور عیسٰی کی پریشانی کو بہت اچھی طرح سمجھ سکتی تھی۔

''نہیں، میں زیادہ دیر نہیں رکوں گا۔'' وہ بغیر رکے گروسی تک آ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر عجلت، پریشانی، تفکر اور جانے کیا، کیا تاثر پھیلے تھے، اس نے گم صم کھڑی مالا کی طرف توجہ تک نہیں دی تھی، شاید پریشانی کی وجہ بہت بڑی تھی۔ اب وہ گروسی سے کچھ بات کر رہا تھا۔ یقیناً اجازت چاہ رہا تھا۔ مالا نے غور کیا تو پتا چلا، وہ اس کا سامان بھی اٹھا کر نیچے لے آیا تھا۔ یعنی وہ دونوں من ہائیم واپس جا رہے تھے۔ مالا کا دل جو کچھ لمحے پہلے سکڑ کر سہم رہا تھا اب قدرے مطمئن ہو چکا تھا مگر گروسی کی عیسٰی کے ساتھ طویل ہوتی بحث کو دیکھ کر پھر سے غیر مطمئن ہونے لگا تھا۔ اب کہ سوزن بھی جانے کون سے دلائل دینے کی غرض سے میدان میں اتر آئی تھی۔ عیسٰی کچھ اور جھنجلا گیا تھا پھر اسی جھنجلاہٹ بھرے لہجے میں اس سے مخاطب ہوا۔

''مالا! مجھے جلدی میں واپس جانا ہو گا، کمپنی کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے کئی ورکرز شدید زخمی ہیں۔ گروسی اور سوزن کی خواہش ہے تم یہیں رک جاؤ، موسم خاصا خطرناک ہے، ان کے خیال میں تمہارا ساتھ جانا اس وقت مناسب نہیں۔ تم فکر مت

کرنا...... میں صبح ہوتے ہی تمہیں لے جاؤں گا۔'' وہ اسے تسلی دے رہا تھا گویا گروسی اور سوزن نے مالا کے حوالے سے اسے قائل کرلیا تھا۔ وہ ان کی بات سمجھ چکا تھا۔ موسم انتہائی خراب اور طوفانی تھا، مالا کا ساتھ جانا کسی طور مناسب نہیں تھا۔ اِدھر مالا کا ننھا سا دل اس خیال سے ہی سہم گیا۔ وہ عیسٰی کے بغیر اس جادونگری میں اکیلی رہے گی۔ وہ خوف زدہ ہوگئی تھی اور عیسٰی اس کے خوف کو سمجھ رہا تھا۔ وہ اس کی زرد ہوتی رنگت دیکھ کر کچھ متفکر ہوگیا...... اس نے سوزن کو دوبارہ مخاطب کیا۔

''تم مالا کے ساتھ سوجانا، اسے اکیلا مت چھوڑنا، خیال رہے، تمہیں مالا کا بہت زیادہ خیال رکھنا ہے۔'' وہ بجائے جرمن کے اردو میں سوزن سے مخاطب تھا۔ مالا حیران رہ گئی، شاید عجلت میں کبھی اردو اور کبھی دوسری زبان میں بول رہا تھا مگر مالا کی حیرانی اس وقت بڑھ گئی تھی جب سوزن نے اردو سمجھتے ہوئے بےساختہ اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

''تم فکر مت کرو، میں مالا کا بہت خیال رکھوں گی۔'' صبح سے لے کر اب تک کچ پچ کرنے والی ابھرے سرخ پھولے گالوں والی اور سیفور سے ڈھکے سر والی اس لڑکی نے پہلی مرتبہ اردو میں بات کرکے مالا کو حیران کردیا تھا۔ وہ اس انکشاف پر دم بخود تھی کہ سوزن نہ صرف اردو سمجھتی ہے بلکہ بول بھی سکتی ہے۔ وہ جو اس خیال سے پیلی پڑتی جارہی تھی کہ کچ پچ بولنے والے لوگوں میں صبح ہونے تک کا وقت کیسے گزارے گی اب قدرے مطمئن ہوگئی تھی اور مالا کے چہرے پر سکون پھیلتا دیکھ کر عیسٰی خود بخود مطمئن ہوگیا تھا۔

بس ایک لمحے کی بات تھی، بس ایک پل کی بات تھی، بس ایک ساعت کی بات تھی، عیسٰی چلا گیا اور وہ اس جادونگری میں رک جانے پر مجبور کردی گئی تھی، اسے لگ رہا تھا گویا اسے یہاں محبوس کردیا گیا ہے، اپنی مرضی اور اپنی خواہش سے حالانکہ رکی تو وہ خود تھی۔ عیسٰی سے اصرار کرتی تو وہ ضرور مان جاتا۔ پھر نہ طوفانی موسم کو دیکھتا نہ آندھی کے جھکڑ کو...... اسے ساتھ ضرور لے جاتا مگر مالا کو زبردستی روکا گیا تھا۔ وہ بھی کیسے...... جیسے کوئی اس کے ذہن میں گھس گیا تھا...... ہاں...... بالکل یہی کیفیت تھی کچھ دیر پہلے اس کی...... وہ آنکھیں اور سر دباتے ہوئے کچھ متوحش سی بیٹھی تھی آخر اس کے ساتھ ہوا کیا تھا......؟ اور کیسے بعد دیگرے اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا؟ کچھ دیر پہلے اس کے ذہن پر بوجھ تھا مگر اب یہ بوجھ غیر محسوس انداز میں خود بخود ہٹ گیا تھا۔ کچھ دیر بعد سوزن اس کے لیے بلیک کافی بنا لائی تھی۔

''بواریا آنا کیسا لگا......؟'' وہ خوش اخلاقی کا عمدہ نمونہ تھی، اسی اخلاق بھری نرم مسکراہٹ کے ساتھ اس نے گفتگو کا آغاز کیا تھا، تب بلیک کافی کے مگ کو پکڑنے کے بعد سابقہ کیفیت سے نکل کر مالا نے سوزن سے پہلا سوال کیا...... وہ اس کی بات کو قطعاً نظر انداز کرچکی تھی۔

''تم نے اردو بولنا کس سے سیکھا......؟'' مالا حقیقتاً حیران تھی، وہ کبھی یقین نہیں کرسکتی تھی مغربی جرمنی کے کسی گمنام چھوٹے سے گاؤں میں رہنے والی کوئی جرمن لڑکی اتنی شستہ اردو بول سکتی ہوگی۔

''مون سے......'' سوزن کے بھرے بھرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ اس کا اوپر والا ہونٹ نچلے ہونٹ سے کچھ زیادہ موٹا تھا اور پھر سرخ غبارے جیسے گال، مجموعی طور پر وہ خوب صورت لڑکی تھی۔ پہلی نظر میں اچھی لگنے والی، وہ قطعاً فیشن ایبل نہیں تھی۔ ہمیشہ سوتی روک میں نظر آتی تھی۔ اس کے بال بھی رومال میں ڈھکے رہتے تھے یقیناً اسے بھی مالا کی طرح سر ننگا کرنے کی عادت نہیں تھی۔ سوزن کے مقابلے میں مون بہت ماڈرن تھی، سر سے لے کر پیروں تک میچنگ کرتی تھی۔

''مجھے حیرت ہے۔'' مالا نے اپنی حیرانی کا مظاہرہ کردیا تھا۔ وہ دل میں آئی بات زیادہ دیر تک چھپا نہیں سکتی تھی۔

''تم حیران اس لیے ہو کہ تمہیں ہمارے بارے میں کچھ پتا نہیں...... دراصل، میں بہت عرصے تک مون کے ساتھ رہی ہوں پھر حسیب انکل اور میری آنٹی دونوں اپنے بچوں کے ساتھ اردو میں بات کرتے تھے سو مجھے بھی اردو بولنے کا شوق پیدا ہوگیا۔ ویسے میں نے اور مون نے اور بھی بے شمار زبانوں پر عبور حاصل کیا ہے۔'' سوزن کا تفصیلی جواب مالا کی تشفی کے لیے کافی تھا...... مگر ایک انگریز لڑکی کو اپنی زبان میں اتنی خوب صورتی کے ساتھ بات کرتے دیکھنا بھی انوکھا تجربہ تھا۔ مالا کو لگا اب عیسٰی کے بغیر وقت شاید جلد کٹ جائے...... وہ دل ہی دل میں عیسٰی کے لیے دعا کررہی تھی تاکہ اس طوفانی بارش میں وہ خیریت کے ساتھ پہنچ جائے۔

''مجھے تم سے بات کرکے بہت اچھا لگا ہے۔'' مالا نے دل سے کہا تھا، وہ حقیقتاً سوزن کی کمپنی کو انجوائے کررہی تھی۔

''اور مجھے بھی۔'' سوزن بھی مسکرائی۔

''تم ہماری شادی میں نہیں آئی تھیں کیا......؟'' مالا نے کچھ سوچتے ہوئے بات آگے بڑھائی، اس نے بلیک کافی کے دو سپ لے کر مگ ٹیبل پر کھسکا دیا تھا۔

''میں آئی تھی، اپنی موتر کے ہمراہ......'' سوزن نے سینٹرل ٹیبل پر رکھی کافی دیکھ کر کہا تھا۔ ''کیا تمہیں کافی پسند نہیں آئی؟'' اس کا اشارہ مگ کی طرف تھا جسے دوبارہ نہ اٹھانے کا مالا نے فیصلہ کرلیا تھا۔ اس کے سوال پر وہ قدرے ہکا بکا رہ گئی تھی۔

''کافی اچھی ہے، پر میں نے کبھی پی نہیں۔'' مالا نے قدرے شرمندگی سے وضاحت کی۔

''کوئی بات نہیں، تم اگر چائے پینا چاہو تو میں بنا کر لاتی ہوں۔'' سوزن نے سابقہ نرمی سے کہا۔

پاکیزہ کے لیے

نہ رنگ آنکھوں کا لال رکھنا
نہ ویراں ویراں سا حال رکھنا
جو چاہتوں میں لکھے تھے ہم نے
وہ لفظ سارے سنبھال رکھنا
چُل بُل کے ادا دکھانا
ادا کے اندر کمال دکھنا
تجھے دلوں کی ملے حکومت
تو شاہوں جیسا جلال رکھنا
میری دعائیں ہیں ساتھ تیرے
بس اپنا بہت خیال رکھنا

☆☆☆

دعا

وقتِ دعا میں اِک دعا کروں
میں رب سے اِک التجا کروں
تُو خوش رہے، تو شاد رہے
تیرے دل کا آنگن آباد رہے
تو ہر پل یونہی ہنسا کرے
تو پھول کے مانند کھلا کرے
تیری زندگی میں کوئی غم نہ ہو
تیری آنکھ کبھی نم نہ ہو
تجھے کسی سے کوئی گلہ نہ ہو
تجھے بن مانگے وہ عطا کرے
تیری معاف ہر اِک خطا کرے

مرسلہ: اُمِ ایمان، ڈیرہ غازی خان

''نہیں، مجھے طلب نہیں۔'' اس نے فوراً انکار کر دیا تھا۔ وہ اپنی وجہ سے کسی کو بھی پریشان نہیں کرتی تھی پھر ایک گھنٹا مزید باتیں کرنے کے بعد سوزن نے اٹھ کر سفید نائیلون کے پردے ہٹا کر ونڈوز کھول دی تھیں۔ باہر طوفان حیرت انگیز طور پر رک چکا تھا اور چمکتی دھوپ مالا کو ورطۂ حیرت میں مبتلا کر رہی تھی...... اس کی حیرانی ملاحظہ کر کے سوزن نے بتایا تھا۔

''یہاں کے طوفان اسی طرح اچانک آتے اور اچانک چلے جاتے ہیں کبھی رات بھر بارش برستی ہے اور کبھی گھنٹا ڈیڑھ بعد دھوپ نکل آتی ہے۔ تم یہاں کے موسموں کی ابھی عادی نہیں ہو، آہستہ، آہستہ ہو جاؤ گی۔'' سوزن نے مسکرا کر اسے باہر آنے کا اشارہ کیا تھا۔ وہ اٹھ کر اس کے پیچھے چلی آئی۔ باہر کا منظر انتہائی دل آویز تھا نکھرا، نکھرا سبزہ اور پھولوں کے خوب صورت دُھلے دُھلائے رنگ...... وہ اسے لیے ٹیرس پر چلی آئی۔ نیلگوں آسمان کی چھایا میں ٹھنڈی ہوا کا لطیف ہونا اچنبھے کا باعث نہیں تھا۔ مالا کا دل گویا ہوا کے ساتھ رقص کرنے لگا۔ بلاشبہ اتنی اونچائی پہ کھڑے ہو کر اس جنت نظیر خطے کا نظارہ کرنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ وہ دونوں ٹیرس پر کھڑی تھیں اور اردگرد کا جائزہ لے رہی تھیں۔ تاحدِ نگاہ اونچے پہاڑوں کا سلسلہ تھا، طویل تر سلسلہ...... شاید آسٹریا... کی سرحد سے جا ملتا ہوا...... اس کی بھٹکتی نگاہ نے سرخ عمارت کو جلد ہی کھوج لیا تھا۔ یہ سرخ عمارت بہت خوب صورت تھی...... تین منزلہ انتہائی عالیشان، ایک گاؤں میں ایسی خوب صورت عمارت کا تصور ہی حیران کن تھا۔

''یہ کس چیز کا انسٹی ٹیوٹ ہے؟'' مالا نے بالآخر مچلتا سوال پوچھ لیا۔ تب سوزن نے اپنی فطری سادگی بھرے لہجے میں اس کو کچھ اور بھی حیران کر دیا تھا۔

''یہاں لینگویج کورسز کروائے جاتے ہیں۔ یہ ایک پرائیویٹ ادارہ ہے، جسے دو سال پہلے موون نے ایک لارڈ سے خریدا تھا۔ اس انسٹی ٹیوٹ کی اونر موون ہے...... پہلے وہی لارڈ اس انسٹی ٹیوٹ کو عمدگی سے چلا رہا تھا پھر وہ بیمار ہو گیا اور شہر چلا گیا بعد میں اسے موون نے خرید لیا۔'' سوزن کے جواب نے مالا کو اگرچہ حیران تو بہت کیا تھا تاہم وہ ان کی شستہ اردو کے علاوہ مختلف زبانوں پر عبور حاصل کرنے کی وجہ بھی سمجھ گئی تھی۔

''کیا تم یہ انسٹی ٹیوٹ دیکھنا چاہو گی؟'' اس کی دلچسپی محسوس کر کے سوزن نے سوال کیا...... مالا نے نفی میں ہلکا سا سر ہلایا۔

''شاید نہیں، دراصل یہ عیسیٰ کی خواہش ہے کہ میں ترکش اطالوی زبان سیکھوں، کیا پتا وہ میرا ایڈمیشن اسی انسٹی ٹیوٹ میں کروا دیں...... یہ علاقہ اور جگہ بہت خوب صورت ہے۔'' نہ جانے کس جھونک میں مالا کے لبوں سے یہ الفاظ پھسل گئے تھے۔ حالانکہ وہ یہاں مستقل رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ شاید اس پُراسرار نگری میں رہ کر سہم سہم کر مر جاتی۔

''ہرگز نہیں، عیسیٰ تمہارا اس انسٹی ٹیوٹ میں ایڈمیشن نہیں کروائے گا۔'' سوزن کے الفاظ اسے بری طرح چونکا گئے تھے۔

''مگر کیوں......؟'' وہ بحث نہیں کرتی تھی مگر کر رہی تھی۔ ایک فطری تجسس امڈ آیا تھا۔ عیسیٰ اسے انسٹی ٹیوٹ کی طرف لے کر بھی تو نہیں گیا تھا۔ سو یہ تجسس خود بخود اس کے من میں امڈ آیا تھا۔

''یہ موون کا انسٹی ٹیوٹ ہے ناں...... اور عیسیٰ کی موون کے ساتھ اَن بن چل رہی ہے۔'' وہ مختصر بول کے لمبی، لمبی سانسیں لینے لگی تھی۔ اس کوشش میں سوزن کے کانوں کی بالیاں جھولنے لگی تھیں۔ مالا کچھ ٹھٹک گئی۔

''کیا ابھی تک ناراضی ہے؟ مگر کیوں......؟'' اس نے آنکھیں میچ کر حیرت سے پوچھا۔ وہ ابھی تک موون اور عیسیٰ کی لڑائی یا ناراضی کی وجہ نہیں جان پائی تھی...... اب اگر خوش قسمتی سے موقع مل گیا تھا اور اردو بولنے والی ایک خوش اخلاق خاتون کی کمپنی بھی میسر تھی سو وہ یہ سنہری موقع کیسے گنوا دیتی؟

''عیسیٰ کی خواہش تھی موون...... بزنس کی فیلڈ میں آئے اور اپنی تعلیم مکمل کرے...... مگر اس نے پڑھائی چھوڑ کر انسٹی ٹیوٹ بنا لیا...... پھر وہ گھر پر نہیں رہتی تھی اور یہاں بھی کم کم آتی ہے...... جب وہ گھر چھوڑ کر آئی تھی۔ پھر ہمارے پاس بھی نہیں رہی بلکہ بیدی نونگ، انسٹی ٹیوٹ میں جانے کون سا ہنر سیکھنے چلی گئی۔ دراصل وہ ایک غیر معمولی ذہن رکھنے والی لڑکی تھی۔ اسے ہجوم پسند نہیں تھا...... اور پڑھائی میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ کچھ غیر معمولی کام سیکھنا چاہتی تھی۔ کچھ ایسا جو اس کے اردگرد رہنے والوں میں سے کسی نے نہ سیکھا ہو...... بس انہی باتوں پر عیسیٰ کا اس سے اختلاف تھا۔'' سوزن نے کب سے اس کے ذہن میں لگی گرہ کو کھول دیا تھا تو اتنی معمولی بات پر وہ باپ اور بھائی سے خفا تھی۔ حالانکہ یہ کوئی بڑی بات تو ہرگز نہیں تھی۔

''عیسیٰ تو اب بھی کہتا ہے، وہ گھر آ جائے مگر وہ مانتی نہیں...... دراصل آنٹی کی وفات نے اسے ذہنی طور پر بہت تنہا کر دیا تھا۔ پھر وہ گروی کے پاس چلی آئی...... انکل اور عیسیٰ مطمئن ہو گئے...... انہیں گروی پر بڑا اعتبار تھا مگر موون یہاں بھی اتنا نہیں رہی...... وہ بیدی نونگ چلی گئی......'' سوزن اسے بتا رہی تھی وہ مزید اب سوزن سے کیا پوچھتی؟ اس نے ذہن کو آگے، پیچھے دوڑانا چاہا...... اس کی سوچوں کے درمیان ہی سوزن نے سلسلۂ کلام دوبارہ جوڑ دیا تھا۔

''اس انسٹی ٹیوٹ کو خریدنے کے لیے سرمایہ تو حسیب انکل نے ہی دیا تھا۔ انہیں اپنے بچوں سے بڑا پیار ہے۔'' یہ بات مالا کو بتاتے ہوئے اس کا لہجہ حسرت کی نمی سے بھر گیا تھا۔ شاید اسے اپنا باپ یاد آ گیا تھا۔ سوزن کی ممی، پاپا میں کب سے علیحدگی ہو چکی تھی۔ شاید وہ اس بات کو بہت محسوس کرتی تھی مالا کو سمجھ نہ آئی، وہ اسے افسردگی کی اس کیفیت سے کیسے نکالے؟ کچھ دیر بعد مالا کو گفتگو کا موضوع بدلنے کے لیے ایک بے ضرر سی بات مل گئی تھی۔

''اور تم کیا کرتی ہو؟'' اس نے ہمدردی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کے پوچھا۔ سوزن اس پل مالا کو اور بھی اچھی لگی تھی۔

''فیر کی فرین......'' وہ اپنے ہی دھیان میں بولتے ہوئے ایک دم ٹھٹکی جیسے کچھ یاد آیا ہو......

''میں سیلز گرل ہوں...... کاؤف ہاؤس میں کام کرتی ہوں۔'' اسے خیال آیا تھا مالا ترکش نہیں سمجھتی تبھی سنبھل کر اردو میں بولی تھی۔

''کیا شہر جاتی ہو؟'' مالا نے مزید پوچھا۔

''نہیں، سڑک کے پار اسٹور ہے کسی کا، اس انسٹی ٹیوٹ کے اسٹوڈنٹس کے لیے...... بھانت بھانت کے لوگ آتے ہیں زبانیں سیکھنے، نہ جانے کس، کس نگر اور وطن سے۔'' سوزن نے سنجیدگی سے بتایا تھا۔ مالا کو یہ جان کے دھچکا سا لگا تھا۔ یعنی عیسیٰ اور موون کی کزن معمولی سی سیلز گرل تھی۔ موون جو انٹرنیشنل لیول کا انسٹی ٹیوٹ چلا رہی تھی اور عیسیٰ جس کا اتنا وسیع بزنس تھا۔ وہ شاکڈ نہ ہوتی تو کیا کرتی......؟

''ویسے میں سال کے دو تین ماہ ایک سنڈیکیٹ کے ساتھ تبلیغ کے لیے بھی جاتی ہوں۔'' وہ بہت مذہبی لڑکی تھی۔ حقیقت میں اسے اپنے مذہب سے بہت لگاؤ تھا۔ سوزن نے اسے بتایا تھا کہ وہ اپنے باپ کی طرح کریستن تو تھی یعنی عیسائیت کی پیروکار...... اور وہ اپنے مذہب سے بہت مطمئن تھی، چرچ اس کے لیے تفریح گاہوں سے زیادہ سکون مہیا کرنے والے تھے۔ مالا کو یاد آیا، سوزن کو اس نے پہلی مرتبہ چرچ میں دیکھا تب وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی، مالا کے

استفسار پہ عیسیٰ نے بے نیازی سے کہا تھا۔

''شاید آخرت کے خوف سے رو رہی ہے۔'' جانے عیسیٰ نے ٹھیک کہا تھا کہ یا محض اندازہ لگایا تھا مگر مالا کو لگا یقیناً وہ آخرت کے خوف سے ہی رو رہی تھی۔ وہ بہت سادہ اور باوقار سی لڑکی تھی۔ ہر قسم کی بناوٹ سے پاک، مالا کا دل خود بخود اس کی طرف کھنچ رہا تھا۔ گروسی کے بعد اس گھر میں سوزن ہی وہ فرد تھی جس کے ساتھ مالا کا اچھا وقت گزر سکتا تھا۔ اسے گروسی کے بعد سوزن بہت اچھی لگی تھی۔

'' تم...... تم بہت اچھی ہو سوزن......! تمہارے وجود سے اپنائیت کی مہک آتی ہے۔'' مالا زیادہ دیر تک اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکی تھی۔ اس نے بے ساختہ سوزن کی تعریف کر دی تھی۔ مالا کے بے ساختہ پن میں چھپی سچائی سوزن کو مسکرانے پر مجبور کر گئی تھی۔ اس نے مسکرا کر سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''جہاں محبت اور اپنائیت ہوتی ہے، وہاں خدا ہوتا ہے اور یاد رکھنا، خدا ہمیشہ یہاں ہوتا ہے۔'' اس نے اپنے دل کے مقام پر ہاتھ رکھا تھا۔ اس کی سچی بات نے مالا کو گویا خرید لیا تھا۔ وہ حق دق کھڑی رہ گئی تھی۔ اسے شاید سوزن سے اتنی گہری بات کی امید نہیں تھی۔

''اور جہاں ایمان اور امید ہوتی ہے، وہاں بہار ہوتی ہے...... اور یاد رکھنا، بہار کو موسموں میں تلاش نہیں کرتے...... اسے رویوں، نیت اور جذبوں میں ڈھونڈتے ہیں۔'' اس نے ٹیرس کے بائیں جانب موجود گرل سے لٹکی گلابی پھولوں والی بیل سے ایک پھول توڑ کر مالا کی طرف بڑھا دیا تھا۔

''گلابی پھولوں کی مالا کے لیے، سوزن کی طرف سے پہلا تحفہ۔'' اس کا انداز بالکل عیسیٰ کی طرح تھا۔ گویا وہ اس انداز میں عیسیٰ کی کاپی کر رہی تھی۔ ہو بہو عیسیٰ کا انداز، اسی کے الفاظ......

حالانکہ یہ بات عیسیٰ نے مالا سے بالکل تنہائی میں کی تھی پھر سوزن کو بھلا کیسے پتا چلا......؟ شاید یہ بھی نائیلون کے سفید جالی والے پردوں اور گھروں کے سامنے پھولوں سے لدی ٹوکریوں والا ایک جیسا کوئی انداز ہو۔

''بہت شکریہ، کیا ہماری دوستی ہو سکتی ہے؟'' مالا نے بہت خوش دلی اور دبے، دبے جوش کے ساتھ کہا تھا۔ مغربی جرمنی میں اس کی پہلی سہیلی...... یہ احساس کتنا انوکھا تھا، اتنا منفرد اور دلنشین...... اجنبیوں کے دیس میں ایک جرمن لڑکی، ایک مغربی لڑکی کا اپنی زبان میں گفتگو کرنا کتنا دلنشین احساس تھا۔

''میرا خیال ہے، ہماری دوستی اب تک ہو چکی ہے۔'' سوزن نے اس کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے دبایا تھا پھر آہستگی سے بھرائی آواز میں بولی۔

''تم میری دوسری سہیلی ہو......'' اس کا لہجہ کتنا نم نم ہو گیا تھا۔ جانے کیوں ایک دم اداس ہو گئی تھی۔ ایک دم افسردہ ہو گئی تھی۔

''اور پہلی کون تھی؟'' مالا نے بے ساختہ پوچھا۔

''مون......'' اس کے بھرے، بھرے ہونٹ... بے آواز ہلے، اس کے چہرے پر ہلکا سا سایہ لہرا گیا تھا۔

''کیا وہ اب تمہاری سہیلی نہیں؟'' مالا نے حیرت سے کہا تھا۔ اس کے سوال پر وہ کچھ دیر کے لیے چپ کر گئی تھی پھر اس کا سر بے ساختہ نفی میں ہلا تھا۔

''نہیں......''

''کیوں......؟'' اس نے پھر حیرت کا اظہار کیا...... وہ بہت سوال نہیں کرتی تھی مگر یہ سوزن کی اپنائیت تھی جو اُن دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لے آئی تھی۔ اسے لگا وہ برسوں سے ایک دوسرے کے ساتھ رہتی آئی ہیں۔

''وہ اب کسی کی بھی سہیلی نہیں...... بہت بدل گئی ہے۔'' سوزن نے افسردگی سے بتایا۔ ''ہماری اب

پہلے جیسی دوستی نہیں رہی۔'' وہ اسے مزید بتا رہی تھی۔ اس کا لہجہ اب بھی بھیگا، بھیگا تھا گویا وہ موں کی دوستی کو بہت مس کر رہی تھی۔

''کیوں......؟'' مالا نے بے چینی سے کہا۔ تصور کے پردے پر کسی کی حسین تر اور عجیب تر آنکھیں عکس بنا گئی تھیں۔ اس کے پورے وجود میں خوف کی لہر دوڑ گئی...... وہ موں کو نہیں سوچنا چاہتی تھی مگر اُسی کو سوچ رہی تھی۔ وہ موں کی بات نہیں کرنا چاہتی تھی مگر اس کی بات کر رہی تھی۔ بعض کوششیں کتنی بیکار ہوتی ہیں۔

''تم نہیں سمجھوگی......'' اس نے گہری سانس کھینچ کر کہا تھا تب اچانک مالا کو خیال آیا۔ حالانکہ یہ بات اسے بہت پہلے پوچھنا چاہیے تھی مگر اب پوچھ رہی تھی، وہ کتنی کم فہم تھی۔

''کل رات موں آئی تھی یہاں......؟'' اس کا دل لمحے بھر کے لیے بہت زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ موں کا ذکر اس کا ہراس بڑھا دیتا تھا۔

''کل رات......؟ نہیں تو...... وہ پچھلے ایک ہفتے سے گھر نہیں آئی۔ انسٹی ٹیوٹ کی ایک تجربے گاہ میں رہتی ہے۔'' سوزن نے فوراً نفی میں سر ہلایا تھا اور اس کا انکار مالا کے چہرے کی رنگت کو پل بھر میں کیا سے کیا بنا گیا تھا۔

''کیا تم ٹھیک کہہ رہی ہو؟'' اس نے بہ مشکل ہکلائے لہجے میں کہا۔ اس کی رنگت سفید سے زرد پڑ رہی تھی۔

''ہاں، مجھے غلط بیانی کرنے کی کیا ضرورت ہے، ویسے موں تم سے ملنے بھی نہیں آئی۔ وہ ایسی ہی موڈی ہے، تم دل پر مت لینا۔'' سوزن نے اسے پچکارتے ہوئے کہا۔ وہ سمجھی، مالا اس کے رویے سے ہرٹ ہوئی ہے، موں کے انداز ہی ہرٹ کرنے والے ہوتے تھے۔ وہ جانتی تھی عیسیٰ اور مالا یہاں آئے ہیں پھر بھی ملنے نہیں آئی تھی۔ اس نے خود رشتوں میں دراڑیں ڈال رکھی تھیں...... وہ ایسی ہی تھی بالکل نہ سمجھ میں آنے والی۔

کچھ دیر بعد سوزن اسے نیچے لے آئی تھی پھر ان دونوں نے مل کر کھانا بنایا، ڈھیروں باتیں کیں، کچھ دیر بعد عیسیٰ کا فون آ گیا تھا۔ اگرچہ وہ بہت مصروف اور پریشان تھا مگر اسے مالا کی بہت فکر تھی۔

''میں کل صبح ہوتے ہی پہنچ جاؤں گا، تم فکر نہ کرنا...... سوزن تمہارا خیال رکھ رہی ہے؟'' عیسیٰ نے عجلت میں کہا تھا، وہ شاید تیز تیز چل رہا تھا۔

''ہاں، سوزن بہت اچھی ہے۔'' مالا اس کی آواز سن کر اداس ہو گئی تھی۔ وہ اس سے کتنے فاصلے پر چلا گیا تھا۔

''میں تمہارے لیے موبائل بھی لیتا آؤں گا۔ مجھ سے کتنی بھول ہو گئی۔ اتنی اہم چیز تمہیں لے کر نہیں دی۔'' وہ کسی اور سے کچھ بات کر کے دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ مالا کی بات سنے بغیر وہ بس اپنی کہے جا رہا تھا۔

''ابھی میں مصروف ہوں، تم سے رابطے میں رہوں گا۔ سونے سے پہلے کال کروں گا۔'' اب وہ خدا حافظ کر کے فون بند کر رہا تھا۔ مالا کے دل پر غبار چھا رہا تھا۔ وہ پہلے خود دور گیا تھا، اب اس کی آواز بھی دور ہو رہی تھی...... مگر دوری سے کیا فرق پڑتا تھا۔ وہ اس کے دل میں ہمیشہ کے لیے موجود تھا...... یہ احساس زندہ رہنے اور یہ وقت گزارنے کے لیے کیا کم تھا۔ وہ عیسیٰ کو سوچتے ہوئے سفید نائیلون کے جالی دار پردے کو ہٹا کر کھڑکی میں جھانکنے لگی تھی۔ باہر کے منظر ہی ایسے تھے جی چاہتا تھا کہ عمر بھر کے لیے دیکھتے ہی رہیں۔

گروسی کے گھر کی دوسری طرف ایک صلیبی مجسمہ ٹنگا تھا۔ کمزور، ناتواں سا مسیح، کیلوں سے جڑا ہوا، ایک طرف کو سر گرا ہوا جیسے ڈھلکی ہوئی گردن، کیلوں کی جگہ پر ہاتھوں اور پاؤں سے لال خون رِس رِس کر ٹپکتا ہوا...... مالا کو اس منظر سے خوف نہیں آیا

تھا۔ جس قدر ایک اپنے ہی جیسی عورت سے آیا تھا۔

اس نے دیکھا اور محسوس کیا تھا، بواریا کے لوگ بہت سادہ مزاج، باوقار، ہنس مکھ اور محنتی تھے۔

''اب تم آرام کرو، ورنہ عیسیٰ میری جان کو آجائے گا۔ اللہ، اللہ کر کے تو اس کا موڈ کچھ بہتر ہوا ہے، ورنہ میرے ساتھ تو بولتا ہی نہیں تھا۔'' سوزن کے اگلے الفاظ نے مالا کو سخت بے چین کر دیا تھا۔ وہ اس سے مزید کچھ پوچھنا چاہتی تھی بلکہ سوزن کے ساتھ باتیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ تھکاوٹ محسوس کرنے کے باوجود نیند کو اپنی آنکھوں میں اترتا نہیں پا رہی تھی۔ اس کی خواہش تھی سوزن کچھ دیر تک یہیں بیٹھی رہے...... لیکن دن بھر کی مصروفیت نے سوزن کو بھی تھکا دیا تھا۔ وہ بھی یقیناً آرام کرنا چاہتی تھی۔

''میں اپنے لیے کافی اور تمہارے لیے دودھ لاتی ہوں پھر تم سو جانا، آج میں تمہارے ساتھ ہی سوؤں گی۔'' سوزن نے نرمی سے کہا تھا جبکہ مالا کی تو گویا من کی مراد بر آئی تھی۔ وہ اکیلے سونے کے تصور سے ہراساں تھی اور اپنے خوف کو سوزن کے ساتھ شیئر بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

سوزن کے چلے جانے کے بعد وہ اس کے انتظار میں کھڑی رہی۔ وہ مون کے بارے میں سوچ رہی تھی تو گویا مون کل رات گھر والوں سے چھپ کر یہاں آئی تھی۔ کسی کو مون کے آنے کی خبر نہیں ہو سکی تھی۔ وہ یہاں کیوں آئی تھی؟ محض اسے خوفزدہ کرنے، دھمکانے؟ یا یہ باور کروانے کہ اس کے بھائی کی زندگی میں سے مالا کو نکالنا اس کے لیے کچھ مشکل نہیں تھا۔

کافی دیر ایسی ہی تکلیف دہ سوچوں میں گھرے رہنے کے بعد وہ اٹھ کر نیچے چلی آئی تھی۔ اکیلے رہنے سے گھبراہٹ محسوس ہونے لگی تھی پھر تکلیف دہ سوچوں سے بچنے کے لیے واحد حل یہی تھا کہ وہ سوزن کے قریب رہتی۔

وہ جونہی سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی تو سوزن کی تیز آواز سن کر ٹھٹک گئی۔ وہ کچن میں تھی اور نہ جانے کس سے تیز لہجے میں بات کر رہی تھی۔ وہ اسی جرمن زبان میں بات کر رہی تھی۔ مالا بھلا کیسے سمجھتی...... مگر دیکھ تو سکتی تھی ناں...... وہ نرم قدموں سے چلتے ہوئے کیوخ کے دروازے تک آئی تھی۔ پھر اندر کا منظر دیکھ کر اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔

سیاہ ریشمی پھولا پھولا سلک کا پیروں کو نہیں بلکہ زمین کو چھوتا فراک پہنے، وہی سرخ انتہائی لمبے سلکی بالوں کی پونی کیے مون ہی کھڑی تھی۔ اس کی طرف اس کی پشت تھی تبھی لمبے ریشمی سیدھے بال اس کی نگاہ میں آ گئے تھے۔ اونچی پونی میں جڑے چمکتے نگینے اور اونچا سا یاقوت اور ہیرے سے سجا کراؤن، مالا کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔

وہ دونوں کسی بات پر جھگڑ رہی تھیں...... گویا مون، سوزن سے کچھ منوانا چاہ رہی تھی یا پھر دھمکا رہی تھی۔ سوزن کی آواز تیز تھی جبکہ مون کا لہجہ پہلے جیسا دھیما، نرم اور پُراسرار قسم کا تھا۔ ادھر سوزن سر کو دائیں بائیں ہلا کر بس ایک ہی بات کیے جا رہی تھی۔

''این فاخ، این فاخ......''

☆☆☆

''این فاخ......'' اس کے ذہن میں کلک سا ہوا تھا...... اسے آج ناشتے کی ٹیبل کا منظر یاد آیا۔ سوزن نے آج صبح بھی اس کے لیے یہی الفاظ بولے تھے پھر وہ ہاؤس فراؤ جس نے انہیں قہوہ پلایا تھا۔ وہ بھی تو مالا کے لیے یہی کہہ رہی تھی۔ تو گویا سوزن اور مون کے درمیان جو بھی بات ہو رہی تھی مالا کے متعلق تھی۔ ان کی باتیں سننے کا فائدہ کوئی نہیں تھا۔ مالا کون سا ان کی گفتگو سمجھ سکتی تھی۔ وہ الٹے قدموں واپس آ گئی تھی مگر اس کا دل بہت تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ وہ گیلری میں سے گزری تو اچانک ایک کمرے سے گروسی کی بوڑھی سی آواز سنائی دی۔

وہ کھلے دروازے سے اسے دیکھ کر اشارے سے بلانے کے ساتھ کچھ کہہ بھی رہی تھیں۔

''آنروف، آنروف۔'' انہوں نے مالا کو ہی شاید بلایا تھا وہ تیزی سے گروسی کے کمرے میں آئی تب انہوں نے اشارے سے مالا کو بتایا۔

''آنروف۔'' وہ کارڈلیس کی طرف اشارہ کر رہی تھیں گویا ''آنروف'' کا مطلب ٹیلی فون تھا۔ مالا نے کارڈلیس اٹھایا تو عیسیٰ کی مسکراتی آواز سنائی دی...... وہ جو ذہن میں ''آنروف'' کو دُہرا رہی تھی علی عیسیٰ کی آواز سن کر اندر تک مہک اٹھی۔

''تم ابھی تک نہیں سوئیں؟'' علی عیسیٰ کا پہلا سوال یہی تھا۔ مالا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

''سونے لگی تھی۔'' اس نے متوقع ڈانٹ کے خیال سے پیش بندی کے طور پر کہا تھا...... تب علی عیسیٰ گویا چیخ پڑا۔

''میرے فون کا انتظار کیے بغیر......؟'' اسے شاید دھچکا لگا تھا تبھی بلند آواز میں کراہا۔ مالا اس کی ایکٹنگ پر ایک مرتبہ پھر مسکرا دی تھی۔ اس نے ارادہ کیا، وہ اسے چڑائے گی مگر پھر اپنے ارادے کو بدل گئی۔ وہ علی عیسیٰ کو مذاق، مذاق میں بھی پریشان کرنا نہیں چاہتی تھی۔

''کیا یہ ممکن تھا، میں آپ کا فون سنے بغیر سو جاتی؟'' اس کے میٹھے سے اظہار نے من ہائیم کے علی عیسیٰ کا پورا من سرشار کر دیا تھا۔

''آں...... ہاں، یہ ممکن نہیں تھا۔'' وہ بھی مسکرایا۔ پھر اس کے دن بھر کی روٹین پوچھنے کے بعد بولا۔

''تم ابھی کیا کر رہی تھیں؟''

''میں نیچے تھی، ابھی مون آئی ہے ناں......''

اس نے جان بوجھ کر مون کا ذکر کیا تھا اور مون کا نام سنتے ہی علی عیسیٰ چونک گیا۔

''مون آئی ہے، صلح ہو گئی اس کی سوزن کے ساتھ؟'' وہ حد درجہ حیران تھا۔

''یہ تو مجھے نہیں پتا......'' اس نے برجستہ کہا تو گویا مون اور سوزن کی چپقلش بھی کوئی معمولی ہرگز نہیں تھی۔

''کمال ہے، مجھے تو سوزن نے بتایا ہے ان دونوں کی بات چیت بند ہے۔ یہ سوزی کس قدر جھوٹی ہے، چالباز اور مکار......'' علی عیسیٰ کی... بڑبڑاہٹ نے مالا کو سرتاپا کپکپا کر رکھ دیا تھا۔ وہ بہت کڑوے لہجے میں سوزن کے لیے بات کر رہا تھا۔ مالا کو اس کی بات بری لگی تھی۔ اپنی نئی، نئی سہیلی کے لیے ایسے القابات سننا اس سے برداشت نہیں ہوا تھا۔ پھر سوزن جیسی لڑکی حلیم، نرم اور مہربان...... وہ کب چالباز یا مکار تھی؟

''سوزن ایسی نہیں......'' مالا نے فوراً وکیلِ صفائی بننے کی کوشش میں علی عیسیٰ کو ذرا خفا کر دیا تھا۔

''سوزی کیسی ہے؟ یہ مجھے پتا ہے تمہیں نہیں...... میں نے خواہ مخواہ اس سے صلح کر لی...... بات چیت بند ہی رہتی تو بہتر تھا۔'' وہ خفگی سے بول رہا تھا۔

''چالاک لڑکی، اس نے تمہاری تعریف کی تو مجھے اچھی لگی سو میں نے اس سے صلح کر لی...... اندر سے تو وہ تم سے جیلس ہی ہو گی۔'' عیسیٰ اپنے دھیان میں بولتا ہوا ایک دم چونک گیا تھا۔ گویا بات کر کے اسے احساس ہوا کہ جانے جذباتیت میں کیا، کیا بول گیا ہے۔

''وہ مجھ سے جیلس کیوں ہو گی؟'' وہی فطری سا تجسس عود آیا تھا۔ مالا نے کارڈلیس زور سے پکڑ کر گروسی کو دیکھا...... وہ اس کی گفتگو سے انجان تکیے پر سر رکھے بیڈ پر نیم دراز تھیں۔ مالا بے فکری سے بولتی رہی۔ جس طرح وہ ان کی کچ بچ سے انجان تھی۔ اسی طرح گروسی بھی تو اس کی اردو سے ناواقف تھیں۔ اس نے تو کل سے لے کر آج رات تک گروسی کو اردو بولتے نہیں دیکھا تھا۔ سو وہ قدرے مطمئن ہو چکی تھی۔

"آں...... ہاں، چھوڑو اس بات کو، یہ بتاؤ، میرے بغیر دل لگ گیا؟" عیسیٰ نے اس کی توقع کے عین مطابق موضوع بدلنے کی کوشش کی تھی۔ مالا جانتی تھی اب وہ ایسے ہی کرے گا۔ وہ عیسیٰ کو زیادہ نہیں مگر کچھ، کچھ جان ضرور گئی تھی۔

"آپ کے بغیر دل کا کیا حال ہے، یہ مت پوچھیں...... حکایتِ دل سن کر آپ کا دل من ہائیم میں ہرگز نہیں لگے گا۔ سو اس کتابچے کو مت کھولیے، جو پوچھا ہے، فٹافٹ بتائیں۔ شاباش، اچھے لڑکے جلدی بولو۔" مالا کے روانی سے بولنے اور برجستہ گفتگو کا انداز ملاحظہ کر کے عیسیٰ شاکڈ رہ گیا تھا۔

"ایں...... یہ تم ہو مالا......! چند گھنٹوں میں آخر کیا ہوا، جو تمہاری زبان کے زنگ اتر گئے۔" وہ حیران در حیران تھا اور مالا کو اس کی حیرانی ملاحظہ کر کے ہنسی آ رہی تھی۔ وہ عیسیٰ کو تصور کی آنکھ سے بخوبی حیران ہوتا دیکھ سکتی تھی۔

"بواریا کے حسن کا رنگ چڑھ گیا ہے۔" مالا نے مسکرا کر بڑے دل آویز انداز میں کہا تھا۔

"اللہ...... میرے اللہ اگر بواریا کے حسن میں گم ہو گئیں تو میرا کیا بنے گا؟" عیسیٰ کی آہ نے مالا کو کھلکھلانے پر مجبور کر دیا تھا۔ تاہم وہ اسے موضوع سے ہٹنے نہیں دینا چاہتی تھی۔

"آپ نے بتایا نہیں، سوزی مجھ سے جیلس کیوں ہے؟" اس نے گروی کی طرف دیکھ کر اپنی بات دوبارہ دُہرائی تھی۔ گروی منہ پر سیفو رکھے شاید سو گئی تھیں۔ مالا ان کا چہرہ دیکھ نہیں سکتی تھی مگر اسے لگ رہا تھا کہ گروی سوئی نہیں جاگ رہی ہیں۔

"یہ بتاؤ، تم اس وقت کہاں ہو......؟" عیسیٰ نے کچھ چونک کر خیال آنے پر پوچھا تھا۔ مالا نے شانِ بے نیازی سے کارڈلیس کو دائیں سے بائیں کان تک منتقل کیا اور مزے سے بولی۔

"گروی کے روم میں، کارڈلیس اِدھر ہی تو رکھا تھا۔" اس نے قدرے وضاحت بھرے لہجے میں کہا تھا جبکہ دوسری طرف عیسیٰ گویا چیخ پڑا۔

"تم گروی کے پاس ہو؟"

"جی......" وہ کچھ گھبرائی۔ عیسیٰ کی چیخ ہی ایسی تھی۔

"اوہ میرے اللہ......" عیسیٰ پھر سے چیخا تھا۔

"کیا ہوا ہے......؟" مالا اور بھی گھبرائی۔

"تم گروی کے کمرے میں ہو، وہ ہماری بلکہ تمہاری باتیں سن رہی ہوں گی۔" عیسیٰ نے اپنے چیخنے کی وجہ بتائی تھی تب مالا نے حیرت سے کہا۔

"پر وہ میری بات کہاں سمجھ سکتی ہیں؟" اس کو پھر سے ہکلانا پڑا۔

"سبحان اللہ...... گروی نانی ہیں میری، مما کی مما...... ایک عرصے سے ہم ان کے ساتھ ہیں، ایک دوسرے کو سمجھتے، بولتے، کہتے، سنتے، سیکھتے دیکھتے رہے ہیں۔ وہ اردو اگرچہ بول نہیں سکتیں مگر سمجھ خوب لیتی ہیں۔" عیسیٰ نے مرے مرے لہجے میں وضاحت کی تھی۔ اب کہ چیخنے کی باری مالا کی تھی مگر وہ چیخ کر گروی کو ڈسٹرب بھلا کیا کرتی؟ اس نے بھی مرے مرے انداز میں کارڈلیس رکھ کر کمرے سے کھسک جانا ہی مناسب سمجھا تھا۔ اسے اپنی گفتگو میں سب سے قابلِ اعتراض ایک ہی جملہ لگا تھا سوزی مجھ سے جیلس کیوں ہے، اب ان الفاظ کی واپسی ممکن نہیں تھی۔ وہ سخت شرمندہ تھی اور دعا کر رہی تھی کہ گروی سچ مچ سو چکی ہوں۔ اس نے احتیاطاً ان کا انگوٹھا ہلا کر دیکھا پھر گویا مطمئن ہو کر باہر نکل آئی تھی۔ گروی سچ مچ سو چکی تھیں۔

مالا کے سہمے ہوئے دل میں کیا تھا جو علی عیسیٰ نہیں جان پا رہا تھا...... مون حسیب آخر معصوم مالا سے کیا چاہتی تھی؟ یہ سب ضرور جانیے مگر اگلے ماہ



ناولٹ

ترکِ وفا

نایاب جیلانی

چوتھا حصہ

ڈبل روم میں پہنچ کر وہ ایک مرتبہ پھر حیران ہوئی تھی۔ سوزی بیڈ کے ایک کونے میں سکڑی سمٹی سو رہی تھی۔ سائڈ ٹیبل پر دودھ کا گلاس رکھا تھا، یقیناً دودھ مالا کے لیے رکھا تھا۔ تاہم اس کا دودھ پینے کو ہرگز دل نہیں چاہ رہا تھا۔

"گویا مون چلی گئی!" اس کا دل مطمئن ہو گیا تھا۔ اس نے آرام سے بیڈ پر لیٹ کر آنکھیں موند لی تھیں۔ اب وہ پُرسکون ہو کر سوزن اور مون کے

بارے میں سوچ سکتی تھی۔ ان کے رویے، جھگڑے اور سوزن کے آخری الفاظ......این فاخ......؟ تو جب سوزن، گروسی وغیرہ اس کی پیاری اردو کو سمجھ اور بول سکتی تھیں تو پھر مالا کیوں نہیں زبان سیکھ سکتی؟ اس نے ارادہ کرلیا تھا.... من ہائیم پہنچ کر جرمن سیکھنے کا......ان لوگوں کے رویے سمجھنے کے لیے ہم زبان ہونا بہت ضروری تھا۔

”بھلا مون نے سوزن سے کیا کہا؟ یہ جھگڑا کیوں کررہی تھیں؟ پھر سوزن نے کیا کہا......؟“ وہ یہی باتیں سوچتی نیند کی گہری وادی میں اتر گئی تھی۔ نیند بھی قدرت کا حسین تحفہ ہے، ایک تھکا دینے والے دن کے بعد رات کا پہلا انعام، نیند جو ذہن کو سکون دیتی ہے، آرام پہنچاتی ہے، اعصاب کی تھکن نچوڑ لیتی ہے۔ مالا پُرسکون نیند میں گم ہوچکی تھی۔ وہ گزشتہ رات سو نہیں پائی تھی مگر آج رات بہت مطمئن اور پُرسکون نیند لے رہی تھی۔ وہ پوری رات اطمینان سے سوئی رہی...... جب اس کی نیند پوری ہوئی تب فجر کے قریب اس کی آنکھ کھل گئی۔

وہ بستر سے اٹھی تو سوزن اسے اپنے برابر کہیں بھی دکھائی نہیں دی تھی۔ مالا واش روم کی طرف بڑھ گئی۔ وضو کیا، نماز پڑھی، اگرچہ جائے نماز کہیں نہیں تھی مگر مالا نے قالین پر ہی نماز ادا کرلی ... وہ سلام پھیر کر دعا مانگنا چاہتی تھی مگر بائیں طرف کاؤچ پر مون بیٹھی تھی اس کی ہلکی سی چیخ ابھری مون وہی سلک کی پھولی فراک پہنے، سفید انگلیوں کو گھماتی ہوئی وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی بلکہ ونڈو کے جالی دار نائیلون کے پردے کو دیکھ رہی تھی۔ وہ کب اندر آئی تھی؟ اور کتنے آرام سے اندر آئی تھی۔ مالا کو ذرا سی آہٹ نے بھی نہیں چونکایا تھا۔ یقیناً مون بہت دبیز چپل پہنی تھی۔ انتہائی نرم، چلنے کی آواز تک نہیں آئی تھی۔ وہ بلی کی چال چلنے والی لڑکی مالا کو آخر ہراساں کیوں کرنا چاہتی تھی۔ دبے پاؤں کمرے میں آنے کا مقصد آخر بھلا کیا تھا... یقیناً مالا کو خوفزدہ کرنا تھا۔

عام حالات میں بھی جب بندہ کمرے میں اکیلا ہو اور کسی کی بھی موجودگی کا گمان نہ ہو تو اچانک کوئی دبے قدموں اندر آجائے ایسی صورت میں پہلا احساس بھیانک خوف کا ہوتا ہے تو یقیناً مون اسے خوف زدہ کرنا چاہتی تھی۔ مالا کو یہ خبر نہیں تھی وہ اس کی زندگی میں بھیانک خوف بن کر ہی داخل ہوئی تھی۔

”یہ کس وقت کی نماز پڑھ رہی ہو؟“ اس کی چیخ کا نوٹس لیے بغیر وہ بڑے آرام سے پوچھ رہی تھی۔ آج اس کا لہجہ اتنا کھردرا نہیں تھا۔ مالا جو چیخنے کے بعد قدرے گم صم اٹھ کھڑی ہوئی تھی بے دم ہوکر اسے دیکھے چلی گئی۔

”تم نے بتایا نہیں۔“ وہی سرد قسم کا پُراسرار لہجہ۔ وہ اب بھی اسے دیکھے بغیر نائیلون کے پردے کو دیکھ رہی تھی۔ آج مالا نے اسے بہت غور سے دیکھنے کی کوشش آخر کر ہی لی تھی۔ یہ چہرہ آج اس کے بہت قریب تھا اور حیرت انگیز طور پر مون کے نقوش عیسیٰ سے خاصے ملتے جلتے تھے۔ یوں لگتا تھا اللہ پاک نے مون کا چہرہ اور اس کے ایک، ایک نقش کو کسی خاص قسم کے سانچے میں رکھ کے بنایا ہے۔ نفیس اور انتہائی خوب صورت خدوخال، گلِ جام جیسا چہرہ، چنبیلی جیسی رنگت، مکھن جیسی چہرے پہ پھیلی چکناہٹ وہ کنول تھی؟ گل بکاؤلی تھی؟ گوہر تاب تھی؟ یا گلگوں تھی؟ اس کے موتی جیسے چمکیلے ہاتھ، سنہری مائل سرخ بال، چیری میں دُھلے ہونٹ قدرے بھرے بھرے اور خم دار، وہ سفید پھولوں کے باغات کا سب سے حسین، شگفتہ، تر و تازہ اور مغرور ترین پھول تھی۔ وہ عیسیٰ جیسی تھی مگر عیسیٰ سے انتہائی مختلف۔ بھلا اتنے حسین چہرے کو دیکھ کر کوئی خوف زدہ ہوسکتا ہے؟ کبھی حسن بھی خوف میں مبتلا کرتا ہے مگر مالا کے ساتھ یہاں آکر بڑے انوکھے واقعات پیش آرہے تھے۔ وہ اتنے حسین اور ملیح چہرے سے خوف زدہ ہوگئی تھی۔

لوگ بدصورتی سے ڈرتے ہیں۔ جلے چہرے، بیماری سے مسخ شدہ چہرے، بدصورت چہرے، بھیانک چہرے سے خوف کھاتے ہیں اور مالا ذوالفقار کتنی عجیب لڑکی تھی وہ ایک حسین چہرے سے خوف زدہ ہوگئی تھی۔ وہ مون حسیب سے ڈر گئی تھی۔ اس کے دل میں ہی نہیں اس کی آنکھوں میں بھی خوف منجمد ہوگیا۔ وہ اس کے چہرے پر سے نگاہ ہٹا ہی نہیں پائی تھی۔

علی عیسیٰ کے نقوش دیکھ کر اس سے محبت کرنے کو دل کرتا تھا اور مون کے چہرے کو دیکھ کر خوف آتا تھا، آخر ایسا کیوں تھا؟ اسے کسی مجسمے کی طرح ساکت دیکھ کر مون نے پھر سے بِنا اس کی طرف دیکھے عجیب انداز میں کہا۔ وہ اسے دیکھ نہیں رہی تھی پھر بھی اس کے تاثرات ازبر کررہی تھی۔

”مجھے حفظ کرلیا ہے تو میری بات کا جواب دو۔“ مون نے سابقہ سرد کاٹ دار لہجے میں اپنی بات دُہرائی تھی۔ مالا کا پورا وجود کپکپا گیا تھا۔ اس نے ہکلاتے لہجے میں کہا۔

”فجر...... فجر کی نماز۔“ اس کی ہکلاہٹ نے مون کو کچھ اور سرد کردیا تھا حالانکہ مالا اپنا خوف اس پر ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی مگر اس لڑکی میں مقناطیس کی سی کوئی کشش تھی۔ مالا اس کے سامنے اعتماد سے کھڑی نہیں ہوسکتی تھی۔ اس نے خود کو مون کے سامنے بے بس پایا تھا۔ یہ بے بسی کیوں تھی، وہ اتنی خوف زدہ کیوں تھی؟

”فجر کی نماز؟“ مون زیرِ لب بڑبڑائی۔ ”مگر یہ فجر کی نماز کا وقت نہیں۔“ تو گویا مون نماز کے تمام اوقاتِ کار سے واقف تھی مگر یہ فجر کا وقت کیوں نہیں تھا؟ مالا نے گھڑی کی طرف دیکھا پھر اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ ابھی رات کا ڈیڑھ بجا تھا تو پھر رات کے ڈیڑھ بجے سوزن کہاں گئی تھی؟ مالا تو سوزن کی غیر موجودگی کو محسوس کرکے وضو کرنے گئی تھی۔ اس نے وقت دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔ سوزن کے اٹھنے کا مطلب یہ تھا شاید صبح ہوگئی۔ وہ بہت سویرے اٹھتی تھی۔ صبح صادق کے وقت...... مالا اسی وجہ سے بِنا وقت دیکھے واش روم کی طرف بڑھ گئی تھی اور اب اس وقت مون بتا رہی تھی کہ فجر کا وقت ابھی دور ہے۔

”سس... سوزن کہاں ہے؟“ مالا نے اپنی تر پیشانی کو بغیر چھوئے ہکلائے سے لہجے میں کہا تھا۔ سوزن کی موجودگی میں اس کے دل کو کتنی ڈھارس تھی تبھی وہ سب کچھ بھلائے گہری نیند سوگئی تھی اور سوزن کی غیر موجودگی نے کیا ستم ڈھایا تھا، وہ صاف محسوس کرسکتی تھی۔

”شاید باہر گئی ہے۔“ اسے امید نہیں تھی کہ مون جواب دے گی مگر اس نے جواب دے دیا تھا اور اب وہ نائیلون کے پردے سے نگاہ ہٹا کر سامنے دیوار کو دیکھ رہی تھی۔ مالا نے پہلی مرتبہ اس کی آنکھوں کو دیکھا تھا۔ جانے اس کی آنکھوں کا رنگ کیا تھا؟ سبز، سرمئی، ہیزل، گھبراہرا مالا کو سمجھ ہی نہ آئی مگر جوں ہی مون نے نگاہوں کا زاویہ بدل کر اپنی ساحرانہ آنکھیں اس کے وہی، معصوم، کٹھے کے مانند سفید چہرے پر گاڑیں تب لمحے بھر کے لیے مالا کو لگا وہ منجمد ہوگئی ہے۔ وہ مون کی آنکھوں کی تیز لپک سے ساکت ہوگئی تھی۔ دو عجیب تر آنکھیں لمحے کے ہزارویں حصے میں مالا کے دماغ میں گھس گئی تھیں۔

”تم عیسیٰ سے محبت کرتی ہو؟“ لپکتا ہوا سوال آیا تھا مالا کا سر اثبات میں ہل گیا۔ وہ بے بس کسی مکڑی کے مانند تھی۔ جسے عجیب ترین آنکھوں والی اس لڑکی نے جالے تان کر قید کرلیا تھا۔ اب وہ ان جالوں کو پھاند نہیں سکتی تھی۔ ان جالوں کو ہٹا کر بھاگ نہیں سکتی تھی۔

”تم محبت کرتی ہو تو کیا ہوا؟ سوزی بھی تو عیسیٰ سے محبت کرتی ہے۔ کیا سوزی کو عیسیٰ مل گیا، نہیں ناں؟ تو پھر تمہیں کیسے مل سکتا ہے؟“ سامنے کھڑی ساحرہ

اپنا جادو پھونک رہی تھی اور مالا کسی بت کے مانند ... بے جان ہو رہی تھی۔ مکڑی کا جیسے بے جان بت، وہ مون کے انکشاف پر قطعاً دم بخود نہیں ہوئی تھی گویا مون اس سے معمول کی گفتگو کر رہی تھی۔

''سوزی کو تو ایثار کرنے کی بیماری ہے... پر مجھے ایسی کوئی بیماری نہیں۔ ایثار کرنے کی تمہیں بھی بیماری نہیں ہونی چاہیے۔'' وہ گویا اسے باور کروا رہی تھی۔ مالا کے ہونٹوں پر تالا لگ گیا تھا۔ اس کی زبان تالو سے چپک گئی تھی۔ اس کی پتلیاں ساکت نہیں تھیں مگر وہ یہ ضرور سوچنا چاہتی تھی کہ جھکی آنکھوں والی یہ ساحرہ پلکیں کیوں نہیں جھپکا رہی۔ وہ اس کے چہرے پر نگاہ گاڑ کر کیوں کھڑی ہے؟ وہ کمرے کی کسی اور چیز کو کیوں نہیں دیکھتی؟ وہ لیمپ کو دیکھ لے، فانوس دیکھ لے، وہ نائیلون کے پردے کو دیکھ لے، کرسٹل کی گڑیا دیکھ لے، دیوار میں نصب شرائیک کو دیکھ لے مگر کم از کم مالا... کو نہ دیکھے مگر مون تو بنا پلکیں جھپکائے مالا کو یک ٹک دیکھ رہی تھی۔

''میں کسی سے محبت نہیں کرتی، تمہیں بھی کسی سے محبت نہیں کرنی چاہیے۔ آخر محبت میں رکھا کیا ہے؟ جلن، کڑھن؟'' اس کے چیری جیسے ہونٹوں پر انتہائی برفیلی تہ جم رہی تھی۔ شاید اس کے لفظ برف جیسے تھے یا اس کے تاثرات برف جیسے تھے۔ مالا کچھ سمجھ نہ پائی۔

''یہ فور ہانگ دیکھ رہی ہو؟'' اس نے نائیلون کے جالی دار پردے کی طرف اشارہ کیا۔ ''دیکھو، اس میں کتنے چھید ہیں، کتنے سوراخ ہیں بظاہر ڈیزائن والے خوشنما مگر چھید تو چھید ہوتا ہے خوشنما ہو یا بدنما...... میں ایسا ہی چھید چاہتی ہوں...... ایسا نہیں بلکہ اس سے بڑا چھید جو تمہیں علی عیسیٰ سے دور کردے۔ مجھے سوزی کا علی عیسیٰ اُسے واپس لوٹانا ہے۔ یہ میرا اس سے وعدہ ہے۔ میں اپنا کام ادھورا نہیں چھوڑتی۔ مجھے ادھورے کام پسند نہیں...... جس کام کو چھولوں پایۂ تکمیل تک پہنچا کر ہی سانس لیتی ہوں۔ میں وہ لوہا ہوں جس سونے کو چھولوں اسے لوہا کردیتی ہوں۔ میں وہ آگ ہوں جس آگ کو چھولوں اسے برزخ بنا دیتی ہوں اور میں وہ مٹی ہوں جس ہیرے کو چھولوں اسے زہر بنا دیتی ہوں۔'' وہ مون تھی اور کیا آگ برسا رہی تھی۔ وہ اس کے ذہن کو بواریا کی غلام گردشوں میں چکر لگوا رہی تھی۔ وہ اسے خوف و ہراس کے جنگل میں بھٹکا رہی تھی۔

''یہ میرا لانٹ (ملک) ہے، یہاں تمہاری اجارہ داری نہیں ہو سکتی۔'' وہ دھیمی آواز میں پھنکار رہی تھی۔

''لوگ تمہیں سلیوٹ کرتے اور مبارک باد بولتے ہیں۔ تم علی عیسیٰ کو پا کر زمانہ پائے بیٹھی ہو اور وہ جو چرچ کی دیواروں سے سر ٹکرائے دیوانی پھرتی ہے، اس کی محبت کرخ کے قدیم دیواروں میں سر پٹخنے کے لیے ہے؟ وہ خدا سے عیسیٰ کو مانگتی ہے اور عیسیٰ اس کو نہیں ملتا، عیسیٰ اس کو کیوں نہیں ملتا؟ اس لیے کہ بیچ میں میرے خود غرض باپ نے تمہیں لا کھڑا کیا ہے۔ یہ کیسا اندھیر ہے، یہ کیسا ظلم ہے۔'' مون کی دھیمی آواز کسی تلوار سے مشابہ تھی۔ وہ دھیرے دھیرے اس کے دل کو کاٹ، کاٹ کر قیمہ کر رہی تھی۔ وہ مالا کے وجود کو پیروں تلے روند رہی تھی۔

''کرخ کے مناروں کا نوک دار کلس سوزی کی محبت کا گواہ ہے۔ کیسی پاک محبت کی تھی اس نے علی عیسیٰ سے اور میرا بھائی کتنا خود غرض اور ذلیل نکلا پاکستان سے گند اٹھا لایا...... آخ تھو۔'' اس نے کارپٹ پہ تھوکا نہیں تھا مگر مالا کو لگا اس کے منہ سے نکلنے والی آوازیں اور تیزابی چھینٹیں اس کے منہ پر آپڑی ہیں۔

''میں تمہیں علی عیسیٰ کی زندگی سے اکھاڑ دوں گی، یہ میرا سوزی کی محبت سے وعدہ ہے اور مون جو وعدہ کرلے پھر نبھا کر چھوڑتی ہے۔ مون اچھوں کے ساتھ اچھی اور بروں کے ساتھ بہت بری ہے۔

سوزی نے اپنا حق چھوڑ دیا، خاموش ہوگئی...... محبت پر صبر کر لیا مگر میں اسے اجاڑ اور ویران نہیں دیکھ سکتی۔ میں اس سے محبت کرتی ہوں اور اس کی خوشی کو دوسرے سے چھین بھی سکتی ہوں۔ سوزی میری مما کی خواہش تھی۔ مما نے اپنی زندگی میں عیسیٰ کا رشتہ سوزی کے ساتھ طے کر دیا تھا مگر میرے پاکستانی بے وفا، خود غرض باپ نے مما کے مرتے ہی رشتہ توڑ دیا۔ آہ...... میرا بے وفا باپ، بیوی کے مرتے ہی اسے بھول گیا۔ میرا بھائی بھی تو اسی شخص کا بیٹا ہے۔ انتہا کا خود غرض۔'' آج وہ سینے کا زہر اگلنے آئی تھی۔ انکشاف در انکشاف تھے۔ مالا اب ایک مری ہوئی مکڑی کے مانند جالے سے اٹک گئی تھی مگر یہ کیا؟ ابھی اس کی کچھ سانسیں نکل رہی تھیں مگر ہر سانس کیسے گھٹ گھٹ کر آرہی تھی۔

''آہ سوزی......'' مون کسی جذب کے عالم میں بولی۔ ''اس کی الوہی عبادت اور دعا نے بھی اسے محبت سے دور کر دیا مگر میں اس کی محبت لوٹا سکتی ہوں۔'' اس کا عزم اور ارادہ قابلِ دید تھا۔ پتھرائی ہوئی ہر رنگ کی جھلک دیتی آنکھیں اب سنہری گھڑی پر جم گئی تھیں پھر وہ نپے تلے قدم اٹھاتی وہاں تک گئی۔ اس کا ریشمی پھولا پھولا فراک زمین کو چھو رہا تھا۔ اس کے لمبے سلکی سرخ بال کمر پر خم کھا رہے تھے۔ اونچی پونی اسے مغرور ثابت کرتی تھی۔ کیسا غرور تھا اس لڑکی کو اپنے لہجے، اپنے ارادے پر گویا سب کچھ اپنے ہاتھ میں لیے بیٹھی تھی۔

''اس گھڑی کو دیکھو۔'' اس نے سنہری گھڑی کو ہاتھ میں لیا۔ چابی گھمائی اور دو بجاتی سوئی کو ساڑھے پانچ تک لے آئی۔ ''اگر میں اس کا وقت پیچھے کرکے تمہیں احمق ترین ثابت کر سکتی ہوں تو تمہیں علی عیسیٰ کی زندگی سے بے دخل بھی کر سکتی ہوں۔'' گھڑی کا وقت اب کیا تھا...... ساڑھے پانچ یعنی صبح صادق کا وقت۔ اب وہ ریشمی پھولے فراک کو لہراتی ونڈوز تک گئی تھی۔

اس نے کھڑکی کے دونوں پردے ہٹا دیے۔ سفید نائیلون کی جالی والا پردہ اور ریشمی سلک کا پھولدار پردہ اب وہ سلائڈ ہٹائے کھڑی تھی۔ باہر جگمگاتا سویرا تھا۔ رات ڈھل چکی تھی، صبح پھوٹ پڑی تھی۔

مالا ذوالفقار نے مالا علی عیسیٰ بننے تک کا وقت کیسا بے خبری اور بھولپن میں گزار دیا تھا۔ اس نے ایسی جادوگری اور شاطرانہ چالیں کہاں سیکھی تھیں؟ تو گویا مون حبیب نے اسے پہلے ہی مقام پر پچھاڑ دیا تھا۔ وہ اسے لفظوں کے جال میں الجھا کر بے وقوف ثابت کر چکی تھی اور مالا علی عیسیٰ، مون حبیب کی زندگی کا سب سے آسان ترین چیلنج اور مشکل ترین شکار تھی۔ اس نے چیلنج آسان سمجھ کر قبول کیا تھا حالانکہ آسان نظر آنے والی چیزیں، مقابلے اور چیلنج اتنے آسان ہوتے نہیں۔

تو گویا آج سے ایک سرد جنگ کا آغاز ہونے والا تھا۔ مالا کا ساکت وجود اور منجمد ذہن کچھ سوچ نہ پایا۔ اسے لگ رہا تھا دو عجیب ترین آنکھیں اس کے ذہن کی ہر سوچ کو اکھاڑ پچھاڑ کے چلی گئی ہیں۔ دو عجیب ترین سرد آنکھیں اس کے ذہن کی ہر سوچ کو کھنگال آئی تھیں۔ اب اس کے پاس سوچنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا پھر جانے کتنا وقت دبے پیر گزر گیا۔ مون چلی گئی اور سوزن آندھی طوفان کی طرح اندر آگئی۔ مالا پہلے کی طرح ساکت کھڑی تھی۔ کسی بے جان مکڑی کی طرح جالے کے ساتھ لٹک رہی تھی۔ گویا پور لگانے سے گرنے کے قریب تھی۔

سوزن بھاگتی ہوئی مالا تک آئی۔

''مالا! تم ٹھیک ہو، تمہیں کیا ہوا؟ کیا ابھی مون آئی تھی تمہارے پاس؟'' سوزن نے اسے کسی سنگی مجسمے کی طرح ساکت دیکھ کر جھنجوڑ ڈالا تھا۔ وہ بہت زرد، پریشان اور حد سے زیادہ متفکر لگ رہی تھی۔

''تمہیں کیا ہوا، بولتی کیوں نہیں؟'' سوزن مزید گھبرا گئی۔ وہ اس کے ٹھنڈے ہاتھ پکڑے کھڑی

تھی۔ سوزن کے چہرے پر اسے خاموش دیکھ کر سراسیمگی پھیل گئی تھی پھر اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال کوندے کی طرح لپکا۔

''اوہ......تو، یہ مون تھی ناں۔'' وہ گویا لمحوں میں ساری کہانی سمجھ گئی پھر اس نے ایک خاص انداز میں مالا کو بڑے نرم لہجے میں مخاطب کیا۔

''تم کیا محسوس کرتی ہو مالا؟'' اس کے سوال کو جادو اثر بھی کہا جاسکتا ہے۔ وہ کسی ٹرانس کے عالم میں سوزن کے سوال کا خود بخود جواب دیتی گئی۔ مون کی خوف ناک باتوں سے لے کر ایک، ایک گرہ کھولتی گئی۔ جو مون نے کہا، وہ سب کسی الہامی یا خیالی کیفیت میں اس نے سوزن کے گوش گزار کردیا تھا۔ اس کی پوری بات سن کر سوزن زرد پھیکے پھول کے مانند کملا گئی۔ اس کی آنکھیں پانی کے نمکین قطروں سے بھر گئی تھیں۔ وہ افسردگی کی تہوں میں دب گئی مگر سوزن نے خود کو سنبھالنا تو تھا ہی۔ اسے امید نہیں تھی... مون اس کے لاکھ سمجھانے کے باوجود بھی یہ سب بکواس مالا سے کردے گی اور جس طرح وہ اس پر سحر پھونک کر کر گئی تھی سوزن کو سوفی صد یقین تھا وہ اپنا کوئی نیا تجربہ کر کے گئی ہے۔ اس نے آخر کار تمام سوچوں کو جھٹک کر مالا کی طرف رخ کیا تھا۔ اسے مالا کی ذہنی کیفیت کو بحال کرنا تھا۔

''تم اب بہت اچھا اور خود کو تر و تازہ محسوس کر رہی ہو مالا......ایک دم فریش اور ہلکا پھلکا، ہے ناں؟'' سوزن کے لفظوں میں ایسی مٹھاس تھی کہ پتھر بنی مالا کے بے جان مٹی جیسے بت میں جان پڑ گئی تھی۔ اس نے جھٹکا کھا کر پاس کھڑی متفکر سی سوزن کو دیکھا تھا۔ وہ گویا کسی خواب یا بھیانک نیند سے جاگی تھی۔

''تم ٹھیک تو ہو ناں...؟'' سوزن نے بہت محبت سے مالا کو مخاطب کیا۔ تب وہ بڑی حیران، حیران سی اسے دیکھے گئی تھی۔

''مجھے کیا ہونا تھا، میں ایک دم ٹھیک ہوں۔'' مالا نے مسکرا کر جواب دیا۔ وہ ایک دم فریش اور تر و تازہ تھی مگر سوزن کے چہرے کو دیکھ کر نہیں لگتا تھا کہ وہ کچھ ٹھیک یا فریش تھی۔

''تمہیں کیا ہوا ہے؟'' مالا نے نرمی سے پوچھا۔ اتنے تھوڑے سے وقت میں سوزن اس کے بہت قریب آگئی تھی۔ مالا اس کی تکلیف یا کسی بھی پریشانی کو محسوس کرسکتی تھی۔ شاید یہی ہمدردانہ احساس، دوستی کی سیڑھی کا پہلا قدمچہ تھا۔

''آں......ہاں، کچھ نہیں۔'' وہ گڑبڑا سی گئی۔

''تم مون کا ذکر کر رہی تھیں ناں۔'' مالا کو خیال سا گزرا پھر کچھ دیر پہلے کا منظر ذہن میں روشن ہوا حالانکہ منظر روشن کہاں تھا، دھندلا، دھندلا سا تھا۔ شاید وہ اور مون اسی کمرے میں کھڑی تھیں؟ جانے مالا نے نیند میں مون کو دیکھا تھا یا وہ حقیقت میں یہاں آئی تھی؟ وہ شک میں مبتلا ہوگئی یا وہم میں پڑ گئی۔ اسے لگ رہا تھا مون اس کے حواسوں پر سوار ہوتی جا رہی ہے۔ یقیناً سونے سے پہلے وہ مون کے متعلق سوچ کر سوئی تھی تبھی تو مون...... مگر مون تو یہاں موجود تھی کچھ دیر پہلے۔ وہ اس سے کیسی باتیں کر رہی تھی؟ عجیب، فضول، خوف ناک بھلا عیسیٰ اور سوزن...... یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ وہ اسے دھمکیاں دے رہی تھی۔ عیسیٰ کی زندگی سے نکل جانے کا کہہ رہی تھی۔ یہ ممکن تھا کیا؟ مون پاگل تو نہیں تھی یا کوئی نفسیاتی مریضہ؟

''کس الجھن میں ہو؟'' سوزن نے دھڑکتے دل کے ساتھ مالا کو مخاطب کیا۔ وہ واقعی کسی الجھن میں تھی۔ سوزن کو بتانے لگی۔

''ابھی مون آئی تھی کچھ دیر پہلے...... یہ دیکھو گھڑی کا وقت بدل گیا۔ پہلے دو پر سوئی تھی پھر پانچ پر کر گئی۔ خیر اب تو چھ بج رہے ہیں۔'' مالا نے کچھ بے ربط سے انداز میں کہنا شروع کیا تھا۔ ''اتنی عجیب باتیں کر رہی تھی۔'' مالا کے دل میں نیزہ سا چبھا تھا۔

''تم مون کی باتوں پر توجہ مت دیا کرو، وہ تو پاگل ہے یوں سمجھو۔'' سوزن نے اسے پچکارتے ہوئے کہا۔ ''اور ہاں، مون یہاں نہیں آئی تھی، تمہیں وہم ہوا ہے۔ مون رات کو واپس انسٹی ٹیوٹ چلی گئی تھی۔'' سوزن نے نگاہ چرا کر اس کا خوف کم کرنے کی کوشش کی تھی مگر مالا کا خوف کم ہونے کے بجائے بڑھ گیا تھا۔

''نہیں، وہ ابھی یہاں آئی تھی۔ میرا وہم نہیں......اس نے مجھ سے اتنی باتیں کیں۔'' مالا نے مضطرب لہجے میں کہا تھا۔ وہ اسے یقین دلانا چاہتی تھی کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہی مگر سمجھ نہیں آرہی تھی کہ یقین آخر دلائے کیسے؟ اور سوزن شاید یقین کرنے والی بھی نہیں تھی۔

''اچھا......مون نے تم سے کیا کہا؟'' سوزن نے کسی خدشے کے تحت محتاط انداز میں پوچھا تھا اور اس کی توقع کے عین مطابق مالا نے بے چاری سی صورت بنالی تھی۔ اسے مون کی بکواس یکسر بھول چکی تھی حالانکہ کچھ دیر پہلے اس کے ذہن پر کچھ دھندلے، دھندلے منظر بکھر رہے تھے۔ مون کا سیاہ ریشمی زمین کو چھوتا فراک، اس کی اونچی پونی میں جڑے نگینے، سر کے عین وسط میں رکھا یاقوت اور ہیرے کا کراؤن، اس کے سرخ ریشمی بال مگر اب ذہن صاف سلیٹ کے مانند ہو رہا تھا۔ ہر بوجھ اور ہر نقش سے آزاد۔ وہ قدرے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ پہلے والی بے چینی اور اضطراب اندر کہیں نہیں تھا۔

''تم نے بتایا نہیں؟'' سوزن نے ایک مرتبہ پھر محتاط سے انداز میں پوچھا تب مالا نے بے چارگی کے عالم میں بے ساختہ کہا تھا۔

''یار! میں بھول گئی ہوں، جانے کیا کچھ بول کے گئی ہے مگر وہ آئی ضرور تھی۔'' دوپٹے کو نماز کے اسٹائل میں سر پر لپیٹے مالا کتنی معصوم، کتنی پاکیزہ اور

مقدس لگ رہی تھی۔ سوزن کو اس لمحے مالا پر رشک آیا۔ اگر علی عیسیٰ مالا کو اس کیفیت میں دیکھ لیتا تو عمر بھر کسی اور کی طرف نگاہ نہ ڈالتا۔ اسے مالا کی معصومیت، سادگی اور بھولپن پر ٹوٹ کر پیار آ گیا تھا۔

''این فاخ پوپے۔'' سوزن نے بے ساختہ اس کے گال کو چھوا تھا اور نرمی سے اس کی پیشانی کو چوم لیا۔ مالا دنگ رہ گئی تھی۔

''این فاخ پوپے۔'' یہ لفظ اب مالا کے لیے اجنبی نہیں تھے۔ تاہم سوزن کے منہ سے سن کر اسے بہت اچھے لگتے تھے۔ وہ ان کے معنی سوزن سے پوچھ سکتی تھی مگر چونکہ عیسیٰ نے منع کیا تھا سو اسے خود ہی ان الفاظ کو کھوجنا تھا۔ وہ ابھی انہی الفاظ پر غور کر کے سابقہ بہت سی باتوں کو نظر انداز کر رہی تھی جب سوزن اسے نیچے آنے کا کہہ کر باہر نکل گئی تھی۔ کچھ دیر بعد مالا بھی سر جھٹکتی نیچے آ گئی تب ایک مرتبہ پھر گروی نے اسے آواز دے کر بلایا تھا۔

''آنروف۔'' ان کی آواز اور اشارہ سمجھ کر مالا جھٹ پٹ فون تک آ گئی تھی۔ اسے یقین تھا عیسیٰ کا فون ہوگا اور وہ اسے لینے کے لیے آنے والا ہوگا مگر فون کے دوسری طرف حسیب چاچو تھے جو بڑے ہی بے قرار اور مضطرب لگ رہے تھے۔

''وہ نالائق تمہیں اُدھر ہی چھوڑ کر آ گیا ہے۔ میں نے خوب کلاس لی ہے اس کی۔ صبح ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ تم تیاری پکڑو، عیسیٰ کو بھیجتا ہوں اگرچہ وہ رات سے اسپتال ہی میں ہے۔'' وہ اپنی عجلت پسندی کے باعث تیز، تیز بول رہے تھے اور مالا کو عیسیٰ کی مصروفیت کے متعلق بتا رہے تھے۔ کمپنی کے کچھ ورکرز ازحد زخمی تھے۔ ان کی حالت تشویش ناک تھی تو پھر بھلا عیسیٰ ان کو چھوڑ کر کیسے آ سکتا تھا؟

''اور تم وہاں پریشان رہی ہوگی، گروی تو بہت نائس ہیں جبکہ روی (تانتے) خاصی بدمزاج ہے۔'' حسیب چاچو کی تیز گفتگو میں بھی اپنائیت کی مہک محسوس ہو رہی تھی۔ مالا کو لگا وہ اپنے ڈیڈ سے ہم کلام ہے۔ اس کا من اندر تک شانت ہو گیا تھا۔

''نہیں چاچو، میں پریشان نہیں رہی۔ یہاں سب نے میرا بہت خیال رکھا ہے۔'' مالا نے سچے دل سے حسیب چاچو کو یقین دلانا چاہا تھا پھر محتاط انداز میں آس پاس دیکھا۔ گروی کہیں نہیں تھیں شاید اپنے جانوروں کی سیوا کرنے چلی گئی تھیں۔

''اچھا۔'' وہ بے ساختہ خوش ہو گئے۔ ''گروی بہت اچھی ہیں، عیسیٰ سے بہت پیار کرتی ہیں اور عیسیٰ کے حوالے سے تم بھی انہیں بہت پیاری ہو گی مگر وہ روی اور سوزن؟'' وہ بولتے بولتے پھر سے اٹک گئے تھے۔ مالا کے ذہن میں ان کے اٹکنے سے جھماکا سا ہوا تھا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے سن ہو گئی۔ یوں لگا تھا ذہن کی اسکرین پر سے کوئی دھندلا سا پردہ کھسکا ہے۔ اسے اچانک موں کی باتیں یاد آ گئی تھیں۔ جیسے پرت در پرت، تہ در تہ کوئی انکشاف سا ہوا تھا، کوئی گرہ سی کھلی تھی۔

''روی اور سوزن۔'' یقیناً انہیں عیسیٰ کی خالہ اور کزن کی طرف سے کوئی خدشہ تھا۔ یہی کہ وہ شاید عیسیٰ کی بیوی کو برداشت نہ کر سکیں مگر ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ سوزن تو بہت ہی اچھی تھی جبکہ تانتے نے بھی محض رکھائی دکھانے کے علاوہ کوئی بدمزگی نہیں پھیلائی تھی مگر موں کی کہی باتیں جو اس نے ایک مرتبہ پھر مالا کے کمرے میں زبردستی گھس کر کی تھیں وہ نظر انداز نہیں کی جا سکتی تھیں۔ آخر موں نے اپنی تمام تر جلن اور کھولن باہر نکال ہی دی تھی...... تو گویا موں کی اصل ناراضی کا سبب صرف یہی تھا مگر وہ کتنی کم فہم تھی اتنی سی بات سمجھ نہیں پائی کہ مقدر کا لکھا کبھی نہ مٹ سکتا ہے نہ بدل سکتا ہے تو پھر جب عیسیٰ کے ستارے سوزن کے ساتھ کبھی مل نہیں سکتے تھے پھر زبردستی یہ کیسے ملا سکتی تھی؟ مگر بعض لوگ تقدیر کے فیصلوں سے ٹکرانے کھڑے ہو جاتے ہیں یہاں تک

کہ تقدیر ان کا پانسہ پلٹ دیتی ہے۔ شاید موں انہی کم فہموں میں سے ایک تھی۔ اس کی سوچوں کو رکنا پڑا جب چاچو کی حلیم آواز سنائی دی۔

''میری بیٹی کے بغیر گھر بہت سونا لگ رہا ہے۔'' چاچو کی محبت نے مالا کے اندر چہار گنا...... خوشگواریت اتار دی تھی۔ اس کی آنکھیں ان کی محبت پر چمکنے لگیں۔

''چاچو میں خود بھی گھر آنا چاہتی ہوں۔'' مالا نے سرشاری کیفیت میں کہا تھا۔ چاچو کی آواز اس لمحے ڈیڈی کی آواز سے مشابہ ہو گئی تھی۔ ڈیڈی جیسی نرمی، محبت، حلاوت اس کا دل اپنے بابل کی یاد سے بھر بھر آیا مگر کمالِ ضبط سے خود پر قابو پائی رہی تھی۔

''ویسے چاچو، میری یہاں موں سے بھی ملاقات ہوئی ہے۔'' ہر چند کے موں سے ملاقات کوئی خوشگوار ماحول میں نہیں ہوئی تھی پھر بھی اس نے موں کا ذکر کرنا مناسب سمجھا تھا۔ موں، چاچو کی اکلوتی بیٹی تھی اور مالا کی کزن بھی پھر اسے موں کے ساتھ کوئی پرخاش بھی نہیں تھی یہ جانتے ہوئے بھی کہ موں اسے قطعاً پسند نہیں کرتی۔ موں کا ذکر مالا کے لبوں سے سن کر چاچو فطری محبت سے مغلوب ہو گئے تھے۔ مالا نے محسوس کیا جب چاچو نے بولنا شروع کیا تو ان کے لہجے میں ڈھیروں پیار اتر آیا۔

''موں تم سے ملی، اس نے کچھ کہا تو نہیں؟'' جانے وہ کیوں متجسس بلکہ خوف زدہ ہو گئے تھے۔ ان کا انداز کھوجی، سراغی قسم کا تھا۔ گویا وہ کچھ جانچنا اور پوچھ گچھ کرنا چاہتے تھے۔ کچھ ایسا جو غیر فطری یا غیر متوقع ہو سکتا تھا۔

''کچھ نہیں کہا بلکہ اچھے طریقے سے ملی تھی۔'' مالا ان کے خدشات کی تہ میں بنا ان کے کچھ کہے چپکے سے اتر گئی تھی حالانکہ عام روٹین میں چاچو بلا کے تفریح طبع، ہنسوڑ اور فرحت مزاج تھے تاہم یہ موں کا ذکر تھا جس نے انہیں کچھ اپ سیٹ کر دیا تھا۔

''جانے موں کے حوالے سے کیسی بھول ہوئی مجھ سے۔'' وہ گویا خود سے ہم کلام تھے اور اپنے آپ کو ملامت کر رہے تھے۔ اپنی ناکردہ خطا، قصور یا لغزش پر وہ دل برداشتہ تھے۔ وہ خود کو ہی مجرم ٹھہرا رہے تھے حالانکہ ان کا بھلا قصور کیا تھا؟ ہر بچہ اپنی فطرت پہ پیدا ہوتا ہے۔ عیسیٰ بھی تو انہی کا بیٹا تھا، فرمانبردار، نیک، ذہین...... اگر موں کچھ الگ یا منفرد تھی تو اس میں بھی چاچو کا قصور کہاں نکلتا تھا۔

''موں نے ایسا کیا کر دیا؟'' اس کے لبوں سے غیر ارادی طور پر پھسل گیا تھا حالانکہ یہ سوال وہ کم از کم چاچو سے نہیں کرنا چاہتی تھی مگر اب بھلا کیا ہو سکتا تھا۔ زبان سے نکلی بات پلٹ نہیں سکتی تھی۔ ویسے بھی اس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے غیر ارادی طور پر یہ بات کہی تھی۔

''آں......'' وہ کسی گہری سوچ میں گم ہو گئے تھے۔ جانے کیا سوچنے لگ گئے تھے یا انہیں موں کی شخصیت کے بارے میں بات کرنا کچھ مشکل لگ رہا تھا۔

''وہ بہت مختلف ہے بیٹا...... شاید عام لوگوں سے بہت ہی مختلف۔'' یقیناً وہ اس سے اچھی کوئی اور وضاحت اپنی بیٹی کے لیے...نہیں دے سکتے تھے جبکہ مالا ان کی بیٹی کے لیے بہت اچھی اور بہت جامع وضاحت محض چند الفاظ میں بیان کر سکتی تھی اور شاید وہ موں کی ہر بات کو نظر انداز بھی کر دیتی مگر جو وہ مالا کو اچانک ہراساں کرنے بنا اجازت کمرے میں گھس آئی تھی۔ ان باتوں کو سوچ کر مالا کے اندر گرہ سی پڑ گئی تھی۔ دراصل موں کے غیر اخلاقی اقدام نے مالا کے اندر حد درجہ خوف و ہراس بھر دیا تھا۔ جانے موں کے مقاصد کیا ہیں؟ تاہم مالا اتنا جان پائی تھی کہ موں اسے خوف زدہ کرنا چاہتی تھی اور اس نے موں کی شخصیت کی تشریح یک طرفہ انداز میں کچھ اس طرح سے کی تھی۔

''چاچو! آپ کی بیٹی تو ساحرہ ہے اللہ کی قسم!

بولتی ہے تو سحر پھونک دیتی ہے۔‘‘ اس کے نرم الفاظ نے دوسری طرف چاچو کے وجود پر کیسا بارود گرایا تھا یہ محض آنکھوں سے دیکھا جاسکتا تھا۔ وہ کسی کٹے ہوئے شہتیر کے مانند ڈھے گئے تھے جبکہ مالا.... بے چاری ناسمجھی کے عالم میں ہیلو، ہیلو کرتی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

لائن شاید ڈراپ ہوگئی تھی۔ مالا نے بے دلی سے فون رکھ دیا اور پلٹ کر کیوخ کی طرف بڑھ آئی مگر کیوخ کی خاموشی اور کھٹ پٹ کی نہ آنے والی آوازیں بتارہی تھیں کہ سوزن یہاں نہیں۔ میز پر ناشتے کا سامان رکھا تھا۔ اناس کی فلاشے رس سے بھری تھی۔ ایک پلیٹ میں بیرنے کے قتلے کٹے ہوئے پڑے تھے۔ انڈے اور سلائس بھی تھے۔ مالا نے اناس کا بس رس پیا تھا حالانکہ سبز لوبیے کا سالن بھی موجود تھا اور میدے کا پراٹھا بھی۔ سوزن نے ہمیشہ کی طرح ناشتے پر خاصا اہتمام کیا تھا۔ وہ جوس پی کر سوچ رہی تھی کہ عیسیٰ کو فون کرے۔ اسی اثنا میں سوزن چلی آئی۔

’’گرس گوٹ۔‘‘ اس نے بواریا کا مخصوص سلام پیش کیا تھا... جیسے انگریزی کا گڈ مارننگ اور اردو کا صبح بخیر۔ سوزن کے ساتھ اتنے مختصر وقت میں مالا نے بہت کچھ نہ سہی تھوڑا بہت سیکھ لیا تھا۔ جیسے کوئی فون کے لیے بلاتا تو وہ سمجھ کے فوراً آجاتی۔ جیسے گرس گوٹ یعنی پورے دن کی سلامتی کے لیے دعا۔ عیسیٰ نے کہا تھا وہ لوگوں کے لفظوں اور باتوں کی طرف توجہ دیا کرے تاکہ اسے لفظ سمجھنے میں آسانی ہو۔ کوئی بھی زبان مشکل... نہیں ہوتی اگر اسے سمجھ لیا جائے تو اور یہ علی عیسیٰ کی خاص ہدایت تھی پھر مالا اسے کیسے نظر انداز کردیتی۔

ادھر سوزن اسے مسکراتی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اب گرس گوٹ کے جواب میں جانے کیا بولتے تھے؟ مالا کو کچھ سمجھ نہ آیا تو اس نے بڑے جذب کے ساتھ ’’وعلیکم السلام‘‘ بول کر سوزن پر سلامتی کو لوٹا دیا۔ مالا کے اس انداز پر سوزن کی مسکراہٹ اور گہری ہوگئی تھی پھر اس نے اسٹول کھینچ کر مالا کی طرف کیا۔ اب وہ اپنی سوتی روک سمیٹ کر مالا کے قریب بیٹھ گئی تھی اور مالا اسے اتنے قریب سے دیکھ کر سوچ رہی تھی۔

’’بھلا علی عیسیٰ نے سوزن پر اسے کیوں ترجیح دی؟ کیا خوب صورتی کی بنا پر مگر عیسیٰ نے تو مالا کو دیکھا ہی نہیں تھا تو پھر آخر کیا وجہ تھی؟ شاید چاچو کی محبت یا اصرار؟ ہاں، شاید یہی ٹھوس وجہ ہوسکتی تھی مگر جو بھی تھا مالا اس انداز میں سوچ کر بھی سوزن سے حسد محسوس نہیں کرتی تھی اور نہ ہی اسے علی عیسیٰ کے اپنے ساتھ رشتے پر مان جانے کی کسی بھی خاص وجہ کو جاننے کے متعلق تجسس تھا۔ گویا وہ علی عیسیٰ کو پاکر ہی سرشار تھی۔ وہ اسے کیوں ملا، کیسے ملا اور یہ شادی کس طرح ہوئی؟ مالا کو یہ جاننے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے لیے اہم یہ تھا کہ علی عیسیٰ سفید پھولوں کی مالا سے بے انتہا محبت کرتا ہے اور جب وہ اس سے محبت کرتا تھا تو باقی چیزیں قطعاً فضول اور بے معنی تھیں۔ مالا کے لیے یہی احساس پوری زیست کا سرمایہ تھا۔ مون کیا چاہتی تھی؟ تانتے اور سوزن کی کیا خواہش تھی؟ یہ پوری کہانی مالا کے یہاں آنے سے پہلے کی تھی اور مالا کو ماضی کریدنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر پھیلے اتار چڑھاؤ کو ملاحظہ کرکے سوزن نے اسے سوچوں کے گرداب سے باہر نکالا۔

’’عیسیٰ کا فون آیا تھا، وہ آج بھی نہیں آسکے گا۔‘‘ سوزن کے الفاظ نے مالا کی رنگت پل بھر میں زرد کردی تھی۔ اس کی سانس رک سی گئی چونکہ سوزن اس کے بہت قریب بیٹھی تھی اور مالا کا چہرہ بھی کھلی کتاب جیسا تھا سو وہ اس کے تاثرات کا فوراً جائزہ لے کر نرمی سے بولی۔

’’گھبراؤ مت، عیسیٰ نے مجھے کہا ہے کہ میں

تمہیں اسٹیشن تک چھوڑ آؤں۔ وہ تمہیں آگے سے پک کرلے گا۔ وہ بہت پریشان ہے اور انکل بھی تمہارے لیے اداس ہیں۔ میں نے آفاق کو بلایا ہے اگر اس کی کلاس نہ ہوتی تو تمہیں من ہائیم چھوڑ آئے گا۔ اگرچہ عیسیٰ کو یہ پسند نہیں مگر میں چاہتی ہوں تم اکیلے سفر نہ کرو۔ آفاق بہت اچھا لڑکا ہے۔ پاکستانی ہے، یہاں جاب کرنے آیا ہے آج کل ڈچ سیکھ رہا ہے اُدھر انسٹی ٹیوٹ میں۔ آفاق کے ساتھ جانے میں دشواری نہیں ہوگی۔ وہ تمہاری بات سمجھے گا اور تم اس کی... ہم وطن ہونا پردیس میں ایک نعمت ہے۔‘‘ سوزن نے سابقہ نرمی اور حلاوت سے کہا تھا۔ مالا جہاں اپنے واپس جانے کا بہت خوش ہوکر پروگرام سن رہی تھی وہیں آفاق کے نام پر ٹھٹک گئی۔ اس پوری گفتگو کے دوران اسے صرف ایک بات چونکا گئی تھی۔ ’’اگرچہ عیسیٰ کو یہ پسند نہیں۔‘‘ عیسیٰ کو کیا پسند نہیں؟ آفاق کے ساتھ جانا یا پھر کسی کے ساتھ بھی سفر کرنا؟ اس نے کہا تھا وہ اکیلی چلی آئے۔ عیسیٰ آگے سے پک کرلے گا تو پھر کسی بھی آفاق کے ساتھ جانا بیکار اور فضول تھا جبکہ سوزن آفاق کی تعریف میں رطب اللسان تھی۔ وہ شاید اس کا تذبذب سمجھ چکی تھی۔

’’آفاق بہت شریف جوان ہے۔ بہت نیک اور ایمان دار ہے۔ پہلے ہمارے گھر میں ہی رہتا تھا۔ اب اِدھر قریب ہی ایک گھر کرائے پر لیا ہے اس نے۔ آفاق کے ساتھ جانے میں کوئی پرابلم نہیں، میں عیسیٰ کو بتادوں گی ویسے وہ بھی آفاق کو جانتا ہے۔ تم یہاں اجنبی ہو، ڈچ سے ناواقف ہو میرا نہیں خیال کہ اکیلے سفر کرپاؤ گی۔‘‘ سوزن بلاشبہ بہت ہمدرد اور احساس کرنے والی لڑکی تھی۔ اسے مالا کی پریشانی کا خیال تھا مگر مالا، سوزن کی بات بھلا کیسے مان لیتی جب عیسیٰ نے کہا تھا وہ اکیلی آجائے۔ اگر وہ چاہتا تو کہہ دیتا کہ کوئی اسے چھوڑ جائے۔ وہ کتنی پریشان اور تذبذب کا شکار ہو چلی تھی۔ سوزن کچھ دیر کے لیے چپ سی ہوگئی پھر اندر سے اپنا موبائل اٹھا لائی۔ اس نے عیسیٰ کا نمبر ملا کر پہلے پندرہ منٹ عیسیٰ سے خود بات کی شاید اسے سمجھاتی رہی تھی کہ مالا اس ملک میں اجنبی ہے اور اکیلے سفر نہیں کرسکتی پھر کافی لمبی گفتگو کے بعد اس نے موبائل مالا کو پکڑا دیا تھا۔ مالا نے سیل فون کان سے لگایا تو عیسیٰ کی متفکر آواز سنائی دی۔

’’مالا! میں خود تمہیں لینے آجاتا مگر بورٹ (ارکان کمیٹی) کے دو لوگ مر چکے ہیں۔ یہاں خاصا لمبا چوڑا کام ہے۔ حادثے کے باعث ایک دو کی مزید حالت تشویش ناک ہے۔ پاپا کو ڈاکٹر نے ڈرائیونگ سے منع کر رکھا ہے ورنہ وہ خود تمہیں لینے پہنچ جاتے۔ میں نے بہ مشکل روک رکھا ہے انہیں۔ سوزن تمہیں اسٹیشن تک چھوڑ جائے گی، تم آفاق کے ساتھ آجانا۔ بہت اچھا لڑکا ہے تم ڈچ سے ناواقف ہو راستے میں پریشانی ہوسکتی ہے۔ دھیان سے آنا، اپنا خیال تم اچھی طرح رکھ سکتی ہو۔‘‘ وہ عجلت میں مگر محتاط سا بول رہا تھا۔ اس کے آخری الفاظ میں ایک پوشیدہ سی تنبیہ تھی۔ اس تنبیہ کو مالا اچھی طرح سمجھ چکی تھی۔ وہ نہ بھی کہتا تب بھی مالا اپنا خیال بہت اچھی طرح سے رکھ سکتی تھی۔ اپنا وقار، نسوانی پندار، عزت اور آبرو کی حفاظت کرنا اسے خوب آتا تھا۔ ایک یہی تو خاص تربیت تھی جسے اِن کی مشرقی مائیں گھٹی میں پلا دیتی تھیں۔ فون بند ہوگیا تھا اور شاید فیصلہ بھی ہوچکا تھا۔ اسے سوزن کی بات اب ماننی ہی تھی کیونکہ عیسیٰ نے آفاق کے ساتھ چلے آنے کی اجازت دے دی تھی سو مالا کو اب اپنی چیزیں سمیٹنا تھیں جو تقریباً پہلے سے ہی سمٹی رکھی تھیں پھر بھی تھوڑی بہت پیکنگ سوزن نے کروادی تھی پھر مالا، گروسی سے ملنے ان کے جانوروں والے باڑے میں پہنچ گئی۔ یہاں گوبر کے بھبکوں نے اس کا استقبال کیا تھا۔ تانتے مشین میں

چارہ کاٹ رہی تھی۔ ایک سخت دل، روکھے مزاج کی محنت کش عورت۔ اس نے پہلی مرتبہ تانتے کو کام کرتے دیکھا تھا۔ تانتے گھر میں کم کم نظر آتی تھی یقیناً اس کا زیادہ وقت باڑے میں گزرتا تھا۔ یہاں پنیر اور تازہ دودھ کی باس تھی۔ گروسی اور تانتے اسے دیکھ کر کام چھوڑ کر حیران کھڑی تھیں پھر تانتے تو نہیں البتہ گروسی اس کے قریب آگئیں۔ انہوں نے اپنے کھردرے سفید ہاتھ کو اس کے سر پر رکھا تھا پھر گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھا۔

''کیا ہوا تو خترِ (بیٹی)؟'' گروسی کی سبز گدلی بہت کشادہ آنکھوں میں سوال تھا تب مالا کو سمجھ نہ آئی کہ وہ انہیں کیسے بتائے، وہ جارہی ہے اور ان سے ملنے کے لیے آئی ہے۔ اس کی مشکل سوزن نے آسان کردی۔ وہ اس کے پیچھے ہی چلی آئی تھی یقیناً سوزن جان گئی تھی مالا، گروسی سے ملنے باڑے تک گئی ہوگی۔ گروسی نے سوزن کی بات سن کر کچھ کہا تھا شاید یہی کہ وہ کچھ اور دن ان کے پاس رک جائے۔ گروسی کی محبت پر مالا کو کوئی شک نہیں تھا تاہم اتنا وہ جانتی تھی کہ تانتے اس کے جانے کا سن کر بہت خوش ہوگی۔ سوزن کی بات سن کر تانتے نے مشین کا ہینڈل گھما کر اندر کی طرف رخ کرلیا تھا۔ مشین خود بخود چارہ کاٹ رہی تھی اور تانتے کا یوں مالا کو دیکھ کر اندر چلے جانا اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ کیا وہ تانتے کو اتنی ہی بری لگتی تھی کہ ملنا تو دور اس نے دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ مالا کا کانچ سا دل ٹوٹ ہی گیا۔ اب اگر عیسٰی نے سوزن سے شادی نہیں کی تھی تو اس میں بھلا مالا کا کیا قصور تھا؟ گروسی سے مل کر اور ان کی دعائیں سمیٹ کر جوں ہی وہ پلٹی تب تک تانتے دوبارہ باڑے تک آگئی تھی۔ سوزن نے اشارے سے مالا کو رک جانے کا کہا تھا۔ اب وہ حیران نظروں سے تانتے کو دیکھ رہی تھی جس نے ہاتھ میں ایک شون روک پکڑ رکھی تھی۔ پھول دار سی خوب صورت اسکرٹ جس پر دھاگے کا کام تھا پھر تانتے نے اس کی حیرانی سے پھٹی پڑتی آنکھوں کو دیکھے بغیر ایک انتہائی نفیس آرمبانٹ مالا کی کلائی میں پہنا دیا تھا۔ اگرچہ آرمبانٹ (بریسلٹ) نقلی نگینوں سے سجا تھا مگر انتہائی خوب صورت اور نفیس تھا۔ یہ تانتے اور گروسی کی طرف سے تحفے تھے۔ مالا کی خوشی کے مارے آنکھیں بھر آئیں۔ اسی روکھے مزاج والی... بداخلاق تانتے نے گروسی کے انداز میں مالا کو پیار کرکے اچھی قسمت کے لیے دعا دی تھی۔

''فیل گلوک۔'' تانتے نے سابقہ انداز میں کہا تھا پھر واپس باڑے کی طرف چلی گئی۔ گروسی اسے باہر تک چھوڑنے آئی تھیں۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ... گروسی اور سوزن کی محبت سمیٹ کر اور تانتے اور موں کو سمجھے بغیر واپس جانے والے راستوں پر رواں دواں تھی۔ سوزن اس کے ہمراہ آئی تھی۔ اب وہ جنگلی پھولوں کی باڑ پھلانگ کر ایک ہاؤس فراؤ کے گھر کے پاس پہنچ چکی تھیں۔ وہیں سوزن نے آفاق کو آواز دے کر باہر بلایا تھا۔ کچھ دیر بعد ایک ہینڈسم جوان خوب تیار شیار ہوکر ہنستا مسکراتا باہر آیا تھا۔ اس نے خوب رگڑ رگڑ کر شیو کررکھی تھی۔ گورا چٹا، کالی آنکھیں، کالے بال...... شکل سے ہی مالا کا ہم وطن لگ رہا تھا۔ آتے ساتھ بڑا گرم جوشی بھرا اسلام کیا۔ حال احوال پوچھا اور محض پندرہ منٹ کے اندر اندر لاہور سے لے کر یہاں تک کا سفرنامہ سناڈالا۔ انتہا کا باتونی یہ لڑکا آفاق تھا۔ اس کا تعلق بھی لاہور سے تھا۔ پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی، مستقبل سنوارنے کی خواہش لیے جرمنی آیا تھا۔ اپنی ماں اور بہنوں سے بہت محبت کرتا تھا۔ اسے بہنوں کی شادیاں کرنا تھیں، ماں کو حج کروانا تھا اور دادی کو سونے کے کنگن بنوا کردینے تھے۔ اس کے علاوہ آفاق پر اپنے دو بہنوئیوں کو جرمنی لے کر آنے کی ذمّے داری بھی تھی اور ایک بہنوئی کو کاروبار سیٹ کرکے دینا تھا۔ اس کی اکیلی جان بے شمار سیاپوں

میں پھنسی ہوئی تھی اور پھر بھی فی الحال کوئی اس سے خوش نہ تھا۔ وہ پچھلے آٹھ ماہ سے جرمنی میں تھا۔ سوزن کے اسٹور میں کام کرتا تھا ساتھ ساتھ یہاں کی زبان بھی سیکھ رہا تھا۔ یہ تمام گفتگو ٹھیٹھ پنجابی میں آفاق نے مالا کے گوش گزار کی تھی۔ وہ مالا کی توقع سے بھی زیادہ ہنس مکھ اور زندہ دل تھا۔ اس کی چلتی زبان کے جوہر دیکھ کر سوزن نے برجستہ کہا۔

''اہلِ بواریا کی زندہ دلی آفاق کے اندر بدرجہ اتم موجود ہے۔'' سوزن کے کمنٹس آفاق کو مسکرانے پر مجبور کرگئے۔ وہ اب مالا کو بتا رہا تھا۔

''آہ، بواریا کا حسن...... تم ساری دنیا بھی دیکھ لو تب بھی بواریا کے حسن کا سحر ایسا نہیں جس سے خود کو آزاد کر پاؤ گی۔'' وہ دور تک پھیلی ہریالی کو دیکھتا، سبزے پھولوں، پہاڑوں، چشموں، جھیلوں کی داستان سنا رہا تھا۔ جو آس پاس بکھرے پڑے تھے۔ یہاں سفید مرغابیاں بھی کثرت سے پائی جاتی تھیں۔ اس وقت سورج پگھل رہا تھا۔ ہر چیز روشن اور چمک دار تھی۔ وہ لوگ اسٹیشن تک ایک منی بس کے ذریعے آئے۔ مالا ایک گاؤں میں عالیشان سا چمکتا دمکتا اسٹیشن دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی۔ انتہائی صاف شفاف، ایک طرف بڑے... بڑے ڈیپارٹمنٹ اسٹورز تھے۔ جس روڈ پر بس رکی تھی وہاں پیٹرول پمپ اور سی این جی اسٹیشن بھی تھا۔ دو تین ہوٹلز اور گیسٹ ہاؤسز بھی تھے۔ یہ ایک چھوٹے سے معمولی گاؤں کی ترقی کا حال تھا۔ مالا کی آنکھیں جانے کیا کچھ دیکھ کر حیران ہوتیں۔ تبھی ایک ٹرین کے آنے کی وسل ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد ٹرین قریب آگئی۔ مسافر سوار ہونے لگے تھے۔ مالا نے دھندلی آنکھوں سے سوزن کی طرف دیکھا تھا۔ وہ اپنی زندگی کا ایک اور خوب صورت انتہائی یادگار تھوڑا سا وقت یہاں گزار کر واپس جارہی تھی۔ وہ سوزن کو کبھی بھلا نہیں سکتی تھی۔ اس کی محبت، ایثار اور پیار کا کوئی مول نہیں تھا۔ مالا نے فرطِ محبت سے اسے گلے لگایا تھا جواباً سوزن نے بھی اسی گرم جوشی کا مظاہرہ کیا تھا۔

''میں آج کل خاصی غریب ہوں، تمہیں کوئی تحفہ نہیں دے سکی... مگر تحفہ تمہارا ادھار رہا۔'' اس کے گال پر بوسہ دے کر سوزن نے سرگوشی کی تھی۔ تب مالا اسے منع کرنا چاہتی تھی مگر اچانک وسل سنائی دی۔ آفاق نے چیخ کر اسے بلایا اور مالا عجلت میں ہاتھ ہلاتی ٹرین میں سوار ہوگئی۔ اس کی آنکھیں سیٹ پر بیٹھنے کے بعد بھیگ رہی تھیں۔ وہ سوزن کی محبت کو کبھی بھلا نہیں سکتی تھی۔ وہ سوزن کے ساتھ گزارے وقت میں اس قدر محو تھی کہ اپنے ساتھ آئے آفاق کو بھی بھول چکی تھی۔

''جس دن میں بواریا چھوڑوں گا، مجھے بھی ایسا ہی دکھ ہوگا۔'' آفاق نے اس کی افسردگی محسوس کرکے آہستگی سے کہا۔ ''یہ بواریا...... یہ ہے ہی ایسا۔ اپنے سحر میں جکڑ لیتا ہے۔ بندے کو اپنی طرف مقناطیس کی طرح کھینچتا ہے۔ یہاں کے لوگ بہت سادہ طبیعت، ہمدرد، مخلص اور مذہبی ہیں۔ میں نے اہلِ مغرب میں اس علاقے جیسے لوگ کہیں نہیں دیکھے۔ لگتا ہے، یہاں افسانوی کردار بستے ہیں۔'' وہ باتونی لڑکا بالآخر سوں، سوں کرتی مالا کو اپنی طرف متوجہ کرہی چکا تھا۔ مالا نے اس کی بات سے... بےخیالی میں اتفاق کرلیا۔

''میں یہاں بس ایک مہینے تک ہوں پھر من ہائیم میں جاب ڈھونڈوں گا۔'' وہ بولے جانے کے خبط میں مبتلا تھا۔ جواب نہ پاکر بھی بولے چلا جاتا تھا۔ اسے خاموش رہنا گویا پسند نہیں تھا۔

''عیسٰی بہت اچھا ہے، اس نے میری بہت مدد کی تھی۔ یقیناً میرا کورس مکمل ہونے کے بعد جاب بھی ڈھونڈ دے گا۔'' وہ اب عیسٰی کی تعریفوں میں رطب اللسان تھا اور عیسٰی کی تعریف ایک ایسا موضوع تھا جو مالا کو اندر تک سرشار کردیتا تھا۔ وہ گویا جی جان سے

آفاق کی طرف متوجہ ہوگئی تھی۔ اسے عیسٰی کے بارے میں کسی سے بھی کچھ سننا بے حد پسند تھا۔

"میرا انسٹی ٹیوٹ میں مون نے فری ایڈمیشن کروایا تھا۔ یہ لوگ بہت اچھے ہیں۔ ہمدرد اور مخلص خصوصاً ان لوگوں میں سب سے زیادہ سوزن انتہائی مخلص اور ایثار کرنے والی لڑکی ہے کاش کہ وہ عیسائی نہ ہوتی۔" بولتے بولتے اچانک وہ ایک دم رک گیا تھا۔ زیادہ بولنے کا ایک یہی نقصان ہوتا ہے جو کچھ زبان بول دیتی ہے وہ پھر واپس نہیں پلٹ سکتا۔ وہ بھی قدرے خاموش اور شرمندہ ہوگیا تھا مگر مالا نے گویا اس کی بات پکڑلی تھی یعنی انسانی فطری تجسس...... حالانکہ وہ اجنبی لوگوں سے زیادہ تو کیا کم بھی بے تکلف نہیں ہوتی تھی اور اس نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ وہ آفاق سے بالکل بات نہیں کرے گی مگر یہ آفاق کی سادگی، خلوص یا اپنائیت بھرا انداز تھا جو مالا کو رکھائی دکھانے سے روک رہا تھا۔ وہ چاہ کر بھی... بداخلاقی نہیں دکھا سکی تھی اور نہ ہی آفاق سے بدتمیزی کرسکتی تھی۔ بلاشبہ وہ ایک تمیزدار، بااخلاق اور شائستہ اطوار لڑکا تھا۔

"وہ عیسائی نہ ہوتی تو؟" مالا نے اس تمام گفتگو میں ایک جملہ بالآخر پکڑ ہی لیا تھا۔ آفاق ایک دم جھینپ سا گیا تھا پھر شاید بات بنا کر بولا تھا۔ یقیناً گفتگو کو کسی بھی موڑ سے اپنے حق میں کرنے کا ہنر اسے آتا تھا۔ مالا سراہے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

"سوزی بہت اچھی لڑکی ہے۔ کسی بھی انسان کا آئیڈیل، ویسے میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ اگر وہ عیسائی نہ ہوتی تب بھی عیسائی ہی ہوتی، اپنے مذہب پر جان دیتی ہے۔ میں نے بہت کم مغربی لڑکیاں سوزی کی طرح، سوزی کے مزاج والی، سوزی جیسے کردار والی دیکھی ہیں۔" آفاق یقیناً سچ بول رہا تھا۔ سوزی ایسی ہی تھی، قابلِ تعریف، محبت کرنے والی، ایثار لوٹانے والی۔ کچھ دیر بعد آفاق پھر سے سوزی کے متعلق گفتگو کو بڑھا رہا تھا۔

"مجھے سوزی کے ہم سفر پر رشک آتا ہے۔ یقیناً وہ خوش قسمت انسان ہوگا جسے سوزی پسند کرے گی۔" آفاق کے لہجے میں حسرت سی در آئی تھی۔ مالا ایک مرتبہ پھر سے ٹھٹکی بھلا اس حسرت آمیز لہجے کا مفہوم کیا تھا۔

"سوزی بھی میری طرح سیلز گرل ہے یعنی میں سیلز بوائے، وہ سیلز گرل۔ یہ جاب بڑی مشکل سے مجھے ملی ہے ویسے میں کبھی کبھی حیران ہوتا ہوں بلکہ مجھے رشک آتا ہے۔" اس نے اپنا کندھے پر لٹکایا لیدر کا بیگ کھول کر اس کے اندر تانکا جھانکی شروع کردی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک چپس کا پیکٹ کھول کر مالا کی طرف بڑھانے لگا۔ مالا جھجک سی گئی تھی اس نے چپس کا پیکٹ نہیں پکڑا تھا۔

"شکریہ، میرا موڈ نہیں ہے۔" اس نے انکار کردیا۔ آفاق نے زیادہ اصرار بھی نہیں کیا تھا۔ وہ پہلے جیسی بے تکلفی کے ساتھ مسلسل بول رہا تھا اور برابر چپس کھائے جا رہا تھا۔

"تم نے پوچھا نہیں، مجھے رشک کس پر آتا ہے؟" اب وہ مالا کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ جس کی مسلسل خاموشی شاید آفاق کے لیے اچنبھے کا باعث تھی۔

"کس پر رشک آتا ہے؟" مالا نے میکانکی انداز میں پوچھا تھا۔ دراصل وہ زیادہ بولنے کی عادی نہیں تھی اور اسے آفاق کا بلا تکان بولنا بھی گراں گزر رہا تھا۔

"علی عیسٰی پر۔" آفاق نے لمحوں میں چپس کا پیکٹ خالی کرکے گول مول سا گولا بنایا اور اسے ایک چھوٹی کورپ (ڈسٹ بن) میں اچھال دیا۔ شاید وہ اسی لیے ایک کنڈے میں لٹکائی گئی تھی۔

"اچھا!" مالا کی دلچسپی دیدنی تھی۔ "بھلا وہ کیوں؟" اب وہ حیرانی سے بول رہی تھی۔

"وہ اس لیے کہ علی عیسٰی بہت اچھا ہے، بہت

امیر ہے۔ اس نے کچھ بھی محنت سے نہیں بنایا۔ اسے سب بنا بنایا ملا ہے۔ اس کے علاوہ وہ ایک ہمدرد دل رکھتا ہے۔" آفاق کی کچھ باتیں مالا کو اچھی اور کچھ بری لگی تھیں۔ وہ چپ ہوا تو مالا بولی۔

"اس کے باپ نے تو بہت محنت کی ہے ناں اور اسی بزنس کو عیسٰی نے مزید وسعت دی ہے۔ ہمارے پچھلے، اگلوں کے لیے کچھ نہیں کرتے، اسی لیے پیچھے رہ گئے ہیں۔" مالا نے بے ساختہ جواب دیا تھا اسے آفاق کی بات بھائی نہیں تھی۔

"ہاں، یہ تو میں بھی کہتا ہوں۔ ویسے حسیب انکل جیسا انسان بھی کوئی نہیں...... مگر مون کی خودسری نے انہیں بیمار کرڈالا ہے۔ تم جانتی ہوگی وہ ہارٹ پیشنٹ ہیں۔ انہیں دوسرا اٹیک تمہاری شادی سے کوئی ایک مہینہ پہلے ہوا تھا۔ تبھی تو انہوں نے عیسٰی کی جھٹ پٹ شادی کردی تھی۔" آفاق اپنی رو میں بولتا جا رہا تھا اور مالا کی گویا سانس سینے میں اٹک گئی۔

"کیا چاچو اتنے سخت بیمار تھے؟" مالا کو اس انکشاف نے حیران کرڈالا تھا۔ وہ اندر تک آزردہ ہوگئی۔

"بیمار تھے نہیں، بیمار ہیں۔" آفاق نے اپنی بات پر زور دے کر کہا تھا پھر مالا کی نم آنکھوں اور ڈھیروں رنجیدگی کو محسوس کرکے قدرے گڑبڑا گیا۔

"ارے...... اب تو وہ بالکل ٹھیک ہیں۔" آفاق کو سمجھ نہ آئی کہ اسے تسلی کیسے دے۔ مالا کی آنکھیں ٹپ ٹپ برسنے لگی تھیں۔ اسے اب پتا چلا تھا کیوں چاچو نے آناً فاناً عیسٰی کی شادی اس کے ساتھ کردی تھی۔ یقیناً وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو چلے تھے۔

"ویسے عیسٰی کی جلدی شادی کا موجب یہی تھا۔ وہ تو پہلے مون کی شادی کرنا چاہتے تھے مگر وہ مانی نہیں۔" آفاق ان کی فیملی کو اتنے قریب سے جانتا تھا۔ یہ مالا کو پہلے نہیں پتا چل سکا تھا۔ وہ تو ان کے گھر کی بہت پرسنل باتوں کو بھی جانتا تھا تو پھر وہ مون کے متعلق بھی جانتا ہوگا۔ عیسٰی اور سوزن کے نام نہاد رشتے کو بھی جانتا ہوگا اور مون کی ساحری، جادوگری کے فن سے بھی واقف ہوگا۔ مالا اچنبھے سے آفاق کو دیکھے جا رہی تھی۔ وہ اس سے کچھ پوچھنے اور نہ پوچھنے کی کشمکش میں مبتلا تھی اسی اثنا میں بارش گارڈ ٹکٹ فروخت کرنے آگیا۔ اس غریب بے تکلف لڑکے نے فوراً دو ٹکٹ خرید لیے تھے۔ اب ٹرین گلابوں کے نگر سے گزر رہی تھی۔ وسیع پھولوں سے سجے فیلڈ تاحدِ نگاہ پھولوں کی رنگ برنگی قوسِ قزح پھیلی تھی۔ ایسا مہکیلا، جان فزا منظر تھا کہ کچھ پل کے لیے آفاق بھی بولنا بھول گیا تھا حالانکہ وہ ایک منٹ بھی چپ رہنے والا نہیں تھا اِدھر مالا پھولوں کی مالاؤں پر نگاہ جمائے آفاق سے کچھ پوچھنے کے لیے لفظوں کو توڑ مروڑ رہی تھی۔ دراصل اسے گفتگو کی ابتدا کے لیے کوئی مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ بھلا وہ کیسے اتنی اہم بات انجان لڑکے سے پوچھ لیتی۔ ویسے بھی جس طرح مون نے دو دفعہ مالا کو اچانک ہراساں کیا تھا اس بات سے بھی ناواقف تھے اور سوزن تو مانتی ہی نہیں تھی کہ مون ان کے گھر اچانک آئی تھی بلکہ گھر نہیں، مالا کے کمرے میں...... سوزن کا خیال تھا مون اس کے کمرے میں نہیں آئی جبکہ مالا کو پورا یقین تھا وہ اسے پہلی شب کی طرح ہراساں کرکے گئی ہے۔ اب جانے آفاق کو بتانا مناسب تھا یا نہیں۔ وہ اسی کشمکش میں مبتلا بات بدل کر بولی تھی۔

"کیا تم جانتے ہو کبھی عیسٰی اور سوزن کا رشتہ یا منگنی وغیرہ ہوچکی ہے؟" مالا نے حتی المقدور لہجے کو سرسری بنایا تھا تاکہ آفاق کو شک بھی نہ گزرے۔

"آں......" آفاق پھولوں کے حسن سے نگاہ چرا کر فوراً چونکا۔ "منگنی......" اسے بھی اچنبھا ہوا۔ وہ دائیں بائیں سرنفی میں ہلا کر ایک مرتبہ پھر اپنا لیدر کا بیگ کھولنے لگا تھا۔ اب کے اس نے جوس کا ٹن نکالا تھا۔ پہلے مالا کی طرف بڑھایا پھر کچھ سوچ کر فوراً

بولا۔ ’’یقیناً تمہارا موڈ نہیں ہوگا۔‘‘ وہ گویا پورے وثوق سے کہہ رہا تھا جیسے مالا فوراً انکار ہی تو کرنے والی تھی۔ مالا کو اس سے ایسی صاف گوئی کی امید نہیں تھی۔ تبھی جوس کاٹن پکڑ کر بولی۔

’’میرا حلق خشک ہورہا ہے۔‘‘ اس کی حیرت سے باہر نکلی آنکھوں میں دیکھے بغیر اس نے آرام سے جوس پکڑ کر پینا شروع کردیا تھا۔ آفاق نے مسکراہٹ دبا کر اپنی زنبیل میں پھر سے منہ دے دیا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک اور جوس کاٹن نکالے منہ سے لگا کر گھونٹ، گھونٹ پی رہا تھا۔

’’تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟‘‘ مالا کو جواب جاننے کی بے چینی تھی اور آفاق کو جوس پینا... فی الحال جواب دینے سے زیادہ ضروری لگ رہا تھا پھر جوس کاٹن خالی کرکے ڈسٹ بن میں اچھالنے کے بعد وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

’’اگر ہم اپنے ملک میں بھی ایسی صفائی کا خیال رکھیں تو پاکستان جنت نہ بن جائے۔‘‘ آفاق درمیانے سائز کے ڈسٹ بن دیکھ کر خود کو ملامت کررہا تھا اور پھر اچھی طرح خود کو اور اپنی عوام کو سنے کے بعد مالا کی بات کے متعلق سوچنے لگا۔

’’منگنی تو نہیں، البتہ میری آنٹی (عیسٰی کی مما) کی خواہش تھی سوزن ان کی بہو بنے۔‘‘ آفاق کچھ سوچ، سوچ کر بول رہا تھا۔ یہ باتیں خاصی پرانی تھیں مگر آفاق کو پھر بھی پتا تھا۔ یقیناً وہ کروسی کے گھر میں ایک فرد کی طرح رہتے ہوئے بہت کچھ جان گیا تھا۔

’’تو پھر؟‘‘ مالا کی آنکھوں میں بے چینی اتر آئی تھی۔

’’پھر یہ کہ میری آنٹی اور عیسٰی کی یہ بھی خواہش تھی کہ اگر سوزن اسلام قبول کرلے ویسے میں نے یہ بھی سنا تھا عیسٰی، سوزن سے رشتے پر تیار نہیں تھا۔ مطلب وہ سوزی کے لیے ایسے جذبات نہیں رکھتا تھا کہ اس سے شادی کرلیتا۔‘‘ آفاق نے اس کی... بے چینی محسوس کیے بغیر سادگی سے بتادیا تھا۔ مالا کے اندر پھڑ پھڑاتے سوال مزید بڑھ گئے۔ وہ آفاق سے کچھ اور بھی پوچھنا چاہتی تھی مگر اسے خدشہ تھا کہ آفاق یہ نہ سمجھے کہ وہ اپنی فیملی سے اتنی انجان ہے۔

’’پھر؟‘‘ مالا کے ہونٹ بے آواز پھڑ پھڑائے۔

’’ایکچوئلی، عیسٰی نے شرط رکھی تھی شاید میری آنٹی کی خواہش سے متاثر ہوکر اس نے آخری شرط بتائی کہ سوزن اسلام قبول کرلے۔ تب وہ اپنی مما کی خواہش پوری کرتے ہوئے سوزی سے شادی کرلے گا۔‘‘ آفاق نے بنا کوئی خاص تاثر دیے مالا کے ہر سوال کا جواب دینا شروع کردیا تھا۔ اس کا چہرہ سادہ سا تھا یقیناً وہ غلط بیانی سے کام نہیں لے رہا تھا۔ مالا کے مزید کچھ بھی بولے بغیر وہ خود ہی بتانے لگا۔ بہت باتونی ہونا شاید اسی کو کہتے ہیں، وہ چپ نہیں رہ سکتا تھا اور مالا کے لیے اس کا بولنا بہت ضروری تھا۔

’’تب سوزی نے انکار کردیا۔ وہ عیسائیت کے عشق سے نکلنے والی نہیں تھی۔ اس نے کہا تھا، وہ دنیا کے لیے آخرت نہیں ختم کرسکتی۔ وہ عیسٰی کے لیے عیسٰی علیہ السلام کی کتاب اور ان سے عشق کو نہیں چھوڑ سکتی مگر وہ علی عیسٰی سے محبت کرنا بھی ختم نہیں کرسکتی۔ بے چاری کو وقت نے دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔‘‘ آفاق کے الفاظ میں سچائی کے ساتھ سوزی کے لیے بے انتہا دکھ اور کرب تھا۔ وہ اس چھوٹی سی لڑکی کے لیے دل میں بہت نرم جذبات رکھتا تھا۔ وہ یہ بات کسی سے تو کیا خود سے بھی شیئر نہیں کرسکتا تھا۔ سوزی اس کی محسنہ تھی اور احسان کرنے والوں کے دلوں کو ٹھیس نہیں پہنچائی جاتی۔ ادھر مالا اس انکشاف پر دم بخود رہ گئی تھی۔

’’سوزی نے علی عیسٰی سے شادی کرنے سے انکار کردیا تھا؟‘‘ مالا کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔ اسے سوزی اس لمحے بہت عظیم لگی تھی۔ اس نے مذہب پر محبت کو قربان کردیا تھا۔ اس کے لیے محبت اہم نہیں تھی، مذہب اہم ترجیح تھا۔

’’ہاں، تب عیسٰی مطمئن ہوگیا۔ وہ اپنی مری ہوئی ماں کے سامنے خود کو سرخرو سمجھنے لگا تھا۔ اس کا ضمیر مطمئن ہوگیا۔ دراصل وہ انکل کی بھتیجی کو چاہتا تھا یعنی تمہیں...... بہت پہلے سے انکل نے کہہ دیا تھا کہ عیسٰی کی شادی مالا سے ہوگی یعنی تم سے...... سو اس کے ذہن میں تمہارا خیال تھا۔‘‘ آفاق پرت در پرت انکشافات کی بوچھاڑ کررہا تھا۔ اس باتونی لڑکے نے اس کی حیران آنکھوں میں جلتی جوت کو دیکھ کر شرارتاً کہا تھا۔

’’تم سوچتی ہوگی اتنی اندر کی باتیں مختصر سے آٹھ، نو مہینوں میں مجھے کیسے پتا چلیں؟‘‘ آفاق نے چپ رہنا کہاں سیکھا تھا۔ مالا کو اس لمحے آفاق کا بہت بولنا بہت ہی اچھا لگ رہا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ آفاق یوں ہی بنا اس کے کچھ پوچھے بولتا رہے۔

’’ایکچوئلی مجھے یہ سب سوزن نے بتایا تھا اور سوزن کبھی جھوٹ نہیں کہتی۔‘‘ آفاق کے لہجے میں واضح سچائی تھی۔ مالا پوری پوری قائل ہوگئی پھر اس نے بہت خوف زدہ انداز میں مون کا ذکرِ خیر چھیڑا تھا تب مالا کی طرح آفاق بھی مون کے ذکر پر قدرے سہم گیا۔

’’اس کی بات نہ ہی کرو، پوری جادوگرنی ہے، اللہ کی قسم مجھے بہت ڈر لگتا ہے مادام مون سے۔‘‘ آفاق نے سہم کر کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ’’اور میرا مشورہ بھی یہی ہے کہ مون کے بارے میں زیادہ کھوج اور تفتیش میں نہ پڑنا۔ جس کا پیچھا لے لیتی ہے اس کی سانسیں کھینچ کے دم لیتی ہے۔ من ہائیم کی ساحرہ ہے۔‘‘ آفاق کے اگلے الفاظ نے مالا کے چڑیا جیسے دل کو بری طرح سہما دیا تھا۔

☆☆☆

’’تم بہت اچھے ہو آفاق۔‘‘ اسٹیشن پر اترنے سے پہلے مالا نے تہ دل سے اپنے احساسات آفاق تک پہنچا دیے تھے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ اجنبیوں سے اتنی جلدی بے تکلف نہیں ہوتی تھی مگر آفاق میں کچھ بہت ہی انفرادیت تھی۔ اس کی شخصیت میں کچھ

آزادیِ نسواں

مغربی عورت نے، مرد کے شانہ بشانہ گھر گرہستی چھوڑ کر ہر قسم کی صنعت میں کام کیا اور معاشی طور پر مستحکم، آزاد، خوشحال اور خود مختار ہوگئی۔ اب شوہر اس کی مجبوری صرف خرچے کے لیے نہیں رہے، مردوں نے بھی آزادی کی اس حقیقت کو تسلیم کرلیا کیونکہ اس میں ان کا ہی فائدہ تھا۔ آہستہ آہستہ خاندانی بندھن ٹوٹنے لگے اور تصورِ خاندان بکھرنے لگا۔ single parenty خاندان کا رواج عام ہوا۔

آج مغربی معاشرے میں عورت کی نسوانیت کی تلاش ہے، جو عنقا ہوچکی ہے۔ نکتہ وراس سوال پر غور کررہے ہیں کہ جہاں عورت مکمل طور پر ارزاں اور مشرقی ماحول کے بالمقابل نہایت پُراعتماد ہے پھر اس قدر عدم تحفظ کا شکار کیوں ہے؟ اس سوال کا جواب آج تک آزادیِ نسواں کی کوئی تحریک نہیں دے سکی اور نہ ہی مغرب کا وہ طبقہ دے سکا جو مسلم عورت کی ’’آزادی‘‘ کے لیے بھی سرگرمِ عمل رہتا ہے۔

مرسلہ: عروبہ ناز، کوٹلی

محبت کی امر بیل

محبت کی امر بیل میں ہمیشہ ستم کے پھول کھلتے ہیں، ستم کا پھول جس کی پنکھڑیوں پر تاسف کے آنسو منجمد ہوتے ہیں جس کی تخلیں جلد سے جدائی کی خوشبو آتی ہے۔ ستم کے پھول کی کہانی سنی ہے کبھی تم نے یہ تو دکھ کے پھول کی داستان ہے، ایک ایسا پھول جس میں محبت کا مدفن ہوتا ہے، دیوتا اپالو اور وینس کی محبت بادام کے شگوفوں کی طرح معطر، نازک مگر ہر خوب صورت چیز تمام خوب صورت لمحے صرف چند روزہ کیوں ہوتے ہیں وینس کی قبر پر اپالو کے اتنے آنسو گرے کہ اک دن اس میں سے اک پودے نے سر نکالا اور اس میں ایک پھول کھلا ارغوانی رنگ کا یہ ستم کا پھول تھا، ستم کا پھول پچھتاوے کا پھول محبت کا مدفن اس کی ہر ایک پنکھڑی پر لکھا ہوتا ہے افسوس صد افسوس۔

بانو قدسیہ کی تصنیف امر بیل سے انتخاب

پسند: ماہ نور قیصر، راولپنڈی

خاص قسم کی اپنائیت تھی۔ کوئی بھی بندہ اس سے رُکھائی یا غیریت برت ہی نہیں سکتا تھا۔ سوزن نے ٹھیک کہا تھا، آفاق قطعاً بے ضرر قسم کا بندہ تھا۔ پُرخلوص، سادہ اور انتہائی باتونی...... مالا کو آفاق سے بات کرکے بہت ساری ایسی باتوں کا بھی پتا چلا تھا جو عام حالات میں عیسیٰ ہرگز اسے نہ بتاتا۔ اگرچہ وہ فطرتاً بات کی گہرائی میں اترنے والی کھوجی قسم کی لڑکی نہیں تھی مگر پھر بھی ایک ہلکا سا تجسس نما مادّہ ضرور اپنے اندر رکھتی تھی سواسی تجسس کے تحت وہ موون کے رویّے کی الجھی گرہوں کے بارے میں بھی جاننے کے لیے متجسس تھی۔ اگرچہ آفاق نے اسے پرت در پرت رویہ رکھنے والی موون کے متعلق دلچسپی رکھنے سے منع کیا تھا مگر مالا کنویں میں سے مٹی نکالنے کو... بے تاب ضرور ہوگئی تھی۔

فی الوقت آفاق، مالا کی بات سن کر کورنش بجالایا تھا۔ مالا کی تعریف نے اسے بواریا کے سیوتی پھولوں کی طرح مہکا دیا تھا۔ وہ اپنی تعریف پر بہت خوش نظر آیا پھر اس نے اپنے لیدر بیگ میں سے ایک چاکلیٹ نکال کر مالا کی طرف بڑھائی۔

"اسی بات پر منہ میٹھا کریں۔" آفاق خود کینڈی کا ریپر پھاڑ کر منہ میں رکھ رہا تھا۔ وہ بچوں جیسی سرخوشی کے ساتھ دھیرے دھیرے مسکرا رہا تھا۔

"کیا یہ تعریف تم نے دل سے کی ہے؟" آفاق نے کسی خدشے کے تحت ذرا خوف زدہ ہوکر پوچھا تھا۔

مالا نے فوراً شدومد سے سرہلایا۔

"ہاں، دل سے۔" اس کے جواب نے آفاق کو اور بھی خوش کردیا تھا پھر اس نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈال کر مالا کو الرٹ کردیا تھا کہ وہ اترنے کے لیے تیار ہوجائے۔ مالا نے اپنا چھوٹا سا بیگ گود میں رکھ لیا تھا پھر آفاق کو مخاطب کرکے بولی۔

"کیا تم من ہائیم میں ہی رکو گے؟" مالا سوچ رہی تھی شاید وہ اپنے بھی کسی کام کے سلسلے میں آیا ہوگا مگر آفاق کا جواب قطعاً مختلف تھا۔

"میں تمہیں من ہائیم تک چھوڑنے آیا ہوں کسی اور بس یا ٹرین سے فوراً ہی واپس چلا جاؤں گا۔" آفاق کے سادگی سے بتانے پر مالا اس احسان مند ہوگئی تھی یعنی وہ اپنا تمام کام، مصروفیت چھوڑ کر آیا تھا۔ مالا کے دل میں اس کی جگہ بن تھی۔ اچھے لوگ خود بخود دلوں میں اپنی جگہ بنا کرتے تھے۔ آفاق بھی انہی لوگوں میں سے تھا۔

کچھ ہی دیر بعد ٹرین اپنے مقررہ وقت اسٹیشن کی حدود میں رک گئی تھی۔ آفاق نے دور ہی عیسیٰ کو دیکھ کر آواز لگادی تھی۔ پاکستانی کہیں بھی چلیں جائیں۔ خود کو بدل نہیں سکتے۔ ایک مصروف اسٹیشن پر ہزاروں لوگوں کی موجودگی میں بھی ذرا شور ہنگامہ یا بدنظمی نہیں تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ آفاق کی اونچی چہکار نے بہت سارے لوگوں کو ان کی طرف متوجہ کردیا تھا مگر وہ ڈھٹائی سے بولتا، مسکراتا کھلکھلاتا عیسیٰ سے بھینچ بھینچ کر مل رہا تھا۔ وہ حد سے زیادہ بے تکلف قسم کا لڑکا تھا جبکہ عیسیٰ اس افتاد پر ایک دم بوکھلا گیا تھا پھر کچھ دیر بعد سنبھلنے کا موقع ملتے ہی عیسیٰ نے آفاق کا شکریہ ادا کیا تھا اور آفاق بھی ٹوٹی پھوٹی ڈچ میں جانے عیسیٰ سے کیا کچھ کہہ رہا تھا۔ آفاق کو رخصت کرنے کے بعد عیسیٰ اس کی طرف متوجہ ہوا تھا جو آفاق کے محبت بھرے والہانہ مظاہروں پر دھیرے دھیرے مسکرا رہی تھی۔

"یہ ایسا ہی ہے...... تم حیران مت ہونا...... جہاں موقع ملتا ہے میرے ساتھ ڈچ بولنے کی پریکٹس کرتا ہے۔" عیسیٰ نے مسکراتے ہوئے اس کا بیگ پکڑا اور اس کے برابر چلنے لگا۔ "تمہارے ساتھ ڈچ بول کر ڈینگیں تو نہیں مارتا رہا؟" اچانک خیال آنے پر عیسیٰ نے مسکرا کر پوچھا تھا۔ مالا اس کے برابر چلتی ہوئی نفی میں سرہلانے لگی۔

"میرے ساتھ تو پنجابی اور اردو میں با

کررہا تھا۔'' مالا نے بھی مسکرا کر وضاحت کی تھی تب علی عیسیٰ اسے آفاق کے متعلق بتانے لگا تھا۔

''پہلے یہ بولنے سے گھبراتا تھا، آفاق کہتا تھا اسے کبھی یہ اوٹ پٹانگ زبان نہیں آسکتی مگر اب اچھا خاصا ایکسپرٹ ہوچکا ہے۔ عموماً راہ گیروں سے بھی علیک سلیک کرلیتا ہے۔ اسے زبان وبیان پر عبور حاصل کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ ڈچ بولنے کا یہی ایک طریقہ سمجھ میں آیا ہے۔'' عیسیٰ اسے تفصیلاً بتاتا اپنی لاڈلی benz تک لے آیا تھا۔ اس کا سامان رکھ کر وہ مالا کے لیے فرنٹ ڈور کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

''اسی لیے تو کہتا ہوں، تم بھی روزمرہ کے جملوں پر غور کیا کرو، ٹی وی دیکھتے ہوئے، میوزک سنتے ہوئے، شاپنگ کرتے ہوئے، مجھے امید ہے تم بھی جلد ہی یہاں کی زبان سیکھ جاؤ گی۔ جہاں رہنا ہو، وہاں کی زبان ضرور سیکھنی چاہیے۔'' عیسیٰ اسے نرمی سے بتارہا تھا۔ تب مالا نے قدرے خفگی سے جتایا تھا۔

''نہ سلام دعا، نہ حال نہ احوال پوچھا آتے ساتھ ہی ڈچ سیکھنے پر لیکچر دینا شروع کردیا۔ مجھے نہیں آسکتی یہ فضول قسم کی زبان۔'' مالا کے بے تکلفی بھرے روٹھے، روٹھے ناراض لہجے کو ملاحظہ کرکے عیسیٰ بے ساختہ حیرت میں مبتلا ہوگیا تھا۔ وہ گردن موڑے بڑے ہی شگفتہ تاثرات کے ساتھ مالا کے پھولے، پھولے چہرے کو دیکھ رہا تھا اور ہنسی تھی کہ اس کے لبوں پر پھول مہکائے جارہی تھی۔ اسے... بے ساختہ ہنستے دیکھ کر مالا کا منہ کچھ اور پھول گیا تھا۔

''اس طرح کیوں ہنس رہے ہیں؟ میرے منہ پر کیا لطیفہ لکھا ہے؟'' مالا کچھ چڑ کر خفگی سے بولی تھی حالانکہ یہ خفگی قطعاً مصنوعی تھی۔ اسے علی عیسیٰ کو ہنستا دیکھنا بہت اچھا لگ رہا تھا اور پھر وہ خاص الخاص مالا کے لیے ہی تو ہنس رہا تھا۔ اسی کی باتوں کو انجوائے کرتا مسکرا رہا تھا۔

''ایک مرتبہ پھر اسی طرح بولو ناں کتنی کیوٹ لگ رہی ہو تم، روٹھی روٹھی سی۔'' عیسیٰ نے بڑی محبت سے اصرار کیا تھا۔ مالا بجائے کچھ بولنے کے... بے ساختہ ہنس پڑی اور اسے مسکراتا دیکھ کر عیسیٰ بھی ہنسنے لگا تھا پھر کچھ دیر مزید بلاوجہ ہنسنے کے بعد عیسیٰ نے کس قدر حسرت سے کہا تھا بلکہ اتنے عرصے کے دوران پہلی مرتبہ ایک عجیب بات کہی تھی۔

''پتا ہے، میری بڑی خواہش تھی کہ مون کے ساتھ میری اچھی فرینڈشپ ہوسکے۔ وہ ڈھیروں کے حساب سے ہنستی رہے۔ مجھ سے فرمائشیں کرے، کبھی روٹھ جائے، کبھی مان جائے، کبھی ہنسے، کبھی روئے، ہم مل کر آؤٹنگ پر پورا جرمنی گھومیں مگر میری یہ خواہش کبھی نہیں پوری ہوسکی تھی۔ مجھے فطری طور پر ایک عجیب بہن ملی ہے جو غیر معمولی ذہن رکھنے والی، بہت عجیب سی لڑکی تھی، آدم بیزار قسم کی۔ جب تک مما تھیں سب ٹھیک رہا مگر مما کے چلے جانے کے بعد اس کی شخصیت میں بہت سی تبدیلیاں آئیں۔ وہ مجھ سے اور پاپا سے ہمیشہ دور رہی تھی مگر مما کی وفات کے بعد گویا صدیوں کی دوریاں درمیان میں حائل ہوگئیں۔ وہ پھر کبھی ہمارے قریب آہی نہ سکی۔'' عیسیٰ کا حسرت زدہ لہجہ گہرے کرب میں ڈوب گیا تھا۔ جانے کس جذباتی لمحے اس نے مالا سے مون کا رویہ شیئر کرلیا تھا ورنہ وہ بہت گہرا سا بندہ تھا۔ اتنی جلدی کھلنے والا نہیں تھا اور اسے شاید اپنے دکھوں کی تشہیر بھی پسند نہیں تھی حالانکہ اپنوں سے دل کی باتیں کرنا اپنائیت کو مزید بڑھادیتا ہے مگر عیسیٰ کے اس معاملے میں اصول کچھ اور قسم کے تھے۔ وہ سمجھتا تھا جو پریشانی، دکھ یا تکلیف اس کا اکیلا وجود سہہ سکتا ہے پھر وہ اپنے پیاروں کو کیونکر اس تکلیف میں حصے دار بنائے۔ اس نے ہمیشہ اپنی تکلیف، دکھ یا کسی بھی قسم کی پریشانی کو خود اپنے تک ہی محدود رکھا تھا اور وہ اپنے اس اصول پر بہت مطمئن بھی تھا...

فی الحال وہ مزید موّن کے بارے میں گفتگو سے اجتناب کرتے ہوئے ذرا ہلکے پھلکے خوشگوار لہجے میں کہہ رہا تھا۔ دراصل اسے فوری طور پر احساس ہوا تھا کہ اس نے موّن کا ذکر بالکل بھی ٹھیک وقت پر نہیں چھیڑا تھا۔ یہ معاملہ کچھ ایسا تھا کہ مالا اس پر سوال بھی اٹھا سکتی تھی مگر عیسیٰ فی الوقت اس کے کسی بھی سوال کا جواب دینے کے موڈ میں نہیں تھا سو گفتگو بدلتے ہوئے ذرا چھیڑنے والے انداز میں بولا۔

”تو جناب! اب بتائیں کیا حال احوال ہے آپ جناب کا۔ بڑے عرصے بعد ملاقات ہو رہی ہے۔ شاید تین یا چار سو سال بعد...... اس دوران ایک مرتبہ بھی خط کتابت پر رابطہ نہیں ہو سکا۔ نہ آپ نے کوئی ٹیلی فون کیا، نہ مجھے فون کال کرنے کی فرصت مل سکی۔“ علی عیسیٰ کی کھلکھلاتی مسکراہٹ نے مالا کی ہنسی کے سُر گاڑی میں بکھیر دیے تھے۔ وہ کتنی ہی دیر تک ہنستی رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھیں شفاف پانی کی ننھی منی بوندوں سے لبالب بھر گئیں۔

”آپ بھی کمال کے بندے ہیں۔“ مالا بہ مشکل ہنسی روک کر بول سکی تھی۔

”کہاں مجھ میں کمال رکھا ہے......اِک پردہ سا ڈال رکھا ہے۔“ عیسیٰ کچھ شاعرانہ موڈ بنا کر بولا تھا۔ مالا نے فوراً اس کی بات اچک لی۔

”تو کیا شاعری سے بھی شغف ہے؟“ اس نے حیران ہو کر پوچھا تھا۔

”جی، کیوں نہیں آپ کچھ سننا پسند فرمائیں گی؟“ علی عیسیٰ گویا نہال ہو گیا تھا۔ اسے مالا کے چھوٹے، چھوٹے سوال بہت پسند تھے۔ اسے مالا کا بولنا، ہنسنا اور ہنستے ہنستے آنکھوں میں پانی بھر آنا بہت پسند تھا۔ علی عیسیٰ کو لگتا تھا، پاپا اس کے لیے پاکستان سے دنیا کا حسین ترین تحفہ اٹھا لائے تھے اگرچہ وہ خوب صورت تھی مگر ایسی حسین بھی نہ تھی کہ عیسیٰ دیوانہ ہو اٹھتا۔ یہ تو اس کے چہرے کی ملاحت، سادگی اور معصومیت تھی جس نے پہلی نگاہ میں علی عیسیٰ کو اپنا اسیر کر لیا تھا ورنہ بواریا کی عورتوں سے بڑھ کر یورپ کے خطے میں کوئی حسین عورت نہ تھی۔ صحت مند، دلنشین، حسین اور انتہائی ہنس مکھ......

”یوں سجا چاند کہ جھلکا ترے انداز کا رنگ
یوں فضا مہکی کے بدلا میرے ہم راز کا رنگ!“

علی عیسیٰ نے فوراً ہی اس کی فرمائش پوری کر دی تھی۔

”سایۂ چشم میں حیراں رخِ روشن کا جمال
سرخیِ لب میں پریشاں تری آواز کا رنگ“

مَن ہائیم کے سارے تالابوں پر سفید مرغابیاں اتر آئی تھیں۔ سنہری پریوں نے مَن ہائیم کے دیوتا کی پجارن کو دیکھ کر رقص کرنا شروع کر دیا تھا۔ تتلیاں رنگ بدل رہی تھیں، اکسون کے موتی بکھر رہے تھے یاقوت کی بوندیں گر رہی تھیں۔

”بے پیے ہوں اگر لطف کرو آخرِ شب
شیشۂ مے میں ڈھلے صبح کے آغاز کا رنگ“

علی عیسیٰ کی انگلیاں اسٹیئرنگ وہیل پر متحرک رہی تھیں۔ وہ بن پیے اِک نشے، اِک سرور میں تھا۔ جیسے بلوریں فنجانوں میں انگور کا رس قطرہ قطرہ، بوند بوند گر رہا تھا۔

”اک سخن اور کہ پھر رنگِ تکلم تیرا
حرفِ سادہ کو عنایت کرے اعجاز کا رنگ“

فضا نے سانس روک لی تھی اور ہوہن موس کے جنگل میں مورنیوں نے باجماعت عشقیہ سلام پڑھے تھے۔ اس کا دل diskothek جرمن پب کی طرح کا ایک حیرت کدہ تھا جس میں دل کے سازوں کی موسیقی برابر بجتی چلی جا رہی تھی۔ کبھی نہ رکنے کے لیے، کبھی نہ تھمنے کے لیے۔ یہ قمرین (سورج اور چاند) کے ملن کی خوشی میں سنگیت چھیڑے گئے تھے۔ یہ دلوں کے قلیب (کنویں) میں محبت کے معجزاتی چشمے پھوٹ پڑنے کے اعزاز میں سُر بکھر رہے تھے اور قمیس (سمندر) میں طوفانی گرم جوش لہریں امڈ رہی تھیں۔ یہ فردوس کے جلوے تھے جو اہلِ زمین کو معتبر کر رہے تھے۔

benz کی بھینی مہک والی فضا کا طلسم بھی بالآخر ٹوٹ گیا تھا۔ علی عیسیٰ کے خاموش ہونٹ اس طلسم کو پاش پاش کر چکے تھے۔ مالا کو لگا وہ کسی خواب کی میٹھی نیند سے اچانک بیدار کر دی گئی ہے۔ اس نے کچی نیند سے بھری گلابی آنکھوں سے علی عیسیٰ کا مسکراتا چہرہ دیکھا تھا۔

”کیسی لگی یہ مدہوش کُن غزل؟“ علی عیسیٰ نے مسکرا کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا تھا۔

”میں حیران ہوں اور کچھ سحر زدہ بھی۔“ اس نے بنا جھجک کے پہلی سی خواب آگیں کیفیت میں کہا۔

”کس لیے؟“ عیسیٰ کو اچنبھا ہوا۔

”فیض کی غزل کے لیے۔“ مالا مسکرائی تھی۔ عیسیٰ نے گہری سانس خارج کی۔

”کیا مجھے فیض کی غزل یاد نہیں ہو سکتی؟“ اس نے آنکھیں میچ کر پوچھا۔

”امید تو نہیں تھی مگر......“ مالا نے نچلا لب دانتوں میں دبا کر شرارتی لہجے میں کہا۔

”مگر......؟“ عیسیٰ نے بھویں اچکائیں۔ اگرچہ وہ اس کی شرارت کو سمجھ رہا تھا تاہم جان بوجھ کر اسے بولنے کے لیے اکسانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”مگر آپ نے حیران کر دیا۔“ مالا کے ساتھ عیسیٰ بھی گہری سانس لے کر مسکرا دیا پھر سامنے اشارہ کر کے بولا۔

”میڈم مالا، گھر آچکا ہے۔“ اس نے احتیاط سے موڑ کاٹ...... کر انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ benz کو گیراج میں لا کھڑا کیا تھا اور مالا اپنے گھر کی جنت میں پہنچ کر گویا شانت ہو گئی تھی۔

☆☆☆

”مالے! تم تو مجھے بھول ہی گئیں۔“ یہ چاچو کی آواز تھی بالکل ڈیڈی سے مشابہ آج کتنے عرصے بعد کسی نے اسے ڈیڈی کے سے انداز میں مالے کہہ کر پکارا تھا۔ شاید چاچو نے تازہ ترین ڈیڈ کے منہ سے مالے سنا تھا پھر اس کے خیال کی تصدیق بھی ہو گئی۔ ڈیڈی، بندیا اور ممی کی کتنی ہی فون کالز آئی تھیں۔ اس کے بواریا سے آنے سے تھوڑی دیر پہلے ہی ڈیڈی کا فون آیا تھا۔ وہ اپنی مالے کے لیے شدید اداس تھے اور مالا نے سب سے پہلے پاکستان اپنے گھر والوں سے فون پر بات کی تھی اور اب کھانے کی میز پر چاچو کی بے قراریاں ملاحظہ کر رہی تھی۔ عیسیٰ کو بھی چاچو کا طرزِ تخاطب یعنی ”مالے“ بہت پسند آیا تھا اور وہ میٹھی میٹھی نظر سے دیکھتا دھیرے دھیرے زیرِ لب بڑبڑایا تھا۔

”مالے۔“ اس کی بڑبڑاہٹ اتنی اونچی ضرور تھی کہ برابر بیٹھی مالا اور اس کے دوسری طرف سربراہی کرسی پر بیٹھے چاچو بھی سن لیتے۔ جہاں مالا اس شہد آگیں طرزِ تخاطب پر گڑبڑائی تھی وہیں چاچو نے علی عیسیٰ کی گت بنا دی تھی۔

”آلام فرتر کے مصنف گوئٹے کی شارلوت کے عاشق! مالے صرف ہماری ہے۔ تم اپنے لیے کوئی اور نِک نیم سوچ لو۔“ جس طرح چاچو نے اس کی بڑبڑاہٹ سن کر آڑے ہاتھوں لینے کے بعد بڑا میٹھا طنز کیا تھا وہیں مالا کو علی عیسیٰ کی ایک پرانی بات یاد آئی تھی جس کو بتاتے ہوئے علی عیسیٰ نے کہا تھا کہ ہم دونوں باپ بیٹا خاصے منہ پھٹ ہیں اور مالا کو یقین تو پہلے بھی آچکا تھا اب کچھ اور یقین ہو چلا تھا۔ مالا جہاں چاچو کی لطیف گفتگو پر جھینپ رہی تھی وہیں علی عیسیٰ نے زوردار قسم کا قہقہہ لگایا تھا۔

”آں......ہاں، آپ غلطی کر رہے ہیں پاپا۔ میں گوئٹے کی شارلوت کا عاشق نہیں جسٹ ایک فین ہوں اور ویسے بھی گوئٹے جیسا دل پھینک نہیں ہوں۔“ وہ احتجاجاً چیخا تھا۔

”جو بھی ہو، ایک بات یاد رکھنا مالے پہ صرف ہمارا حق ہے۔“ حبیب چاچو اسے سخت قسم کی

چڑچڑاہٹ میں مبتلا کررہے تھے اور وہ بری طرح چڑ بھی رہا تھا۔

”آپ بھی یاد رکھیے، مالے صرف میری ہے۔“ دونوں باپ بیٹا حد سے زیادہ جذباتی تھے۔ اب بھی علی عیسیٰ نے جذباتی پن کی انتہا کردی تھی۔ مالا اس نوک جھوک سے محظوظ کیا ہوتی الٹا شرمندہ ہوئے جارہی تھی۔ چاچو کی موجودگی میں علی عیسیٰ کے بے باک جملے اسے بے حد شرم دلا رہے تھے۔

”اچھا، اچھا...... حوصلہ کرو۔“ اب جان بوجھ کے چاچو اسے پچکار رہے تھے۔ اسی دل فریب نوک جھوک اور خوشگوار ماحول میں کھانا کھایا تھا پھر ننی کافی بنالائی تھیں کافی کا طویل تر دور چلا تھا۔ ان دونوں باپ، بیٹے نے کافی کے بعد گرین ٹی بھی پی تھی پھر آخری مرتبہ اٹھنے سے پہلے قہوہ بھی مالا سے بنوا کر پیا۔ اس دوران انہوں نے دنیا جہان کی باتیں کرلی تھیں۔ آفیشل گفتگو کے علاوہ گھریلو، سیاسی، سماجی ہر قسم کا موضوع زیرِ بحث لائے تھے۔ گروسی کے گھر سے لے کر یہاں تک مالا سے بھی چیدہ، چیدہ باتیں پوچھی تھیں پھر عیسیٰ نے چاچو کو دوا کھلائی اور انہیں کمرے تک چھوڑنے چلا گیا۔

مالا نے اگلے بہت سارے دنوں میں بہت سی باتیں نوٹ کی تھیں۔ سب سے پہلے یہ کہ عیسیٰ کو چاچو سے بے انتہا محبت تھی۔ وہ ان کا خیال اپنے ہر ضروری کام کو ادھورا چھوڑ کر بھی رکھتا تھا۔ چاچو کی بہترین خوراک، جوسز، دودھ، فروٹس وہ ان کا ڈائٹ چارٹ بنا کر گھر سے نکلتا۔ کس وقت انہیں جوس دینا ہے، دودھ دینا ہے یا ٹھوس غذا دینی ہے۔ اس طرح ان کی صبح، دوپہر اور شام والی دوائیں بھی الگ، الگ رکھ کے جاتا تھا بعد میں ننی وقت پر سب کچھ ایک روٹین کے مطابق دے دیتیں مگر اب مالا نے یہ ساری ذمے داری غیر محسوس طریقے سے سنبھال لی تھی۔ وہ کوکنگ سے لے کر چاچو کا خیال رکھنے تک سب چھوٹے بڑے کام خود کرتی تھی۔

چاچو نے کہا تھا اب وہ اس گھر کی ہاؤس فراؤ ہے۔ یہ گھر مالا کا ہے سوائے اپنے گھر اور گھر والوں کا خود ہی خیال رکھنا تھا۔ ننی اب بھی صفائی ستھرائی کے لیے آتی تھی مگر اس کا کام بہت مختصر ہوگیا تھا۔

علی عیسیٰ کے کپڑوں سے لے کر چاچو کا لباس تیار کرنے تک مالا بہت دل جمعی سے دھیان رکھتی، بڑی محبت سے کپڑے پریس کرتی، الماریوں میں لٹکاتی حالانکہ چاچو اور علی عیسیٰ منع بھی کرتے تھے مگر مالا کو یہ مصروفیت دل و جان سے بے حد پسند تھی...... اور جہاں اس کے لباس کی بات آتی تھی وہیں عیسیٰ ہمیشہ خود اس کے لیے کپڑے منتخب کرتا۔ اسے کون سا لباس سوٹ کرتا تھا، اسے کیسے کپڑے پہننے چاہیے اور یہاں آج کل کیسا فیشن چل رہا تھا! عیسیٰ کی انفارمیشن اس حوالے سے بہت اپ ٹو ڈیٹ تھیں۔ وہ اس کے لیے خوب شاپنگ کرتا، اکثر اسے آؤٹنگ پر لے جاتا۔ بعض ایسی جگہوں پر جہاں ہنگامے، شور کی وجہ سے وہ خود جانا پسند نہیں کرتا تھا مگر اسے لگتا تھا مالا ہنگاموں اور شور وغل کو بہت پسند کرتی ہے حالانکہ وہ پہلے ایسی نہیں تھی مگر یہاں آکر اکثر گھر کی خاموشی سے گھبرا جاتی تھی۔ اپنے گھر میں اس کی چھوٹی بہن بندیا اور شامی بہت ہنگامہ مچائے رکھتے تھے۔ ذیشان اور ذی شاہ مزاجاً مختلف تھے مگر بندیا اور شامی کی موجودگی میں ان کے گھر ہمہ وقت ہنگامہ مچا رہتا تھا۔ سو یہاں کے سناٹے اکثر اسے پریشان کردیتے تھے۔ خصوصاً جب چاچو آرام کررہے ہوتے تھے تب ننی اخبار پڑھتی یا ٹی وی دیکھتی۔ مالا اس کی بات سمجھ نہیں سکتی تھی اور رات تک خاموش رہ، رہ کر اس پر اکتاہٹ سوار ہوجاتی۔ گھر میں اتنا کام نہیں ہوتا تھا۔ بس پاکستان فون کالز کرتی یا بے مقصد ٹی وی کو گھورے جاتی۔ ہاں، جب عیسیٰ گھر آجاتا تھا تب گویا زندگی پھر سے دھڑک جاتی تھی۔

وہ اسے کئی دفعہ کلبز اور کنسرٹس، فیشن شوز بھی دکھانے لایا تھا۔ ایک مرتبہ سینما میں مووی بھی دیکھی تھی۔ جسے سمجھنے کے لیے اسے پورا ایک سال بھی لگ جاتا تب بھی سمجھ نہ آتی۔ وہ یہاں کی مشہور جھیلوں کی سیر کرکے بھی آئی تھی۔ مختلف پارکس اسٹورز، شاہرائیں، گارڈنز چھان مارنے کے بعد ایک مرتبہ پھر زندگی پر جمود طاری ہونے لگا تھا۔ محض اس وقت تک، محض اتنی ہی دیر تک جب مردانہ بوٹوں کی دھمک سنائی نہ دیتی۔ عیسیٰ کے آتے ہی زندگی کے رنگ بدل جاتے تھے۔ مالا کا دل... گھڑی کی ٹک ٹک کے ساتھ چلتا تھا۔ جہاں گھڑی آٹھ، نو کے ہندسے پہ آتی اس کا دل پنکھ لگا کر اڑنے لگتا تھا۔ وہ سنہری ہندسوں پر نگاہ جما کر بیٹھ جاتی تھی۔

وہ رَش ڈرائیونگ کرتے ہوئے وقت سے پہلے ہی گھر پہنچ جاتا تھا اور مالا کا بنا میک اپ، بنا ہار سنگھار والا سادہ چہرہ اس کی نگاہوں میں عکس بنانے لگتا۔ کچھ ایسے ہی محبت سے گندھے رشتے میں وہ دونوں ہمیشہ کے لیے بندھ گئے تھے۔

علی عیسیٰ نے مالا کا ایڈمیشن ایک چھوٹے انسٹی ٹیوٹ میں کروادیا تھا۔ اسے مصروف رہنے کے لیے ایک اور جواز مل گیا تھا۔ اب وہ گھر کے کاموں سے فارغ ہوکر انسٹی ٹیوٹ چلی جاتی تھی حالانکہ جرمن زبان سیکھنا کم از کم مالا کے لیے آسان نہیں تھا۔ اسے پہلی کلاس میں پہلے جرمنی کے تعارف پر رونا آگیا تھا۔ وہ اگلے دس دن تک بھی یہ ملک جرمنی ہے کو صحیح جرمن تلفظ کے ساتھ ادا نہیں کرسکتی تھی۔

”یہ ملک جرمنی ہے اور میں پاکستانی ہوں۔“ ٹیچر فرولائن ایکس کی ہزار مرتبہ بتائی ایک لائن کو بھی مالا ٹھیک سے بول نہیں پائی تھی تب اسے رونا آجاتا۔ عیسیٰ کہتا تھا وہ سیکھنا چاہے تو سیکھ سکتی ہے مگر مالا کو یہ کام انتہائی مشکل لگتا تھا۔ وہ گھر آکر ننی کے ساتھ ایک ایک لائن کی سیکڑوں مرتبہ مشق کرتی تھی۔

خوابوں جیسی باتیں

بھولی لڑکی
مت اس خواب کے پیچھے بھاگو
پتھر بن کے رہ جاؤ گی
تیز بہت ہے وقت کا دریا
تم بھی اس میں بہہ جاؤ گی
نشتر جیسی یہ رسوائی
بولو، کیسے سہہ پاؤ گی
کیا بچوں جیسی باتوں سے
تم سب کو بہلا سکتی ہو؟
کیا تم اپنے من کی منطق
دنیا کو سمجھا سکتی ہو؟
خوابوں جیسی باتیں کرکے
کیا تعبیریں پا سکتی ہو؟
جس گھر میں پروان چڑھیں تم
اس کو چھوڑ کر آسکتی ہو؟
ایسی باتیں ناممکن ہیں
تم اپنی تنہائی میں
ہجر کے گیت ہی گا سکتی ہو

از: سیمار رضا ردا' کراچی

یہ حقیقتاً بہت مشکل مرحلہ تھا مگر مالا کو یہ سب کرنا ہی تھی۔ اپنے لیے نہیں...... محض علی عیسیٰ کے لیے۔

یہاں قریب ہی ایک ٹاؤن شولے بھی تھا یعنی ڈانس سکھانے والا اسکول۔ مالا کے گھر سے کچھ فاصلے پر ہی تھا۔ یہاں چھوٹے چھوٹے بچے اپنی ماؤں کے ساتھ آتے جاتے دکھائی دیتے تھے۔ مالا کو بچوں کے ساتھ خصوصی لگاؤ تھا مگر وہ ان بچوں کو مخاطب نہیں کرسکتی تھی۔ انسٹی ٹیوٹ آتے اور جاتے

ہوئے اس کی واحد مصروفیت بس یہی تھی۔

شروع میں علی عیسیٰ اسے خود چھوڑنے اور لینے آتا تھا مگر اب وہ خود ہی پیدل آتی جاتی تھی۔ انسٹی ٹیوٹ چونکہ قریب ہی تھا۔ پہلے کچھ دن نینی ساتھ آجاتی تھی مگر اب مالا... کو گھر کے راستے ازبر ہوچکے تھے۔

اس کی عادت تھی، وہ جس چیز کو سیکھتی، جس لفظ کو یاد کرلیتی اسے ڈائری میں لکھ لیتی تھی اور واپس آنے تک اسے ذہن میں دُہراتی رہتی۔ مالا نے ابتدائی جملوں کے بعد ایک خاص قسم کا جملہ سیکھا تھا۔

”اِش لیپے دیخ۔“ وہ اس جملے کی کئی مرتبہ مشق کرتی تھی تاکہ اسے بھولے نہیں۔ اسے ڈچ میں یہ لائن بولنا بہت پسند تھا۔ جس کے معنی تھے میں تم سے پیار کرتا ہوں یا تم سے پیار کرتی ہوں۔ مالا نے سوچ رکھا تھا جس دن عیسیٰ کا برتھ ڈے ہوگا وہ اسے کسی انوکھے طریقے سے وش کرے گی۔ وہ عیسیٰ کی سالگرہ کے دن کا شدت سے انتظار کررہی تھی پھر یہ دن پورے تین ہفتوں بعد بالآخر آہی گیا تھا۔

اس نے اور حبیب چاچو نے پورا دن چپکے، چپکے تیاری کرنے میں گزار دیا تھا۔ وہ دونوں عیسیٰ کو سرپرائز دینا چاہتے تھے۔ چاچو کی خواہش تھی کہ اس موقع پر مون بھی شامل ہو مگر مالا کو امید نہیں تھی کہ مون ان کی خوشیوں میں شریک ہوگی مگر وہ چاچو کو روکنا نہیں چاہتی تھی۔ چاچو نے خوشی، خوشی مون کو فون کال کی تھی پھر جانے اس نے کیا کہا تھا جو چاچو بے ساختہ خوش ہوگئے تھے۔ ان کی خوشی محسوس کرکے مالا کو اندازہ ہوگیا تھا مون نے یقیناً آنے کی ہامی بھرلی ہے۔ وہ اگرچہ حیران تھی کہ مون نے کیسے آنے کی ہامی بھرلی؟ مگر وہ اپنی حیرت چاچو پر واضح نہیں کرنا چاہتی تھی اور یہ بھی حقیقت تھی کہ مون کے آنے کا سن کر کہیں اندر اس کے دل میں خوف پنپنے لگا تھا لیکن وہ اپنے اس خوف کو بھی چاچو پر منکشف کرنا نہیں چاہتی تھی۔

پھر یوں ہوا کہ بھیگتی ہوئی مہکی ہوئی یہ انوکھی شام ان کے خوب صورت گھر میں اتر آئی تھی۔ مالا نے آج تانتے کی دی ہوئی خوب صورت روک پہنی تھی۔ آج اس نے خوب دل سے میک اپ بھی کررکھا تھا پھر چاچو نے اس کی خوب تعریف بھی کی۔ وہ آج ایک مکمل ہاؤس فراؤ لگ رہی تھی۔ نینی کے تعریفی جملے اور پھر علی عیسیٰ کی میٹھی نگاہوں نے مالا کو بتادیا تھا کہ آج کی محنت وصول ہوگئی ہے۔

کچھ دیر بعد مون بھی چلی آئی۔ ریشمی سلک کا لمبا فراک پہنے، وہی نزاکت، وہی حسن، وہی دلکشی کے ساتھ غرور سے تنی گردن، اس کے بلونٹ ..... (سنہرے بال) آج بھی کھلے تھے۔ نیچے سے کھلے اور اوپر نگینوں سے بجی پونی میں جکڑے۔ سر پہ تاج نما کلپ بالوں میں کھبویا ہوا تھا۔ یہ کراؤن اس کے غرور کو کچھ اور واضح کرتا تھا۔ اس کی آنکھیں آج بھی جھکی تھیں۔ عجیب تر آنکھیں اور حسین تر آنکھیں۔ ہمیشہ کی طرح مالا کے دل کو کچھ ہونے لگا تھا۔

آج علی عیسیٰ بھی بہت خوش تھا گویا اس کی فیملی آج کی شام مکمل ہوگئی تھی۔ یہ چھوٹا سا گھریلو فنکشن تھا۔ کیک کٹنے کے بعد مالا اور نینی ڈنر سرو کررہی تھیں جب ایک اجنبی گھنٹی نے ان سب کو چونکا دیا تھا۔ علی عیسیٰ بڑی ترنگ کے عالم میں گیٹ تک گیا۔ کچھ دیر بعد اس کی واپسی ہوگئی تھی۔ عیسیٰ کے ہاتھ میں ایک خوب صورت گفٹ پیک تھا۔ اس نے مالا کی طرف وہ پیکٹ بڑھادیا۔ مالا کچھ حیران اور کچھ متوحش ہورہی تھی بھلا عیسیٰ نے اسے پیکٹ کیوں پکڑایا تھا؟ اب سب کی نگاہیں خود پر جمی دیکھ کر مالا کو گفٹ پیک کھولنا پڑا تھا۔ پیکٹ میں سے ایک نقلی نگینوں کا بریسلیٹ نکلا تھا۔ اس کے ساتھ ایک چکنی خوب صورت سلپ بھی تھی۔ خالصتاً اردو میں لکھی گئی۔

”پیاری میڈیشن مالا! تمہارے لیے حقیر سا

گفٹ۔ تم بواریا آئیں اور چلی گئیں مگر تمہاری یادیں کبھی مٹ نہ پائیں گی۔“ مالا سے سلپ کے نیچے لکھا نام پڑھا نہ گیا تھا کیونکہ سلپ عیسیٰ نے محتاط سے انداز میں بے ساختہ مالا کے ہاتھ سے اچک لی تھی۔ مالا کو لگا اس کا ذہن ایک دم گول، گول گھومنے لگا ہے۔

”کیا کچھ غلط ہونے والا تھا؟“ مالا کا چڑیا جتنا دل سہم، سہم گیا۔ ایک خوف کی بھیانک لہر تھی جس نے مالا کو کپکپا کررکھ دیا تھا۔

چکنی خوب صورت سلپ اسے کسی اژدھے کے مانند لگ رہی تھی اور مون کی نگاہوں میں شارک جیسی شکاری تیز لپک اس کے وجود میں آر پار ہورہی تھی۔

”کیا ہونے والا تھا؟ اور کیوں ہونے والا تھا؟ کیا ضروری تھا بواریا کے چھوٹے سے قصبے میں رہنے والا کوئی بھی فرد اسے پارسل بھیجتا؟ ابھی چند دن پہلے ہی تو وہ بواریا سے آئی تھی پھر کسے اس کی یاد اس قدر شدت سے آئی، جس نے گھر کے پتے پر گفٹ بھیج دیا تھا اور پھر اس چکنی بھیانک سلپ پر لکھے الفاظ ”تم بواریا آئیں اور چلی گئیں مگر تمہاری یادیں کبھی مٹ نہ پائیں گی۔“ مالا کی گویا سانسیں رکنے لگی تھیں۔ ان الفاظ کے نیچے بھلا کس کا نام ہوسکتا تھا؟ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا اچھا گیا۔

”سوزن؟ تانتے؟ گروبی مگر ان لوگوں کو گفٹ بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟ پھر بھلا پارسل بھیجنے والا کون تھا؟ جس کی طرف مالا کی چھٹی حس اشارہ کررہی تھی وہ اس کے بارے میں کم ازکم اس کنڈیشن میں کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ آفاق؟“ اس کا دل خوف کے عالم میں پھڑ پھڑانے لگا اور جسم سے گویا جان نکلنے کے قریب تھی۔ یہ نام اس کے لیے اب اجنبی نہیں تھا۔ وہ آفاق کو اتنا جان گئی تھی جتنا کسی بھی اجنبی کو جاننا ضروری تھا مگر سوال تو یہ تھا کہ آفاق نے اسے تحفہ کیوں بھیجا۔ آفاق کی بھلا ایسی جرأت کیوں ہوئی؟ اس کا آفاق سے رشتہ ہی کیا تھا جو وہ اتنی دیدہ دلیری سے اسے گفٹ بھیج رہا تھا۔

دل چاہ رہا تھا وہ نقلی نگینوں سے سجا بریسلیٹ اٹھا کر اس چرب زبان، شاطر لڑکے کے منہ پر مار آئے اور ایسی بے نقط سنا کر آئے کہ اپنی ساری تیزی طراری اور چرب زبانی بھول جائے۔ اس کے دل میں آفاق کے خلاف کچھ ایسا ہی غصہ اور نفرت ابھر رہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا کوئی تیزاب سے بھری بوتل ہو تو مالا نتائج کی پروا کیے بغیر اس کے منہ پر الٹ آئے۔ آفاق نے مالا کو تحفہ بھیج کر کچھ ایسا ہی گناہ تو کیا تھا حالانکہ یورپ میں تحائف کے لین دین کو بہت اچھا سمجھا جاتا تھا اور گفٹ دے کر یا لے کر کوئی غلط قسم کا خیال یا وسوسہ بھی دل میں نہیں پنپتا تھا مگر مالا جس معاشرے سے آئی تھی جس وطن سے تعلق رکھتی تھی یا جس سوسائٹی سے اٹھ کر آئی تھی وہاں انجان لوگوں کی طرف سے ملنے والے تحفے کیسی، کیسی قیامت ڈھا دیتے ہیں۔ وہ گفٹ لینے اور دینے کے معاملے میں بہت محتاط تھی۔ اس کی کوئی غیر ضروری سہیلیاں بھی نہیں تھیں۔ یہاں پر بھی وہ صرف سوزن کے ساتھ دوستانہ جوڑنے کی خواہش مند تھی مگر یہ آفاق نہ جانے بیچ میں کہاں سے ٹپک آیا تھا۔ محض چار گھنٹے کے سفر کا فائدہ اٹھا کر اپنی چرب زبانی کا مظاہرہ کرکے مالا کی ذہنی سطح پر مثبت تاثر چھوڑنے کے بعد اب جانے کیسے تعلقات بحال کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تو شرارے پھوٹنے لگے تھے۔ جی چاہ رہا تھا کہ آفاق کا منہ طمانچوں سے رنگ دے مگر وہ اپنے کسی بھی ارادے کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکتی تھی۔

اس وقت صورت حال بھی کچھ ایسی ہی تھی کہ مالا کو اپنا آپ انتہائی کمتر لگ رہا تھا۔ بھلا اس کے بارے میں حبیب چاچو کیا سوچتے؟ علی عیسیٰ کے دل میں کس قسم کے خیال آسکتے تھے؟ وہ ایسی کردار کی ہلکی یا مردوں سے فری ہونے والی تھی جو چار پانچ گھنٹے کے سفر میں ایک غیر مرد سے دوستانہ جوڑ چکی تھی جس

نے چند ہی دن بعد۔۔ تجدیدِ تعلقات کے لیے پہلا تحفہ بھیج دیا تھا؟ مالا کا شرم کے مارے برا حال تھا۔

ایک لمحے میں جانے اس پر کیسی، کیسی قیامتیں گزر گئی تھیں۔ شاید سے بدلنے والا تھا اور اس پر مہربان ہوئی تقدیر اپنا پانسہ الٹ رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں کی مکھیں ایسی طاقت ور نہیں تھیں جو بدلتے سمے کی نبض جان جاتیں۔ زندگی مالا ذوالفقار پر شاید تنگ ہونے والی تھی مگر جانے کیسے اس کی سماعتوں نے کچھ ایسا سنا جو اس کی سوچوں سے قطعاً الگ اور انوکھا تھا۔ وہ حیرت سے منجمد ہوتی حسیب چاچو کو ٹکر ٹکر دیکھنے لگی۔ حسیب چاچو یہ کیا بول رہے تھے؟ یا مالا کے وجود میں نئی روح پھونک رہے تھے یا سانس کھینچ رہے تھے۔

’’تمہارا اس شہر میں کون سا ایسا دوست ہے جس نے تمہیں برتھ ڈے گفٹ بھیج دیا؟‘‘ چاچو بہت حیرانی کے عالم میں علی عیسیٰ سے مخاطب تھے اور مالا کو لگا تھا اس کے اندر کچھ ٹوٹ گیا ہے۔ جانے اب علی عیسیٰ کون سا جواب دینے والا تھا؟ مالا ابھی تک سن کھڑی تھی۔

’’یہ عورتوں والا بریسلیٹ میرے لیے نہیں آیا۔‘‘ علی عیسیٰ نے سلپ ایک مرتبہ پھر مالا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

’’تو پھر؟‘‘ چاچو حیران ہوئے تھے۔ ان کے چہرے پر اچنبھا تھا۔

’’یہ گفٹ مالا کے لیے آیا ہے شاید سوزن نے بھیجا ہے۔ اپنا نام لکھنا بھول گئی۔‘‘ علی عیسیٰ اب وضاحت کر رہا تھا۔ اس کا چہرہ پہلے کی طرح نارمل تھا۔ وہاں برہمی کے آثار نہیں تھے۔ علی عیسیٰ کا جواب سن کر جہاں چاچو اور مالا کے اندر سکون کی لہریں اٹھی تھیں وہیں مالا نے غور کیا تھا کہ مون پہلو بدل کر رہ گئی ہے۔ اس کے چہرے پر پھیلے تاثرات سمجھنا آسان نہیں تھا۔ عموماً مون کا چہرہ سپاٹ ہوتا تھا ہر قسم کے تاثرات سے عاری۔

مالا کو حیرانی اس وقت زیادہ ہوتی تھی جب مون، چاچو اور عیسیٰ کو جو بھی کہتی وہ بلا چوں وچرا مان جاتے۔ اکثر وہ دعویٰ کرتے کہ اب مون آئی تو اسے زبردستی روک لیں گے مگر جب اس سے روبرو بات کی جاتی تو وہ ان دونوں باپ بیٹے پر کوئی ایسا سحر پھونکتی تھی کہ دونوں ایسے بے بس ہو جاتے گویا کبھی اس کے سامنے بول ہی نہ پائیں گے۔ نہ بولنے کی جرأت کر سکیں گے۔ نہ اپنی بات کبھی مون سے منوا سکیں گے۔ اس کے چلے جانے کے بعد بھی بہت سارے دن چاچو ایسے ہی بے بس رہتے۔

مون کی ایک اضافی خوبی یہ بھی تھی کہ وہ باپ اور بھائی سے جھگڑا نہیں کرتی تھی۔ چیختی تھی نہ چلاتی تھی۔ نہ غصے کا اظہار کرتی تھی۔ شاید مالا کے آنے سے پہلے وہ ایسا بھی کرتی رہی ہو مگر فی الحال ایسا کچھ نہیں تھا۔ وہ ڈانٹ ڈپٹ، روک ٹوک، دھمکی، ملامت، غصہ اور بدزبانی کے بجائے لفظوں کے تیر پھینکتی تھی وہ بھی شہد میں ڈبو ڈبو کر۔ ویسے بھی جو شیرینی سے گھائل ہونے والے تھے انہیں زہر بھلا کیا دینا تھا۔ اسے مقابل کو تنگ، عاجز، لاچار..... اور زچ کرنا بخوبی آتا تھا۔ وہ کم بولتی تھی دوسروں کی طرف کم دیکھتی تھی عموماً لوگوں سے ملتی بھی نہیں تھی۔ وہ حقیقت میں مالا کی زندگی میں آنے والا بے انتہا عجیب کردار تھی۔

پاپا نہیں جانتے تھے، عیسیٰ نہیں جانتا تھا بلکہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا مون کس قدر انا پرست، خود پسند، تنتم مزاج، کینہ پرور اور حاسد لڑکی تھی۔ کوئی اس کے باپ کی اور بھائی کی محبتوں میں حصے دار بن آیا تھا۔ وہ بھی اس کی مرضی اور چاہت کے بغیر...... بھلا یہ کوئی معمولی بات تھی؟ اس کے اندر لگی آگ کے شعلے آہستہ آہستہ باہر آ رہے تھے۔ وہ غیر محسوس طریقے سے اب آگ کا کھیل رچانے والی تھی۔

اسے آگ سے کھیلنا پسند تھا چاہے خود جلتی یا دوسروں کو جلاتی۔ بعض لمحے خنجر کی دھار جیسے ہوتے ہیں۔ غلط فیصلہ ہو جائے تو ان کی کاٹ سے نہ جان بچتی ہے اور نہ ایمان بچتا ہے اور اب چاہے بازی جان کی لگتی یا ایمان کی وہ اپنے فیصلے سے ہٹنے والی نہیں تھی۔

دراصل خود کو ہر لحاظ سے عقلمند، ہوشیار اور چالاک سمجھنے والے ہی اکثر خطا کھاتے ہیں اور جان سے بھی جاتے ہیں۔ شاید مون انہی لوگوں میں سے تھی بغیر نتائج کی پروا کیے سر دھڑ کی بازی لگا دینے والی...... مون چونکہ فطرتاً غیر معمولی ذہانت رکھنے کے ساتھ بہت عجیب لڑکی تھی اور اس کی قوتِ مشاہدہ بھی کمال کی تھی سو وہ ایک ہی نظر میں بندے کے اندر کا احوال پڑھ آتی تھی۔ اسے ذہن کھوجنے میں انتہا کی حد تک کمال حاصل تھا۔ مون نے کہیں پڑھا تھا کہ انسان کا بہترین مطالعہ، انسان ہی کا مطالعہ ہے جانے یہ لفظ اس کی سوچ میں کہاں سے آ کر جم گئے تھے۔ شاید اسی ایک لمحے کی گرفت مضبوط ہونے پر اس نے کتابیں آرام سے اٹھا کر اپنے باپ اور بھائی کے کتب خانے میں سجا دی تھیں۔ اس نے کتاب کا مطالعہ چھوڑ کر انسانوں کے ذہن پڑھنے شروع کر دیے تھے۔ اسے غیر فطری کاموں میں مزہ آتا تھا حالانکہ علم کی طلب عبادت اور اس کی تلاش جہاد ہے جب اس نے عبادت اور جہاد کے مفہوم پر غور کرنا چھوڑ دیا تب وہ منزل، منزل بھٹکنے لگی۔

جبھی اس غیر فطری عجیب لڑکی نے اس حسین شام کے اس سنہرے پل دو لوگوں کے ذہنوں کو لمحے کے ہزارویں حصے میں چھانی کی طرح چھان لیا تھا تب اس پر ایک برا سا انکشاف ہوا یعنی اعتبار کا انکشاف، اعتماد کا انکشاف اور شاید محبت کا بھی تو گویا ایک لاوارث پارسل ملنے پر اس کا بھائی بڑے اطمینان سے جواب پیش کر رہا تھا۔

’’شاید سوزن نے بھیجا ہے، اپنا نام لکھنا وہ بھول گئی۔‘‘ علی عیسیٰ کے اعتبار کی کوئی حد بھی تھی۔ اتنا اندھا اعتماد، ایسی اندھی محبت تو گویا بوار یا کے چھوٹے سے قصبے میں دور اتیں گزارنے والی علی عیسیٰ کی بیوی کو کوئی بھی اجنبی اپنا نام لکھے بغیر تحفہ ہی نہیں بھیج سکتا تھا۔ یہ علی عیسیٰ کے اعتبار کی انتہا تھی۔

پھر یوں ہوا کہ یہ سنہری شام بنا بدمزگی کے بہت سُبک خرامی سے گزر گئی۔ کھانے کے بعد ہمیشہ کی طرح مون نے مصروفیت کے کئی بہانے کیے اور چاچو بے چارے بے بس مون کو جاتا دیکھتے رہے۔ عیسیٰ اسے روکنا چاہتا تھا مگر روک نہیں پایا۔

وہ گفٹ والا پارسل رات بھر مالا کے ذہن میں کھلبلی مچائے رہا تھا حالانکہ چاچو اور عیسیٰ نے دوبارہ کوئی سوال نہیں اٹھایا تھا بلکہ سوزن کے بھیجے تحفے کی خوب تعریف بھی کی تھی۔ تاہم مالا اپنے ذہن اور دل کو مطمئن نہیں کر پائی تھی۔ اس کا ذہن کئی حصوں میں الجھا ہوا تھا۔ کبھی خیال آتا محض دو ہفتے گزرنے کے بعد سوزن کو گفٹ بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟ کبھی وہ دل کو تسلی دے لیتی کہ یقیناً سوزن نے ہی گفٹ بھیجا ہوگا مگر رات بھر اتنی خوشگوار شام گزارنے کے باوجود بھی اسے ٹھیک سے نیند نہیں آئی تھی۔

☆☆☆

بڑی مضمحل سی صبح طلوع ہوئی تھی، عجیب سی پژمردگی سے بھری۔ انتہائی ست، ست...... مالا کا بستر چھوڑنے کو دل نہ چاہ رہا تھا مگر وہ علی عیسیٰ کو آفس بھیجنے کے لیے تیاری میں مدد کروانا بھی چاہتی تھی گوکہ عیسیٰ نے کبھی اسے فورس نہیں کیا تھا نہ تنگ کیا تھا کہ وہ اپنی نیند خراب کر کے عیسیٰ کو ناشتا بنا کر دے یا دوسرے چھوٹے موٹے کام کرے۔ یہ سب مالا کے اپنے دل کی خوشی تھی۔ وہ عیسیٰ سے اتنی محبت کرتی تھی کہ اس کا بس چلتا تو رات کو بھی نہ سوتی بلکہ چپکے، چپکے قریب بیٹھ کر اس کے نقوش حفظ کرتی رہتی اور عیسیٰ میٹھی نیند میں گم رہتا۔

وہ ناشتے سے فارغ ہوکر بھی عیسیٰ کو خوب صورت طریقے سے سی آف کرکے سرخ گلابوں کے گارڈن میں کھڑی پھولوں کی روح میں اترنے والی خوشبو کو سینے میں اتار رہی تھی۔ اسے کل شام کے مناظر یاد آرہے تھے۔ کل عیسیٰ کی سالگرہ جو تھی۔ وہ پورا دن مصروف رہی تھی۔ چاچو اور وہ دونوں ایک چکر مارکیٹ کا بھی لگا کر آئے تھے۔ اپنی طرف سے وہ اس کے لیے سرپرائز پلان کررہے تھے۔

پھر یوں ہوا کہ چاچو کی ڈھیروں بوکھلاہٹوں کے باوجود کھانا وقت پر تیار ہوگیا تھا۔ سب سے زیادہ حیرانی تب ہوئی جب عیسیٰ وقت سے پہلے گھر آگیا۔ مالا تو کیا نمی اور چاچو بھی حیران رہ گئے تھے حالانکہ کچھ دیر پہلے چاچو، مالا کو بتارہے تھے کہ عیسیٰ کو کبھی اپنا برتھ ڈے یاد نہیں رہا۔ بچپن سے لے کر آج تک وہ ہمیشہ اسی اہم دن کو بھول جاتا ہے اور یہ بھی کہ عیسیٰ کی سالگرہ پر اتنا اہتمام نہیں ہوتا بس کیک کاٹا جاتا ہے جبکہ مالا نے عیسیٰ کو سرپرائز دینے کے لیے بہت اہتمام کررکھا تھا اور وہ دونوں بہت خوش بھی تھے کہ عیسیٰ ایک دم سرپرائز ڈ رہ جائے گا مگر ان سب کو حیرت کا جھٹکا تب لگا جب عیسیٰ اپنے موبائل پر یہ رنگ ٹیون سیٹ کرکے ہنستا مسکراتا اندر داخل ہوا۔

''آج ہماری سالگرہ ہے ناں، دیکھو ہم کو یاد ہے ناں۔'' وہ برابر مسکراتا ہوا گنگنا رہا تھا جبکہ چاچو تو کیا مالا بھی ہونق رہ گئی تھی تو گویا یہ سارے اہتمام میں سرپرائز کا پہلو کہیں سے بھی نہ نکلا تھا۔ وہ حضرت اپنی سالگرہ کے دن کو خوب یاد رکھے ہوئے تھے۔ مالا کی اتری صورت دیکھ کر چاچو فوراً تنک کر بول اٹھے تھے۔

''پچھلے تئیس سالوں میں تو تمہیں سالگرہ کا دن کبھی یاد نہیں رہا۔ آج بائیس، تئیس سال بعد کیسے سالگرہ کا دن یاد آگیا؟'' چاچو بھی سرپرائز کرکرا ہونے کی وجہ سے سخت بدمزہ ہورہے تھے۔ ان کے رو کھے، طنزیہ لب و لہجے کو سن کر عیسیٰ قطعاً حیران ہوتا ہوا بولا تھا بلکہ انتہا درجے کا حیران نظر آرہا تھا۔

''میں تو خود حیران ہوں، پندرہ بیس منٹ پہلے مجھے قطعی طور پر اپنی سالگرہ یاد نہیں تھی پھر اچانک میرے ذہن میں خیال آیا، یوں سمجھیں کلک سے کچھ روشن ہوا تھا اور میرے سامنے سالگرہ کی ڈیٹ آگئی۔'' وہ اپنی حیرانی کا اظہار بہ آواز بلند کررہا تھا۔ مالا بھی ایک دم ٹھٹک گئی تھی حالانکہ اس میں ٹھٹکنے والی کوئی بات نہیں تھی۔ اکثر اچانک بے خیالی میں پرانی اور بھولی ہوئی باتیں یاد آجاتی ہیں۔ علی عیسیٰ کو بھی سالگرہ یاد آگئی سو اس میں اتنا حیران ہونے کی ضرورت نہیں تھی مگر جس چیز نے مالا کو ٹھٹکایا تھا وہ چاچو کے کرب انگیز تاثرات تھے۔ ان کے چہرے پر ایک دم صدیوں کی ..... تھکن اتر آئی تھی۔ وہ لمحوں میں بہت تھکے، تھکے، پژمردہ اور نڈھال نظر آنے لگے تھے۔ آخر چاچو کو کیا ہوا تھا؟ مالا زیادہ دیر سوچ بھی نہیں سکی تھی، چاچو کی تھکی، تھکی خود کلامی نے اسے اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا وہ گویا علی عیسیٰ اور مالا کو نظر انداز کیے خود سے مخاطب تھے۔

''تو یہ کارستانی مون کی ہے۔ اس سے مالا کی چھوٹی سی خوشی بھی برداشت نہیں ہوسکی۔ میں مون کو نہ ہی بتاتا کہ مالا نے عیسیٰ کی سالگرہ کا اہتمام کررکھا ہے۔ اسے سرپرائز دینے کے لیے۔'' ان کی آواز عجیب سی تکلیف میں بھیگ رہی تھی۔ چہرے پر دکھ کے سائے لہرا رہے تھے۔ وہ بہت اذیت میں نظر آرہے تھے گویا مون کے عمل نے ان کے دل کو سخت ٹھیس پہنچائی تھی۔ جانے مون نے کیا، کیا تھا؟ ٹیلی فون کرکے عیسیٰ کو اطلاع دے دی تھی یا کسی اور ذرائع سے مطلع کردیا تھا؟

''مون نے فون تو نہیں کیا، یہ تو اچانک ہی میرے ذہن میں خیال آگیا.....'' عیسیٰ بھی کچھ بولتے، بولتے ایک دم ٹھٹک کر چپ ہوگیا تھا۔ گویا اسے بھی کچھ خیال سا آیا یا کچھ یاد سا آیا۔ اس کے لب سختی سے بھینچ گئے تھے کبھی نہ کھلنے کے لیے۔ وہ غصے کو شدید ضبط کررہا تھا۔ اس کا چہرہ لمحوں میں رنگ بدل گیا۔ آخر ان باپ بیٹے کو ہوا کیا تھا؟ مالا ناسمجھی کے عالم میں حق دق کھڑی تھی۔

''ہاں تو اس نے اپنا کوئی تجربہ کرلیا ہوگا تم پر، بس ہم ہی دونوں نہیں مانتے، زمانہ تو سارا کہتا ہے میری بیٹی غیر معمولی صلاحیتوں کی مالک ہے۔'' حسب چاچو کی آواز میں اب بھی گہرا کرب ہلکورے لے رہا تھا حالانکہ اگر ان کی بیٹی غیر معمولی صلاحیتوں کی مالک تھی تو اس بات پر انہیں فخر کرنا چاہیے تھا مگر یہ اداسی نہ جانے کیوں تھی؟ شاید مالا کا سرپرائز خراب ہوجانے کی وجہ سے...... مالا کچھ سمجھ نہیں پائی تھی اور اپنی عقل کے مطابق خود کو دلیل دے کر مطمئن بھی کرچکی تھی پھر یوں ہوا کہ علی عیسیٰ نے صورتِ حال کو سنبھال لیا۔ وہ اس وقت متعنی خیز کثیف ماحول کو اپنی ہنسی اور چٹکلوں سے بدل چکا تھا۔ کچھ دیر بعد مون بھی آگئی تھی اور محض مون کے چلے آنے سے اس کا باپ اور بھائی اتنے خوش ہوئے کہ سابقہ ناراضی یا غصہ انہوں نے فوراً بھلا دیا تھا۔ شاید یہ ماحول ایسا ہی سازگار یا خوشگوار رہتا مگر اس پارسل کی وجہ سے ایک مرتبہ پھر بدمزگی ہوتے، ہوتے رہ گئی تھی۔ اگر عیسیٰ اس پارسل پر ہنگامہ کھڑا کردیتا یا بے نام سی اس سلپ پر لکھے الفاظ کو دیکھ کر مشکوک ہوجاتا یا پھر وہ سرے سے سمجھتا ہی نہیں کہ یہ پارسل سوزن نے بھیجا ہے۔ وہ اگر شک میں مبتلا ہوجاتا تب بھلا مالا کیا کرسکتی تھی؟ اسے کیسے یقین دلاتی؟ عیسیٰ کو کیسے مطمئن کرتی؟ اس وقت تو بات آئی گئی ہوگئی نہ عیسیٰ کھوج میں پڑا اور نہ ہی چاچو نے تفتیش کی مگر مالا اپنی چھٹی حس کا کیا کرتی جو اسے کسی انہونی سے ڈرا رہی تھی۔ وہ اس پارسل پر اب مطمئن نہیں تھی اور عیسیٰ کے دفتر چلے جانے کے بعد مسلسل اسی پہلو پر غور کررہی تھی جب چاچو کی آواز نے اسے بوکھلا دیا تھا۔

''مالے! کیا تم بھی عیسیٰ کے ساتھ چلی گئیں؟'' چاچو کی شوخ آواز سن کر وہ دوڑتی ہوئی واپس لاؤنج میں آئی تھی۔ چاچو گلاسز لگائے اخبار پڑھنے میں مصروف نظر آرہے تھے مگر ان کا دھیان مالا کی طرف ہی تھا جو انہیں کچھ الجھی، الجھی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی الجھن کو جان بوجھ کر نظر انداز کرتے وہ مسکرا کر چھیڑ رہے تھے۔

''میں سمجھا تھا کہ عیسیٰ نے تعریفی ڈائیلاگز کچھ طویل کردیے ہیں! تبھی میری بیٹی واپس آنا بھول گئی۔'' ان کے چہرے پر صاف شرارت نظر آرہی تھی۔ وہ اسے دن بھر میں کئی طرح سے ستاتے اور تنگ کرتے تھے خصوصاً اس وقت جب وہ پورے دل سے عیسیٰ کے انتظار میں گھڑی پر نگاہ جمائے بیٹھی ہوتی تھی اور چاچو آتے جاتے اسے جتانا نہ بھولتے تھے۔

''ابھی تین گھنٹے رہتے ہیں مالے، اتنی دیر میں کوئی فیشن شو ہی دیکھ لو۔'' گھڑی کی طرف بڑھتا اس کا انہماک دیکھ کر وہ کچھ نہ کچھ ضرور بولتے تھے اور مالا بُری طرح جھینپ جاتی تھی۔ کبھی، کبھی وہ اس قدر ٹائم پیس پر نگاہ جما کر کھو جاتی تھی کہ چاچو اندر سے الارم والا گھنٹا اٹھا لاتے تھے پھر چاچو کی ہنسی اور مالا کی شرمندگی کا دورانیہ طویل ہوجاتا تھا۔ جب اس نے محسوس کیا کہ چاچو اس کی حرکتوں سے خاصے محظوظ ہوتے ہیں تب مالا نے گھڑی پر چپکے، چپکے نگاہ رکھنی شروع کردی تھی اور اس کے علاوہ مالا نے نئی انتظار کی مصروفیت ڈھونڈلی تھی یعنی لاؤنج سے گیٹ تک کے بے مقصد چکر اور یہ کام وہ چاچو کے سامنے بھی کرلیتی تھی حالانکہ چاچو کی زیرک نظروں سے کچھ بھی چھپا نہ رہتا تھا۔ نہ اس کی بے تابی، نہ اس کی بے قراری۔ سو وہ بھی نئے، نئے انداز سے مالا کو زچ کرتے۔

''کیوں جوتے گھسا رہی ہو بیٹا۔ عیسیٰ اپنے وقت پر ہی گھر آئے گا۔'' وہ مالا کے پیچھے ہی باہر

آجاتے تھے۔ اسے محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے حالانکہ مالا کی عیسیٰ کے لیے بے قراری انہیں دل وجان سے پسند تھی مگر وہ نہیں چاہتے تھے کہ مالا فضول میں چکر لگا کر تھکتی رہے اور مالا کی ڈھٹائی بھی اس لمحے عروج پر ہوتی تھی۔

"میں تو واک کر رہی ہوں چاچو آپ بھی اپنے بیٹے کی طرح خاصے خوش فہم ہیں۔" مالا بھی دوبدو جواب دے کر اپنے تئیں انہیں لاجواب کر دیتی تھی مگر چاچو کی آنکھوں میں چھپی شرارت اسے باور کروا دیتی کہ چاچو قطعاً قائل نہیں ہوئے بلکہ خوب زچ کرنے والی نظروں سے دیکھتے رہتے تھے۔

"میرا بیٹا ضرور خوش فہم ہوگا مگر میں نہیں...... یہ بال میں نے دھوپ میں سفید نہیں کیے بیٹا جی۔" چاچو نے ہار ماننا کہاں سیکھی تھی۔ یہ تو علی عیسیٰ تھا جو انہیں لاجواب کر دیتا تھا۔ مالا تو اکثر اپنی کہی باتوں میں خود ہی گرفتار ہو جاتی تھی۔

"یہاں دھوپ نکلتی کہاں ہے چاچو کبھی کبھار اگر موڈ ہوا تو جھلک دکھا دی۔" مالا کو موضوع بدلنے کا موقع مل جاتا تھا اور چاچو اس کی چالاکی پر قہقہہ لگا کر ہنس پڑتے تھے۔

اس وقت بھی وہ مالا کو چھیڑنے کے موڈ میں تھے مگر اس کے چہرے پر پھیلی الجھن دیکھ کر رک سے گئے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے گلاسز اتار کر میز پر رکھے، اخبار بھی سمیٹ دیا پھر اس کا چہرہ کھوجنے والے انداز میں دیکھ کر بولے تھے۔

"کیا بات ہے بیٹا، کوئی پریشانی ہے کیا؟" ان کے لہجے میں گہرا تفکر تھا۔ اس کی چپ انہیں ہولا رہی تھی۔

"نہیں۔" وہ گویا خواب کی کیفیت سے جاگی تھی۔ ایک دم ہڑبڑا کر بولی۔ چاچو پُرسوچ نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے پھر کچھ دیر تک دیکھتے رہے۔ مالا کو ان کی نظروں سے الجھن ہو رہی تھی۔

"مجھے امید ہے میری بیٹی مجھ سے کچھ نہیں چھپائے گی۔" چاچو کی محبت اور مان بھرے لہجے نے اسے بھربھری ریت بنا دیا تھا۔ اسے لگا وہ حقیقت میں چاچو سے کچھ بھی نہیں چھپا سکتی۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے اپنے خدشات تو نہیں البتہ رات والے پارسل کا ذکر ضرور کر دیا تھا جسے سن کر چاچو مطمئن انداز میں بولے تھے۔

"ہاں تو بیٹا تم سوزن کا شکریہ ادا کر دو، اسے کال کر لو۔" اس کی بات سمجھے بغیر انہوں نے وہی بات کہی تھی جو مالا کی خواہش میں شامل تھی۔ وہ سوزن کو فون کرنا چاہتی تھی مگر مالا کے پاس اس کا نمبر نہیں تھا اور مالا کی الجھن سوزن ہی دور کر سکتی تھی۔

"کیا سوزن کا نمبر مل سکتا ہے؟" مالا نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"عیسیٰ کے پاس ہوگا تم عیسیٰ کو فون کر کے نمبر لے لو۔" چاچو کے مشورے نے مالا کو تھوڑا ریلیکس کر دیا تھا۔ وہ سر ہلا کر میز پر سے برتن اٹھانے لگی تھی۔ آج نمی نے نہیں آنا تھا اور ویسے بھی برتنوں کے علاوہ اور کوئی کام بھی نہیں تھا۔ صفائی تو یہاں دو ہفتے بھی نہ ہوتی تو گرد، دھول کا نشان نظر نہیں آتا تھا مگر مالا نے عادتاً پہلے برتن دھوئے پھر کچن صاف کیا اور پھر فارغ ہو کر فون تک آگئی۔ فون کے اوپر ہی عیسیٰ کا نمبر لکھا تھا یقیناً سہولت کے لیے لکھ دیا گیا تھا کہ کسی بھی وقت ضرورت پڑ سکتی تھی۔ مالا نے جھجکتے ہوئے نمبر ڈائل کیا چونکہ یہ عیسیٰ کا پرسنل نمبر تھا سو فون بھی عیسیٰ نے ہی اٹھایا۔ یقیناً وہ گھر کا نمبر دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا تبھی اس نے پہلی بیل پر کال ریسیو کر لی تھی۔

"پاپا تو ٹھیک ہیں؟" اس نے ڈچ میں بہت عجلت بھرے لہجے میں پوچھا تھا۔ یقیناً وہ سمجھا ہوگا کہ نمی نے اسے فون کیا ہے جبکہ دوسری طرف خاموشی محسوس کر کے وہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ فون نمی نے نہیں کیا تبھی ہلکے پھلکے لہجے میں ذرا مسکرا کر بولا۔

"مالے! یہ تم ہو ناں!" علی عیسیٰ کے لہجے میں یقین تھا مالا اسے تنگ کرنے کے موڈ میں نہیں تھی اسی لیے کچھ پھیکی سی آواز میں کہنے لگی۔

"جی! میں ہوں اور بھلا کون ہو سکتا ہے؟"

"اور کوئی بھی نہیں ہو سکتا۔" عیسیٰ گویا کھل کر مسکرا دیا۔ "کہیے ملکۂ عالیہ! فون کس لیے کیا؟" وہ بڑی فرصت سے بات چیت کرنے کے موڈ میں لگ رہا تھا حالانکہ وہ اس وقت بہت مصروف تھا کچھ دیر بعد اسے ایک میٹنگ اٹینڈ کرنا تھی پھر ایک آفیشل لنچ کے لیے نکلنا تھا مگر مالا کی فون کال نے اسے روک لیا تھا۔

"مجھے سوزن کا نمبر چاہیے۔" مالا نے تمہید باندھے بغیر ڈائریکٹ نمبر مانگ لیا تھا۔ شاید وہ محسوس کر چکی تھی کہ عیسیٰ اس وقت خاصا مصروف ہوگا جبکہ وجۂ فون دریافت ہو جانے پر عیسیٰ نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

"ظالم نے یاد بھی کیا تو رقیب کو...... آہ۔" اس کا انداز ایسا مسکین سا تھا کہ مالا کو اتنے کشیدہ سے ماحول میں بھی ہنسی آگئی تھی۔ دراصل اس وقت مالا کے سر پر صرف سوزی سے بات کرنے کی دُھن سوار تھی۔ وہ اپنی پریشانی کم کرنا چاہتی تھی یہ پوچھ کر کہ آیا سوزن نے ہی اسے گفٹ بھیجا ہے یا پھر مالا کسی کی سازش یا شرارت کا شکار ہونے والی تھی۔

"آج لگتا ہے، آپ خاصے فراغت کے موڈ میں ہیں۔" مالا کو کچھ تو بولنا ہی تھا حالانکہ ذہن سوزی میں اٹکا ہوا تھا۔ آنکھوں کے سامنے پارسل اور نقلی نگینوں کا بریسلیٹ ناچ رہا تھا۔ ذہن کہیں تھا اور گفتگو بے ربط سی ہو رہی تھی۔ عیسیٰ نے اس کی...... بے توجہی فوراً نوٹ کر لی تھی۔

"تم ٹھیک تو ہو؟" وہ فوراً پریشان ہو اٹھا تھا اور اس کی پریشانی محسوس کر کے مالا کو سنبھلنا ہی پڑا۔

"مجھے کیا ہونا ہے اکچوئلی، انناس کی پڈنگ بنا رہی ہوں سو ذہن کچن کی طرف چلا گیا۔" مالا کو اپنی بے دھیانی کا جواز پیش کرنے کے لیے بروقت بہانہ مل گیا تھا۔

"او...... تو یعنی آپ معدے سے ہو کر دل میں براجمان ہونے کا پورا پورا منصوبہ بنائے ہوئے ہیں۔" عیسیٰ نے مسکرا کر اسے چھیڑا تو مالا خاصے اعتماد سے دوبدو بولی۔

"دل میں براجمان تو ہم ہو چکے، ایسی کوششیں تو بس محبت کو اور بڑھانے کے لیے کی جاتی ہیں۔" اتنے عرصے میں بلکہ شادی کے بعد مالا کی طرف سے پہلا خوب صورت اظہار عیسیٰ کی روح تک کو شانت کر گیا تھا تبھی وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"ماروِلس۔" عیسیٰ نے ہنسی کے دوران ہی ذرا رک کر کہا تھا پھر تھوڑی عجلت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ "دل تو چاہ رہا ہے تم سے تھوڑی اور لمبی بات کروں، ابھی میں تمہی کو سوچ رہا تھا، تمہی کو یاد کر رہا تھا۔ دل چاہتا ہے کہ اس دل کو پنکھ لگیں اور اڑتا ہوا تمہارے پہلو میں جا گرے مگر یہ غمِ روزگار......" عیسیٰ کو پٹڑی سے اترتا دیکھ کر مالا جلدی سے سنبھل گئی تھی اور جو بے چارہ سا دل تھا، عیسیٰ کی بات کے مفہوم میں الجھتا دھڑک، دھڑک کر بے حال ہو رہا تھا۔

"ویسے ایک بات کہوں؟" سوزن کا نمبر لکھوا کر عیسیٰ نے فون رکھنے سے پہلے ذرا تنگ کرنے والے انداز میں مالا کو چھیڑنے کی کوشش کی تھی۔ وہ جو فون رکھنے لگی تھی، عیسیٰ کی بات سن کر رک سی گئی۔

"رقیبوں کو فون کر رہی ہو، ذرا دھیان سے۔" وہ اسے چھیڑ رہا تھا یا تنبیہ کر رہا تھا۔ مالا سمجھ نہیں پائی تھی مگر وہ خود کو کچھ بولنے سے روک نہیں پائی تھی۔ ایک دم آفاق کی باتیں یاد آنے لگیں۔ یہ اللہ نے اوپر جو کھوپڑی نما میموری باکس بنا رکھا ہے یہاں سارا ڈیٹا ایک دم سیف ہو جاتا ہے کبھی کمپیوٹر کی خرابی کے باعث بھول چوک

ہوجاتی ہے تاہم ڈیٹا ڈیلیٹ ہرگز نہیں ہوتا۔ کچھ دن بعد یادداشت کے خانوں سے پٹ پٹ باتیں نکل کر گرنے لگتی ہیں۔ جیسا کہ ابھی عیسیٰ کی چھیڑ چھاڑ نے اسے آفاق کی باتیں یاد دلادی تھیں۔ سوزن کی عیسیٰ کے لیے محبت، عیسیٰ کی ماں کے سوزن جیسی اچھی لڑکی کے لیے جذبات، عیسیٰ کی شرط اور پھر سوزن کا انکار۔ اس نے محبت پر مذہب کو ترجیح دی تھی۔ وہ بلاشبہ ایک منفرد اور عظیم لڑکی تھی اور اب عیسیٰ شاید تنبیہہ کررہا تھا کہ رقیبوں سے بات کرتے ہوئے محتاط رہنا یا پھر مذاق میں تنگ کررہا تھا؟ مالا سمجھی نہیں مگر الجھ ضرور گئی۔

''سوزن میری رقیب کیسے ہوگئی؟'' مالا نے حتی المقدور اپنے لہجے کو نارمل کیا تھا۔ وہ عیسیٰ پر کچھ ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی کہ اسے آفاق نے کچھ بتا رکھا ہے۔ دراصل یہ موضوع کبھی عیسیٰ نے چھیڑا ہی نہیں تھا ورنہ مالا تو کب سے بے چین تھی یہ جاننے کے لیے کہ آیا آفاق نے جھوٹ بولا تھا یا سچ؟

''آں......تو گویا تم نہیں جانتیں؟'' عیسیٰ کچھ چونک گیا پھر کچھ دیر کے لیے سوچوں میں گم ہوگیا تھا۔ شاید اپنی عجلت پسندی پر خود کو ملامت کررہا تھا کہ اسے مالا کے ساتھ ایسی بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔ مالا کچھ اس قسم کے احساسات کا شکار تھی۔

''میں کیسے جان سکتی ہوں، آپ نے کچھ بتایا ہے کیا؟'' وہ الٹا ناراض ہونے کا موڈ بنا رہی تھی کہ عیسیٰ نے اپنی پچھلی زندگی کے بارے میں اس کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ مما کی باتیں ضرور کرتا تھا مگر یہ نہیں بتاتا تھا کہ مما کی خواہش تھی اپنی بھانجی کو بہو بنانے کی۔ شاید یورپ میں ایسی رشتے داریوں کا تصور نہیں کیا جاسکتا تھا مگر علی عیسیٰ کی مما کا گھرانا اس لحاظ سے بہت مختلف تھا۔

''اگرچہ سوزن نے تمہیں کچھ نہیں بتایا ہوگا مگر میں مان نہیں سکتا کہ آفاق کے ہلکے پیٹ میں کوئی بات ٹھہر سکے۔ اس نے تمہیں ایک دو گھنٹے کے اندر پوری ہسٹری بتادی ہوگی۔ اِٹ از ناٹ پاسیبل کہ وہ چپ رہے اور کچھ بولے نہیں۔ اسے بولتے رہنے کا خبط ہے۔'' عیسیٰ کے اگلے سوال نے مالا کو ہکا بکا کردیا تھا۔ وہ تو ابھی عیسیٰ کی بتائی تفصیل کے حصار سے نہیں نکلی تھی کہ پھر عیسیٰ نے جھٹ سے معصوم بن کر کہا۔ ''پر تم خاصی گھنی ہو یا دوسرے معنوں میں بردبار کہہ لو مجال ہے جو مجھ سے کچھ پوچھا ہو تم نے۔'' وہ اب مسکرا رہا تھا یا جتا رہا تھا۔ مالا گویا ہونق سی ہوگئی پھر اسے اپنی پوزیشن کلیئر کرنے کا اچانک خیال آگیا۔ اگر وہ اب بھی نہ بولتی تو شاید عیسیٰ سمجھتا کہ وہ کسی بات پر ناراض یا بدگمان ہے۔

''میں آپ سے پوچھتی تب جب مجھے آفاق کی کسی بات پر یقین آتا۔ مجھے کیا خبر آفاق جھوٹ بول رہا تھا یا سچ؟ ویسے بھی میں اجنبیوں سے.... بے تکلف نہیں ہوتی اور نہ ان کی بے سروپا باتوں کو حقیقت سمجھتی ہوں۔'' مالا کے تفصیلاً دوٹوک نپے تلے جواب نے جہاں عیسیٰ کا دل جیت لیا تھا۔ وہیں اسے اپنی ہم سفر پر فخر محسوس ہوا تھا۔ وہ تو ایسے سیپ کے مانند تھی جس کے اندر نگینہ چھپا تھا۔ عیسیٰ کو مالا پر ٹوٹ کے پیار آیا تھا مگر یہ پیار جتانے کا وقت یا موقع نہیں تھا۔

''میڈیشن مالا! آئی لو یو۔'' اپنے حواسوں پر قابو پاکر عیسیٰ نے جس خواب آگیں، شرابی لہجے میں اظہارِ محبت کیا تھا مالا گویا لڑکھڑا گئی۔ وہ جو گھنی یا بردبار والی بات سن کر اتنا سنجیدہ اور کرارا جواب دے رہی تھی عیسیٰ کے بے ساختہ انداز کو سن کر سرشار ہوگئی۔ وہ ایسا ہی تھا، جذباتی، منہ پھٹ اور دل میں کچھ بھی نہ رکھنے والا۔ نہ کینہ، نہ بغض، نہ حسد بس محبت دیتا اور محبت وصول کرتا تھا۔ جو کچھ محسوس کرتا فٹ سے کہہ دیتا جیسے ابھی مالا کی بات سنے بغیر اپنی

کہے جا رہا تھا۔

''اور یار! آفاق جھوٹ نہیں بولتا، اس نے جو کہا ٹھیک ہی کہا۔'' اب کہ عیسیٰ کا لہجہ ذرا مدھم ہوگیا تھا۔ ''مگر ایک بری عادت ہے اس میں، راز سینے میں رکھنے والا نہیں ویسے بہت اچھا ہے۔ اتنا اچھا کہ میں نے تمہارے حوالے سے اس پر اعتماد کیا اور وہ اعتماد کو ٹھیس پہنچانے والا نہیں۔'' وہ مدھم لہجے میں جانے آفاق کی تعریف کررہا تھا یا اپنے خیالات کا اظہار کررہا تھا۔ جو کچھ بھی تھا مالا کو آفاق کے حوالے سے وضاحت کچھ پُرسکون کرگئی تھی ورنہ وہ تو اچھی خاصی آفاق سے بدگمان ہوچکی تھی حالانکہ اس نے ایسا تو کچھ بھی نہیں کیا تھا جو مالا کو اس حد تک بدگمان کردیتا مگر وہ عیسیٰ کی باتوں کو سمجھتے ہوئے آفاق کی گفتگو کو ذہن میں دُہرا رہی تھی پھر کچھ دیر کی خاموشی کے بعد مالا نے آہستگی سے پوچھا۔

''تو کیا یہ سچ ہے کہ سوزن نے آپ سے شادی سے انکار کردیا تھا؟'' مالا کے لہجے میں چبھن نہیں تھی وہ بہت سادگی بھرے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔ ویسے بھی اسے سوزن سے کسی بھی قسم کی پُرخاش نہیں تھی۔ وہ جو بھی تھی جیسی بھی تھی مالا کو عزیز تھی۔ جانے یہ کیسا اٹوٹ سا رشتہ تھا جو خود بخود سوزن اور مالا کے درمیان جُڑ چکا تھا۔

''ہاں، سو فی صد سچ۔'' عیسیٰ نے خواہ مخواہ دکھی ہونے کی کوشش میں منہ بنا لیا تھا۔ مالا نے کم از کم یہی محسوس کیا تھا کہ وہ غیر سنجیدہ سا ہے۔

''کوئی آپ کو بھی انکار کرسکتا ہے؟'' مالا نے حیرت سے پوچھا۔

''میں کہاں کا شہزادہ ہوں بھلا...... مجھے انکار کیوں نہیں ہوسکتا؟'' وہ الٹا مزے سے کہنے لگا۔

''وہ آپ سے محبت کرتی تھی۔'' اس نے بڑے گہرے لہجے میں عیسیٰ کو جانے کیا جتانا چاہا تھا مگر دوسری طرف شوخ پن کا کوئی انت نہیں تھا۔

''ایں......کیا مطلب؟ کرتی تھی نہیں، کرتی ہے۔'' وہ اپنی بات پر زور دے کر چکا تھا۔ احساسِ تفاخر تو اگرچہ محسوس نہیں کیا جاسکتا تھا تاہم وہ اترا ضرور رہا تھا اور شاید مالا کو چڑانا بھی چاہتا تھا۔

''اس اچھی لڑکی کے ساتھ ویسے کچھ اچھا نہیں ہوا۔'' مالا بغیر چڑے اطمینان سے بولی تھی۔ عیسیٰ کو جھنجلاہٹ میں مبتلا کرنے کے لیے۔ وہ جو اسے تنگ کرنا چاہتا تھا ایک دم جھنجلا کر رہ گیا۔

''تو کیا میں نے اس اچھی لڑکی کے ساتھ برا کیا؟'' اسے چڑانے کی کوشش میں اب وہ خود چڑچڑے انداز میں کہہ رہا تھا۔ اس کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ بہت جلدی چڑ بھی جاتا تھا تبھی تو چاچو اسے ہمہ وقت ستاتے رہتے تھے۔

''میں نے یہ کب کہا۔'' مالا نے فوراً وضاحت کی۔

''تو پھر؟'' وہ تلملایا۔

''پھر یہ کہ وہ نامراد رہ گئی۔'' مالا نے حسرت سے کہا تھا۔ عیسیٰ اس کے حسرت زدہ انداز پر اش اش کر اٹھا۔

''تو تم اسے بامراد کردو مگر ایک بات کا دھیان رکھنا۔ یہاں قانوناً ایک بیوی ہی رکھ سکتے ہیں۔'' عیسیٰ نے جس تلملاہٹ سے جواب دیا تھا مالا گویا دھک سے رہ گئی تھی۔

''آپ کہاں تک سوچ بھی آئے؟'' وہ حیران در حیران تھی۔ ''میں نے تو صرف ایک بات کی ہے، آپ کے ارادوں کا بھلا کیا ہی کہنا۔'' مالا اب عیسیٰ کے بے ساختہ پن کو آڑے ہاتھوں لے رہی تھی اور وہ کون سا شرمندہ تھا۔ پوری ڈھٹائی کے ساتھ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''تو میں ایک بزنس مین ہوں میڈیشن مالا۔ آنا کو پہلے سوچتا ہوں۔'' عیسیٰ نے ہنسی دبائی تھی مگر مالا ہنس بھی نہ سکی۔ رہ رہ کر سوزن کا سوز و گداز سے بھرا چہرہ

آنکھوں کے سامنے عکس بنا رہا تھا۔ نم ناک آنکھیں، ابھرے ابھرے سرخ گالوں پر چھائی اداسی۔ وہ کتنا کم مسکراتی تھی پھر کرخ کی ٹھنڈی اور رمی تقریب میں سوزن کے بہنے والے آنسو، وہ آنسو بلاوجہ تو نہیں گر رہے تھے۔ اتنی بالی سی عمر میں اس کی مذہبی دلچسپی، ہچکولے لیتا اس کا بھرا بھرا وجود، سادگی، وقار اور شرافت کی چمک لیے اس کا وجود ٹھکرائے جانے والا تو ہرگز نہیں تھا مگر اسے ٹھکرایا نہیں گیا تھا وہ تو اس نے خود ہی...... اور اب عیسیٰ کہہ رہا تھا۔

''مجھے سوزن پر اعتراض نہ ہوتا اگر بیچ میں تم، تمہارا وجود، تمہاری محبت اور تمہاری چاہت کے جگنو نہ ہوتے۔'' عیسیٰ کے لہجے میں واضح سچائی تھی۔ وہ کتنے مضبوط اور مدلل لہجے میں کہہ رہا تھا۔ کتنی خوب صورت بات کر رہا تھا۔ کتنے دل سے کہہ رہا تھا مگر مالا پھر بھی جگہ جگہ اٹک گئی تھی۔

''آپ کو سوزن پر اعتراض نہ ہوتا، اگر بیچ میں میری محبت نہ ہوتی...... تو پھر مذہب کہاں گیا؟'' مالا کے دل میں پھانس سی چبھی تھی۔ وہ عیسائی لڑکی عظمت کے کس مینار پر کھڑی تھی۔ جس نے محبت پر مذہب کو قربان نہیں کیا تھا مگر یہ......

''میں نے مما سے کہا تھا وہ اسلام قبول کرلے جیسے انہوں نے کیا تھا مگر وہ راضی نہیں ہوئی پھر میری اس سے جذباتی وابستگی بھی نہیں تھی۔ دراصل شروع میں پاپا اور میں سمجھتے تھے کہ مون کو سوزن ہمارے خلاف بھڑکاتی ہے تبھی سوزن کے کہنے پر ہی مون گھر چھوڑ گئی مگر ہم کچھ غلط ہی سوچتے تھے مون تو خود ہی...... بہت عجیب اور جانے کیوں ہے وہ ایسی۔'' عیسیٰ بے ربط سا بولتا کچھ چپ کرگیا تھا پھر اچانک اسے گزرتے وقت کا احساس ہوا تھا۔ وہ ایک دم چونک کر سیدھا ہوا پھر عجلت بھرے لہجے میں بولا تھا۔

''باتوں میں الجھا لیتی ہو...... کچھ ایسا باندھ رکھا ہے مجھے تم نے، دیکھو، تمہاری آواز سن کر مجھے سب کچھ بھول گیا۔'' اب وہ تیز تیز بولتا، فون سرعت سے بند کر گیا تھا۔ تاہم فون بند کرنے سے پہلے اسے اپنا خیال رکھنے کی تاکید کرنا نہیں بھولا تھا۔ فون بند کرنے کے بعد بھی مالا، علی عیسیٰ کی سحر آمیز گفتگو کے حصار میں رہی تھی۔ اس کا دل کسی پہلو سے بھی قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ کچھ ایسا سرور تھا عیسیٰ کی باتوں میں اور کچھ ایسی ہی محبت ہوگئی تھی مالا کو علی عیسیٰ کی منفرد ذات سے۔

وہ کتنی ہی دیر تک عیسیٰ کی محبت کے رس میں بھیگتی رہی تھی، سوزن کے فون نمبر والی چٹ کو ہتھیلی میں دبائے ہوئے۔ وہ عیسیٰ کی گفتگو کے حصار میں سے نکلنا نہیں چاہتی تھی مگر فون کے سفید بٹنوں میں گڑھے ہندسے اسے زیادہ دیر تک مسحور نہیں رہنے دے سکے۔ اس نے گہری سانس کھینچ کر نمبر ڈائل کرنا شروع کیا تھا کچھ ہی دیر میں فون کال ریسیو ہوگئی۔ فون تانتے نے اٹھایا تھا، مالا کی آواز سنے بغیر وہ سی ایل آئی پر عیسیٰ کے گھر کا نمبر دیکھ کر سمجھ چکی تھیں کہ فون کرنے والا کون ہے۔ مالا نے انگلش میں تانتے سے کہا تھا کہ وہ سوزن کو بلا دیں مگر تانتے انگریزی نہیں سمجھتی تھیں سو مالا کچھ تفکر میں پڑ گئی مگر ہوا کچھ یوں کہ تانتے نے آواز دے کر کسی اور کو بلایا تھا۔ شاید کوئی ان کے قریب ہی بیٹھا گفتگو کر رہا تھا پھر ریسیور کسی اور کے ہاتھ میں منتقل ہوگیا اور جو آواز مالا کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی کم از کم اس وقت مالا اس آواز کو سننا نہیں چاہتی تھی۔ تانتے نے آواز لگا کر جسے بلایا تھا، مالا سمجھ نہیں سکی تھی۔

مون حسیب، مالا کی زندگی میں کیا کرنے والی تھی...... علی عیسیٰ اور مالا کے بیچ کیا ہونے جا رہا تھا۔ یہ سب کچھ ضرور معلوم ہوگا مگر اگلے ماہ



ناولٹ

ترکِ وفا

نایاب جیلانی



پانچواں حصہ



تانتے نے گچ مچ میں ''ایفق'' نام لیا تھا۔ یہ نام بھلا کیا تھا؟ اور کس شخصیت کا تھا؟ مالا کچھ نہیں جان پائی تھی۔ یہاں تک کہ وہ آواز اس کے کانوں سے غیر متوقع ٹکرا گئی۔

''ارے مالا جی! تُسی؟ کس لئی یاد کرلیا سانوں......'' (مالا جی آپ! کیسے یاد کرلیا ہمیں؟) وہ ٹھیٹ پنجابی میں بڑے کھلکھلاتے لہجے میں بول رہا تھا جبکہ مالا اس کی آواز سن کر لمحوں میں پہچان گئی تھی۔

''آفاق تم یعنی ایفق؟'' مالا کے منہ سے پھنسی، پھنسی آواز نکلی...... یہ بڑبولا باتونی آج فون پر بھی اس سے ٹکرا گیا تھا۔ مالا گویا اپنے ناخن چبا کر رہ گئی تھی۔ آفاق کی آواز سننے کی اسے توقع ہرگز نہیں تھی۔ آخر یہ کہاں سے ٹپک پڑا تھا؟

''جی ہاں...... میں ہی ایفق...... اِدھر سارے بواریا میں مجھے ایفق ہی کہا جاتا ہے۔'' وہ بڑے خوشگوار انداز میں کہہ رہا تھا۔ گویا مالا سے اس کی خوب دوستی رہ چکی ہو۔ بے تکلفی ایسی کہ جوتوں سمیت آنکھوں میں گھس رہا تھا اور یوں مخاطب تھا گویا اس سفر کے بعد بھی مالا اس سے رابطے میں رہ چکی تھی۔ یہ بے تکلفی مالا سے ہضم ہونے والی نہیں تھی۔

''اور سناؤ تم کیسی ہو......؟ عیسیٰ صاحب تو ٹھاٹ باٹ سے ہوں گے۔ کام پڑے تو میں یاد آتا ہوں، کبھی بھول کر بھی تمہارے شوہر نے مجھ مسکین کو یاد نہیں کیا۔'' آفاق کی چلتی زبان کو روکنا محال تھا ...... ویسے بھی اسے اگلے بندے کی سنے بغیر بولنے کی عادت تھی اور فی الحال اس کے اپنے شکوے ہی بے شمار تھے، وہ مالا کی ناگواری یا غصے کو بھلا کیسے محسوس کرتا...... اس کی چلتی زبان رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

''خیر، مصروف بندہ ہے وہ، اب میں اسے کیا کہوں...... محسن ہے میرا، ویسے عنقریب میں بھی من ہائیم آنے والا ہوں۔'' وہ بہت پُرجوش سے دوستانہ لہجے میں بتا رہا تھا۔ گویا مالا کو تو بڑی بے قراری سے اس کا انتظار تھا۔ کم از کم آفاق کے جوش و خروش سے تو یہی نظر آ رہا تھا۔ مالا کو سخت الجھن ہونے لگی تھی، ابھی وہ سوزن کے بارے میں پوچھنا چاہتی ہی تھی کہ آفاق پھر سے بول پڑا۔

''من ہائیم میں مجھے اچھی جاب مل سکتی ہے، میں نے ایم بی اے کر رکھا ہے اور بزنس ایڈمنسٹریشن میں ہی سویڈن سے اضافی ڈگری بھی لے رکھی ہے۔ مجھے اسکالر شپ ملا تھا ناں عیسیٰ کو سب پتا ہے، وہ میری قابلیت کی تعریف بھی کرتا ہے اور مجھے امید ہے، اپنی فرم میں ہی مجھے بھی کھپا لے گا۔ میں نے ایک ماہ اس کے پرسنل سیکرٹری کی جاب بھی کی ہے پر مجھے اس جاب کو چھوڑ کر یہاں آنا پڑا...... ڈچ سیکھنے کے لیے۔ مجھے ڈچ نہیں آتی تھی ناں...... ورنہ جاب کے کیا ٹھاٹ تھے، عیسیٰ کے ساتھ آنا جانا، پتا ہے تمہارے گھر کے گیسٹ روم میں رہتا تھا میں...... انکل اور عیسیٰ بہت اچھے ہیں۔'' آفاق کی ہر بات، ہر انداز میں بے ساختگی چھلکتی تھی۔ وہ بولتا تو اگلے بندے کی ہرگز نہیں سنتا تھا تب وہ مالا کو بہت برا لگتا تھا مگر جب اس کی ہر بات کی تان عیسیٰ کی تعریف پر ٹوٹتی تب وہ مالا کو بہت اچھا لگتا تھا۔ چاچو اور اب آفاق بھی...... ہاں جو شخص عیسیٰ سے محبت کرے گا، اس سے مالا بھی محبت کرے گی، یہ اس نے سوچا ہی نہیں تھا بلکہ خود ایسے جذبات دل میں امڈ آئے تھے جبکہ آفاق تو بانگ دہل کہہ رہا تھا۔

''مجھے عیسیٰ سے بہت محبت ہے، اس جیسا پورے مغربی جرمنی میں کوئی نہیں۔'' آفاق کے یہ الفاظ مالا کے لیے کسی انمول خزانے سے کم نہیں تھے۔ اس کے ہونٹ آپوں آپ مسکرا اٹھے۔ عیسیٰ کی تعریف اس کے اندر باہر پھول کھلا دیتی تھی۔ کچھ پل کے لیے اسے بھول گیا تھا کہ اس نے فون پر آخر کس سے بات کرنا تھی؟ وہ سوزن کا پوچھنا چاہتی تھی مگر آفاق بولنے کا موقع نہیں دے رہا تھا۔ اللہ، اللہ کر کے پورے پندرہ منٹ بعد آفاق بولتے، بولتے رکا تب مالا نے عجلت میں اس سے سوزن کے بارے میں پوچھ لیا تھا۔ مبادا وہ پھر سے کہیں اسٹارٹ ہی ہو جائے...... اس کے خدشے اور وسوسے کے عین مطابق وہ اسٹارٹ ہوتے، ہوتے رک گیا تھا۔

''سوزی بس آتی ہی ہوگی، باڑے تک گئی

ہے، میں ابھی ابھی آیا ہوں اِدھر...... پہلے یہیں رہتا تھا، پھر مجھے اچھا نہ لگا کہ ڈھیر سارے دن کسی پر بوجھ بن جاؤں...... خیر، تم سناؤ؟ فون سوزن کے لیے ہی کیا ہوگا یہاں کوئی اور سوزن کے علاوہ اردو نہیں بولتا اور تمہیں ڈچ آتی نہیں۔'' ایک ہی سانس میں اتنا طویل جملہ بولنا، محض آفاق کا ہی کمال ہو سکتا تھا...... اور وہ اپنے کمالات میں انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔

''مجھے سوزن سے بات کرنی ہے۔'' مالا نے بروقت اپنا مدعا اس باتونی کی سماعتوں تک پہنچا دیا تھا تبھی وہ کچھ سوچ کر بولا۔

''تم انتظار کرو، سوزن بس آتی ہوگی بلکہ انتظار سے بہتر ہے مجھ سے بات کر لو۔'' آفاق نے اپنے تئیں بڑا بہترین مشورہ دیا تھا مگر مالا کو ایسے بھیا تک مشورے کی ضرورت نہیں تھی سو وہ فوراً ہی خوفزدہ سی ہو گئی۔

''نہیں...... نہیں، میں پھر کال کر لوں گی، تم یاد سے سوزن کو بتا دینا۔'' مالا نے عجلت کے عالم میں ہکلاتے ہوئے بے ساختہ کہا تھا۔ تب آفاق کو اچانک کچھ ایسی بات یاد آئی تھی کہ وہ ایک دم بول اٹھا۔

''مالا خاتون! میرا ایک کام تو کر دینا......'' آفاق نے جس تیز رفتاری سے اسے پکارا تھا، وہ فون کان سے ہٹاتے ہٹاتے رک گئی۔

''کون سا کام......؟'' مالا ٹھٹک گئی تھی۔

''ایگزیکٹلی! کام یہ ہے کہ تمہیں میری سفارش کرنا ہوگی۔'' اب وہ بڑے لاڈ سے ٹھنک کر کہہ رہا تھا۔ مالا کو اس کی دماغی حالت پر شبہ سا گزرا۔ تھا تو وہ عیسیٰ کا ہم عمر مگر حرکتیں...... مالا کا دماغ بری طرح جھنجنا اٹھا۔ ایک دم اسے آفاق پر خوب تپ چڑھی تھی۔

''کیسی سفارش......؟'' اسے سخت قسم کا غصہ آ گیا تھا...... حالانکہ وہ اتنا غصہ کرتی نہیں تھی، دوسری طرف اس کے غصے کی ہرگز پروا نہیں کی گئی تھی بلکہ آفاق نے تو اس کے غصے کی طرف دھیان بھی نہیں دیا تھا...... اسے بس اپنی ہانکے جانے کی عادت تھی۔

''وہ علی عیسیٰ سے کہنا، مجھے پھر سے اپنا پرسنل سیکرٹری رکھ لے، اللہ کی قسم......! اب کہ ذرا بھی گڑبڑ نہیں کروں گا، فر فر لینگویج بولوں گا، عیسیٰ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔'' وہ عادتاً ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا تھا...... تب مالا نے بھنا کر کہا۔

''میں عیسیٰ کے آفیشل افیئرز میں انٹرفیئر نہیں کرتی......'' مالا جس طرح چبا، چبا کر بولی تھی، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ اس کی ناگواری کو سمجھ جاتا مگر بھلا وہ اس کی ناگواری کو سمجھتا ہی کیوں......؟ اسے کون سا کسی کی بھی بات کبھی بری لگی تھی۔ کوئی اسے گالیاں ہی کیوں نہ دے جاتا، وہ مسکرا کر گالیاں دینے والے کو تھینکس ضرور بولتا تھا اگر کوئی اسے بے ضمیر یا بے حس کہہ کر غیرت دلانے کی کوشش کرتا تو آفاق صاحب آفاقی سی مسکراہٹ لبوں پر لا کر بڑے رسان سے فرماتے۔

''میں کسی بداخلاق کی وجہ سے اپنا اخلاق نہیں گرا سکتا۔'' اپنی انہی خوبیوں کی بنا پر وہ حسیب صاحب کا دُلارا تھا مگر عیسیٰ کی آنکھ کا تارہ نہیں بن سکا تھا۔ اس وقت بھی وہ مالا کی ناگواری پر غور کیے بغیر چہک رہا تھا۔

''میں نے تو تم سے اس لیے کہا تھا کہ عیسیٰ تمہاری بات کبھی ٹال نہیں سکتا، خیر، مجھے سفارش کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے، حسیب انکل ہیں ناں...... ویسے بھی مجھے اپنی صلاحیتوں پہ ناز ہے۔'' اس کی طرف سے ٹکا سا جواب ملنے پر اب وہ لمبی، لمبی چھوڑ رہا تھا۔ مالا نے جھنجلا کر کھٹاک سے فون بند کر دیا...... اس کا پہلے سے تپا دماغ کچھ اور تپ گیا تھا جس کام کے لیے فون کیا تھا، وہ بھی نہ ہو سکا۔ نقلی نگینوں والا بریسلیٹ ہنوز اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ مالا کو اتنا غصہ آیا کہ بریسلیٹ توڑ مروڑ کر ڈسٹ بن میں جا پھینکا...... ایسے بے نام تحائف اور تعلقات کی

جگہ کوڑے دان کے علاوہ کوئی اور نہیں ہوسکتی۔ وہ اس الجھن کو اپنے تئیں ڈسٹ بن کے حوالے کرچکی تھی مگر الجھنیں یوں اٹھا کر کوڑے دان میں پھینک دینے سے ختم ہوجاتیں تو آج ہر کوئی اپنی زندگی میں مطمئن اور شاد ہوتا۔

☆☆☆

اس کی زندگی میں آنے والی یہ صبح بھی عجیب تھی۔ اور ہوتا یوں تھا کہ جو صبح بھی عجیب ہوتی، عجیب طرح سے طلوع ہوتی، وہ مالا کے... پورے دن کو عجیب بنادیتی تھی۔

تو پھر یہ صبح بھی عجیب طرح سے طلوع ہوئی، ہُوا کچھ اس طرح کہ پہلے کیا حسین، چمکیلی سنہری دھوپ نکلی، محض آدھے گھنٹے کے لیے، عیسیٰ نے گلاس ونڈو کے جالی دار نائیلون کے پردے کو ہٹا کر دیکھا اور دوسرے ہی لمحے کرسیاں اٹھائے لان میں جا پہنچا۔ کچھ دیر بعد چاچو بھی عیسیٰ کے بلاوے پر بھاگے، بھاگے چلے گئے تھے مگر یوں ہوا کہ لمحوں میں آسمان نے رنگ بدل لیا، سورج نے بدلیوں میں چہرہ چھپایا اور اوپر سے شفاف چمکیلے موتی برسنے لگے۔

ٹپ ٹپ بارش برستی جارہی تھی اور عیسیٰ ایک مرتبہ پھر کرسیاں اٹھائے برآمدے کی طرف بھاگا تھا۔ چاچو تو بارش کی ہولنا کی ملاحظہ کرکے بدمزہ سے ہوکر اپنے بیڈ روم میں گھس گئے تھے جبکہ عیسیٰ وہیں برآمدے میں اسٹول پر براجمان برستی بارش کا نظارہ کرنے لگا تھا۔ اسے ایسی فرصت کبھی کبھی نصیب ہوتی تھی اور آج کا خوش قسمت ترین دن چھٹی کا تھا۔ سو عیسیٰ کا دل تھا وہ چھٹی کو خوب انجوائے کرے۔

مالا کچن میں ناشتا بنارہی تھی اس کا رخ بھی برآمدے کی طرف تھا، وہ اِک نظر عیسیٰ کو دیکھ کر دوبارہ کچن میں آگئی تھی۔ مالا اسی سمت کھڑی تھی جہاں سے علی عیسیٰ اسے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بڑے ہی انہماک سے بارش کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بچوں کی سی خوشی تھی، گویا وہ برستی بارش کو دیکھتا، خوب انجوائے کررہا تھا۔ اس دوران وقتاً فوقتاً وہ کچن کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا مگر بارش دیکھنے میں اس کی دلچسپی کم نہیں ہورہی تھی پھر وہ اٹھا تھا اور اندر سے ڈائری اور قلم اٹھالایا۔ یقیناً کچھ لکھنے کا موڈ بن رہا تھا مگر وہ لکھنے کی کوشش کیے بغیر کوئی نظم دھیرے، دھیرے گنگنانے لگا تھا۔ ڈائری میں قلم رکھ کر اس نے ایک طرف اچھال دی تھی۔ مالا بہت غور سے اس کی حرکات وسکنات کو دیکھ رہی تھی۔ اسے تو ویسے بھی علی عیسیٰ کو سوچنا اور پہروں چپکے، چپکے دیکھتے رہنا پسند تھا اور فی الوقت وہ بڑی توجہ اور فراغت سے عیسیٰ کو دیکھ سکتی تھی۔ اس کی ساری توجہ عیسیٰ کے ہلتے لبوں اور خوب صورت آنکھوں کی طرف تھی۔ وہ جانتی تھی' عیسیٰ کو بہت سارے شاعروں کا کلام زبانی یاد ہے۔ عیسیٰ کو شاعری سے دلچسپی وراثت میں ملی تھی، چاچو کو بھی لگ بھگ چھ سات سو اشعار تو زبانی یاد تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا چاچو نے اپنا شوق عیسیٰ میں منتقل کردیا ہے۔ وہ خود بھی اکثر کچھ نہ کچھ گنگناتے رہتے تھے اور اس وقت عیسیٰ بھی کچھ گنگنا رہا تھا۔ اس نے اوٹ سے جھانکا تو اسے عیسیٰ پہلے کی طرح انہماک سے بارش دیکھتا نظر آیا تھا اور اس کی آواز گویا مالا کے دل میں اترتی جارہی تھی۔

"دل سوچ کا پنجرہ ہے
اِک بار ہی کُھلتا ہے
دل پیار کا سودا ہے
اِک بار ہی ملتا ہے"

آخری شعر گنگناتے ہوئے وہ خود بھی بڑی بے خودی کیفیت میں تھا۔

"دل درد کا ٹکڑا ہے
بے چین سا رہتا ہے"

عیسیٰ کی آواز نے پورے ماحول پر سحر طاری کر رکھا تھا۔ وہ خاموش ہوا تو گویا طلسم پھر سے ٹوٹ

گیا۔ وہ گویا اس کے لفظوں کی موسیقی اور لہروں کے ساتھ بہہ رہی تھی۔ عیسیٰ کی آواز وائلن کے سُروں جیسی تھی۔ دلوں کو پگھلا دینے والی، انتہائی پُرلطف احساس جگاتی محبت کو ابھارتی، جذبات کو گرماتی اور دلوں کو بے چین کرتی۔

"دل سوچ کا پنجرہ ہے
ایک بار ہی کھلتا ہے"

اب وہ بے خیالی میں یہی دو لائنیں گنگنا رہا تھا۔ وہ اپنے آپ میں مگن تھا، اسے مالا کی موجودگی اور نگاہ کی تپش نے نہیں چونکایا تھا۔ اسے سانسوں کی سرسراہٹ اور پیروں کی آہٹ نے بھی نہیں چونکایا تھا، وہ آنکھیں بارش کے قطروں پر جمائے نظم کے خالق سے غائبانہ مخاطب تھا۔

"اے لکھنے والے، تم نے ٹھیک کہا۔ دل کی اتنی اچھی تشریح ہو ہی نہیں سکتی، ہاں دل سوچ کا پنجرہ ہے، ایک بار ہی کھلتا ہے، بار بار نہیں کھلتا اور جس کے لیے ایک دفعہ کھل جائے پھر اسے اپنے اندر محصور کرلیتا ہے۔ اپنی دیواروں میں قید کرلیتا ہے پھر اسے "مقیدِ دل" کہتے ہیں۔" عیسیٰ زیرِ لب بڑبڑایا تھا پھر گردن موڑے بغیر گویا مالا کی موجودگی محسوس کرکے بولا۔

"چوری چھپے کسی کو تاڑنا اچھی بات نہیں ہوتی۔" اس کی نگاہیں اب بھی بارش کے شفاف قطروں پر جمی تھیں۔ مالا کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ ہونٹوں سے بے ساختہ چیخ نکلنے والی تھی، جسے دونوں ہاتھ منہ پر جما کر اس نے بہ مشکل روکا تھا۔

"اللہ......! یہ دونوں بہن بھائی تو کمال کے ہیں...... جادوگر ناں ہوں تو...... کیسے پتا چل گیا، میں چپکے، چپکے تاڑ رہی ہوں انہیں......" مالا کی سانسیں اس اچانک حملے پر اتھل پتھل ہوگئی تھیں۔ وہ چونکہ اپنے دھیان میں کھڑی تھی اور اپنے تئیں اس انداز سے چھپی تھی کہ عیسیٰ کی نظر میں نہ آسکے مگر یہ علی عیسیٰ بھی ناں......

"پردے میں رہنے والے، ذرا پردہ تو ہٹا
چھپ چھپ کر تاڑنے والے ذرا سامنے تو آ"

بِنا گردن موڑے، وہ سامنے رکھی میز ہاتھوں سے بجاتے ہوئے گنگنا رہا تھا۔ مالا سخت جھینپ گئی تھی۔ اب اوٹ میں کھڑے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا، وہ جھینپی، جھینپی سی سامنے آگئی تھی۔ عیسیٰ نے نگاہ جما کر اسے دیکھا تھا، وہ خاصی گھبرائی، گھبرائی نظر آرہی تھی۔ عیسیٰ نے آنکھیں میچ کر سرتاپا اسے دیکھا تھا، اس کی نگاہیں مالا کے ہاتھوں پر جم گئی تھیں۔ اس کے ہاتھوں پر میدے کی باقیات لگی تھیں۔ وہ کچن میں کام کررہی تھی اور عیسیٰ کی آواز سن کر شاید باہر آگئی تھی۔ عیسیٰ کے ہونٹ نیم وا ہوئے...... وہ دھیمے، دھیمے مسکرا رہا تھا اور مالا اپنی خجالت چھپاتی اس پر بگڑ رہی تھی۔

"جانے کون سی دوربین سر کے پیچھے فٹ کررکھی ہے۔" مالا روٹھے، روٹھے انداز میں بولی تھی۔ اس کا پھولا منہ عیسیٰ کو ہنسنے پر مجبور کرگیا تھا۔

"آں...... ہاں، دوربین نہیں......" عیسیٰ نے فوراً وضاحت کی...... "مالے ڈیئر! یہ انتہائی تیز رفتار حواسِ ظاہری ہیں...... شامہ، باصرہ، ذائقہ، لامسہ اور سامعہ...... کچھ لوگوں میں ان کی رفتار ایک ہزار فی سیکنڈ سے بھی بڑھ کے ہوتی ہے، وہ لمحے کے آخری حصے سے بھی پہلے سونگھتے، دیکھتے، چھوتے یا سن لیتے ہیں...... میں ان لوگوں میں سے ہرگز نہیں ہوں، مجھے تو تمہارے وجود کی یہ بھینی، بھینی خوشبو چونکا دیتی ہے۔ تم میری پسندیدہ خوشبو لگاتی ہو، مجھے تمہارے آنے سے پہلے اس اعلان کرتی خوشبو سے پتا چل جاتا ہے۔" عیسیٰ نے تفصیلاً وضاحت کردی تھی، گویا اسے کوئی جادوگر یا غیر معمولی ذہین نہ سمجھا جائے۔ مالا نے بھی گہری سانس کھینچ کر مسکرانا شروع کردیا تھا...... وہ ایک سادہ لڑکا تھا، جھوٹ اور غلط بیانی اسے پسند نہیں تھی۔

"اُوہ...... تو یہ بات تھی۔" وہ ہاتھوں سے میدہ کھرچتی عیسیٰ کے سامنے فرش پر بیٹھ گئی۔ عیسیٰ نے عادتاً اسے نیچے بیٹھنے سے ٹوکا تھا مگر وہ عیسیٰ کی یہ بات نہیں مانتی تھی، اسے عیسیٰ کے سامنے فرش یا کارپٹ پر بیٹھنا بہت پسند تھا۔

"ویسے یہ پرفیوم مجھے چاچو نے لے کر دیا تھا۔" مالا اپنے دوپٹے کو سونگھتی مسکرائی تھی۔ اس نے چوڑی دار پاجامہ اور لمبی سی قمیص پہن رکھی تھی، عیسیٰ کو مالا کے ایسے تمام ڈریسز پسند تھے۔ وہ لمبی فراک کو بھی پسند کرتا تھا۔ مالا نے اپنی وارڈ روب کو رنگ، رنگ کے کپڑوں سے بھر رکھا تھا۔ ان میں زیادہ ڈریسز وہ تھے جنہیں اس کی ماں نے پاکستان سے بھیجا تھا۔ آہ، پیاری ماں، اتنے فاصلوں کے باوجود بھی دوری کا احساس نہیں ہونے دیتی تھی۔ وہ ماں ہی تو تھی جس نے دل سے دل تک کے درمیان اپنی محبت سے ربط قائم کر رکھا تھا۔ وہ دور دیس میں موجود اپنوں کی یاد میں پور، پور بھیگنے لگی تھی مگر عیسیٰ نے اس کی یہ کوشش ناکام کردی۔ وہ مالا کو اپنے علاوہ کچھ اور سوچنے نہیں دیتا تھا۔

"میں جانتا ہوں، پاپا میری پسند سے آگاہ ہیں۔" عیسیٰ نے بے نیازی سے کہا تھا، برستی بوندوں سے اس کا دھیان ہٹ گیا تھا، اب وہ مالا کی طرف متوجہ تھا اور اسی کو دیکھنا چاہتا تھا۔

"اور میں......؟" مالا نے ٹھنک کر کہا۔

"تم ابھی وہاں تک نہیں پہنچی......" عیسیٰ شریر ہوا۔

"کہاں تک......؟" وہ بھینچی بھینچی آواز میں چیخی۔

"جہاں سے محبت ختم ہوتی ہے اور عشق شروع ہوتا ہے۔" وہ شرارتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

مالا کو ڈھیر سارا غصہ آگیا۔

"اچھا تو میں اس مقام کے قریب بھی نہیں پہنچی......؟" مالا نے خفگی بھرے لہجے میں کہا۔ عیسیٰ نے بے ساختہ اسے ٹوک دیا تھا۔

"وہاں تک نہیں پہنچیں...... تاہم قریب، قریب ضرور ہو۔" مالا کی ناراضی نے اسے کھل کر قہقہہ لگانے پر مجبور کردیا تھا۔ مالا کا منہ ابھی تک پھولا ہوا تھا۔ حالانکہ یہ خفگی مصنوعی تھی مگر عیسیٰ کی جان پر بن آئی۔ اس نے مسکراہٹ سمیٹ کر اٹھتی ہوئی مالا کو بے ساختہ روکا تھا مگر وہ کچن کی طرف بڑھ گئی۔

"کیا تم نے سوزن کا شکریہ ادا کردیا؟" کچھ دیر بعد عیسیٰ اس کے پاس موجود تھا۔ اس کے الفاظ اور لہجہ نارمل تھا پھر بھی مالا کا دل بری طرح سے کانپ اٹھا۔ پھر وہ ہی پارسل، سلپ اور پھر بریسلیٹ...... اس کا دھیان اپنے کمرے کے ایک کونے میں رکھی ڈسٹ بن تک گیا تھا، جس کے اندر وہ تڑا مڑا بریسلیٹ رکھا تھا۔ اور ٹکڑے، ٹکڑے ہوئی سلپ، عیسیٰ کے الفاظ ایسے نہیں تھے جو مالا کو پریشان کردیتے مگر وہ پھر بھی پریشان ہوچکی تھی۔

"میری اس سے بات نہیں ہوسکی۔" وہ سچ، جھوٹ بولنے کے درمیان معلق تھی۔ پھر اچانک مالا نے سچ بولنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ وہ جھوٹ بولتی تب بھی بے چین رہتی...... اگر وہ کہہ دیتی، ہاں بات ہوئی ہے، میں نے اس کا شکریہ بھی ادا کردیا تو یہ کہنا مشکل نہیں تھا پھر اگر عیسیٰ سوزن سے خود پوچھ لیتا اور سوزن نے گفٹ ہی نہیں بھیجا ہوتا تب مالا کو منہ چھپانے کی کہیں جگہ نہیں ملتی، سو اس نے سچ بول کر خود کو بھی مطمئن کرلیا تھا مگر کبھی، کبھی بلاوجہ ہی اطمینان رخصت ہوجاتا ہے، شاید عیسیٰ فی الوقت مطمئن ہوگیا تھا تبھی اس نے مزید کوئی سوال نہیں اٹھایا تھا۔ خاموشی سے ناشتا کرتا رہا، مالا چپکے سے کھسک گئی تھی پھر چاچو کو بلا لائی، وہ صبح، صبح ناشتا نہیں کرتے تھے، کبھی چائے پیتے، کبھی دودھ، کبھی جوس کا ایک گلاس پی لیتے تھے، تاہم اکثر موڈ ہوتا تو ناشتے کی میز پر آجاتے...... چاچو کا میز تک آنا ہی ماحول کو خوشگوار

کردیتا تھا اسی لیے مالا فضا کو کثیف محسوس کرکے چاچو کو بلا لائی تھی......اور چاچو کے آنے کی دیر تھی، عیسیٰ کا موڈ بھی پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔ چاچو کو دیکھ کر وہ بے ساختہ چہکا تھا۔

"آجائیں...... آج پراٹھے نہیں ہیں، قیمہ بھرے سلائس اور انڈوں کا حلوا......آپ کو اپنا لاہور یاد آگیا ہے ناں......" چاچو سربراہی کرسی سنبھال چکے تھے، یہ کرسی انہی کے لیے مخصوص تھی اور اب عیسیٰ کی چہکتی آواز کے موجب کو دیکھ رہے تھے، یعنی ناشتا آج اسے پسند آیا تھا اور وہ خوب رغبت سے کھا رہا تھا مگر تعریف اب بھی نہیں کی تھی۔ چاچو نے گہرا سا ہنکارا ابھرا۔

"اتنا لذیذ حلوا کھا کر بھی تمہیں تعریف کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔" ان کی پہلی گھرکی پر ہی عیسیٰ اسٹارٹ ہوگیا تھا۔ مالا کو لمحے بھر کے لیے وہ آفاق جیسا لگا تھا، تیز تیز بولتے ہوئے سانس لینے کے لیے بھی رک نہیں رہا تھا...... مگر وہ آفاق جیسا کیوں ہونے لگا...... اپنی فضول سوچ پر اسے جی بھر کے تاؤ آگیا تھا۔ بڑے غلط ٹائم پر آفاق کی طرف دھیان گیا تھا سو اسے غصہ کیوں نہیں آتا؟

"میں نے زندگی میں ایسا لذیذ حلوا نہیں کھایا بلکہ میں نے زندگی میں حلوا کبھی کھایا ہی نہیں...... پر اس لذیذ ڈش کو بنانے والے ایکسپرٹ ہاتھوں نے کمال کردیا...... میں دوسری پلیٹ فل بھر کے معدے میں اتار چکا ہوں، ابھی سلائس کھانے باقی ہیں، کاش کہ میں اتنی اتھارٹی رکھتا اور پورے من ہائیم کے فوڈ پوائنٹس بند کروا دیتا پھر میرے گھر کے سامنے ایک ہجوم کھڑا ہوتا اور میں فرم چلانے کے بجائے ہوٹل بنانے کا پلان کرلیتا...... ایسی بہترین کک ہم دونوں باپ، بیٹے کو کہیں نہ ملتی۔" وہ مزے سے بولتا ہوا کبھی مالا کو اور کبھی چاچو کو دیکھ رہا تھا پھر اس نے انڈوں کا تھوڑا اور حلوا اپنی پلیٹ میں ڈالا تھا۔ مالا کی گویا پوری محنت وصول ہوگئی تھی جبکہ چاچو، عیسیٰ کی جانے کس بات پر خفا ہونے کا موڈ بنا چکے تھے۔

"تم نے میری بیٹی کو بیکر اور خانساماں بنا دیا...... خود تم کہاں کے ڈیوک ہو۔" چاچو نے لڑائی کا باقاعدہ آغاز کردیا تھا، پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ عیسیٰ خاموش رہ جاتا۔ مالا جب تک چاچو کے لیے ابلے چاول اور مسور کی ... خوشبودار دال کا باؤل بھر کے لائی تب تک جھڑپ نے ماحول کو خاصا گرم کردیا تھا۔

"میں نے کب کہا، میں کہیں کا ڈیوک ہوں۔" عیسیٰ بے ساختہ چلایا۔

"ڈیوک تمہارے جیسے ہوتے بھی نہیں۔" چاچو نے شانِ بے نیازی سے کہا۔

"تو پھر آپ جیسے ہوتے ہوں گے؟" وہ انہیں تاؤ دلا کر بولا تھا۔

"آف کورس......!" چاچو نے مصنوعی کالر کھڑے کیے تھے۔ اب وہ دال چاول کھاتے ہوئے ہر، ہر اسپون کو بھرنے کے ساتھ مالا کی تعریف کیے جارہے تھے۔ اور ان کا انداز مالا کا سیروں خون بڑھانے کے ساتھ ساتھ اسے جھینپنے پر بھی مجبور کررہا تھا۔ کھانے کے دوران نوک جھوک جاری تھی جبھی عیسیٰ اٹھ کھڑا ہوا کہ اسے کہیں ضروری فون کرنا تھا وہ ان دونوں کو باتیں کرتا چھوڑ کر فون تک آگیا تھا۔ اسے اچانک ایک فون کال کا خیال آیا تھا۔ سیل کمرے میں رکھا تھا سو وہ لینڈ لائن تک آگیا۔ ایک آفیشل کال کرنے کے بعد اس نے سوچا کافی دن سے گروسی کو کال نہیں کی۔ بس یہی سوچ کر وہ ڈائلڈ نمبر دیکھ رہا تھا آخری کال گروسی کے نمبر پر کی گئی تھی، کال کا دورانیہ پچیس سے تیس منٹ تھا۔ عیسیٰ قدرے حیران رہ گیا۔ اس کی پچھلے دو ہفتے سے گروسی یا نانتے سے بات نہیں ہوسکی تھی گھر سے آخری کال مالا نے کی تھی، عیسیٰ کو کال کرنے کے بعد...... یعنی سوزن کا نمبر عیسیٰ سے لے کر پھر اسے کال کی گئی تھی مگر بقول مالا

کے سوزن سے بات نہیں ہوسکی تھی۔ تانتے اور گروی انگریزی اور اردو کی شُدھ بدھ نہیں رکھتی تھیں۔ گروی اردو تھوڑی بہت سمجھ لیتی تھیں مگر بولنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا پھر اگر سوزن سے بھی بات نہیں ہوسکی تھی تو مالا نے گروی کے گھر پچیس، تیس منٹ تک کس سے بات کی تھی؟ وہ شکی مزاج نہیں تھا، نہ وہ مالا پر شک کرسکتا تھا مگر تجسس تو عین انسانی فطرت ہے، اس سے مبّرا تو کوئی بھی نہیں...... تو بس اسی تجسس کے تحت اس نے گروی سے پوچھ لیا تھا تب انہوں نے تانتے سے پوچھ کر بتایا تھا کہ کل مالا کی کال آئی تھی، وہ سوزن سے بات کرنا چاہتی تھی مگر سوزن اس وقت گھر پر نہیں تھی تب آفاق آیا ہوا تھا تو تانتے نے آفاق کو فون پکڑا دیا۔ پھر آفاق نے جانے کتنی دیر بات کی ہوگی۔ گروی نے سادگی سے سب جواب دے دیے۔ عیسیٰ نے فون بند کرنے سے پہلے اِدھر اُدھر کی دو چار باتیں کیں پھر فون بھی رکھ دیا...... مگر اس کے ذہن میں کوئی بات چبھن دینے لگی تھی۔

''سوزن سے بات نہیں ہوسکی مگر آفاق سے اتفاقاً ہوگئی...... لیکن مالا نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟ یہ بات کیوں چھپائی؟ کیا یہ بات چھپانے والی تھی؟'' اس کا ذہن بہت گرم سوال اگل رہا تھا۔

☆☆☆

الجھن چھوٹی ہو یا بڑی...... ہوتی تو الجھن ہے...... اگر ذہن میں الجھن کی گرہ لگ جائے تو آسانی سے کھلتی بھی نہیں ہے...... وہ بلاوجہ مشکوک نہیں ہوتا تھا مگر جہاں گرہ لگ گئی تو پھر آسانی سے کھلتی بھی نہیں تھی۔ وہ اتنا الجھ رہا تھا کہ اسے پاپا کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی، وہ اسے بلا رہے تھے مگر عیسیٰ نے گویا سنا ہی نہیں تھا۔ وہ benz کی چابی اٹھا کر باہر نکل آیا تھا۔ ایک دم گھر میں گھٹن محسوس ہونے لگی تھی۔ اگرچہ وہ بلاوجہ گھر سے نہیں نکلا تھا، اسے چھوٹے موٹے ایک دو کام نمٹانے تھے جو اس نے چھٹی والے روز تک روکے ہوئے تھے۔ ہارڈ ویئر اسٹور سے کچھ سامان لے کر اس نے گاڑی کی ڈگی میں رکھا تھا پھر غیر ارادی طور پر اسپورٹس کلب کی طرف آ گیا...... وہ جب بھی کچھ ڈپریسڈ ہوتا تھا تو اسپورٹس کلب کی طرف آ جاتا تھا۔ یہاں خود کو مصروف رکھنے کے لیے بہت سے کھیل تھے جس میں پیراکی کرنا بھی تھا۔ لہروں پر تیرنا، لہروں کو چیرنا، پانی میں گم ہونا، ڈوبنا، ابھرنا، گویا چند لمحوں کے لیے دنیا کی ہر سوچ سے تعلق ٹوٹ جاتا تھا وہ آدھا گھنٹا اسی شغل میں مصروف رہا تھا مگر پھر بھی فریش ہونے کے بجائے اس کی طبیعت اور بھی اوب گئی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ ٹینس کلب کی طرف آ گیا...... مگر ٹینس کورٹ میں بھی اس کے لیے دلچسپی اور کشش نہیں تھی جلد ہی اس پر بیزاریت طاری ہوگئی تھی اور آخری پناہ گاہ کی طرف اسے آنا ہی پڑا۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے، دنیا کے کسی کونے میں بھی تمہارے لیے ویسا سکون نہیں ہوسکتا جیسا تم اپنے گھر کے کسی بھی گوشے میں محسوس کرسکتے ہو، وہ اپنی الجھی سوچوں سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا مگر اسے یہ خبر نہیں تھی کہ الجھن گھر سے باہر بھی نہ ختم ہوسکتی ہے نہ حل ہوسکتی ہے، الجھنیں وہیں پہ ختم ہوتی ہیں جہاں سے ان کی شروعات ہوتی ہے، اب اسے اسی مقولے پر عمل کرنا تھا جو بات کسی سے براہِ راست کرلی جائے، اس خاموشی اور گریز سے بہتر ہے جو ایک چپ کی وجہ سے دماغ کو تپاتی رہے۔ وہ باہر اسی لیے چلا گیا تھا کہ مزید اس چیز پہ سوچنا نہیں چاہتا تھا مگر جب الجھی سوچوں سے پیچھا نہ چھڑا سکا تو واپس پلٹ آیا۔ اس نے مالا سے بات کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ بہت کوشش کے باوجود وہ اپنی الجھن کو نظر انداز نہیں کرسکا تھا پھر بہتر یہی تھا کہ وہ مالا سے صاف بات کرلیتا کیا خبر، اسے بتانا یاد ہی نہیں رہا ہو...... یا پھر مالا کے نزدیک اس بات کی کوئی وقعت ہی نہیں ہو؟ وہ حقیقت میں

شکی مزاج نہیں تھا مگر الجھنیں اکثر الجھا لیتی ہیں...... پھر جب وہ چار گھنٹے بعد گھر واپس آیا تو مالا بے قراری اسے برآمدے میں کھڑی نظر آ گئی تھی۔ اس کے چہرے پر پھیلی پریشانی نے عیسیٰ کو قدرے نادم کردیا تھا۔ وہ مالا کو بتائے بغیر جو نکل گیا تھا پھر وہ پریشان کیوں نہ ہوتی......؟ اس صورت میں بھی کہ سیل فون گھر میں ہی پڑا رہ گیا تھا۔ عیسیٰ کو ہلکی سی ندامت ہوئی۔ وہ اتنی پریشان تھی کہ عیسیٰ کو دیکھ کر خود پہ قابو نہ رکھ سکی اور پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگی۔

''کہاں چلے گئے تھے بنا بتائے؟'' اس نے سسکیوں کے درمیان روتے ہوئے کہا تھا۔ عیسیٰ کے دل کو کچھ ہوا، اس کے اندر بے قراری بڑھ گئی تھی، اس نے بہ مشکل مالا کو چپ کروایا تھا۔ حالانکہ ابھی وہ ڈھیر سارا رونا چاہتی تھی عیسیٰ کے اجنبی رویے پر اسے بہت سی باتیں بھی سنانا چاہتی تھی مگر عیسیٰ کے نرم پھولوں سے لہجے اور الفاظ کو سن کر ساری ناراضی اور غصہ بھلا گئی تھی۔ محبت میں ایسی ہی وسعت ہوتی ہے اور محبت میں ایسی ہی طاقت ہوتی ہے، مالا اس کے لفظوں سے نرم پڑ گئی تھی تو پھر عیسیٰ بھی اس کے آنسوؤں سے پگھل گیا تھا۔

''میں نے کہیں پڑھا تھا کہ کسی کو اتنا مت چاہو کہ اس کی جدائی برداشت نہ کرسکو...... مگر مجھے لگتا ہے، میں تمہاری چاہت میں بہت آگے بڑھ گیا ہوں، اتنا کہ پلٹنے کا سوال نہیں...... اگر تم مجھے کبھی دکھائی نہیں دو تو میرا کیا حال ہوگا؟'' عیسیٰ کے محبوبانہ الفاظ اور لہجے نے کچھ دیر پہلے والی کثافت کے اثر کو زائل کردیا تھا۔ وہ رونا بھول گئی تھی۔ اب وہ مسکرا رہی تھی مگر لفظ جدائی نے پھر اس کی ہنسی کا رس نچوڑ لیا تھا۔

''جدائی کی بات کیوں کرتے ہو؟ رسوائی کی بات کیوں کرتے ہو؟'' مالا کی آنکھیں پھر سے لبالب بھر گئیں۔

''آں...... ہاں...... اللہ نہ کرے، جو تمہیں بھی رسوا کروں، پھر خود سے جدا کروں......'' عیسیٰ نے مالا کو اپنے گارڈن سے ایک کلی توڑ کر دی تھی۔ مالا روتے، روتے ہنس پڑی۔ عیسیٰ نے بارش میں دھوپ نکلتی دیکھی تھی پھر دھوپ میں بارش برستی دیکھی تھی۔ دونوں منظر اس کی نگاہ کو مبہوت کر گئے تھے۔ وہ گویا مسحور سا کھڑا تھا اور اس سحر کو مالا کی آواز نے توڑا تھا۔

''آپ کو کیا ہوا تھا......؟ ایسے اٹھ کر کہاں چلے گئے تھے؟ بتانا بھی گوارا نہیں کیا۔'' مالا کا شکوہ عیسیٰ کو کچھ وقت پہلے کی ذہنی کشمکش میں دھکیل گیا تھا۔ اسے تھوڑی دیر پہلے کی اذیت یاد آ گئی...... وہ مالا سے کچھ پوچھنے اور نہ پوچھنے کے درمیان معلق ہوگیا تھا اگر اس نے انکار کردیا تو......؟ اگر جھوٹ بول دیا تو...... چاہے مصلحتاً ہی سہی۔ پھر میرے اندر وہ ٹوٹ جائے گا جو کبھی ٹوٹنا نہیں چاہیے۔'' وہ کسی تکلیف دہ ساعت کے اثر میں تھا...... وہ مالا کو بھلا کیا بتاتا......؟ وہ مالا سے کیسے پوچھ لیتا؟ اگرچہ بات بڑی نہیں تھی۔ اگر مالا خود سے شیئر کردیتی یا ہلکا سا ذکر بھی کردیتی تب اس کے اندر ایسی بے چینی نہ اترتی مگر اب کیفیات مختلف تھیں، وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ گفتگو کا آغاز کیسے کرے۔

''آپ کچھ بول نہیں رہے، آپ ٹھیک تو ہیں ناں......'' مالا کی آنکھوں میں تفکر اتر آیا تھا۔ وہ کس قدر گھبرا رہی تھی، شاید عیسیٰ کو اس کی گھبراہٹ کا اندازہ نہیں تھا مگر یہ مالا کی خام خیالی تھی، عیسیٰ اس کی بے چینی کو بخوبی سمجھ رہا تھا۔

''مجھے کچھ کام تھا اسی لیے اچانک چلا گیا۔'' عیسیٰ نے بات بنا کر کہا۔ اگرچہ بات بنانا مشکل تھا مگر وہ سچ ہی تو بول رہا تھا۔

''بتا کر تو جاتے ناں......'' وہ خفگی سے بولی۔

''آئی ایم سوری......'' عیسیٰ نے مسکینی صورت بنالی تھی تب مالا نے بڑے خفا خفا لہجے میں کہا تھا۔

''مجھے انگریزی کے اس خبیث لفظ ''سوری''

سے بہت سخت نفرت ہے۔'' وہ دھپ، دھپ کرتی اندر چلی آئی تھی، عیسٰی بھی اس کے پیچھے چلا آیا... وہ سوچ رہا تھا کہ مالا سے خفا ہونا مشکل ہے، وہ اس لڑکی سے کبھی ناراض نہیں ہوسکتا تھا۔

''میں جرمن میں سوری کرلیتا ہوں۔'' عیسٰی نے فرمانبرداری کے ریکارڈ توڑ ڈالے تھے، تب مالا نے گویا ہاتھ باندھ لیے۔

''آپ مجھے اپنی گچ مچ سے تو محفوظ ہی رکھیں......'' وہ تپ کر بولی تھی۔

''تو پھر کیا کروں......؟'' عیسٰی حقیقت میں سوچنے لگا تھا، مالا کی خفگی کتنی جان لیوا تھی اور اس کے آنسو دیکھنا مشکل ترین کام تھا۔ وہ خود سے عہد کررہا تھا کہ اب کبھی مالا کو نہیں رُلائے گا۔

''کچھ نہیں......'' مالا بے نیازی سے کندھے اچکا کر رہ گئی۔

''لغت میں اس کے کیا معنی ہیں؟'' وہ ہونق پن سے بولا تھا پھر مالا کو بے ساختہ ہنستے دیکھ کر جھینپ گیا۔

''تم بھی ناں......'' اسے ہنسی آنے لگی تھی کیونکہ مالا بھی ہنس رہی تھی۔ اسی ہنسنے مسکرانے کے چکر میں عیسٰی کو پھر وہی فون کال یاد آگئی تھی۔ لحہ بھر پہلے کھلنے والی گرہ پھر سے بندھ گئی۔ اس نے مالا کو چائے بنانے کے لیے بھیج دیا تھا...... جب تک وہ واپس آئی، عیسٰی لفظوں کو ترتیب دے چکا تھا...... وہ اس کے قریب بیٹھ گئی تھی پھر عیسٰی نے مالا سے ہلکی پھلکی بے شمار باتیں کی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی، اس کے بچپن کی، گھر والوں کی، تایا، تائی، بندیا اور اس کے بھائیوں کی بے شمار باتوں کے دوران اسے پتا چلا تھا کہ ذیشان اپنی کزن عینی میں انٹرسٹڈ ہے، ان دونوں بہنوں کو عینی پسند نہیں تھی۔ عینی میں نخرہ اور غرور تھا۔ ان کی ممی یعنی عیسٰی کی تائی بہت نرم مزاج اور حلیم الطبع خاتون تھیں۔ اپنے بچوں پر زور زبردستی کی قائل نہیں تھیں۔ عیسٰی کو اپنی تائی اور کزنز سے ملنے کا بہت شوق تھا۔ کبھی زندگی میں موقع نہیں ملا تھا کہ وہ ان سے مل سکتا......اب اس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ جلد ہی مالا کو لے کر پاکستان جائے گا۔ وہ اپنے بہن، بھائیوں کے لیے بہت اداس تھی، اگرچہ منہ سے کہتی نہیں تھی پھر بھی عیسٰی، مالا کی فیلنگز سمجھتا تھا اور عیسٰی کو یہ بھی پتا تھا کہ وہ بندیا اور ذی شاہ کو بہت مس کرتی تھی۔ اسے بندیا سے بہت پیار تھا، ان دونوں بہنوں کی بہت دوستی تھی۔ عیسٰی کو خبر تھی ذیشان تھوڑا اسیلفش تھا یعنی اپنی ذات کے بارے میں سوچنے والا...... ذی شاہ کچھ بے پروا تھا جبکہ زرشام یعنی شامی بہت شرارتی تھا۔ وہ مالا کی زبانی گھر کے ہر فرد کی عادت، مزاج اور شخصیت کے بارے میں جان چکا تھا۔ وہ ان سب سے ملنے کا خواہشمند تھا، پاپا کی خواہش تھی کہ مون کی شادی کرکے وہ بھی ان کے ساتھ پاکستان چلے جاتے مگر فی الحال یہ ممکن نہیں تھا۔ مون شادی کے لیے تیار ہی نہیں ہورہی تھی۔

فی الوقت وہ مالا سے اس کے گھر کی ہر چھوٹی، بڑی بات ڈسکس کرنے کے بعد قدرے ریلیکس ہوگیا تھا پھر اسی ریلیکس موڈ میں اس نے بے حد سرسری سے لہجے میں مالا سے اصل بات پوچھنے کی کوشش کی تھی۔ وہی بات جس نے عیسٰی کو اندر سے کچھ مضطرب کررکھا تھا۔ اس کا انداز اتنا سرسری سا تھا کہ مالا ہرگز بھی چونکی نہیں تھی جیسے معمول کی باتیں کرتے ہوئے اچانک کسی کا ذکر چھیڑ لیا جائے بالکل اسی طرح عیسٰی نے آفاق کی بات چھیڑ لی تھی۔

''تم نے کبھی آفاق سے بات کی؟ یا تمہاری کبھی آفاق سے بات ہوئی؟'' عیسٰی کا انداز اتنا عام اور نارمل سا تھا کہ مالا ہرگز بھی ٹھٹکی نہیں تھی بلکہ کچھ یاد آنے پر سرسری سے انداز میں بولی تھی۔

''ہاں تو...... جس روز سوزن کو کال کی تھی، فون تب تانیہ نے اٹھایا تھا۔ انہیں میری بات سمجھ نہیں

آسکتی تھی سو انہوں نے پاس بیٹھے آفاق کو فون پکڑا دیا تھا پھر اس سے کافی بات ہوئی، مجھ سے سفارش کرنے کو کہہ رہا تھا۔ میرے ذہن سے بھی نکل گیا۔ بے چارہ کافی اچھا ہے اور جاب لیس بھی۔'' آفاق کے ذکر نے مالا کو اس کی درخواست بھی یاد کروادی تھی بھلے وقت میں عیسٰی نے بھی آفاق کا ذکر چھیڑا تھا۔ وہ اس سے آفاق کی جاب کے متعلق کہہ سکتی تھی، اگرچہ مالا کو انسانوں کی پہچان تو نہیں تھی مگر آفاق اسے بہت مخلص، سادہ اور ہمدرد سا لگا تھا پھر عیسٰی کی تو اتنی تعریف بھی کرتا تھا اور مالا کو ہر وہ بندہ پسند تھا جو عیسٰی کی تعریف کرتا۔

''آں...... تو اس نے تم سے کہا، جاب کے لیے سفارش کرو؟'' عیسٰی ایک دم حیران ہوگیا تھا، وہ کچھ دیر پہلے کی الجھن کیا رفع ہوئی تھی اس کی ساری چونچالی لوٹ آئی تو اس کا اندازہ ٹھیک ہی نکلا تھا۔ مالا اسے آفاق کے بارے میں بتانا بھول گئی تھی۔ یہ اتنی اہم بات بھی نہیں تھی کہ جسے مالا یاد رکھتی...... عیسٰی کو مالا اس لمحے بہت پیاری لگی تھی، انتہائی سادہ، معصوم اور تھوڑی، تھوڑی بھلکڑ......

''جی ہاں اس نے کہا...... آپ میری بات کبھی نہیں ٹالیں گے سو میں جاب کے لیے آپ سے کہوں......'' مالا نے بڑے مان بھرے لہجے میں کہا۔ عیسٰی کو اس کا مان توڑنا اچھا نہیں لگا تھا سو کچھ سوچ کر اثبات میں سرہلا گیا۔

''بات تو میں تمہاری کبھی نہیں ٹال سکتا۔ مگر یہ آفاق بطور سیکریٹری میرا ناک میں دم کردیتا ہے۔'' عیسٰی نے اسے کچھ سابقہ واقعات بھی بتائے تھے جسے سن کر وہ ہنس، ہنس کر دہری ہوتی رہی۔

''وہ پرسنل سیکریٹری کے بجائے بیوی بننے کی کوشش کرتا ہے، تمہیں تو پتا نہیں ہوگا میں نے اپنی قابل ترین سیکریٹری ایلنس کو ہٹا کر اسے پاپا کے کہنے پر جاب دی تھی مگر اس نے مجھے ذلیل وخوار کردیا......''

عیسٰی ہنستے ہوئے مالا کو بتا رہا تھا کہ ڈچ سے نابلد ہونے کی وجہ سے آفاق نے کہاں، کہاں اسے ستایا نہیں تھا۔ تنگ آکر اس نے پاپا سے شکایت کی، پاپا نے شاید مون سے ذکر کیا تھا پھر اسے مون کے انسٹی ٹیوٹ میں ایڈمیشن مل گیا۔ حالانکہ عیسٰی چاہتا تھا اُدھر بھیجنے کے بجائے وہ یہاں کے کسی ادارے سے لینگویج کورس کرلے۔ آفاق جلدی سیکھ جانے والوں میں سے تھا اور اب یقیناً اس کا کورس کمپلیٹ ہونے کے قریب پہنچ چکا تھا تبھی اسے جاب کی پریشانی ہورہی تھی۔ حالانکہ آفاق کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تھی جب تک عیسٰی یا پاپا یہاں تھے وہ کسی بھی پاکستانی کو پریشان ہونے نہیں دیتے تھے۔

ان کی گفتگو کا اختتام خوشگوار موڈ پر ہوا تھا اور ہمیشہ کی طرح عیسٰی نے مالا کو علم وحکمت اور دانائی سے گندھی آخری بات سمجھائی تھی۔ وہ ایسی باتیں عموماً کرتا رہتا تھا مگر گفتگو کے اختتام پر اس دانائی بھری بات کی مالا کو سمجھ نہ آئی تھی۔ عیسٰی نے اٹھ کر بیڈ روم کی طرف جاتے ہوئے کہا تھا۔

''ایک بات تمہیں سمجھاؤں گا مالا......! تھوڑی، تھوڑی نادان لگتی ہو، شاید کم عمری کی وجہ سے یا پھر آگہی کے در منکشف نہیں ہوئے تم پر...... ویسے بھی ہم جو کچھ سیکھتے ہیں کتبِ حیات میں سیکھتے ہیں.... درسگاہیں، اسکول، یونی ورسٹیز ہمیں کچھ نہیں سکھاتیں...... شاید کتابِ حیات تمہیں بہت کچھ سکھا دے مگر اس سے پہلے ایک بات یاد رکھنا، اگر سچائی کو اس کی اصل ضرورت کے وقت پیش نہ کیا جائے تو پھر اس کے وجود کا اعتراف بیکار ہوجاتا ہے، امید ہے تم سمجھ گئی ہوگی......'' وہ نرم الفاظ میں بولتا ہلکا پھلکا ہو کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ عیسٰی نے مالا کو سرزنش کی تھی یا تنبیہہ......؟ جو بھی تھا علی عیسٰی کی بات کو مالا نے اپنی گرہ سے ضرور باندھ لیا تھا۔

اس سے اگلا دن مالا کے لیے خاصا مصروف

تھا، ناشتے کے بعد وہ انسٹی ٹیوٹ پہنچ گئی تھی۔ آج کی کلاس بہت اہم تھی، اس کی اتالیق نے چھٹی سے منع کیا تھا۔ آج اسے یہ سیکھنا تھا کہ اگر اچانک اسے کیمسٹ یا ڈاکٹر کے پاس جانا پڑ جائے تو اسے کیا کہہ کر اپنا مسئلہ بتانا ہوگا۔ اہم نکات ہمیشہ کی طرح وہ اپنی ڈائری میں لکھ رہی تھی اگرچہ اس نے زیادہ امید نہیں رکھی تھی کہ وہ زبان سیکھ جائے گی مگر پھر بھی عیسیٰ کے لیے یہ گھونٹ تو بھرنا ہی تھا...... وہ برابر اسے ڈھارس بندھاتا تھا کہ مالا کو دل چھوٹا نہیں کرنا چاہیے...... کوئی بھی کام مشکل ضرور ہوتا ہے مگر ناممکن نہیں، بس اسی حوصلے کی بدولت وہ دل بڑا کر کے روزانہ کلاس اٹینڈ کرنے آجاتی تھی۔

جرمن زبان سیکھنے کی اس کلاس میں اس کی سب سے اچھی ہیلو ہائے ہوگئی تھی جبھی اس روز، ہیرا نام کی لڑکی...... کلاس فیلوز کے بارے میں اپنی رائے دے رہی تھی۔ ایک، ایک کر کے سب کی باری آتی گئی اور مالا کے بارے میں وہ کہنے لگی۔

''مالا علی عیسیٰ، این فاخ پوپے'' (سادہ گڑیا)

ہیرا کی دمکتی آنکھوں میں سچائی کے رنگ تھے۔ پوری کلاس نے گویا تائید میں پُر جوش تالیاں بجائی تھیں...... وہ سب لوگ مالا کے لیے ان الفاظ پہ متفق تھے اور بہت خوشی کا اظہار کر رہے تھے، مالا نے ان سب کے دلوں میں اپنا ایک مقام بنالیا تھا۔ خصوصاً ہیرا کے دل میں مالا کے لیے خوب جگہ نکل آئی تھی۔

وہ ہیرا کے الفاظ پر غور کر رہی تھی۔ اور یوں ہی اچانک ذہن میں کچھ کلک ہوا تھا۔ اسے بوا ریا کے چھوٹے سے قصبے میں اس ہاؤس فراؤ کے الفاظ یاد آئے تھے جو اس نے مالا کے لیے کہے تھے۔ ''این فاخ پوپے اور پھر اس رات سوزن، مون سے کچھ کہہ رہی تھی۔ مالا کے ذہن میں پھر سے جھما کا ہوا تھا۔ سوزن کیا کہہ رہی تھی، کس کے بارے میں کہہ رہی تھی؟ مالا کو سب خبر ہوگئی...... سوزن کے وہ الفاظ مالا کو بھولے نہیں تھے۔ بھول سکتے ہی نہیں تھے۔

''این فاخ......'' (سادہ) وہ مون سے کہہ رہی تھی، وہ مالا کے متعلق ہی بات کر رہی تھی...... وہ مون کو شاید سمجھا رہی تھی کہ مالا بہت سادہ ہے۔ وہ اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں...... مون اسے لفظوں سے tease (ستایا) نہ کرے...... یقیناً سوزن جانتی تھی کہ مون، ضرور مالا کو ٹیز کرے گی۔ تبھی اسے سمجھا رہی تھی کہ مالا ایسی نہیں...... وہ سادہ اور معصوم ہے، بے خطا ہے، اسے تنگ مت کرو...... مالا کے آنے سے پہلے شاید یہی باتیں ہو رہی تھیں۔ وہ اسکول کے گراؤنڈ میں چلتی ہوئی مسلسل سوزن کو سوچ رہی تھی۔ سوزن کی محبت کو سوچ رہی تھی، سوزن کے خلوص کو سوچ رہی تھی۔ وہ اپنی دوست نما بہن مون سے مالا کی خاطر الجھ رہی تھی۔ ایک اجنبی اور غیر لڑکی کی خاطر لڑائی کر رہی تھی۔ مون کو سمجھا رہی تھی بلکہ مون کو خفا اور ناراض کر رہی تھی۔ سوزن کتنی اچھی، کتنی نیک، کتنی عظیم تھی۔ اس پل مالا کے دل میں سوزن کے لیے محبت اور خلوص کے چشمے پھوٹ رہے تھے۔ سوزن اس کے سامنے ہوتی تو وہ اس کا منہ چوم لیتی...... سوزن کی محبت نے گویا مالا علی عیسیٰ کو بن داموں خرید لیا تھا۔

☆☆☆

مالا نے عیسیٰ کو بتایا تھا کہ پہلے پہل اسے ہیرا اچھی نہیں لگی تھی، تھوڑی شوخ اور چھچھوری محسوس ہوئی تھی مگر اس سے تفصیلی بات کر کے اس کی سوچ بدل گئی۔ وہ خوش مزاج اور ہنسوڑ لڑکی تھی۔ مالا سے فٹ دوستی گانٹھ لی...... اب مالا کو اپنی سوچ پر ندامت تھی...... خواہ مخواہ وہ ہیرا کو چھچھوری سمجھتی رہی تھی۔ وہ اپنے لینگویج اسکول کے کلاس فیلوز کے بارے میں عیسیٰ سے باتیں کر رہی تھی۔

''ہر انسان کا ایک نہ ایک روپ آپ سے چھپا ہوا ضرور ہوتا ہے ورنہ آپ کسی کے خاص رویے پر

چونکتے نہیں...... اب تمہیں پتا چلا ہے کہ ہیرا چھچھوری نہیں بلکہ خوش مزاج اور ہنسوڑ ہے۔ پانی میں اترے بغیر اس کی گہرائی کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا، انسان کو سمجھے، پرکھے اور جانے بغیر اس کی شخصیت پہ فتویٰ بھی نہیں لگایا جاسکتا۔'' وہ علی عیسیٰ تھا، کوئی بھی بات بنا مقصد کیے جانے کو گناہ سمجھتا تھا۔ وہ زندگی کو محتاط انداز میں برتنے والا بندہ تھا۔ اس نے مالا کو ایک مرتبہ بتایا تھا کہ اس نے آج تک کسی سے بداخلاقی نہیں کی، کسی کا برا نہیں چاہا، فحش کلامی نہیں کی...... کلاس فیلو سے ایک حد تک انسیت اور لگاؤ بھی رکھا...... مگر دوستی میں حدود وقیود کا خاص دھیان رکھا تھا۔ نہ اتنا میٹھا ہوا کہ لوگوں نے اسے نگل لیا، نہ اتنا کڑوا ہوا کہ لوگوں نے اسے تھوک دیا...... اس نے باپ سے سیکھے علم، ہنر اور فن کو مٹھی میں قید کر کے زندگی کا سفر شروع کیا تھا...... اسے میانہ روی نے کبھی ڈگمگانے نہیں دیا...... وہ اپنا فن مالا میں منتقل کرنے...... پر بضد نہیں تھا وہ تو بس اسے زندگی کے نشیب و فراز کے متعلق سمجھانا چاہتا تھا۔

''مالا ہر مسکراہٹ کے پیچھے خلوص نہیں ہوتا اور نہ ہر خلوص بھری مسکراہٹ کے پیچھے منافقت ہوتی ہے۔ بات معمولی ہے اگر سمجھ لی جائے۔'' وہ اسے بتانا چاہتا تھا، بھروسے اکثر ٹوٹ جاتے ہیں، وہ بھی ہر کسی پر بھروسا نہیں کیا کرے، عیسیٰ اسے سمجھا دینا چاہتا تھا کہ وہ اپنی تکون کو گھر، عیسیٰ اور جاچو تک محدود رکھے، اسے وسیع کرے گی تو توڑ...... دے گی اور عیسیٰ کو پورا یقین تھا کہ وہ عنقریب تین کی اس تکون کو وسیع کرنے کی خواہش کرے گی، وہ مون کے متعلق بات کرے گی، مالا اسے اپنی زندگی میں شمولیت کی دعوت دے گی اور حیرت انگیز طور پر مالا نے گفتگو کا رخ ہیرا سے ہٹ کر مون کی طرف موڑ دیا تھا۔ وہ بہت سادگی بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''میں ہیرا کو بہت چھچھوری سمجھتی تھی مگر وہ ایسی نہیں، اسی طرح مون کو بہت عجیب اور پُراسرار سمجھتی ہوں، مجھے لگتا ہے، مون بھی ایسی نہیں......'' یہ ایک عام سی سوچ تھی جسے اس نے عیسیٰ سے شیئر کرلیا تھا۔ عیسیٰ کھانا ختم کر کے نیپکن سے ہاتھ صاف کر کے مالا کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ کھانا کھاچکا تھا...... اب مالا کی بات ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔

''دیواریں محض قلعوں کی نہیں ہوتیں مالا......! دل کے اندر بھی ایک دیوار ہوتی ہے، وجود کے اوپر بھی ایک دیوار ہوتی ہے، انسان اپنی ذات کو پرت در پرت چھپائے رکھتا ہے۔ انسانی ذہن، سوچ اور شخصیت کو کھوجنا آسان نہیں، کوئی اس کھوج میں آگے تک نکل جاتا ہے اور سمجھو، یا تو وہ بھٹک جاتا ہے یا انسانیت کی اعلیٰ معراج پالیتا ہے۔ تمہیں میری کہاوتیں حیران کرتی ہیں ناں......؟ دراصل میں نے ڈسکو کلب میں وقت ضائع نہیں کیا، نہ شراب کے نشے میں اپنے حواس معطل کیے ہیں، اپنی تھوڑی سی عمر کا زیادہ تر وقت صحت مندانہ سرگرمیوں میں گزارا ہے۔ تبھی کچھ نہ کچھ وہ پاچکا ہوں جس کی خواہش تھی...... اور جہاں تک مون کی بات ہے تو اس کے بارے میں کیا کہوں؟ جب تک پتھروں سے واسطہ نہ پڑے، ان کی سختی، نوکیلے پن اور وزن کا اندازہ نہیں ہوسکتا اور پھر ہر کوئی الفاظ کو اپنی سمجھ کے مطابق ڈھالتا ہے۔'' عیسیٰ نے کتنی روانی اور سبھاؤ سے مالا کو بہت کچھ باور کروانے کی کوشش کی تھی۔ وہ تو بزنس کی کتابیں پڑھتا رہا تھا یہ حکمت، دانائی اور فلسفہ کہاں سے سیکھ گیا؟ مالا کو لگا، وہ اپنے سامنے ایسے نوجوان لڑکے کو دیکھ رہی ہے جو اپنی ذات میں ایک پوری یونیورسٹی ہے جبکہ وہ خود کو چھوٹا سا کتب خانہ بھی ماننے کو تیار نہیں تھا۔

''تو کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مون وہ نہیں جو نظر آتی ہے؟'' اس کے بے تکے سوال کو سن کر عیسیٰ نے بردباری کی انتہا کردی تھی۔ وہ جھنجلائے بغیر ایک مرتبہ

پھر رک گیا۔ حالانکہ اسے دفتر سے دیر ہو رہی تھی، یہ بھی حقیقت تھی کہ دفتر اپنے باپ کا ہی تھا مگر وقت کی پابندی تو لازم تھی چاہے مالک ہو یا ملازم......

”خاموشی بغیر تخت کی بادشاہی ہے۔“ عیسیٰ کی مسکراہٹ نہ جانے کہاں سے اُمڈ آئی۔ مالا اس کی کوئی اور بات سمجھتی یا نہ سمجھتی مگر یہ بات ضرور سمجھ گئی تھی۔ اسی لیے فوراً منہ پھول کر کُپّا ہو گیا تھا حالانکہ عیسیٰ کے لہجے میں کتنی شرارت تھی مگر وہ سمجھ ہی نہیں پائی۔

”آپ کا مطلب ہے، میں بولوں ہی نہ......“ اس نے بھنا کر کہا تھا، عیسیٰ کی توقع کے عین مطابق وہ ناراض ہو گئی تھی۔

”میں نے بس اتنا کہا ہے کہ فضول بولنے سے بہتر خاموشی ہے۔“ عیسیٰ نے فوراً وضاحت کی تھی مگر یہ وضاحت کارگر ثابت نہیں ہوئی۔ مالا کا موڈ ٹھیک نہیں ہوا جبکہ وہ چاہتا تھا کہ موّن کی شخصیت پر مزید بات نہ ہو، ٹاپک بدلنے کے لیے مالا کی ہلکی پھلکی خفگی اسے گوارا تھی مگر اب کہ ...... مالا ذرا سیریس قسم کی ناراض ہو چکی تھی۔

”آئندہ آپ میری آواز نہیں سنیں گے۔“ وہ عجلت میں کرسی پیچھے کر کے اٹھ گئی تھی جبکہ عیسیٰ اس حملے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا وہ لمحے بھر کے وہ بھونچکا رہ گیا...... پھر اسے فوراً احساس ہوا تو مگر ذرا دیر ہو ہی گئی تھی۔ مالا نے کمرے میں جا کر دروازہ لاک کر لیا تھا۔ یعنی عائلی زندگی کا پہلا سنجیدہ ٹائپ کا جھگڑا...... مگر جھگڑا تو ہوا نہیں تھا۔ بلاوجہ ناراضی ہو گئی تھی۔ عیسیٰ بے چارہ پریشان سا ہو گیا...... اس نے دیکھا تھا، مالا نے کھانا بھی نہیں کھایا...... اور اب ناراض ہو کر اندر بند ہو گئی تھی، عیسیٰ نے پاپا کو پریشان کرنے کے خیال سے کچھ نہیں بتایا تھا نہ انہیں جگا کر فکر مند کیا...... وہ خود ہی مالا کی منتیں کرتا رہا...... اسے دفتر جانا ہی بھول گیا تھا۔ اپنے بیڈ روم کے باہر کھڑے ہو کر مالا کو آوازیں دے دے کر بولنے پر مجبور کرنے کا تجربہ بھی خاصا انوکھا تھا۔ وہ ایک پریکٹیکل لڑکا تھا۔ شروع سے لے کر اب تک خاصا روکھا مزاج بھی تھا مگر مالا کے اس کی زندگی میں چلے آنے کے بعد بہت سی تبدیلیاں آئی تھیں۔ وہ پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔

اب وہ دروازے پر دستک دے رہا تھا اور دستک دینے والا بھی ایک حد تک دستک دیتا ہے اگر کواڑ بروقت نہ کھولے جائیں تو دستک دینے والے ہاتھ گر جاتے ہیں، قدم پلٹ جاتے ہیں، وہ اس فلسفے کی گہرائی سے ابھی تک واقف نہیں تھی۔ دوسری طرف وہ بڑی مستقل مزاجی کے ساتھ باہر کھڑا اپنا سب سے ضروری کام کر رہا تھا...... بھلا مالا کو منانے کے علاوہ فی الحال کوئی اور اہم کام ہو سکتا تھا؟

”وقت ضائع کرتے وقت اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ وقت آپ کو بھی ضائع کر رہا ہے۔“ عیسیٰ نے اونچی آواز میں اسے سنانے کو کہا تھا۔ پورے سات منٹ گزر چکے تھے۔ وہ گھڑی پر نگاہیں جمائے کھڑا تھا۔ اندر سے ذرا سی بھی آہٹ نہیں آ رہی تھی۔ عیسیٰ سخت بے چین تھا اور اندر تک اس کی بے چینی، بے قراری اور بے تابی کی آہٹیں پہنچ رہی تھیں مگر دروازہ پھر بھی کھل کر نہ دیا...... دس منٹ چپکے سے نکل گئے۔ مالا کی ناراضی شدید نوعیت اختیار کر رہی تھی۔ حالانکہ بات اتنی بڑی نہیں تھی۔ وہ اور بھی بے قرار ہوا...... نظریں گھڑی کے آر پار ہو رہی تھیں۔

عیسیٰ زیرِ لب آنکھیں بند کیے بڑبڑاتا رہا...... تیرھواں، چودھواں اور پندرھواں منٹ گزرنے والا تھا۔ اچانک چرچر کی آواز سے دروازہ کھل گیا تھا بلکہ کھلا نہیں، باہر کی صورتِ حال ملاحظہ کر کے پھر سے بند کر دیا گیا تھا۔ عیسیٰ پھر سے بھونچکا رہ گیا...... اس نے انتہائی دلسوز لہجے میں آہ بھر کر کہا تھا۔

”آپ کا پل پل بدلتا رویّہ، آپ سے وابستہ لوگوں کو پل پل اذیت میں مبتلا کر رہا ہے۔“ اس کے بھیگے لہجے میں مقناطیس کی سی کشش تھی۔ کاش وہ پہلے یہ حربہ استعمال کر لیتا، مالا نے فوراً دروازہ کھول دیا تھا۔ عیسیٰ کے سامنے اس کا دکھی سا چہرہ آ گیا...... اس نے بے ساختہ مالا کی افسردگی دیکھ کر کہا۔

”ہٹ دھرمی سردیوں کی برف جیسی ہوتی ہے، نری بے فائدہ...... نہ اس کی ضرورت ہوتی ہے نہ قدر...... جس بات کی وضاحت کرنے کے لیے زبان ہو، اسے استعمال کر لینا چاہیے۔“ عیسیٰ کے نرم الفاظ پر وہ خفگی سے منہ پُھلا کر جتانے والے انداز میں بولی۔

”اور اسی زبان کو اگر بند کرنے کا حکم دیا جائے تو......؟“ مالا کے طنزیہ لہجے کو محسوس کر کے وہ مسکرا دیا تھا۔

”بات الفاظ کی نہیں، لہجے کی ہوتی ہے، تم نے الفاظ پر غور کیا...... لہجے پر نہیں...... اگر غور کر لیتیں تو غصہ نہ کھاتیں...... مگر غصہ تو تمہیں کھانا ہی تھا۔ بھوک جو لگ رہی ہے۔“ اس نے پہلے سی شرارتی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا...... تب مالا کو خیال گزرا...... عیسیٰ نے کہاوت غصہ دلانے والی بولی تھی مگر اس کی مسکراہٹ اچانک امڈ آئی تھی۔ شرارتی سی مسکراہٹ، تھوڑی چڑانے والی، تھوڑی زچ کرنے والی، اسے عیسیٰ کی بات ٹھیک لگی تھی اس نے الفاظ پر غور کیا تھا لہجے پہ نہیں...... مگر تائید کر کے اسے اترانے پر مجبور نہیں کر سکتی تھی۔

”میں آپ کے فلسفے سے متاثر ہو کر دروازہ کھولنے پر مجبور نہیں ہوئی، بات فقط اتنی ہے کہ میں آپ کو ناراض نہیں کر سکتی اور نہ آپ کی خفگی سہہ سکتی ہوں۔“ مالا نے نم آواز میں سچ اگل دیا تھا۔ عیسیٰ کے لیے مالا کے یہ الفاظ گویا امرت تھے۔ وہ سرتاپا سرشار ہو گیا۔

”کچھ چیزیں ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہوتی ہیں۔ جیسے پھول کے ساتھ خوشبو جیسے چاند کے ساتھ ستارے...... جیسے دن کے ساتھ رات...... جیسے روشنی کے ساتھ اندھیرا...... اسی طرح روٹھنے اور منانے کا سنگم بھی بہت پرانا ہے۔ الفاظ جیسے بھی ہوں، مطلب ایک ہی نکلتا ہے، نہ تم میری خفگی سہہ سکتی ہو اور نہ میں تمہیں خفا کر کے دنیا کے کسی کام کا ہو سکتا ہوں۔ میرے سارے کام اب تمہی سے شروع ہو کر تمہی پر ختم ہوتے ہیں۔ سو اب ناراضی ختم، آرام سے بیٹھ کر کھانا کھا لو، بھوکے پیٹ تو بولا بھی نہیں جاتا، ناراضی تو دور کی بات ہے۔“ وہ اسے واپس میز تک لے آیا تھا، مالا خفگی بھلا کر اس بے پایاں محبت بھرے احساس رکھنے والے انداز پر مسکرا دی تھی۔ ایک نرم مسکراہٹ، دلوں کی رنجش دور کر سکتی ہے اور جانے لوگ لفظوں کے ذخیرے اور دلیلوں میں وقت ضائع کیوں کرتے ہیں؟ وہ اسی بات پر غور کر رہی تھی جبکہ عیسیٰ اسے اپنے زیرِ نگرانی کھانا کھلانے کے بعد آفس چلا گیا تھا پھر چاچو اُٹھے تو مالا نے عادتاً دن بھر کی روداد انہیں سنا دی تھی۔ وہ اتنا مزے کا سین نہیں دیکھ پائے تھے، یہی عیسیٰ کی منتیں کرنے والا، سو خاصے بدمزہ ہو رہے تھے، اس کے منہ سے من وعن پوری رومینٹک اسٹوری سن کر بھی خاصے افسردہ اور رنجیدہ تھے۔

”لائیو سین کا تو اپنا ہی ایک الگ مزہ ہے۔“ انہیں شدید قلق تھا کہ مالا نے انہیں جگایا نہیں...... اب وہ انہیں تسلی دے رہی تھی کہ پھر کبھی لائیو بھی دیکھ لیجیے گا۔ چاچو سوپ پی رہے تھے جبکہ مالا فون کی بیل سن کر اٹھ گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ عیسیٰ کی ہی کال ہوگی مگر دوسری طرف سوزن تھی۔ مالا غیر متوقع طور پر اس کی آواز سن کر خوشی سے دیوانی ہو گئی تھی۔

”تم مجھے بھول گئی ہو سوزن......“ اس نے بے ساختہ شکوہ کیا تھا۔ دوسری طرف سوزن متانت سے ہلکا سا مسکرائی تھی۔ مالا کا شکوہ سوزن کو بہت اپنائیت بھرا لگا تھا۔ وہ اس کی غلط فہمی فوری طور پر دور کرنا چاہتی تھی مگر اسی پل آفاق گھر میں داخل ہوا تھا۔ سوزن کچھ حیران ہوئی، وہ بیگ اٹھائے آیا تھا تو کیا وہ جانے والا تھا......؟ رات کو گروسی بھی آفاق کی واپسی کے متعلق کوئی بات کر رہی تھیں مگر سوزن کا ان

www.paksociety.com

کی طرف دھیان نہیں تھا...... اب آفاق کے بیگ کو دیکھ کر اسے خیال آیا تھا کہ اس کا کورس کمپلیٹ ہو چکا ہے، اس نے اشارے سے آفاق کو بیٹھنے کے لیے کہا تھا۔ جب وہ لاؤنج کے ایک کونے میں رکھے صوفے پر بیٹھ کر میگزین اٹھائے ورق گردانی کرنے لگا تب سوزن، مالا کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

''میں تمہیں ہرگز بھی نہیں بھول سکتی۔'' سوزن کے محبت بھرے الفاظ نے آفاق کو کچھ چونکا دیا تھا...... وہ جو ذرا بے پروا سا بنا بیٹھا تھا، اب کچھ چوکنا ہو گیا۔

''یہ کس سے بات کر رہی ہے؟ وہ بھی اردو میں......'' تجسس جیسا بھی ہو، انسان کی فطرت میں ضرور شامل ہوتا ہے، آفاق بھی سوچوں کے گھوڑے دوڑانے لگا تھا۔ یقیناً فون پر حسیب انکل نہیں تھے، ورنہ سوزن کا یہ انداز نہ ہوتا...... عیسیٰ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ سوزن سے اس طرح بات کرے...... وہ عیسیٰ کو اچھی طرح سے جانتا تھا پھر فون پر دوسری طرف کون تھا؟

''کیوں نہیں، میں چکر لگاؤں گی، تم شولے (اسکول) جا رہی ہو؟'' سوزن نے سابقہ مٹھاس بھرے لہجے میں کہا تھا۔ اب کہ آفاق کے ذہن میں کلک سے کچھ روشن ہوا۔

''اوہ ....تو دوسری طرف مالا ہے۔'' غبارے میں سے نکلنے والی ہوا کی طرح آفاق کا تجسس ''پھر'' ...... سے نکل گیا تھا، وہ ایک مرتبہ پھر میگ کی طرف متوجہ ہونے سے پہلے بولا تھا، دوسرے معنوں میں اس نے سوزن کو یاد دلانا چاہا تھا کہ وہ بھی یہاں موجود ہے۔

''مالا سے کہہ دو، میری میزبانی کے لیے تیاری پکڑ لے...... میں کل وہاں پہنچ رہا ہوں...... عیسیٰ سے فون پر بات ہو گئی ہے۔'' آفاق نے کمالِ شاہانہ انداز میں بے تکلفی کا مظاہرہ کیا تھا تب سوزن کچھ اچنبھے سے ریسیور پر ہاتھ رکھے بغیر بولی۔

''تم عیسیٰ کے گھر میں رہو گے؟'' سوزن نے شدید حیرت کا مظاہرہ کیا تھا کیونکہ آفاق کسی کے گھر پر ٹھہرنا..... پسند نہیں کرتا تھا۔ گروی کے بہت دفعہ اصرار پر بھی وہ ریںٹ پر کمرا لے کر رہنے پر بضد رہا تھا اور ان کے گھر ٹھہرنے کو ترجیح نہیں دی تھی پھر اب بھلا کیسے مان گیا تھا؟ سوزن کیوں نہ حیران ہوتی......؟

''ہاں...... جناب شرط یہی رکھی ہے، حالانکہ میں نے اتنا کہا، پہلے کی بات اور تھی...... اب تو مالا بھی ہے، اچھا نہیں لگتا مگر عیسیٰ نہیں مانا...... مجھے دھمکی دی کہ جاب نہیں دے گا...... مجبوراً اس کی بات ماننا پڑی...... ورنہ میں جاب کے لیے کہاں دھکے کھاتا......؟ تم تو جانتی ہو ناں میرے گھر کے سارے حالات...... ماں کو حج کروانا ہے، دادی کے کڑے، بہنوں کی شادیاں وغیرہ...... وغیرہ......'' وہ آفاق تھا، مختصر جواب نہیں دے سکتا تھا، سوزن تو اسے چھیڑ کر پچھتائی تھی جبکہ دوسری طرف مالا نے بھی آفاق کی لن ترانیاں سن لی تھیں۔ اب وہ سوچ رہی تھی کہ اتفاقاً آج بھی آفاق یہاں موجود ہے۔ اس کی موجودگی میں پارسل کے بارے میں پوچھنا مناسب رہے گا؟ کچھ دیر کی کشمکش کے بعد بالآخر مالا نے سوزن سے پوچھ لیا...... بلکہ بہت مناسب طریقے سے شکریہ ادا کرنا چاہا تھا۔

''تم نے مجھے گفٹ بھیجا تھا، اس کے لیے بہت شکریہ......'' اس نے بڑے محتاط الفاظ کا استعمال کیا تھا۔ دوسری طرف سوزن کچھ حیران رہ گئی تھی۔ ابھی اس کے لبوں میں یہی الفاظ تھے کہ ''کون سا گفٹ......؟'' جب اچانک لاؤنج کے دروازے میں کھڑی موں پر اس کی نظر پڑی تھی، عین اسی لمحے آفاق نے بھی لاؤنج کے دروازے کی طرف دیکھا تھا، پھر اس کی آنکھیں ایک عجیب سا منظر دیکھ کر گویا ابل کر باہر آ گئی تھیں۔ اس نے موں کی سحر طراز

آنکھوں میں سے ایک مقناطیسی لپک نکلتی دیکھی تھی، شاید لمحے کے آخری حصے سے بھی پہلے وہ لپک سوزن تک سفر کر گئی۔ گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ بات ہوئی! یا پھر سوچ سے سوچ ٹکرائی تھی؟ جہاں انسانی عقل دم بخود رہ جائے وہیں سے معاملے کی شروعات ہوئی تھی۔ محض ایک لمحے کی دیر تھی۔ آفاق اب سوزن کی آواز سن رہا تھا جبکہ اس ایک لمحے میں نہ جانے کیا سے کیا ہو گیا تھا؟

''ہاں...... گفٹ میں نے بھیجا تھا مگر شکریے کی ضرورت نہیں۔'' سوزن کی ٹھہری سوئی سوئی آواز میں خوابیدگی کا عنصر نمایاں تھا۔ آفاق اسے پہلے سے فون پکڑے بولتے نہ سن چکا ہوتا تو یہی سمجھتا کہ سوزن نیند سے اٹھ کر آئی ہے مگر اب تو اس کی حیرانی کا کوئی عالم ہی نہیں تھا۔ وہ اس لمحاتی اتھل پتھل کرتی کیفیت کو سمجھ نہیں پایا تھا مگر اس کے دل کی دھڑکن قابو میں نہیں آ رہی تھی...... دماغ گویا مفلوج ہو گیا تھا۔ موں کے پلٹتے ہی غیر ارادی طور پر سوزن نے فون کریڈل پر پٹخا اور آفاق کی طرف دیکھے بغیر کسی اور ہی عالم کو سوچتی راہداری کی طرف پلٹ گئی تھی جبکہ آفاق جو الوداعی سلام کرنے آیا تھا اپنے ایسے استقبال پر ششدر رہ گیا...... اس کی عقل گویا لمحے بھر کے لیے مفلوج ہو گئی تھی۔

☆☆☆

لائن اچانک ڈراپ ہو گئی تھی، مالا نے سوچا کہ دوبارہ کال کرے مگر چاچو کی پکار نے ارادہ ڈانوں ڈول کر دیا تھا۔ اور وہ جو پہلی فرصت میں بیڈ روم کے ایک کونے میں رکھی کورپ کو کھنگالنا چاہتی تھی وقتی طور پر اتنا اہم کام بھول گئی...... دراصل چاچو کی پکار میں تکلیف کے آثار محسوس ہو رہے تھے۔ وہ بھاگتی ہوئی چاچو تک آئی تو وہ کرسی سے نیچے گرے کراہ رہے تھے۔ مالا کی تو گویا جان ہی نکل گئی تھی۔ پہلی مرتبہ چاچو کو اس حالت میں کراہتے اور تکلیف

اصل وجہ

استاد: ''بھینس کی کتنی ٹانگیں ہوتی ہیں؟''

شاگرد: ''سر! یہ تو کوئی بے وقوف بھی بتا دے گا۔''

استاد: ''اسی لیے تو تم سے پوچھ رہا ہوں۔''

درد شریک

کرایہ دار نے نصف شب کو مالک مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا، مالک مکان نیند سے بیدار ہو کر جلدی سے دروازے پر آیا تو کرایہ دار بولا۔ ''میں اس مہینے کا کرایہ ادا نہیں کر سکوں گا۔''

''مگر یہ اطلاع دینے کا کون سا وقت ہے؟'' مالک مکان غصے سے بولا۔ ''تم یہ بات مجھے صبح بھی بتا سکتے تھے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر میں نے سوچا اس پریشانی میں، میں اکیلا کیوں جاگتا رہوں۔ تم بھی میرے درد شریک بھائی بنو۔''

از: نگینہ ضیا...... کیماڑی

زندگی

زندگی کی شام ہو رہی ہے
پھر بھی سکون نہیں حاصل ہمیں
چھائی ہے من پر غم کی چادر
قرار ابھی تو نہیں حاصل ہمیں
زندگی اب کم ہی باقی ہے ہماری
پھر بھی راحت کیوں نہیں حاصل ہمیں
چاہت ہے کہ گزر جائیں اب تو ہم
لیکن موت بھی اب نہیں حاصل ہمیں
کیا کریں گے ایسی زندگی کا آتا
سکون ہی جس میں نہیں حاصل ہمیں

از: آنا خولہ بنت حوا، کراچی

سے تڑپتے دیکھا تھا...... انہیں سینے میں شدید درد تھا...... مالا بھاگتے ہوئے فون تک آئی پھر عیسیٰ کو فون کر کے چاچو کی خرابی طبیعت کا بتایا تھا۔ جب تک عیسیٰ آندھی طوفان کی طرح گھر آیا تب تک مالا رو رو کر بے حال ہو چکی تھی۔ وہ مالا کو تسلی دے کر چاچو کو ایمبولینس میں ڈال کر اسپتال چلا گیا تھا۔ جبکہ مالا تنہا، اکیلی گھٹنوں میں سر دیے روتی رہی۔ اس نے تو کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ چاچو کو پھر سے سینے میں اتنا بھیانک درد اٹھے گا اور وہ اسپتال چلے جائیں گے۔ وہ جانے کتنے ہی گھنٹے بے آواز روتے ہوئے دعائیں کر رہی تھی۔ اسی دوران نماز کا وقت ہو گیا...... بکھری ہمتیں مجتمع کر کے وہ اللہ کے حضور نماز کے لیے کھڑی ہوئی تھی پھر آخری سجدے کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو آنسو پھر سے بہتے چلے گئے تھے۔ جانے وہ کب تک روتی رہتی مگر فون کی چنگھاڑتی آواز نے اسے حواس باختہ کر دیا تھا...... وہ لپک کر گرتی پڑتی فون تک گئی تھی۔ سینے میں دھڑکتا دل خوف سے.... پھڑپھڑا رہا تھا...... فون اٹھایا تو دوسری طرف سے غیر متوقع طور پر بندیا کی آواز سنائی دی تھی۔ آج پورے پندرہ دن بعد بندیا نے ہی بالآخر فون کیا تھا...... اور وہ خاصے جارحانہ تیور لیے ہوئے تھی۔ اس کی آواز سنے بغیر گویا ابل پڑی۔

''اللہ! تم جیسی بہن کسی کو نہ دے...... کبھی توفیق نہیں ہوتی فون کرنے کی...... جب بھی کیا، ہم نے ہی فون کیا...... تمہاری شادی اس لیے نہیں کی تھی کہ تم عیسیٰ کو ہی پیاری ہو جاؤ۔'' بندیا نے اتنے دن کا جمع شدہ غصہ باہر نکال دیا تھا مگر ابھی اس کی تسلی کہاں ہوئی تھی۔

''ہمیں تو تم بھول ہی چکی ہو...... ایسے بھی جرمنی میں کون سے کام ہیں جو تمہیں فرصت ہی نہیں ملتی......؟ کیا اُپلے تھاپتی ہو، فصلوں کی کٹائی کرنے جاتی ہو، بھینسوں کو چارہ ڈالتی ہو؟ آخر مصروفیت کی وجہ بھی تو معلوم ہو۔'' بندیا بھنّا بھنّا کر چیخ رہی تھی۔ پیچھے ممی شاید اسے تحمل سے بات کرنے کی تلقین کر رہی تھیں مگر وہ بندیا ہی کیا جو کسی کی سن لے...... اس کے اپنے ہی بے شمار شکوے تھے۔

''نہ شادی کی تصویریں بھیجیں...... نہ مووی، کم از کم نیٹ ہی استعمال کر لیا کرو...... جرمنی جا کر بھی بدّھو ہی رہیں......'' بندیا اب بری طرح سے لتاڑ رہی تھی۔ شاید وہ اب بھی جی بھر کے اس کی کلاس لیتی مگر مالا کی سوں، سوں نے بندیا کو حواس باختہ کر دیا تھا۔

''تم رو رہی ہو مالا......! تم ٹھیک تو ہو ناں......؟'' سابقہ بکواس بھلائے بندیا لمحے بھر میں انتہائی پریشان ہو گئی تھی۔ ''ارے، کچھ تو بولو میں ہی بولتی جا رہی ہوں...... خیریت تو ہے ناں....؟ میرا دل سخت گھبرانے لگا ہے۔'' بندیا کی دُہائیوں نے بالآخر مالا کو زبان کھولنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے روتے ہوئے چاچو کی طبیعت کے متعلق بتا دیا تھا تب بندیا بھی سخت متوحش ہو گئی تھی۔

''عیسیٰ کہاں ہے؟'' بندیا نے متفکر لہجے میں پوچھا۔

''چاچو کے ساتھ ہیں۔'' مالا کو بندیا کی آواز سن کر خاصی ڈھارس پہنچی تھی۔ تبھی قدرے سنبھل کر بتانے لگی۔

''اور تم اکیلی ہو......؟'' بندیا مزید ہراساں ہوئی۔ بہن کے اکیلے پن اور پریشانی نے اسے بھی سخت بے چین کر دیا تھا۔

''ہاں......'' اس نے دھیمی آواز میں بتایا۔

''وہ نینی کدھر ہے؟'' بندیا نے پُرسوچ انداز میں پوچھا۔

''نینی چلی گئی...... میرا مطلب ہے چھٹی پر چلی گئی......'' وہ بے ربط سی بولی تھی۔ فون انگیجڈ تھا، کیا پتا...... عیسیٰ کال کر رہا ہو، اس کا سارا دھیان اسپتال

کی طرف تھا تبھی بے دھیانی میں بول رہی تھی۔

''اچھا، تم پریشان نہ ہو...... ہم لوگ یہاں چاچو کے لیے دعا کرتے ہیں۔ انہیں کچھ نہیں ہوگا......'' بندیا نے بھرائی ہوئی آواز میں تسلی دی تھی۔ تب مالا نے سسک، سسک کر روتے ہوئے کہا تھا۔

''بندیا...... دعا کرنا، چاچو کو کچھ نہ ہو...... انہیں کچھ ہو گیا تو عیسیٰ سنبھل نہیں پائے گا، تمہیں نہیں پتا، یہ باپ بیٹا ایک دوسرے کو دیکھے بنا رہ نہیں سکتے۔'' مالا کے آنسو ایک تواتر سے گر رہے تھے۔ وہ دوپٹے کے کونے سے آنسو صاف کرتی ہوئی کھڑکی کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ پاکستان میں جانے اس وقت کیا ٹائم تھا......؟ مالا سے کچھ پوچھا نہیں گیا۔ یہاں جرمنی میں تو چوبیس گھنٹوں والا سسٹم چلتا تھا۔ دوپہر بارہ بجے کے بعد ایک دو استعمال نہیں ہوتا تھا بلکہ تیرہ اور چودہ کو استعمال کیا جاتا تھا۔ اور اس وقت عیسیٰ کو گئے ہوئے دو گھنٹے ہو چکے تھے مگر فی الحال کوئی اطلاع نہیں آئی تھی۔ مالا کا دل سوکھے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ جانے کون سی خبر کان سننے والے تھے؟ دل کو دھڑکا سا لگا تھا پھر بندیا کے بعد ممی اور شامی نے بھی بات کی تھی۔ اس کا دل اپنے بھائیوں سے اداس ہونے لگا تھا...... خصوصاً شامی اسے بہت یاد آتا تھا...... نٹ کھٹ سا چلبلا...... بالکل آفاق جیسا باتونی لگتا تھا اور ذی تو گھر میں نہیں تھا، ابھی تک ہاسٹل میں قیام تھا اس کا...... اور ذیشان سے اتنی بے تکلفی نہیں تھی۔ ممی سے اور بندیا سے بات کر کے دل کچھ پُرسکون ہو گیا تھا۔ ماں بھی کیسی ہستی ہے، اتنے فاصلوں پر بھی دل گھبرانے سے جان گئی تھی کہ سمندر پار موجود بیٹی کو کسی پریشانی نے اپنے حصار میں لے رکھا ہے۔

ممی اور بندیا کے بعد ڈیڈی نے بھی کال کی تھی۔ حسیب چاچو کے لیے وہ بہت پریشان اور بے چین تھے پھر انہوں نے عیسیٰ کا سیل نمبر لے کر اسے بھی کال کی تھی۔ مالا نے ڈیڈی سے بات کر کے فون رکھا تب ڈور بیل بج اٹھی تھی۔ وہ قدرے متوحش رہ گئی تھی۔ گھر میں اس وقت کون آ سکتا تھا؟ وہ کچھ خوفزدہ ہو گئی تھی۔ مگر یہ خوف لمحاتی تھا، کچھ دیر بعد اسے ایک اور فون کال نے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا...... اب کے آفاق کی کال آ گئی تھی۔ مالا تو فون سنتے سنتے خبطی سی ہونے لگی تھی۔ عیسیٰ کا کچھ اتا پتا نہیں تھا...... جس کی کال کا اسے انتظار تھا سوچا کہ سیل فون پر کال کر لے مگر عیسیٰ نے اس کی کال پک ہی نہیں کی تھی۔ ابھی آفاق کی غیر متوقع آواز سن کر مالا ٹھٹک گئی تھی جبکہ وہ چھوٹتے ہی منت کرنے لگا تھا۔

''اب تو دروازہ کھول دو، میں گھنٹیاں بجا، بجا کر تھک گیا...... یہ سامنے والے تمہارے نئے پڑوسی بھی اب تو آتے جاتے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھنے لگے ہیں۔'' آفاق گویا رو دینے کو تھا۔ ادھر مالا سر تا پا حیران رہ گئی تھی۔ تو کیا، کل آنے والا وہ چھلاوا آج ہی پہنچ گیا تھا؟ مالا پریشان نہ ہوتی تو کیا کرتی؟ اسے دروازہ کھولنا چاہیے تھا یا نہیں......؟ اس بارے میں عیسیٰ نے کوئی ہدایت نہیں دی تھی۔ وہ عجیب کشمکش میں مبتلا ہو گئی تھی، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آفاق کو کیا جواب دے، چاچو کی پریشانی الگ تھی اور اب یہ آفاق نئی مصیبت کی طرح نازل ہو گیا تھا۔

''تم...... آج ہی آ گئے......؟'' آفاق کے دوسری مرتبہ دہائی دینے پر مالا کے منہ سے بے ساختہ پھسلا تھا۔ اگرچہ اسے اپنی غلطی کا فوراً احساس ہو گیا تھا مگر آفاق نے قطعاً برا نہیں مانا تھا۔

''جی ہاں...... سرکار بلائیں اور ہم نہ آئیں......'' وہ لہک لہک کر گا رہا تھا مگر آواز پہلے کی طرح رونے والی تھی۔ یقیناً وہ ان سوالات پہ زچ ہو رہا تھا۔

''میں سمجھی نہیں......'' اسے آفاق کی بکواس اس لمحے زہر لگ رہی تھی۔ وہ جلدی، جلدی بات کر کے فون بند کرنا چاہتی تھی تاکہ عیسیٰ اگر کال کرے تو اسے

مشکل نہ ہو۔

"مالا خاتون! آپ کی سمجھ بھی میری سمجھ کی طرح نہ ہونے کے برابر ہے۔ میں بھی سامنے والی باتیں اور صاف دکھائی دینے والی چیزیں نہ دیکھ پاتا ہوں نہ سمجھ پاتا ہوں۔" آفاق نے انتہائی برے وقت میں فلسفہ جھاڑا تھا۔ مالا کے پلّے کچھ نہیں پڑا تھا تبھی بھنّا کر بولی تھی۔

"گھر میں اس وقت کوئی بھی نہیں...... تم پھر کبھی آجانا۔" اس نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا تھا۔

"میں جانتا ہوں گھر میں اس وقت کوئی نہیں...... اسی لیے تو آیا ہوں......" آفاق نے مالا کی بات کاٹ کر بے ساختہ کہا تھا پھر اسے اپنے لفظوں کے ہیر پھیر کا احساس ہوا تو ایک مرتبہ پھر برجستہ بولا۔

"بلکہ اسی لیے تو بلوایا گیا ہوں۔" اس نے قدرے وضاحت کی تھی مگر مالا پھر بھی نہ سمجھی تھی بلکہ کچھ اور ہونق ہوگئی۔

"تم کیا کہنا چاہتے ہو، صاف، صاف بات کرو، پہیلیاں بجھوانے کی ضرورت نہیں۔" اس کی آواز میں سخت ناگواری تھی تبھی آفاق جلدی سے بولا تھا مبادا مالا کو غصہ آجائے۔

"مجھے عیسٰی نے فون کرکے بلایا ہے، تم دروازہ کھول کر مجھے اندر آنے دو، سامان رکھ کر پھر اسپتال چلا جاؤں گا۔ اگر دروازہ نہیں کھولو گی تو یہ حوض کے پار سڑک کی دوسری طرف مکان ہے ناں جس میں کوئی نئے لوگ شفٹ ہوئے ہیں آج...... ان کی ایک بیٹی آتے جاتے مجھے گھورتے ہوئے نکلتی ہے یا میرے سامان کو دیکھتی ہے یا مجھے...... شاید وہ سمجھ رہی ہے، تم نے مجھے گھر سے سامان سمیت باہر نکال دیا ہے اور اب میں دروازے پر بیٹھا منتیں کر رہا ہوں...... اب یہ نہ ہو، میری دہائیاں سن کر اس نازک حسینہ کو مجھ پر ترس آجائے اور وہ مجھے گھر لے جانے کی آفر کردے...... دیکھ لو، میں کسی کا دل نہیں توڑ سکتا...... پھر عیسٰی خواہ مخواہ مجھ سے ناراض ہوجائے گا اور عیسٰی کی خفگی کا سارا ذمّہ تمہیں بھگتنا پڑے گا۔ فٹافٹ کھول دو دروازہ۔" آفاق نے ایک ہی سانس میں سامنے والے گھر پر نگاہ جما کر مالا کے حواس باختہ کردیا تھا اور مالا کے ذہن میں صرف عیسٰی کی ناراضی کے ذمّے والی بات گھوم رہی تھی۔ سو اس نے دروازہ کھول دیا تھا تبھی آفاق سامان سمیت اندر آگیا۔ اس کی روئی روئی صورت کو نظر انداز کرتا وہ اپنی لن ترانیوں میں مصروف تھا۔

"اللہ، اللہ! اتنی منتیں کروائیں، اتنی تفتیش کی...... میرا تو حلق خشک ہوگیا...... پر آپ تردّد مت کیجیے گا...... میں پانی نہیں پیوں گا۔" آفاق کوئی بات سیدھے طریقے سے منہ بگاڑے بغیر نہیں نکالتا تھا اب مالا جان گئی تھی کہ اس کی بات کا کیا مقصد ہے ظاہر ہے، وہ پانی ہی پینا چاہتا تھا۔ مالا چپ چاپ کچن سے جوس نکال لائی۔

"بڑی مہربانی، آپ تو خاصی ذہین خاتون ہیں۔" جوس کے دو تین گلاس حلق میں انڈیل کر اب وہ اسپتال جانے کے لیے نکل رہا تھا جاتے، جاتے اسے کچھ ہدایات دینے لگا۔

"دوازہ نہیں کھولنا، پریشان نہیں ہونا اور رونا بھی نہیں۔" اس کے چہرے پر نگاہ ڈالے بغیر وہ تیز، تیز بولتا باہر نکل گیا تھا۔ مالا حیران رہ گئی پھر اس کی ہدایات کو دُہراتی دروازے تک آئی تھی۔ اس نے اپنے بھیگے چہرے پر غیرارادتا ہاتھ پھیرا تھا۔ یہاں وہاں نمی ہی نمی تھی۔ اسے آفاق کا اپنائیت بھرا انداز یاد آیا۔ "اور رونا بھی نہیں۔" وہ گویا تنبیہہ کرکے گیا تھا۔ مالا کو روتے رُوتے ذرا سی ہنسی آئی۔

"یہ آفاق بھی کمال ہے۔" اس نے دروازہ بند کردیا تھا پھر تسبیح اٹھا کر لاؤنج میں آگئی۔ آفاق اپنا سامان ٹھکانے پر لگا کر گیا تھا جس سے معلوم ہوتا تھا

کہ وہ اس گھر میں پوری بے تکلفی سے رہتا آیا ہے۔ اس نے مالا سے گیسٹ روم کا نہیں پوچھا تھا بلکہ خود ہی آرام سے اسی طرف چلا گیا۔ مالا، آفاق کو سوچتے ہوئے عیسٰی کی باتیں ذہن میں دُہرانے لگی تھی تو گویا عیسٰی نے آفاق کو بلوایا تھا۔ "کیا پتا چاچو کی طبیعت زیادہ خراب ہو۔" اس کا دل پھیکا پڑ رہا تھا...... اسے چاچو کی ہنستی مسکراتی آواز سنائی دے رہی تھی۔ زندگی سے بھرپور، تازگی سے بھری...... کوئی اتنا تازہ دم شخص بھی اچانک بیمار پڑ سکتا ہے؟ مالا کا دل بھر بھر آرہا تھا۔ اسے چاچو ہنستے مسکراتے، چلتے پھرتے دکھائی دینے لگے تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو وہ کہہ رہے تھے۔ "لائیو سین دیکھنے کا تو اپنا ہی ایک مزہ ہوتا ہے۔" وہ کتنے افسردہ موڈ میں بیٹھے تھے گویا عیسٰی اور مالا کی پہلی تازہ، تازہ کھٹی میٹھی جھڑپ دیکھنے سے محروم رہ گئے تھے۔ جھڑپ بھی ایسی جس میں عیسٰی نے مالا کی ڈھیروں منتیں کیں اور پھر وہ...آفس جانا بھی بھول گیا۔ وقت کی شدید پابندی کرنے والا جب بہت دیر سے دفتر گیا ہوگا تو سب ورکرز کی معنی خیز نگاہوں سے خاصا جھنجلایا ہوگا۔ چاچو تصور کی آنکھ سے گویا خوب لطف لے رہے تھے مگر لائیو سین دیکھنے کا تو مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ سو اُن کا قلق جا ہی نہیں رہا تھا۔ مالا نے انہیں تسلی دی تھی۔ "آپ پھر دیکھ لیجیے گا، دل چھوٹا کیوں کرتے ہیں۔" اس نے جیسے بچوں کی طرح ان کو بہلایا تھا۔

"ارے...... پھر کس نے دیکھی ہے۔" انہوں نے آہ بھر کر کہا۔

"آپ ایسے کیوں کہہ رہے ہیں۔ پھر سب نے ہی دیکھی ہے، ہم آج رات پھر سے لڑائی والا ماحول بنائیں گے۔" وہ گویا ہنس رہی تھی۔ اس بات سے...... بے خبر کہ وقت کا خوشنما پانسہ کسی بھی لمحے پلٹ سکتا ہے اور دکھ ایسا دیمک ہے جو ہنسی کو چاٹ جاتا ہے، کچھ دیر پہلے اس گھر میں ہنسی گونج رہی تھی مگر اب سناٹوں کا راج تھا...... وقت اپنا پانسہ کبھی پلٹ بھی سکتا ہے۔ مالا کو پہلے گمان تھا، اب یقین بھی ہونے لگا تھا۔

اسے چاچو کی آواز گھر کے در و دیوار سے سنائی دے رہی تھی۔

"ایں...... ہرگز نہیں، تم لڑنا ضرور، پر جلد مان جانے کے لیے...... لڑائی زندگی کا حسن ہے مگر جب تک طویل نہ ہو۔" انہوں نے بے ساختہ ٹوکا تھا، مالا کو لگا، وہ اس کے قریب ہی بیٹھے سرزنش کر رہے ہیں۔ اس کی آنکھیں بھل بھل بہنے لگی تھیں۔ اب بھلا کسے یاد تھی آفاق کی اپنائیت بھری تنبیہہ...... "رونا بھی نہیں۔"

"میں عیسٰی سے لڑوں گی اور وہ مجھے جلد منالیں گے۔" اس نے شرارتی لہجے میں بڑے مان سے کہا تھا، یہ کیسی بے خبری اور نادانی بھری بات تھی، ہمارے ایسے اکثر بول جن پر تقدیر کا لکھا مسکراتا ہے...... انسان کچھ باتوں کو لبوں سے ایسے پھسلا دیتا ہے جیسے ہاتھ سے نکلے ریت کے ذرے...... جو بکھر تو سکتے ہیں مگر جمع نہیں ہوسکتے اور کہتے ہیں ناں...... وقت اور نصیب کسی لمحے بھی کسی کو زیر کرسکتا ہے اور برے وقت کی آہٹیں کان پہلے سے ہی سننے لگتے ہیں۔

سے کی لہریں گزرتی جارہی تھیں۔ فون کی گھنٹیاں ابھی تک خاموش تھیں۔ جانے اب کیا ہونے والا تھا؟ مالا کا دل خوف سے سکڑتا، پھیلتا جاتا تھا پھر ایک گھنٹے سے کچھ وقت پہلے فون کی تو نہیں دروازے کی گھنٹی البتہ ضرور بجنے لگی تھی۔ مالا اٹھ کر دروازے تک آئی۔ دروازے میں لگا عدسہ جس سے باہر کا منظر صاف نظر آرہا تھا سے باہر جھانکا تو اسے دروازے کے سامنے کوئی لہراتا آنچل دکھائی دیا تھا۔

"یہ کون ہے؟" وہ کچھ گھبرا گئی تھی، اتنے عرصے سے اس دروازے پر نینی کے علاوہ اور کوئی خاتون نظر نہیں آئی تھی۔ پھر اب یہ جانے کون تھی؟ مالا کشمکش میں مبتلا ہوگئی کہ دروازہ کھولے یا نہ

کھولے...... اس دوران کال بیل کا جلترنگ بجتا رہا تھا۔ وہ عدسے سے آنکھ چپکا کر باہر کا ایک مرتبہ پھر جائزہ لینے لگی تھی۔ سامنے کوئی لڑکی کھڑی تھی، دروازے کی طرف پشت کیے۔ شاید پہلے یا دوسرے اسٹیپ پر، مالا کچھ اندازہ نہیں لگا سکی تھی مگر اس نے کچھ سوچتے ہوئے دروازہ کھول دیا تھا۔ سامنے ایک حسین اور نفیس چہرے والی نوخیز لڑکی کھڑی تھی۔ اس کے نقوش بہت دلفریب تھے، مالا تو پہلی ہی نظر میں گھائل ہوگئی، کالی آنکھیں، کالے بال، ملکوتی سا حسن، مسکراتے ہوئے نیم وا ہونٹ بے شک جرمنی کا حسن بے مثال تھا...... مگر یہ پری پیکر تو مشرقی لگ رہی تھی۔ اس کا چہرہ خاصا سرخ تھا اور ناک انتہائی گلابی...... تھوڑی زکام زدہ سی۔ مالا کے اتنے تفصیلی پوسٹ مارٹم پہ بڑے شائستہ انداز میں مسکرائی تھی۔

''ہیلو...... شام کا سلام......'' اس نے جرمن زبان میں سلام کرکے ہاتھ بھی آگے بڑھا دیا تھا، مالا نے جھجک کر اس کا ہاتھ تھاما اور پھر چھوڑ دینا چاہا تھا مگر مقابل کھڑی لڑکی نے اس کی کوشش کو ناکام بنا دیا...... وہ اس کا ہاتھ ابھی تک گرم جوشی سے دبائے کھڑی تھی۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟'' وہی جوش بھرا انداز تھا ایک دم دوستانہ سا۔

''مالا علی عیسیٰ۔'' مالا کو بھی مسکرانا پڑا تھا، زبردستی کی مسکراہٹ بوجھل دل کے ساتھ مسکرانا بھی کتنا مشکل تھا۔ مالا کو اسی پل ادراک ہوا تھا پھر اس نے اپنا تعارف کروایا تھا، مالا چپ چاپ سنتی رہی۔ اس نے اپنا نام اِنی بتایا تھا۔ وہ لوگ بھی پاکستانی تھے، یہاں آج ہی شفٹ ہوئے تھے پھر اس نے اپنے آنے کا مدعا بیان کیا تھا وہ کچھ دیر پہلے یہاں کسی کو باہر بیٹھا دیکھ چکی تھی اور وہ اسی کے بارے میں پوچھنے آئی تھی کہ شاید باہر سامان سمیت بیٹھے لڑکے کو کرائے پر کمرا چاہیے تھا۔ اس نے بڑی شائستگی سے مالا کو مخاطب کرکے کہا تھا۔

''سِمر فری...... (کرائے کے لیے کمرا خالی ہے)'' اس نے اپنے گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جہاں ایک بورڈ پر ''روم فار رینٹ'' لکھا تھا۔ یعنی انگریزی اور جرمن دونوں میں لکھا تھا۔ مالا گویا سمجھ کر مسکرا دی تھی پھر اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی اور انتہائی شکستہ ڈوئچ میں اسے سمجھایا تھا کہ وہ لڑکا ان کے گھر مہمان آیا ہے، اسے کرائے کے لیے کمرا نہیں چاہیے تھا۔ مالا کی تفصیل سن کر وہ کچھ مایوس ہوئی تھی تاہم اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ پھر اس نے مالا سے مزید کچھ کہا جو اسے سمجھ نہ آیا۔

''آئی ڈونٹ انڈر اسٹینڈ۔'' اس کی شرمندگی محسوس کرکے وہ لڑکی جھٹ اردو میں بولی تھی تب مالا کا منہ بے ساختہ کھل گیا۔

''تمہیں اردو آتی ہے؟'' اس کے چہرے پر بے ساختہ خوشی امڈ آئی تھی۔ ''اُف، اردو آتی تھی پھر بھی میرا امتحان لینے کھڑی ہوگئی ...... یہ جرمن لوگ بھی ناں......'' مالا نے دل ہی دل میں بے چارگی سے کہا تھا تب انی نے زور شور سے اثبات میں سر ہلایا۔

''ہاں، میرے پاپا پاکستانی ہیں...... ان کی ڈیتھ ہوچکی ہے میرا بھائی ان دنوں پاکستان گیا ہوا ہے۔ ہم لوگ اس گھر میں آج ہی شفٹ ہوئے ہیں۔'' انی نے بہت دوستانہ لہجے میں اسے بتایا تھا۔ وہ اپنی ماں اور بہن کے ساتھ فی الحال یہاں اکیلی تھی۔ مالا اس بااخلاق لڑکی کو اندر لے آئی تھی۔ پھر انی، مالا کے ہاتھ سے بنی چائے پی کر ہی گئی۔ جاتے، جاتے وہ اسے اپنے گھر آنے کی دعوت بھی دے گئی تھی۔ یوں اس کی سوزن، ہیرا کے بعد اِنی کے ساتھ بھی دوستی کی ابتدا ہوگئی تھی۔

سوزن اور انی اجنبیوں کے اس دیس میں مالا کو اپنے دل سے قریب لگی تھیں، دوستی کی وجہ ان کا پُرخلوص ہونا اور ہم زبان ہونا بھی تھا۔ وہ اس کی گفتگو کو اسی کی زبان میں سمجھ لیتی تھیں۔ دوستی کی ابتدا پہلے

"وجہ" پر ہوئی تھی پھر دھیرے دھیرے "وجہ" ختم ہو گئی اور ایک لازوال رشتہ باقی رہ گیا۔ ہیرا کا معاملہ کچھ الگ تھا، وہ اس کی ہم زبان نہیں تھی مگر اچھی کلاس فیلو ضرور تھی۔ وہ دونوں گھنٹوں ایک دوسرے کے ساتھ ڈوچ بولنے میں ہلکان ہوتی رہتی تھیں۔ بات چیت کی ابتدا پہلے "وجہ" سے ہوئی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی بہترین "اتالیق" تھیں۔ اتالیق ہونا وجہ تھی، بعد میں وجہ ختم ہوگئی صرف رشتہ رہ گیا۔ ہمدردی، خلوص اور دوستی کا رشتہ۔

"اجنبی راہ اور اندھیرے انجان سفر میں کوئی جگنو ٹکرا جائے تو اسے مٹھی میں دبا لینا چاہیے۔ کیا پتا وہ بہ آسانی رستوں کی رہنمائی کر کے منزل تک پہنچا دے۔" یہ علی عیسیٰ کی بتائی حکمت بھری باتیں تھیں جن کو مالا نے گرہ میں کس کر باندھ لیا تھا کہ دوستی اور چائے کی حدت اور تیزی ہی ان کی خوبی ہے نہ کہ حد درجہ مٹھاس...... تو گویا اس بات کا مفہوم یہ تھا۔ دوستی میں تلخ رویے اور کبھی کبھی لڑائی بھی سہنا پڑتی ہے۔ انسان کو گرم اور ٹھنڈی دونوں طرح کی چائے پینے کا عادی ہونا چاہیے۔

اس وقت تنہا لاؤنج میں تکلیف دہ سوچوں کو جھٹک کر سوزن، ہیرا اور رافی کو سوچنا بہت دلفریب لگ رہا تھا۔ پھر جانے کتنا وقت بیت گیا جبھی عیسیٰ کی benz کی آواز آئی۔ دروازے کھلے اور بند ہوئے۔ مالا بھاگتی ہوئی دروازے میں لگے عدسے میں سے جھانکنے لگی۔ وہ موبائل پہ آج کل (میں شادی شدہ ہوں) کی ٹیون سیٹ کیے ہوئے تھا۔ دروازے کے قریب آ کر موبائل بجنے لگا تھا، مالا نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ سامنے عیسیٰ کا چہرہ تھا۔ انتہائی پژمردہ، مرجھایا ہوا جبکہ سب سے زیادہ اس کی آنکھیں متاثر لگ رہی تھیں۔ انتہائی سرخ جیسے کچن کا پھل ہو، رسیلا اور لہو برساتا ہوا۔ انتہائی سوجے پھوٹے جیسے وہ اسپتال میں اتنے گھنٹے روتا رہا ہو۔ اس کی پلکیں جڑی ہوئی تھیں، بھیگی، نمناک...... گویا واپسی کے سفر پر بھی روتا رہا تھا۔ ہاں، اپنے باپ کی تکلیف اسے اتنی ہی اذیت میں مبتلا کر دیتی تھی۔ اسے اپنے پاپا سے عشق تھا۔ وہ انہیں "درد" میں بے قرار نہیں دیکھ سکتا تھا۔ مالا کے دل کو کچھ ہونے لگا، وہ بھاگ کے عیسیٰ کو وہیں چھوڑ کر پانی لے آئی۔ عیسیٰ لاؤنج میں جوتے اتار کر صوفے پر سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے پانی دیا، عیسیٰ نے بنا کچھ کہے گلاس پکڑ لیا۔ مالا کارپٹ پر اس کے قریب ہی دوزانو بیٹھ گئی تھی۔

"چاچو کی طبیعت کیسی ہے عیسیٰ؟" مالا کی آواز سن کر وہ بے خیالی میں سر اٹھائے یک ٹک اسے دیکھنے لگا۔ مالا اس کی بوجھل لہو رنگ آنکھوں کو دیکھ کر دہل گئی۔

"اللہ! اتنی سرخ آنکھیں۔" اس کے دل پہ چوٹ سی لگی۔ عیسیٰ کچھ دیر اسے دیکھنے کے بعد دوبارہ سر جھکا گیا تھا۔

"پہلے سے کچھ بہتر ہیں۔" اس کا انداز تسلی دینے والا تھا مگر مالا کی تشفی نہ ہوئی۔ جیسے عیسیٰ مالا کے بجائے گویا خود کو تسلی دے رہا تھا۔

"تو پھر آئے کیوں نہیں؟" وہ بے قرار ہوئی لیکن عیسیٰ کے سامنے روئی نہیں۔ وہ اسے پریشان کرنا نہیں چاہتی تھی۔ کم از کم اپنی وجہ سے تو ہرگز نہیں۔

"ڈاکٹر نے انہیں ایڈمٹ کر لیا ہے۔ میں آنا نہیں چاہتا تھا مگر آفاق نے زبردستی بھیج دیا۔ آفاق اچھا لڑکا ہے۔ اپنوں سے بہت بہتر۔" عیسیٰ کے لہجے میں ٹوٹے کانچ چیخ رہے تھے۔ وہ اتنا پُراذیت اور دکھی کیوں لگ رہا تھا... چاچو کے لیے؟ شاید کوئی اور وجہ بھی تھی۔

"آپ نے موں کو اطلاع نہیں دی؟" معاً اسے خیال آیا تو عجلت میں بولی تھی۔ شاید علی عیسیٰ اسی سوال سے بچنا چاہتا تھا جبھی بے چین سا صوفے پر سے اٹھ گیا۔

''آپ نے بتایا نہیں۔'' مالا اس کے پیچھے ہی آگئی۔ بیڈروم کی طرف بڑھتے عیسٰی کے قدم لحظہ بھر کے لیے رک گئے تھے۔ وہ اس کے پژمردہ روئے، روئے چہرے کو دیکھنے لگا تھا۔ نماز کے اسٹائل میں دوپٹا اوڑھے، ہاتھ میں تسبیح لیے وہ اپنے چچا کے لیے بہت غمگین، متفکر اور پریشان تھی۔

''اسے اطلاع دی تھی میں نے۔'' وہ نگاہیں موڑ کر اندر بڑھ گیا...... مالا پھر اس کے پیچھے بھاگی۔

''تو مون کیا آگئی؟'' اس نے بے چینی دبائے بغیر پوچھا۔ عیسٰی کچھ پل کے لیے رک گیا تھا گویا سوچ رہا تھا کہ کیا جواب دے۔

''نہیں......'' عیسٰی نے سپاٹ لہجے میں کہہ دیا۔

''کیوں......؟'' اس نے بے تابی سے کہا تھا تب عیسٰی گہری سانس کھینچ کر پلٹا...... وہ اس کے چہرے پر لکھی بے چینی اور پاپا کے درد کی اذیت کو بخوبی پڑھ سکتا تھا۔ کچھ چہرے کھلی کتاب کے مانند ہوتے ہیں بغیر تردد کے پڑھتے چلے جاؤ۔ مالا کا چہرہ بھی ایسا ہی تھا اور اس کی بے چینی بھی معمولی نہ تھی، وہ مون کے بارے میں جاننے کے لیے اکثر بے تاب رہتی تھی۔ حالانکہ عیسٰی کا دل چاہتا تھا وہ اسے شیخ سعدی کا ایک قول بار بار سنائے تاکہ وہ اس کے زرخیز دماغ میں بیٹھ جائے۔ وہ مالا کو بتانا چاہتا تھا کہ ظاہر پہ جانے والے خسارے میں رہتے ہیں، آگ دیکھنے میں سرخ نظر آتی ہے مگر جلا دے تو سیاہ راکھ کے علاوہ کچھ نہیں بچتا مگر مالا ابھی ادراک کے لمحوں سے بہت دور تھی۔ وہ وقت سے پہلے مالا کو اتنا سیانا نہیں کرسکتا تھا۔ اس پل بھی مالا کے چہرے پر بکھرے سوز و گداز کو محسوس کر کے آہستگی سے بولا تھا۔

''زیادہ سوال کبھی کبھی عذاب لگتے ہیں مالا......!'' وہ بیزار نہیں تھا، بس تھوڑا شکستہ دل تھا مگر مالا سمجھی نہیں تھی، بس چپ سی رہ گئی۔ عیسٰی بولنے کے موڈ میں نہیں تھا پھر وہ اسے کیسے تنگ کرنے کی کوشش کرتی......؟ اس کی خاموشی نے مقابل کو چار شانے چت کردیا تھا۔ وہ اپنا کوٹ، ٹائی اور ... ایک، ایک چیز صوفے کی طرف اچھالتا گیا۔ صوفے کی ترتیب کچھ بدل گئی۔ کشن آڑھے ترچھے ہو کر گر گئے اب صوفے پر پہلے جیسا روپ نہیں تھا وہ بے ترتیب اور الجھا، الجھا لگ رہا تھا۔ آنکھوں کو بھلا لگنے والا نہیں تھا۔ مالا کچھ الجھ گئی تھی اور عیسٰی اسے الجھن سے ہی نکالنا چاہتا تھا۔

''اسی کو بے ترتیبی کہتے ہیں مالا! زندگی میں ... رویّوں میں، کبھی دل کو سکون نہیں دیتی، نہ نظر کو بھلی ... ہے، کچھ لوگ اپنی زندگی میں بے ترتیبی کو پسند کرتے ہیں اور پھر خواہش رکھتے ہیں کہ دوسرے بھی ان کے غلط عمل کی پیروی کریں...... جب ایسا نہیں کیا جاتا ان کی انا اور میں کو دھچکا لگتا ہے۔ مون انہی لوگوں میں سے ہے۔ وہ پاپا کی تکلیف کا سن کر نہیں آئی۔ اس نے آنے سے انکار کردیا...... وہ سمجھتی ہے، پاپا اسے واپس بلانے کے لیے روز، روز ڈرامے کرتے ہیں وہ کسی تھیٹر کی اداکارہ نہیں جو معمولی سا رول ملنے پر بھاگتی چلی آئے۔'' عیسٰی کی آنکھوں میں شفاف پانیوں کا طوفان امڈ آیا تھا مگر ضبط نے آگے بڑھ کر اسے ڈھارس پہنچائی تھی۔ وہ کچھ پل خاموش کھڑا رہا۔

''مون ہم سے اتنی دور چلی گئی ہے کہ پلٹ آنے کی امید نہیں...... وہ بدگمان ہے اور فاصلے مٹانے کے بجائے اور بڑھا رہی ہے۔ تم نے کہیں پڑھا تو ہوگا، فاصلے بڑھ جائیں تو دلوں کے بندھن کمزور نہیں پڑتے، کبھی کبھی ٹوٹ جاتے ہیں۔ انتظار مرتا نہیں، آنکھوں میں منجمد ہوجاتا ہے، ہاں بس آنکھیں مرجاتی ہیں...... اور مون میرے باپ کی آنکھوں کے اس انتظار کو منجمد کردینا چاہتی ہے۔'' عیسٰی کے ضبط کا بندھن کانچ کے مانند ٹوٹ گیا تھا پھر وہ عجلت میں پلٹا اور واش روم کی طرف بڑھ گیا جبکہ مالا کسی مجسمے کی طرح ساکت ہوگئی تھی۔ اس نے مون جیسی خودغرض، عجیب، سنگ دل اور انتہائی ظالم کوئی اور بیٹی آج تک نہیں دیکھی تھی۔

☆☆☆

ایک، دو، تین، چار...... پوروں پر گنتی کے چوتھے دن مالا کے پیارے چاچو ہشاش بشاش سے گھر واپس لوٹ آئے تھے۔ مالا ان کی صحت یابی کی خوشی میں دیوانی سی ہوگئی تھی۔ پاکستان اطلاع کردی گئی تو ممی نے چاچو کے لیے بہت سی خیرات کی۔ اِدھر مالا نے خود شکرانے کے نفل پڑھے۔ آیتِ کریمہ پڑھایا اور نیاز بھی خود پکائی۔ چاندی کے ورق سجا کر انتہائی لذیذ کھیر بنائی تھی مگر جب تک آیتِ کریمہ نہ پڑھا گیا اس نے کسی کو ایک چمچہ کھیر نہیں چکھائی تھی۔

یہ چھوٹی سی مقدس تقریب تھی جس میں ہیرا اور اس کے ڈاکٹر شوہر ابوبکر نے شرکت کی تھی۔ مالا نے انی اور اس کی فیملی کو بھی انوائٹ کیا تھا...... سوزن کو بھی کال کی مگر اس نے معذرت کرلی تھی۔

سب نے بڑے دل کے ساتھ انتہائی خشوع و خضوع سے آیتِ کریمہ پڑھا تھا۔ مہمان تو سارے کافی دیر سے آئے تھے جبکہ مالا نے آفاق کو صبح سے تسبیح دے کر بٹھایا ہوا تھا۔ ناشتے کے بعد کا بیٹھا ہوا وہ ابھی تک آیتِ کریمہ پڑھ رہا تھا۔ بیچ میں اس نے بہت دفعہ بھاگنے کی کوشش کی تھی مگر مالا کی دھمکی سے خوفزدہ ہوجاتا تھا۔

لنچ کے قریب تو آفاق کو چکر آنا شروع ہوگئے تھے حلق خشک ہوگیا اور بھوک سے معدہ چلّانے لگا تب حسیب چاچو اور عیسٰی کو اس پر ترس آگیا تھا۔

''زبردستی کی عبادت ایسے درخت جیسی ہے جس پر پتے تو آجائیں مگر پھل اور پھول کبھی نہ آئیں۔'' عیسٰی کے الفاظ پر آفاق کو کرنٹ لگا تھا۔ وہ سخت برا مان گیا...... عیسٰی کی گہری باتیں اکثر اسے اختلاجِ قلب میں مبتلا کردیتی تھیں۔

"تم میرا عمل ضائع کرنا چاہتے ہو؟" آفاق روہانسا ہوگیا...... سفید جالی کی ٹوپی اتار کر میز پر رکھی، تسبیح کو آنکھوں سے چوم کر لگایا۔

"میں کون ہوتا ہوں نیکی، بدی، جزا سزا میں فیصلہ کرنے والا...... تم میری بات سمجھ کر پلٹ جاؤ تو یہ اور بات ہے۔" عیسٰی نے مسکراہٹ دبالی تھی۔ آفاق تھوڑا کھسیا گیا تھا۔

"تمہاری باتیں کم ہی کسی کی سمجھ میں آتی ہیں۔ اتنی مشکل باتیں جو کرتے ہو۔" اب وہ عیسٰی پر چڑھائی کر رہا تھا۔ ان دونوں کے درمیان نوک جھوک تو اکثر چلتی ہی رہتی تھی۔ مالا کے لیے اب کچھ نیا نہیں تھا جبکہ مہمان بھی انجوائے کر رہے تھے۔

"بات مشکل نہیں ہوتی، نہ الفاظ پیچیدہ ہوتے ہیں۔ بس لہجے کو سمجھ لینے سے ساری مشکل حل ہو جاتی ہے۔" عیسٰی نے مہمانوں کی تواضع کرتی مالا کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔ وہ اس کی بات سمجھ کر مسکرادی تھی۔

☆☆☆

مالا کو بھی آفاق نے...... تھوڑا تھوڑا بدل دیا تھا...... اب وہ بھی کھل کر ہنسنے لگی تھی۔ آفاق کے سنائے لطیفوں پر قہقہوں کی بوچھاڑ سے پاگل ہو جاتی...... آفاق کے پاس معلومات کا خزانہ تھا۔ وہ اسے فیشن سے لے کر کوکنگ تک چیدہ، چیدہ باتیں اور مشورے دیتا...... چاچو تو گویا آفاق کے چلے آنے سے تازہ دم ہوگئے تھے۔

آفاق گویا ہرفن مولا تھا، کبھی مشین لگا کر سارے کپڑے دھو دیتا، کبھی مالا سوئی ہوئی ہوتی تو ناشتا بنا دیتا...... اب نتی بس صفائی کے لیے آیا کرتی تھی۔ باقی کے کام مالا اور کبھی کبھی آفاق کر دیتا...... گھر کی بہت ساری ذمے داریاں آفاق نے اپنے کندھوں پر اٹھالی تھیں۔ چاچو کے ویکلی چیک اپ سے لے کر گھر کا سودا سلف لانے تک ہر کام بخوبی کیے جاتا تھا۔ اس نے یہاں رہنے کے بعد آنے سے بھی پہلے عیسٰی سے [...] تھا کہ وہ شکایت کا موقع آنے... نہیں دے گا۔ درا[...] گھر کے کاموں پر تو عیسٰی کو کبھی اعتراض نہیں ہوا تھا[...] کبھی اس نے آفاق کو ٹوکا تھا بلکہ وہ دفتری امور [...] پہل ٹھیک سے انجام نہیں دیتا تھا۔ اپنے پہلے قیام [...] آفاق نے عیسٰی کو ناکوں چنے چبوائے تھے سو اب [...] آفیشل معاملات کو اچھی طرح سے سمجھ کر ہینڈل کر[تا] تھا۔ پہلے قیام کے دوران عیسٰی کو سب سے بڑی [...] آفاق سے شکایت تھی وہ کچھ یوں تھی کہ آفاق [...] وقت پر تیار ہو کر دفتر نہیں پہنچتا تھا اور اب آفاق صاحب صبح سویرے، منہ اندھیرے اٹھ کر ٹو پیس [...] ٹائی شائی لگائے، بالوں کو جیل سے سنوارے عیسٰی کے بیڈروم کے سامنے کھڑے اعلان کیے جاتا۔

"عیسٰی اٹھ جاؤ...... اتنے بج کر اتنے منٹ ہو چکے ہیں۔" وہ منہ اندھیرے ہی الارم بجاتے پھرتا تھا۔ ناشتا بھی بنا دیتا...... اخبار حفظ کر کے عیسٰی کے تیار ہو کر آنے تک ایک، ایک خبر مرچ مسالے سمیت سنا ڈالتا...... اب عیسٰی کا اخبار پڑھنے میں وقت ضائع نہیں ہوتا تھا اور یوں بہت کم مدت میں عیسٰی یہ کہنے پر مجبور ہوگیا کہ "آفاق جی، تسی بڑے گریٹ ہو۔" یہ الفاظ کم از کم آفاق کے لیے بہت اہمیت رکھتے تھے۔ اس کا جی چاہتا تو ان جملوں، تعریفی لفظوں کا تعویذ بنا کر گلے میں لٹکا لیتا...... مالا اس کی حرکتوں پر اکثر چوٹ کیے جاتی، خصوصاً اس وقت جب عیسٰی اس کی تعریف کرتا اور آفاق اپنی تعریف پر پھول کے کُپا ہوا جاتا۔

"صد شکر، کنجوسِ اعظم نے تعریف تو کی۔" وہ شکر ادا کرتے ہوئے نہال ہو جاتا تھا۔ عیسٰی کی تعریف آفاق کو دونوں مسرور رکھتی تھی۔ اسی طرح گھر کے دیگر معاملات میں مالا اس سے بہت خوش تھی۔ مالا کے کہنے پر وہ نئے گملے اٹھا لایا تھا۔ حوض کے لیے

نئی موٹی موٹی تر و تازہ دو عدد بطخیں بھی لے آیا۔ گھر کے بیرونی سرسبز احاطے کو آفاق کے فارغ اوقات کی محنت نے گل و گلزار بنا دیا تھا۔ انی اکثر ان کے گارڈن کو دیکھ کر جیلس ہوتی اور اکثر آفاق کو چڑانے کے لیے مالا سے کہتی۔

"اپنا مالی چند دن کے لیے ادھار دے دو۔" انی کی شرارت محسوس کر کے آفاق جھٹ سے جواب دیتا۔

"یہ مالی مستقل بھی آپ کی طرف قیام کرسکتا ہے اگر آپ چاہیں تو......؟" وہ آفاق ہی کیا جو ادھار رکھ لیتا...... اس کی انی کے ساتھ اکثر تکرار ہو جاتی تھی۔ خصوصاً اس وقت جب آفاق اپنے کوڑے کا ڈرم انی کے ڈرم میں الٹ آتا۔ تب ان دونوں کی خوب لڑائی ہوتی تھی...... اتنی کہ مالا کو سیز فائر کروانا پڑتا تھا یا پھر وہ آفاق کو گھسیٹ کر اندر لے جاتی۔

☆☆☆

اس دن بھی موسم خوب خوشگوار تھا۔ بہت دلفریب ہوا چل رہی تھی۔ آسمان صاف اور گہرا نیلا تھا...... یہاں کی مشہور مرغابیاں موسم کے حسن میں گم تھیں۔ نیلگوں ٹکڑوں میں پرواز کرتے سنہری کئی ایک پرندے اپنے رقص سے دیکھنے والی آنکھ کو مسحور کر سکتے تھے بشرطیکہ کوئی انہیں دیکھنے کے لیے وقت نکال لیتا۔

آج بہت دن بعد مالا، آفاق کے ہمراہ باہر آئی تھی۔ اسے کچھ سبزیاں اور فروٹس خریدنے تھے۔ وہ انی کے ساتھ آنے کا ارادہ رکھتی تھی مگر انی کو اپنی بہن کے اسکول جانا پڑ گیا تھا۔ سو مالا دل مسوس کر رہ گئی۔ اسے ہفتے بھر کی سبزیاں خریدنی تھیں اس کی اتری شکل دیکھ کر عیسٰی نے آفاق سے کہا تھا۔

"تم مالا کے ساتھ چلے جاؤ......" وہ آفس ورک کرنے میں مصروف تھے دونوں...... عیسٰی نے آفاق کو ڈھیر سارا کام بتا رکھا تھا۔ جسے مارے باندھے کرنے پر مجبور تھا...... اب جو جان چھوٹنے کے چانس نظر آئے تو وہ فوراً فائلیں ٹیبل پر پٹخ کر اٹھ گیا۔

"مالا کو این کاؤف سین تروم (مرکز) تک تو نہیں جانا......؟" وہ بال سنوار رہا چکا تھا۔ کام سے جان جو چھوٹ گئی تھی۔ عیسٰی نے نفی میں سر ہلا دیا...... تب وہ مسکراتا ہوا مالا کے ہمراہ باہر آگیا تھا...... اب جو قیامت سا موسم نظر آیا تو منہ بسور کر بولا۔

"دیکھ لو، تمہارے بور شوہر نے اس حسین موسم میں بھی فائلوں، لیپ ٹاپ اور کیلکولیٹر میں سر کھپا رکھا ہے۔ بھلا دفتر کو گھر اٹھا کر لانے کی کیا ضرورت تھی، بندہ اس موسم میں تفریح کے لیے نکلتا ہے۔" وہ کلستا ہوا فرائٹے سے بول رہا تھا۔ مالا نے کندھے اچکا کر کہا۔

"اب تم کیوں جل، جل کر خاک ہو رہے ہو، تمہاری جان تو چھوٹ گئی۔" مالا اپنے ہینڈ بیگ میں سے کچھ مارک (جرمن کرنسی) نکال کر الٹ پلٹ کر رہی تھی۔ اسے پیسوں کا مسئلہ نہیں تھا۔ عیسٰی نے اپنا خزانچی ساتھ بھیجا تھا۔ مالا کچھ مطمئن سی ہو کر چلتی رہی جبکہ آفاق اپنا لیدر بیگ بغل میں دبائے مالا سے بھی تیز چل رہا تھا۔ ایک وارین ہاؤس سے کچھ چیزیں خرید کر اب وہ سبزی اور پھلوں کی مارکیٹس تک آگئے تھے۔ مالا یہاں پہلی مرتبہ آئی تھی۔ اس نے سبزی اور پھلوں کی شفاف شیشے کی چمکتی دکانوں کو دیکھا تو حیران رہ گئی...... من ہائیم کے افسانوی کردار یہاں بھی بستے تھے۔ وہ ہی شفاف رائل روڈ کے اطراف میں بنے چمکتے دمکتے بڑے، بڑے اسٹورز انتہائی خوب صورت اور صحت مند سیل گرلز...... ان کے ہونٹوں سے چپکی میٹھی مسکان گویا چینی کی گڑیائیں شیشوں میں سجی تھیں۔ صفائی کا اتنا اعلیٰ اہتمام تھا کہ پھل، سبزیاں صاف ستھری چمکتی دمکتی نظر آرہی تھیں۔ مالا کی طرح آفاق بھی حیران در حیران تھا...... آنکھوں اور لہجے میں حسرت لیے وہ زیر لب بڑبڑایا تھا۔

"کاش میرا پاکستان بھی ایسا ہو جاتا۔" اس کی

آواز میں بھی حسرت در آئی تھی تب مالا نے بڑے ٹھنڈے سے لہجے میں کہا۔

"جب تمہارے جیسے جوان پردیس بھاگ آئیں گے تو پھر پاکستان بچوں اور بوڑھوں کے رحم و کرم پر کہاں تک آگے جاسکتا ہے؟" اس کے لہجے میں واضح چبھن تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ عیسیٰ کے ہمراہ واپس چلی جاتی کبھی یہاں نہ آنے کے لیے...... اجنبی وطن تو اجنبی ہی رہتا ہے۔ چاہے سال گزاریں یہاں یا صدیاں......

"کوئی شوق سے تو دَر دَر کی خاک نہیں چھانتا۔ وطن تو ہمارا ہے، پر کیا کریں حکمران ہمارے نہیں...... ڈگریوں کو گھن لگ رہا تھا، گھر میں پڑے، پڑے کتنے لوگوں کی آنکھوں میں خواب مرتے دیکھ چکا تھا۔ سو میں نے وقت ضائع نہیں کیا...... نہ ڈگریوں کو دیمک لگنے دی ہے۔ پتا نہیں، میرا فیصلہ غلط ہے یا صحیح......؟ تاہم مطمئن ضرور ہوں...... رزقِ حلال کماتا ہوں جلد ہی ماں، باپ کو حج کرواؤں گا۔ دادی کو سونے کے کنگن لے کر دیئے ہیں...... بہنوئیوں کو سیٹلڈ کرنا ہے...... کیا ہوا جو اپنی ذات خسارے میں چلی گئی، خیر، خسارہ بھی کیوں......؟ اپنوں کے لیے جینا ہی تو زندگی ہے، یہ میرا نہیں، تمہارے شوہر عیسیٰ کا قول ہے۔" اب وہ ہمیشہ کی طرح مسکرا رہا تھا۔ بظاہر لاابالی سا یہ لڑکا اندر سے کتنا گہرا تھا۔ مالا کچھ کچھ حیران رہ گئی تھی۔ پھر آفاق نے زیادہ دیر اسے سوچنے بھی نہیں دیا تھا۔ وہ خریداری میں بری طرح مگن ہوگئے تھے۔

واپس آتے ہوئے بڑے، بڑے تھیلے پکڑے مالا نے نوٹ کیا تھا کہ آفاق نے ایک اور تھیلا بھی گھریلو سامان کا فل کروا رکھا تھا۔ مالا کے پوچھنے پر آفاق نے بے پروائی سے بتایا۔

"سامنے والی جنگلی بلی لسٹ پکڑا گئی تھی۔ اسے بہن کے اسکول جانا تھا۔ میں نے سوچا، اس کا سامان بھی لے چلوں...... بے چاری کا بھائی ابھی تک واپس نہیں آیا۔" آفاق سادگی سے بول رہا تھا جبکہ مالا آہم آہم کرتی رہ گئی تھی۔

"جنگلی بلی، بے چاری......" مالا کو ڈھیروں ہنسی آگئی تھی۔ اسی طرح چھوٹی، چھوٹی باتوں کے دوران گھر قریب آگیا تھا جبکہ مالا اسے مسلسل چھیڑتی رہی تھی۔

گھر کے سامنے رک کر آفاق نے کچھ تھیلے اسے پکڑائے اور انی کا تھیلا پکڑے اس کے گھر کی طرف دیکھ کر بولا۔

"روم فار رینٹ......" بورڈ پر ابھی تک لکھے الفاظ رو رہے تھے۔ آفاق کو بے تحاشا ہنسی آگئی...... "ان لوگوں کو ابھی تک کرائے دار نہیں ملا...... لگتا ہے، ان کے نصیب کا کرائے دار میں ہی ہوں...... پہلا اور آخری......" وہ انی کے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ مالا کچھ ٹھٹک گئی پھر سر جھٹک کر اندر چلی گئی تھی۔

سچ تو یہ تھا...... آفاق کے آنے سے اسے بہت سہولت ہوگئی تھی...... وہ اندر باہر کے سارے کام نمٹا دیتا تھا۔ آفس بھی باقاعدگی سے جاتا بڑی لگن اور محنت سے کام کر رہا تھا...... گھر والوں کو ڈھیروں رقم بھی بھیجتا...... اپنا خرچہ تو اس کا تھا نہیں، تھوڑا خرچہ رکھ کے باقی سب پاکستان بھجوا دیتا۔

آفاق کے آنے سے رونق بھی خوب لگ گئی تھی۔ سامنے والے گھر سے انی اور ایمی بھی آجاتی تھیں پھر عیسیٰ اور آفاق کا کرکٹ میچ ہوتا...... کبھی بیڈ منٹن کھیلتے...... خوب ہنگامہ آرائی، ہلا گلا ہوتا، فنکامہ ٹائپ زندگی بن چکی تھی۔ چاچو کو شور اور قہقہے بہت پسند تھے۔ وہ خود بھی گارڈن میں آکر بیٹھ جاتے...... اکثر ویک اینڈ پر ہیرا اور ابوبکر بھی آجاتے تو رونق دوبالا ہوجاتی تھی۔ کاش کہ زندگی یوں ہی گزر جاتی، ایک خواب کی طرح...... کسی پھول کی طرح، خوشبو کی طرح، چمکتے چاند کی طرح، بہار کی خوشبو و تازگی اور

مہکار کی طرح۔

چاندنی رات کے ہاتھوں پہ سوار اتری ہے
کوئی خوشبو میری دہلیز کے پار اتری ہے

آہ...... خوشبو، جو لمحوں کا دھوکا ہوتی ہے، آتی ہے اور آکر چلی جاتی ہے، ایک چھناکے سے ٹوٹ جانے والے خواب کی طرح...... بس ایسی ہی کوئی کیفیت اس کا دل دھڑکائے رکھتی تھی۔ جیسے کچھ ہونے والا تھا۔ جیسے کچھ ہونے کے قریب تھا۔ دل کے وسوسے زبان تک آنے سے قاصر تھے۔

☆☆☆

بڑے بوجھل سے دن تھے۔ بڑی اداس سی شامیں تھیں۔ بظاہر سب کچھ ٹھیک تھا مگر پھر بھی کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ وہ اپنی الجھی کیفیات میں مگن تھی سوان دنوں الجھے، الجھے آفاق پر بھی غور نہیں کرسکی...... وہ بہت پریشان اور متفکر تھا۔ پہلے کی طرح نہ ٹھیک سے کھانا کھاتا نہ باتیں کرتا...... آفس سے آکر باہر نکل جاتا تھا...... گویا وہ ماحول سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ جانے اس کے ساتھ مسئلہ کیا تھا......؟ اسے پریشانی کیا تھی؟ چاچو بھی اب تو چونکنے لگے تھے۔ آفاق پہلے سے بہت بدل گیا تھا۔ وہ ہنسی، وہ قہقہے خواب نظر آتے تھے۔ عیسیٰ اسے کوئی میچ رکھنے کو کہتا تو وہ سہولت سے انکار کردیتا تھا۔ عیسیٰ بھی اس کی بدلتی کیفیت پر حیران تھا۔ آفاق کے دم سے جو رونق لگی تھی اب اس کا خاتمہ ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔

پھر وہ دفتر سے آکر رات گئے تک غائب ہوجاتا...... یہ بات عیسیٰ کو پسند نہیں تھی۔ اس نے آفاق کو ٹوکا تو وہ دوبارہ جلدی گھر آنے لگا تاہم مالا نے اکثر رات بھر اسے جاگتے دیکھا تھا۔ اس کے کمرے کی لائٹ جلتی رہتی تھی۔ صبح سرخ آنکھیں لیے دفتر چلا جاتا تھا، وہ بھی بغیر ناشتا کیے...... وہ کھانے پینے اور سونے سے غافل ہو رہا تھا۔ آخر اسے کیا ہوا تھا؟ مالا کو تو ہول اٹھنے لگے تھے۔ وہ کچھ بتاتا بھی نہیں تھا۔ مالا تو پوچھ، پوچھ کے تھک چکی تھی۔

پھر ایک دن وہ وقت سے پہلے گھر آگیا تھا۔ عجیب تھکا، تھکا اور پژمردہ سا...... وہ بغیر کچھ کھائے پیے معمول کی طرح اپنے کمرے میں بند ہوگیا تھا۔ کیونکہ اب اسے عیسیٰ باہر جانے نہیں دیتا تھا۔ آج چونکہ مالا کا ضبط جواب دے گیا تھا سو وہ ساری احتیاط بھلا کر گیسٹ روم کی طرف آگئی تھی۔

اس کے کمرے میں داخل ہوکر مالا کو کچھ عجیب سا لگا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو حیران رہ گئی۔ وہ صوفے پر آڑا ترچھا لیٹا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ مالا نے اسے پہلی مرتبہ سگریٹ پیتے دیکھا تھا تبھی تقریباً دنگ رہ گئی تھی جبکہ آفاق اسے دیکھ کر اسپرنگ کی طرح اچھل پڑا تھا۔

"تم یہاں......؟" وہ بری طرح گڑبڑا گیا۔ اسے امید نہیں تھی، مالا اس طرح چھاپا مار دے گی۔ اسی لیے کچھ حواس باختہ ہو رہا تھا۔

"اتنے حیران کیوں ہو......؟ اور یہ سگریٹ کیوں پھونک رہے ہو؟" مالا کو گویا تپ ہی چڑھ گئی تھی۔ اس نے سگریٹ کا ٹکڑا اس کے ہاتھ سے کھینچ کر دور پھینک دیا تھا۔ آفاق گویا ششدر رہ گیا۔ ایسی جرأت کی بھی اسے امید نہیں تھی۔

"آخر تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟" اس نے غضبناک ہوکر پوچھا تھا پھر آدھا گھنٹا طویل بحث کے بعد آفاق کچھ منہ سے پھوٹنے پر رضامند ہوگیا تھا تاہم اس دوران مالا کے دماغ کی چولیں ہل گئی تھیں۔ آفاق کی سرخ آنکھیں، بڑھی شیو اور یہ...... جوگیوں والے انداز اسے کچھ، کچھ کھٹکا تو رہے تھے مگر وہ اپنے خدشات کو بیان نہیں کرسکتی تھی۔ ادھر آفاق سر جھکائے کارپٹ کی نرم فر کو کھرچتا کسی الجھن میں کھڑا تھا۔ اس کے بالوں کا گچھا سفید پیشانی کو ڈھکے ہوئے تھا۔ نوکدار پلکوں کی جھالر آنکھیں ڈھکے تھی۔ وہ اس جوگیوں والے روپ میں بھی کسی کا

آئیڈیل ہو سکتا تھا۔ کسی کے بھی حواسوں پر بجلی گرا سکتا تھا اور اس نے دھیمی آواز میں کچھ بولتے ہوئے مالا کے حواسوں پر بجلی گرا ہی دی تھی۔

''مجھے محبت ہوگئی ہے۔'' اس نے گویا اعترافِ جرم کیا تھا۔ جھکے سر اور جھکی آنکھوں کے ساتھ...... مالا ایک دم دہل کر رہ گئی۔

''کس سے......؟'' وہ بھنچی بھنچی آواز میں بولی تھی۔ تبھی کمرے کے باہر ہلکی سی آہٹ سنائی دی تھی۔ آفاق کا دھیان بھی دروازے کی چرر...... اور آہٹ کی طرف چلا گیا تھا تاہم وہ سابقہ الجھے، الجھے لہجے میں بے ربط اور اٹک، اٹک کر بولنے لگا۔

''تم سے......'' آفاق کے اگلے الفاظ لبوں میں ہی دبے رہ گئے تھے، دروازہ اب پوری طرح کھل چکا تھا۔ مالا اور آفاق کی آنکھیں ابل پڑیں۔

''تم سے...... اس لیے شیئر کر رہا ہوں کہ مجھے لگتا ہے، اس محبت کا اب میں اکیلے بوجھ اٹھا نہیں پاؤں گا۔'' آفاق نے اٹک، اٹک کر ہی سہی تاہم بات مکمل کر دی تھی۔ مالا کی غیر معمولی حد تک کھلی آنکھیں لمحے بھر میں نارمل ہوگئیں...... خوف کے مارے دھڑکتا دل تھم سا گیا تھا جبکہ آفاق کسی اور کی موجودگی محسوس کر کے اصل بات چھپا لینا چاہتا تھا پھر صورتِ حال ایسی دیکھ کر سچ بتانے سے خود کو روک نہ پایا حالانکہ کوئی اور وقت ہوتا تو فی الحال وہ عیسیٰ کو کچھ نہ بتاتا۔

چونکہ علی عیسیٰ اچانک اس طرف آیا تھا، ابھی اس نے آفس سے آکر کپڑے بھی نہیں بدلے تھے۔ یقیناً وہ مالا کو ڈھونڈتا ہوا آفاق کے کمرے کی طرف آیا تھا۔ اس کی عادت تھی وہ آفس سے آنے کے بعد مالا، مالا پکار کر جب تک اسے دیکھ نہ لیتا، اس کی تسلی نہیں ہوتی تھی۔ سو وہ اپنی تسلی کرنے مالا کو ڈھونڈتا ہوا اِدھر آیا تھا۔ اسے امید تھی مالا آفاق سے انویسٹی گیشن کر رہی ہوگی۔ عین انسانی فطرت کے تحت آفاق کی بدلی کیفیت اور مجنونانہ انداز نے مالا کو بھی ٹھٹکا رکھا تھا سو وہ آج معاملے کی تہہ میں اترنے کی کھوج لیے آفاق کے کمرے تک آگئی تھی۔ عیسیٰ کو امید نہیں تھی آفاق اسے دیکھ کر بھی سچ بول دے گا وہ آفاق کے بدلے تیور کب سے دیکھ رہا تھا۔ اسے کھٹکا تو تھا ہی کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے اور یہ کالا نظر بھی آگیا تھا۔ اب عیسیٰ کے ہاتھ جیسے آفاق کی کمزوری آلگی تھی۔

''اوہ...... تو یہ بات تھی۔'' عیسیٰ نے مصنوعی گہرے طنز سے کہا۔ ''میں تمہارے جوگیوں والے روپ کو دیکھ کر سمجھ گیا تھا مگر مجھے یقین نہیں تھا کہ مینڈکی کو بھی بالآخر زکام ہو گیا ہے۔'' وہ مسکراہٹ دباتا آفاق پر صاف چوٹ کر رہا تھا...... دراصل آفاق بھی عیسیٰ کے اچانک چلے آنے پر بوکھلا گیا تھا، کچھ صورتِ حال بھی ایسی تھی کہ اگر ''وہ تم سے......'' کے بعد ایک دفعہ پھر رک جاتا تو ڈھیروں غلط فہمیاں بھی جنم لے سکتی تھیں۔ عام حالات میں وہ فی الحال عیسیٰ کو اپنی محبت کے بارے میں ہرگز نہ بتاتا کیونکہ عیسیٰ نے اس کا ریکارڈ لگا دینا تھا مگر فی الوقت آفاق کو سچ بتانا ہی پڑا تھا اور اس کا سچ سن کر عیسیٰ کے چہرے پر غیر محسوس قسم کا سکون بھی اتر آیا تھا۔ تبھی آفاق کو تلملانے کے لیے مزید چوٹ کر رہا تھا۔ آفاق چونکہ سنبھل چکا تھا اسی لیے بے ساختہ عیسیٰ کی بات ٹوک کر بولا۔

''یہ مینڈکی سے مراد کیا ہے تمہاری؟'' ماتھے پر بل ڈالے اس نے خفا، خفا سے لہجے میں پوچھا۔

''سمجھدار کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے جبکہ تمہارے جیسے احمق وضاحت مانگنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔'' عیسیٰ نے چہک کر کہا۔

''میں تمہیں اسی لیے کچھ بتا نہیں رہا تھا۔ مالا کم از کم تمہاری طرح طنز نہیں کرتی...... تم اچانک جانے کہاں سے ٹپک پڑے ہو۔'' آفاق نے روٹھے، روٹھے لہجے میں کہہ کر منہ بسورا تھا۔ اس کی غمناکی کو

محسوس کر کے کب سے ہونق کھڑی مالا کی طرف اشارہ کر کے عیسیٰ مزے سے بولا تھا۔

''مالا کو تو ایسے بتا رہے ہو گویا تمہاری لو اسٹوری میں یہ بڑا اہم کردار ادا کرے گی۔'' اس نے بھناتے ہوئے کھڑے آفاق کو پھر سے چھیڑا۔

''بہن ہے میری...... کیوں نہیں اہم کردار ادا کرے گی، ہر کوئی تمہارے جیسا نہیں ہوتا...... بدلحاظ اور طنز کرنے والا، خود تو میچ پر بھی میں شادی شدہ ہوں... کی ٹیون سیٹ کر رکھی ہے اور دوسروں کو محبت بھی نہیں کرنے دیتے۔'' آفاق غصے میں الٹا سیدھا بولے جا رہا تھا۔ عیسیٰ کو ہنسی تو بہت آئی مگر چھپا گیا تھا۔

''میں نے کون سا کرفیو لگا رکھا ہے؟'' عیسیٰ نے مصنوعی حیرانی سے کہا۔

''پر میری محبت کی رام کہانی تم سے برداشت نہیں ہوسکی فوراً بوتل کے جن کی طرح حاضر ہوگئے۔ میں نے مالا سے بات کرنے کے لیے اتنی مشکل سے ہمت مجتمع کی تھی۔'' آفاق کو عیسیٰ کی اچانک تنزی پر غصہ تھا اور یہ غصہ اسے مالا پر بھی تھا جو عیسیٰ کو دیکھ کر ایسی ہونق ہوئی تھی کہ ابھی تک مجسمہ بنی کھڑی تھی۔ کم از کم آفاق سے یہ تو پوچھ لیتی کہ اسے محبت کس سے ہوئی تھی؟'' شاید وہ آفاق کے ''تم سے'' کے بعد ایسی چپ ہوئی کہ دوبارہ وضاحت کرنے پر بھی بول نہیں سکی تھی حالانکہ آفاق نے اس کا سوال نظر انداز کر کے ہی یہ الفاظ بولے تھے کہ ''تم سے اس لیے شیئر کر رہا ہوں، مجھے لگتا ہے اس محبت کا میں اکیلے بوجھ اٹھا نہیں پاؤں گا۔'' وہ سوچ رہا تھا، مالا سے کچھ شیئر کر کے اس کا من شانت اور بوجھ ہلکا ہو جائے گا جبکہ عیسیٰ اس کے من کا بوجھ مزید بڑھانے پہنچ گیا تھا۔

''آہ...... ہمت...... تو اب کہاں گئی تمہاری ہمت......؟'' عیسیٰ نے بھولپن کی انتہا کرتے ہوئے کہا تھا۔ آفاق کا دل چاہا، پاس رکھا لائٹر اس کے منہ پر دے مارے مگر اتنے سے لائٹر نے عیسیٰ کا بھلا کیا بگاڑ لینا تھا۔

''مجھے نہیں پتا...... جاؤ تم یہاں سے۔'' آفاق بھنا کر رہ گیا...... تب عیسیٰ کو اس کی حالت پر رحم آہی گیا...... اس نے آفاق کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے بے ساختہ اسے پچکارا تھا۔

''اچھا، مجھ سے شرم آتی ہے؟ میرے سامنے بتانا نہیں چاہتے؟ ٹھیک ہے، میں باہر چلا جاتا ہوں، تم مالا کو بتا دو، اس امید کے ساتھ کہ مالا تمہارا راز لیک آؤٹ نہیں کرے گی۔'' عیسیٰ نے اس کا کندھا دبا کر نرمی سے کہا تھا پھر مالا کو رک جانے کا اشارہ کیا...... حالانکہ وہ عیسیٰ سے بھی پہلے باہر نکلنا چاہتی تھی اور اس وقت پہ پچھتا بھی رہی تھی جب اس نے آفاق سے کچھ پوچھنے کا ارادہ کیا تھا۔

کچھ دیر پہلے آفاق کے جملے اور اس کے پہلے دو لفظوں نے اس کی جان نکال دی تھی پھر اچانک عیسیٰ کا کمرے میں آجانا۔ مالا کو لگ رہا تھا وہ مجرم، نہ ہوتے ہوئے بھی مجرم بن گئی ہے پھر عیسیٰ اور آفاق کی نوک جھوک نے اس کے من کو ڈھارس پہنچائی تھی۔ کچھ دیر پہلے والی اعصاب شکن صورتِ حال کا خاتمہ ہو چکا تھا مگر پھر بھی مالا کچھ کھٹک رہی تھی کہ ''کیا پتا عیسیٰ کو دیکھ کر آفاق نے بات بدل دی ہو۔'' مگر جب آفاق نے اتنے مان بھرے لہجے میں کہا کہ ''مالا میری بہن ہے۔'' تب اسے اپنی کچھ دیر پہلے والی سوچ پر شرمندگی ہوئی تھی۔ اس نے آفاق کی نیت پر شک کیا تھا، چاہے لمحے بھر کے لیے ہی سہی تاہم اسے اپنی سوچ پر خفت ضرور تھی۔ اداسی و شرمندگی کے باعث وہ فی الفور منظر سے ہٹ جانا چاہتی تھی مگر عیسیٰ کی بات نے اسے رک جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

''مالا تمہارا راز لیک آؤٹ نہیں کرے گی۔'' عیسیٰ کے لہجے میں کیسا مان اور اعتماد بول رہا تھا۔ مالا کو اس لمحے اپنے ہم سفر پر فخر محسوس ہوا۔ اسے لگا، وہ

زمین سے دوانچ اور اونچی ہوگئی ہے۔ اس کی آنکھوں میں دیوں کی چمک بھر گئی تھی۔ اس کے چہرے پر الوہی خوشی چمکنے لگی۔ یہ کیسا اعتماد اور اعتبار کا رشتہ تھا؟ یہ کیسی محبت تھی؟ یہ کیسا خلوص تھا؟ مالا کو آج گویا دو جہاں کی خوشیاں میسر آگئی تھیں۔ علی عیسیٰ اس پر اعتبار کرتا تھا...... اس سے محبت کرتا تھا، اس کی عزت کرتا تھا اور وہ کبھی مالا سے بدگمان ہونے والا نہیں تھا۔ یہ احساس معمولی نہیں تھا، یہ احساس معمولی ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

''تم مالا سے کچھ بھی شیئر کرسکتے ہو تاہم اگر میری ضرورت پڑی تو ہاتھ نہ آؤں گا۔'' وہ جاتے جاتے بھی دھمکانے سے باز نہیں آیا تھا تب آفاق نے خوفزدہ انداز میں کہا۔

''مجھے تمہاری بڑی ضرورت ہے اور اگر مالا میرا ''راز'' تم تک پہنچادے گی تو یہ میرے لیے عین سعادت ہوگی۔'' آفاق نے انکساری کی انتہا کرتے ہوئے کہا تھا پھر عیسیٰ کے باہر نکلتے ہی مالا کی طرف متوجہ ہوگیا...... وہ ابھی تک گم صم سی کھڑی تھی، عیسیٰ کے مہکتے لفظوں کے اثر میں کھوئی، کھوئی سی، آفاق نے گلا کھنکھار کے ڈرامائی لہجے میں ہانک لگائی تھی۔

''اللہ، تیرا شکر ہے بلا ٹل گئی۔'' اس کے انداز میں بھرپور شرارت تھی جبکہ بلا سے مراد اس کا اشارہ عیسیٰ کی طرف تھا۔ مالا کو اتنا برا لگا کہ حد نہیں وہ جو کچھ دیر پہلے جوگی بنا ہوا تھا، اتنے دن سے آزردہ، رنجیدہ، افسردہ، غمگین اور جانے کیا، کیا دکھائی دے رہا تھا، اب پھر سے پرانی جون میں لوٹتا نظر آرہا تھا...... یہ عیسیٰ کی نرمی کا کمال تھا یا پھر کچھ دیر کے لیے وہ سابقہ کیفیت سے باہر نکل کر فریش ہونا چاہتا تھا۔ مالا سمجھ نہیں پائی تھی تاہم آفاق کا عیسیٰ کو بلا کہنے والا انداز اسے آگ لگا گیا تھا۔

''کیا بکواس ہے؟'' اسے ہنستا دیکھ کر مالا کے ماتھے پر بل پڑگئے۔ مالا کا غصہ دیکھ کر اس کی ہنسی کو بریک لگ گئے تھے۔

''ابھی بکواس کی کہاں ہے؟'' آفاق نے پھر سے دانت نکوسے تھے۔ مالا الجھ گئی۔

''تم منہ تو اپنا بند کرو...... اور یہ سگریٹ کے بھبکے...... اُف......'' مالا نے ناک چڑھا کر سفید نائیلون کا جالی والا پردہ ہٹا کر سلائڈ کھول دیے تھے، کمرے میں تازہ ہوا کی آمد ہوئی تو کچھ تازگی کا احساس ہوا تھا۔

''یہ اسموکنگ کی لت کیوں لگائی؟ اور کب سے لگائی؟'' اب وہ بڑے جارحانہ تیور لیے پوچھ رہی تھی تب آفاق نے ڈرتے، ڈرتے بتایا۔

''جب سے محبت ہوئی۔'' اس کا انداز مسکینی لیے تھا۔ اتنا کہ مالا کو غصہ آتے آتے رہ گیا...... پھر اس نے آنکھیں سکیڑ کر آفاق کو دیکھا تھا جو ہاتھوں سے بال سنوارتا اب پہلے کی طرح افسردہ نہیں لگ رہا تھا۔

''اور محبت کب سے ہوئی؟'' اس نے تیکھے چتونوں سے آفاق کو گھور کر پوچھا۔ یعنی اس کا شک بھی درست ہی نکلا تھا۔ جناب محبت کا روگ سینے سے لگائے پھر رہے تھے۔

''جب سے اسے دیکھا ہے یوں سمجھو...... پہلی نظر کی محبت......'' آفاق گویا کھو سا گیا تھا۔ مالا نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔

''اوہ...... تو میں پوچھ سکتی ہوں، وہ خاتون ہیں کون؟'' اسے فطری سا تجسس لاحق ہوا تھا۔ تبھی ذرا تیز لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

''تم......'' وہ ابھی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اس کا سیل فون بج اٹھا جبکہ مالا نے اتنی زور کی چیخ ماری تھی کہ سیل فون کی طرف متوجہ ہوتا آفاق دہل کر رک گیا۔

مالا علی عیسیٰ کی زندگی میں آفاق کیا گل کھلانے والا تھا اس کی خوشگوار ازدواجی زندگی کیونکر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئی یہ سب ضرور جانیے لیکن اگلے ماہ !

ناولٹ

ترکِ وفا

نایاب جیلانی



چھٹا حصہ



آج کل ان کی طبیعت پہلے سے بہت بہتر تھی اور شاید وہ پہلے کی طرح جلدی صحت یاب ہوجاتے اگر مون کی طرف سے انہیں دھڑکے نہ لگے ہوتے...... ان کی سب سے بڑی خواہش تو یہ تھی کہ مون ان کے ساتھ اس گھر میں رہے اور دوسری خواہش یہ تھی کہ مون شادی کر لے...... اور ان کی بہت لاڈلی، تھوڑی ،ضدی، کچھ سرکش اور انتہائی غیر معمولی ذہین بیٹی ان دو باتوں کو ماننے سے قطعاً

دور تھی...... وہ جب بھی موِن کے سامنے اپنی یہ دو خواہشات رکھتے تھے، موِن انہیں ایسے، ایسے دلائل دے کر بے بس کر دیتی تھی کہ وہ دوبارہ کچھ کہہ ہی نہیں پاتے تھے۔

علی عیسیٰ کی خوشحال اور پُرسکون زندگی سے وہ جتنے مطمئن تھے، موِن کی وجہ سے اتنے ہی اپ سیٹ، پریشان حال اور پُر اذیت رہنے لگے تھے۔ وہ کیوں ایسی تھی؟ وہ کیوں ایسی ہوگئی تھی؟ یا پھر وہ شروع سے ہی ایسی تھی وہ باپ ہو کر بھی سمجھ نہیں پائے۔ ابھی کچھ دیر پہلے موِن کی فون کال آئی تھی۔ اکلوتی بیٹی کی آواز سن کر ان کے دل میں دور تک ٹھنڈک اتر آئی تھی مگر اس کی باتوں نے اتنا ہی ان کے وجود کو برزخ بنا دیا تھا۔ وہ ابھی تک بہت ژولیدہ حال اور بکھری ہوئی سوچوں کے بھنور میں غرق ہو رہے تھے اور موِن جیسے بڑے ہی عام لہجے میں ٹھوکروں سے کانچ اڑا رہی تھی۔ ان کے یہ کہنے پر کہ ”تم میرا حال پوچھنے بھی نہیں آئی بیٹا۔“ اور اسی قسم کے دوسرے شکوے سن کر موِن نے سرسری لہجے میں کہا تھا۔

”آپ تو اکثر بیمار رہتے ہیں، اب ہر روز اپنا کام چھوڑ کر تو نہیں آسکتی۔“ اس کا لہجہ اتنا برا نہیں تھا جس قدر الفاظ زہریلے تھے۔ ان کے اندر کانچ ٹوٹ کر بکھرنے لگے تھے۔ ایسا زور کا دھچکا لگا تھا کہ بہت دیر تک وہ کچھ بولنے کے قابل بھی نہیں ہوسکے تھے۔ یہ ان کی اکلوتی، لاڈلی بیٹی تھی جس کے پاس باپ کی طبیعت پوچھنے کا بھی وقت نہیں تھا حالانکہ وہ جانتے تھے موِن ان سے بے انتہا محبت کرتی تھی...... پھر اچانک بیچ میں کیا ہوگیا؟ وہ سوچتے تو موِن کے اس رونے کے پیچھے تھوڑا بہت اپنا بھی قصور انہیں نظر آنے لگتا تھا مگر موِن بھی آہستہ، آہستہ اس حقیقت کو تسلیم کرلے گی یا احساسِ توہین کی زنجیروں سے نکل جائے گی، اپنی خام خیالی پر وہ بس سوچتے ہی رہ گئے تھے نہ وہ احساسِ توہین کے شکنجے سے نکل سکی تھی اور نہ ہی وہ کچھ بھول پائی تھی۔ اسے اوّل روز سے مالا کے وجود اور اس کی ذات سے نفرت تھی، یہ نفرت بڑھ تو سکتی تھی کم نہیں ہوسکتی تھی۔

ان کے سینے پر ایک بوجھ نما راز دفن تھا اور جب اس بوجھ کا وزن دُگنا ہوجاتا ان کی برداشت سے بڑھ جاتا تب وہ اسپتال کے بستر پر پہنچ جاتے تھے۔ اب بھی سینے سے اٹھتی ٹیسوں کو دبائے وہ مسلسل موِن کے بارے ہی میں سوچ رہے تھے۔

”تمہارے پاس اپنے بیمار باپ سے ملنے کا بھی وقت نہیں رہا بیٹا۔“ انہوں نے کیسے اپنے بکھرے حواسوں پر قابو پاکر بہ مشکل شکوہ کرنے کی کوشش میں آنسوؤں پر بند باندھا تھا۔

”نہیں......“ موِن نے کٹھور پن کی انتہا کردی تھی۔ ان کے دل کو پھر سے دھچکا لگا۔

”تم ایسی تو نہیں تھیں موِن......“ وہ رو دیے تھے مگر موِن ان احساسات کو سمجھنے سے بہت دور چلی گئی تھی۔ اس پر باپ کے بھرائے لہجے نے کوئی اثر نہیں کیا تھا۔ وہ بہت سنگ دل ہوچکی تھی۔

”آپ میرے لیے متفکر نہ ہوا کریں......“ اس نے غصیلی آواز میں کہا۔

”تو پھر کون متفکر ہوا کرے......؟“ انہیں گہرا رنج ہوا۔ موِن کی باتیں اکثر ان کے دل میں پیوست ہوجاتی تھیں۔

”پلیز پاپا! کوئی بات اور نہیں تو میں فون بند کرتی ہوں، کام ہے مجھے۔“ وہ سخت بیزار لہجے میں بولی تھی۔

”میری بات سنو......“ انہوں نے بے ساختہ موِن کو روکا تھا۔ وہ جو فون بند کرنے لگی تھی ایک دم رک گئی۔

”گھر کب آؤ گی؟“ اس کی خاموشی محسوس کر کے حبیب احمد نے جھجکتے لہجے میں پوچھا۔

”یہ سوال مت کیا کریں......“ وہ رُکھائی سے بولی۔

”کیوں......؟“ انہیں پھر سے دھچکا لگا۔

”میں جواب نہیں دے سکوں گی۔“ موِن بولتے، بولتے ذرا دیر کے لیے چپ کر گئی تھی تبھی انہوں نے دوبارہ بے چینی سے پوچھا۔

”کیوں......؟“

”آپ کو برا لگے گا۔“ وہ ایک مرتبہ پھر ذرا سا رک گئی۔

”اچھا...... تو تمہیں اس بات کا خیال ہے؟“ ان کی نم آنکھیں مسکرا دی تھیں تب موِن کچھ جھنجلا گئی۔

”ہے تو مگر......“ وہ شاید فون بند کردینے کا ارادہ رکھتی تھی۔ کال طویل ہوتی دیکھ کر جھلاہٹ کا شکار تھی۔

”اگر خیال ہے تو اپنے پاپا کی خاطر گھر لوٹ آؤ بیٹا!“ ان کے لہجے میں آس بھیگ رہی تھی۔ وہ آزردگی کی انتہا پر تھے اور موِن کٹھور پن کی انتہا پر......

”یہ ممکن ہے، اگر آپ ”اسے“ یا مجھے، ہم دونوں میں سے ایک کو قریب رکھیں، آپ میری بات مان جائیں، میں آپ کی بات مان جاؤں گی۔“ اس نے وہی بات کی جس کا انہیں دھڑکا تھا تو اس کا مطلب ہے موِن نے اپنے دل میں لگی گانٹھ کو ابھی تک نہیں کھولا تھا۔ وہ کتنے بے بس ہو کر رہ گئے تھے۔

”تم کیوں نہیں سمجھتیں بیٹا! یہ ممکن نہیں۔“ وہ رو دینے کو تھے مگر دوسری طرف پروا کسے تھی۔

”جب ممکن ہوا تب اپنی ڈیمانڈ میرے سامنے رکھیے گا۔“ موِن زہرخند ہوئی...... تب وہ گویا اندر سے ایک مرتبہ پھر ٹوٹ گئے تھے۔

”تمہارا اعتقاد کیوں اتنا کمزور ہوتا جا رہا ہے؟ کیوں نہیں، تمہیں سمجھ آتی، جو محبتیں ہمارے نصیب کی ہوں، دنیا کی کوئی طاقت انہیں ہم سے نہیں چھین سکتی۔ وہ ہمیں مل کے ہی رہتی ہیں اور جو ہمارے حصے کی نہ ہوں انہیں ساری دنیا مل کے بھی ہمارا نہیں کرسکتی۔“ وہ قطرہ، قطرہ پگھل گئے تھے، موِن کی سرکشی، ضد اور جذباتیت انہیں اتنی ہی تکلیف دیتی تھی۔ اس کی ایک ضد نے انہیں برسوں کا بیمار بنا دیا تھا۔

”میرے سامنے عیسیٰ کی طرح اقوالِ زریں بولنا مت شروع ہوجایا کریں......“ موِن چیخ کر رہ گئی...... اکثر باپ اور بھائی کی باتیں اسے لاجواب کردیتی تھیں پھر جب اس کے پاس دلائل ختم ہوجاتے تھے تب وہ دوسرا حربہ استعمال کرتی تھی پھر کیا مجال تھی، اس کے باپ یا بھائی کی جو وہ اس کے سامنے کوئی اور دلیل اٹھا لاتے۔ موِن اس وقت بھی چاہتی تو اپنے باپ کو لاجواب کرسکتی تھی مگر فی الحال دوسرا حربہ استعمال کرنے کا اس کے ذہن میں خیال نہیں آیا تھا اور نہ ہی اس کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ وہ اپنے ذہن کو کبھی کبھی بہت ریلیکس کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیتی تھی، اب باپ کی نیندیں حرام کر کے وہ خود کو پُرسکون کر رہی تھی، کیسی خود غرض بیٹی تھی وہ۔

”تمہارا باپ ہوں، تمہیں بھٹکتا نہیں دیکھ سکتا۔“ وہ بھرائی آواز میں بولے۔

”آپ میرے لیے کچھ نہیں کرسکتے، نہ کل کچھ کیا تھا اور نہ آج کچھ کریں گے۔ میں خود بھی بہت کچھ کرسکتی ہوں۔ آپ شاید جانتے نہیں، میں تو محض آپ کی محبت کو آزما رہی تھی اور آپ کی محبت کتنی کمزور نکلی...... بس علی عیسیٰ اور مالا تک محدود ہے آپ کی محبت...... اور دیکھ لیجیے گا، میں وہ سب کر کے دکھاؤں گی جو آپ وہم و گمان بھی نہیں کرسکتے۔“

اس کے لہجے میں کیسی فرعونیت بھری تھی۔ حسیب احمد گویا دہل، دہل گئے۔

"تجھے خوف نہیں آتا مون......" ان کو اگلے الفاظ ہی بھول گئے...... مون کے لب و لہجے میں پوشیدہ دھمکی نے ان کے حواس معطل کردیے تھے۔ وہ گویا سر سے لے کر پیروں تک منجمد ہوگئے تھے۔ وہ کیا چاہتی تھی؟ وہ کیا کرنے کا ارادہ رکھتی تھی؟ وہ انہیں ڈھکے چھپے لفظوں میں کیا بتارہی تھی؟

"نہیں......" اس نے ایک مرتبہ پھر ان کے حواس معطل کردیے تھے۔

"تو تمہیں کسی بات کا خوف نہیں رہا...... پھر بھی تم سمجھ نہیں رہیں بیٹا! کہ تم راستہ بھول رہی ہو۔" حسیب احمد کی آواز کسی عمر رسیدہ بزرگ کی طرح کپکپارہی تھی۔ مون اللہ کی طرف سے ان کے لیے آزمائش اور امتحان بن رہی تھی۔ ان کا جھٹکے کھاتا وجود بے بس ہورہا تھا۔ یہ ان کی بیٹی کا ذہن اور سوچ اسے کس سمت لے جارہے تھے؟ وہ کیوں نہ خوف زدہ ہوتے؟ مون نے ایک ننھے سے خواب کو بچانے کی خاطر جان کی بازی لگا رکھی تھی۔

"میں رستہ نہیں بھول رہی...... بس ایک خواب بچارہی ہوں، پہلا اولین خواب...... جسے آپ نے اپنے ہی قدموں تلے کچل دیا......" اس کی سانسیں پھنکار رہی تھیں حالانکہ لہجہ تو اب بھی اس کا بہت دھیما تھا۔ سرگوشیانہ سا، مدھم سا...... مگر اس کے لفظ تلوار کی دھار تھے۔

"وہ خواب تمہارے نصیب کا نہیں تھا، تمہارے حصے کا نہیں تھا پھر تم نے اسے کیوں دیکھا......؟ اس میں رنگ کیوں بھرے......؟ تم نہیں جانتی تھیں کیا......؟ خوابوں میں حقیقت کے رنگ صرف اللہ بھرتا ہے اگر خواب دیکھ لیا تھا تو پھر اس کی تعبیر کے لیے اللہ سے مدد مانگتی، دعا کرتی...... یقیناً وہ دلوں کو پلٹنے والا ہے، یقیناً وہ اس کے دل کو بھی پلٹ دیتا......" وہ ٹوٹے بکھرے لہجے میں بے آواز روتے ہوئے بولتے جارہے تھے مگر دوسری طرف سماعتوں پر خمار کا پردہ چڑھا تھا۔ اپنی بے پناہ صلاحیتوں پر مان اور خمار کا پردہ...... وہ کیوں نہ پھر مون کی سرکشی سے خوفزدہ ہوتے......؟

"میں گمراہ یا سرکش نہیں، نہ رستہ بھولنے والی ہوں...... آپ کیوں نہیں سمجھتے...... اللہ خود مدد کے لیے زمین پر نہیں اترتا...... وسیلے بنادیتا ہے اور میری صلاحیتیں، میرے لیے وسیلہ ہیں۔" مون نے جھنجلا کر وضاحت کی تھی۔ عموماً وہ وضاحتیں کرتی نہیں تھی مگر پاپا کے "سرکشی" والے طعنے اسے صفائی دینے پر مجبور کردیتے تھے۔

"اپنی صلاحیتوں کا ناجائز استعمال نہ کرو، یہ بھی گناہِ کبیرہ ہے، اپنے علم کو بھی ناجائز نہ بانٹو، یہ بھی گناہِ کبیرہ ہے۔" وہ بے ساختہ اسے ٹوک گئے تھے۔

"اور ثواب کیا ہے؟ احساسِ توہین میں جکڑ کر عمر گزار دینا، ٹھکرائے جانے کی تکلیف سہنا......؟ انتقام لینا، نہ بدلہ لینا......؟" مون غضبناک ہوگئی۔

"تمہیں کسی نے نہیں ٹھکرایا...... غلط بات مت کرو۔" حسیب احمد نے گویا منت کی تھی۔

"آپ دوسروں کے عیبوں پر پردہ مت ڈالیں، میں جانتی ہوں، جس نے جو بھی میرے ساتھ کیا تھا۔" وہ انتہا کی بدگمان تھی۔

"کسی نے تمہارے ساتھ کچھ نہیں کیا، تم نصیب کے لکھے پر شاکر کیوں نہیں ہوتیں......؟" حسیب احمد زیرِ لب بڑبڑا رہے تھے تب کسی نے چپکے سے دروازہ کھول کر قدم اندر رکھے تھے۔ پھر کوئی دبے قدموں چلتا ہوا ان کے قریب آگیا...... وہ چونکے تو تب تھے جب کسی نے ریسیور ان کے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے کان سے لگالیا تھا۔ اثر میں سے وہی پُراثر، دھیمی مگر سلگتی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"ابھی تک صبر اور شکر کیے تو بیٹھی ہوں...... ورنہ جانے کیا کچھ کر ڈالتی، آپ کا خیال ہی تو ارادوں کو توڑ ڈالتا ہے......" جانے کس رو میں اس نے پہلی مرتبہ کمزور لہجے میں کچھ کہا تھا۔ شاید باپ کی محبت اسے کبھی کبھی کمزور کرہی دیتی تھی۔ عیسیٰ نے ایک گہری سانس لی تھی اور دوسری طرف مون کی اتنی تیز حسیات تھیں کہ اس نے محض عیسیٰ کے سانس لینے والے اسٹائل سے ہی اندازہ لگالیا تھا کہ ریسیور پاپا کے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔

"تم بھی پہنچ گئے؟" مون نے زیرِ لب بڑبڑا کر کہا تھا، وہ جانتی تھی عیسیٰ نے جتنی بات سُن لی تھی، اس پر تبصرہ کیے بغیر رہنے والا نہیں تھا۔

"پاپا کا خیال تمہارے یعنی مون حسیب کے ارادوں کو توڑ دیتا ہے۔ اس سے بڑی خوش نصیبی اور کیا ہوگی؟ تم اپنے آپ سے نکل کر دوسروں کے لیے سوچنے لگی ہو، اتنی بڑی تبدیلی...... یقیناً میں حیران ہوں۔"

عموماً مون اپنے بھائی سے کم، کم ہم کلام ہوتی تھی، اسے عیسیٰ کی مقناطیسی باتوں سے خوف آتا تھا۔ جیسے اب آرہا تھا، وہ عیسیٰ سے بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھی یہ تو اچانک عیسیٰ اس کے فون کی خوشبو کا پیچھا کرتا آگیا تھا حالانکہ مون جانتی بھی تھی، وہ آفس سے آنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ کچھ وقت ضرور گزارتا ہے، یہ عیسیٰ کا معمول تھا اور مون کی توقع کے برعکس عیسیٰ شادی کے بعد بھی اپنی روٹین بدل نہیں سکا تھا۔ وہ تو یہی سمجھتی تھی، عیسیٰ شادی کے بعد بہت بدل گیا ہے، حالانکہ دور سے دیکھنے والی چیز کے بارے میں غلط اندازے لگانا اس کے فن میں شامل نہیں تھا۔ وہ جانے کب تک خاموش رہتی مگر عیسیٰ کی دھیمی نرم آواز طلسم توڑ ڈالتی تھی۔

"کیا تم لائن پر موجود ہو مون......؟" عیسیٰ نے گلا کھنکھار کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا تھا اور مون گویا خیالات کی دنیا سے حیران، حیران باہر نکلی تھی۔

"تم جانتے تو ہو، مجھے اپنی ذات بہت عزیز ہے۔" وہ فی الفور سنبھل کر گویا ہوئی تھی۔ اپنی کسی کمزوری کو واضح کرنا اسے گوارا نہیں تھا۔ عیسیٰ کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی تھی۔

"وہ کہتے ہیں ناں......" اس نے مسکراہٹ روک کر کچھ یاد کرنے کی کوشش میں خاموشی اختیار کی تھی پھر نرمی سے گویا جتانے لگا۔

"گزرے لمحوں کو بھلانے میں کچھ وقت لگے گا
اپنی ذات سے باہر نکلنے میں کچھ وقت لگے گا"

"آں...... ہاں......" عیسیٰ کے کلام کو سن کر مون نے برجستہ اسے ٹوکا تھا......"میں اپنی ذات کے بُت کدے سے باہر نکلنے والی نہیں......" در پردہ وہ اسے لاجواب کرنا چاہ رہی تھی۔ مون ایسا کر بھی سکتی تھی اگر اپنے اوپر والے پورشن (دماغ) کا کمال حاصل کرتی تو...... مگر آج وہ کسی اور ہی موڈ میں تھی۔ ذہنی طور پر خود کو تھکانا نہیں چاہتی تھی۔

"یاد رکھنا پیاری مون......! بت ٹوٹ بھی جاتے ہیں...... اللہ تمہیں ایسی اذیت سے بچائے......" عیسیٰ نے بے ساختہ اسے ٹوکا تھا۔

"تم مجھے اتنا کمزور نہ سمجھو......" وہی ضدی سا کچھ کچھ کروفر انداز...... بھلا مون کا باپ اور بھائی پوری جان سے کانپتے کیوں نہ......

"اتنی اونچائی پر مت جانا مون......! کہ ہم تم تک اور تم ہم تک پہنچ ہی نہ پاؤ...... یاد رکھنا، جب اللہ کسی کو اونچی جگہ پر کھڑا کرتا ہے تو اسی پر بھروسا رکھنا چاہیے یا تو جب گرنے کے قریب وہ سہارا دے گا، ورنہ اڑنا تو سکھا ہی دے گا...... بات صرف اللہ پر بھروسے کی ہے، اپنے ایمان کو کمزور مت کرو...... اور اونچائی پر کھڑے ہو کر غرور بھی مت کرو، تمہیں اونچائی پر کھڑا کرنے والا بھی اللہ

ہے اور اونچائی سے زمین بوس کرنے والا بھی وہی خدا ہے۔ اس کے بھروسے کی رسی کو چھوڑو گی تو نہ دنیا رہے گی نہ آخرت......" عیسیٰ نے تحمل سے اپنی بات کی وضاحت دلیل کے ساتھ کی تھی۔ مون کو یہی لہجے لاجواب کرتے تھے اور وہ لاجواب ہو کر اپنی کمزوری ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"میرا ایمان کمزور نہیں۔" اس نے ٹھوس لہجے میں کہا تھا، اب کہ لہجہ مضبوط تھا پر الفاظ ذرا کمزور تھے۔ وہ جو باتوں کو پکڑنے کے فن سے آشنا تھا اس وقت سابقہ کسی لمحے کو پکڑ کر سامنے لے آیا تھا۔

"بواریا کے (کرخ) گرجا گھر میں کھڑے ہو کر بھی یہی کہو، تو بات بنے...... جہاں تمہارا جانا ضروری نہیں ہوتا، وہاں کیوں جاتی ہو؟" عیسیٰ نے کتنی پرانی بات کا حوالہ دیا تھا...... جب وہ مالا کو ہمراہ لے کر گروی کی طرف گیا تھا اور وہ مالا کو بواریا کا تاریخی گرجا گھر دکھا رہا تھا، تب اس نے مون کو وہاں دیکھا تھا مگر جتایا بعد میں بھی نہیں تھا۔ آج اتنے دنوں بعد اسے جتانے کا موقع بالآخر مل ہی گیا تھا۔ وہ موقع کی مناسبت سے بات کرنے والوں میں سے تھا۔ بعد میں کئی ملاقاتوں کے دوران بھی اس نے مون کو گرجے جانے پر کبھی کچھ کہا نہیں تھا۔ آج موقع ملا تو اس نے گنوایا بھی نہیں تھا۔ مون کچھ پل کے لیے چپ سی کر گئی تھی۔

"میں تم سے ملنے وہاں گئی تھی، سوزن کے لیے یا گرجے کی کشش میں نہیں۔" وہ سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔ یقیناً وہ سچ بول رہی تھی۔ تب عیسیٰ نے اِک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

"تم مجھ سے ملنے گئی تھیں پر ملی نہیں...... مجھے دیکھ کر تم غائب ہو گئیں......" عیسیٰ کا انداز اب بھی صاف جتانے والا تھا، مون کو بے حد برا لگا۔ وہ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بولی۔

"تمہارے ساتھ وہ لڑکی تھی، سو میں وہاں سے چلی گئی، مجھے تمہاری بیوی نہیں پسند......" عیسیٰ کی بات کے جواب میں ایسا روکھا، سچ باہر آنے والا تھا یہ عیسیٰ کو بھی خبر نہیں تھی۔ اب کہ عیسیٰ کچھ پل کے لیے گم صم رہ گیا...... حالانکہ وہ جانتا تھا کہ مون کو اس کی بیوی سے عجیب سی پُرخاش ہے۔ مون اسے پسند نہیں کرتی...... مگر یوں منہ پھاڑ کر مون کا سچ بولنا بھی عیسیٰ کو اچھا نہیں لگا تھا۔

"اب تمہاری پسند، ناپسند کی حدود سے بات باہر نکل چکی ہے، مالا میری بیوی ہے، اس لحاظ سے تمہارے لیے بھی قابلِ احترام ہے۔" عیسیٰ نے تحمل کے ساتھ اسے سمجھانا چاہا تھا۔ پاپا اس دوران خاموشی کے ساتھ عیسیٰ کی گفتگو سن رہے تھے۔ انہوں نے عیسیٰ کو ٹوکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"وہ میرے لیے قابلِ احترام نہیں......" مون بے ساختہ چیخی۔

"تو پھر......؟" عیسیٰ نے اچنبھے سے پوچھا۔

"اس کا نام میرے سامنے مت لیا کرو۔" وہ زہر خند ہو رہی تھی۔

"نام نہ لینے سے کیا ہوگا......؟ اس کی حیثیت میں تبدیلی نہیں آئے گی...... وہ میری بیوی ہی رہے گی۔" عیسیٰ اب ذرا سخت لہجے میں بولا تھا۔ مون کی ناگواری اور غصہ اسے بھی غصہ دلا رہا تھا۔

"وقت بہت کچھ ختم کر دیتا ہے۔" کچھ دیر بعد وہ اپنے ازلی اعتماد سے گویا ہوئی...... وہی پُرتپش، پُراسرار قسم کا دھیما لہجہ...... عیسیٰ کا ذہن الجھ گیا تھا۔

"وقت کم از کم رشتے ختم نہیں کر سکتا......" عیسیٰ نے اندرونی بے چینی چھپا کر کہا تھا تب وہ ہولے سے دوسری طرف دیکھ کر مسکرائی تھی۔

"بہت کچھ بدل جاتا ہے عیسیٰ! تم جانے کتابوں سے کب نکلو گے۔" مون نے استہزائیہ لب و لہجے میں کہا تھا، عیسیٰ کچھ چونک گیا۔

"تم جو کتابوں کو چھوڑ چکی ہو۔" عیسیٰ کو قلق سا ہوا تھا، مون نے جب تعلیم ادھوری چھوڑی تھی تب عیسیٰ کو سب سے زیادہ تکلیف ہوئی تھی مگر ہمیشہ کی طرح مون نے نہ پاپا کی بات مانی تھی اور نہ عیسیٰ کے دلائل کو کوئی اہمیت دی تھی۔

"مجھے اس پر کوئی پچھتاوا نہیں......" وہ بے نیازی سے بولی۔

"سب سے بڑی غلطی ہی یہی ہے کہ اپنی غلطیوں سے بے خبر رہا جائے۔" عیسیٰ متاسف سا رہ گیا۔

"تو تم اپنی غلطی سے آگاہ ہو؟" وہ بھی تو عیسیٰ کی بہن تھی پھر بھلا کیسے چُوک جاتی، چبھتا ہوا لہجہ عیسیٰ کو خوب چونکا بھی رہا تھا اور مون کی بات کے ہر پہلو کی طرف اشارہ بھی کر رہا تھا۔

"پاکیزہ رشتوں کو غلطیوں سے عبارت کر رہی ہو......؟ اگر شادی کرنا ایک غلطی ہے تو پھر میں واقعی گناہ گار ہوں۔" عیسیٰ بھی بے نیازی سے جتلا رہا تھا۔ تب مون نے بے ساختہ اسے ٹوک دیا۔

"شادی کرنا غلطی نہیں...... اگر سوچ سمجھ کر چھان پھٹک کے کی جائے......" اس نے اندر کی جلن باہر نکال ہی دی تھی۔ آج بہت عرصے بعد ان دونوں کے درمیان طویل گفتگو ہو رہی تھی۔ مون کو بیتے ہوئے کتنے ہی ماہ و سال یاد آ گئے تھے جب وہ دونوں بہن بھائی اتنے قریب نہ سہی پر اتنے دور بھی نہیں تھے۔

"یعنی تم سمجھتی ہو، پاپا کا اور میرا انتخاب غلط ہے؟" عیسیٰ نے بہ مشکل ناگواری دبا کر پوچھا تھا۔

"ہاں...... اور وقت ثابت بھی کر دے گا۔" وہ مطمئن تھی۔ گویا وقت کے اچانک پلٹا کھانے کا اسے یقین تھا۔ عیسیٰ کو بے پناہ دکھ ہوا تھا مگر وہ کچھ دیر کے لیے چپ سا کر گیا...... بہت دیر کی خاموشی کے بعد عیسیٰ نے سابقہ لہجے کو برقرار رکھ کر کہا تھا۔

"ایسا نہیں ہوگا......" عیسیٰ بھی مطمئن تھا، اس کا لہجہ بھی ٹھوس اور مستحکم تھا۔

"سانپ کو آستین میں رکھ کر سمجھتے ہو کہ وہ ڈسے گا بھی نہیں......" مون کے اگلے الفاظ نے عیسیٰ کے مستحکم یقین کو متزلزل کر دیا تھا۔ وہ گویا لمحے بھر کے لیے بھونچکا رہ گیا...... اسے مون سے ایسی دلیری اور زہریلی بات کی امید نہیں تھی۔

"سانپ سے تمہاری مراد کیا ہے؟" بہت دیر بعد عیسیٰ نے بڑے ہی ضبط کے ساتھ پوچھا تھا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا مون کبھی اچھی بات نہیں کرے گی مگر پھر بھی جانے کس امید کے تحت پوچھ لیا تھا۔

"مالا اور آفاق......" بالآخر مون نے اپنے اندر کا زہر باہر اگل ہی دیا تھا۔ دوسری طرف اتنے زور سے عیسیٰ چلایا کہ مون کو اپنے کان پھٹتے ہوئے محسوس ہونے لگے تھے۔ وہ ایک دم دہل کر چپ ہو گئی تھی۔

☆☆☆

وہ اس کی چیخ پر دہل گیا تھا یہی وجہ تھی کہ اس کا موبائل پکڑنے والا ہاتھ ہوا میں ہی معلق رہ گیا تھا۔ اس نے کچھ تپ کر موبائل کو دیکھا تھا جو بج، بج کر خاموش ہو چکا تھا۔ اس نے اسکرین کو روشن کر کے دیکھا، سامنے والی سفید جنگلی بلی کی کال تھی۔ اسے قلق سا ہوا، مالا کی ڈرامائی چیخ کی وجہ سے موبائل زمین بوس ہو چکا تھا اسے اٹھانے کے لیے وہ نیچے جھکا تو مالا کے ہونق سے چہرے پر نظر پڑی تھی۔ آفاق کا منہ کچھ کھل سا گیا تھا۔ اس نے حیرت کے جھٹکے سے سنبھل کر کہا۔

"تم کبھی ہونق ہو جاتی ہو اور کبھی چیخ پڑتی ہو، آخر میری باتوں میں ایسا کیا راز ہے؟" وہ...... بے چارگی کی تصویر بنا کھڑا تھا۔ موبائل کی اسکرین خاموش تھی، اس کا آدھا دھیان کال کرنے والی

میں اٹکا ہوا تھا اور آدھا دھیان مالا کی طرف چکر لگا رہا تھا۔

''یہ جو تم قسطوں میں بات کرتے ہو ناں...... ادھوری گفتگو چھوڑ کر اِدھر اُدھر توجہ دینا، آدھی بات کسی سے کرنا، آدھی بات درمیان میں چھوڑ دینا...... کسی دن اپنے ساتھ مجھے بھی لے ڈوبو گے۔'' مالا نے سنبھل کر اس کے چودہ طبق بھی روشن کردیے تھے۔

''آں...... آں...... سمجھ گیا۔'' وہ چونک کر سیدھا ہوا تھا پھر اسے ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ خوب لمبا سا قہقہہ لگا کر وہ مالا کے غصیلے تاثرات کا جائزہ لینے لگا تھا پھر اس کا کام سے فارغ ہو کر ذرا سنجیدہ ہو گیا کیونکہ مالا بھی غصہ انتہائی سنجیدگی سے کر رہی تھی۔

''وہ اصل میں یہ اچانک موبائل بج کے ماحول ڈسٹرب کر گیا تھا ناں......'' اس نے موبائل کو غصے سے اٹھا کر صوفے پر پٹخا تھا پھر مالا کی طرف متوجہ ہوا۔

''تم وہ بات بتاؤ جسے ادھورا چھوڑ کے موبائل کے گیت سننے لگے تھے۔'' وہ بیزاری سے بولی تھی۔ ابھی اسے ٹیبل پر کھانا لگانا تھا۔ عیسٰی کے کپڑے نکالنے تھے جبکہ آفاق کی لن ترانیاں ختم نہیں ہو رہی تھیں۔

''تم سے...... ایک التماس کرنا تھی۔'' وہ ایک مرتبہ پھر تمہید باندھنے لگا تھا جب مالا نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیے تھے۔

''جو کہنا ہے، کہہ بھی دو، تمہیں اللہ کا واسطہ۔'' مالا گویا عاجز ہو چکی تھی تب آفاق نے ذرا پُرسوچ لہجے میں پچھلی بات کا حوالہ دے کر کہا۔

''پہلے مجھے تم یہ بتاؤ کہ محبت صرف ایک بندے تک محدود ہوتی ہے؟'' اس کا لہجہ اور انداز بہت پُرسوچ قسم کے تھے، مالا الجھ سی گئی۔

''یہ کیا بات ہوئی؟'' اس نے جُز بز سا ہو کر پوچھا۔

''او کے، اس بات کو رہنے دو، سوال مشکل ہے، مجھے صرف یہ بتاؤ کہ محبت کی صرف ایک ہی قسم اور ایک ہی نظر ہوتی ہے۔ کیا محبت ماں، بہن، بیٹی یا کسی دوست کے خلوص سے نہیں ہو سکتی؟'' آفاق نے آسان لفظوں میں اپنی بات کو واضح کر دیا تھا، مالا گویا سمجھ کر ڈھیرے سے مسکرادی تھی، وہ جو یہ سوچ رہی تھی کہ آفاق جانے اب کون سی الجھنوں میں الجھاتا رہے گا، اب اس کی بات کے معنی سمجھ کر ہلکی پھلکی ہو گئی۔ حالانکہ کچھ دیر پہلے بھی وہ ایک مرتبہ پھر اس کے حواسوں پر بجلی گراتا رک گیا تھا۔ آفاق کے ''تم سے'' جیسے دو لفظوں سے تو مالا کو اب خوف آنے لگا تھا۔ حالانکہ یہ خوف کچھ دیر پہلے بھی اس کے دل کو پنکھ لگا گیا تھا مگر اس کی وضاحت نے اسے پھول کی طرح ہلکا پھلکا کر دیا تھا۔ اس کی خاموشی پر آفاق نے جھنجلا کر آواز لگائی تھی تبھی مالا چونک اٹھی۔

''ہاں، کیوں نہیں...... !'' اس نے مسکرا کر آفاق کا حوصلہ بڑھایا تھا۔ تبھی وہ مزید بڑے اعتماد سے بولا۔

''تو پھر جان لو کہ مجھے تم سے اور عیسٰی سے بہت پیار ہے...... میری محبت تم لوگوں کے خلوص کے سامنے بالکل ہیچ ہے...... اور یہ محبت کسی بھی غرض سے پاک ہے جبکہ اِفی پڑوسن سے محبت اگرچہ بے غرض ہے مگر پھر بھی اس میں کچھ نہ کچھ غرض پوشیدہ ہے......'' وہ اپنی جھونک میں بولتا جا رہا تھا جب مالا ایک مرتبہ پھر بے ساختہ چیخ پڑی۔

''اِفی سے؟ تو کیا تم اِفی سے محبت کرتے ہو؟'' پچھلی ساری باتیں نظر انداز کر کے وہ اِفی کے نام پر انتہائی شاکڈ رہ گئی تھی۔

''ہاں تو اور کیا......'' وہ آنکھیں مسل کر اثبات میں زور شور سے سر ہلاتا گیا...... ''مگر جو

محبت تم دونوں سے ہے، اس کی برابری اِفی بھی نہیں کر سکتی۔'' آفاق شاید بتانا چاہتا تھا کہ اِفی کی چار روزہ محبت ان دونوں کی محبت پر سبقت نہیں لے گی مگر مالا نے جھنجلا کر اسے ٹوک دیا تھا۔

''ارے...... ہمیں بھاڑ میں جھونکو...... مجھے اِفی کے بارے میں بتاؤ...... یہ معرکہ کب سرانجام دیا؟ ہماری ناک کے نیچے پوری لو اسٹوری چلتی رہی اور ہمیں کانوں کان خبر نہیں ہو سکی۔'' مالا سخت متجسس اور بے چین ہو چکی تھی۔ آفاق کی محبت سے لے کر مجنوں بننے تک پوری کہانی سننا چاہتی تھی۔

''اِفی کے بارے میں کیا بتاؤں؟ اسے تو خود اپنے بارے میں خبر نہیں......'' اب وہ فلسفہ جھاڑنے کے موڈ میں نظر آ رہا تھا تب مالا پھر سے جھنجلا گئی تھی۔

''اُف...... اب لمبی، لمبی مت چھوڑنے بیٹھ جاؤ...... جلدی بولو محبت کی ابتدا کے بعد کہانی فلاپ کیسے ہو گئی؟'' اس نے بے قراری سے پوچھا تھا...... دراصل میز پر کھانا لگانے کی بھی جلدی تھی اور اتنی دیر تک تجسس پر قابو پانا بھی محال تھا۔ وہ اس کی پوری اسٹوری میں جہاں، جہاں عیسٰی کی محبت اور مالا کا خلوص سامنے آتا گیا، وہ اسے فارورڈ کرواتی ہوئی محض اِفی اور آفاق کے سین تک پہنچ گئی تھی۔

''پہلے میری بات سن تو لو، آگے بھی بتاتا ہوں۔'' وہ معاً انتہا کا سنجیدہ ہو گیا تھا۔ مالا نے ایک گہری سانس کھینچی۔ وہ جانتی تھی پوری حکایت سنے بغیر جان نہیں چھوٹے گی...... اور آفاق مختصر بات کرنے کا تو تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

''اب جلدی بولو، بیچ میں رکنا نہیں۔'' مالا جھلا گئی تھی۔

''دیکھو مالا! مجھے کچھ وضاحت کرنی ہے، یہ جو تم میری باتوں پر پریشان ہو جاتی ہو، تو اس کے لیے چھوٹی سی وضاحت دوں گا، مجھے عیسٰی اور تمہارے خلوص سے بہت محبت ہے۔ میں یہاں اجنبیوں کے دیس میں مارا، مارا پھر رہا تھا جب عیسٰی میرے لیے وسیلہ بن گیا...... میں اس گھر کا نمک کھاتا ہوں اور میں نمک حرام نہیں ہوں...... عیسٰی نے اگر مجھے یہاں رکھا ہوا ہے تو وہ مجھ پر اپنی ذات سے بڑھ کر اعتبار کرتا ہے۔ اسے مجھ سے کوئی خدشہ لاحق نہیں، وہ مجھ پر اعتماد کرتا ہے اور میں عیسٰی کا اعتبار توڑ دوں؟ یہ مجھے مر کے بھی گوارا نہیں ہو گا۔ باقی کہانی کچھ یوں ہے کہ اِفی مجھے بہت اچھی لگتی ہے اور اِفی کی ممی کو بھی میں بطور داماد پسند آ گیا ہوں مگر......'' وہ نان اسٹاپ بولتے ہوئے عادتاً رک گیا تھا تب مالا نے بے چینی سے کہا۔

''مگر کیا......؟'' اس نے عجلت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''یہی کہ میری دادی اور بہنوں نے محاذ کھڑا کر دیا ہے۔ انہیں غم ہے کہ میں کسی میم کے ہتھے نہ چڑھ جاؤں حالانکہ وہ جانتی بھی ہیں کہ یہاں شادی کرنا میری مجبوری ہے۔ محبت ایک طرف، اگر میں یہاں شادی نہ کر سکا تو کبھی سیٹلڈ نہیں ہو سکوں گا پھر ان لوگوں کے بڑے، بڑے خواب کیسے پورے ہوں گے؟ میرا فیوچر بھی نہیں بن سکے گا۔'' وہ اپنی پریشانی کی اصل وجہ مالا کو بتا کر اسے بھی متفکر کر چکا تھا۔

''تو پھر اب کیا ہو گا؟'' مالا سخت پریشان ہو گئی تھی۔ آفاق بھی فکرمند سا پیشانی ملتا بہت اپ سیٹ لگ رہا تھا۔

''ہونا کیا ہے؟ امی اور دادی کو منانا ہو گا مگر یہ کام عیسٰی ہی کر سکتا ہے۔ امی اور باجیوں کو عیسٰی پر بڑا اعتماد ہے۔'' آفاق نے سنجیدگی سے اگلے معاملات سے بھی آگاہ کیا...... تب مالا تھوڑا سا الجھ سی گئی تھی۔

"تم نے عیسیٰ سے بات نہیں کی۔" وہ کچھ سوچ کر حیرت سے پوچھ رہی تھی۔

"اگر عیسیٰ سے بات کر لیتا تو تمہارے سامنے بین بجانے کی کیا ضرورت تھی۔" آفاق جھلا کر بولا۔ مالا سخت برا مان کر خفگی سے تڑخ تھی۔

"تو پھر اب میں کیا کروں......؟" اس نے الجھ کر کہا تھا۔

"تم عیسیٰ سے بات کرو، وہ تمہاری بات کبھی رد نہیں کر سکتا۔" آفاق ملتجی سا بول رہا تھا۔ مالا ذرا سا حیران ہوئی۔

"اور تمہاری بات رد کر دے گا؟" اس نے آنکھیں پھیلا کر پوچھا تھا۔ آفاق کی دماغی حالت پر اسے سو فیصد شک تھا۔ اب یقین بھی ہو چکا تھا۔ محبت نے اس کے حواس اچھے خاصے متاثر کر رکھے تھے۔

"ہاں کیونکہ وہ رشتوں کو ایک طریقے سے ساتھ لے کر چلنے والا بندہ ہے، جب میں اسے بتاؤں گا امی اور دادی نہیں مان رہیں تو وہ کہے گا' میں ان کی بات مان لوں...... جو میرے دل کو گوارا نہیں ہوگی......" وہ منہ بسورے پھر سے نان اسٹاپ شروع ہو چکا تھا۔ مالا ہونق سی ہو گئی۔

"عیسیٰ تمہاری محبت کو انجام تک لے جانے میں اگر تمہارا ساتھ نہیں دیں گے تو پھر میری طرف سے بھی جواب ہے۔" مالا نے گویا آنکھیں ہی ماتھے پر رکھ لی تھیں۔ اس کا صاف کھرا جواب سن کر آفاق کو دھچکا لگا تھا۔

"ایں...... تم کیسی بہن ہو؟" اب وہ بہت خونخوار تیور لیے پوچھ رہا تھا۔ مالا کو فوراً اپنے لفظوں کا احساس ہو گیا۔ دراصل یہ لفظ ہی تو ہوتے ہیں جو ذرا سے ہیر پھیر کی وجہ سے پورا مفہوم ہی الٹ دیتے ہیں۔ کسی کو سمجھ آ جاتے اور کوئی ان کی گہرائی میں اترے بغیر اپنی مرضی کا مفہوم نکال لیتا ہے۔ اب مالا کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو فوراً وضاحتی لہجے میں بولی۔

"میرا مطلب ہے اگر عیسیٰ ساتھ نہ دیں تو میں کیسے؟" وہ گڑبڑا کر چپ سی کر گئی...... تب اتنے کشیدہ ماحول میں بھی آفاق کو ہنسی آ گئی تھی۔ وہ دیر تک اس کی گڑبڑاہٹ سے لطف اندوز ہوتا رہا تھا۔

"اُف اے مشرقی خاتون! نہیں آپ کی اطاعت گزاری اور وفاشعاری پر حرف آئے گا۔" وہ مسکرا مسکرا کر ہلکان ہو رہا تھا۔ اپنے جوگیوں والے حلیے میں ہنستا ہوا وہ قطعاً جوکر لگ رہا تھا۔ مالا کو سخت برا لگا۔

"میں مشرقی خاتون ہوں، مجھے اس پر فخر ہے۔" وہ ذرا اترا کر اور تھوڑا جتا کر بولی تھی۔ تب آفاق نے فوراً سرِ تسلیم خم کر دیا تھا۔

"جانتا ہوں میں...... اب کیا اعلان کروا دوں......" آفاق نے مسکرا کر اسے چھیڑا تھا تب وہ چڑ کر رہ گئی تھی۔

"اب میرے لیے کیا حکم ہے؟" اس نے جھنجلا کر کہا۔

"وہ ہی...... یعنی عیسیٰ سے بات کرو، وہ دادی کو منا لے، باقی انی کی ممی تو سمجھو تیار بیٹھی ہیں۔ انہیں میرے جیسا داماد تو کہیں مل ہی نہیں سکتا۔" اب...اترانے کی باری آفاق کی تھی۔

"ایک بات بتاؤ آفاق کیا تم انی سے محبت کرتے ہو یا پھر محض نیشنلٹی کے لیے شادی کرنا چاہتے ہو؟" مالا نے کچھ جھجکتے ہوئے بالآخر اصل بات پوچھ ہی لی تھی جبکہ آفاق کا چہرہ کچھ تاریک سا ہو گیا تھا۔ گویا اپنی محبت پر غرض کی یہ ہلکی گرد بھی اسے پسند نہیں تھی۔ تاہم وہ مالا کو کچھ بھی پوچھنے سے روک نہیں سکتا تھا۔

"ایسی بات نہیں مالا! مجھے انی سے محبت نیشنلٹی کے لالچ میں نہیں ہوئی... بلکہ میں نے تو یہ سوچا بھی نہیں تھا...... ان تمام آپشنز کو انی نے میرے سامنے رکھا تھا بلکہ اسی نے مجھے پرپوز کیا...... تم تو کچھ جانتی ہی نہیں مالا......! یہاں پاکستانی فیملیز کو بیٹیوں کے مناسب رشتوں کے لیے کس قدر ذہنی اذیت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انی کا بھائی پاکستان اسی سلسلے کی غرض سے گیا ہے۔ اپنے باپ کے خاندان والوں میں بہنوں کے لیے مناسب بر تلاش کرنے...... جو پاکستانی گھرانے حبیب انکل اور انی کی فیملی جیسے مہذب، شریف اور پرانی قدروں پہ جان دینے والے ہیں، ان کو اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی شادی کے لیے یہاں اپنے جیسے ملتے ہی نہیں اور جو ملتے ہیں وہ اس قدر عیاش ہوتے ہیں کہ ان سے رشتہ جوڑنے سے بہتر خودکشی کر لینا ہے۔" آفاق نے بہت سنجیدگی کے ساتھ وضاحت کی تھی تب مالا گویا سمجھ کر سر ہلا گئی۔ وہ بغیر سوچے سمجھے سوچ کی انتہا پر پہنچ کے فتویٰ جاری کر دیتی تھی جو بالکل غیر مناسب تھا۔ کسی بھی پہلو پہ غور کیے بغیر اگلے بندے پہ اٹیک کرنا قطعاً فضول حرکت ہے، عیسیٰ نے کئی مرتبہ مالا کو اس جلد بازی پر ٹوکا بھی تھا مگر مالا سے پھر بھی بھول چوک ہو جاتی تھی...... وہ نہ جانے کتنی دیر تک اپنی جلد بازی پہ پشیمان رہتی مگر آفاق نے اسے زیادہ دیر تک پشیمان نہیں رہنے دیا تھا۔ وہ مالا کو مزید بتا رہا تھا کہ جرمنی میں مستقل رہائش کے باوجود بھی شہریت بڑی مشکل سے ملتی ہے۔ گنتی کے تارکینِ وطن جو یقیناً بڑے خوش نصیب تھے انہیں جرمنی کی شہریت ملی تھی جن میں ایک حبیب احمد بھی شامل تھے۔ ویسے بھی تمام مغربی ممالک اپنے مفاد کو لے کر آگے چلتے ہیں۔ اگر جرمنی، سیاسی پناہ کے لیے آنے والے مہاجرین کو اپنے ملک میں جگہ دیتا ہے تو اس میں بھی سراسر اپنا فائدہ اور نفع دیکھتا ہے جیسا کہ صنعت و حرفت کی ترقی کے لیے مہاجرین بڑا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

اسی طرح جرمنی اگر ایگری منٹ کے تحت کسی دوسرے ملک سے افرادی قوت حاصل کرے تو یہ کام خاصا مہنگا ہوگا...... یہ ملک اقوامِ متحدہ کے قانون کے مطابق سیاسی پناہ گزینوں اور مہاجرین کو مکمل تحفظ فراہم کرتا ہے...... اسے اپنی قانونی یا اخلاقی ذمے داری نہیں سمجھتا بلکہ اس میں بھی جرمنی کا اپنا فائدہ اور نفع نظر آتا ہے۔ کیونکہ سیاسی پناہ لے کر آئے افراد جرمنی کی تمام صنعتوں اور کاروباری اداروں میں کم لاگت پر انتھک اور دیر تک کام کرتے ہیں بلکہ ان پناہ گزینوں کے خون تک نچوڑ لیتے ہیں۔ یہ انگریز قوم بغیر نفع و نقصان کا حساب لگائے تو سانس بھی نہیں لیتی۔ آفاق نے مزید یہ بھی بتایا تھا کہ یہاں پیپر میرج کرنا بھی آسان نہیں، یہ قوم بڑی عقلمند ثابت ہوئی ہے۔ ویسے بھی اگر دوسری عالمی جنگ کے بعد مردوں کی تعداد جرمنی میں کم نہ ہو جاتی تو حکومت نے جرمن عورتوں کو غیر ملکیوں کے ساتھ شادی کی ہرگز بھی اجازت نہیں دینا تھی۔ اس قانون میں نرمی کے بعد جرمن خواتین کو غیر ملکیوں سے شادی کی اجازت مل گئی تھی مگر انہیں ہر لحاظ سے مردوں پہ فوقیت دی گئی۔ وہ کئی مغربی ممالک میں عورتوں کی آزادی کے تحت جب دل چاہے شوہر سے طلاق لے سکتی تھیں۔ شوہر کی مکمل نگرانی کا حق انہیں حاصل تھا۔ تمام اخراجات ان کے ہاتھ میں ہوتے تھے۔ جتنی چاہے رقم شوہر کو دیں...... وہ بے چارہ کما، کما کر بے حال ہو جاتا اور یہ اپنی مرضی سے عیاشیاں کرتی پھرتیں، حتیٰ کہ شوہروں کو باہر اپنی مرضی سے دوستوں اور تعلق داروں سے ملنے کے لیے ایک مقرر وقت کی حد تک بیوی سے اجازت درکار ہوتی تھی۔

آفاق مالا کے چودہ طبق روشن کرتے ہوئے

مزید بتا رہا تھا کہ ویسے جرمن عورتیں بلا کی وفادار اور وفاشعار ثابت ہوتی ہیں جن کی ایک بڑی مثال عیسٰی کی مما اور...... انی کی ممی نے قائم کی۔ عیسٰی کی مما جب تک زندہ رہیں، اپنے شوہر کی وفاداری اور انی کی ممی اپنے شوہر کے مرجانے کے بعد بھی اس کی وفادار تھیں...... انہوں نے اپنی باقی زندگی بچوں کی تعلیم و تربیت میں وقف کردی تھی۔ یقیناً یہ دونوں عورتیں عظیم تھیں اور ان دو عورتوں کے شوہر بھی عظیم ثابت ہوئے تھے۔ جنہوں نے پاکستانی سابقہ روایات کو برقرار رکھتے ہوئے ان عورتوں سے شادی کرکے شہریت لینے کے بعد انہیں چھوڑا نہیں تھا۔ اب یہ تو طے تھا کہ شادی کرلینے کی صورت میں مستقل رہائش کی ٹینشن دور ہوجاتی مگر دیکھنا یہ تھا کہ بیوی کیسی ملتی؟ اس کا مزاج اور عادتیں کیسی ہوتیں......؟ محض شادی کرنا ہی تو آفاق کے لیے مسئلہ نہیں تھا...... وہ کسی سے بھی شادی کرکے اچھے تعلقات بیوی سے رکھتا تو بینک سے کار خریدنے یا گھر بنوانے کے لیے قرض بھی مل سکتا تھا...... مگر بیوی کی بھلا کیا گارنٹی ہوتی؟ وہ آفاق کے ساتھ ساتھ جانے کس کس کی بیوی بن چکی ہوتی۔ حالانکہ وہ جانتا بھی تھا جرمن عورت سے شادی کے ایک سال بعد رہائشی ویزا جاری ہوجائے گا پھر اس میں دو یا چار سال کی توسیع بھی کردی جائے گی...... اگر وہ بیوی کا فرمانبردار، پیدا ہونے والے بچوں پر بھی بھرپور توجہ دے، گھر کا ماحول لڑائی جھگڑے سے پاک رکھے، کسی جرم میں بھی ملوث نہ رہے تو مدت گزرنے کے بعد پانچ سال کے لیے پاسپورٹ بھی جاری ہوجائے گا۔ جس کی وجہ سے وہ جرمن میں مزید رک سکتا ہے اگر مزید پانچ سال گزر جائے تو جرمنی کا پاسپورٹ بھی مل جاتا، جس کی وجہ سے وہ کسی بھی ملک میں آزادانہ گھوم سکتا تھا مگر بات تو بیوی پر آکر رک جاتی تھی۔ ضروری تو نہیں تھا، اس کی بیوی عیسٰی کی مما اور انی کی ممی جیسی نیک، خدا ترس اور شریف ثابت ہوتی...... پھر اگر بچے ہوجاتے تو وہ عمر بھر کے لیے خوار ہوجاتا...... اس نے ہر پہلو پر غور کیا تھا، یہاں پیپر میرج کا مسئلہ نہیں تھا...... مگر وہ خود کو عمر بھر کے لیے اسیر کرنے اور پیدا ہونے والے بچوں کو ذلیل کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

اسے شادی کرنا تھی تو حسیب احمد کی طرح...... ایک معزز، مہذب اور شریف لڑکی سے، وہ شادی کے نام پر کاروبار کرکے پھر بیوی، بچوں کو خوار کرکے اپنے ملک کے نام پر دھبا نہیں لگوانا چاہتا تھا پھر اگر قسمت اس پر مہربان ہورہی تھی، محبت اس پر مہربان ہورہی تھی تو وہ ناشکرا کیوں بنتا......؟ اس نے پیچھے کسی سے عہدوپیمان تو کر نہیں رکھے تھے مگر اس کی امی اور بہنوں نے اتنا رونا دھونا مچا رکھا تھا۔ وہ چاہتی تھیں۔ آفاق ویزے کی مدت پوری کرکے واپس آجائے۔ اس کی شادی پاکستان میں وہ خود کریں...... جبکہ آفاق جانتا تھا کہ ذمے داریوں کے اتنے پہاڑ وہ پاکستان میں جاکر کیسے سر کر پائے گا؟ وہ اپنی ماں، دادی اور بہنوں کو قائل نہیں کرسکا تھا۔ وہ کہتی تھیں، ہمیں پہلے روز سے یہی امید تھی کہ تم جرمن جاکر ''چن'' ضرور چڑھاؤ گے...... وہ پچھلے کئی دنوں سے ذہنی اذیت کا شکار تھا...... اگر انی کی ممی سے وعدہ نہ کرچکا ہوتا تو وہ اپنے دل کو سمجھا ہی لیتا مگر یہ دل کے سلسلے اپنے بس میں تھے کہاں؟ اتنے دنوں سے عیسٰی چپ چاپ تماشا دیکھ رہا تھا مگر اتنی توفیق نہیں ہوئی، اس کا حالِ دل جان جاتا...... یقیناً وہ چاہتا تھا کہ آفاق خود اپنا مسئلہ شیئر کرے...... آفاق یہ کام بھی کرلیتا مگر وہ جانتا تھا عیسٰی نے امی اور بہنوں کے حق میں ووٹ دینا تھا...... عیسٰی کا خیال تھا بزرگوں کو ناراض کرکے دائمی خوشیاں نہیں سمیٹی جاسکتیں...... اس کا خیال

درست تھا...... مگر بزرگوں کو منایا بھی تو جاسکتا تھا ناں...... اب وہ مالا سے ہر بات ڈسکس کرنے کے بعد پُرسکون ہوچکا تھا...... اسے امید تھی کہ مالا کی بات عیسٰی رد نہیں کرے گا...... یوں اس کی نیا بھی پار لگ جائے گی...... اِدھر مالا سوچ رہی تھی۔ انی کے لیے آفاق سے بہتر کوئی نہیں...... اور اگر آفاق، سوزن میں انٹرسٹڈ ہوتا تو پھر بھی اسے بہت خوشی ہوتی...... مگر سوزن کے آفاق سے ستارے ملنے والے نہیں تھے۔ دونوں کے درمیان مذہب، نظریات اور رسم و رواج خلیج کے مانند کھڑے تھے۔ اب ہر مغربی لڑکی عیسٰی کی مما جیسی نہیں ہوتی، جو کامیابی کے آخری زینے پر کھڑی تھیں۔ جنہوں نے حسیب احمد کو چن کر زمانہ پالیا تھا...... مذہب، رشتے، محبت سب کچھ......

☆☆☆

''جسٹ شٹ اپ مون......!'' وہ پوری قوت سے چلّا اٹھا تھا...... مون کو لگا، اس کی سماعتوں پہ یکے بعد دیگرے کئی پتھر آگرے تھے۔ ایسے نوکیلے اور سخت پتھر کہ وہ بے ساختہ کراہ اٹھی تھی مگر عیسٰی کی دہاڑ نے اس کی سانسیں تک روک دی تھیں۔ وہ کسی پتھر میں ڈھلے مجسمے کی طرح ساکت ہوچکی تھی جبکہ عیسٰی کی لہو رنگ آنکھوں کو دیکھ کر حسیب احمد کے ہاتھ سے کتاب گر پڑی تھی۔ وہ بے ساختہ راکنگ چیئر سے اٹھ کر عیسٰی کی طرف آئے تھے۔ انہوں نے گھبراہٹ میں عیسٰی کا کندھا ہلا کر اسے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا تھا مگر عیسٰی اپنے حواسوں میں کہاں تھا؟ وہ باپ کی بات سن کہاں رہا تھا؟ اس کے ذہن میں، کانوں میں اور آس پاس بڑا تمسخر اڑاتا شور اٹھ رہا تھا۔

''آفاق اور مالا......'' کوئی اس کے کان میں بہت زور سے چلّایا تھا۔ عیسٰی کو لگا، اس کے دماغ کی کوئی شریان پھٹ جائے گی۔ یہ اس کی سگی بہن تھی جو اس کے وجود کی دھجیاں اُڑا رہی تھی۔ اس کے پرخچے اڑا رہی تھی۔ وہ زہرخند سا چلّا اٹھا تھا۔

''تم اپنے حواسوں میں نہیں ہو مون! تم پاگل ہوچکی ہو۔'' عیسٰی نے دھیمے انداز میں پھنکارتے لہجے میں کہا تھا۔ حسیب احمد نے پھر سے اس کا کندھا ہلا کر اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ سمجھ گئے تھے، بہن بھائی کے درمیان کسی بات پر تلخ کلامی ہورہی ہے۔ یقیناً مون نے عادتاً کوئی ایسی بات ضرور کردی تھی جو عیسٰی کا ضبط جواب دے گیا تھا۔ وہ بیٹے کو کول ڈاؤن رہنے کا اشارہ کررہے تھے مگر عیسٰی ان کی کوئی بات نہیں سن رہا تھا۔

''میں اپنے حواسوں میں ہوں، مجنون یا دیوانی نہیں ہوں، بس یہ چاہتی ہوں کہ تم اپنی آنکھیں کھول کر رکھو، آستین سے سانپ نکال کر پھینک دو، یہ لوگ تمہیں ڈس لیں گے۔'' مون کی سوئی ایک جگہ پھنس چکی تھی جبکہ اس کے آگ اگلتے الفاظ عیسٰی کو غضبناک کررہے تھے۔

''بکواس بند کرو مون......!'' وہ پھر سے چیخا تھا...... ''تم میری بہن نہ ہوتیں تو میں تمہارے ساتھ کس طرح پیش آتا...... تم گمان بھی نہیں کرسکتیں۔'' وہ اپنے ماتھے کو مسلتا کسی قدر شکستہ نظر آنے لگا تھا۔ ایک دم نڈھال اور غمزدہ، مون اس کی اذیت کو سمجھ نہیں سکتی تھی اگر سمجھ جاتی تو ایسی بات ہی کیوں کرتی؟ مگر اسے دلوں کو ٹھوکروں سے اڑاتا آتا تھا...... سو وہ اپنا کام دلجمعی سے کررہی تھی۔

''ایک غیر عورت کے لیے اپنی بہن سے اس لہجے میں بات کررہے ہو۔'' مجھے بہت تکلیف ہوئی مگر یاد رکھنا، جس کے لیے مجھ سے تلخ کلامی کررہے ہو، وہ کبھی تمہیں فیض نہیں دے گی۔ سخت دھوکا کھاؤ گے بڑے خسارے اٹھانے والے ہو تم۔''

مون، عیسیٰ کے زہریلے لہجے کے دھچکے سے سنبھل کر سابقہ زہر خند آواز میں کہہ رہی تھی۔ اس کے لیے اپنے الفاظ کی کوئی اہمیت نہیں تھی جو کچھ وہ عیسیٰ کو کہہ چکی تھی گویا وہ سب اس کے لیے معمولی تھا۔

وہ مون کا فون بند کر کے باہر نکلا تو مالا کچن سے نکلتی دکھائی دی تھی۔ وہ اس کے چہرے پر نگاہ ڈال کر ٹھٹک سی گئی پھر میز پر کوئی باؤل رکھ کر اس کے پیچھے چلی آئی تھی۔ عیسیٰ جو فی الحال اتنے برے موڈ کے ساتھ مالا کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے اپنے پیچھے آتے دیکھ کر فوراً واش روم کی طرف بڑھ گیا تھا جبکہ مالا وہیں کمرے میں کھڑی ہو کر اس کے باہر نکلنے کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ جان بوجھ کر اتنا ٹائم لگا کر فریش ہونے کے بعد واش روم سے باہر نکلا تو مالا کو ابھی تک کمرے میں موجود دیکھ کر گہری سانس کھینچ کر رہ گیا جبکہ مالا بہت متفکر سی گھبرائے، گھبرائے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ غمگینی کی تصویر بنا ہوا تھا۔

''آپ ٹھیک تو ہیں......؟'' وہ کتنی بے چین اور مضطرب تھی۔ تبھی بغیر کوئی دوسری بات کیے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ کچھ دیر پہلے والے غصے، اضطراب اور پریشانی کا عیسیٰ کے چہرے پر شائبہ تک نہیں تھا...... مگر مالا پھر بھی مطمئن نہیں ہو سکی تھی۔

''ہاں، میں ٹھیک ہوں۔'' عیسیٰ نے ٹاول اسٹینڈ پہ پھیلا کر اپنے کپڑے ہینگ کرنے شروع کر دیے تھے۔ وہ عموماً اپنا کام کرتے ہوئے پھیلاوا نہیں ڈالتا تھا۔ یہ اس کی بہت پرانی عادت تھی مگر... فی الحال تو وہ مالا کے مزید سوالوں سے بچنا چاہتا تھا مگر مالا پھر بھی......

''مگر تب تو کچھ مضطرب لگ رہے تھے۔'' وہ فکرمندی سے گویا ہوئی...... رہ رہ کر عیسیٰ کی لہو رنگ آنکھیں یاد آ رہی تھیں۔ وہ آفاق کے کمرے سے نکل کر اچھے موڈ میں گیا تھا پھر اب مالا نے اسے چاچو کے روم سے نکلتے دیکھا تھا۔ جانے اندر کیا بات ہوئی جو وہ ابھی تک اتنا اپ سیٹ تھا مگر مالا سے اپنی پریشانی کو چھپا رہا تھا۔ اس کو طرح، طرح کے اندیشے لاحق ہونے لگے۔

''کچھ نہیں یار! بس مون کی فون کال سن کر آ رہا ہوں......'' عیسیٰ زیادہ دیر اسے پریشان نہیں دیکھ سکتا تھا۔

''اور مون کی کال سن کر خیریت نہیں ہو سکتی۔'' اس کے منہ سے بے ساختہ پھسل گیا تھا۔ حالانکہ بات کر کے وہ سخت پچھتائی بھی تھی مگر عیسیٰ نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔

''یہی سمجھ لو......'' وہ مبہم سا بولا تھا پھر اچانک کچھ یاد آنے پر چونک گیا۔ ''آفاق کا مسئلہ حل ہوا؟'' اس نے ہیئر برش اٹھا کر بال بنانے شروع کر دیے تھے۔ مالا گہری سانس کھینچ کر رہ گئی تھی۔ تو گویا وہ مون پر زیادہ بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اندر سے کتنا گہرا تھا، مالا کو اب احساس ہو رہا تھا۔ وہ جس ٹاپک پہ نہیں بولنا چاہتا تھا، اس پہ بات بھی نہیں کرتا تھا بلکہ بہت صفائی کے ساتھ موضوع تبدیل کر دیتا۔

''میں اس کا مسئلہ تو حل نہیں کر رہی تھی، یہ کام تو آپ نے کرنا ہے۔'' مالا برا مان کر بولی تھی تب عیسیٰ پھر سے کچھ چونک گیا۔

''تو کام بتا دیا اس نے؟'' وہ بال بنا چکا تو ہاتھ دھونے پھر سے واش روم چلا گیا۔ جب واپس آیا تو مالا سنبھل کر کچھ الفاظ ترتیب دے کر بیٹھی تھی تاکہ عیسیٰ سے ابھی آفاق کے متعلق بات کر لے۔

''جی...... ہاں......'' اس نے اگلے دس منٹ تک تمام تفصیل عیسیٰ کے گوش گزار کر دی تھی جسے سن کر وہ سر ہلا کے بولا۔

''یہ تو میں جانتا ہوں۔'' اس کا انداز پُرسوچ

قسم کا تھا۔ تب مالا گویا چیخ پڑی۔

''آپ جانتے بھی تھے پھر بھی کچھ نہیں کیا...... وہ بے چارہ اتنے دنوں سے مجنوں بنا پھرتا رہا...... اتنے دن سے ٹینشن لے رہا تھا۔ اور آپ جان بوجھ کر دیکھتے رہے......'' مالا خفگی سے بولتی جا رہی تھی۔ تب عیسیٰ نے اسے رسان سے سمجھایا تھا۔

''مجھے کسی کے بھی ذاتی معاملات میں گھسنا پسند نہیں۔ چاہے وہ آفاق ہی کیوں نہ ہو...... تاہم اس کے بارے میں پل، پل کی خبر گیری کرنا میرا فرض ہے...... اس سے میں کنارہ نہیں کر سکتا...... ہاں میں پاکستان کال کر کے اس کی امی کو سمجھانے کی کوشش ضرور کروں گا۔'' عیسیٰ نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے حامی بھر لی تھی...... تب مالا کچھ پُرجوش سی ہو گئی۔

''آفاق اور انی کی شادی ہو جائے تو میری بھی تنہائی کا خاتمہ ہو جائے گا۔'' وہ دبے دبے جوش اور ڈھیروں سرخوشی کا اظہار کر رہی تھی تب ہی عیسیٰ نے اس کی خوشی محسوس کر کے بے ساختہ کہا تھا۔

''تم اپنی تنہائی بانٹنے کا کوئی اور حل سوچ لو۔'' اس کے لہجے میں واضح شرارت تھی۔ کچھ دیر پہلے والی مون کی بکواس اس کے ذہن سے محو ہو چکی تھی۔ وہ زیادہ دیر تک تکلیف دہ یادوں اور باتوں کو نہیں سوچتا تھا۔ تبھی مطمئن اور پُرسکون رہتا تھا۔

''مثلاً......؟'' مالا منہ بنا کر بولی۔ ''یہی کہیں گے ناں آپ......! نٹی سے ڈچ میں گپ شپ لگایا کرو......'' اس کا انداز جلا کٹا سا تھا۔ عیسیٰ بے ساختہ ہنس پڑا۔

''نہیں، اس کے علاوہ کچھ......؟'' اس کی آنکھوں میں کوٹ، کوٹ کر شرارت بھری تھی۔ مالا کچھ دیر کے لیے ہونق سی ہو گئی تھی۔ اسے عیسیٰ کی بات کے اندر اترنا کبھی نہیں آتا تھا۔

''اس کے علاوہ کیا......؟'' وہ سوچتے ہوئے عیسیٰ کا چہرہ دیکھنے لگی۔ وہاں انوکھی سی جگمگاہٹ تھی اور اس کی آنکھیں مالا کے خریدے گئے ڈھیروں کھلونوں پر جمی تھیں جنہیں مالا نے ترتیب سے کمرے میں جگہ، جگہ سجا رکھا تھا تب عیسیٰ کی بات اور نظر کا مفہوم جان کر وہ ڈھیروں شرم سے بے حال ہو گئی تھی۔ انتہائی سرخ چہرہ لیے وہ پلکوں کو جھکائے میٹھی، میٹھی مسکان کے ساتھ سیدھی دل میں اتر رہی تھی۔ عیسیٰ کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ پھر اس نے آہ بھر کر کہا تھا۔

''جانتی ہو، حسن سے بڑھ کر حیا میں کشش ہوتی ہے۔'' اس کا لہجہ بوجھل اور آواز مخموری تھی۔ مالا کے دل کی گھنٹیاں ٹن ٹن بجنے لگی تھیں اس کا سر کچھ اور جھک گیا تھا۔ یوں لگا، باہر تالاب میں سنہری پریاں اتر آئی ہیں یا بیلے کے جنگل میں مور پھر سے ناچنے لگے یا ستاروں کی بارات اس کے آنگن میں اتر آئی۔ اس کا دل کہکشاں کا گھر بن گیا تھا۔

علی عیسیٰ کے دل نے اس پل سجدۂ شکر ادا کیا...... اللہ نے اسے ایک نیک اور باحیا عورت زمین پر بخش دی تھی۔ یہ اس کی خوش نصیبی کا بڑا اعلیٰ مقام تھا۔

''تم کو ایک بتاتا ہوں مالا......'' اسے علی عیسیٰ کی رواں، مدھم آواز سنائی دی تھی۔ وہ ایک کرسٹل کی گڑیا کو ہاتھ میں لے کر اس کی چابی گھما رہا تھا۔ یہ گڑیا مالا خرید کر لائی تھی۔ ان تمام کھلونوں میں سب سے منفرد بھی یہی گڑیا تھی اور عیسیٰ کو بھی کرسٹل کی یہ گڑیا بہت پسند آئی تھی۔ اسے مالا نے سائڈ ٹیبل پر رکھا ہوا تھا کیونکہ اس گڑیا کی آنکھوں میں بہت تیز لائٹس روشن ہوتی تھیں جو اندھیرے میں زیرو پاور جتنے بلب کا کام بخوبی دے رہی تھیں۔ عیسیٰ نے اسی گڑیا کو ہاتھ میں لے رکھا تھا۔

”تم نے سنا تو ہوگا، وہ شخص مرگیا، جو کسی کے دل میں نہیں رہا۔ آدمی کب مرتا ہے؟ جب دل سے اترتا ہے اور زندہ کب ہوتا ہے۔ جب دل میں اترتا ہے۔“ عیسیٰ کی مدھم آواز کے ساتھ ہی کرسٹل کی گڑیا میز کی سخت سطح سے ٹکرائی تھی۔ مالا کے دل کو کچھ ہوگیا۔ کیونکہ گڑیا کو پوری شدت کے ساتھ میز کی سطح سے ٹکرایا گیا تھا۔ اس کی نیلگوں انتہائی موٹی آنکھوں میں سے ایک کا نیلا موٹا سا ڈیلا باہر نکل آیا تھا۔ گڑیا لمحوں میں بدنما ہوگئی تھی۔ مالا کو ایک دم دھچکا سا لگا۔ ابھی وہ کچھ بولنا چاہتی ہی تھی جب عیسیٰ نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا تھا۔

”خوب صورتی دیکھنے والی آنکھ میں ہوتی ہے...... چیز اچھی ہو یا بری...... جسے خود اپنی پسند اور چاؤ سے خریدا ہو اس کے عیب پہ دل برا نہیں کرتے......“ عیسیٰ نے نرمی سے سمجھاتے ہوئے گڑیا کا موٹا سا نیلا ڈیلا پھر سے آنکھ کے گڑھے میں فٹ کردیا تھا۔

”اس عیب کی اصلاح کرتے ہیں...... دل برا کر کے اسے یوں کورپ (ڈسٹ بن) میں نہیں پھینکتے۔“ عیسیٰ نے کوڑے والی ٹوکری کا پیر سے بٹن دبایا تو اس کا منہ کھل گیا۔ یہ ڈسٹ بن صرف عیسیٰ کے غیر ضروری کاغذات کے لیے کمرے میں رکھی گئی تھی۔ اکثر وہ غیر ضروری کاغذات مروڑ کر کورپ میں پھینک دیتا تھا مگر پھر کچھ دن بعد کبھی نہ کبھی ان کی ضرورت محسوس ہو ہی جاتی پھر انہیں ڈھونڈنے میں دشواری نہیں ہوتی تھی۔ ننی اس کورپ کو کم ہی ہاتھ لگاتی تھی۔ عیسیٰ نے اسے منع کردیا تھا۔ فی الوقت بھی وہ ڈسٹ بن کھولے کچھ بول رہا تھا جب ایک دم کچھ چونک گیا۔

”اکثر غیر ضروری چیزیں جن کو ناکارہ سمجھ کر کوڑے دان میں پھینک دیا جاتا ہے، وہ ہمارے کام بھی آجاتی ہیں۔“ عیسیٰ نے بات کرتے ہوئے کاغذات سے بھری کورپ میں ہاتھ مارا تھا۔ پھر کچھ ہی دیر بعد ایک سخت سی چیز عیسیٰ کے ہاتھ میں آگئی۔ یہ نقلی نگینوں والا بریسلیٹ تھا جسے مالا نے توڑ مروڑ کر غصے میں پھینک دیا تھا۔ تب وہ جانتی نہیں تھی کہ سوزن نے یہ گفٹ اسے بھیجا تھا۔ مالا کو ایک دم ڈھیروں ندامت ہوئی...... وہ جو بریسلیٹ کورپ میں سے نکالنا بھول گئی تھی اب انتہائی شرمسار کھڑی تھی۔ بھلا علی عیسیٰ کیا سوچتا ہوگا؟ مالا نے اس کی اتنی سویٹ کزن کا خلوص سے دیا تحفہ اتنی بے رحمی سے ڈسٹ بن کے حوالے کردیا تھا۔ اس وقت بھی عیسیٰ کے تاثرات کم و بیش ایسے ہی تھے، وہ مالا کو حیران نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”تحفے کی ایسی ناقدری پہلے کبھی نہ دیکھی نہ سنی...... اگرچہ بریسلیٹ اتنا مہنگا نہیں تھا مگر اتنا حقیر بھی نہیں تھا جو اس کی جگہ یہ کورپ ہوتی۔“ عیسیٰ کی آواز میں تاسف تھا۔ مالا گویا شرمندگی کے گڑھے میں گوڈے، گوڈے ڈوب گئی تھی۔

”سوزن اتنی امیر نہیں یار......! تم نے جانے کیا سمجھا تھا۔ بہر حال، میں یہ بریسلیٹ اسے واپس لوٹا دوں گا۔“ اس نے گویا آخری فیصلہ کر کے بریسلیٹ اپنے لاکر میں محفوظ کرلیا تھا۔ مالا جو اپنی صفائی میں کچھ بولنا چاہتی تھی باہر سے آتی آفاق کی آواز سن کر دل مسوس کر رہ گئی۔ پھر اس نے سوچا۔ وہ عیسیٰ کو تسلی سے جواب دے گی اور وجہ بھی بتا دے گی مگر پھر آفاق کی لن ترانیوں اور بھوک کے شور کو سن کر ہمیشہ کی طرح بھول گئی اور یہ بھولنا کیا قیامت لائے گا...... اس بات سے مالا ہرگز واقف نہیں تھی۔

☆☆☆

آسمان پر سفید بادل دھجی دھجی بکھرے تھے۔ سورج اپنی جگہ پر جما چمک رہا تھا۔ ہوا میں خنکی تھی۔

پورا آسمان سفید مرغابیوں سے چھپا تھا۔ فضا میں خاموشی کا راج تھا، کاریڈور سے کچھ آگے ہیرا کھلکھلاتی نظر آرہی تھی۔ اس نے گلے میں کیمرا لٹکا رکھا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ کھٹا کھٹ سفید مرغابیوں کی تصویریں اتار رہی تھی۔ اس کے قریب ہی میکس وان کسی گہری سوچ میں گم بیٹھا تھا۔ وہ عیسائی باپ کا بیٹا تھا اور ہندو عورت کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ وہ خود کو کتابی کہلوانا پسند کرتا تھا اور عیسائیت سے سچے عشق میں مبتلا تھا۔ مالا نے اب تک میکس کی کوئی ایک بھی گرل فرینڈ پورے شولے میں نہیں دیکھی تھی۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتا تھا اور چرچ باقاعدگی سے جاتا تھا۔

مالا کو ہیرا کے بعد میکس بہت اچھا لگتا تھا۔ شرمیلا سا، انتہائی کم گو اور مہذب......

مالا گراؤنڈ میں سے گزرتے ہوئے پارک پلاتس تک آئی تو میکس بھی اس کے پیچھے چلا آیا تھا۔ مالا کا ارادہ آج گھر جانے کا نہیں تھا بلکہ وہ کاؤف ہاؤس جانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ سو اسی لیے ذرا جلدی کلاس سے نکل آئی تھی۔ وہ کوئی بس پکڑ کر مرکز تک جانا چاہتی تھی اور اس کا ارادہ بھانپ کر میکس نے فوراً آفر کردی تھی۔

”میں بھی مرکز تک جارہا ہوں، تم مجھے جوائن کرسکتی ہو۔“ میکس کی پُرخلوص آفر کو مالا ٹھکرانے کا بھرپور ارادہ رکھتی تھی مگر انکار کے لیے کوئی موزوں الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ میکس اس کا تذبذب محسوس کر کے نرمی سے بولا تھا۔

”تم میرے ساتھ بے جھجک جاسکتی ہو، میں انتہائی شریف آدمی ہوں۔“ اس نے اتنے بھولپن سے وضاحت کی تھی کہ مالا جو اتنی سنجیدہ صورت بنائے کھڑی تھی ایک دم ہنس پڑی۔

”ایسی بات نہیں......“ مالا ذرا جھجک کر بولی تھی۔ دراصل اس نے عیسیٰ کو میسج کررکھا تھا کہ آفاق

ماہِ صیام

مبارک ہو مسلمانو کہ پھر ماہِ صیام آیا
خدا کی رحمتوں اور برکتوں کا اژدہام آیا
خدا کا شکر ہے فصلِ بہار جاں فزا آئی
خوشا قسمت کہ پھر سے موسمِ صوم و قیام آیا
زمانہ آگیا کہ لطفِ باریٔ عام اب ہوگا
نصیب اپنے کہ پھر سے زندگی میں یہ مقام آیا
قیامت میں یہ روزہ ڈھال ہوگا روزہ داروں کی
یہ سرمایہ بھی اپنا کیسے آڑے وقت کام آیا
ہدایت کے صحیفے سب کے سب اس ماہ میں اترے
اسی ماہِ مبارک میں کلاموں کا امام آیا

پسند: فضہ بتول، بہارہ کہو

فضیلتِ قرآن مجید

رمضان المبارک بہت ہی فضیلت و بزرگی والا مہینہ ہے اور اسی مناسبت سے اس مہینے میں ایک بہت ہی عظیم الشان امر کا ظہور ہوا ہے وہ یہ ہے۔

شھر رمضان الذی انزل فیہ القرآن

رمضان المبارک کا مہینہ ایسا ہے کہ اس مبارک مہینے میں قرآن شریف نازل ہوا اور جتنی کتابوں اور صحیفوں کے نزول ہوئے سب کے سب اسی مہینے میں اترے اسی نسبت سے حضور ﷺ کا رمضان شریف میں تلاوتِ پاک پر زور دینا نسبتاً اور مہینوں کے زیادہ ثابت ہے۔ صحابہ کرامؓ و خلفائے راشدینؓ... صحابہ کرامؓ و خلفائے راشدینؓ... مہدیین اور بزرگانِ دین کا رمضان المبارک میں تلاوت کا خاص اہتمام...... یہ سب امور اس بات کے متقاضی ہیں کہ اس ماہِ مبارک میں قرآن پاک کی تلاوت کا معمول نسبتاً دوسرے معمولات ذکر و شغل کے اور زیادہ کرنا چاہیے اور جو بے چارے قرآن پاک کی تلاوت سے معذور ہیں وہ تراویح میں شریک ہوجائیں تو ان کو بھی یہ فضیلت میسر ہوجائے گی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کے اہتمام کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

مرسلہ: جبیں نیاز، ملتان

کو بھیج دے۔ اسے کچھ شاپنگ کے لیے مرکز جانا ہے مگر عیسیٰ کار پلائی نہیں آیا تھا جس کا مطلب تھا وہ بہت مصروف ہے۔ ویسے بھی ''این کاوَف سین ٹروم'' اتنا دور نہیں تھا۔ وہ بہ آسانی بس سے جاسکتی تھی مگر وہی اندرونی بزدلی، اکیلے جانے سے گھبراہٹ ہوتی تھی۔ اگر وہ ہیرا سے کہتی تو اس نے فوراً تیار ہوجانا تھا۔ سو وہ اب میکس کی آفر ذہن میں رکھتے ہوئے ہیرا کو آواز دے رہی تھی۔ اس کی آواز سن کر ہیرا گلے میں کیمرا لٹکائے بھاگتی دوڑتی آگئی۔

''اگر شاپنگ کا موڈ ہے تو میرے ساتھ چلو۔'' مالا نے دبی آواز میں ہیرا سے ریکویسٹ کی تھی۔ اب اندھے کو بھلا کیا چاہیے تھا۔ وہ فوراً تیار ہوگئی تھی۔ میکس ان دونوں کو خوشی، خوشی اپنی ننھی سی کار میں بٹھا کر شاپنگ کے لیے لے آیا تھا۔ وہ دونوں آپس میں ڈھیروں باتیں کررہی تھیں جبکہ میکس خاموشی سے ڈرائیونگ کرتا مسکراتا جارہا تھا۔ پھر شاپنگ کے دوران وہ ان دونوں کو اکیلا چھوڑ کر اپنا کام کرتا رہا تھا۔ ہیرا نے اپنے لیے ڈھیروں کاسمیٹکس خریدا تھا۔ مالا کو بھی ضروری چند ایک چیزیں خریدنا تھیں...... سو ڈیڑھ گھنٹے کی شاپنگ کے بعد جب وہ دونوں لدی پھندی باہر آئیں تو پارکنگ میں میکس کو کھڑا دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

''تم ابھی تک یہیں ہو؟'' مالا نے حیرت کا برملا اظہار کیا تھا۔

''تو کیا مجھے چلے جانا چاہیے تھا؟'' میکس نے الٹا حیران ہوکران سے پوچھا تھا۔

''کیوں چلے جانا تھا......؟ ہمارے پاس ٹیکسی کا کرایہ تک نہیں بچا۔ اچھا ہوا، تم گئے نہیں۔'' ہیرا نے خوش اخلاقی کا اعلیٰ ترین مظاہرہ کرکے شاپنگ بیگ دھڑا دھڑ کار میں ٹھونس دیے تھے جبکہ مالا میکس کو اتنا انتظار کروانے پر کچھ خفت زدہ تھی۔

''جب تم لوگ میرے ساتھ آئی تھیں تو پھر میں اکیلا تم لوگوں کو چھوڑ کر کیسے جاسکتا تھا؟'' میکس نے مسکرا کر جواب دیا۔ مالا اور ہیرا اس کے ایثار کی قائل ہوگئی تھیں۔ بلاوجہ بے چارہ انتظار کی زحمت اٹھاتا رہا تھا۔ تاہم اس سفر کے دوران ان دونوں پر منکشف ہوا تھا کہ میکس بہت اچھا اور مہذب انسان ہے۔

وہ پہلے ہیرا کو اس کے فلیٹ پر اور مالا کو اس کے گھر تک ڈراپ کرکے گیا تھا پھر مالا کو اسے گیٹ پر ٹرخانا اچھا نہیں لگا تھا۔ اس نے جھجکتے ہوئے میکس کو اندر آنے کی دعوت دی تھی۔ جسے اس نے شائستگی سے رد کرتے ہوئے ایک ریکویسٹ کی تھی اور مالا اس کی ریکویسٹ سن کر تذبذب کا شکار ہوگئی تھی۔

''آپ لوگ میری برتھ ڈے پارٹی پر ضرور آئیے گا۔'' میکس نے بڑی محبت اور خلوص کے ساتھ دعوت دی تھی۔ آپ لوگوں سے مراد جانے کون، کون تھا؟ مالا نے ہونق پن کی انتہا کرتے ہوئے میکس سے پوچھ ہی لیا۔

''میں اور کون......؟'' وہ ہونق بنی پوچھ رہی تھی۔ تبھی میکس نے وضاحت کی۔

''تم اور تمہاری فیملی......'' اس نے مسکرا کر حسیب چاچو کو باہر نکلتے دیکھ کر اشارہ کیا تھا پھر ان سے ہیلو ہائے کرنے لگا۔ چاچو، مالا کے مہمان کو سوکھے منہ نہیں جانے دینا چاہتے تھے مگر میکس پھر کسی دن آنے کا وعدہ کرکے جانے لگا تھا جب چاچو نے اچانک اسے روک کر پوچھ لیا۔ وہ کچھ الجھی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ جیسے پہچاننے کی کوشش کررہے ہوں۔

''مجھے لگ رہا ہے، ہم پہلے بھی مل چکے ہیں؟'' چاچو کے لہجے میں یقین بول رہا تھا۔ تب میکس نے مسکرا کر جواب دیا۔

''جی ہاں...... میں تو آپ کو دیکھتے ساتھ ہی پہچان گیا...... ایک دفعہ شام کو آپ کے گھر مون اور سوزن کے ساتھ آبھی چکا ہوں، شاید آپ کو یاد نہیں رہا۔ میں سوزن کی سنڈیکیٹ کا باقاعدہ رکن ہوں۔'' اس کی شائستگی سے تفصیلاً وضاحت کو سن کر چاچو سر ہلانے لگے تھے۔ گویا انہیں میکس کا گزشتہ حوالہ دینا بہت کچھ یاد دلا گیا تھا۔

''تب مالا کی اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔'' میکس اب مسکرا کر مالا کی طرف اشارہ کررہا تھا تب چاچو نے بڑے فخر کے ساتھ میکس کو بتایا تھا۔

''یہ میری بھتیجی اور بہو ہے، میرے اکلوتے بیٹے کی بیوی......'' چاچو کے تعارف نے مالا کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دی تھی جبکہ میکس ایک دم حیران رہ گیا تھا۔

''عیسیٰ کی بیوی......؟'' میکس کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ وہ کمال کی حیرت کا مظاہرہ کررہا تھا۔ گویا اسے عیسیٰ کی شادی کا گمان ہی نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر پھیلے تاثرات بھی بہت عجیب تھے۔ چاچو اور مالا دونوں الجھ کر رہ گئے۔

''حیرت کی بات ہے۔'' میکس کی بڑبڑاہٹ بہ آسانی ان دونوں کی سماعتوں تک اتر گئی تھی۔ ان دونوں نے بیک زبان کچھ کہنے کی کوشش کی تھی جبکہ میکس ان کی سنے بغیر اپنی ہی کہے جارہا تھا۔

''مجھے سوزن نے بھی نہیں بتایا، چلیں سوزن سے تو کافی عرصے سے ملاقات نہیں ہوسکی۔ جبکہ مون تو اکثر بیدی نوٹنگ میں ملتی رہتی ہے۔ نہ اس نے مجھے شادی پہ انوائٹ کیا...... اور نہ ہی بتانا گوارا کیا۔'' میکس انتہائی افسردہ اور دل برداشتہ نظر آرہا تھا۔ گویا سوزن اور مون کے عمل نے اس کے دل کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ اسے سوزن اور مون دونوں سے ایسی بے مروتی کی امید نہیں تھی۔ وہ تینوں ماضی

میں اچھے دوست رہ چکے تھے اور ماضی قریب میں ہی سوزن کے جھگڑے کی وجہ سے وہ جماعت کی رکنیت سے بھی الگ ہوگیا تھا مگر پھر بھی اسے سوزن سے ایسے کٹھور پن کی قطعاً امید نہیں تھی۔ اسے بے دل سا مڑتا دیکھ کر چاچو زبردستی اندر لے آئے تھے پھر مالا کو چائے بنانے کے لیے بھیج کر وہ دونوں سٹنگ روم میں چلے گئے۔ مالا جب چائے کے ساتھ ڈھیروں لوازمات لے کر اندر آنے لگی تھی تب اسے چاچو اور میکس کی بہت سنجیدہ گفتگو نے پل بھر کے لیے روک دیا تھا۔ وہ دونوں بہت سنجیدگی سے کچھ ڈسکس کررہے تھے۔ مالا نے غور کیا تو اندازہ ہوا کہ گفتگو مون کے حوالے سے ہورہی تھی۔ چاچو کی آواز میں عجیب سی شکستگی تھی۔ وہ بہت بکھرے، بکھرے لہجے میں کچھ کہہ رہے تھے۔ مالا نے دروازے کی جھری میں سے جھانکا تو اس کے دل کو دھچکا سا لگا تھا۔ چاچو کا زرد آنسوؤں سے بھیگا چہرہ سامنے تھا جبکہ میکس انہیں نہ جانے کون، کون سی تسلیاں دے رہا تھا۔ وہ مقامی زبان میں بات کررہے تھے...... اور مالا کی ڈوچ اتنی امپرود تو ہوچکی تھی جو وہ پورا فقرہ نہ سہی کچھ، کچھ الفاظ تو سمجھ جاتی...... اس نے کان لگا کر سننے کی کوشش میں ہلکا سا دروازہ کھول دیا تھا۔ اسے میکس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ چاچو کو کچھ بتارہا تھا۔

''اسے غیر ملکی اور ملکی کئی ایجنسیوں نے ہائیر کرنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔'' میکس کی بات نے چاچو کے چہرے پر سرسوں کے عرق کا برش پھیر دیا تھا۔ ان کے گال انڈے کی زردی جیسے پیلے پڑ گئے۔ بہت دیر تک وہ کچھ بول ہی نہیں پائے تھے۔

''پھر...... اس نے حامی بھرلی؟'' ان کے لہجے میں وسوسے ڈول رہے تھے۔ آنکھوں میں تفکر اور اذیت دور سے بھی نظر آسکتی تھی۔

”نہیں......“ میکس کے جواب نے گویا ان کے اندر ایک نئی روح پھونک دی تھی۔

”تو پھر......؟“ وہ کچھ بے چینی سے پوچھنے لگے۔

”فی الحال تو اس نے انکار کر دیا ہے۔ اب آگے کا نہیں پتا......“ میکس نے سنجیدگی سے بتایا۔

”بیدی نوتنگ ابھی تک جا رہی ہے؟“ چاچو نے گہری طویل سانس کھینچ کر پوچھا۔ ان کے اعصاب تھکن سے چور ہو گئے تھے۔ عجیب شکستگی کا غبار اُن کے آس پاس چھا رہا تھا۔

”وہاں جانے کی اسے ضرورت تو نہیں...... بیدی نوتنگ والے تو خود اس کی صلاحیتوں کے تابع ہیں۔“ میکس بھی شاید مون کے متاثرین میں سے تھا مگر یہاں مون کی بات کہاں ہو رہی تھی؟ مالا نے حیرت سے سوچا تھا، یہ لوگ تو نہ جانے کسے ڈسکس کر رہے تھے اور مالا سمجھ رہی تھی وہ لوگ مون کے متعلق بات کر رہے ہیں، وہ سر جھٹک کر اندر جانا چاہتی تھی جب میکس کی پھر سے آواز سنائی دی تھی۔ مالا کے بڑھتے قدم پھر سے رک گئے تھے۔

”پروفیسر بشر کیا اب بھی آتے ہیں؟“ وہ قدرے جھجک کر پوچھ رہا تھا۔ تب چاچو نے پھیکے سے لہجے میں بتایا تھا۔

”نہیں......“ ان کا سر بھی بے اختیار نفی میں ہلتا چلا گیا تھا۔ میکس کچھ دیر کے لیے سوچوں میں گم ہو گیا۔ گویا کسی سابقہ منظر کو یاد کر رہا تھا۔ پھر سر جھٹک کر بولا۔

”جب سے عیسٰی نے پروفیسر بشر کی بے عزتی کی تھی، وہ مون سے بھی کم کم ملنے لگے تھے۔ یوں سمجھ لیں، انہوں نے مون کے سر پر سے اپنا دستِ شفقت ہٹا لیا تھا۔“ میکس سنجیدگی سے گویا ہوا۔

”سارے فساد کی جڑ یہ بشر ہی تو تھا۔ بس میں ہی سمجھ نہیں پایا۔“ چاچو افسردگی سے کہہ رہے تھے۔ ان کے لہجے میں عجیب سا پچھتاوا تھا۔ وہ رنجیدگی کی انتہا پر کھڑے تھے۔ جانے انہیں کیا کچھ نہیں یاد آ رہا تھا۔

”بس کچھ لوگوں کی فطرت ہی ایسی ہوتی ہے، عموماً لوگوں کی کھوج میں رہتے ہیں۔“ وہ مبہم سا بولا تھا پھر چاچو نے ماحول کی کثافت کم کرنے کے لیے یہ موضوع بدل دیا تھا۔

”سوزن کا اور تمہارا معاملہ کہاں تک پہنچا؟“ ان کے لہجے میں تجسس نہیں، سادگی تھی گویا وہ میکس کے بارے میں بہت کچھ جانتے تھے۔

”وہ بات تو وہیں ختم ہو گئی تھی۔“ میکس کے الفاظ بھی گویا بھیگ سے گئے تھے۔ اس کے چہرے پر چھائی شکستگی بہت واضح پڑھی جا سکتی تھی۔ وہ اتنا دلبرداشتہ اور رنجیدہ کیوں ہو گیا تھا؟ مالا سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ مگر اب باہر کھڑے رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ میکس الوداعی کلمات بول کر اٹھنے ہی لگا تھا جب مالا ٹرالی دھکیلتی اندر آ گئی۔ وہ اتنے لوازمات چائے کے ساتھ دیکھ کر بوکھلا سا گیا تھا۔

”فولین مالا......! اس کی ضرورت کیا تھی؟ میں اس گھر میں مہمان تھوڑی ہوں۔“ میکس خواہ مخواہ شرمندہ ہوئے جا رہا تھا مگر چاچو اور مالا کے اصرار پر اسے چائے پینا ہی پڑی تھی۔ پھر وہ کچھ دیر مزید وہاں بیٹھ کر واپس چلا گیا تھا اور میکس کے چلے جانے کے بعد مالا سہولت سے برتن سمیٹ کر ان کے قریب آ بیٹھی تھی۔ تاہم بیٹھنے سے پہلے اس نے چاچو کو دوا ضرور دے دی تھی۔ کم از کم چاچو کو وقت پر دوا دینے والا کام وہ کبھی نہیں بھولتی تھی۔ باقی بہت سے معاملات میں اپنے بھلکو پن کی وجہ سے اسے کتنا نقصان اٹھانا پڑ سکتا تھا، اس بات سے مالا واقف نہیں تھی۔ تاہم وہ اپنی کمزوری پہ فی الحال قابو نہیں پا سکی تھی۔ اکثر اسے صبح کے وقت عیسٰی کو یہ یاد دلانا بھول جاتا تھا کہ وہ لنچ کے

لیے اب بھی گھر آ جایا کرے۔ وہ لینگویج اسکول سے جلدی آ جاتی تھی۔ تاہم عیسٰی مصروفیت کے باعث لنچ ٹائم میں اس کا فون نہیں اٹھاتا تھا اور صبح کے وقت مالا تاکید کرنا بھول جاتی تھی۔

فی الوقت بھی وہ میکس کی باتوں پر غور کرتی چاچو کو سوزن کے گفٹ کا نہیں بتا سکتی تھی جسے لاعلمی میں مالا نے کورپ میں پھینک دیا تھا اور جو اس کی بدقسمتی کے پھیر کی وجہ سے عیسٰی کے ہاتھ لگ گیا تھا اور نہ صرف عیسٰی نے اسے بھگو بھگو کر باتیں سنائی تھیں بلکہ گفٹ اٹھا کر اپنے پاس سوزن کو لوٹانے کے لیے سنبھال لیا تھا...... اب بھلا مالا وہاں کیا کرتی......؟ وہ اس کی کوئی بات سننے والا نہیں تھا اور بعد میں مالا عادتاً وضاحت کرنا بھول گئی تھی۔ حالانکہ اگر وہ وضاحت کر دیتی تو عیسٰی سو فیصد مطمئن ہو سکتا تھا۔ ظاہری بات تھی اسے سوزن کے تحفے کی اتنی بے حرمتی پسند نہیں آئی تھی۔ مالا ان نزاکتوں کی طرف دھیان کر لیتی تو شاید اتنے خسارے میں کبھی نہیں رہتی۔

فی الحال بھی وہ میکس کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ جب اچانک چاچو نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔

”میکس تمہارا کلاس فیلو ہے؟“ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھے، نہ جانے کیا سوچ رہے تھے اور کسے سوچ رہے تھے۔ ان کا سوال سن کر مالا نے فوراً سر ہلا کر جواب دیا تھا۔

”اس کی لینگویج بہت امپروو ہو چکی ہے چاچو! وہ اوپر کے کسی درجے میں پڑھتا ہے۔“ اس نے اپنی معلومات کے مطابق بتایا تھا جبکہ چاچو قدرے پُرسوچ انداز میں ہنکارا بھر کے رہ گئے تھے پھر انہوں نے نفی میں ہولے سے سر ہلایا تھا۔ گویا مالا کی بات انہیں قائل نہیں کر سکتی تھی اور وہ ذرا بھی مطمئن نہیں ہو سکے تھے۔ چاچو کے تاثرات ملاحظہ کر کے مالا نے مزید...... انہیں بتایا تھا۔

”پڑھتا تو وہ اوپر والے کسی درجے میں ہے جبکہ زیادہ وقت ہماری کلاس میں پایا جاتا ہے۔“ اس نے سنجیدگی سے اپنی بات مکمل کی تھی۔ اسے چاچو کے سنجیدہ تاثرات کچھ کچھ گھبراہٹ میں مبتلا کر رہے تھے۔ جانے کیا مسئلہ تھا؟ وہ اتنے سنجیدہ تو کبھی نہیں رہے تھے۔

”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے چاچو۔“ وہ متفکر ہو گئی تھی اور بھاگ کر بی پی آپریٹس اٹھا کر لانا چاہتی تھی۔ شاید چاچو کا بلڈ پریشر بڑھ رہا تھا، چاچو اس کا ارادہ بھانپ کر سرعت سے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولے۔

”میں ٹھیک ہوں بیٹا! تم میرے پاس رہو۔“ ان کے چہرے پر اب بھی زردی چھا رہی تھی۔ بس مالا کے دل کو کچھ ہونے لگا تھا۔

”مگر مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے، کیا عیسٰی کو بلاؤں؟“ مالا نے ان کا ٹھنڈا ہاتھ نرمی سے مسلتے ہوئے کہا تھا۔ تب وہ پھیکے سے انداز میں مسکرا دیے تھے۔

”اسے پریشان نہ کرو...... مجھے کچھ نہیں ہوا۔“ اب وہ مالا کی خاطر خود پہ قابو پا کر مسلسل مسکرا رہے تھے۔ وہ جانتی تھی، چاچو خود پر جبر کر رہے ہیں مگر ان کی بات مانے بغیر گزارہ بھی نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ان کا دھیان بٹانے کی غرض سے بولی۔

”آپ میکس کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے؟“ اس نے گفتگو کا سلسلہ وہیں سے جوڑ دیا تھا جہاں سے اس کی سوچوں کے باعث ٹوٹ گیا تھا...... تب چاچو پھر سے کسی سوچ میں ڈوب گئے تھے۔ مالا نے ان کا گھٹنا ہلا کر اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔

”کیا سوچ رہے ہیں آپ؟“ وہ پھر سے متفکر ہو گئی تھی۔

”میں سوچ رہا ہوں کہ میکس کو ڈوچ سیکھنے کی

کیا ضرورت ہے۔ وہ تو آٹھ دس ماہ بواریا میں مون کے انسٹی ٹیوٹ میں پڑھاتا بھی رہا ہے...... تو پھر اس اسکول میں پڑھنے کی کیا ضرورت تھی؟" چاچو کے حیران سوال نے مالا کو بھی لمحہ بھر کے لیے منجمد کردیا تھا۔

"تو کیا میکس جان بوجھ کر اپنا ٹائم ویسٹ کررہا ہے یا پھر شوقیہ......؟" وہ بولتے، بولتے اٹک، اٹک کر رک گئی تھی۔

"شوقیہ تو نہیں، کیا پتا...... تمہارے اسکول میں جاب کا ارادہ رکھتا ہو۔" چاچو نے گویا خود کو بودی سی دلیل دے کر قائل کرنا چاہا تھا مگر کر نہیں پائے تھے۔

"میکس بتا رہا تھا، اس کی مون کے ساتھ کسی بات پر تلخ کلامی ہوگئی تھی، وہ بواریا کا انسٹی ٹیوٹ چھوڑ چکا ہے اور بیدی تونگ بھی نہیں جاتا...... جانے اس بات میں کتنی سچائی ہے۔" چاچو گویا خود کلامی کررہے تھے جبکہ مالا کی تو سانس تک رک گئی تھی۔ وہ پھٹی، پھٹی نگاہوں کے ساتھ چاچو کو ایک ٹک دیکھے جارہی تھی۔ اس کے ذہن پر ہتھوڑے کی ضربیں لگ رہی تھیں۔

"مون اور میکس...... انسٹی ٹیوٹ، لڑائی، ڈوئچ بولنا، اردو سمجھنا۔" اسے لگ رہا تھا، مون اور میکس ایک ہی کہانی کے دو مختلف رخ ہیں، اس کے تصور کی اونچائی پر گروی کے گھر کی وہ بھیانک رات ناچنے لگی تھی۔ وہ حسین تر اور عجیب تر آنکھیں...... اس کی عجیب گفتگو، روح کھینچ لینے والی باتیں...... آنکھوں سے لپکتی نفرت کی آگ...... چہرے پر سنگِ مرمر جیسی سختی...... کروفرانہ، مغرورانہ وہ غرورِ حسن تھا یا کچھ اور......؟

وہاں نفرت کے شعلے تھے یا زخمی انا کا زہر پھونکا جارہا تھا؟

"تم عنقریب علی عیسیٰ کی زندگی سے جانے والی ہو۔" تکبر سے بھرا لہجہ، آگ اگلتے لفظ...... اور پتھر جیسی رنگ بدلتی آنکھیں جو کبھی ہری نظر آتیں، کبھی سرمئی، کبھی نیلی اور کبھی سیاہ......

مالا کو کڑی سے کڑی ملانا نہیں آتا تھا...... اسے لفظ کی گہرائی میں اترنا نہیں آتا تھا۔ اسے لہجے سمجھنا اور چہرے پڑھنا بھی نہیں آتا تھا۔ اسے تو کچھ بھی نہیں آتا تھا۔ وہ چھوٹے سے ملک کی شہری تھی، اِک چھوٹے سے گھر میں محدود زندگی گزارتی آئی تھی۔ اس نے بھانت، بھانت کے اور رنگ، رنگ کے لوگ کہاں دیکھے تھے؟

مگر ایک بات اسے سمجھ ضرور...... آرہی تھی۔

کوئی جال سا تھا جو اس کے آس پاس پھینکا جارہا تھا۔ کوئی گھیرا سا تھا جو اس کے حلقوم اور گردن کے گرد تنگ کیا جارہا تھا۔ اسے چاروں طرف سازشوں کے شکنجے جکڑنے والے تھے مگر بے خبری کا یہاں عالم ہی کوئی اور تھا۔

☆☆☆

اسے رات بھر ٹھیک سے نیند نہیں آئی تھی۔ بار بار جانے کس خدشے کے تحت آنکھ کھل جاتی۔ اس شب علی عیسیٰ بھی گھر نہیں آیا تھا۔ آفاق اور عیسیٰ دونوں آؤٹ آف اسٹیشن گئے تھے۔ بس مالا اور چاچو ہی گھر میں موجود تھے۔ ہاں، عیسیٰ نے ننی کو رک جانے کے لیے کہا تھا۔ ننی دوسرے کمرے میں سو رہی تھی جبکہ مالا کو نیند نہیں آرہی تھی۔ پانچ دس منٹ کے لیے آنکھ لگتی اور پھر جانے کیسے اور کیونکر پلکیں خود بخود کھل جاتی تھیں۔ وہ اس آنکھ مچولی سے عاجز آکر بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے کرسٹل کی گڑیا کے دونوں ڈیلے آن کردیے تھے۔ کمرے میں خاصی روشنی پھیل گئی تھی۔ یہ گڑیا، ٹیبل لیمپ کا کام بھی بخوبی دیتی تھی۔ اللہ نے انسان کو کیسے، کیسے دماغ دیے ہیں؟ کبھی آسمان پر اڑتے جہاز اسے حیران کرڈالتے تھے اور کبھی پانی

کی سطح پر تیرتے محل برابر جہاز، یاٹ، کشتیاں، کبھی ننھی منی مشینریاں اسے...... حیران کردیتی تھیں۔ یہ انسانی ذہن ہی تو تھا جس نے آنکھوں کو دنگ کردینے والی چیزیں ایجاد کی تھیں۔ کروڑوں میل دور بیٹھ کر اپنوں کی آوازیں سن لینا...... ایک بٹن دبا کر کمرا ٹھنڈا اور گرم کرلینا...... انسان کی زندگی مشین کے کتنے تابع ہے اور انسان خود بھی تو ایک مشین (دماغ) کے تابع ہے...... مالا نے عقل کو حیران کردینے والے ایسے ایسے نظارے اور چیزیں دیکھی تھیں کہ وہ دنوں ان کے سحر سے نکل نہیں پاتی تھی۔ کبھی کسی اتنی اونچی عمارت کو دیکھ کر وہ حیرت سے سوچتی تھی۔ "اللہ یہ بھی تو انسان نے بنائی ہیں...... تیری بنائی مشین (دماغ) کے زور پر...... پھر بھی تیری ذات کو تسلیم نہیں کرتے؟ کیسے اندھے لوگ ہیں یہ......" یہاں جگہ جگہ حیرت کدے کھڑے تھے۔ خود مالا کے اپنے گھر میں بہت ساری ایسی چیزیں موجود تھیں جس کے استعمال کی اسے سمجھ نہیں آتی تھی۔ خصوصاً اسے تو کمرا لاک ہو تو کھولنا بھی نہیں آتا تھا تبھی عیسیٰ نے جگہ جگہ کچھ پیغامات لکھ دیے تھے۔ جیسا کہ اس کے بیڈ روم کا دروازہ اندر کی طرف بہت کھینچنے سے کھلتا تھا سو عیسیٰ نے وہاں ایک سفید سلپ پر طریقہ لکھ دیا تھا۔ اسی طرح مالا کی رہنمائی کے لیے عیسیٰ نے بہت سی آسانیاں فراہم کردی تھیں۔ وہ عیسیٰ کو سوچتی ہوئی بہت اداس ہونے لگی تھی۔ وہ کبھی رات بھر کے لیے کہیں نہیں گیا تھا، کم از کم کاروباری کام کے لیے تو کبھی نہیں گیا تھا مگر اب اسے اپنے کام کے لیے شہر سے باہر تو جانا ہی تھا۔ مالا کو عارضی جدائی کے لیے عادی ہونا ہی تھا۔

اور شاید اس کی یاد اور محبت کی کشش تھی جو عیسیٰ کی فون کال نے ماحول کے سناٹے کو توڑ ڈالا تھا۔ "آختونگ، آختونگ۔" (توجہ کیجیے) عیسیٰ کا موبائل بج اٹھا تھا۔ وہ اپنا موبائل مالا کے پاس چھوڑ گیا تھا جبکہ دوسرا سیل ہمراہ لے گیا تھا۔ اس سیل فون کی ٹیون خود بخود بدلتی رہتی تھیں۔ مالا نے لپک کر سیل فون اٹھا لیا تھا تبھی دوسری طرف گہری سانس کھینچی گئی۔

"مجھے پوری توقع تھی کہ تم جاگ رہی ہوگی۔" عیسیٰ نے چھوٹتے ہی چوٹ کرنے کی کوشش میں مالا کو خفا کردیا تھا۔ وہ اس کی بات سن کر بگڑ گئی۔

"ایک تو اکیلا چھوڑ گئے ہیں، اوپر سے زبردستی سلانے کی کوشش میں بھی ہیں، نہیں آرہی مجھے نیند۔" مالا چڑچڑے پن سے بولی۔ وہی بغیر سوچے سمجھے بولنے کی پرانی عادت...... اب وہ عیسیٰ کی طرح تول، تول کر تو بول نہیں سکتی تھی۔ عیسیٰ کو بے ساختہ ہنستے سن کر وہ قدرے حیران ہوئی تھی پھر اپنی بات پر غور کیا تو جھینپ سی گئی۔

"میں کہاں سلا رہا ہوں، اتنی دور بیٹھے بس تصور ہی کیا جاسکتا ہے، عمل ہرگز نہیں۔" عیسیٰ کا لہجہ شوخ سا تھا، ذرا بھی آواز میں نیند کا خمار یا بھاری پن نہیں تھا۔ مالا قدرے چونکی تھی پھر اس کی شوخ بات کا اثر زائل کرنے کی غرض سے بولی۔

"آپ کیوں نہیں سوئے......؟" وہ خفگی سے پوچھ رہی تھی۔ حالانکہ عیسیٰ کی غیر متوقع کال نے اس کے اندر سکون اتار دیا تھا۔ کچھ دیر پہلے کا خوف جاتا رہا تھا۔ ورنہ، اسے تو نیلے ڈیلوں والی نازک اندام گڑیا سے بھی خوف آرہا تھا۔

"بس آپ کی یاد نے دل کو بے قرار کر رکھا ہے۔" عیسیٰ نے خمار آلود آواز میں کہا تھا تب مالا اسے چھیڑنے کی غرض سے بولی۔

"کہیں پی تو نہیں رکھی؟" اس کا لہجہ شوخ سا تھا۔ مسکراتا، کھلکھلاتا ہوا، عیسیٰ نے بڑی مزیدار سی آہ بھری تھی۔

"ہزار جام لطف، ہزار مے خانے
نگاہِ یار کی لذت، شراب کیا جانے

وہ بڑے برجستہ لب و لہجے میں بولا تھا۔ یوں کہ مالا بے ساختہ ہنس پڑی تھی پھر عیسٰی نے پورا ایک گھنٹا اس سے بات کی تھی۔ مالا کا تو اب بھی دل نہیں بھر رہا تھا تاہم عیسٰی نے اسے پچکارتے ہوئے رات گہری ہونے کا احساس دلایا تھا اور یہ کہ اسے وقت پر سونا چاہیے تھا تاکہ صبح فریش اٹھ سکے، عیسٰی نے فون بند کیا تو مالا نے خود میں ایک نئی تازگی بھرتی محسوس کی تھی۔ یہ صرف عیسٰی کی فون کال کا کمال تھا۔ وہ چپل پہن کر باہر نکل آئی۔ ارادہ تھا پانی پی کر آرام سے سونے کے لیے لیٹے گی۔ سو پانی پی کر وہ اپنی ترنگ میں باہر نکل رہی تھی جب کاریڈور کے آخری سرے پر اسے کسی کا سایہ نظر آیا تھا۔ یہ سایہ انسانی وجود کا تھا...... مالا کا کچھ دیر والا شگفتہ سا مطمئن دل گویا اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔

خوف کے مارے اس کا وجود دھیرے، دھیرے کانپنے لگا تھا۔ لاؤنج اور کاریڈور میں اندھیرا تھا، نیم ملگجا سا...... اور مالا کو یہ سایہ چلتا پھرتا نظر آ رہا تھا۔ وہ اتنی خوف زدہ تھی کہ چیخ بھی نہیں پا رہی تھی اور نہ اس میں ہمت تھی کہ جو آگے بڑھ کر کچن کی لائٹ آن کر لیتی۔ اس نے آنکھیں مسل، مسل کر سامنے دیکھنے کی کوشش میں تھوڑا آگے بڑھنا چاہا تھا مگر اس کے پیر گویا زمین نے جکڑ لیے تھے۔ اس کا دل سوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ پھر اس نے سوچا کہ شاید باہر ہوا تیز چل رہی ہو اور کاریڈور کے دائیں طرف سٹنگ روم کا کوئی پردہ ہل رہا ہو مگر یہ خیال پختہ نہیں تھا۔ سایہ کسی انسانی وجود کا تھا۔ مالا نے مڑنا چاہا تو محسوس ہوا کہ ٹانگوں میں ذرا بھی ہمت نہیں...... وہ نہ آگے بڑھ سکتی تھی اور نہ پیچھے ہٹ پا رہی تھی۔ خوف نے اسے زرد کر رکھا تھا اور وہ انسانی سایہ کہیں غائب ہونے والا بھی نہیں تھا۔

ایک ہی جگہ چلتا نظر آ رہا تھا۔ پھر معاً اسے خیال آیا...... کہیں نینی تو نہیں...... اور شاید وہ نینی ہی تھی۔ اس نے گردن موڑ کر داخلی دروازے کو دیکھا تو اس کی آنکھیں پھٹ کر باہر نکلنے کو بے تاب ہو گئیں۔ داخلی دروازہ کھلا تھا جبکہ چاچو نے سونے سے پہلے خود تمام لاک لگائے تھے۔ مالا کا سر چکر کھانے لگا تھا۔ وہ بے ہوش ہونے کے قریب تھی اور وجود کسی مجسمے کے مانند ساکت اور سرد ہو رہا تھا پھر جانے کیسے اس نے دل کو ڈھارس پہنچانے کے لیے خود سے فرض کر لیا۔ "شاید نینی یا چاچو اندر سے بھلا کس نے دروازہ کھولنا تھا۔" بس یہی سوچ کر وہ ہمت مجتمع کرتی ہوئی کاریڈور کی طرف بڑھنے لگی تھی جب ایک عجیب سی کرخت اور بھیانک آواز سن کر سہم گئی۔

"زیخت...... (خبردار) فورسیخت (خبردار)"

آواز میں اتنا واضح تحکم تھا کہ مالا کی گویا جان ہی نکل گئی تھی۔ اس نے چیخنا چاہا تھا مگر چیخ نہیں پائی، بولنا چاہا تو بول نہیں پائی۔ گویا اس کرخت آواز نے اسے اپنی طرف بڑھنے سے روکا تھا۔ مالا کو گویا زماں و مکاں بھول گئے تھے۔ وہ آنکھیں بند کر کے سرپٹ دوڑ لگاتے اس...... پہلے ہی بیڈ روم میں گھس گئی تھی جو نینی کا تھا یا چاچو کا...... جس طرح دروازہ دھاڑ سے کھول کر وہ چیختے ہوئے اندر آئی تھی۔ بیڈ پر پڑا نینی کا وجود سہم کر ہڑبڑایا تھا پھر نینی گویا خود بھی چیختی ہوئی بیڈ سے اچھل پڑی تھی۔ مالا کو اپنے کمرے میں حواس باختہ کھڑا دیکھ کر وہ بھی انتہائی خوفزدہ ہو گئی۔

"تم یہاں......؟" نینی نے نیند سے بھاری آواز میں کہا تھا تب مالا نے ہکلاتے ہوئے باہر کی طرف اشارہ کر کے نینی کو بتایا۔

"باہر...... کوئی ہے......" وہ بھاگتے ہوئے نینی سے چمٹ گئی تھی جبکہ نینی کا رنگ بھی خوف سے

اُڑ گیا۔ اوپر سے مالا کی انتہائی بری حالت اور خوف سے نیلا پڑتا چہرہ دیکھ کر ڈرپوک سی نینی خود بھی تھرتھر کانپنے لگی تھی۔

"ک...... کون ہے......؟" نینی نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

"کوئی...... سایہ...... بولتا ہوا......" مالا نے رک رک کر بتایا تھا۔ وہ نینی کا بازو دبوچے کھڑی تھی۔ اگر باہر نینی بھی نہیں تھی تو پھر وہ کرخت آواز کس کی تھی۔ انتہائی کھردرا اور بھاری زنانہ لہجہ تھا۔ نینی نے پوچھا تھا کہ وہ آواز کیسی تھی؟ مالا نے لڑکھڑاتے لہجے میں پوری بات بتا دی پھر لاؤنج کے کھلے دروازے کا سن کر تو نینی کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی تھی۔

"دروازہ کس نے کھولا......؟ سر نے خود لاک چیک کیے تھے؟" نینی ہکلاتے ہوئے حواس باختہ ہو گئی پھر مالا کو ساتھ لیے چاچو کے کمرے تک آئی۔ کاریڈور میں اب پوری روشنی پھیلی ہوئی تھی بلکہ سارا گھر جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ نینی اور مالا ایک مرتبہ پھر سے بے ساختہ چیخ پڑیں۔

"لائٹس کس نے آن کی......؟" چاچو کو اپنے بیڈ پر گہری نیند میں سوتا دیکھ کر مالا چیخ پڑی تھی۔ یہ اس کی چلاہٹ بھری خوفزدہ آواز تھی جسے سن کر چاچو بھی اٹھ گئے تھے اور چاچو کو اٹھتا دیکھ کر مالا ایک ہی جست میں ان تک پہنچ کر اونچی آواز میں رونا شروع ہو گئی تھی۔ چاچو اس افتاد پر گھبرا اٹھے تھے مگر مالا نے رونا اور چیخنا کم نہیں کیا تھا۔

"مالا......! میری بیٹی ہوا کیا ہے؟" چاچو کے بار بار پوچھنے پر سہمی کھڑی نینی نے پوری بات انہیں بتا دی تھی تب چاچو بے انتہا پریشانی کے عالم میں فوراً باہر نکل گئے تھے۔ مالا اور نینی بھی ان کے پیچھے بھاگتے ہوئے آئی تھیں اور مالا کی ایک مرتبہ پھر گویا آنکھیں پھٹ پڑی تھیں۔ پورے لاؤنج میں ہُو کا

مجھ سے ملیے

میرا نام صدف نورین ہے، میں گوجرانوالہ کے ایک گاؤں میں سات اپریل 1988ء میں پیدا ہوئی۔ جب پانچ سال کی تھی تو میں اپنے والدین کے ساتھ لاہور شفٹ ہو گئی۔ میرے دو بھائی ہیں، میں ایک ہی بہن ہوں۔ پنجاب یونیورسٹی سے میں نے بی اے کیا ہے۔ میری پسندیدہ کتاب قرآن مجید ہے۔ میں تدریس کے شعبے سے وابستہ ہوں۔ قرآن و حدیث کے بے شمار کورسز بھی کیے ہیں، میں اپنے اس علم کو اپنے اسٹوڈنٹس تک منتقل کرنا چاہتی ہوں تاکہ وہ دینی تعلیم سے روشناس ہو سکیں جس سے بچوں کی اخلاقی تربیت بہتر ہو سکے گی۔ پاکیزہ سے میرا رشتہ بہت پرانا ہے...... جب تک پاکیزہ نہ پڑھ لوں چین نہیں ملتا۔ ہر ماہ بے قراری سے نئے پرچے کا انتظار رہتا ہے۔ مجھے آپ سے مل کر اچھا لگا، آپ کو کیسا لگا؟

عالم تھا۔ مکمل اندھیرے میں ڈوبا ہوا...... کاریڈور میں اب کوئی بھی بولتا ہوا سایہ نہیں تھا۔ حتیٰ کہ لاؤنج کے لاک جب چاچو نے چیک کیے تو مالا گویا دنگ رہ گئی تھی۔ دونوں آٹو میٹک لاک بند تھے۔ چاچو کچھ متحیر سے پلٹے۔

''مالا......! میری جان، یہاں تو کچھ بھی نہیں۔'' انہوں نے پھر سے اسے ساتھ لگا کر چوما تھا۔ تسلی دلاسا دینے کی کوشش کی تھی۔ وہ اسے سمجھا رہے تھے کہ شاید اس نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے مگر مالا قطعاً ماننے کو تیار نہیں تھی۔

''میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے چاچو......! یہاں ابھی کچھ دیر پہلے کوئی تھا۔'' وہ بری طرح سسک رہی تھی اور ننی بھی سر ہلا کر گویا تائید کر رہی تھی۔

''لائٹس آن تھیں۔'' ننی نے یقین دلانے والے انداز میں کہا تھا...... مگر چاچو نے اسے ڈانٹ دیا۔

''تم نے بے پروائی سے آن کر دی ہوں گی...... اب اسے مزید خوف زدہ مت کرو۔'' چاچو کے غصے کو محسوس کر کے ننی چپ کر گئی تھی جبکہ مالا قطعاً اسے کوئی بھیانک خواب نہیں سمجھ رہی تھی۔ اس نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کچھ دیر پہلے گھر میں کوئی آیا تھا؟ کون آیا تھا؟ اور پلک جھپکنے کی دیری میں کیسے چلا گیا؟ یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتی تھی۔

''تمہارا وہم ہے بیٹا......'' چاچو نے پیار سے اسے سمجھایا۔ ''صدیوں سے یہاں اس گھر میں رہ رہا ہوں...... ایسا کبھی نہیں ہوا۔'' وہ اسے برابر تسلی دے رہے تھے پھر مالا کو دوبارہ اپنے کمرے میں لے آئے۔ ننی بھی ان کے پیچھے ہی چلی آئی تھی۔

''کیا پتا، بھوت پریت میں سے کوئی ہو، اپنی دنیا سے بھٹک کر ہماری دنیا میں آ گیا ہو......'' ننی نے اپنی عقل کے مطابق رائے دی تھی۔ چاچو کو بے انتہا غصہ آ گیا۔ انہوں نے جھڑک کر ننی کو باہر جانے کے لیے کہا تھا۔

''یہ قوم......'' چاچو نے بہ مشکل خود کو غصہ کرنے سے باز رکھا تھا۔ ''اس چیز کو نہیں مانتے جس کو ماننا چاہیے...... وجودِ لاریب سے غافل ہیں اور بھوت پریت پر اندھے اعتقاد......'' ننی کے اٹھ کر چلے جانے کے بعد بھی چاچو غصہ کرتے رہے تھے۔ پھر ہوا یوں کہ ننی ایک مرتبہ پھر ڈرتے، ڈرتے واپس آ گئی۔

''سر......! مجھے باہر جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔'' اس نے اتنی بے چارگی سے کہا کہ چاچو اور مالا دونوں کو ترس آ گیا۔ یوں ننی اور مالا نے رات چاچو کے کمرے میں جیسے تیسے گزاری تھی اور صبح ہوتے ہی ننی نے گویا دوڑ لگا دی۔ یہ بواریا میں گزرنے والی راتوں سے بھی خوفناک اور بھیانک رات تھی۔ مالا کو پوری رات نیند نہیں آئی تھی اور صبح بھاری سر کے ساتھ نماز ادا کرنا بہت مشکل لگ رہا تھا۔ چاچو تو مالا سے بھی پہلے اٹھ کر نماز ادا کر چکے تھے...... اور اب اپنی تسبیحات پڑھنے کے بعد معمول کے مطابق دوبارہ سو چکے تھے۔ تاہم مالا اٹھ کر باہر چلی آئی تھی۔ رات کا منظر ایک پل کے لیے بھی مالا کی نظر سے اوجھل نہیں ہوا تھا، یہی وجہ تھی کہ کاریڈور کے آخری کونے کو دیکھتے ہوئے اس نے بے ساختہ جھرجھری لی تھی۔ رات کی بھیانک ساعتیں ایک مرتبہ پھر نگاہوں کی پتلیوں میں جم گئی تھیں۔ وہ بہ مشکل خوف سے پیچھا چھڑا کر باہر آئی تو ننی کو تالاب کے کنگرے پر بیٹھا دیکھ کر کچھ متحیر رہ گئی تھی۔ پھر کچھ سوچ کر وہ دبے قدموں سے چلتی ہوئی تالاب کی طرف آئی۔ اسے لگا ننی سر جھکائے گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی ہے مگر یہ مالا کی خام خیالی تھی۔ قریب آنے پر پتا چلا تھا ننی گھٹنوں میں منہ چھپائے کسی سے فون پر بات کرنے میں مصروف تھی اور عجیب بات یہ تھی کہ اس نے دور سے ہی کسی کے آنے کی آہٹوں کو محسوس کر لیا تھا تبھی فون کو آف کر کے گردن موڑے مالا کو دیکھنے لگی تھی۔ مالا کو اس کے تاثرات کچھ عجیب لگے تھے۔ گویا اسے مالا کی مداخلت سخت گراں گزری تھی۔ اور اس کا موڈ بھی کچھ بگڑ گیا تھا۔ تاہم وہ منہ سے تاگ (ہیلو) تک بھی نہیں بولی تھی جو اس کے معمول کا ایک حصہ تھا۔ مالا کو وہ کچھ کھوئی، کھوئی اور کسی الجھن میں ڈوبی نظر آئی تھی پھر کچھ ہی لمحوں میں اس نے گویا حواسوں میں آ کر مالا کو ہیلو کہا تھا اور پھر اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔

''تم بھی سویرے اٹھنے کی عادی ہو۔'' ننی نے بہ مشکل مسکرانے کی کوشش میں باچھیں یہاں سے وہاں تک پھیلائی تھیں۔ مالا کو اس کا زبردستی مسکرانا بھی برا لگا تھا۔ بالکل عجیب سا۔

''ہاں...... اور شاید تم بھی۔'' مالا کو جواب میں کچھ تو بولنا ہی تھا سو مالا کا سوال سن کر ننی نے بے ساختہ اثبات میں سر ہلایا۔

''کسی سے بات کر رہی تھیں؟'' اسے خاموش دیکھ کر مالا نے گفتگو مزید آگے بڑھائی تھی۔ تب وہ کچھ گھبرا کر ہاں کہنے کے بعد اِدھر اُدھر دیکھنے لگی تھی۔ مالا نے کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ یقیناً ننی اپنے کسی بوائے فرینڈ سے گپ شپ کر رہی تھی سو مالا کی انٹری نے اسے کچھ بدمزہ سا کر دیا تھا۔ اب مالا، کے سوال پر وہ بجائے جواب دینے کے پیروں سے گھاس مسلنے لگ گئی تھی۔ سو مالا نے اس تمہید پر لعنت بھیج کر سیدھے سیدھے رات کا قصہ چھیڑ دیا تھا جسے سن کر وہ خوف سے پیلی پڑ گئی۔ رات کو بھی ننی کا ردِعمل یہی رہا تھا۔ وہ مالا سے بھی زیادہ خوفزدہ تھی اور یقیناً ڈرپوک بھی بہت تھی۔

''ننی! کیا پہلے بھی رات کو اس قسم کے واقعات پیش آ چکے ہیں؟'' مالا اپنے وسوسے کو ختم

کرنا چاہتی تھی، تبھی براہِ راست ننی سے پوچھ رہی تھی ورنہ چاچو تو رات کو جو کچھ بھی ہوا تھا اسے مالا کا وہم سمجھ رہے تھے۔ حالانکہ وہ سب مالا کا وہم ہرگز نہیں تھا۔ ننی اس کا سوال سن کر پھر گھبرا گئی تھی۔ تبھی اس نے بے ساختہ نفی میں سر ہلایا تھا۔

''پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا......'' ننی نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے، مالا کو ذرا بھی یقین نہیں آیا تھا بلکہ ننی کے جھوٹ نے اس کا ایقان بڑھا دیا تھا۔ وہ پورے وثوق سے کہہ سکتی تھی اس گھر میں ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔

''جھوٹ مت بولو، ننی! مجھے سچ بتاؤ، یقین کرو، میں چاچو کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔'' مالا نے نرمی سے کہا تھا۔ وہ اس کا تذبذب جان چکی تھی۔ یقیناً اسے چاچو کی ڈانٹ نے خوف زدہ کر رکھا تھا اگر چاچو جان جاتے کہ ننی نے مالا کو کچھ اور بھی بتایا ہے تو پھر اس کی چھٹی کروا دی جاتی۔ ننی بہت غریب گھرانے سے تھی۔ اس کا باپ سیاسی پناہ لے کر جرمنی آیا تھا۔ ننی کا کنبہ بھی بہت زیادہ تھا...... یہ ساری بہنیں کلینرز تھیں اور گھر کا خرچہ یہی کھینچ گھسیٹ کر چلاتی تھیں۔ مالا کی یقین دہانی نے ننی کو کچھ ڈھارس پہنچائی تھی۔ اب وہ مالا کو کچھ بھی بتا دینے کے لیے خود کو تیار کر چکی تھی۔ اس نے جھکے سر کے ساتھ بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ حالانکہ وہ اب بھی خوفزدہ دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا لہجہ اور آواز بھی کانپ رہی تھی۔

''اس گھر میں عجیب، عجیب واقعات ہوتے ہیں۔ یہ گھر شادی شدہ جوڑوں کے لیے بڑا ہی منحوس ہے۔ یہ صرف میں نہیں کہتی بلکہ یہاں کی ہاؤس فراؤ (عیسیٰ کی مما) بھی کہتی تھیں۔'' ننی نے خوف زدہ لہجے میں دھیرے، دھیرے بتانا شروع کیا تھا جبکہ مالا جو خود کو بڑا بہادر بنا کر ننی سے

سوال کر رہی تھی پہلی بات پر ہی اندر سے ڈھے گئی۔ ایک عجیب سا خوف تھا جس نے مالا کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیا تھا مگر وہ نمی کو خاموش نہیں کروا سکتی تھی۔ وہ نمی کو سننا چاہتی تھی۔

"میں نے اپنا لڑکپن یہیں گزارا ہے۔ ہاؤس فراؤ (مالکن) بہت اچھی تھی مگر آئے دن ان کے ساتھ کچھ نہ کچھ عجیب ہوتا تھا۔ کبھی ان کے کپڑے جل جاتے، کبھی نئے نکور برتن خود بخود شیلف سے نیچے گر کر ٹوٹنے لگتے اور پھر صحت مند تو وہ کبھی رہی ہی نہیں تھیں۔ ہر وقت بیمار رہتیں، کبھی سر میں درد، کبھی شدید قسم کا بخار، کبھی کھڑے، کھڑے چکر آنے لگتے تھے اکثر وہ راتوں کو خواب میں ڈر جاتی تھیں اور کبھی کبھار مالکن کو گھر میں چلتے پھرتے لوگوں کی آہٹیں سنائی دیتی تھیں۔" نمی انگلیاں مروڑتے ہوئے اِدھر اُدھر چور نظروں سے دیکھتی کسی نادیدہ مخلوق کو دیکھ رہی تھی۔ ایسی مخلوق جو نمی کے منہ سے اپنا ذکر سن کر اسے نقصان بھی پہنچا سکتی تھی۔ وہ انتہائی خوف زدہ نظر آ رہی تھی اور مالا اس کی آخری بات سن کر لمحے بھر کے لیے دہل سی گئی۔

"لوگوں کی آہٹیں......؟" مالا کے ہونٹ کپکپا گئے تھے۔ چہرے کی رنگت زرد پڑ گئی۔ اس کے کان کسی نادیدہ مخلوق کی آہٹوں کو سننے لگے تھے جیسے عجیب سی شائیں شائیں جیسے کوئی گھاس پر چل رہا ہو، مالا نے بے ساختہ نمی کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"کیا تمہیں بھی کسی کی آہٹ سنائی دی ہے؟" اس کا وجود سوکھے پتے کے مانند کانپ رہا تھا۔ نمی اس کا سوال سن کر چپ سی کر گئی تھی پھر مالا کے دوبارہ دہرانے پر بھنچی، بھنچی آواز میں بولی۔

"ہاں......" اس کا سر جھکا ہوا تھا اور وہ شدید گھبراہٹ کا شکار تھی۔ "مجھے اکثر لاؤنج میں اور نیچے بیسمنٹ میں کوئی سرگوشیاں کرتا اور بولتا ہوا سنائی دیتا ہے۔" نمی ہونٹ کاٹتے ہوئے کپکپاتی آواز میں بتا رہی تھی۔ مالا ایک دم پھر سے دہل گئی۔

"رات سے پہلے مجھے کبھی ایسا فیل نہیں ہوا۔" مالا زیرِ لب بڑبڑا رہی تھی تب نمی نے اپنی سمجھ کے مطابق جواب دیا تھا۔

"پہلے تم کو اس لیے تنگ نہیں کیا گیا کہ یہاں رہنے والے لوگ مہمانوں کو کچھ نہیں کہتے...... اب ان کو سمجھ آ گئی ہے کہ تم مستقل یہاں رہو گی سو وہ اپنا آپ دکھانے لگے ہیں۔" نمی بہت سنجیدگی کے ساتھ مالا کے حواسوں کو معطل کر رہی تھی۔ وہ خود بھی بہت پریشان تھی، رات کے واقعے نے اسے بھی سخت خوف زدہ کر رکھا تھا۔ اس کی مجبوری نہ ہوتی تو شاید وہ اس نوکری کو لات مار کے چلی جاتی مگر مسئلہ یہ تھا کہ کسی اسٹور یا پمپ پر جاب کرنا بہت تکلیف دہ، پُراذیت کام تھا۔ اڑتالیس گھنٹے کی سخت ڈیوٹی تھی اور نمی اتنا مشکل کام نہیں کر سکتی تھی جبکہ اس پاکستانی فیملی کے ساتھ کام کرتے ہوئے اسے کئی سال گزر چکے تھے۔ مناسب تنخواہ، کھانا فری اور کام بھی مشکل نہیں تھا۔ خصوصاً یہ لوگ ہر تہوار پر اضافی تنخواہ، بونس وغیرہ بھی دیتے تھے، عید، شب برات پہ نئے کپڑے بھی لے دیتے، اکثر بچا ہوا سارا کھانا وہ گھر لے جاتی تھی پھر اتنے اچھے لوگ تھے کہ ڈانٹ ڈپٹ، روک، ٹوک بھی نہیں کرتے تھے پھر ذرا سے خوف اور غیر معمولی واقعات سے ڈر کر وہ کیسے اتنی اچھی نوکری چھوڑ سکتی تھی۔ اس وقت بھی وہ مالا کو اپنی مجبوری کے متعلق بتا رہی تھی۔

"کبھی کبھی تو دن کو بھی برآمدے میں کسی کے چلنے کی آواز آتی ہے، مجھے اتنا ڈر لگتا ہے کہ حد نہیں...... مگر سر کو بھی نہیں بتا سکتی۔ وہ میری بات کا یقین نہیں کرتے۔" نمی نے خوفزدہ لہجے میں بتایا۔ گویا یہ صورتِ حال اس کے لیے بہت پریشان کن تھی۔ مالا کی خوف کے مارے گھگھی بندھ گئی تھی۔

ذہن پر ایک دم بوجھ آ پڑا تھا۔ چاروں طرف سائیں، سائیں کی آوازیں ابھر رہی تھیں اور اسے یوں لگ رہا تھا کہ گویا کوئی نادیدہ چہرے اور آنکھیں اسے گھور رہی ہیں۔ اس نے بے ساختہ نمی کا ہاتھ تھام لیا تھا، اسے رات کو کاریڈور سے آنے والی آواز پھر سے سنائی دے رہی تھی۔ "زیخت" (خبردار) مالا کے کانوں میں نوکیلے کانچ چبھ رہے تھے۔ جیسے اس وقت بھی وہ نادیدہ مخلوق انہیں خبردار کر رہی تھی کہ ہم یہیں آس پاس ہیں۔ اسی گھر میں رہتے ہیں۔ یہ ہمارا ٹھکانا ہے۔ یہاں کوئی عورت مستقل نہیں رہ سکتی۔ ہم اسے یہاں رہنے نہیں دیں گے۔ کم از کم مالا کو اپنے آس پاس یہی بھنبھناہٹ سنائی دے رہی تھی۔

☆☆☆

رات کا واقعہ اتنا معمولی نہیں تھا جسے اتنی آسانی کے ساتھ نظر انداز کر دیا جاتا مگر چاچو نے ایسے ہی کیا تھا۔ گویا ان کے نزدیک رات کا واقعہ مالا کے وہم یا خواب کے سوا کچھ نہیں تھا۔ حالانکہ نمی کے چلے جانے کے بعد بھی وہ چاچو سے کرید کرید کر سوال کرتی رہی تھی اور ہر دفعہ بات کو گھما پھرا کر اس گھر میں رہنے والی کسی نادیدہ مخلوق تک لے آئی تھی مگر چاچو کمالِ ذہانت سے اس کی بات کو بدل دیتے تھے یا تو وہ مالا کے خوف و ہراس کی وجہ سے کچھ چھپا رہے تھے یا پھر چاچو اس قسم کے واقعات اور انہونیوں کے عادی ہو چکے تھے جو بھی تھا، مالا کو وہ ہرگز بھی کوئی تسلی بخش جواب نہیں دے سکے تھے...... بلکہ ابھی تک اس کے رات والے وہم کو انجوائے کر رہے تھے جبکہ مالا اندر ہی اندر سخت جھنجلاہٹ کا شکار تھی۔

ایک طرح سے یہ بات مذاق میں ٹال دی گئی تھی۔ اتنا سنجیدہ موضوع مذاق کا نشانہ بن گیا تھا پھر عیسیٰ کو گویا اسے چھیڑنے کے لیے ایک اور موقع مل گیا۔ وہ آتے جاتے مالا کو تنگ کرتا۔

"پھر دوبارہ سے سہیلیوں نے ملاقات نہیں کی؟" اس کی شرارت مالا کو غصہ دلا دیتی تھی۔ غالباً سہیلیوں سے مراد وہی نسوانی آوازیں تھیں جس نے مالا کو کاریڈور کی طرف آنے سے روکا تھا۔ مگر سچ تو یہ تھا جسے سب مالا کا وہم کہہ رہے تھے وہ کوئی وہم نہیں تھا بلکہ جاگتی آنکھوں دیکھنے والا بھیانک خواب تھا۔ مالا نے اس روز کے بعد کئی مرتبہ کمرے کے باہر آہٹیں سنی تھیں۔

اس رات کے بعد لائٹس آن ہونے والا واقعہ تو نظر کے سامنے نہیں آیا تھا مگر ایک ایسی انہونی ہوئی جسے کسی کا ذہن قبول کرنے والا نہیں تھا۔ صحیح معنوں میں چاچو اور عیسیٰ کو بھی اس واقعہ نے جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا اور وہ جو مالا کی باتوں کو سرے سے کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے ایک دم انتہائی متفکر ہو گئے تھے بلکہ ان کی راتوں کا سکون اور نیند اُڑنے لگی تھی۔

ہوا کچھ یوں کہ مالا کو اس رات بھی اتفاقاً اکیلے رہنا پڑا تھا، اس شب نمی، مالا کے کمرے میں ہی سو رہی تھی کچھ دیر پہلے عیسیٰ نے کال کر کے "سب خیریت ہے؟ کوئی مسئلہ تو نہیں۔" اس قسم کی بہت سی باتیں پوچھی تھیں۔ تب تک کوئی مسئلہ نہیں پیش آیا تھا۔ مسئلہ تو فون بند کرنے کے بعد پیش آیا۔ کچھ دیر وہ ریسیور پکڑے بیٹھی رہی پھر جیسے کسی... غیر مرئی قوت نے اسے بستر سے اٹھا دیا۔ وہ غیر ارادی طور پر کمرے میں ٹہلنے لگی تھی۔ جب عیسیٰ گھر میں ہوتا تب اسے کسی بھی قسم کا خوف لاحق نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی ایسے عجیب و غریب واقعات پیش آتے تھے۔ اسے لگتا تھا عیسیٰ کے منظر سے ہٹتے ہی اس کی زندگی بے ترتیبی کا شکار ہونے لگتی تھی۔ جیسا کہ اس وقت اتنا عجیب واقعہ پیش آیا تھا۔ مالا کمرے میں ٹہل رہی تھی۔ جب اس نے اپنے روم کی واحد

گلاس ونڈو پر پڑے آدھے سفید نائیلون کے جالی دار اور آدھے پھولدار سلک کے پردے پر کسی عکس کو سرسراتے دیکھا تھا۔ جیسے کوئی کھڑکی کے باہر کھڑا تھا...... رات کے انتہائی پہر یہ خیال کیا کم ڈراؤنا تھا کہ کمرے کی کھڑکی سے باہر کوئی وجود سانس لیتا ہو اور آپ کو دکھائی نہ دیتا ہو؟ مالا کا معمول کے مطابق دھڑکتا دل اچھل کر حلق میں آگیا تھا۔ ایک غیر ارادی حرکت کے طور پر وہ لمحے کے ہزارویں حصے میں کھڑکی کے دوسری طرف گویا اوٹ میں ہوگئی تھی۔ یہ سمجھے بغیر کہ جو گھر کی حدود میں داخل ہوجاتا ہے، جو بند لاک کو کھول سکتا ہے، وہ کمرے میں بھی تو آسکتا ہے، وہ کمرے میں بھی تو بلا جھجک داخل ہوسکتا تھا اور وہ جہاں بھی چھپتی، اس نادیدہ مخلوق نے اسے دیکھ ہی لینا تھا مگر عین فطرتِ انسانی اس نے گویا خود کو کھڑکی میں سے تاڑتے وجود کی آنکھوں سے محفوظ کرلیا تھا۔ حالانکہ وہ سانس روکے دیوار سے چپکی کھڑی تھی۔ نیچے میٹرس پہ نِنی بے خبر سو رہی تھی مگر اس کے ہونٹ ایک دوسرے کے ساتھ چپکنے سے بھی گریزاں تھے سو وہ نِنی کو جگانے سے بھی قاصر تھی۔

مالا کو لگ رہا تھا گویا یہیں کھڑے، کھڑے صدیاں بیت گئی تھیں۔ اس سے مزید سانس روکنی بھی محال ہوگئی۔ وہ دیوار سے سر چپکائے لمبی، لمبی سانسیں لے رہی تھی۔ جب اسے باہر باتوں کی جھنجھناہٹ سنائی دی تھی۔ کسی مرد اور عورت کی آوازیں تھیں، مالا کو لگا جیسے زمین اس کے پیروں تلے سے کھسک جائے گی...... جیسے ساتوں آسمان اس کے سر پر آن گریں گے جیسے وہ کبھی اپنے وجود کی عمارت کے ساتھ کھڑی نہ ہو پائے گی۔ اس کے کانوں نے آوازیں ہی کچھ اس قسم کی سنی تھیں۔ آسمان جیسے گر پڑا تھا اور زمین جیسے ریت کے مانند سرکنے لگی تھی۔ وہ ان آوازوں کو لاکھوں، ہزاروں، کروڑوں لوگوں کی آوازوں میں سے بھی پلک جھپکنے کی دیر سے پہلے پہچان سکتی تھی۔ مالا نے کان دیوار کے ساتھ چپکا دیے تھے۔

"ٹارگٹ تو اچیو کرنا ہی ہے......" یہ مرد کی آواز تھی، سنجیدہ ...... بردبار اور مستحکم سی، لہجے میں یقین بول رہا تھا۔ ارادے کی پختگی نظر آرہی تھی...... کچھ دیر بعد نسوانی آواز بھی سنائی دی۔

"ٹارگٹ مشکل ضرور ہے، پر ناممکن نہیں...... میں چاہتی تو لمحوں میں کھیل کو ایک ہی چال کے ساتھ ختم کرسکتی تھی مگر ایسی گیم کا مزہ ہی کیا جس میں مقابل کو بے خبری میں مار ڈالا جائے...... بے خبری میں ہرا دیا جائے۔ مزہ تو تب ہے کہ مات کرنے سے پہلے تڑپا تڑپا کر ہار کا مزہ لوٹا جائے۔" نسوانی آواز میں حقارت تھی، نفرت تھی، غرور تھا، زہر تھا، جانے اس کی آواز میں نفرت کے کیسے، کیسے غلیظ رنگ تھے۔ مالا کا پورا وجود سن ہوگیا تھا۔ جیسے برف کے تودوں نے اسے سن کر دیا ہو، جیسے اس کا وجود برف کے گڑھے میں گر کر جم گیا ہو...... جیسے وہ برف کی کوئی دیوار بن گئی ہو، ان آوازوں کی پہچان نے مالا کو برف کا سردخانہ بنا ڈالا تھا۔

وہ مرجاتی پھر زندہ ہوتی تب بھی ان دو لوگوں کی آوازوں کو پہچان سکتی تھی۔ وہ عالم جنون میں بھی ان دو لوگوں کی آواز کو پہچان سکتی تھی۔ وہ دو لوگ کوئی اور نہیں بلکہ آفاق اور سوزن تھے۔

مرد اور عورت کی جھنجھناہٹ اب ختم ہوچکی تھی۔ جیسے کہانی ایک دفعہ تو ختم ہوچکی ہو مگر اصل کہانی ختم کہاں ہوئی تھی؟

> مالا کی خوشگوار زندگی کس کی سازشوں کا شکار ہوئی......؟ کیا وہ ان آوازوں کو درست پہچانی تھی یا پھر......؟ یہ سب ضرور جانیے مگر اگلے ماہ

ناولٹ

ترکِ وفا

نایاب جیلانی



ساتواں حصہ

"پیاری مالا! لگتا ہے، رات کو سہیلیوں کے ساتھ لمبی ملاقات ہوئی ہے۔" وہ جو مسلسل ان آوازوں کے بارے میں سوچتے ہوئے سخت اذیت میں مبتلا تھی، عیسیٰ کی شوخ آواز سن کر بالکل ڈھے گئی تھی۔ کیا وہ کبھی آفاق کا گھناؤنا چہرہ عیسیٰ کو دکھا پائے گی؟ کیا عیسیٰ کو یہ انکشاف ہلا کر نہ رکھ دے گا؟ وہ کس قدر اذیت محسوس کرے گا، اسے کتنا دکھ ہوگا؟ مگر مالا اسے آفاق کا کریہہ روپ ہر صورت دکھانا چاہتی تھی، چاہے کچھ بھی

ہو جاتا، چاہے عیسیٰ یقین کرتا یا نہ کرتا..... مگر وہ آفاق اور سوزن کے ہاتھوں خود کو مزید بے وقوف نہیں بننے دے سکتی تھی۔ اسے آفاق کے دھوکے نے اتنی ٹھیس نہیں پہنچائی تھی جس قدر سوزن کی غلیظ سوچ نے دکھ اور اذیت میں مبتلا کیا تھا۔ بظاہر کیسی ہمدرد، پُر خلوص اور نیک نیت نظر آتی تھی مگر در پردہ سوزن کیا تھی؟ مالا کچھ تو جان چکی تھی اور کچھ جاننے کے قریب تھی۔ ایک بات تو طے تھی، مالا اب سوزن اور آفاق کے جھانسے میں آنے والی نہیں تھی۔

"ویسے یار! یہ خوب صورت روحیں اور پریاں مالا کو نظر آتی ہیں، ہمیں کیوں نہیں ....." آفاق کی شوخ کھنکناتی آواز مالا کو پُر اذیت سوچوں کے بھنور سے کھینچ لائی تھی، وہ گم صم سی آفاق کو دیکھنے لگی تھی۔ کیا کوئی اتنا ڈرامے باز ہو سکتا ہے؟

"سوچنے کی بات ہے، پریاں ہمیں نظر کیوں نہیں آتیں؟ ہماری غیر موجودگی ہی میں کیوں آتی ہیں۔" عیسیٰ بھولپن کا مظاہرہ کرتا آفاق سے پوچھ رہا تھا۔ اس بات سے بے نیاز کہ سامنے بیٹھا لڑکا کتنا مکار اور ہوشیار ہے اور کس طرح آستین میں بیٹھ کر ڈسنے کے ارادے باندھے ہوئے ہے، مالا کو ایک مرتبہ پھر سوزن اور آفاق کی باتیں زہر آلود کرنے لگی تھیں۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہیں پل دو پل میں آفاق کے چہرے پر سے نقاب کھینچ دے۔ وہ کسی غیر مرئی نکتے پر نظر جما کر ان الفاظ کو ترتیب دے رہی تھی جو اسے کچھ دیر بعد عیسیٰ کے گوش گزار کرنے تھے۔ مالا کو اتنی سوچ بچار میں گم دیکھ کر عیسیٰ نے کھنکھار کر شرارتاً کہا۔

"مالا ڈیئر! پھر تو نہیں کوئی سہیلی دکھائی دے رہی؟" عیسیٰ پلیٹ میں چمچ بجا کر اسے اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔ "کیا پھر کوئی پری نظر آئی؟ حسین و جمیل اور نازک اندام سی؟" وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔ تنگ کر رہا تھا جبکہ مالا بہت اذیت میں تھی۔ وہ اسے اپنی تکلیف فوراً بتا دیتی اگر آفاق سامنے نہ بیٹھا ہوتا...... وہ محض آفاق کے منظر سے ہٹنے کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ جوں ہی اٹھ کر وہاں سے جاتا، مالا عیسیٰ کو اس کی حقیقت فوراً کھول کر بتا دیتی۔ چاہے نتائج کچھ بھی نکلتے..... اسے پکا یقین تھا، اس گھر پر کسی آسیب کا سایہ نہیں..... یہ آفاق اور سوزن کی کوئی ملی بھگت تھی۔ یقیناً سوزن، عیسیٰ سے کوئی پرانا بدلہ لے رہی تھی...... اور مالا کو خوفزدہ کر کے اسے تیز کر رہی تھی مگر آفاق کیوں اس گھناؤنے کھیل میں شامل تھا؟! اپنے محسن اور دوست کے ساتھ کھلا دھوکا کر رہا تھا۔

"مالا! کیا ہو گیا ہے تمہیں یار؟" اسے پھر کسی سوچ میں گم دیکھ کر اب کہ عیسیٰ کچھ متفکر ہو گیا تھا۔ مالا گویا ایک وہم پر بدظن ہو گئی تھی۔

"تم اس معاملے میں اتنی سیریس کیوں ہو رہی ہو؟ ایسا کچھ بھی نہیں، وہم ہے بس تمہارا۔" اس نے چپ بیٹھی مالا کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا تب مالا کچھ سخت لہجے میں چیخی تھی۔

"میرا وہم نہیں، حقیقت ہے یہ سب......" وہ آفاق کو چبھتی نظر سے دیکھ رہی تھی، عیسیٰ سمجھے بغیر نرمی سے بولا تھا۔

"ایک ہی بات کو بار بار سوچو گی تو یہ حقیقت ہی لگنے لگا۔ آہٹیں، آوازیں، دیکھو مالا! ایک وہم کو سر پر سوار کرنے سے یوں ہی محسوس ہوتا ہے گویا سب کچھ حقیقت میں ہو رہا ہے، کبھی تم نے خیال کیا، اکیلے بیٹھنے سے ہمارے کان خاموشی کے سناٹوں کو محسوس کرتے ہیں، جیسے رنگ برنگ کی آوازیں آنے لگتی ہیں، اسی طرح آنکھوں کو سختی سے بند کر لینے کے بعد اندھیرے میں آہستہ آہستہ عکس ابھرتے ہیں، ہماری تصوراتی دنیا کے کئی طرح کے اور کسی قسم کے منظر ابھرتے ہیں۔ یہ ہمارا خیال ہوتا ہے۔ حقیقت سے قطعاً دور......" عیسیٰ بہت نرمی سے اسے سمجھا رہا تھا۔ وہ بہت سنجیدہ ہو گیا تھا۔ گویا پہلے والی مذاق کی کیفیت

ختم ہو چکی تھی۔ اسی طرح آفاق بھی تائیدی انداز میں سر ہلاتا گویا عیسیٰ سے متفق تھا اور مالا کو وہ سراسر ڈراما کرتا دکھائی دے رہا تھا۔

"ویسے عیسیٰ! مالا کچھ زیادہ وہمی ہو رہی ہے، یہ سب ٹھیک نہیں، اسی طرح تو انسانی نفسیات بھی متاثر ہوتی ہے۔" وہ چالاک بڑی ہمدردی کے ساتھ عیسیٰ سے مخاطب تھا جبکہ عیسیٰ سنجیدگی کے ساتھ اثبات میں سر ہلا رہا تھا..... اور مالا کا دل چاہ رہا تھا کہ آفاق کا کریہہ منہ نوچ لے۔ اس نے ایسا منافق زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"یہی تو اسے سمجھا رہا ہوں، جو یہ فیل کر رہی ہے، ایسا کبھی نہیں ہوا، کیا آفاق! تم نے کبھی محسوس کیا ہے؟" عیسیٰ نے آفاق کی طرف دیکھ کر پوچھا تھا، اس نے بے ساختہ نفی میں سر ہلا دیا۔

"نہیں تو...... مجھے کبھی پریاں نظر نہیں آئیں..... حالانکہ مجھے پریاں دیکھنے کا بہت شوق ہے۔" آفاق نے بے چارہ سا منہ بنا لیا تھا جیسے اس کی سب سے بڑی زندگی کی خواہش ابھی تک ادھوری تھی۔ مالا کو اس کی مکاری پر اور بھی غصہ آ گیا تھا مگر فی الحال وہ کچھ بھی بولنے سے قاصر تھی۔

"کاش پریاں مالا کے بجائے مجھے نظر آتیں....." آفاق نے پھر مصنوعی حسرت کا مظاہرہ کیا تھا۔ تب عیسیٰ نے اس کے کندھے پر دھپ لگائی۔

"مت اتنی آہیں بھرو..... یہ نہ ہو کہ آج رات تمہاری باری ہو۔" عیسیٰ نے اسے دھمکایا اور وہ دھک بھی گیا۔

"نہیں یار! مت ڈراؤ..... میرا دل پہلے ہی کمزور ہے، پریوں کی تاب نہیں لا سکے گا۔" وہ منمنا کر بول رہا تھا۔

"اتنی ہمت تھی بس۔" عیسیٰ نے اس کا مذاق اڑایا۔

"تم بھی زیادہ بہادر نہ بنو، کیا پتا آج تمہارے امتحان کی باری ہو۔" آفاق نے اسے چڑایا۔

"مجھے پریاں کچھ نہیں کہتیں..... بڑا پیار آتا ہے انہیں مجھ پر۔" عیسیٰ اترایا۔

"ہونہہ، دھیان سے یار.....! کہیں پیار، پیار کے کھیل میں تمہیں لے نہ اڑیں....." آفاق نے منہ بنا کر کہا تھا..... ادھر مالا دہل گئی۔

"اللہ نہ کرے....." اس نے چیختے ہوئے لہجے میں غصے سے کہا۔ اس کا ردعمل خاصا جارحانہ تھا۔ تبھی عیسیٰ اور آفاق دونوں چونک گئے تھے۔ آفاق تھوڑا خفت زدہ رہ گیا تھا جبکہ عیسیٰ کو بات سنبھالنی مشکل ہو گئی تھی۔

"آفاق مذاق کر رہا ہے مالا!" عیسیٰ نے نرمی سے کہا۔

"مذاق بھی سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے۔" وہ روہانسے لہجے میں بولتی اٹھ گئی تھی جبکہ وہ دونوں کچھ ہونق رہ گئے تھے۔

"کیا اس کے مزاج اور دماغ پر بھی تو اثر نہیں ہو گیا.....؟" عیسیٰ انتہائی متفکر سا مالا کو کچن کی طرف جاتا دیکھ کر یہ سوچ رہا تھا۔ جبکہ آفاق کچھ خفت زدہ سا عیسیٰ کا کندھا تھپتھپا کر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

"کیا بات ہے مالا.....؟" عیسیٰ جو اپنے کمرے میں آ کر کسی کام میں مصروف تھا اب مالا کے کمرے میں داخل ہوتے ہی نرمی سے پوچھ رہا تھا۔ وہ اس کی ذہنی ابتری سمجھ سکتا تھا۔ ان دنوں وہ نہ جانے کن وہموں میں پڑ گئی تھی۔

"مجھے آپ کو کچھ بتانا ہے۔" بہت دیر کی کوشش کے بعد مالا نے بالآخر بولنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ اسے آفاق کے کرتوت کھول کر بتانے کا ارادہ کر چکی تھی۔

"کیا.....؟" عیسیٰ بھی کچھ پریشان ہو گیا تھا۔

مالا کے تاثرات ہی کچھ ایسے تھے اور جو کچھ مالا نے بتایا اسے سن کر تو عیسیٰ کا پورا وجود ہل گیا تھا۔ اس نے بے یقینی کے ساتھ مالا کی طرف دیکھا تھا آیا وہ

حواسوں میں ہے یا پھر سچ میں خبطی ہو چکی ہے۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو......؟" عیسیٰ کا پورا وجود جھنجھنا اٹھا۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔ اس کھڑکی کے باہر کوئی سایہ تھا جسے میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا پھر میں نے آفاق اور سوزن کی آواز سنی تھی۔ میں نیند میں نہیں تھی، نہ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی تھی' میں نے خود ان دونوں کی باتیں سنی تھیں۔" مالا نے ہونٹ کچلتے ہوئے ایک، ایک بات بتا دی تھی مگر سامنے تو بے یقینی کا عالم ہی کوئی اور تھا۔ عیسیٰ پہلے تو ششدر رہ گیا پھر اس کے چہرے پر ناقابل فہم تاثرات ابھرے تھے۔ وہ آنکھیں پھاڑے مالا کو دیکھے جا رہا تھا۔ اتنی حیرت اور بے یقینی کے ساتھ گویا اسے پورا یقین تھا کہ مالا جھوٹ بول رہی ہے یا پھر غلط بیانی سے کام لے رہی ہے۔

"یہ کیا بکواس ہے مالا؟" عیسیٰ کی آنکھوں میں ناگواری کا تاثر تھا۔ اسے ایک دم مالا کی بات سن کر غصہ آ گیا۔

"پلیز آپ میری بات کا یقین کریں......" مالا ایک دم گھبرا اٹھی تھی۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ عیسیٰ اتنی شدت کے ساتھ بے یقینی کا اظہار کرے گا۔ وہ حیرت زدہ ہو جاتا تو اور بات تھی مگر وہ تو ایک دم غصے میں آ گیا تھا جیسے اسے مالا کی غلط بیانی پر غصہ آیا تھا اور مالا کو ٹھنڈے پسینے آنے لگے تھے۔ عیسیٰ کی ناگواری بھلا وہ برداشت کر سکتی تھی؟

"کس بات کا یقین کروں؟ تمہیں نہ جانے کیا ہو گیا ہے؟ اتنی بہکی بہکی باتیں کرنے لگی ہو، بس لیتا ہوں.... کسی سائیکاٹرسٹ سے ٹائم......" عیسیٰ نے جیسے پریشانی اور تفکر کے عالم میں سر تھام لیا تھا جبکہ مالا حق دق سی بیٹھی رہ گئی۔

"تو آپ کو لگتا ہے، میں جھوٹ بول رہی ہوں؟" مالا کی آنکھیں لبالب آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ عیسیٰ سے یہ دردناک منظر بھی دیکھا نہیں گیا تھا مگر اس نے دل پر پتھر رکھ کر کرخت لہجے میں کہا۔

"پھر "سچ" کہاں سے بول رہی ہو......؟" وہ رکھائی سے بولا۔

"میں جھوٹی ہوں......؟" اسے انتہا کا صدمہ ہوا۔

"مجھے نہیں پتا......" عیسیٰ نے سختی سے کہتے ہوئے اپنا سر تھام لیا تھا۔ "جب تم ایک ایسی بات کرو گی جس کا سر ہوگا نہ پیر......اور جس بات پر میں قیامت تک یقین نہیں کر سکتا اسے سچ کیسے کہوں......؟ مجھے انتہائی تکلیف سے کہنا پڑ رہا ہے تم نے پھر سے کوئی خواب دیکھا ہے۔" وہ اتنا متفکر اور پریشان ہو گیا تھا کہ اسے سامنے چھم چھم آنسو بہاتی مالا کی موجودگی بھی لمحے بھر کے لیے بھول گئی تھی۔

"میں نے اپنی آنکھوں سے سایہ دیکھا اور ان دونوں کی باتیں خود سنی تھیں۔" وہ بھرائے لہجے میں بولی بہت اذیت میں تھی۔ عیسیٰ اتنی بے دردی سے اس کی بات رد کر دے گا، یہ تو اس کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ وہ اتنی تکلیف محسوس کر رہی تھی جس کی انتہا کوئی نہیں تھی۔

"میں کیسے یقین کروں...... تم......تم پاگل تو نہیں ہو گئیں؟" عیسیٰ تیز لہجے میں غصے سے بولا۔

"سوزن اور آفاق ہی تھے، میں ان کی آواز لاکھوں میں بھی پہچان سکتی ہوں۔" مالا اب کمزور ہو کر عیسیٰ کو خود سے بدگمان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اب اسے ہر صورت عیسیٰ کو یقین دلانا تھا، چاہے کچھ بھی ہو جاتا۔ عیسیٰ اسے جھوٹا سمجھے لگتا یہ تو وہ کبھی گوارا نہیں کر سکتی تھی۔

"سوزن اور آفاق کیسے ہو سکتے تھے؟" عیسیٰ گویا زچ ہو اٹھا۔ "سوزن سنڈیکیٹ کے ہمراہ شہر سے باہر ہے اور آفاق......" عیسیٰ بولتے ہوئے ایک دم لب بھینچ کر غصہ ضبط کرنے لگا تھا پھر کچھ دیر کی

خاموشی کے بعد بولا۔

"اور آفاق میرے ساتھ تھا۔ ہم دونوں اسٹین (سٹی) میں تھے۔ ایک پل کے لیے وہ میری نظر سے دور نہیں ہوا اور نہ وہ چھلاوا ہے جو رات کے چند گھنٹے مجھے چکما دے کر دوبارہ میرے ہی گھر میں آکر سوزن سے ملاقات کرے..... پھر اسے سوزن سے ملاقات کی ضرورت ہی کیا ہے؟ سوزن کسی غیر مسلم سے ہی شادی کرے گی، کسی مسلمان سے بھی نہیں..... پھر وہ ایسی لڑکی نہیں جو بوائے فرینڈز کے ساتھ وقت گزاری کرے..... اور سب سے بڑی بات ان دونوں کو "ملاقات" کرنا ہوتی تو کم از کم میرا گھر استعمال نہیں کرتے..... پھر بتاؤ، جب آفاق سارا وقت میرے ساتھ رہا..... ہم پوری رات ٹرین میں سفر کرتے رہے ہیں، نہ اسے نیند آتی ہے سفر میں نہ مجھے..... تو پھر آفاق کوئی جنات کی قوم سے ہے جو لمحوں میں اڑتا ہوا ہر جگہ پہنچ جائے۔" عیسیٰ کا تلخ لہجہ اور کھری، کھری باتوں نے مالا کی پوری آنکھیں کھول دی تھیں۔ اس پہلو پہ مالا نے سوچا ہی کہاں تھا.....؟ بلکہ ان دونوں کی آوازیں سن کر وہ ایسی حواس باختہ ہوئی تھی کہ فقط ایک ہی پہلو پر سوچ رہی تھی۔

"عیسیٰ! آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔" وہ بھل بھل رونے لگی تھی۔ عیسیٰ سر اٹھا کر جیسے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگا تھا پھر کرنٹ کھا کر سیدھا ہوا۔ دوسرے ہی پل وہ کارپٹ پہ جھکا مالا کو چپ کروا رہا تھا۔

"کیا پاگل پن ہے مالا.....! میں نے یہ سب کہا تم سے.....؟" وہ اس کے آنسو پونچھتا خود بھی جیسے الجھ رہا تھا۔ گویا یقین اور بے یقینی کے درمیان معلق تھا۔ مالا کے چہرے کو دیکھتا تو وہاں سچائی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا اور اگر دوسری طرف غور کرتا تو دماغ چکرانے لگتا تھا، آفاق اور سوزن دو الگ دنیاؤں کے لوگ تھے۔ ان کے درمیان کبھی ملاقاتوں کا ریلیشن نہیں رہا تھا پھر عیسیٰ کے گھر میں ملاقات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا جبکہ مالا جو بات کر رہی تھی اسے عیسیٰ بھلا کیسے مان لیتا.....؟

☆☆☆

اس کی اتنی ابتر کنڈیشن دیکھ کر علی عیسیٰ نے ماہر نفسیات سے رجوع کرنا شروع کیا۔ وہ ہر ڈاکٹر سے یہی کہتا..... "میری بیوی وہم اور خوف کا شکار ہے۔" اس کے لیے مالا کی صحت ہر دنیاوی کام سے اہم ہوتی چلی گئی تھی۔ وہ دفتر میں کم اور ڈاکٹرز کے کلینک میں زیادہ خوار ہونے لگا تھا۔ کبھی پاپا کو اسپتال لے کر بھاگتا، کبھی مالا کو..... اس کی زندگی کا مقصد گویا یہی رہ گیا تھا۔ مالا عیسیٰ کی حالت دیکھ، دیکھ کر کڑھتی تھی پھر خود ہی اس نے ایک پہاڑ جتنا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہی کہ وہ عیسیٰ کو اپنے خوف کے متعلق کچھ نہیں بتائے گی۔ اس فیصلے نے مالا کو مطمئن کر دیا تھا اور اب وہ اندر ہی اندر گھلتی رہتی مگر عیسیٰ کو کچھ نہ بتاتی۔ اس کی بہتر حالت کو دیکھ کر آفاق سمیت چاچو اور عیسیٰ نے بھی سکھ کی سانس لی تھی۔ پھر کچھ دن بہت اچھے گزرے..... عیسیٰ نے مالا کو دوبارہ شولے جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اب وہ پھر سے شولے چلی جاتی۔ کلاسز اٹینڈ کرتی..... اس کا کورس بھی مکمل ہونے کے قریب پہنچ گیا تھا۔ پھر ایک دن اس نے میکس کو پکڑ لیا..... وہ اور ہیرا کینٹے سے لوٹ کر آئیں تو میکس پر ان دونوں کی نظر پڑ گئی تھی پھر مالا نے میکس کے وہ لتے لیے کہ وہ تو بے چارہ حق دق رہ گیا تھا۔

"تم بوواریا کے انسٹی ٹیوٹ میں ڈچ پڑھاتے تھے اور اب یہاں ڈچ سیکھتے ہو، یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی؟" مالا کے خطرے نے میکس کو بوکھلا دیا تھا تاہم وہ گھبرایا نہیں تھا۔ مالا جو سمجھ رہی تھی وہ میکس کو لاجواب کر دے گی، اس کا جواب سن کر چپ سی ہو گئی۔

"میں یہاں ڈچ پڑھنے نہیں آتا، یہ تم سے کس نے کہہ دیا، ضروری تو نہیں، میں یہاں ڈچ ہی

پڑھوں...... مجھے کچھ اور زبانیں سیکھنے کا بھی چسکا ہے۔ میں آج کل، عربی اور افریقی لینگویج کورس کررہا ہوں ......'' میکس نے اطمینان سے کہا تھا۔ مالا اپنا سا منہ لے کر رہ گئی تھی اور میکس یوں دانت نکال رہا تھا جیسے مالا کو لاجواب کر کے لطف اندوز ہورہا ہو۔

''اور تم مون کو کب سے جانتے ہو......؟'' مالا نے پھر سے ذرا چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''کافی عرصہ پہلے سے......'' میکس نے.... بے پروائی سے بتایا تھا پھر جیسے کچھ یاد آنے پر بولا۔

''تم نے میری برتھ ڈے پارٹی پر ضرور آنا ہے......اور ہیرا کو تو کہنے کی ضرورت نہیں۔'' اب وہ ہمیشہ کی طرح سادگی سے بتا رہا تھا بلکہ یاد دلا رہا تھا کہ مالا کہیں بھول نہ جائے...... ہیرا نے پرجوش انداز میں حامی بھرلی تھی جبکہ مالا کچھ الجھتی ہوئی پلٹ آئی۔

جب وہ گھر آئی تو نمی نے بتایا کہ چاچو کے کچھ مہمان آئے ہیں، مالا نے یہی سمجھا تھا کہ مہمان دو چار تو ضرور ہوں گے مگر ڈرائنگ روم میں جھانکنے کے بعد اسے پتا چلا کہ مہمان صرف ایک ہی ہے اور وہ بھی عیسیٰ کا انتہائی ناپسندیدہ...... مالا کو مہمان کی خصوصیات کے بارے میں علم نہیں تھا۔ وہ کون تھا......؟ اور اتنے عرصے میں پہلے کیوں نہیں آیا؟ مالا کو ان باتوں کی طرف دھیان دینے کی بھلا ضرورت ہی کیا تھی۔ اس نے معمول کے مطابق ڈرائنگ روم میں چائے کے لوازمات بھیجے اور پھر خود نمازِ ظہر ادا کرنے لگی تھی۔ آخری سلام پھیرنے کے بعد اس نے کوئی ناگوار سی آوازیں ابھرتی سنی تھیں جیسے کوئی غصے میں تیز تیز بول رہا تھا۔ مالا نے جانماز لپیٹ کر شیلف پر رکھی پھر سلیپر پہن کر جلدی سے باہر آگئی۔ نمی کچن میں مصروف تھی اور اس شور سے قطعاً بے نیاز اپنے کام میں مصروف تھی گویا جو کچھ ہو رہا تھا اس کی بلا سے ہوتا رہتا۔ مالا تقریباً بھاگتے ہوئے لاؤنج میں پہنچی تو وہاں عیسیٰ اور چاچو دونوں کو دیکھ کر ایک دم رک سی گئی۔ لاؤنج کے ایک صوفے پر سر جھکائے آفاق بھی بیٹھا تھا جبکہ عیسیٰ بہت غصے کے عالم میں زیر لب کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ اس کی بڑبڑاہٹ مالا کے کانوں تک بھی پہنچ گئی تھی۔

''پروفیسر کیوں آیا تھا یہاں......؟ آپ نے اسے دھکے دے کر کیوں نہیں نکالا......؟'' عیسیٰ کی زہر میں بجھی آواز سن کر مالا ٹھٹک گئی تھی۔

''تو کیا وہ آدمی پروفیسر بشر تھا......؟'' مالا گویا سرتاپا حیران رہ گئی تھی۔ پروفیسر بشر کو دیکھنے کی سعادت سے محروم رہنے کا بھی اسے قلق تھا۔ وہ ذرا آگے بڑھ کر پردے کی اوٹ میں ہوگئی تھی۔ اس نے کان اندر کی آواز پر لگا دیے تھے۔ چاچو بجھی آواز میں گویا صفائی پیش کررہے تھے۔

''پرانی دوستی کا لحاظ تھا...... پھر گھر سے کیسے نکال دیتا......؟ میری احوال پرسی کے لیے آیا تھا۔'' چاچو کی آواز بہت ہلکی تھی جیسے انہیں بھی پروفیسر کا آنا پسند نہیں آیا تھا مگر وہ مہمان کا لحاظ کر کے خاموش ہوگئے تھے۔

''شیطان کی اولاد ہے...... ایک دم خبیث انسان...... پھر کسی سازش کے تحت آیا ہوگا...... آئندہ مجھے پتا چلا کہ وہ میرے گھر آیا ہے تو یہ اس کے حق میں بالکل اچھا نہیں ہوگا......'' عیسیٰ نے گویا وارننگ دی تھی پھر لمبے، لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا تھا۔ چاچو بے چارے سنجیدہ سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے تھے۔ بس لاؤنج میں آفاق رہ گیا تھا۔ جس نے مالا کی موجودگی محسوس کرلی تھی پھر اسے باہر کی طرف جاتا دیکھ کر خود بھی پیچھے آگیا تھا۔ مالا تالاب کی طرف جا رہی تھی۔ پھر تالاب کے اونچے کنگرے پر بیٹھ کر سر جھکائے کسی سوچ میں ڈوب گئی۔ آفاق بھی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اس کے قریب آگیا تھا پھر جس طرح مالا قدموں کی آہٹ پر حواس باختہ ہو

کر چکی تھی۔ آفاق سے یہ منظر بھلائے نہیں بھولا تھا۔ وہ بہت خوف زدہ نظر آئی تھی...... یعنی اس کے چہرے پر جو پہلا تاثر ابھرا تھا وہ خوف کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ وہ سہم گئی تھی۔ یعنی آہٹیں اسے سہا دیتی تھیں۔ وہ ذہنی طور پر شکستہ ہو رہی تھی۔ اس بات سے کوئی واقف نہیں تھا، وہ اپنے خول میں سمٹ رہی تھی اس بات سے بھی کوئی واقف نہیں تھا۔ فی الوقت مالا، آفاق کو دیکھ کر کچھ سنبھلی تھی۔ یہ قدموں کی چاپ کسی غیر مرئی مخلوق کی نہیں تھی، تبھی اس کے چہرے پر سکون اتر آیا تھا مگر یہ سکون لمحاتی تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ غصے کے ساتھ آفاق سے مخاطب تھی۔

''کیوں آئے ہو......؟ کوئی کام تھا تو نینی سے کہتے......؟'' مالا کے چہرے پر غصے کی شکنیں تھیں۔ آفاق کچھ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا تھا۔ وہ وجہ جاننے سے قاصر تھا کہ مالا کی اسے دیکھ کر طبیعت کیوں بگڑ جاتی ہے اور مالا کو پچھلی کئی راتوں کی اذیت بھلائے نہیں بھولتی تھی پھر اس کی مکاری اور سوزن کے ساتھ اس گھر میں ملاقات نے تو مالا کے حواس معطل کر دیے تھے پھر سونے پر سہاگا نینی اس کی بات سرے سے مانتا ہی نہیں تھا۔

''مالا! تمہیں کوئی الجھن ہے تو بتاتی کیوں نہیں......؟ کیا حقیقت میں تمہیں کچھ سنائی یا دکھائی دیتا ہے؟'' وہ متفکر سا پوچھ رہا تھا۔ تب مالا نے سر جھٹک کر کہا۔

''ہاں......نظر تو بہت کچھ آتا ہے۔۔۔۔'' اس کا انداز بلا کا معنی خیز تھا۔

''کیا......؟'' وہ سمجھے بغیر بولا۔

''بہت جلد جان جاؤ گے......'' مالا نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا تھا تب آفاق ایک مرتبہ پھر سمجھے بغیر کہہ رہا تھا۔

''کیا مجھے بھی کچھ نظر آئے گا......؟'' اس نے مسکرا کر پوچھا۔

''کچھ نہیں، بہت کچھ......'' مالا دو ٹوک لب، لہجے میں بولی تھی تب آفاق شوخ سا ہو گیا۔

''پریاں نظر آئیں تو بات بھی بنے......'' وہ مسکراتے ہوئے من ہائیم کے بادلوں کو دیکھنے لگا...... گہرے ہوتے بادل...... جیسے برسنے کو.... بے تاب ہوں...... مرغابیوں کے غول محو رقص تھے، سفید دودھ جیسی کونجیں گا رہی تھیں۔

''پریاں بھی دکھائی دے جائیں گی۔ تمہیں فکر کس بات کی ہے؟'' مالا نے تلخی سے پوچھا۔ آفاق کے انجان پن پر اسے سخت تاؤ آ رہا تھا۔ جبکہ وہ اس کا تلخ مزاج سمجھے بغیر پرانی جون میں بولے جا رہا تھا۔

''میں انی سے مخلص ہوں، محبت کرتا ہوں اور عنقریب نینی ہماری شادی کروا رہا ہے، تم بدروحوں اور پریوں کے چکر سے نکلو تو کچھ نظر بھی آئے۔ تمہیں اپنی چھوٹی بہن بنایا تھا اور پہلی پانچ سگی بہنوں سے زیادہ پروٹوکول دیا...... پر تم تو سوتیلی بہنوں سے بھی بڑھ کر بے مروت نکلی ہو۔'' آفاق بے ساختہ شکوہ کر اٹھا۔ دراصل مالا کے بدلتے تلخ رویے نے نینی کے ساتھ، ساتھ آفاق کو بھی خاصا اپ سیٹ کر رکھا تھا۔ کہاں تو وہ اتنی دلچسپی لیا...... کرتی تھی۔ اس کی شادی اور محبت کی اسٹوری میں اور کہاں اتنی بیزار ہو چکی تھی کہ بات بھی کرتی تو سات پتھر اٹھا کر...... یہ صورت حال آفاق کے لیے بھی بہت پریشان کن تھی۔

''تمہاری بات طے ہو گئی......؟'' مالا گویا چیخ پڑی۔ یعنی اس کی بے خبری میں انی کی ذات پر کیسا ظلم ہونے والا تھا۔ مالا کی تو گویا جان ہی نکل گئی تھی۔ وہ تو کسی بھی صورت آفاق جیسے منافق کے ساتھ انی کو برباد ہوتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔

''نہیں...... ہونے کے قریب پہنچ گئی تھی مگر تمہاری وجہ سے سب پروگرام چوپٹ ہو گیا۔'' آفاق کا منہ اتر گیا تھا۔ تاہم وہ اسی بات پر خوش تھا

کہ مالا اس کے ساتھ بات تو کر رہی ہے۔ ورنہ اتنے دن سے آفاق کو دیکھ کر راستہ بدل جاتی تھی۔ سیدھے منہ بات نہیں کر رہی تھی۔ جانے اسے کیا ہو گیا تھا۔

''میری وجہ سے؟'' مالا چونکی۔

''تو اور کیا......؟'' آفاق نے پھر سے برا سا منہ بنایا۔

''کیوں؟'' وہ حیران ہوئی تھی۔

''لو جی..... کیوں کا بھلا کیا سوال......؟ عینی کو ڈاکٹرز کے ہاں چکر لگانے سے فرصت ملے تب ناں.....'' آفاق پھولے منہ سے گویا ہوا۔ وہ سر جھکائے گھاس نوچ رہا تھا جبکہ چہرے پر مصنوعی خفگی تھی۔

''تمہارے گھر والے مان گئے......؟'' مالا متحیر رہ گئی۔ تو گویا اس کی بے خبری میں اتنا بڑا نقصان ہونے والا تھا۔ صد شکر کہ اس کی بیماری میں معاملہ التوا میں پڑ گیا تھا۔

''عینی نے بات کی تھی، مانتے کیوں نہیں......'' وہ اترایا۔ ''اب تم روحوں کو بھاڑ میں جھونک کر جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ...... پھر چھوٹی سی نکاح کی تقریب رکھیں گے۔'' آفاق لمحوں میں پرجوش ہو چکا تھا۔ مالا کی کیفیات سمجھے بغیر اپنا اگلا پروگرام اسے بتا رہا تھا جبکہ مالا کچھ دیر کے لیے تو گم صم ہو کر رہ گئی تھی۔ تو گویا انی کو ڈوبنے سے وہ ہرگز بچا نہیں سکتی تھی۔

☆☆☆

وہ انی کو بھلا بچاتی بھی کیسے؟ اس کی ممی تو گویا سب تیاریاں مکمل کر چکی تھیں...... عینی اور آفاق کے جاتے ہی وہ انی کے گھر آ گئی۔ ہمیشہ کی طرح انی کی ممی اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھیں۔ وہ ایک بااخلاق، مہمان نواز خاتون تھیں اور مالا کو تو خصوصی اہمیت دیتی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد ہنستی مسکراتی انی بھی آ گئی تھی۔ اس کے انتہائی نفیس نقوش میں سرخیاں اتر آئی تھیں۔ چمکیلی آنکھیں اور مسکراتے ہوئے لب بتا رہے تھے کہ وہ اپنی شادی کے قریب آنے پر بہت خوش تھی۔ مالا سے اس کی خوشی میں بدمزگی گوارا نہ ہو سکی تھی مگر وہ اتنی پیاری لڑکی کو بے خبری کے عالم میں برباد ہوتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ بہت دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد مالا کو بالآخر بولنے کے لیے کچھ الفاظ مل ہی گئے تھے پھر اس نے جھجکتے ہوئے گفتگو کا آغاز کر لیا تھا۔

''تمہیں آفاق سے بہت محبت ہے انی......؟''

مالا نے ذرا جھجک کر پوچھا تھا۔ حالانکہ یہ سوال پوچھنے کی ضرورت تو ہرگز نہیں تھی۔ انی کی خوشی اس کے اندر کا حال بتا رہی تھی پھر اس کی ہر بات آفاق سے شروع ہو کر آفاق پر ختم ہوتی تھی۔ مالا کا سوال سن کر وہ اس وقت بھی چونکی نہیں تھی بلکہ بہت جوش کے عالم میں بتانے لگی۔

''ہاں...... بہت محبت کرتی ہوں، آفاق ہے بھی تو بہت اچھا......'' اس نے چمکتی آنکھوں سے بتایا۔ وہ اتنی خوش اور پرجوش تھی کہ مالا کا ارادہ ڈانواں ڈول سا ہو گیا۔

''کسی کے اچھا ہونے کی کیا کوئی دلیل ہوتی ہے؟'' مالا نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔

''یار! کسی کی اچھائی کو دیکھنے کے لیے دلیل نہیں ڈھونڈتے بلکہ اس کی شخصیت کی اچھائیاں دیکھتے ہیں اور آفاق بہت اچھا ہے۔'' انی نے گویا اسے سمجھانے کے ساتھ، ساتھ آفاق کی تعریف کرنا بھی ضروری سمجھا تھا۔

''اور اچھائی کو ناپنے والا کوئی پیمانہ ہوتا ہے؟'' مالا نے الجھ کر بھی پوچھا تھا۔ انی اس کی بات پر کسی سوچ میں ڈوب گئی۔

''میڈیشن مالا......! اچھائی کو ناپنے والا کوئی پیمانہ نہیں ہوتا۔ بس دیکھنے والی آنکھ ہوتی ہے جو اچھائی اور برائی کو کھوج لیتی ہے۔'' انی نے کچھ دیر بعد بہت نرمی سے گویا اسے سمجھایا تھا جبکہ مالا کچھ اور الجھ گئی تھی۔

"ضروری تو نہیں ہر اچھا دکھائی دینے والا بندہ مخلص ہو۔۔۔کیا خبر، وہ ڈراما کرتا ہو یا اچھائی کے لباس کو پہن کر بھیس بدل کے کسی کو اپنے سازشی جال میں پھنسانا چاہتا ہو۔" مالا کی گہری کاٹ دار سی بات نے انی کو کچھ چونکا دیا تھا۔ تاہم وہ کندھے جھٹک کر بے پروائی سے بولی تھی۔

"دلوں کے بھید تو بس اللہ ہی جانتا ہے۔" وہ شاید مزید بحث نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مگر مالا کا دل ابھی مطمئن نہیں ہوا تھا۔ وہ بات کو کسی نہ کسی طریقے گھما پھرا کر آفاق تک لانا چاہتی تھی مگر ہمت یوں نہیں ہو رہی تھی کہ اسے انی کی خوشی کو ختم کر دینے کی تکلیف بھی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ انی کا دل ٹوٹے یا وہ پریشان ہو۔

"ویسے بھی کسی کی اچھائی جاننے کے لیے دل کا مطمئن ہونا بھی ضروری ہے جیسا کہ میں نے خود آفاق کو پروپوز کیا تھا اور یہ اس کی اچھائی تھی جو آج تک اس نے کسی کو بتایا نہیں..... حتیٰ کہ ممی کو بھی نہیں..... تمہاری فیملی سے تو وہ سب کچھ شیئر کر لیتا ہے پھر یہ بھی تو دیکھو، وہ کتنا پُرخلوص ہے۔ اس کی موجودگی میں کوئی مسئلہ جنم لے اور وہ اسے حل نہ کرے یہ ممکن نہیں..... میرا بھائی یہاں نہیں اور سمجھو، اس نے بہت سے ہمارے بوجھ بٹا رکھے ہیں۔" انی نے نہایت عقیدت کے ساتھ آفاق کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا۔ ویسے بھی مالا کو لگ رہا تھا کہ انی کی آنکھوں پر آفاق کی محبت اور اچھائیوں کی پٹی بندھ چکی ہے۔ وہ اس کی بات کبھی نہیں سمجھے گی۔

"ضروری تو نہیں ہر بلند نظر آنے والا بندہ حقیقت میں بھی بلند ہو..... ہر چمکتی چیز سونا بھی تو نہیں ہوتی۔" مالا دبے لفظوں میں بالآخر کہہ ہی گئی تھی۔

"شاید تم بھی ٹھیک کہتی ہو، پر آفاق نے کوئی دکھاوا نہیں کیا۔" انی سنجیدگی سے بولی تھی۔ شاید وہ مالا کی بات کے اندر کی گہرائی میں اتر گئی تھی پھر اس نے کچھ سنجیدگی بھرے لہجے میں جتایا تھا۔ "تم وہ بات کرو جو کہنا چاہتی ہو۔" وہ سنجیدہ تھی جبکہ مالا نے بھی چپ رہنا مناسب نہیں سمجھا۔

"پیاری انی! تم مجھے بہت عزیز ہو...... میں چاہتی ہوں تمہارا بھائی واپس آ جائے، آفاق کے حوالے سے کچھ اور چھان بین کر لو، عمر بھر کے فیصلے اتنی عجلت میں نہیں کرنے چاہئیں۔" مالا نے اسے رسان سے سمجھایا تھا تب انی گویا اس کے خدشات سمجھ گئی تھی۔

"مجھے تمہارا تفکر بہت اچھا لگا...... میرے دل میں تمہاری محبت اور بھی بڑھ گئی ہے۔" انی نے سچے دل سے محبت بھرے لہجے میں کہا تھا۔

"مگر یار! میرے بھائی کے آنے میں بہت وقت ہے، پھر بھائی اور ممی دونوں کا مشترکہ فیصلہ ہے۔ آفاق نے بھائی سے بات کر لی ہے۔ اسے بھی آفاق بہت اچھا لگا ہے کیونکہ عینی کی گارنٹی بھی موجود ہے۔" وہ مسکرا کر گویا اسے تسلی دے رہی تھی۔

"انی...... کیا خبر، وہ نیشنلٹی کا لالچ بھی رکھتا ہو۔" مالا نے کچھ اور وسوسوں کا اظہار کیا تھا جس پر انی کچھ اور بھی مسکرا گئی تھی بلکہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی تھی۔ اس کے قہقہے نے مالا کو کچھ اور ہونق کر دیا تھا۔ وہ اس کے قہقہے کو سمجھ نہ پائی تھی۔

"اگر ایسی بات ہے تو کچھ غلط نہیں...... اسے نیشنلٹی مل جائے گی مگر اتنی آسانی سے نہیں۔" انی ابھی تک ہنس رہی تھی پھر اسے مزید بتانے لگی۔

"یار! میری نانی بھی میرے پاپا کو نیشنلٹی ملنے پر خدشات کا شکار تھیں۔ وہ پاپا کے پیپرز نہیں بننے دے رہی تھیں۔ انہیں خدشہ تھا پیپرز بننے کے بعد پاپا ممی کو اور ہمیں چھوڑ جائیں گے مگر ایسا نہیں ہوا۔ پاپا ہمیشہ ہمارے رہے، نانی کے خدشے بے بنیاد تھے۔ سو آفاق بھی مجھے کبھی دھوکا نہیں دے گا۔" وہ اتنی مطمئن تھی کہ مالا کو اس کے اطمینان پر رشک آیا تھا۔

اس نے دل ہی دل میں اس کا اعتماد قائم رہنے اور خوشیاں برقرار رہنے کی دعا کی تھی۔

''اللہ کرے، آفاق بہت اچھا رہے تمہارے ساتھ۔'' مالا نے سچے دل سے دعا دی اور جانے کی اجازت چاہی۔

وہ لاؤنج میں داخل ہوئی تو عیسیٰ مسکراتا ہوا اسے سامنے سے آتا نظر آیا۔ اس نے ہاتھ میں ٹرے پکڑ رکھی تھی۔ شاید وہ کچن سے نکل کر باہر آ رہا تھا۔ ٹرے میں کیک، چائے اور سنیکس تھے۔ مالا نے فوراً آگے بڑھ کر ٹرے پکڑ لی تھی۔

''گھر میں کوئی آیا ہے؟'' اس نے حیران ہو کر پوچھا تھا۔ وہ عیسیٰ کے پیچھے سٹنگ روم کی طرف جا رہی تھی۔ عیسیٰ نے اثبات میں سر ہلایا۔

''سوزی آئی ہے۔'' عیسیٰ کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔ وہ اور سوزن جانے کس موضوع پر بات کر رہے تھے۔ دونوں کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔ تاہم مالا نے نوٹ کیا تھا، سوزی کچھ الجھی، الجھی سی بیٹھی ہے، مالا کو دیکھ کر اگرچہ اس نے جوش اور محبت کا مظاہرہ کیا تھا مگر وہ کچھ بجھی، بجھی سی لگ رہی تھی جبکہ مالا کے تو اندر باہر آگ کے بھانبڑ بھڑکنے لگے تھے۔ جیسے اس رات کا ایک، ایک سین دوبارہ اس کی نگاہ میں جم گیا تھا۔ سوزی اور آفاق کی آوازیں کھیوں کی طرح بھنبھنا رہی تھیں۔ مالا کی آنکھوں میں سرخی اترنے لگی۔

''دھوکے باز، منافق لڑکی۔'' اس نے زیرِ لب بڑبڑا کر کہا۔ وہ دونوں پھر سے باتوں میں مصروف ہو چکے تھے۔ جبکہ مالا اس پر لعنت بھیج کر جانے کے بجائے وہیں صوفے پر ٹک گئی تھی۔ اب وہ بڑے غور سے سوزن کے سرخ ابھرے گالوں کو دیکھ رہی تھی۔ چکنا سا مکھن کی ٹکیہ جیسا چہرہ..... سر کو سکارف سے اب بھی ڈھکا ہوا تھا، پیچھے کی طرف جیسے رومال کو گرہ لگا رکھی تھی۔ اس کی سوتی روک کی فرل فرش کو چھوتی تھی۔ مالا بنا دیکھے بھی جانتی تھی اس نے گھریلو آرام دہ چپل پہنی ہوگی۔ وہ قدرے مضطرب تھی اور عیسیٰ سے گفتگو کے دوران کبھی، کبھی مالا پر بھی نگاہ ڈال لیتی تھی۔ جانے وہ دونوں کس ٹاپک پر بات کر رہے تھے۔ مالا چونکی تو تب جب عیسیٰ نے ایک ایسا موضوع چھیڑا جس کی مالا کو توقع تھی اور نہ سوزن کو..... وہ دونوں کچھ متحیر سی عیسیٰ کو سن رہی تھیں۔

''میری سالگرہ والی شام تحفہ تم نے مجھے دینا تھا یا مالا کو......؟ کتنی کنجوس ہو تم...... اگر ایک سینٹ یا شرٹ مجھے بھیج دیتیں تو میری بیوی کے سامنے کچھ عزت بن جاتی۔ کیا سوچتی ہوگی مالا! ان لوگوں میں کزنز فرینڈشپ تو ہے ہی نہیں۔'' عیسیٰ نے جس قدر سادگی بھرے لہجے میں شکوہ کیا تھا سوزی کے جواب نے عیسیٰ اور مالا کو اسی قدر سن کر کے رکھ دیا۔

''تحفہ......؟ کون سا تحفہ......؟ میں تو آج تک شرمندہ ہوں۔ مالا کو کوئی تحفہ نہیں دے سکی۔'' سوزن نے سر جھکا کر جیسے اعترافِ جرم کیا تھا۔ مالا کی سانس تک حلق میں اٹک گئی...... یہ سوزی کیا کہہ رہی تھی۔ سوزی ... کتنی جھوٹی تھی۔ کتنی منافق تھی؟ اس نے خود فون پر مالا کو بتایا تھا کہ اس نے اسے تحفہ بھیجا ہے پھر اب عیسیٰ کے سامنے کیوں مکر رہی تھی؟ سوزی یہ سب کیا کر رہی تھی؟ مالا کے ساتھ کون سا کھیل کھیلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اتنا بڑا جھوٹ وہ بھی ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ کر...... اتنی شدید غلط بیانی؟ تحفہ بھیج کر مکر جانا کوئی معمولی بات تھی۔ مالا کو لگا وہ دھڑام، دھڑام تباہ و برباد ہو جائے گی۔ وہ فنا ہو جائے گی۔ اس نے بے یقینی کے عالم میں سوزن کو دیکھا تھا۔ وہ اب بھی انکاری تھی اور عیسیٰ جیسے سنبھل کر پوچھ رہا تھا۔

''پھر مالا کو تحفہ کس نے بھیجا؟'' عیسیٰ کے ماتھے پر شکنیں تھیں اور لہجہ اتنا سخت اور کھردرا تھا کہ مالا کا اندر تک ہل گیا۔

"یہ تو تم مالا سے پوچھو، پر یقین مانو..... میں نے مالا کو تحفہ کچھ بھی نہیں بھیجا۔" وہ سادگی بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی جبکہ مالا کو وہ کوئی چالاک لومڑی نظر آرہی تھی۔ اس کا دل چاہا، وہ اٹھ کر سوزن کا منہ نوچ لے۔ مگر اس کی ہمت جیسے نچڑ کر رہ گئی تھی۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے عیسیٰ کو دیکھا تھا۔ وہ مالا کو ہی دیکھ رہا تھا۔ گویا اس کے کچھ بولنے کا منتظر تھا۔

"بولو مالا......! تم نے تو کہا تھا سوزی سے فون پر بات ہوئی تحفہ سوزن نے ہی بھیجا تھا۔ پھر یہ کیوں غلط بات کررہی ہے۔" عیسیٰ کے لہجے میں نرمی تھی۔ وہ بڑے مان بھرے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ جیسے ابھی مالا تردید کردے گی۔ جیسے ابھی مالا، سوزن کو جھوٹا ثابت کردے گی مگر مالا کچھ بھی نہیں کرسکی..... اسے لگا، وہ گہری آنکھیں جو اس کی تاک میں لگی رہتی تھیں، اسے لحہ بہ لحہ عیسیٰ کی نظر سے گرا رہی تھیں۔ وہ گرتی جارہی تھی..... گرتی جارہی تھی۔ وہ کھائی میں گرتی جارہی تھی۔

"بولتی کیوں نہیں ہو مالا!" عیسیٰ اٹھ کر اس کے برابر آبیٹھا تھا۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کی مذاق میں کہی بات اتنی سنجیدہ صورت اختیار کرجائے گی۔ وہ تو سوزن کو جھجکا رہا تھا کہ کبھی اسے عیسیٰ کو برتھ ڈے وش کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹ گیا۔ وہ بے نام تحفہ جو اس وقت بھی اس کے ذہن کو الجھا گیا تھا۔ ایک مرتبہ پھر سوالیہ نشان بن کر چیلوں کے سامنے ناچنے لگا تھا۔ مالا نے بتایا تھا وہ بے نام تحفہ سوزن کی طرف سے آیا ہے۔ اس کی سوزن سے فون پر بات ہوگئی تھی۔ سوزی نے شکریہ بھی وصول کرلیا اور اب وہ عیسیٰ کے مقابل بیٹھ کر صاف صاف مکر رہی تھی۔ عیسیٰ کو غصہ نہ آتا تو وہ اور کیا کرتا...... وہ اٹھا کر بریسلیٹ لے آیا تھا۔ جو توڑ مروڑ دیا گیا تھا۔ بھلا مالا نے سوزن کا تحفہ کوڑے میں کیوں پھینکا؟ اس نے تب نہیں سوچا تھا۔ وہ اب سوچ رہا تھا۔ آخر یہ تحفہ آیا کہاں سے

تھا؟ اسے یقین تھا مالا جھوٹ نہیں بول رہی......اور اسے یہ بھی یقین تھا سوزی غلط بیانی نہیں کرتی۔ پھر مالا کے منہ پر کیوں مکرتی؟ پھر جانے اصل "سچ" کیا تھا؟ عیسیٰ کا سر تو چکرانے لگا۔

ادھر مالا نفرت آمیز نظروں سے سوزی کو گھور رہی تھی۔ اس کا دل چاہا وہ اس کے سرخ چکنے ابھرے گال نوچ دے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ سوزی کی آنکھوں کو بھی پھوڑ دے...... بلکہ کوئی ایسا بھالا اس کے اندر اتارے کہ سوزی کو اس بھیانک جھوٹ بولنے کی سزا مل جائے۔ اس نے عیسیٰ کی آنکھوں میں بے یقینی اتری دیکھی تھی وہ بھلا چپ رہ سکتی تھی۔

"کتنی مکار لڑکی ہو تم......ایک دم شاطر اور چالباز......عیسیٰ کی نظر سے مجھے گرانے کے لیے کتنی گھٹیا حرکت کی ہے تم نے...... آئی ہیٹ یو..... دل چاہتا ہے تمہارے منہ پر تیزاب پھینک دوں......تم نے خود فون پر مجھے بتایا، میں نے تمہارا شکریہ ادا کیا تھا تب تم نے انکار کیوں نہ کیا......؟ تم نے آج انکار کردیا۔ تم آج عیسیٰ کے سامنے مکر گئی ہو تاکہ عیسیٰ کا اعتبار مجھ پر قائم نہ رہ سکے، عیسیٰ مجھ سے نفرت کرنے لگے۔ عیسیٰ سمجھے کہ میں ایک جھوٹی لڑکی ہوں..... یہ مجھ پر کبھی اعتبار نہ کرے اور میں عیسیٰ کے دل اور نگاہ سے اتر جاؤں۔" مالا ہذیانی انداز میں چیخنے لگی تھی۔ اس کے آنسو بھل بھل گر رہے تھے اور وہ اپنے بالوں کو نوچتی حواسوں میں نہیں لگ رہی تھی۔

"میں ایسا کیوں چاہوں گی، تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔" سوزن اور عیسیٰ دونوں گھبرا گئے تھے۔ عیسیٰ، مالا کے لیے پانی لینے کچن کی طرف بھاگا تھا جبکہ مالا مسلسل چیختے جارہی تھی۔

"تم ایسا ہی چاہو گی...... میرے خلاف سازشیں کرتی ہو، تم انتہائی خبیث ہو، یہ میں ہی تھی جو تمہیں جان نہیں سکی۔ تمہارا کریہہ روپ دیکھ نہیں پائی۔" مالا ہانپتے ہوئے زہر خند ہورہی تھی جبکہ سوزن

کا سرخ چہرہ آگ کے مانند تپنے لگا تھا۔ مالا کے الفاظ نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

''مالا...... اتم پاگل ہو چکی ہو۔'' سوزن نے تلخی سے کہا۔ ''بہت جذباتی ہو...... ایک دم احمق اور بدھو......'' عیسیٰ کو آتا دیکھ کر وہ خاموش ہو گئی تھی مگر اس کے چہرے کی تپش ختم نہیں ہوئی۔

''ہاں، تم تو چاہتی ہو، میں پاگل ہو جاؤں، پہلے مجھے تحفے بھیجتی ہو...... پھر مکر جاتی ہو تا کہ میرے شوہر کو بدگمان کر سکو۔'' مالا چنگھاڑی تھی۔ وہ مزاجاً ایسی نہیں تھی۔ اسے حالات نے مخبوط الحواس کر دیا تھا۔ عیسیٰ نے آگے بڑھ کر اسے زبردستی پانی پلایا تھا پھر سوزن کی طرف مڑ کر تلخی سے بولا۔

''پلیز سوزن! تم یہاں سے چلی جاؤ...... تمہاری وجہ سے مالا کی طبیعت بگڑ گئی ہے۔'' عیسیٰ کے انتہائی توہین آمیز الفاظ نے سوزن کو کپکپا کر رکھ دیا تھا۔ وہ اسے اپنے گھر سے نکل جانے کو کہہ رہا تھا۔ دوسرے معنوں میں وارننگ دے رہا تھا کہ اس کی وجہ سے مالا کی طبیعت بگڑی ہے اور سوزن دوبارہ یہاں نہ آئے۔ اس ذلت بھرے احساس نے اس کی آنکھوں کو نم کر دیا تھا مگر وہ پھر بھی ماننے کو تیار نہیں تھی کہ اس نے مالا کو تحفہ بھیجا ہے۔ وہ جاتے جاتے بھی اپنی صفائی میں کچھ بول گئی تھی جسے عیسیٰ نے سنا ہی نہیں۔ وہ تو مالا کی طرف متوجہ تھا۔ وہ اسے پچکار رہا تھا۔ نرمی اور پیار سے سمجھا رہا تھا۔

''میں تم سے کبھی بدگمان نہیں ہو سکتا۔ تمہارا جو مقام میرے دل میں ہے اسے کوئی بھی بدگمانی ختم نہیں کر سکتی اور نہ مٹا سکتی ہے۔ سوزن مکرتی ہے تو سو دفعہ مکر جائے۔ مجھے یقین ہے مالا جھوٹ نہیں بولتی۔'' عیسیٰ کے نرم پھوار جیسے الفاظ جاتی ہوئی سوزن کی سماعتوں میں بھی اتر گئے تھے۔ اس کے دل میں نیزے کی انی جا چبھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ عیسیٰ کے الفاظ سوزن کے منہ پر طمانچہ تھے۔ کبھی وہ کہتا تھا کہ سوزن جھوٹ نہیں بولتی، آج وہ کہہ رہا تھا کہ مالا جھوٹ نہیں بولتی۔ وقت انسان کو کیسے دوراہے پر لا کھڑا کرتا ہے۔ حالانکہ عیسیٰ اپنے ایمان اور یقین سے کہہ سکتا تھا مالا اور سوزن دونوں جھوٹ نہیں بولتیں...... اگر وہ ایسا کہہ دیتا تو کیا حرج تھا؟ مگر وہ ایسا نہیں بولا تو گویا اس کا یقین مالا پہ بھاری تھا۔ سوزن کا پلڑا ہلکا ہو گیا...... مالا اس کی بیوی تھی جبکہ سوزن صرف ایک کزن...... رشتوں میں فرق بہت تھا، اعتبار اور اعتماد کی نوعیت بھی کچھ اور تھی۔ اس نے فرش پر گرے بریسلیٹ کو دیکھا...... پھر جھک کر اسے اٹھا لیا۔ اس بریسلیٹ کی وجہ سے کتنے دلوں کا نقصان ہوا تھا۔ یہ تو کوئی نہیں جانتا تھا۔ ہاں، سوزن کا اعتبار مالا سے اٹھ گیا تھا اور مالا کا اعتبار سوزن سے اٹھ گیا تھا۔ ایک قرآن کی قسم کھا رہی تھی...... ایک مقدس انجیل کی قسم کھا رہی تھی۔ ان دونوں سے بھی زیادہ عیسیٰ مشکل میں گرفتار تھا۔ بھلا وہ ان دونوں میں سے کس کا یقین کرتا......؟ وہ دونوں ہی اپنی، اپنی جگہ درست تھیں شاید...... جانے غلط کیا تھا؟ جانے غلط کیوں تھا؟ اور کیسے ہو رہا تھا؟

عیسیٰ نے مالا کے لبوں سے پانی کا گلاس ہٹایا تو اس کی سماعتوں میں سوزن کی آواز اتری۔ وہ سینے پر صلیب کا نشان بناتی بھرائی آنکھوں سے پلٹ کر ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے لیے یہ منظر... بے انتہا اذیت ناک تھا۔

''مقدس انجیل کی قسم! یہ لڑکی خسارہ اٹھانے والی ہے، اسے انسانوں کی پہچان ہی نہیں۔'' سوزن کی دردناک آواز لاؤنج میں گونجتی رہ گئی تھی جبکہ وہ اپنی روک کو پیروں میں رولتی الٹے سیدھے قدم اٹھاتی کبھی اس گھر میں دوبارہ نہ آنے کے لیے چلی گئی تھی جبکہ لاؤنج اور سٹنگ روم کے سناٹوں کو محسوس کرتے یہ دو لوگ ایک دوسرے کو بے ساختہ پکار اٹھے تھے۔

☆☆☆

"مالا......!" اس نے مالا کا گال بے ساختہ تھپتھپایا۔

"عیسیٰ ......!" مالا نے گھبرا کر عیسیٰ کا اپنے گال پر رکھا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ وہ دونوں کچھ دیر کے لیے گم صم رہ گئے تھے۔ جیسے کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ چند لمحوں میں بھلا ہوا کیا تھا؟ عیسیٰ کو لگا جیسے یہ کوئی ڈرامے کا سین تھا جو فنافٹ منظر بدلا گیا۔ دو پل میں کیا سے کیا ہو گیا؟ سوزن کے چلے جانے کے بعد عیسیٰ کو احساس ہوا تھا کہ اس نے سوزن کو گھر سے نکال کر اچھا نہیں کیا...... غصے، جذباتیت اور جلد بازی میں اس نے سوزن کی بہت توہین کر دی تھی۔ عیسیٰ نے گروی کی محبت کا خیال رکھا اور نہ تا نتے کے پیار کو نظر میں رکھا..... پھر وہ اس کے گھر مہمان آئی تھی۔ مہمانوں کو یوں بے عزت کر کے گھر سے نکالنا عیسیٰ کے گھرانے کی روایت تو نہیں تھی۔ اسے سوزن کے ساتھ انتہائی معیوب سلوک کرنے پر اور بات گھر سے نکال دینے کی وجہ سے خود پر غصہ آ رہا تھا۔ غصہ حرام ہوتا ہے۔ اسے ان لمحات میں غصے کے نقصانات کا ادراک ہوا تھا۔ مگر وہ بھی کیا کرتا؟ سچویشن ہی ایسی تھی۔ مالا کی اذیت نے عیسیٰ کی سُدھ بدھ بھلا دی تھی۔ تبھی وہ سوزن پر الٹ پڑا تھا۔ اسے سوزن کے ساتھ اتنا تلخ رویہ نہیں رکھنا چاہیے تھا۔ عیسیٰ نے سوچا تھا، معمولی سے گفٹ کا تو معاملہ تھا۔ بات رفع دفع ہو جاتی تو بہتر تھا۔ اسے بات بڑھانی نہیں چاہیے تھی۔ مگر بات پھر بھی بڑھ چکی تھی۔ ادھر مالا ابھی تک اس کیفیت سے باہر نہیں آ رہی تھی۔ اسے سوزن پر شدید غصہ تھا۔ وہ اب بھی سسکاریاں بھرتی گھٹی، گھٹی آواز میں کہہ رہی تھی۔

"یہ کون سی جادوگری ہے علی عیسیٰ! یہاں اتنی انہونیاں کیوں ہوتی ہیں؟ میری سادہ سی زندگی میں اتنی الجھنیں کہاں سے آ گئی ہیں۔" وہ آنسو پونچھتی کراہ رہی تھی۔ یہ علی عیسیٰ کی ذات کا مان، تحفظ، محبت اور اعتبار ہی تو تھا جو وہ پھر سے بولنے کے قابل ہو چکی تھی۔ ورنہ جو کچھ سوزن نے اس کے ساتھ کیا تھا وہ نہ بھلایا جانے والا تھا اور نہ نظر انداز کیے جانے والا تھا۔ وہ جو سمجھ رہی تھی سوزن کے انکار اور مکر جانے کے بعد عیسیٰ اس سے بدگمان ہو جائے گا ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ اس نے گفٹ والے قصے پر مٹی ڈال دی اور مالا کو سختی سے تاکید کی کہ آئندہ اس گھٹیا قصے کا ذکر نہیں ہوگا۔ مالا کے دل میں عیسیٰ کی محبت پہلے سے چوگنی ہو گئی تھی۔ کبھی، کبھی اسے خود پر ناز ہونے لگتا تھا۔ وہ تو بہت حقیر سی لڑکی تھی اللہ نے اسے اتنا نواز دیا تھا جس کی نہ کوئی حد تھی اور نہ کوئی شمار تھا۔ سوزن تو یہی سوچتی ہوگی وہ عیسیٰ کو مالا سے بدگمان کر دے گی۔ آخر اس کی بات کا مطلب تو یہی تھا۔ عیسیٰ، مالا سے متنفر ہو جائے گا مگر پانسہ جیسے الٹ ہی گیا تھا۔ عیسیٰ نے مالا سے بدگمان ہونا تھا نہ ہوا۔ حالانکہ اس کے بعد کئی مرتبہ بے نام پارسل موصول ہوئے۔ چونکہ عیسیٰ کی غیر موجودگی میں آتے تھے سو مالا انہیں بنا دیکھے کوڑے والے ڈرم میں الٹ آتی تھی پھر بہت سارے دن دبے قدموں گزر گئے۔ عیسیٰ اسے اور چاچو کو شہر سے باہر گھمانے لے گیا تھا۔ آفاق کو بھی ساتھ چلنے کے لیے کہا تھا مگر اس نے معذرت کر لی تھی۔

زندگی جیسے پھر سے معمول پر آ گئی۔ یوں لگا، وہ دو آنکھوں والا آسیب اس کا پیچھا چھوڑ گیا ہے۔ شاید اس نے مالا کی ذات سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ مالا کے لیے یہ احساس ہی فرحت بخش اور اطمینان دلانے والا تھا۔ مگر یوں تھا کہ مالا بے چاری کے سکون و چین اور اطمینان کے دن تھوڑے ہی تھے۔ پھر ایسا روح ہلا دینے والا واقعہ ہوا جس نے پہلی مرتبہ عیسیٰ اور چاچو کو چونکا ڈالا تھا۔ وہ دن بڑا سست روی سے طلوع ہوا تھا۔ عیسیٰ اور آفاق دونوں دفتر چلے گئے تھے اور آج کے دن چاچو لازمی چاچی کی قبر پر فاتحہ پڑھنے اور پھول چڑھانے جاتے تھے۔ یہ ان کے معمول میں

شامل تھا۔ ہر پندرہ دن بعد وہ دل کے اطمینان کی خاطر چاچی سے ملنے جاتے۔ اس دن نینی اور مالا گھر میں اکیلی تھیں۔ مالا نے بڑا مزیدار لنچ تیار کر رکھا تھا مگر لنچ سے کچھ دیر پہلے عیسیٰ نے کہا وہ کسی ضروری میٹنگ کی وجہ سے نہیں آسکے گا۔ تب مالا پنجے وقت کے مطابق نماز ادا کرنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ وہ سلام پھیر رہی تھی جب اس نے مڑ کر دیکھا...... ہاں اس نے مڑ کر غیر ارادتاً دیکھ لیا تھا، یوں لمحوں میں اسے لگا جیسے اس کے وجود سے دھیرے دھیرے نہیں ایک ہی جھٹکے ساتھ جان نکل گئی ہے۔ اس کے پیچھے ایک عورت کھڑی تھی۔ سر سے لے کر پیروں تک سفید لباس پہنے ہوئے...... اس کا چہرہ انتہائی سفید اور چمکیلے غازے سے لتھڑا ہوا تھا۔ اس عورت کی آنکھیں جھکی تھیں...... وہ خوب صورت عورت تھی مگر اس کی اصل رنگت سفید غازے میں گم ہو چکی تھی۔

ایک تنہا کمرے میں اکیلا وجود کسی اور کا گمان نہ کرتے ہوئے اپنے دھیان میں مگن ہو اور اسے اچانک کوئی وجود نظر آجائے...... پھر کسی کی جانے کیا حالت ہوتی ہوگی تاہم مالا تو جیسے مرنے کے قریب پہنچ گئی تھی۔ اسے لگا، آنکھیں تو حلقہ پھاڑ کر باہر ابل پڑیں گی اور یہ ٹانگیں تو کبھی چلنے کے قابل نہیں ہو سکیں گی۔ اس نے اتنا بھیانک منظر زندگی میں کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔ معاً دروازہ دھیرے سے کھلا تھا اور مالا کی جیسے جان میں جان آگئی۔ اندر داخل ہونے والی نینی تھی جو کسی اور کے وجود سے قطعاً بے نیاز مالا سے مخاطب تھی۔ "برتن میز پر لگا دیے ہیں......" نینی نے بغیر چونکے یا ٹھٹکے آرام سے کہا تھا۔ کیا اسے مالا کے قریب کھڑی وہ عورت نظر نہیں آئی تھی؟ مالا کا ٹھہرتا دل پھر سے دھک دھک کرنے لگا تھا۔

"نینی! کمرے میں کوئی اور بھی ہے۔" مالا نے کمزور آواز میں زیر لب بڑ بڑا کر پوچھا تھا۔ تب نینی کی آنکھیں پھٹ پڑیں۔ اس نے ڈھیلے پھاڑ پھاڑ کر پورے کمرے پر نگاہ ڈالی تھی۔ اسے مالا کے قریب وہ جوان عورت کھڑی نظر نہیں آئی تھی۔ مالا کے پیروں تلے سے زمین دھیرے دھیرے سرکنے لگی تھی۔ پھر اس نے نینی کو کچھ بولتے سنا تھا۔ وہ مالا کے حواس معطل کر رہی تھی۔

"کہاں ہے......؟ کون ہے......؟ مادام! آپ تو بہک گئیں۔ یہاں تو کوئی بھی نہیں۔" نینی نے ہکلاتے ہکلاتے بہ مشکل اپنی بات مکمل کی تھی۔ اس کا پورا وجود تھر تھرا رہا تھا اور وہ چہرہ خوف کے مارے انڈے کی زردی جیسا ہو چکا تھا۔

"تمہیں یہ عورت نظر نہیں آئی......؟" مالا نے اپنے قریب کھڑی عورت کی طرف اشارہ کیا تھا تب نینی چیخ مار کر مالا کے قریب آگئی۔

"مجھے کوئی عورت نظر نہیں آرہی...... یہاں ہم دو ہیں۔" نینی نے اس کا بازو دبوچ کر ہچکی آواز میں کہا۔

"ہم دو نہیں تین ہیں۔" مالا کی گھگی بندھ گئی۔ خوف نے اسے لرزا لرزا کر بے حال کر دیا تھا۔ وہ بے ہوش ہونے کے قریب پہنچ چکی تھی۔ وہ جیسے گرنے کے قریب پہنچ چکی تھی۔

"تم ادھر دیکھو......" مالا نے نینی کا چہرہ اس عورت کی طرف موڑا تھا۔ وہ عورت جو سپاٹ چہرہ لیے ہاتھ باندھے سر جھکائے کھڑی تھی۔ اس کا انداز اتنا عجیب تھا۔ وہ کچھ بول نہیں رہی تھی کچھ کہہ بھی نہیں رہی تھی اور نہ وہ غائب ہو رہی تھی۔ جبکہ مالا کے علاوہ وہ کسی اور کو نظر بھی نہیں آرہی تھی۔ سب سے تکلیف دہ مقام بھی یہی تھا۔

"یہاں کچھ بھی نہیں۔" نینی منمنائی۔

"تم اندھی ہو......" مالا چیخی۔

"میں جھوٹ نہیں بول رہی......" نینی کی آواز کپکپا رہی تھی۔ حلق خشک ہو رہا تھا۔ وہ کمرے سے بھاگ جانا چاہتی تھی مگر کیسے مالا کو اکیلا چھوڑ دیتی۔

"تو میں جھوٹ بولتی ہوں۔" مالا نے تڑپ کر کہا۔ "الٰہی یہ کیسی سزا ہے۔" وہ بھل بھل رونے لگی

تھی۔ مگر سامنے کھڑی چاندی کے مجسمے میں ڈھلی عورت ٹس سے مس نہیں ہوئی تھی۔ نہ چونکی، نہ ٹھٹکی۔ اسی طرح بت کی طرح کھڑی رہی تھی۔

''تم......تم کون ہو......؟'' مالا نے بڑی ہمت کے ساتھ اس عورت کو مخاطب کیا تھا جو صرف اسے نظر آ رہی تھی نینی کو ہرگز نہیں...... مالا بھلا کیا کرتی......؟ خوف، صدمہ، دکھ اور جانے کون، کون سا احساس حواس معطل کر رہا تھا۔

''بولتی کیوں نہیں...... مجھے کیوں تنگ کرتی ہو؟ میرا گناہ کیا ہے؟'' مالا تڑپ، تڑپ کر بولی تھی پھر جیسے پتھر کے بت میں جان پڑ گئی تھی۔ اس چاندی کے مجسمے نے کہا۔

''یہ ہماری جگہ ہے...... تم یہاں سے چلی جاؤ۔'' آواز کی گونج مالا کے کانوں میں اتر گئی تھی۔ مگر نینی گونگوں، بہروں کی طرح بس ٹکر ٹکر دیکھتی رہی۔ مالا نے نینی کو جھنجوڑ دیا تھا۔

''کیا تمہیں کوئی آواز سنائی دی؟'' مالا نے بڑی آس سے پوچھا تھا مگر نینی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''مجھے کوئی آواز سنائی نہیں دی......'' نینی خوف کے مارے لرزتی آواز میں بولی تھی۔ پھر جیسے، مالا نے تھک کر نینی کو بتایا تھا۔

''یہ عورت مجھ سے کہہ رہی ہے میں اس گھر سے چلی جاؤں۔'' مالا پھوٹ، پھوٹ کر رو دی تھی اور نینی کے ڈیلے پھر سے باہر آ گرے تھے۔ شاید مجسمہ نما عورت کو مالا کا بولنا اور رونا پسند نہیں آیا تھا۔ وہ کسی روبوٹ کی طرح چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔ جبکہ مالا کو ایک دم ہوش سا آ گیا تھا۔ وہ بھی لپک کر باہر کی طرف بھاگی تھی۔ حالانکہ نینی اسے روکنا چاہتی تھی مگر مالا سر پر پیر رکھ کر بھاگ رہی تھی۔ جیسے ہی وہ لاؤنج کا دروازہ کھول کر باہر آئی۔ وہ عورت تالاب تک جاتی دکھائی دی پھر وہ جنگلی پھولوں کی اوٹ میں گم ہو گئی تھی۔ مالا آنکھیں پھاڑے اسے پکار رہی تھی۔ مگر جنگلی پھولوں کی باڑ تک جانے کا اس میں حوصلہ نہیں تھا۔ اندھیرا نما جھنڈ، اونچے، اونچے درخت نما پودے جن پر قسم، قسم کے پھول لگے ہوئے تھے۔ نینی بھی تب تک مالا کے پیچھے گرتی پڑتی آ گئی تھی۔ اب اسے باڑ کو گھورتے دیکھ کر زبردستی اندر لے آئی۔

''سایوں کا پیچھا نہیں کرتے۔'' مالا نے نینی کو کہتے سنا تھا۔ پھر جیسے اس کی آنکھوں میں اندھیرا سا اتر آیا۔ وہ چکرا کر فرش پر گر رہی تھی۔ جب اسے نینی نے سہارا دے کر تھام لیا تھا تاہم اس کا ذہن ایک دم تاریکیوں میں گم ہو گیا۔

وہ پورے آٹھ گھنٹے بے ہوش رہی تھی۔ اس بے ہوشی نے اگر اسے شدید اور بھیانک خوف کی سوغاتیں دی تھیں تو اس بے ہوشی کے ساتھ کچھ خوشخبریاں بھی تھیں...... جب وہ بے ہوش ہوئی تب چاچو بھی گھر لوٹ آئے تھے۔ اس کی حالت دیکھ کر گھبرا اٹھے۔ ایمبولینس منگوائی اور مالا کو اس میں ڈال کر اسپتال لے گئے تھے۔ تب تک عیسیٰ بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔ پھر فوراً طبی امداد ملنے کے باعث اسے ہوش تو آ گیا تھا تاہم ڈاکٹر نے بتایا وہ کسی شدید قسم کے خوف اور ڈر کے زیرِ اثر ہے۔ اسی بے ہوشی میں ڈاکٹر نے بتایا کہ مالا ماں بھی بننے والی ہے۔ جہاں یہ خوش خبری چاچو اور عیسیٰ کے لیے انتہائی مسرت تھی وہیں مالا کی حالت نے انہیں تشویش کا شکار کر دیا تھا۔ نینی نے من وعن پورا واقعہ کہہ سنایا تھا۔ مالا نے ہوش میں آ کر وہی باتیں دہرا دی تھیں۔ مالا نے روتے، روتے بتایا۔

''وہ عورت چاہتی ہے، میں اس گھر میں نہ رہوں...... وہ مجھے نظر آتی ہے نینی کو نہیں۔ آخر میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟'' مالا کی ذہنی حالت قابلِ تشویش تھی۔ اس کی کنڈیشن ایسی نہیں تھی کہ...... وہ کوئی صدمہ برداشت کر سکے۔ چاچو اور عیسیٰ سخت پریشان

تھے۔ پاکستان میں ہوتے تو ان باتوں پر آس پاس کے لوگوں سے مشورہ کرتے۔ مگر یہاں تو ایسا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ یہ آسیب وغیرہ پاکستان میں تو تھے ہی، کیا جرمنی جیسے ملک میں بھی تھے؟

عیسٰی نے آفاق کو پوری بات بتادی تھی۔ وہ اس سے مشورہ طلب کر رہا تھا۔ آفاق خود ساری باتیں سن کر سنانے میں رہ گیا تھا۔ خصوصاً وہ عورت جو مالا کو نظر آئی تھی۔ اس کے بارے میں سن کر وہ بچ بچ متفکر ہو چکا تھا اور سنجیدگی سے اس کا حل ڈھونڈنے کی کوشش میں عیسٰی کی ہر ممکن کوشش کرنے کا وعدہ کر چکا تھا۔ مالا کے گھر والوں سے سب کچھ چھپا لیا گیا تھا۔ وہ ان لوگوں کو پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے مگر ہاتھ پر ہاتھ رکھے بھی بیٹھ نہیں سکتے تھے۔

پھر بہت سارے دن سکون سے گزر گئے۔ بلکہ دو تین مہینے گزر گئے تھے۔ ان کی شادی کو کتنی کے پانچ ساڑھے پانچ ماہ ہو گئے تھے۔ اتنا خوب صورت وقت اتنی جلدی گزر گیا تھا۔ خلافِ توقع کوئی انہونا واقعہ وقوع پزیر نہیں ہوا تھا۔ اب عیسٰی نے مالا کو اکیلا نہ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ رات کو اگر اسے پیاس بھی لگتی تو پانی پینے اسے اکیلے نہیں بھیجتا تھا۔ اگر آفس میں جانا اس کا بہت ضروری ہوتا تب جاتا تھا۔ ورنہ آفاق کو بھیج دیتا مگر یہ سلسلہ زیادہ دیر نہیں چل سکا تھا۔ ایک صبح آفاق اور عیسٰی دونوں کو ایک ساتھ آفس جانا پڑ گیا۔ نینی ابھی آئی نہیں تھی جبکہ چاچو سو رہے تھے۔ دن کا وقت تھا، مالا نے عیسٰی کو تسلی دے کر دفتر بھیج دیا تھا۔ حالانکہ جہاں عیسٰی کا جانا بہت ضروری ہوتا وہیں وہ جاتا تھا اور آفاق کو گھر چھوڑ دیتا۔ تاہم آج وہ دونوں چلے گئے تھے اور صرف آدھے گھنٹے کے لیے گئے تھے۔ مالا، چاچو کو سوتا دیکھ کر گارڈن میں آ گئی تھی۔ یہاں تالاب کے پاس بیٹھنا اسے بہت پسند تھا۔ اسے لگتا تھا یہ تالاب سیف الملوک جھیل ہے۔ جس پر ہر رات پریاں اترتی تھیں۔

حالانکہ یہ تالاب ایسا تھا کہ دن کے وقت بھی یہاں پریاں چلتی پھرتی نظر آ سکتی تھیں۔ دیکھا جائے تو تصوراتی خاکوں میں پریوں کا ذکر، ان سے ملاقات اور ان کے حسن کی مجسمہ سازی کی ایک ایک کہانی بھری ہوتی ہے۔ پریوں کو دیکھنے کا شوق اور ان کے حسن سے متاثر ہونا ایک الگ چیز اور بات ہوتی ہے۔ پریوں کو اپنے مقابل دیکھنا بہت ہمت والا کام ہے۔ قومِ جنّ کی حسین عورتیں، جن میں سے ایک پری وادیِ کوہستان کا شہزادہ سیف الملوک بھی عاشق ہو گیا تھا۔ پھر وہ پری شہزادے سے ملنے جھیل پر آتی تھی۔ شہزادہ پری کے عشق میں فنا ہو گیا تھا۔ قصوں اور کہانیوں میں یہ سب کچھ بہت دلفریب لگتا ہے۔ اور اگر حقیقت میں کوئی پری حواس معطل کرنے سامنے آ جائے تو بھلا کیا حال ہوتا ہے؟ شاید ویسا ہی جو مالا کا حال ہو رہا تھا۔

مالا کے ڈیڈی کی ذاتی لائبریری میں قومِ جنّ کی حسین و جمیل پری بدیع الجمال کے حسن پر عاشق ہونے والے شہزادہ سیف الملوک کی سوانح عمری اپنی اصلی حالت میں محفوظ پڑی تھی جسے لکھنے والے حضرت میاں محمد صاحب نے کسی بھی مبالغے سے ہٹ کر اصل کہانی کی صورت میں لکھا تھا۔ کتاب سفر العشق معروف بہ سیف الملوک اصل کتاب جو 1898 میں حضرت منصف نے اپنی زیرِ نگرانی طبع فرمائی تھی۔ مالا نے سیف الملوک پوری پڑھ رکھی تھی۔ اسے پنجابی کے شعر اتنے سمجھ نہ آتے تھے مگر شوق ایسا جنونی تھا کہ اس نے ڈیڈی سے پوچھ پوچھ کر پوری کتاب پڑھ لی تھی۔ بھلا کیا ہی عشق کیا تھا سیف الملوک نے پری بدیع الجمال سے اور کیسے بدیع الجمال مرمٹی تھی شہزادہ سیف الملوک پہ......

اسے تو اپنی محبت اور عشق کے سامنے کسی اور کی محبت دریا میں سے چلو بھر پانی کے برابر لگتی تھی۔ جو عشق اسے علی عیسٰی کے وجود سے تھا ویسا عشق تو کسی نے نہ

کیا ہوگا۔ اس کی تو سانس بند ہونے لگتی۔ اگر وہ کبھی علی عیسٰی سے دوری کا تصور کرتی۔

اور صبح کے اس نورانی وقت تالاب کے کنگرے پر بیٹھ کر کیا ضروری تھا کہ وہ پری بدیع الجمال یا سیف الملوک کو یاد کرتی؟ وہ سر جھٹک کر اپنی سوچوں کو ایک ننھے منے نرم و نازک سے وجود کی طرف مبذول کروانا چاہتی تھی۔ وہ بچہ جو اس کے سارے خدشات ختم کرنے، اس کا دل بہلانے دنیا میں آنے والا تھا۔ ایک خوشگوار ممتا کا احساس بخشنے والا تھا۔

وہ شاید خوابوں اور خیالوں میں بہت دور تک چلی جاتی جو اگر اسے "اوں...... ہوں......" کی آواز نہ چونکاتی...... کوئی پھر مالا کے آس پاس تھا...... کوئی پھر مالا کے قریب تھا۔ اس نے دائیں دیکھا۔ پھر پیچھے دیکھا...... وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ قریب پڑی کچی کلیوں کو بے پروائی سے پانی میں اچھال رہی تھی۔ پانی کی شفاف سطح پر ہلکے بھنور بنتے رہے تھے۔ مالا کی زندگی بھی انہی بھنوروں کے مانند تھی۔ کبھی الجھ جاتی تھی کبھی سلجھ جاتی تھی۔ بس ایک محبت کا احساس تھا جس نے اسے زندہ کر رکھا تھا۔ ورنہ وہ اتنی پریشانیوں میں ابھی تک کیسے حواس قائم رکھے ہوئے تھی!؟

یونہی تالاب کے شفاف پانیوں کو دیکھتے ہوئے اچانک اس کے ذہن میں میاں محمد صاحب کے شعر اترنے لگے تھے۔ کسی اور نے محبت کی ایسی شاندار تشریح کی ہوگی......؟ محبت کو جیسے انہوں نے بدیع الجمال اور سیف الملوک کے قصے میں گوندھ دیا تھا۔ کس طرح سیف الملوک باغ میں ٹہل رہا تھا۔ ایسا ہی کوئی حسین پھولوں سے لدا گارڈن ہوگا۔ مالا آس پاس نگاہ دوڑا رہی تھی۔ اسے لگا، وہ تصوراتی دنیا میں کھوگئی ہے۔ میاں محمد صاحب کی مٹھاس بھری کہانی میں پورہ پور ڈوب گئی ہے۔ انہوں نے کتنی محبت سے سیف الملوک کی سوانح عمری لکھی تھی۔ جب وہ پیدا ہوا، بے شمار منتوں مرادوں کے بعد۔ پھر پلا بڑھا...... نازو نعم میں پرورش پائی۔ پھر ایک روز باغ میں ٹہلتے ہوئے بدیع الجمال نے اسے دیکھا اور سیف الملوک نے بدیع الجمال کو دیکھا عشق نے کیسی آگ لگائی تھی کہ اڑتی ہوئی جن زادی آدم کے عشق میں اسیر ہوگئی۔

مالا کو میاں صاحب کے وہ شعر یاد آرہے تھے جب شہزادہ، بدیع الجمال سے ملنے گیا تھا پھر کیسے التجائیہ انداز میں درخواست پیش کی تھی کہ اس کی محبت اور عشق کی روداد سن لے۔ شہزادے نے پری کو اس کی ماں کے دودھ کی قسم دی تا کہ پری اس کی بات سن لے۔ شہزادے نے پری سے کہا۔ میاں محمد صاحب نے پنجابی زبان میں اس پوری داستان کو نظم بند کیا ہے۔

ترجمہ) میری بات پوری سن لو اور سنا دل کے کانوں سے، میرے پاس اب صبر نہیں رہا، میری روداد عشق اب سن لو۔ پھر پری نے شہزادے کی آہ و زاری سے متاثر ہو کر بڑے ناز بھرے انداز میں جواب دیا تھا۔

ترجمہ) بدیع جمال پری نے کہا...... اے شہزادے! تو نے مجھے ماں کے دودھ کی بہت بھاری قسم دی ہے۔ میں تمہاری بات ایک بار تو ضرور سنوں گی۔ پھر شہزادے کی پوری بات سن کر پری نے اداسی سے کہا تھا۔

ترجمہ) تیرا، میرا ملنا تو بہت مشکل ہے، یہ کس نے کہہ دیا تم سے کہ ہم دونوں کبھی مل سکیں گے؟

پھر پری بدیع الجمال نے سیف الملوک کو جیسے سمجھاتے ہوئے مزید کہا تھا۔ سیف الملوک کے عشق کی داستان کے جواب میں پری دلائل اور جواز دیتی ہے اور بڑے تفاخر اور ناز بھرے انداز میں کہتی ہے۔

ترجمہ) ہم تو ناری ہیں اور خود کو آدم زاد سے اونچا سمجھتے ہیں۔ تم ناری کی محبت چھوڑ دو، پریوں کی محبت تمہیں کیا دے گی۔

مالا نے بھی بدیع الجمال کا قصہ ایک کہانی سمجھ کر نہیں پڑھا تھا۔ اس نے ہمیشہ بڑی محبت، چاہت اور عقیدت کے ساتھ اسے پڑھا تھا۔

وہ اب بھی پری کے ساحرانہ کلام میں جیسے

کھوئی ہوئی تھی۔ اسے لگا، وہ سمندر پار کسی اجنبی ملک کی سرزمین پر نہیں بلکہ اپنے ڈیڈی کی لائبریری میں بیٹھی سفرالعشق یعنی قصہ سیف الملوک و بدیع الجمال پڑھ رہی تھی۔ اسے پری کی ناز بھری آواز لاکھوں میل کی دوری کے باوجود سنائی دے رہی تھی۔ جیسے وہ سیف الملوک کو سمجھا رہی تھی۔ اور ابن آدم کو بے وفا کہہ رہی تھی۔

بے وفائی کم تساڈا، پریاں لوک وفائی
بے قدراں دی الفت مندی، نیچاں دی آشنائی

ترجمہ) پری بتاتی ہے کہ بے وفائی تمہارا کام اور انسانوں کا وصف ہے، جبکہ پریاں فطرتاً وفادار ہوتی ہیں۔ وہ جس سے محبت کرتی ہیں عمر بھر اس کی وفادار رہتی ہیں اور پری کہتی ہے کہ بے قدروں یعنی انسانوں کی الفت بری ہے اور نیچ لوگوں کی آشنائی اور دل ربائی بھی بری ہے۔

نیچاں دی آشنائی کولوں فیض کسے نہیں پایا
ککر تے انگور چڑھایا، ہر گچھا زخمایا

ترجمہ) نیچ لوگوں کی محبت سے کس نے نفع اور ثمر پایا ہے؟ کیکر کے کانٹوں پہ انگور چڑھانے سے ہر دانے کو زخم ہی تو آتا ہے مالا کو لگا جیسے بدیع جمال نے یہ الفاظ اسے ہی سمجھانے کو کہے تھے۔ جیسے ایک پردہ سا اس کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹا تھا۔ اس کے کانوں میں میاں صاحب کا یہ شعر پھر سے امرت ٹپکانے لگا۔

"ککر تے انگور چڑھایا، ہر گچھا زخمایا۔" مالا کو لگا، پیاز کی پرتیں کھلنے لگی ہیں۔ ایک، ایک پردہ ہٹنے لگا تھا۔ خلوص اور محبت کو بے قدروں پر مت لٹاؤ۔ کیکر پہ انگور مت چڑھاؤ اور مالا نے بھلا کیا، کیا تھا؟ اور کیا کچھ کرتی آئی تھی؟ بے قدروں پر اعتبار کرتی رہی اور خلوص لٹاتی رہی۔ جیسے بنجر زمین پر خلوص و الفت کے بیج پھینکتی رہی۔ بھلا بنجر زمینیں فصلیں اگاتی ہیں؟ محبت پتھروں کے سینوں میں سے چشمے نہیں نکالتی پر پتھروں کے نیچے دبی مٹی سے ہی چشمے پھوٹتے ہیں۔ بس مالا ہی سمجھ نہیں پائی تھی۔ اسے لگا، بدیع جمال نے اسے ایک راہ دکھائی ہے۔ بدیع جمال جیسے روشنی کا مینار بنی کھڑی تھی۔ اسے رستہ بتا رہی تھی۔ اسے سمجھا رہی تھی۔

"نیچاں دی آشنائی وچوں فیض کسے نہیں پایا؟" لفظ ملفظ میں جیسے مالا کے لیے کوئی رہبر کھڑا پکار رہا تھا۔ بات مشکل نہیں تھی بس مالا سمجھ نہیں پائی۔ اس نے آفاق اور سوزن پر اعتبار کر کے دھوکا کھایا تھا۔ اس نے ان دونوں پر خلوص لٹا کر غلط کیا تھا۔ مالا نے بے قدروں پر خلوص نچھاور کیا اور انہیں اعتبار کے قابل سمجھا۔ وہ کیوں نہیں سمجھ سکی کہ مون کی کزن، عیسیٰ کی نام نہاد منگیتر سوزن، مالا کے لیے کیوں مخلص ہوگی؟ وہ یہ بھی کیوں نہیں سمجھ سکی، مون کے انسٹی ٹیوٹ سے شارٹ کورس کر کے آنے والا آفاق مون کی ہی حریف، یعنی مالا سے مخلص ہوگا؟ تو گویا مالا نے تسلیم کر لیا تھا۔ وہ ایک بھیانک سازش کا شکار ہو رہی تھی۔ اور اسے نفسیاتی حربوں سے ٹیز اور ٹارچر کیا جا رہا تھا۔ اور سب سے بڑی بات اس سازشی منصوبے میں آفاق اور سوزن کا بھی پورا پورا ہاتھ تھا۔

وہ ابھی آفاق اور سوزن کی منافقت کے بارے میں کچھ اور بھی ٹھوس نکتے نکالتی جب "اوں ہوں" کی آواز نے مالا کو پھر سے چونکا دیا تھا۔ جیسے "اوں ہوں" میں کوئی تنبیہہ تھی۔ مالا کو کسی بات سے منع کیا جا رہا تھا بھلا کس سے؟ اس نے تالاب کے کنکرے پہ رکھے گملے میں سے کئی کنکر تو نکالے ہی تھے بلکہ اس سے بھی پہلے پودے کی شاخوں پر لگی ساری کلیوں کو توڑ کر تالاب میں پھینک دیا تھا اس نے پھولوں سے لدے پودے کو قریب، قریب گنجا کر دیا تھا۔ اب کہ مالا کو کچھ افسوس سا ہوا تھا۔ بھلا ایسی بھی کیا ... خبری؟ وہ خود کو لعن طعن کرنے لگی تھی۔ جب "اوں ہوں" کی آواز پھر سے سنائی دی۔ اب کہ مالا نے بائیں جانب دیکھا تھا۔ پھولوں کا اونچا جھنڈ ایک

جگمگاتی حسین عورت سے لٹک رہا تھا۔ وہی جوان عورت جو مالا کو کمرے میں ملی تھی۔ چمکتا ہوا سفید چہرہ...... سانچے میں ڈھلا بدن...... نہ نقوش مشرقی تھے نہ مغربی...... کمال کا نفیس نقوش سے ترشا چہرہ تھا۔ مالا کو پہلی مرتبہ ذرا بھی خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔ اس نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ وہاں خوف کہیں نہیں تھا۔ مالا کچھ متحیر رہ گئی تھی۔ مگر فی الحال حیران ہونے کا بھی اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ وہ اپنے قدموں پر اٹھ کھڑی ہوئی۔ جھولی میں گری ساری چیاں تالاب میں گر پڑی تھیں۔ مالا نے جھک کر ایک کلی کو مٹھی میں دبا لیا تھا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

''پری بدیع الجمال۔'' مالا نے زیر لب بڑبڑا کر کہا تھا۔ ''مجھے تم سے ملاقات کا بہت شوق تھا۔ میں ایک عرصے سے تمہارے سحر میں گرفتار تھی۔ مجھے یقین تھا تم میرے تصور سے بھی بڑھ کر حسین ہوگی۔'' مالا نے دو قدم غیر محسوس طریقے سے آگے بڑھائے تھے۔ سامنے کھڑی چاندی میں ڈھلی عورت شا کنڈ رہ گئی۔ اس کے تاثرات بہت حیران کن تھے۔ مالا خود بھی متحیر رہ گئی۔ ''تو کیا پریاں بھی حیران ہوتی ہیں؟'' وہ گویا خود سے پوچھ رہی تھی۔ جبکہ دوسری طرف حیرت کا انداز اور شارہی کوئی نہیں تھا۔

مالا سہمی نہیں تھی، ڈری نہیں تھی...... اس کے دل میں کہیں خوف کا نشان تک باقی نہیں تھا۔ خوف اس کے دل سے بے وفائی کر گیا تھا مگر مالا اس بے وفائی پر بہت خوش اور مطمئن تھی۔

''آج تم خاموش کیوں ہو؟ بولتی کیوں نہیں؟ مجھے تمہارے بولنے کا شدت سے انتظار ہے۔'' مالا جیسے اس کی خاموشی سے بھی لطف اندوز ہو رہی تھی۔ آج مالا کی ترنگ ہی کچھ اور تھی۔ اس کے سامنے بدیع الجمال جو کھڑی تھی۔ اس کا تصوراتی پیکر، سیف الملوک کی محبوبہ......

''تم جانتی ہو، میں کون ہوں؟'' چاندی کے بت میں جان پڑ گئی تھی۔ مالا کو گویا بہت ہی لطف آیا۔

''ہاں، ہاں...... تم چاندی کا بت ہو...... ہمارے ہاں تمہارے جیسے بت کو خرید کر مزار پر چڑھاوا دیتے ہیں...... آں...... ہاں، میں یہ کیا بول گئی۔ تم تو بدیع الجمال ہو......'' مالا نے کمالِ عقلمندی سے اسے ایک مرتبہ پھر ہونق کر دیا تھا۔ بھلا پریاں ہونق بھی ہو جاتی ہیں؟ مالا کو پہلی مرتبہ تجربہ ہوا تھا سو کچھ حیرانی بھی تھی۔ مگر سامنے کھڑی عورت اس کے سارے طبق روشن کرنے کے موڈ میں تھی۔

''میں علی عیسیٰ کے نکاح میں ہوں...... جس شب تمہارا محمد علی عیسیٰ سے نکاح ہوا تھا اسی شب میں بھی خود بخود اس کے نکاح میں آ گئی تھی۔ اس گھر میں میرا قیام ہے۔ انسان تو بے وفا ہوتے ہیں جبکہ ہم نہیں...... مر کر بھی نہیں چھوڑتے۔'' وہ اپنے تئیں مالا کے حواسوں پر بم پھوڑ چکی تھی۔ کچھ پل کے لیے مالا بھی چکرا کر رہ گئی تھی۔ اسے سنبھلنے میں بہت وقت لگا تھا۔ یہ انکشاف لمحے بھر کے لیے ہلا کر رکھ گیا تھا اسے...... مگر وہ پھر بھی سنبھل ہی گئی تھی۔ اس نے سامنے کھڑی پری پیکر کو دیکھا تھا۔ انسانی ڈھانچے میں ڈھلا وجود...... چہرے پر نا قابلِ فہم تاثرات اور الفاظ ایسے تھے گویا مالا کی ہستی ہل کر رہ گئی تھی۔

''اوہ...... تو یہ بات ہے، تم عیسیٰ کے نکاح میں ہو...... اور مجھے پریشان کرتی ہو، پھر میری وجہ سے عیسیٰ پریشان ہوتا ہے تم کیسی محبت کرتی ہو علی عیسیٰ سے؟ اس گھر میں رہنے والوں کو زک پہنچاتی ہو، ٹھہرو، میں تمہیں پوچھتی ہوں۔'' مالا نے پورے جوش اور غصے کے عالم میں جارحانہ تیور کے ساتھ مٹھی میں دبائی کلی سامنے کھڑی عورت کو ماری تھی۔ یہ حملہ بہت اچانک تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا، مالا پتھر بھی مارتی تو وہ عورت ٹس سے مس نہ ہوتی بلکہ بندوق کی گولی بھی اس پر اثر نہ کرتی مگر وہ تو معمولی سی کلی کا زور بھی سہہ نہیں سکی تھی حالانکہ کلی اس تک پہنچ بھی نہیں پائی تھی۔

ہوا میں معلق رہ کر بالآخر زمین بوس ہوگئی تھی۔ جبکہ سامنے کھڑی چاندی کی عورت نے بے ساختہ چیخ ماری تھی۔ پھر وہ الٹے قدموں بھاگ گئی۔ مالا کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ جوتا اٹھا کر چاندی میں ڈھلی اس عورت کا پیچھا کرے مگر وہ گلاب کے جھنڈ میں غائب ہوگئی تھی۔ اور مالا ... اک گہری سانس کھینچتی تالاب کے کنگرے پر بیٹھ گئی۔ اس کے سر پر سے خوف کا بھیانک بھوت اتر گیا تھا۔ قوم جن کی ایک عورت علی عیسٰی سے نکاح کا اعتراف کر کے بھاگ گئی تھی۔ مالا نے اسے بھگا ڈالا تھا۔ ناری پہ خاکی جیسے سبقت لے گیا۔ اس نے ڈر کو ڈر کے ساتھ کاٹ ڈالا تھا۔ اس پل مالا کو بدیع الجمال پر ٹوٹ کے پیار آ گیا تھا۔

جیسے کوئی جمیل سیف الملوک پر سر جھکائے ٹھنڈی میٹھی چاندنی میں گنگنا رہا تھا۔ "بھلا پریاں کس کے ہاتھ آتی ہیں؟ پریوں کو تو چھونا بھی ممکن نہیں۔" پھر یہ کیسی پری تھی جو گلی کا وار سہہ نہ پائی اور انسانی لمس کی قربت سے بھاگ گئی۔ مالا تو ابھی اس کے قریب آ رہی تھی۔ وہ اسے گلی مار کر چھونا چاہتی تھی اور شاید وہ عورت اس کا ارادہ بھانپ چکی تھی جبھی بھاگ نکلی۔ اگر مالا اسے چھو لیتی تو بھرم ٹوٹ جاتا۔ شاید آج فیصلے کا ... آگہی اور ادراک کا دن نہیں تھا۔ مالا پھر کسی ایسی ہی ملاقات کا انتظار کرنے لگی تھی۔

علی عیسٰی نے دو دن پہلے ہی مالا کو یہی تو سمجھایا تھا۔

"یہ ڈر اور خوف کچھ نہیں ہوتا۔ انسانی ذہن کے وسوسے ہیں سارے، کچھ بھی خود پر سوار کر لو، چاہے خوشی، چاہے غم یا خوف ..... جو سوچو گے اسی کے زیر اثر رہو گے، دیکھو، کنویں میں جھانکے بغیر اس کی گہرائی کا پتا نہیں چلتا۔ آگ کو چھوئے بغیر اس کی تپش کا احساس ہو جاتا ہے مگر نزدیک جاؤ کچھ چیزیں سمجھانی پڑتی ہیں اور کچھ بغیر سمجھائے ادراک تک پہنچ جاتی ہیں۔ تم خوف کو آگ کی تپش مت سمجھو بلکہ کنویں کی طرح سمجھو...... جب تک خوف کی گہرائی میں نہیں اترو گی، جب تک خوف کو ہاتھ سے محسوس نہیں کرو گی، وہ کبھی تم سے دور نہیں جائے گا۔" یہ عیسٰی کے قول تھے پھر بھلا مالا ان پر ایمان کیسے نہ لاتی۔ اس نے خوف کو مجسم شکل میں دیکھ کر اسے چھونا چاہا تھا اور خوف، مالا کے خوف سے بھاگ گیا تھا۔

مالا کا دل چاہ رہا تھا جو آسمانوں پر مرغابیاں اڑ رہی ہیں اور جو کونجیں قطاروں میں تیر رہی ہیں کم از کم آج تو وہ ان کے ہمراہ رقص کر لے، آج مالا کی فتح کا... پُرمسرت دن تھا۔ آج مالا کی ان دیکھے اور آنکھوں دیکھے خوف سے آزادی کا دن تھا۔

☆☆☆

اگلے بہت سارے دن جیسے امن اور شانتی کی پھوار لے کر آئے تھے۔ زندگی کی بگڑتی ترتیب میں سنوار اور نکھار آ گیا تھا۔ بگڑتی چیزیں جیسے اپنے اصل مقام تک آ رہی تھیں۔ مگر مالا اتنا ضرور جانتی تھی کہ یہ سکون بھی عارضی ہے۔ ابھی اس کی آزمائش ختم نہیں ہوئی تھی۔ ابھی کچھ اور امتحان باقی تھے۔

اس دن شام سے کچھ پہلے ہیرا کی کال آگئی تھی۔ وہ اسے میکس کی برتھ ڈے پارٹی کا بتا رہی تھی بلکہ یاد دہانی کروا رہی تھی۔

"سات بجے تک پہنچ جانا --- میں بھی سات بجے تک آؤں گی۔" ہیرا عموماً ہر قسم کے فنکشن انجوائے کرتی تھی۔ سو اس وقت بھی بہت ایکسائٹڈ تھی۔ مالا کا پہلے تو ارادہ ڈانواں ڈول ہو گیا تھا۔ پھر ہیرا کے اصرار پر اس نے حامی بھر لی تھی۔ پھر جب عیسٰی سے مالا نے پوچھا تو اس نے بخوشی اجازت دے دی تھی۔ مگر ساتھ تاکید بھی کی تھی۔

"اگر آفاق فارغ ہے تو اسے ساتھ لے جاؤ۔"

جانے اس کے شوہر کو خبیث آفاق پر کیسا اندھا اعتماد تھا؟ مالا کو آفاق زہر لگتا تھا۔ دل تو چاہتا تھا اسے اٹھ کر باہر پھینک دے مگر عیسٰی کی وجہ سے مجبور تھی۔

مالا نے آفاق سے مارے باندھے ہی پوچھا تھا

کہ وہ مصروف تو نہیں اور آفاق نے بتایا، اس کا گلا خراب ہے، ڈاکٹر کے پاس جا رہا ہے۔ مالا نے تشکر بھری سانس خارج کی تھی۔ وہ آفاق کے ساتھ کہیں بھی نہیں جانا چاہتی تھی۔ ادھر آفاق کے نکلتے ہی اس نے بھی تیاری کر لی تھی پھر چاچو کو بتا کر بس کے ذریعے میکس کے فلیٹ تک آ گئی۔ رستے میں اس نے فلاور شاپ سے بوکے خریدا تھا اور کیک کے ساتھ چاکلیٹ کا ایک لارج سائز پیک بھی لیا۔ جب وہ میکس کے فلیٹ کی بلڈنگ تک پہنچی تو میکس اسے نیچے ہی مل گیا تھا۔ اس نے مسکرا کر مالا کا خیر مقدم کیا۔ اور پھر مالا کو بتایا، وہ فلیٹ نمبر نسا..ں پر پہنچ جائے۔ دروازہ کھلا ہی ہوگا۔ میکس جلدی میں تھا اور قریبی بیکری میں گھس گیا تھا۔ مالا اسے پکارتی ہی رہ گئی۔ پھر جب وہ لفٹ کے ذریعے مطلوبہ فلیٹ..... پر پہنچی تو توقع کے عین مطابق دروازہ کھلا ہی ملا تھا۔ اس نے دروازے سے اندر پاؤں رکھا تو کئی طرح کی وقفے وقفے کے ساتھ آوازیں سنائی دی تھیں۔ پہلی آواز سوزن کی تھی، دوسری مون کی، تیسری آواز آفاق کی تھی۔ مالا کے سر پر دھڑام دھڑام ساتوں آسمان آ گرے تھے۔ تو آفاق ڈاکٹر کے کلینک جانے کے بجائے مون کے بلاوے پر ادھر آ گیا تھا۔ آفاق نے مالا سے جھوٹ بولا تھا؟ اتنا بڑا ایک اور دھوکا.....؟ مالا کا سر گول، گول گھومنے لگا۔ تو گویا آفاق جانتا ہی نہیں تھا۔ مالا کو بھی میکس کی طرف آنا ہے۔ اگر جان جاتا تو یہاں نہ آتا۔

مالا کو اندر سے قہقہوں کی جھنجھناہٹ نما آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس کا وجود گویا دھول مٹی ہو رہا تھا۔

''ٹارگٹ کامیابی کے آخری مراحل میں ہے..... بس ایک ہی جھٹکے میں کہانی کا اینڈ ہو جائے گا..... اس فلم کی پروڈیوسر مون حبیب ہے۔'' اندر سے مون کی چہکتی آواز سنائی دی تھی پھر کچھ دیر بعد دوسری آواز آئی۔

''اس فلم کا ڈائریکٹر اعلیٰ یعنی کہ میں ہوں..... علی عیسیٰ کی آستین میں آرام فرمانے والا ڈیش، ڈیش اور ڈیش.....'' آفاق نے قہقہہ لگایا تھا کچھ لمحوں کے بعد سوزن کی آواز آئی۔ وہی مکارانہ آواز..... مالا کو جیسے الیکٹرک شاکس لگ رہے تھے۔

''اور میں فلم کی کاسٹ کا اہم حصہ ہوں...... اس فلم کا نام ہے ترک وفا..... یہ فلم مالا اور علی عیسیٰ کی کہانی پر بنتی ہے۔ اس کا اسکرپٹ مون حبیب نے لکھا ہے اور اسے پروڈیوس بھی مون حبیب نے کیا ہے۔ جبکہ ہم محض کہانی کے اہم ترین کریکٹرز ہیں..... اور ایکٹنگ میں کمال کا فن رکھتے ہیں۔'' وہ چالاک لومڑی قہقہہ لگا کر ہنس رہی تھی جبکہ مالا کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔

اندھیرا کیا ہوتا ہے؟ مالا نے اس لمحے جانا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے غبار چھا گیا تھا، سیاہ دھجی دھجی بکھرا گہرا ہوتا غبار..... نقطوں کی شکل میں ابھرتا اور پھر گہرا ہوتا، پھیل پھیل جاتا۔ اس نے دیوار کا سہارا لیا تو دیوار بالشت بھر پیچھے ہٹ گئی تھی۔ دماغ چکی کے پاٹ کی طرح بھاری تھا اور گول، گول گھوم رہا تھا۔ وہ زمین پر گرنے کے قریب تھی یا پھر وہ زمین پر گر چکی تھی یا خلا میں معلق تھی۔ وہ کہاں تھی؟ شاید کہیں بھی نہیں، زمین پر نہ آسمان پر خلا میں، نہ ہوا میں۔

''نیچاں دی آشنائی توں فیض کسے نہ پایا'' کوئی سیف الملوک جھیل پر سر جھکائے بھیگی آواز میں گا رہا تھا۔ مالا کو لگا، اس کا دل پھٹ جائے گا، اس کی سماعتیں، اس کی آنکھیں، اس کا دل، سوچیں کسی گڑھے میں گر رہی تھیں۔ وہ خود بھی تو کسی گڑھے میں گر رہی تھی۔ جہاں اندھیرا تھا، جہاں سانس لینا بھی مشکل تھا۔

وہ دیوار کے ساتھ چپکی گہری، گہری سانس لے رہی تھی، مالا نے اس پل جانا تھا کبھی، کبھی سانس لینا بھی کتنا دشوار ہوتا ہے۔

تالاب کے کنارے پھر کوئی .... پری پیواڑے بیٹھی تھی۔ وہ جو روشنی کا مینار تھی اور مالا کو صاف راہ دکھا رہی تھی، اسے سمجھا رہی تھی کہ نیچ لوگ محلوں میں بھی رہیں تب بھی نیچے ہی ہوتے ہیں۔ اور نیچوں کی یاری، دلداری سے اعتبار ہی ٹوٹتے ہیں، بے چینی، دکھ اور صدمات ملتے ہیں، اسے لگا، بدیع الجمال پھر اس کے قریب آگئی ہے۔ وہ جھیل سیف الملوک کے ٹھنڈے پانیوں میں اتر کر اسے بتا رہی تھی کہ دکھ اور اچانک صدمے سے سنبھلتے کیسے ہیں؟ وہ اسے مضبوط رہنے اور حوصلہ پکڑنے کی ہمت دلا رہی تھی۔ وہ بدیع الجمال ہی تو تھی جو ایک مرتبہ پھر روشنی کا مینار بنی کھڑی تھی۔ اسے بتا رہی تھی کہ انسان کا بھروسا تب ٹوٹتا ہے جب اللہ پر اس کا بھروسا ہلکا ہوتا ہے۔ زاہد اور متقی بن مشقت کے نہیں بن جاتے۔ درگاہوں اور صحراؤں میں رلنا پڑتا ہے۔ کسی نے مالا کے کانوں میں امرت قطرہ، قطرہ ٹپکا دیا تھا۔ اس کی نیم وا آنکھیں ایک جھٹکے سے کھل گئی تھیں۔ نکتوں کی شکل میں دھجی، دھجی بکھرا غبار دھیرے دھیرے چھٹ رہا تھا جیسے اندھیرا کم پڑ رہا تھا۔ جیسے غبار کے پیچھے کوئی ننھا سا جگنو ٹمٹما رہا تھا۔ دور، بہت دور لاکھوں میل کی دوری پہ جھیل سیف الملوک کے بیچ کناروں پہ شیریں نغمے فضاؤں میں بکھرتے سنائی دے رہے تھے۔ کوئی بہت سوز و گداز سے اللہ کی "حمد" پڑھنے میں دنیا بھلائے مگن تھا۔ وہ بھلا کون تھا؟ سیف الملوک یا بدیع الجمال؟ اللہ کی بادشاہی ہمیشہ کی ہے، اسی کا راج ہے، اسی کی حکومت ہے، اسی کے ملک ہیں اور اسی یعنی اللہ کے در پہ بھی سلامی دیتے ہیں۔ سبھی جھکتے ہیں، آدم، جن اور فرشتے ہر دم، ہر جان اللہ کی بندگی میں مصروف اور اسی کے سامنے سربسجود ہیں۔ سیاہ دھجی جیسا اندھیرا کچھ اور چھٹ گیا تھا۔ غبار پہلے سے ہلکا تھا۔ وہ اندھیرے میں آنکھیں کھول سکتی تھی، اسے اندھیرے میں کچھ، کچھ روشنی نظر آ رہی تھی، یہ روشنی جگنو کی تھی یا پھر.....؟

وہ ہی ہے جو غرور اور تکبر کرنے والوں کے غرور کو توڑ ڈالتا ہے۔ غریب، بے کس، مسکین اور مظلوم کا ساتھی مددگار ہے، کوہ قاف تک روزی پہنچانے والا چرند پرند تک رزق دینے والا وہی اللہ تو ہے۔ پردے جیسے ایک، ایک کر کے کھسک رہے تھے۔ اس نے دیوار پر ہاتھ رکھا تو اس کا چکراتا دماغ ٹھہر گیا۔ اسے گزرے ہوئے کچھ پل یاد آئے تھے، اسے کوئی بات یاد آئی تھی۔

"تم عنقریب میرے بھائی کی زندگی سے جانے والی ہو، بہت جلد علی عیسیٰ تمہیں طلاق دے دے گا۔" غرور، تکبر سے بھری یہ آواز کس کی تھی؟ مالا عالم بالا میں پہنچ کر بھی اس آواز کو پہچان سکتی تھی۔ اس کا دل ایک مرتبہ پھر لہولہان ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں زخم بھر گئے تھے مگر پھر جیسے کوئی سکون کا بھم مالا کے وجود پر پڑھ کر پھونکنے لگا تھا۔ جیسے کسی نے مالا کو اپنے محفوظ حصار میں مقید کر لیا تھا۔ اس کے اندر باہر ٹھنڈک اترنے لگی تھی۔

اس نے یقین کو اپنے اندر مضبوط کیا تو اللہ نے اس کے قدم زمین پر مضبوطی سے جما دیے تھے۔ وہ خلا سے باحفاظت زمین پر اتر آئی تھی۔ اس کے قدم زمین پر جم گئے تھے اور وہ نیچ لوگوں کی اوقات پہچان چکی تھی۔

"ٹارگٹ مشکل ضرور ہے پر ناممکن نہیں...... میں چاہتی تو لمحوں کو ایک ہی جھٹکے کے ساتھ ختم کر سکتی تھی۔ مگر ایسی گیم کا مزہ ہی کیا...... جس میں مقابل کو اس کی بے خبری میں مات دی جائے۔" کچھ عرصے بلکہ کچھ دن پہلے تو اس نے اپنے کمرے کی واحد کلاس ونڈو کے دوسری طرف ایک عورت کے زہریلے الفاظ سنے تھے۔ وہ عورت موون اور علی عیسیٰ کی فرسٹ کزن سوزن تھی۔ مالا نے سوزن کی اصلیت پہچان لی تھی اور مالا نے آفاق کی حیثیت بھی سمجھ لی تھی، اب کوئی راز "راز" نہیں رہا تھا جیسے حقیقت

روشن ہو گئی تھی۔ جیسے مالا کے حقیقی دشمن کھل کر اس کے سامنے آ گئے تھے۔ آگہی کا عذاب تکلیف دہ ضرور تھا پر مالا خود کو خوش بخت سمجھتی تھی جسے دوست، اور دشمن کی پہچان بروقت ہو چکی تھی۔ اب مسئلہ یہ تھا وہ علی عیسیٰ کو آفاق کے گھناؤنے روپ اور سوزن کی کریہہ شکل کیسے دکھائے۔ اسے کوئی ٹھوس ثبوت کی اشد ضرورت تھی۔ کوئی ایسی شہادت، کوئی ایسی گواہی جو دلیل بن کر سامنے آتی۔ جو علی عیسیٰ کو یقین کی پہلی سیڑھی سے آخری سیڑھی تک لے جاتی تب وہ سوزن اور آفاق کے اندر کی سیاہی کو کھوج لگاتا۔ وہ مالا کی بات کا اعتبار کر لیتا۔ یہ کام بہت مشکل تھا وہ سب سے برتر تدبیر کرنے والے اپنے رب پر بھروسا کرتی تھی وہی اسے اس مشکل سے نکالنے والا تھا۔

چکنی دیوار سے کمر چپکائے جیسے وہ اپنے حواسوں میں آ چکی تھی۔ چکر کھاتا دماغ اب پرسکون ہو چکا تھا پھر کچھ دیر بعد اسے تیز قدموں کی آہٹیں سنائی دی تھیں۔ دوسرے ہی لمحے میکس کھلے دروازے سے لدا پھندا اندر آ گیا۔ وہ کاریڈور میں کھڑی تھی اور میکس اسے کسی بت کے مانند کھڑا دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

"تم اندر کیوں نہیں گئیں؟ یہاں کیوں کھڑی ہو؟" میکس حیران ہونا ترک کر کے شاپرز سامنے میز پر رکھتا ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولنے کے لیے واپس آیا تھا۔ وہی دروازہ جس کے پیچھے بہت سے سیاہ دل والے چہرے موجود تھے۔ جو کچھ عرصے پہلے تک مالا کے لیے بہت محترم تھے۔ آج وہ اپنی غلاظت کے باعث پستیوں میں گر چکے تھے۔ اس نے سختی سے جبڑے بھینچ لیے تھے۔ وہ میکس کو ہینڈل گھماتا دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھل جاتا اور ان دو لوگوں کی غلیظ صورتیں مالا کے سامنے آ جاتیں۔ وہ قیامت تک ان دو لوگوں کی صورت کبھی نہ دیکھتی گر جو اتنی مجبور نہ ہوتی۔ اسے بالآخر

نظم

نصیب سے، نصیب کو نصیب ہو
کہ پیار تیرا مجھے بھی نصیب ہو
جتنا قریب ہوں میں تیرے
اتنا تو بھی میرے قریب ہو
لگ جائے تجھے ایسا مرضِ پیار کہ
میرے سوا کوئی نہ طبیب ہو
ملے مجھے ایسے پیار تیرا کہ
زمانے میں کوئی نہ رقیب ہو

شاعر: بمیرا اختر
مرسلہ: مہوش آفتاب، اسلام آباد

سوزن اور آفاق کا سامنا تو کرنا تھا۔ سوزن جو اجنبی دیس میں مالا کی پہلی دوست تھی، جو اسے بہت مخلص لگی تھی۔ پھر آفاق تھا، عیسیٰ کا ہمراز اور اس کا عزیز دوست...... مالا کو حیرت ہوتی تھی، لوگ اتنے چالباز کیوں اور کیسے ہوتے تھے؟ مخلص رشتے بناتے اور پھر توڑ ڈالتے، مالا کو آفاق نے بہن بنایا تھا اور بہنوں کے ساتھ بھلا کوئی ایسے کرتا ہے؟

وہ ایک مرتبہ پھر نم آنکھوں سے سنہرے ہینڈل کو دیکھ رہی تھی۔ جو کلک کی آواز کے ساتھ کھل چکا تھا۔

"تم اندر کیوں نہیں گئیں....؟ ڈرائنگ روم میں مون موجود تھی۔ تم اس گھر میں آنے والی پہلی مہمان نہیں ہو، مون تم سے پہلے کی آئی ہوئی ہے۔ اور باقی لوگ بھی آتے ہی ہوں گے۔" میکس نے مسکرا کر جیسے وضاحت کی تھی۔ وہ اس کا تذبذب سمجھ گیا تھا۔ شاید وہ فلیٹ میں اکیلے ہونے کے خیال سے ڈرائنگ روم میں نہیں گئی تھی۔ میکس اب دروازہ کھولے اسے اندر آنے کا کہہ رہا تھا۔ مالا کے ... ارادی قدم آگے کی طرف بڑھے تھے... اور دوسرے

ہی لمحے جیسے اس کے قدم زمین نے پھر سے جکڑ لیے تھے۔ ڈرائنگ روم کا منظر واضح تھا۔ وہاں موون کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ نہ سوزن اور نہ ہی آفاق۔۔۔۔ پورا کمرا بھاں، بھاں کر رہا تھا۔ یاقوت اور ہیرے سے سجا کراؤن سر پر سجائے سرخ گھنے سلکی بالوں کی اونچی سی پونی بنائے بلاشبہ وہ موون ہی تھی۔ سرخ سلک کی پیروں تک چھوتی روک پہنے، ٹانگ پر ٹانگ رکھے وہ بڑے نخرے اور طمطراق کے ساتھ صوفے پر بیٹھی سامنے کسی ڈیکوریشن پیس کو دیکھ رہی تھی۔ مالا کی موجودگی محسوس کر کے اسے الیکٹرک شاک لگا تھا۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ صوفے سے اٹھ گئی تھی۔

''تم نے اسے بھی انوائٹ کر رکھا ہے؟'' موون نے غیظ کے عالم میں میکس سے پوچھا تھا۔ اس کے چہرے پر ناقابلِ فہم تاثرات چھائے تھے۔ گویا اسے مالا کی موجودگی نے بہت شاکڈ کیا تھا۔ وہ کم ازکم ... مالا کی یہاں توقع نہیں کر رہی تھی۔ اگرچہ اس کے انداز سے یہی ظاہر تھا تاہم مالا کو لگ رہا تھا وہ ڈرامہ کر رہی ہے۔ اسے پہلے سے خبر تھی کہ مالا بھی یہاں آئے گی۔ جبکہ میکس، موون کے الفاظ پر ہکا بکا رہ گیا تھا۔ پھر اس کے چہرے پر خفت سی چھا گئی تھی۔

''مالا سے میری اچھی جان پہچان ہے۔ یہ ہیرا کی دوست ہے اور تمہاری بھابی...... اگر اسے انوائٹ کیا ہے تو تمہیں کیوں برا لگا؟'' میکس اپنی شرمندگی مٹا رہا تھا۔ اور مالا کے سامنے موون کی اتنی تلخ بات کا اثر زائل کر رہا تھا۔ جبکہ مالا تو ششدر تھی جو ڈرائنگ روم میں صرف موون کھڑی تھی تو پھر سوزن اور آفاق کہاں تھے؟ اس نے پاگلوں کی طرح آنکھیں پھاڑ، پھاڑ کر پورا کمرا چھان مارا۔ اسے سوزن اور آفاق کہیں بھی نظر نہیں آئے۔ جانے وہ اچانک کہاں چلے گئے تھے؟ مالا کو دیکھ کر کہاں چھپ گئے تھے؟ اس کی موجودگی محسوس کر کے کس جگہ اور کہاں غائب ہوئے تھے؟ مالا کی آنکھیں صوفے کے پار، پردوں کے پیچھے دروازے کے دائیں بائیں دیکھ دیکھ کر تھکنے لگی تھیں جبکہ موون اس کی کیفیات سے بے نیاز مائی فٹ بولتی پیر پٹختی اسی غرور کے ساتھ واپس گھر چلی گئی تھی۔ جبکہ میکس جانے کیا بڑبڑا رہا تھا۔ مالا چونک کر میکس کی طرف متوجہ ہوئی۔

''آفاق اور سوزن کہاں ہیں؟'' اس نے کمرے میں میکس کے علاوہ کسی اور کو نہ پا کر متفکر لہجے میں پوچھا تھا۔ وہ موون کے چلے جانے پر قطعاً غور نہیں کر سکی تھی۔ وہ تو صرف آفاق اور سوزن کی آوازوں میں الجھی تھی۔

''وہ دونوں تو نہیں آئے۔ سوزن نے معذرت کر لی تھی جبکہ آفاق......'' میکس بولتے، بولتے ایک دم رک گیا تھا۔ جیسے اچانک اسے کچھ یاد آیا تھا۔ جیسے اچانک اسے کچھ خیال آیا تھا۔ پھر وہ سر جھٹک کر کچھ بولنا چاہتا تھا جب کاریڈور سے ہیرا اور ابوبکر کے بولنے کی آواز سنائی دی تھی تب وہ مسکراتا ہوا انہیں ویلکم کرنے باہر نکل گیا...... جبکہ جاتے جاتے اس نے مالا کی بڑبڑاہٹ سنی تھی۔

''سوزن اور آفاق کہاں چلے گئے؟ ابھی تو یہیں تھے اور میرے خلاف بول رہے تھے۔'' مالا کی خود کلامی میکس کو ضرور ٹھٹکا دیتی جو اگر ہیرا کی چہکار اس کا دھیان نہ بٹا دیتی۔ کچھ دیر میں میکس کے گنے چنے مہمان جمع ہو گئے تھے۔ پھر محفل زعفران زار بن گئی تھی۔ میکس نے تالیوں کی گونج میں کیک کاٹا تھا، وہ بچوں کی طرح خوش نظر آ رہا تھا۔ پھر اس نے سب سے پہلے مالا کا شکریہ ادا کیا، سب سے گفٹ وصول کرتے ہوئے وہ خوش ہونے کے ساتھ، ساتھ کچھ افسردہ بھی تھا۔ ابوبکر کے پوچھنے پر اس نے افسردگی سے کہا۔

''کیا تھا جو سوزن بھی میرا دل رکھنے کو آ جاتی۔ مگر اسے دل رکھنا آتا ہی کہاں ہے؟'' میکس کا لہجہ نم سا تھا۔ اداس اور غمزدہ سا عجیب سا آنچ دیتا ہوا...... جبکہ مالا تو اس کے الفاظ پر گویا دم بخود رہ گئی تھی۔

''سوزن بھی آ جاتی؟ سوزن آئی تو تھی...... یہ

میکس کیا بے وقوف ہے؟ یا مجھے احمق سمجھتا ہے؟" وہ انتہائی تلخی اور بدگمانی سے سوچ رہی تھی۔ اس نے سوزن اور آفاق کے ساتھ میکس کو بھی اسی کیٹگری میں کھڑا کر دیا تھا۔ دھوکے بازوں اور فریبیوں کی کیٹگری میں۔

☆☆☆

وہ ایک بھرپور شام گزار کر جب گھر واپس آئی تو آفاق کو لاؤنج میں کراہتے ہوئے پایا تھا۔ وہ صوفے پر گلا پکڑے لیٹا تھا۔ اور ہائے وائے کیے جا رہا تھا۔ مالا اسے دیکھ کر متحیر رہ گئی تھی۔ کیا آفاق چھلاوا تھا؟ پل میں ادھر اور پل میں اُدھر...... مالا اس پر تین حرف بھیج کر آگے بڑھ رہی تھی جب آفاق نے کراہتے ہوئے اسے پکارا تھا۔

"کیسی بہن ہو، تڑپتے بھائی کو نظر انداز کیے آگے بڑھ رہی ہو؟ رکتی کیوں نہیں؟ بندہ کسی کا احوال ہی پوچھ لیتا ہے۔" وہ کہنی کے بل سر اونچا کیے بڑی دکھی نظر سے مالا کو دیکھ رہا تھا۔ وہ آگے بڑھتے بڑھتے ایک دم رک گئی تھی۔ اسے آفاق کی ڈھٹائی پہ غش سا آ گیا تھا۔ کوئی اتنا ڈھیٹ بھی ہوتا ہے؟ کوئی اتنا بے شرم بھی ہوتا ہے؟ اس کا دل چاہ رہا تھا۔ وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹے اور آفاق کے منہ پر تین چار طمانچے دے مارے۔ اس کا دل چاہا وہ آفاق کا منہ توڑ کر اس کا کریہہ روپ، اندر کی سیاہی اور منافقت کا سارا کچا چٹھا کھول دے۔ مگر اس کے منہ پہ آیا سارا تلخ کلام ایک ضبط اور صبر کے تیز ریلے میں بہہ گیا تھا۔ اس نے انتظار کی طنابوں کو سختی سے پکڑ لیا۔ وہ تدبیر کرنے والے کی سب سے بہترین تدبیر کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے انتظار کرنا تھا۔ حقیقت کے کھلنے کا، سچائی کے ظاہر ہونے کا اور سون، سوزن، آفاق کی غلیظ پلاننگ کے کھلنے کا تو پھر وہ اتنا سارا انتظار کیوں نہ کر لیتی۔ جب تک علی عیسیٰ سب کچھ خود بخود نہ جان لیتا...... سو وہ اپنے اندر اٹھتی غصے کی لہروں کو دباتے ہوئے واپس پلٹ آئی تھی۔

"کیا ہوا ہے تمہیں......؟" نفرت اور غصے کو دبا کر بالکل پہلے کی طرح نارمل انداز میں بولنا کس قدر مشکل ترین امر تھا۔ مگر مالا نے یہ مرحلہ بالآخر طے کر ہی لیا۔ وہ آفاق سے کلام کرنے پر خود کو تیار کر چکی تھی۔

"گلے میں بہت درد ہے، دوا بھی لے کر آیا ہوں مگر کچھ افاقہ نہیں۔" آفاق نے تکلیف دہ کراہتی آواز میں کہا تھا۔ یقیناً وہ ہمدردی لوٹنے کے چکر میں تھا اور مالا اتنی رحم دلی کا مظاہرہ کرنے سے کترا رہی تھی۔

"تو صبر کرو، آرام آ ہی جائے گا۔" اس نے تلخی چھپا کر کہا۔

"اب صبر ہی تو کر رہا ہوں۔" وہ پھر سے کراہا۔

"تو اب میں کیا کروں......؟" مالا نے منہ بنا لیا تھا۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ اسے خوب کھری کھری سنا کر ہاتھ سے پکڑ کر گھر سے نکال دے مگر اسے صبر کی طناب کو ہاتھ سے نہیں چھوڑنا تھا۔ یہ اس نے خود سے وعدہ کر رکھا تھا اور وہ عہد توڑنے والی بننا نہیں چاہتی تھی۔

"ایک کپ قہوہ بنا دو، مجھے لگتا ہے، قہوے سے افاقہ پاؤں گا۔" آفاق نے مسکین صورت بنا کر فوراً فرمائش جڑ دی تھی۔ اب ہونا تو یہ چاہیے تھا وہ کھٹ سے اسے جواب دے دیتی مگر اس ازلی مروت کا کیا کرتی؟ پھر وہ اپنی بدمزاجی سے آفاق کو چوکنا کرنا بھی نہیں چاہتی تھی، اس کا بدلہ رویہ دیکھ کر یقیناً وہ وجہ کھوج کر محتاط ہو سکتا تھا اور مالا اسے محتاط نہیں کرنا چاہتی تھی، وہ ایسی ہی کسی سازشی پلاننگ میں آفاق اور سوزن کو رنگے ہاتھوں پکڑنا چاہتی تھی۔ خصوصاً اس وقت جب عیسیٰ بھی قریب ہوتا۔ اور اسے پوری امید تھی اللہ اسے بہت جلد ایسا ہی کوئی موقع فراہم کرنے والا تھا۔ ابھی چند گھنٹے پہلے ہی آفاق، مالا کے لیے کتنے بے ہودہ الفاظ بول رہا تھا، وہ اس کا دشمن تھا اور آستین میں بیٹھ کر عیسیٰ پر وار کرنے والا

تھا۔اس کے باوجود یہ مالا کے حوصلے،صبر اور ہمت کی انتہا تھی جو وہ آفاق کے لیے قہوہ بنالائی تھی ورنہ اسے آفاق کے الفاظ بھولے تو نہیں تھے۔

"اس فلم کا ڈائریکٹر آفاق یعنی اسلاق یعنی کہ میں ہوں......علی عیسٰی کی آستین میں آرام فرمانے والا ڈِش،ڈِش اور ڈِش---" قہوہ بناتی مالا نے سختی سے آنکھیں میچ لی تھیں۔ کچھ دیر میں وہ قہوہ ابل گیا۔ اس نے مگ میں قہوہ انڈیل کر باہر کی طرف دیکھا۔ آفاق گلا دباتے ہوئے ابھی تک کراہ رہا تھا۔ جانے وہ تکلیف میں تھا یا محض اداکاری کر رہا تھا۔ کچھ گھنٹے پہلے کی اپنی بکواس کو کسی ڈرامائی سین کی طرح اسکرپٹ سے غائب کرنا چاہ رہا تھا۔ اس کی کراہیں مالا کو کچھ دیر پہلے کی تکلیف اور زہریلے الفاظ بھولنے پر مجبور نہیں کر سکتی تھیں جب ایک مرتبہ انسان نظر سے گر جاتا ہے تو کبھی دوبارہ اٹھ نہیں پاتا۔ سوزن اور آفاق، مالا کی نظر سے گر چکے تھے۔ اب وہ دوبارہ اپنا مقام زندگی کی آخری سانس تک بھی بحال نہیں کر سکتے تھے۔ کہتے ہیں نا، زمین پر گرا انسان اٹھ سکتا ہے، البتہ آنکھ سے گرا کبھی نہیں اٹھ سکتا۔ اسے انسانوں کی پہچان اس سے پہلے نہیں تھی۔ انسانوں کی پہچان اسے اب ہوئی تھی۔ آگہی کا عذاب بہت اذیت ناک ہوتا ہے اور مالا آگہی کے اس عذاب سے گزر رہی تھی۔

اس نے مگ اٹھا کر ٹرے میں رکھا۔ پھر کچھ سوچ کر ٹرے وہیں سلیب پر چھوڑ کر خود باہر آگئی تھی۔ اس نے مگ کو کنڈے سے پکڑ رکھا تھا اور پھر آفاق کو مگ پکڑاتے ہوئے اس نے دانستہ کنڈا نہیں چھوڑا، مجبوراً آفاق کو مگ نیچے سے پکڑنا پڑا تھا۔ گرم قہوے کی وجہ سے مگ بہت گرم تھا۔ آفاق کا ہاتھ بری طرح جل گیا۔

"ہائے، وائے، اوئی......امی جی۔" آفاق اچھل کر سیدھا ہوا تھا،تب تک مالا نے مگ احتیاط سے دور ہٹا کر سینٹرل ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ "جلن بجھی ہو یا زیادہ،مگر ہوتی ضرور ہے۔" اس نے مڑ کر صوفے پر رکھے کشن سیدھے کیے تھے پھر ایک میگزین اٹھا کر دیکھنے لگی۔ جانے یہ میگ کون لایا تھا؟ مالا تو ایک دو صفحات سے زیادہ نہیں دیکھ سکی تھی۔ آج سے پہلے اس گھر میں مالا نے ایسا کوئی بھی میگزین نہیں دیکھا تھا۔ ایک فحش اور بے ہودہ......اسے میگزین پکڑے دیکھ کر آفاق اپنے ہاتھ کی جلن بھلا کر میگ پر جھپٹ پڑا تھا۔ پھر ایک دم اپنی جگہ سے اٹھا اور تیز، تیز قدموں سے چلتا ہوا باہر نکل گیا۔ مالا بھی بجلی کی سی تیزی کے ساتھ گلاس ونڈو کی طرف بھاگی تھی۔ وہی نائیلون کے جالی دار پردے کو ہٹا کر مالا نے باہر جھانکا تو آفاق کو میگ پھاڑ کر ڈسٹ بن میں پھینکتے ہوئے دیکھ کر کچھ متحیر رہ گئی تھی۔ کچھ دیر بعد آفاق ہاتھ جھاڑتا اندر آگیا۔

"یہ میگزین کون لایا تھا؟ عیسٰی دیکھ لیتا تو قیامت آجاتی۔" آفاق تیز تیز بولتا گلے میں سے گرر گرر کرتی آواز کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ تب مالا کی بھنویں ایک دم تن گئی تھیں۔

"تمہاری اس بات کا مطلب کیا ہے؟ ذرا وضاحت کرو گے؟ یہ میگزین کون لایا تھا؟" مالا نے جیسے اس کے لہجے اور الفاظ کی نقل اتاری تھی۔

"مجھے کیا پتا......؟" آفاق نے کندھے اچکائے تھے پھر مگ اٹھا کر قہوہ سڑکنے لگا۔ اس کی......بے نیازی نے مالا کا اشتعال کچھ اور بڑھا دیا تھا۔

"تو پھر کیا یہ بے ہودہ میگ میں لائی ہوں؟" اس کی آنکھوں سے شرارے نکلنے لگے تھے۔ انتہائی بے ہودہ تصویروں والا وہ رسالہ جس پر مالا نے دوسری نگاہ بھی نہیں ڈالی تھی اور اسے اپنے گھر کے نیوز پیپر ریک میں دیکھ کر اسے غصہ تو آنا ہی تھا۔

"میں نے یہ تو نہیں کہا......؟" آفاق اس کے غصے سے ایک دم سہم گیا تھا۔ (ایکٹر نہ ہوتو) وہ خوں رنگ آنکھوں سے مسلسل اسے گھور رہی تھی۔

"تو پھر......؟" وہ اسے بخشنے والی نہیں تھی۔

آفاق کچھ ہونق ہو گیا۔
"تم کیا سمجھ رہی ہو، یہ میگزین میں لایا ہوں؟" آفاق نے سنجیدگی کے ساتھ پوچھا تھا۔ قہوہ پینے سے گلے کو تقویت ملی تو وہ بھی فارم میں آ گیا۔
"پھر کون لایا ہے؟ عیسیٰ؟ میں یا چاچو....؟"
مالا کے تیور غضبناک تھے۔ آفاق پھر سے سہم گیا۔ ڈرامے باز صاف ایکٹنگ کرتا نظر آ رہا تھا۔
"آئی سوئیر مالا......! مجھے اتنے بے ہودہ رسالے خریدنے کا کوئی شوق نہیں۔" آفاق اب... بڑی عاجزی سے کہہ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد یہ بے مقصد بحث عیسیٰ کی آمد کے ساتھ ہی ختم ہو گئی تھی۔ عیسیٰ کے آتے ہی مالا کو میکس کی پارٹی میں مون، سوزن اور آفاق کی بکواس پھر سے یاد آ گئی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ فوراً آفاق کا کچا چٹھا کھول کر رکھ دے مگر بعض قوی خواہشات جتنی بھی قوی ہوں ان کو پورا کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ وہ بھی بے بس ہو کر رہ گئی تھی۔ ایک انتظار کی زنجیر میں بندھ گئی تھی۔ وہ قبل از وقت کچھ بھی بول کر عیسیٰ کو بدگمان کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اپنا اعتبار ہلکا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی خواہش تھی عیسیٰ خود سوزن، مون اور آفاق کی اصلیت کھوج نکالے، ان کی مکاری، عیاری اور سازش کو سمجھے اور ایسا ناممکن تو ہرگز نہیں تھا۔
عیسیٰ کے آتے ہی مالا کی مصروفیات بڑھ جاتی تھیں، اسے سوچنے کا بھی وقت نہیں ملتا تھا۔ ان دنوں عیسیٰ رات کو بھی گھر میں رہتا تھا سو وہ بے نام سا خوف اور عجیب سی آہٹیں سنائی نہیں دیتی تھیں۔ کبھی، کبھی مالا کو لگتا تھا یہ اس کے اپنے ہی ذہن کے وسوسے ہیں، سو وہ سر جھٹک کر نظر انداز کر دیتی تھی ویسے بھی بڑے دنوں سے وہ سفید لبادے میں لپٹی عورت دکھائی نہیں دی تھی۔ مالا کی ماری ہوئی کلی نے جیسے گولی کا کام کیا تھا۔ وہ دوبارہ دکھائی ہی نہیں دی۔ حالانکہ مالا کو اس سے دوبارہ ملاقات کا خاصا اشتیاق تھا۔

چونکہ بہت دنوں سے کوئی عجیب واقعہ رونما نہیں ہوا تھا سو چاچو سمیت سبھی دلی اطمینان محسوس کر رہے تھے۔ حالانکہ جانتے بھی تھے کہ یہ اطمینان بس عارضی ہے۔ تاہم کچھ دن تک سکون سے تو رہا جا سکتا تھا۔ اس دوران آفاق نہ جانے کہاں سے ایک بزرگ خاتون کو دریافت کر لایا تھا۔ جنہوں نے پورے گھر کے کونے، کونے پر زعفران اور گلاب کے عرق میں بھیگے تعویذ والے پانی سے چھڑکاؤ کیا تھا پھر بلند آواز میں قرآنی آیات کی تلاوت پورے تین دن تک کرتی رہی تھیں۔ جرمنی میں ایسی نگینہ بزرگ عورت کو دیکھنا بہت تعجب انگیز تھا۔ پھر مالا کو پتا چلا کہ یہ بزرگ عورت ڈاکٹر ابوبکر کی والدہ ہیں جو ایران سے آئی تھیں اور ان کے پاس روحانی علم تھا۔ ہیرا کی سائیں سے مل کر مالا کے بہت سے وسوسے خود بخود ختم ہو گئے تھے۔ ہالہ صاحبہ نے بتایا تھا ان کے گھر پر کوئی بھی آسیب نہیں ہے۔ مالا اپنے دل سے ہر وہم نکال دے۔ انہوں نے مالا کو کثرت سے ذکرِ الٰہی کے متعلق ہدایات دی تھیں اور جاتے، جاتے انہوں نے انکشاف کیا تھا کہ مالا کسی کی بدنظر کے حصار میں ہے اور ستاروں کی نحوست کا اس پر اثر ہے۔ ہالہ صاحبہ ایک ہفتے کے لیے جرمنی آئی تھیں۔ انہیں جلد واپس چلے جانا تھا۔ اور مالا چاہتی تھی کہ جانے سے پہلے وہ ان کی دعوت کرے۔ اس ضمن میں اس کا پروگرام بھی طے ہو چکا تھا جو جلد ہی ترتیب پایا اس روز کھانے کے دوران بھی مالا یہی ڈسکس کرنا چاہتی تھی مگر آفاق اور عیسیٰ نے ایک الگ موضوع چھیڑ رکھا تھا۔ وہ نوٹ تو کب سے کر رہی تھی کہ آفاق، عیسیٰ کے کانوں میں گھسا ہوا ہے مگر اپنی سوچوں میں گم ہونے کی بیماری کے باعث وہ ان کی گفتگو سننے سے محروم رہ گئی تھی۔ اب جبکہ وہ ان دونوں کی طرف متوجہ ہو چکی تھی تو وہ دونوں ہی منہ بند کیے کھانا کھانے میں مگن ہو چکے تھے۔ عیسیٰ کے چہرے پر...

بے نیازی تھی جبکہ آفاق کا منہ پھولا ہوا تھا۔ جانے ان کے درمیان کیا بات ہوئی تھی؟ مالا کو فطری سا تجسس ہونے لگا تھا۔ کچھ دیر بعد آفاق نے خود ہی بات چھیڑ دی۔ وہ زیادہ دیر چپ نہیں رہ سکتا تھا۔

"تمہیں میرا کچھ احساس ہی نہیں......" وہ دکھی سا نظر آرہا تھا۔ لہجے میں ہزاروں شکوے تھے۔ مالا کو اس کی اداکاری پر سخت تاؤ آنے لگا تھا۔ خصوصاً جب وہ عیسیٰ سی شکل بنا کر اپنی کوئی بھی بات عیسیٰ سے منوا لیتا تھا۔ اور عیسیٰ ایسا نرم دل تھا کہ اس فوراً پسیج جاتا۔

"تمہارا احساس نہ ہوتا تو تم میرے سامنے بھی بیٹھے نہ ہوتے۔" عیسیٰ نے پانی کا گلاس اٹھا کر لبوں سے لگا لیا تھا جو کچھ دیر پہلے مالا نے بھر کے رکھا تھا۔ وہ معمول کے مطابق عیسیٰ کی پلیٹ میں کچھ نہ کچھ رکھتی جارہی تھی۔ حالانکہ پہلے یہی معمول عیسیٰ کا تھا مگر اب مالا نے اس کی گدی سنبھال لی تھی۔ آفاق سے یہ منظر دیکھا نہیں گیا تھا، فوراً منہ بسور کر بولا۔

"تم چاہتے ہی نہیں، میرا بھی کوئی خیال رکھے مالا کی طرح......" آفاق کے دکھ کا پس منظر سمجھتے ہی دفعتاً مالا کے منہ میں کڑوے بادام آگئے تھے۔ یقیناً وہ انی سے شادی کی بات کررہا تھا۔ ایک منافق، فریبی اور مکار شخص معصوم سی انی کو اپنے جال میں پھانسنے والا تھا۔ کیا خبر، آفاق کی اس میں بھی پلاننگ شامل ہو...... وہ جہیز بٹوا کر انی کو چھوڑ دے یا کوئی اور بڑا اڑان لے جائے۔ بھلا منافق اور جھوٹے لوگوں پر بھروسا کیا جاسکتا ہے؟ مالا کے اندر باہر بے چینی بھر گئی تھی۔ وہ اپنی مخلص سہیلی کو کیسے اس فراڈیے سے بچا پاتی؟

"میں کیوں نہیں چاہوں گا......؟" عیسیٰ نے کھانا ختم کرکے نیپکن سے ہاتھ پونچھے تھے۔ اب وہ فراغت کے ساتھ آفاق کو لاجواب کرسکتا تھا۔ "میں تو چاہتا ہوں، کل کے بجائے آج تمہارا نکاح پڑھا دوں...... کم از کم تمہاری بد نظر کا فوکس تو بدلے گا۔ ضرور تم میری اور مالا کی محبت کو نظر لگانے والے ہو۔" وہ آنکھوں میں شرارت بھرے اسے چھیڑ رہا تھا۔ عیسیٰ کی توقع کے عین مطابق وہ فوراً برا مان گیا۔

"میں کیوں نظر لگاؤں گا۔ بھلا بہنوں کے شوہروں کو نظر لگائی جاتی ہے؟" اس پل جو بھولپن آفاق نے اپنے چہرے پر پینٹ کر رکھا تھا مالا کو ایک دم مُد ماسک لگا۔ اس کا دل چاہا، آفاق مکار لومڑے کا منہ ہی نوچ لے۔ مگر وہ یہ سب صرف سوچ سکتی تھی۔ عمل کرنا آسان نہیں تھا۔

"اب مسکہ مت لگانا...... میں اپنی...... بے غم (بیگم) کے ہاتھ کا لذیذ کھانا کھا کر فل ہوچکا ہوں۔" عیسیٰ نے مسکرا کر جتایا۔

"تو پھر تنگی سے کچھ آگے بھی بڑھو۔" آفاق بری طرح چڑ گیا۔

"ہوں...... تو یہ بات ہے۔" وہ گویا سمجھ کر مسکرایا تھا۔ آفاق نے فوراً باچھیں کھلا لیں۔

"جی ہاں...... یہی بات تو تھی۔" آفاق ضرورت سے زیادہ ہی ایکسائٹڈ ہوگیا۔

"بھلا کون سی......؟" عیسیٰ نے اگلے ہی لمحے اس کی پوری ایکسائٹمنٹ کا بیڑا غرق کردیا تھا۔ وہ ایک مرتبہ پھر منہ پھلا کر بیٹھ گیا۔

"بھاڑ میں جاؤ تم۔" آفاق کو غصہ آگیا۔ ادھر مالا برتن اٹھاتی ٹھٹک کر رک گئی تھی۔

"بھاڑ میں جاؤ تم......" وہ زیر لب بڑبڑاتی پھر جیسے پھٹ پڑی۔ "اور تم بھی۔" مالا کا ردِعمل اچانک سامنے آیا تھا۔ وہ دونوں بری طرح سے چونکے تھے۔ مالا ان کے تاثرات دیکھنے رکی نہیں تھی بلکہ فوراً ہی کچن میں چلی گئی۔ آفاق اس کی بات پر کچھ دیر تک کے لیے بھونچکا رہ گیا تھا پھر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

مالا کی زندگی کس نہج پر جا رہی تھی وہ خود بھی سمجھنے سے قاصر تھی کیا جلی عیسیٰ بھی مالا کے ساتھ "کھیل" کھیل رہا تھا؟ یہ سب جانیے! اگلے ماہ کے شمارے میں

ناولٹ

ترکِ وفا

نایاب جیلانی



آٹھواں حصہ



ہالہ صاحبہ کی دعوت کے لیے اس نے بڑا اہتمام کر رکھا تھا...... ڈیڑھ گھنٹا لگا کر تو اس نے محض صرف کھانے پینے کی اشیا کے متعلق لسٹ بنائی تھی، سوسے سے لے کر پفان کوخن تک البتہ پڑا اس نے خود ہی بیک کر لیا تھا، کیرشے، اردبیرے اور پفیر زخ کی سلاد بنائی پھر ہن خن (چوزے کے گوشت) کو سیخوں پر بھونا...... کوئلے دہکا کر سیخوں پر بوٹی چڑھا کر پکانے کا الگ ہی مزہ تھا تاہم یہاں وہ کوئلے لانے کا تردد کیسے

کرتی......؟ نرم، نرم بوٹیوں کو سیخوں میں گھبا کر الیکٹرک تندور میں پکایا تھا۔ پھر جب ایک، ایک کرکے تمام سیخیں ٹرے میں سجائیں تو پورا کچن اشتہا انگیز خوشبو سے مہک گیا تھا...... املی اور آلو بخارے کی چٹنی بوٹیوں پر پگھل رہی تھی...... کھٹی میٹھی اور نمکین سے ذائقے اور خوشبو میں لتھڑی بوٹیوں نے چاچو کو کمرے سے کھینچ کر باہر نکال دیا تھا...... وہ خوشبو کا پیچھا کرتے دبے قدموں کچن میں چلے آئے...... مالا نے سیخیں ٹرے میں سجا کر رکھی تھیں۔ اس کی دروازے کی طرف پشت تھی اور اب وہ پزا بیک کرنے کی تیاریوں میں مگن تھی۔

چاچو نے ایک سیخ اڑائی اور پھر الٹے قدموں واپس ہولیے۔ عموماً عیسٰی ان کا ڈائٹ چارٹ بناتا تھا جس میں ایسی کسی بد پرہیزی کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی تھی...... مگر وہ کبھی کبھار ایسی انجوائے منٹ ضرور کرلیتے تھے۔ اب ہوا یوں کہ چاچو چپکے سے کھسک لیے تھے جبکہ مالا کو ہلکی سی آہٹ سنائی دی تھی۔ قدموں کی ہلکی سی چاپ جیسے کوئی کچن میں دبے قدموں داخل ہوا تھا... پزا کے لیے ٹائمر سیٹ کرتے مالا کے ہاتھ ہولے سے کپکپا گئے تھے۔ اس کا دل یک لخت بہت زور سے دھڑکا تھا مگر اس نے گردن موڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ خوف کچھ اس طرح سے حواسوں پر چھایا تھا کہ وہ پیچھے مڑ کر دیکھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ مگر ہوا کچھ یوں کہ "اوف" کی بھیانک آواز نے مالا کو گردن موڑ کر پہلے دیکھنے پر مجبور کردیا تھا۔ پھر چاچو کو سیخ چھپاتے اور ہونٹ سہلاتے دیکھ کر مالا گویا سمجھ گئی تھی۔ وہ گرما گرم بوٹی منہ میں رکھنے کی غلطی میں "پکڑے" جاچکے تھے۔ صورتِ حال مضحکہ خیز تھی۔ مالا کو بے طرح ہنسی آگئی۔

"دیکھ لیا چوری کرنے کا انجام......" وہ صافی سے ہاتھ پونچھتی چاچو تک آئی تھی جو ذرا بھی شرمندہ نظر نہیں آرہے تھے۔ تاہم اسے ہنستا دیکھ کر قدرے برا مان گئے۔

"تم ہنس لو، ہمارے حال پر......" وہ پھونک مار کر خالص دیسی طریقے سے بوٹی کھاتے ہوئے مزے سے بولے تھے۔ مالا انہیں یکے بعد دیگرے تیسری بوٹی پہ ہاتھ صاف کرتے دیکھ کر فوراً چیخی تھی۔

"بس کریں چاچو! کیوں اپنے بیٹے سے مجھے پٹوانا ہے۔" وہ کچھ خوف زدہ بھی تھی کیونکہ املی کی کھٹی چٹنی کے اثرات جلد ہی ان کی خرابیِ طبیعت کی صورت میں ظاہر ہوسکتے تھے پھر عیسٰی کا غصہ سہنا الگ تھا...... وہ اس بات پر ذرا بھی کمپرومائز نہیں کرتا تھا۔ اپنے باپ کی صحت اور ان کی زندگی عیسٰی کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ تھی۔ وہ اپنے باپ پر جان دیتا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ مما کی دائمی جدائی پر وہ جلد سنبھل گیا تھا مگر باپ سے کچھ ایسا لافانی عشق تھا کہ اسے لگتا، پاپا کو کچھ ہوگیا تو وہ زندہ نہیں رہ پائے گا...... کچھ ایسی ہی محبت میں وہ مبتلا تھا۔ جب سے وہ اسپتال رہ کر آئے تھے تب سے تو عیسٰی کچھ زیادہ ہی بے یقینی کا شکار تھا۔ گھر میں ہوتا تو رات کو لازمی دو تین مرتبہ پاپا کے کمرے میں جھانک کر آتا۔ اکثر وہ عیسٰی کی چوری پکڑ لیتے۔ وہ آتا بھی تو دبے پاؤں تھا۔ پاپا کو سوتا دیکھ کر پُرسکون ہوجاتا اور جاگتا دیکھ کر جھینپ جاتا۔

"نہیں مرنے والا میں...... ابھی تمہارے بچوں کے بچوں کو بھی کھلانا ہے۔ کیوں دھڑکا لگا رہتا ہے تمہیں۔" اگر ان کی آنکھ کھل جاتی تب عیسٰی کی خیر نہیں ہوتی تھی۔ وہ اس کی خوب کلاس لیتے مگر اس ڈانٹ ڈپٹ میں بھی محبت کا الگ قسم اور رنگ کا ذائقہ گھلا ہوتا تھا۔ وہ عیسٰی ہی کیا جو اُن کی ڈانٹ پر کان دھر لیتا...... اس نے اپنی روٹین ترک نہیں کی تھی۔ وہی صبح ان کو اپنی نگرانی میں کچھ نہ کچھ کھلانا، لنچ ٹائم میں مالا کو ہدایات اور ڈنر کے وقت پھر سے کڑی نگرانی ہوتی تھی۔ اکثر چاچو چڑنے لگتے۔

"میرے کھانے پینے کے دشمن! کھالینے دو مجھے، اپنے حصے کا رزق ختم کرتا ہوں۔" وہ بد پرہیزی میں پی ایچ ڈی کیے ہوئے تھے۔ انہیں بھلا کون روک سکتا تھا۔ جس طرح مالا اب بھی انہیں روک نہیں پائی تھی اور وہ مزے سے کوک کا گلاس بھی چڑھا گئے تھے پھر جیسے انہیں اچانک خیال آیا تھا۔

"یہ نینی کدھر ہے؟" وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ذرا حیران ہوئے۔

"وہ چھٹی پر ہے۔" مالا نے بے پروائی سے بتایا تھا۔ وہ سادہ اسفنج کیک شیشے کے چمکیلے باؤل میں سجا کر کیک کے اوپر جیم کی موٹی تہ جما رہی تھی پھر اس نے کیک کے سینڈوچ بنالیے، درمیان میں خوب ڈھیر سارا جیم بھر رکھا تھا۔ ان سلائسز کو کرسٹل کے ڈش نما باؤل میں سلیقے سے اس نے پھیلا دیا تھا۔ اب وہ فریج سے دودھ نکال رہی تھی جس میں اس نے بالائی پہلے سے مکس کر رکھی تھی۔ کام کرتے ہوئے بھی اس کا دھیان چاچو کی طرف تھا۔

"یہ نینی بہت چھٹیاں کرنے لگی ہے۔ اسے خبر بھی ہے، تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں مگر یہ سیلفش لوگ، بس اپنی دفعہ ہزار رونے سنا دے گی مگر دوسروں کی پروا نہیں۔" انہیں مالا کی بہت فکر تھی سو اسی لیے نینی کو ڈانٹ رہے تھے حالانکہ نینی کو اس گھر میں خاصی کھلی چھوٹ دی گئی تھی۔

"میں ٹھیک تو ہوں چاچو......" مالا جھینپی جھینپی سی بولی تھی۔ آج کل اس کی خرابیِ طبیعت بھی عیسٰی اور چاچو کے لیے سخت قسم کا ایشو بنا ہوا تھا۔ ان دونوں باپ، بیٹے کو مالا کے آرام، صحت اور ڈائٹ کے متعلق ہدایات دینے کا خبط سوار تھا اور دونوں ہی مالا کے لیے حد درجہ کانشس تھے۔ چاچو کو تو مالا کا کچن میں ان دنوں جانا سرے سے گوارا ہی نہیں تھا۔ یہ تو مالا جان بوجھ کر ضد کرلیا کرتی تھی۔ ویسے بھی وہ آرام کر کر کے اور فارغ رہ، رہ کر اکتا چکی تھی۔ ان دنوں عیسٰی نے اس کا شولے جانا بھی بند کر رکھا تھا سو وہ کبھی اکتائیاں کرتی اور کچھ دیر آرام کرکے پھر کچن میں گھس جاتی۔ دراصل کچن کی مصروفیت کے علاوہ کوئی اور مصروفیت بھی تو نہیں تھی۔

"ہاں...... ٹھیک تو ہو ماشاء اللہ سے۔" انہوں نے مالا کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔ پھر کچھ خیال آنے پر بولے۔ "کب تک آئیں گے مہمان؟" ان کی نگاہ گھڑی پر جمی تھی، مالا نے بھی گھڑی کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔

"بس ایک گھنٹے تک......" اب وہ جیم بھرے کیک کے ٹکڑوں پر ٹھنڈا کسٹرڈ ڈال رہی تھی۔ پھر اس نے کٹی ہوئی چیری اور کیلے بھی کسٹرڈ پر پھیلا دیے۔ جیلی کے ٹکڑے بھی سج گئے تھے۔ یہ کچن میں آخری آئٹم اس کے ہاتھوں تیار ہوا تھا۔ اب وہ ہاتھ دھو کر ان کے پیچھے ہی باہر نکل آئی تھی۔ چاچو کمرے میں جانے کے بجائے صوفے پر بیٹھ گئے تھے۔ یقیناً مہمانوں کے استقبال اور انہیں خوش آمدید کہنے کے لیے...... ویسے بھی ہالہ صاحبہ کا ان لوگوں کے دلوں میں بڑا احترام بھر گیا تھا۔ خصوصاً اس وقت جب انہوں نے مالا کے دل سے آسیب کا وہم نکال دیا تھا۔ اب چاچو اسے آسیب کے حوالے سے چھیڑتے نہیں تھے، وہ تو اسی بات پر ہالہ صاحبہ کے شکر گزار تھے جنہوں نے مالا کے ذہن سے وسوسے نکال دیے تھے۔ اب بھی ہالہ صاحبہ کے متعلق باتیں کرتے انہوں نے اچانک انی کی فیملی کے متعلق بھی پوچھ لیا تھا۔

"کیا سامنے والوں کو کھانے پر نہیں بلایا؟" چاچو نے کچھ چونک کر مالا سے پوچھا تھا جو جانے کس مراقبے میں مصروف تھی۔ ایک دم ہڑبڑا کر اُن کی طرف متوجہ ہوئی۔

"بلایا ہے چاچو......! عیسٰی نے خود انہیں انوائٹ کیا ہے۔" مالا کچھ کھنچے، کھنچے انداز میں بولی تھی۔ چاچو نے اپنے دھیان میں مالا کا رویہ نوٹ نہیں کیا تھا ورنہ وہ ضرور کھٹکتے...... انی کی فیملی سے مالا کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ وہ انہیں بخوشی کھانے پہ بلاتی مگر آج کے بلاوے کا کچھ خاص مقصد تھا۔ یعنی آج عیسٰی، انی کی ممی سے آفاق اور انی کے نکاح کی بات کرنے والا تھا اور مالا کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ عیسٰی کو کیسے روکے...... انی کو آفاق کی اصلیت کیسے بتائے؟ اور وہ اس بہت اچھی فیملی کو آفاق کے "شر" سے کیسے محفوظ کرے، کبھی اس کا دل چاہتا وہ انی کو صاف،

صاف آفاق اور سوزن کی ملی بھگت کا بتا دے......؟ مگر وہ بتائے بھی کیا......؟ اگر کسی نے ثبوت مانگ لیا تو...... یہاں آکر اس کے تمام ارادے ڈانواں ڈول ہو جاتے تھے۔ اسے نہیں لگتا تھا کہ وہ کبھی عیسیٰ اور انی کو آفاق کے کرتوت بتا سکے گی۔ یہ کہ رات کی تاریکی میں وہ مالا کے گھر میں، مالا کو ہی آسیب کا دھوکا دے کر سوزن اور مون کے ساتھ گہری پلاننگ کے بعد سے ''خوفزدہ'' کر رہا ہے۔ بات عقل میں سمانے والی تو تھی اگر کوئی سمجھ لیتا تو تب ناں...... انی تو عیسیٰ کی طرح ہی آفاق کی اچھائیوں اور محبت میں اندھی ہو چکی تھی۔ اسے تو آفاق کے علاوہ کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا۔ اسی طرح عیسیٰ بھی آفاق پر اندھا اعتماد کرتا تھا...... اگر جو میکس کے گھر میں ہونے والی سوزن، مون اور آفاق کی گفتگو عیسیٰ کو سنوا دی جاتی تو تب...... ہاں تب عیسیٰ یقین کر سکتا تھا...... پھر اسے کسی اور ثبوت کی ضرورت بھی محسوس نہ ہوتی...... اور شاید بہت سے لوگ آفاق کے شر سے محفوظ رہ جاتے۔ تو کیا اسے کوئی ریکارڈ پلیئر اپنے ساتھ رکھنا چاہیے تھا؟ ہاں، وہ ایک ریکارڈ پلیئر ضرور خریدے گی۔ پہلی فرصت میں، آج نہیں کل ہر صورت......'' وہ جیسے ایک نتیجے پہ پہنچ کر مطمئن ہو گئی تھی۔ چاچو اس کی سوچوں سے بے نیاز مشہور اتھلیٹ کارل لیوس کے کارنامے ٹی وی پہ ملاحظہ کر رہے تھے پھر انہوں نے گردن موڑ کر مالا کو دیکھا اور بولے۔

''میں عیسیٰ سے کہوں گا، اب آفاق اور انی کے بارے میں بھی کچھ سوچ لے۔ انی کے یہاں آنے سے تمہاری تنہائی بٹ جائے گی۔ میں بڈھا تو بیماری کے جھٹکے کی وجہ سے اب بولنے اور گپ شپ لگانے سے بھی ریٹائرڈ ہو گیا ہوں۔'' وہ مالا کو گم صم بیٹھا دیکھ کر اسے اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے۔ مالا کچھ سوچ کر سیدھی ہو گئی تھی پھر اس نے حیرانی سے چاچو کو مخاطب کیا تھا۔

''تو کیا شادی کے بعد بھی آفاق اِدھر رہے گا؟''

اس کے لہجے میں واضح چبھن اور ناگواری تھی۔ یوں کہ لاؤنج کے دروازے سے اندر آتا آفاق لمحے بھر کے لیے ٹھٹک کر رک گیا تھا۔

''میری اور عیسیٰ کی خواہش تو یہی ہے۔ تاہم آفاق شاید نہ مانے۔'' چاچو نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا تھا۔ گویا اس موضوع پر وہ آفاق سے طویل بحث کر چکے تھے مگر آفاق شاید مان نہیں رہا تھا۔ اس کے باوجود مالا نے حیرت اور ناگواری کا برملا اظہار کرتے ہوئے آفاق کے سر پر طنز کی ضربیں ماری تھیں۔ وہ آفاق کو اندر آتے اور دروازے میں رکتے دیکھ چکی تھی۔ اب وہ اتنا سنہری موقع بھلا کیسے گنوا دیتی۔ آفاق کو غیرت دلانے کا یہی تو بہترین وقت تھا۔

''آفاق کیوں نہیں مانے گا، یہ جگہ ہر لحاظ سے بہتر ہے اس کے لیے، نہ کرائے کا جھنجٹ اور نہ کھانے کا بل...... سب کچھ ریڈی میڈ اور فری میں مل جاتا ہے۔'' مالا نے کن انکھیوں سے دروازے کی طرف دیکھا تھا۔ اسے آفاق کے جوتے نظر آرہے تھے۔ وہ زمین پر پیر جمائے کھڑا تھا۔ شاید خفت زدہ تھا یا غصے میں۔۔۔ بہرحال، مالا اس کے چہرے کی طرف دیکھ نہیں سکتی تھی۔ حالانکہ وہ آفاق کے تاثرات دیکھنا چاہتی تھی۔

''وہ تو بڑا خوددار لڑکا ہے بیٹا......! بس عیسیٰ کی وجہ سے مجبور ہو جاتا ہے۔'' چاچو نے برابر آفاق کی حمایت جاری رکھی تھی۔ اِدھر مالا، آفاق کی تلملاہٹ کا مزہ لینا چاہتی تھی۔ وہ اسے چھپ کر ذلیل اور خوفزدہ کرتا تھا، مالا اسے سامنے کھڑا کر کے طنز کے تیر پھینک رہی تھی۔ اب اتنا تو وہ جانتی ہی تھی کہ آفاق اب یہاں زیادہ دیر ٹھہرنے والا نہیں۔ زیادہ نہ سہی تھوڑی بہت تو اس میں غیرت ضرور ہو گی۔ اب مالا کے اتنے کھلم کھلا اشارے کو بھی نہ سمجھتا تو پھر آفاق کی مکاری پر بھی لعنت ہی تھی مگر وہ بے غیرت اتنی مراعات چھوڑ کر جاتا بھی کیوں...... یہاں سے چلا جاتا تو مالا کو آنوں بہانوں سے خوف زدہ کیسے کرتا؟ آفاق کو تو ہر پہلو پہ سوچنا تھا جبکہ مالا سمجھ رہی تھی کہ اس کی طنزیہ گفتگو سن کر وہ بوریا بستر سمیٹے فوراً نو دو گیارہ ہو جائے گا مگر ایسا نہ ہو سکا۔ وہ چاچو کے محبت بھرے جملوں کو سیلوٹ کرتا فوراً اندر چلا

آیا تھا۔ پہلے کی طرح ہشاش بشاش اور ہنستا مسکراتا...... وہ کمال کا ایکٹر تھا۔ اتنی بکواس سن کر بھی بے غیرتوں اور ڈھیٹوں کی طرح مسکرا رہا تھا۔ اپنے جلد آنے کی اس نے وجہ یہ بتائی تھی کہ عیسیٰ نے اسے گھر بھیجا تھا تاکہ وہ مالا کی کچھ مدد کروا دے۔ مارکیٹ سے کچھ لانا ہے تو وہ بھی لا کر دے۔ چاچو تو آفاق کو دیکھ کر ویسے بھی کھل اٹھتے تھے۔ اب بھی اسے کچن کے کاموں میں دلچسپی لیتا دیکھ کر فوراً بولے۔

''مالا نے سب کچھ بنا لیا ہے۔ تم چینج کر کے آجاؤ، شطرنج کی ایک بازی ہو جائے۔'' چاچو کا جوش دیدنی تھا۔ مالا پیر پٹختے ہوئے اندر چلی گئی تھی جبکہ آفاق نے مسکراتے ہوئے حکم کی تعمیل کی تھی۔ ایسا ڈھیٹ اور بے غیرت انسان مالا نے اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ میکس کی پارٹی کے بعد سے مالا نے آفاق سے بات چیت بند کر رکھی تھی۔ وہ اس کا ناشتا بھی نہیں بناتی تھی اور جب بھی موقع ملتا طنز کے تیر پھینک دیتی۔ اس کا اکھڑا اکھڑا رویہ ابھی تک کسی اور کی نظر میں نہیں آیا تھا۔ ورنہ عیسیٰ نہ سہی چاچو تو لازمی وجہ دریافت کرتے۔ وہ آفاق کے ساتھ ان دنوں کسی کوڑھ زدہ مریض جیسا سلوک کر رہی تھی۔ اس کے نزدیک آفاق اس رویے سے بھی زیادہ کا حق دار تھا۔ جو کچھ وہ اپنے کانوں سے سن کر آئی تھی اس پر کوئی اور بے شک یقین نہ کرتا تاہم وہ خود تو آفاق کی ذہنی غلاظت سے واقف ہو چکی تھی پھر کیسے پہلے کی طرح آفاق کے ساتھ مخلص رہتی اور آفاق اتنا ڈھیٹ اور خبیث تھا کہ مالا کے مزاج اور تیور دیکھ کر بھی سوال نہیں کرتا تھا۔ اپنے کرتوت جانتا جو تھا کہ اگر مالا سے وجہ پوچھی تو اپنی ہی گردن شکنجے میں آپھنسے گی۔

وہ زیادہ دیر آفاق کی کمینگی پہ غور و فکر نہیں کر سکی تھی۔ جلد اسے باہر آنا پڑا تھا۔ عیسیٰ گھر آچکا تھا اور اب مہمان بھی آرہے تھے۔ انی کی پوری فیملی آچکی تھی، اس کا بھائی ابھی تک پاکستان میں تھا اور فی الحال واپسی نہیں ہوئی تھی۔ ایمی، انی اور ان کی ممی تشریف لے آئی تھیں۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر ابوبکر، ہیرا اور ہالہ صاحبہ بھی آگئیں پھر میکس، اینجلس اور ایوا بھی پہنچ گئے تھے۔ عیسیٰ نے اپنے ایک دو قریبی جاننے والوں کو بھی بلا رکھا تھا۔ کیونکہ اس تقریب میں باقاعدہ آفاق اور انی کے نکاح کی ڈیٹ بھی رکھی جانی تھی۔ ہالہ صاحبہ کے اعزاز میں دی گئی یہ دعوت بہت مبارک ثابت ہوئی تھی۔ کم از کم ... آفاق کے لیے تو بہت ہی مبارک تھی۔ اس کے من کی مراد بر آئی تھی۔ وہ بہت خوش نظر آرہا تھا۔ اسی طرح انی کے پیر بھی زمین پر ٹک نہیں رہے تھے۔ مالا ان دونوں پر سوائے افسوس کرنے کے کچھ اور نہیں کر سکتی تھی۔ آفاق کو تو خوش ہونا ہی تھا۔ اس کی زندگی سنور رہی تھی۔ اس کا فیوچر بننے والا تھا۔ کچھ سال اور گزرتے تو نیشنلٹی بھی مل جاتی پھر انی کا کیا حشر ہوتا؟ یہ مالا تصور کی آنکھ سے دیکھ سکتی تھی۔ اتنی حسین اور تعلیم یافتہ لڑکی کو آفاق کے ہاتھوں خوار ہوتے دیکھنے کا حوصلہ کم از کم مالا میں نہیں تھا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ صرف ایک مرتبہ تو وہ اپنا فرض ادا کرتے ہوئے انی کی آنکھیں ضرور کھولے گی۔ آگے جو بھی ہو، وہ اس کے نصیب ہوں گے یا احمقانہ فیصلے...... کم از کم وہ گلٹی فیل تو نہیں کرے گی ناں...... اسے یہ دیکھ کر اور پچھتاوا تو نہ ہو گا کہ اس نے انی جیسی لڑکی کو دھوکے میں رکھا اور آفاق کی گھناؤنی شکل دکھا نہیں پائی۔

اس تقریب کے اختتام پر بزرگ مہمان گھروں کو روزانہ ہو گئے تھے جن میں ہالہ صاحبہ بھی شامل تھیں۔ البتہ مالا کے کچھ کلاس فیلوز اور انی، ایمی ابھی تک یہیں تھیں۔ پھر یوں ہوا کہ ڈاکٹر ابوبکر اور ہیرا نے برج کھیلنے کا شوشا چھوڑ دیا تھا۔ یہاں پر تقریباً سبھی برج کے شائقین تھے جن میں عیسیٰ صاحب بھی سرفہرست تھے۔

اسی دوران ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ کم از کم مالا کے لیے ایک واقعہ ہی تھا۔ کنٹریکٹ برج سے پہلے مون صاحبہ تشریف لے آئیں۔ توقع کے برخلاف، بالکل اچانک، بیمار باپ کا احوال پوچھنے تو آنہیں سکی تھی۔ اب جانے کس مقصد کے تحت آئی تھی۔ سوزن،

آفاق کے بعد اسے اب مون سے بھی نفرت سی ہونے لگی تھی۔ یہی تو تھی جس کی پلاننگ کے اہم کردار آفاق اور سوزن تھے۔ اصل فساد کی جڑ تو مون تھی۔ آفاق اور سوزن تو محض پتلیاں تھیں جن کی ڈوریں مون حسیب نے اپنے ہاتھوں میں پکڑ رکھی تھیں اور زمین پر تکبر کی ایک واضح مثال بنی بیٹھی تھی۔

وہی لمبا سا گھیر دار بوارین فراک پہنے جس کی فرل کارپٹ کو چھوتی تھی۔ بلاؤز کا گلا سفید موتیوں سے کڑھا تھا۔ گلے میں ننھے سے موتی کا نیکلس جو دودھ جیسی گردن سے چپک گیا تھا۔ اس کے بال آج بھی انتہائی ریشمی اور چمکدار سرخی مائل کمر کو چھوتے تھے۔ اونچی سی پونی میں جگمگاتے ہیرے جیسے موتی سجے تھے اور اس کے سر کا کراؤن جو اسے کسی ریاست کی شہزادی ظاہر کرتا تھا۔ موٹا سا ہیرا جس کے آس پاس یاقوت کے دانے بکھرے تھے۔ اس کے ہیرے کی چمک نے محفل میں موجود کتنے لوگوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا۔ وہ جانِ محفل تھی۔ مالا نے آج تک کسی انسانی وجود سے محفل کے رنگ کو بدلتے نہیں دیکھا تھا۔ اس کی موجودگی نے جیسے اتنے ہنگامے اور شور بھرے ماحول کو بجلی کے بٹن دبانے جتنی مدت میں ساکت کر دیا تھا۔ کھلاڑیوں کے ہاتھ میں تاش کے پتے بھنچ گئے تھے۔ ان میں سے کچھ تو مون کو جانتے تھے اور جو نہیں جانتے تھے وہ اس کے سحر میں بری طرح گرفتار ہو گئے تھے۔ اتنا سناٹا لمحے بھر میں چھا گیا تھا کہ اگر سوئی بھی گرتی تو آواز آ جاتی...... پھر اس جادو نگری کی ساحرہ نے سب کو مخاطب کر کے ماحول پر چھایا طلسم توڑ ڈالا تھا۔ تعارفی مراحل کے بعد وہ برج کی طرف متوجہ ہوئی۔ لمحے بھر میں پارٹنر منتخب ہوئے اور وہ عیسیٰ کی پارٹنر بن گئی۔ اس دفعہ باقی سب کپلز تھے سوائے مالا اور عیسیٰ کے۔ عیسیٰ تو کھیل کی طرف متوجہ تھا جبکہ مالا سانس روکے مون کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ وہی چکنا سفید بے داغ چہرہ...... جھکی پلکوں والی لمبی آنکھیں اور عجیب تر آنکھیں...... کیا کبھی حسین چہرے بھی خوف زدہ کرتے ہیں؟ ایسا کبھی نہیں ہوا...... ایسا ہوتا ہی نہیں...... مگر مالا کے ساتھ ضرور ہو جاتا تھا۔ جب وہ مون کو دیکھتی تھی اس کے دل پر دہشت سوار ہو جاتی۔ اس کی آنکھوں میں وحشت اتر آتی۔ اسے مون کی حسین صورت سے خوف آنے لگتا تھا۔ ایسا کیوں ہوتا تھا؟ وہ کبھی سمجھ نہیں سکی تھی سو وہ اب بھی سمجھ نہیں سکی تھی۔ اس نے ہیرا کا چہرہ دیکھا۔ شوخ و شنگ سا ایرانی حسن کا مجسمہ، اس نے انی اور ایمی کو دیکھا، جیسے جرمنی کا حسن ان کے چہروں پر بکھر گیا تھا۔ اس نے ایوا اور اینجلس کو دیکھا...... وہاں کوئی بھی بدصورت نہیں تھا۔ سب خوش شکل، خوش لباس لوگ تھے پھر مون میں ایسا کیا تھا جو اسے خوف زدہ کر دیتا تھا جو اسے وحشت زدہ کر دیتا تھا۔

اس نے مون کو پھر دیکھا، پھر دیکھا، پھر دیکھا...... کئی بار دیکھا، ہزار بار دیکھا۔ وہ پلکیں جھپک، جھپک کر اسے دیکھ رہی تھی۔ نرم رخساروں پر جیسے، جیسے...... مکھن، سفید گلابی مائل...... ملائم مکھن پگھل رہا تھا...... جیسے پلکوں کی جھالر مکھن جیسے رخساروں سے چپک گئی تھی۔ وہ نگاہ اٹھا کر کسی کو نہیں دیکھتی تھی۔ یہ اس کی انفرادیت تھی؟ یا انداز تھا؟ وہ کبھی سمجھ نہیں سکی۔ مون کسی کو دیکھ کر بات نہیں کرتی تھی، یہ ایک بات تو جیسے طے تھی۔ اب بھی وہ اپنے بھائی کے ساتھ جڑی بیٹھی تھی اور عیسیٰ کا بھلا کیا حال تھا؟ مالا شاید لفظوں میں بیان نہ کر پاتی۔ وہ مون کو اتنے نارمل طریقے سے اس کی کسی محفل میں شریک دیکھ کر اتنا خوش تھا کہ اس خوشی کی نہ کوئی حد تھی اور نہ کوئی شمار تھا۔ اسے مون کا گھر آنا اور ان کی محفل میں شریک ہونا خوشی سے دیوانہ کر رہا تھا اور نہ صرف مون محفل میں شریک ہوئی تھی بلکہ گیم میں بھی شامل ہو گئی پھر عیسیٰ نے ان سب کو جیسے بڑے تفاخر سے بتایا تھا۔

''میری بہن شطرنج کی گرینڈ ماسٹر ہے۔ اگر یہ کسی عالمی مقابلے میں حصہ لیتی تو دنیا کی سب سے کم عمر عالمی شطرنج چیمپئن بن سکتی تھی۔ اس نے دس سال کی عمر میں شطرنج کھیلنا سیکھا اور یہاں کے گرینڈ ماسٹر مائیکل کیمے کو شکست دی تھی۔ یہ عالمی سطح پر اپنی نخریلی اور ضدی عادت کے باعث جا ہی نہیں سکی۔ ورنہ ورلڈ ریکارڈ بک میں آج اس کا نام بھی شامل ہوتا اور یہ کارپوف کا ریکارڈ بھی توڑ ڈالتی۔'' عیسیٰ نے مون کے شانے پر ہاتھ رکھ کر جس محبت اور عقیدت کے ساتھ حاضرین کو اپنی بہن کی ذہانت کے بارے میں بتایا تھا، وہ سب کے لیے حیران کن تھا۔ مون حسیب کتنی ذہین تھی، کتنی قابلیت رکھتی تھی؟ اور وہ کیا تھی۔ شاید مون کا حقیقی بھائی اس کے ساتھ چلنے' بڑھنے والا بھی نہیں جانتا تھا۔ وہ تہ در تہ انکشافات اور ذہانت کا مرقع تھی۔ اللہ نے اسے دو بڑے خطرناک قسم کے ہتھیاروں سے لیس کر رکھا تھا، ایک حسن اور دوسری ذہانت، اپنے حسن سے وہ خود آگاہ تھی یا نہیں؟ تاہم ذہانت میں اس کی ٹکر کا شاید کوئی نہیں تھا... اور اس کے آس پاس رہنے والے لوگ بھی اس کی اصل قابلیت سے اتنے واقف نہیں تھے۔ وہ ایسے سیپ کے مانند تھی جسے آج تک کسی نے دریافت نہیں کیا تھا۔ نہ اس کا کوئی رہنما تھا، نہ اسے کوئی رہنما ملا اور نہ کسی کی راہنمائی پائی۔

ورنہ جس طرح 1814ء میں لوچاؤ کے رہنے والے کارل وٹے نے جرمنی کی گیسن یونی ورسٹی سے ریاضی میں ڈاکٹریٹ کی سند بارہ سال کی عمر میں حاصل کی تھی اسی طرح مون حسیب دس سال کی عمر میں اسکاٹ لینڈ یارڈ کے ذہین آفیسرز کو چاروں شانے چت کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

مگر ہوا کیا تھا؟ اسے کوئی راہنما نہ مل سکا۔ وہ ذہنی طور پر اتنی قابل تھی کہ یو ایس اے کی ریاست الاباما کے مقام موبائلے سے تعلق رکھنے والے مائیکل کیمے کی طرح دس سال چار ماہ کی عمر میں گریجویشن کر لیتی اور آج اس کا نام بھی سنہری حروف میں لکھا جاتا مگر بہت سارے معاملات میں خوش نصیب ہونے کے ساتھ، ساتھ وہ انتہا کی بدقسمت بھی تھی۔ اسے پھر کوئی صحیح رہنما نہ مل سکا۔

اور اِدھر اس کا بھائی کتنے تفاخر سے اس کا ذکر کر رہا تھا جیسے وہ عالمی ریکارڈ توڑے بیٹھی تھی۔ جیسے وہ کوئی خلاباز اور ہواباز تھی، آہ...... وہ تو بس مون حسیب تھی۔ اس کے نام سے پہلے کچھ بھی نہ لگا۔

اور ابھی اس وقت تہ در تہ چھپی ذہانت کے ایک ہی وار میں اس نے برج کے انتہائی کامیاب کھلاڑی ڈاکٹر ابوبکر کو ہرا کر رکھ دیا تھا۔ ابوبکر برج کا شیدائی تھا اور اس کا دعویٰ تھا کہ کوئی اسے ہرا نہیں سکتا۔ پہلی مرتبہ وہ پارٹنر کی نااہلی کی وجہ سے ہارا تھا، دوسری مرتبہ وہ اکیلا کھیلا مگر پھر بھی ہار گیا۔ وہ مون حسیب سے سو پوائنٹس سے ہارتا گیا تھا۔ وہ سب لوگ دم بخود تھے۔ ابوبکر کو ہرانا آسان نہیں تھا۔ اسی لیے عیسیٰ بھی حیران تھا اور ہیرا تو جیسے ششدر رہ گئی تھی۔ وہ اپنے شوہر کی قابلیت سے واقف تھی اور اسے ایک عورت سے ہارتا دیکھ کر منجمد رہ گئی تھی۔

''یہ ٹھیک نہیں، مون نے بے ایمانی کی ہے...... ابوبکر برج میں کم از کم کبھی نہیں ہار سکتا۔'' ہیرا شاکڈ تھی، بے یقین تھی جبکہ ابوبکر بھی کچھ متحیر تھا۔ وہ ننانوے پوائنٹس سے ہارا تھا۔ وہ جیت رہا تھا مگر پھر بھی ہار گیا۔ وہ ایک قابل ترین ڈاکٹر تھا، ایک ذہین ترین ماہرِ نفسیات تھا۔ اسے لگا جیسے مون اس کے ہاتھ میں موجود پتوں کو کھوج رہی تھی پھر جیسے اس نے اپنے حق میں جاتا پتا پھینکنا چاہا تو پلا ارادہ ہی اس نے دوسرا پتا پھینک دیا۔ وہ ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا مگر یہ سب غیر ارادی طور پر ہوا۔ وہ پتا پھینک کر حیران رہ گیا۔ مون آخری پتا پھینک کر آخری بچا ہوا پوائنٹ بھی لے گئی۔ یعنی برج کی بازی وہ آرام سے جیت گئی۔ دیکھنے میں یہ ایک کھیل ہی تھا۔ سب اسے کھیل سمجھ کر انجوائے کر رہے تھے۔ عیسیٰ اور مون کو مبارک باد دے رہے تھے مگر ڈاکٹر ابوبکر کا رویہ کچھ مختلف تھا۔ اسے گیم ہارنے کا دکھ نہیں تھا۔ یقیناً یہ ایک گیم تھا مگر اسے کچھ الگ سا فیل ہوا تھا۔ کچھ ایسا جو حیران کن تھا۔ کچھ عجیب تھا، کچھ غیر معمولی تھا، وہ پُرسوچ نظروں سے مون کو دیکھتا رہا، وہ اس کا چہرہ

کھوجتا رہا پھر جیسے مون کے سپاٹ تاثرات نے اسے جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا مگر وہ اپنے ذہن میں آئے خیالات کو جھٹک نہیں پا رہا تھا۔

دوسرا مقابلہ کوئز کا تھا جس میں اس کی بیوی سمیت مون بھی پیش، پیش تھی۔ دس، دس سوالات کا یہ مقابلہ تھا۔ دو، دو لوگوں کے گروپس بن گئے تھے۔ سب سے پہلے میکس اور ایوا نے سوال کیے، جن کے جواب انی اور آفاق نے دیے تھے۔ ان کے دو سوالوں کے جوابات دینے کے علاوہ باقی سب غلط تھے۔ یعنی انی اور آفاق دو پوائنٹ لے کر گیم سے باہر ہو گئے۔ اب تالیاں بجا بجا کر دوسروں کو کنفیوژ کر رہے تھے پھر اینجلس اور ایمی نے ابوبکر اور ہیرا سے سوال کیے۔ ان کے نو جواب ٹھیک اور ایک غلط نکلا...... اب ابوبکر اور ہیرا نے مون اور عیسیٰ سے سوال کرنا تھے۔ مالا اس دفعہ بھی گیم سے باہر محض خاموش تماشائی تھی اور یک ٹک صرف مون کو دیکھے جا رہی تھی جیسے کوئی پتھر کی مورت ہو۔

گیم کے رول اور قواعد کے مطابق ابوبکر نے سوال لکھ کر نیچے جواب بھی لکھ کر اپنی پارٹنر ہیرا کو پرچہ پکڑا دیا تھا تاکہ پارٹنر کنفیوژ نہ ہو۔ سوال لکھنے کے دوران باقی سب لوگوں نے خوب ہاہا کاری مچائی تھی۔ تالیاں، سیٹیاں اور شور بڑھتا رہا۔ جب سوالوں کی باری آئی تب ماحول پہ خود بخود سناٹا چھا گیا تھا۔ مالا بھی ابوبکر اور ہیرا کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ ہیرا بہت پُرجوش تھی۔ اسے امید تھی، اس کے ڈاکٹر شوہر نے جو سوال لکھے تھے ان کے جوابات کم از کم عیسیٰ اور مون نہیں دے سکتے۔ یہ سائنسی سوال تھے، حیران کُن اور ذرا مختلف...... ڈاکٹر بندے سے بھلا اور امید بھی کیا کی جا سکتی تھی، ہیرا کی مسکراہٹوں کا کوئی شمار نہیں تھا۔ وہ لوگ عیسیٰ اور مون کو ہرانے والے تھے۔ باقی لوگ گیم سے پہلے ہی باہر ہو چکے تھے۔ ہیرا کو پورا یقین تھا برج نہ سہی، کوئز مقابلے میں انہیں کوئی ہرا نہیں سکتا۔ ہر بندے نے اپنی فیلڈ کے حساب سے سوال پوچھنے تھے۔ چاہے کوئی ڈاکٹر تھا، ٹیچر تھا یا بزنس مین۔

اِدھر مالا عجیب کیفیات کا شکار تھی اسے لگا، جیسے برج کی گیم جیت کر مون نے اس پر ثابت کر دیا تھا کہ وہ کبھی ہار نہیں سکتی۔ بساط شطرنج کی ہو یا بازی تاش کی؟ اسے صرف جیتنا ہے۔ مالا کا دل سوکھے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ گیم کی طرف متوجہ تھی۔ اس کا شوہر مون کا پارٹنر تھا۔ اس کی دعائیں عیسیٰ کے ساتھ تھیں مگر وہ پھر بھی چاہتی تھی مون اس دفعہ ضرور ہار جائے۔ مالا کو لگتا تھا، وہ گیمز جیت کر اس پر بہت کچھ ثابت کرنا چاہتی ہے۔ وہ اسی لیے گیمز میں حصہ لے رہی تھی۔ وہ مالا کو مزید ہراساں کر رہی تھی۔ وہ اسے جتا رہی تھی کہ علی عیسیٰ کی زندگی سے مالا کو نکالنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے اور وہ جلد اس کی زندگی کا پانسہ بھی الٹنے والی تھی۔

گیم شروع ہوئی تو انی، آفاق، میکس اور ایوا وغیرہ نے چیخ، چیخ کر ہیرا، ابوبکر اور مون، عیسیٰ کا حوصلہ بڑھایا تھا۔ گیم یوں تھی کہ کچھ سوال عیسیٰ سے کیے جاتے تھے اور کچھ سوال مون سے...... مگر مون نے کہا تھا، وہ سب سوالوں کے خود جواب دے گی۔ اس کے اعتماد نے ابوبکر سمیت سب کو ایک مرتبہ پھر حیران کر دیا تھا۔ ابوبکر نے مون سے کہا۔

''ایک مرتبہ پھر سوچ لو۔ عیسیٰ تمہاری مدد کر سکتا ہے۔'' وہ اسے ''جتا'' رہا تھا کہ سوال مشکل ہیں۔ وہ اپنی ذہانت پر اتنا مت اترائے مگر مون نے ناک چڑھا کر انکار کر دیا تھا۔ تب عیسیٰ، مالا کو بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود اٹھ کر کچن میں ان سب کے لیے چائے بنانے چلا گیا تھا۔ آفاق بھی اس کی مدد کے خیال سے اٹھ گیا۔ باقی لوگ بہت متجسس تھے اور ڈاکٹر ابوبکر کو گیم شروع کرنے پر فورس کر رہے تھے۔ تب مالا نے بھی جیسے ''جتا'' کر کہا تھا۔ وہ مون کو عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''ابوبکر بھائی! آپ سوال کریں......'' اس کی نیک تمنائیں ہیرا اور ابوبکر کے لیے تھیں۔ اللہ، اللہ کر کے پہلا سوال آیا۔ وہ سب انتہائی پُرجوش ہو گئے تھے۔ سوال ابوبکر کر رہا تھا۔ اور مون متوجہ ہیرا کی طرف

تھی۔ اس کے ہر کام میں نرالا پن تو ضرور ہوتا تھا۔

ابوبکر نے بڑی پُرسوچ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''دائیں ہاتھ اور بائیں ہاتھ سے کام کرنے والے انسان، دماغ کا کون سا حصہ استعمال کرتے ہیں؟'' ابوبکر کی طرف سے یہ پہلا سوال تھا۔ انتہائی مشکل اور پیچیدہ۔ ہر ایک کے لیے یہ آسانی تھی کہ وہ اپنی فیلڈ کے حساب سے سوال کر سکتا تھا۔ جبکہ جواب دینے والے کے لیے سخت مشکل ہوتا تھا جواب دینا۔ اب ایک ٹیچر یا انجینئر سے بزنس کے متعلق سوال کیا جاتا تو وہ بھلا کیا جواب دیتا۔ جبکہ اس وقت ایک ماہر ڈاکٹر ایسی لڑکی سے سائنسی نوعیت کے پیچیدہ سوال کر رہا تھا جس نے دنیاوی تعلیم کے حساب سے صرف گنتی کی دس جماعتیں پاس کر رکھی تھیں۔ مقابلہ سخت بھی تھا، مشکل ترین بھی تھا۔ اسی لیے سبھی تقریباً ہمہ تن گوش تھے اور سانس روکے جواب کے منتظر تھے جبکہ مون کے پاس نو سیکنڈ کا وقت تھا۔ ان نو سیکنڈ میں وہ پلک جھپکائے بغیر ہیرا کو دیکھ رہی تھی یک ٹک، بنا نگاہ ہٹائے...... جیسے جیسے اپنی غیر معمولی ذہین آنکھوں سے ہیرا کا ذہن کھنگال رہی تھی۔ جیسے اس کی سوچ کو پڑھ رہی تھی اور جیسے ہیرا کے ہاتھ میں موجود پرچے پہ لکھے جوابات کو ہیرا کے ذہن میں سے نوچ کھسوٹ کر اپنے ذہن تک لانے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ محفل میں موجود کوئی بھی فرد مون اور ہیرا کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ ایوا، ایمی کو اپنی انگوٹھی دکھا رہی تھی۔ انی، اینجلس کی طرف متوجہ تھی۔ آفاق اور عیسیٰ کچن میں تھے۔ میکس بھی انگوٹھی کے ڈیزائن پر تبصرہ کر رہا تھا۔ بس لمحے بھر کی چُوک میں وہ سب مبتلا تھے اور ہوائیں کہ مون کی گہری بولتی نگاہ ہیرا کے چہرے سے ہٹ گئی۔ اب وہ بڑے مطمئن انداز میں جواب دے رہی تھی۔

''انسانی دماغ کے دو حصے ہیں۔ دائیں اور بائیں سمت والا۔ دائیں ہاتھ سے کام کرنے والے، بائیں سمت والا دماغ اور بائیں ہاتھ سے کام کرنے والے دائیں سمت والا دماغ استعمال کرتے ہیں۔ اور یہ قدرتی عمل کے تحت ہوتا ہے......'' جواب کسی بھی دلیل اور سوچ و بچار کے بغیر مکمل تھا۔ حاضرین نے فی الفور اپنی، اپنی مصروفیات ترک کر کے زور شور سے تالیاں بجائی تھیں۔ جبکہ ہیرا کے علاوہ ڈاکٹر ابوبکر اور مالا دم بخود تھے۔ جتنا ابوبکر حیران تھا اسی قدر مالا بھی حیرت سے منجمد ہو گئی تھی۔ گویا مون ہارنے والی نہیں تھی۔ وہ ایک ذہین ڈاکٹر کا مقابلہ بھی کر سکتی تھی۔ مگر نہیں...... مالا کو مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ ابھی تو نو سوال اور بھی باقی تھے۔ وہ بڑی امید بھری نظر سے ڈاکٹر ابوبکر کو دیکھ رہی تھی جیسے اب تو وہ مون کو لاجواب کرنے ہی والا تھا۔

''انسانی آنکھ کتنی دور تک دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے؟'' ابوبکر نے کچھ دیر بعد ایک اور سوال پوچھا تھا۔ اس دفعہ بھی مون نے ابوبکر کو دیکھے بنا ہیرا پہ نگاہ جمائے رکھی۔ یہ جواب دو سیکنڈ میں اسے مل گیا تھا۔ مون کو اس دفعہ زیادہ تردد نہیں کرنا پڑا۔

''انسانی آنکھ پچاس میل دور جلنے والی موم بتی کا شعلہ دیکھ سکتی ہے۔'' مون کا اعتماد اب کی دفعہ بھی قابلِ دید تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ مطمئن ہو چکی تھی۔ گویا وہ اب تو ہرگز بھی ہارنے والی نہیں تھی۔ اس مرتبہ ابوبکر کے ہونٹ بھنچ گئے تھے۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے پر ناقابلِ فہم تاثرات تھے جبکہ ہیرا جیسے کسی ٹرانس میں تھی۔ وہ قطعاً ان لوگوں کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ بلکہ وہ تو کسی کی طرف بھی متوجہ نہیں تھی۔ اگر مالا غور نہ کرتی تو باقی سب کی طرح اسے بھی پتا نہ چلتا کہ ہیرا تو مون کی دودھیا گردن سے چپکی چین اور ہیرے موتی کی طرف متوجہ تھی۔ مالا شاید بے اختیاری میں ہیرا کو پکار ہی لیتی مگر ڈاکٹر ابوبکر نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ وہ مون سے ایک اور سوال کر رہا تھا۔

''آنکھ ایک دن میں کتنی بار جھپکتی ہے؟'' ابوبکر کا لہجہ سنجیدہ تر ہوتا چلا گیا تھا۔ مون کے لیے یہ سوال بھی مشکل نہیں تھا۔

''انسانی آنکھ دن میں بیس ہزار بار جھپکتی ہے۔''

وہ پُراعتماد طریقے سے بول رہی تھی جیسے یہ سوال اس کے نزدیک ننھے منے چیونٹے کی طرح تھے۔ جنہیں وہ پیروں تلے مسل رہی تھی۔ اس کے چہرے پہ ذرا محظوظ قسم کی مسکراہٹ در آئی۔ جیسے وہ ابوبکر کو زچ کر کے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

''انسانی آنکھ کتنے رنگوں اور سایوں میں تمیز کرسکتی ہے؟'' ابوبکر نے ایک اور سوال کیا۔

''آنکھ ایک کروڑ مختلف رنگوں اور سایوں کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔'' مون کے لیے جواب مشکل نہیں تھا۔ پھر سوال پر سوال ہوتے چلے گئے۔ ایک کے بعد ایک سوال۔

''آنکھ آواز کو محسوس کرسکتی ہے یا نہیں؟'' وہ پہلے سے زیادہ بے چین اور سنجیدہ تھا۔

''آنکھ آواز کو ارتعاش سے محسوس کرسکتی ہے۔'' مون پہلے سے بڑھ کر مطمئن تھی۔

''ورزش کرتے، کھیلتے یا دوڑتے ہوئے انسانی دماغ تک پیغام کتنے میل فی گھنٹا کی رفتار سے پہنچتا ہے؟'' وہ اور بھی بے چین ہوا۔

''ورزش کرتے، کھیلتے یا دوڑتے وقت دماغ تک ''پیغام'' 180 میل فی گھنٹا کی رفتار سے پہنچتا ہے۔'' مون مسکرائی۔ حالانکہ وہ مسکراتی نہیں تھی۔ جواب اس کی نوکِ زبان پہ مچل رہے تھے۔ وہ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں جواب دے رہی تھی۔

''کیا کسی انسان کے فنگر پرنٹس کسی دوسرے انسان کی انگلیوں کے نشانات سے ملتے ہیں؟'' ابوبکر نے پہلو بدلا تھا۔

''کسی بھی انسان کے فنگر پرنٹس کسی دوسرے انسان سے نہیں ملتے۔'' مون محظوظ ہوئی۔ جیت قریب تھی، ہار دور ہو رہی تھی۔ ابوبکر پریشان تھا اور مالا دم بخود تھی۔

''کان آواز کو کیسے محسوس کرتے ہیں؟'' ابوبکر نے ٹھہر ٹھہر کر پوچھا۔

''کان ہوا کی وائبریشن (ارتعاش) سے آواز کو پہچانتے ہیں۔'' مون کا غرور بڑھ رہا تھا، مالا کی امید گھٹ رہی تھی۔ اللہ نے مون کو پہاڑ پہ کھڑا کر رکھا تھا۔ وہ ان سب سے بلند تھی۔ وہ لوگ اس کے سامنے کچھ بھی نہیں تھے۔

''کاربن کی قلمی اشکال کا پتا ہے؟'' ابوبکر خود بھی کچھ کمزور پڑ گیا تھا۔ شاید وہ ہار گیا تھا مگر ایک سوال اب بھی باقی تھا۔

''ہاں، پتا ہے۔'' مون مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ بھی اسی کی طرح عجیب ہوتی تھی۔ ''کاربن کی دونوں قلمی، بہروپی اشکال ہیں اور انہی حالتوں میں کاربن قدرتی طور پر آزاد حالت میں پایا جاتا ہے۔'' مون نے کہنا شروع کیا تھا۔ وہی عجیب ترین مسکراہٹ تھی۔ عجیب ترین تاثرات کے ساتھ۔

''نمبر ایک ہیرا اور نمبر دو گریفائیٹ۔'' وہ ہیرا کو دیکھ کر جیسے پھر سے محظوظ ہوئی تھی۔ ''اس ہیرا کی بات نہیں کر رہی۔''

وہ گم صم بیٹھی ہیرا کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ اس کا جواب ابھی نامکمل تھا۔ وہ اب ہیرا اور گریفائیٹ کے فوائد اور خواص بتا رہی تھی۔

''ہیرا یعنی ڈائمنڈ، کاربن کی خالص ترین شکل ہے۔ یہ انتہائی سخت، چمکدار اور شفاف ٹھوس حالت میں پایا جاتا ہے۔ جبکہ گریفائیٹ سیاہی مائل بھورے رنگ کا نرم ٹھوس ہوتا ہے......'' مون نے اس سے اگلا جواب بھی مکمل کر دیا تھا۔ یقیناً وہ جیت کے قریب تھی۔ تب اچانک ابوبکر نے گم صم بیٹھی ہیرا کو ٹہوکا دیا تھا اور ہیرا جیسے نیند سے ہڑبڑا کر جاگی تھی۔ ابوبکر کے احساس دلانے اور ڈپٹنے پر...... وہ سیدھی ہوگئی تھی جیسے وہ سنبھل گئی تھی۔ وہ پچھلے ساڑھے چار منٹ تک بے حواس یا گم صم رہی تھی یا پھر جیسے اونگھ گئی تھی۔ وہ کچھ سمجھ نہ پائی۔ چار منٹ تک جانے اس پر نیند طاری ہوگئی تھی۔ اکثر بیٹھے بٹھائے اونگھ آہی جاتی ہے۔ اس میں پریشان ہونا ضروری نہیں۔ وہ بھی شاید تھکاوٹ کے باعث چار منٹ کے لیے سوگئی تھی اور اب ہڑبڑا کر اردگرد اجنبی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ یہاں سب لوگ اپنی، اپنی مصروفیات میں مگن تھے۔ کوئی بھی ہیرا کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ پھر ابوبکر نے اسے اٹھا دیا۔

''جاؤ، منہ پہ دو چھپاکے مار آؤ۔'' ہیرا کو واش روم کی طرف بھیج کر ابوبکر پھر سے مون کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔ اس کے چہرے پر اب پہلے جیسی بے چینی نہیں تھی۔ جھنجلاہٹ نہیں تھی۔ پہلے جیسی حیرانی نہیں تھی۔ اب اس کے چہرے پر تجسس تھا، کھوج تھا۔ گویا وہ کوئی سراغ پانا چاہتا تھا۔ کچھ کھوجنا چاہتا تھا۔ وہ مون کے چہرے پر سے کیا کھوجنا چاہتا تھا؟ تھوڑی دیر بعد اس نے مون سے ایک عجیب سوال کیا تھا، سوال عجیب نہیں تھا۔ تھوڑی گہرائی لیے ہوئے تھا۔ ابوبکر کے بولنے پر وہ سب لوگ اپنی، اپنی مصروفیات ترک کر کے ایک مرتبہ پھر ان کی طرف متوجہ ہوگئے تھے۔

''کیا تم مجھے ہیرا (ڈائمنڈ) اور گریفائیٹ کے خواص، فوائد اور استعمال بتا سکتی ہو؟'' ابوبکر نے بڑی سنجیدہ نگاہوں سے مون کی طرف دیکھا تھا۔ یک دم مون کے چہرے کا رنگ بدلا۔ مالا گویا حیران رہ گئی تھی۔ کیا مون کا سپاٹ چہرہ بھی رنگ بدل سکتا تھا؟

''میں جواب دے چکی ہوں۔'' وہ پتھریلے لہجے میں بولی۔ اسے ابوبکر کا سوال سخت برا لگا تھا جیسے اسے اب مزید سوال کی امید نہیں تھی۔

''مجھے کچھ وضاحت چاہیے۔'' اب کہ محظوظ ہونے کی باری کسی اور کی تھی اور ان میں ابوبکر اور مالا بھی شامل تھے۔ مالا کا روم جیسے ساعت بن گیا۔

''میں وضاحت دینے کی پابند نہیں۔'' وہ رکھائی سے کہہ رہی تھی۔ گویا صاف جواب دے رہی تھی۔ ابوبکر کے چہرے پہ مسکراہٹ آگئی۔ پھر کچھ دیر بعد وہ گلا کھنکھار کے سنجیدہ ہوگیا تھا۔

''اگرچہ تم جیت گئی ہو، اگرچہ تم نے ٹھیک جوابات دیے۔ اس کے باوجود میں تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ چلو تم وضاحت نہیں کرنا چاہتی تو میں وضاحت کر دیتا ہوں۔'' اس نے مسکرا کر پانی کا گلاس اٹھا کر لبوں سے لگا لیا تھا۔

''تقریباً پندرہ سال سے میں پروفیشنل کتابیں پڑھ رہا ہوں۔ جتنی تمہاری عمر ہے اس سے ذرا کچھ کم تجربہ تو بہرحال میرے پاس ہے ہی...... تم نے کہا کہ تم ہیرے اور گریفائیٹ میں وضاحت نہیں کرو گی۔ مگر میں تمہیں بتاتا ہوں کہ ہیرے اور گریفائیٹ میں کیا فرق ہے؟ تو سنو! ہیرا خالص حالت میں بے رنگ اور شفاف ہوتا ہے۔ بالکل تمہارے کراؤن جیسا قیمتی اور چمکدار۔ جب اس کی تراش خراش کی جاتی ہے تو یہ انتہائی چمکدار، لشکارے مارتا نظر آتا ہے۔ یہ قدرتی حالت میں پائی جانے والی سخت ترین شے ہے۔ اس کی کثافت 3.3 گرام فی مکعب سم ہوتی ہے۔ یہ برقی رو کے لیے ناقص موصل ہے یعنی اس میں سے بجلی نہیں گزر سکتی۔ اگر اسے برقی بھٹی میں زیادہ دیر تک رکھا جائے تو یہ گریفائیٹ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ساخت کے لحاظ سے ہیرے میں پائے جانے والے ایٹم ہر طرف سے جڑے ہوتے ہیں۔ انہیں آسانی سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس وجہ سے یہ زیادہ سخت ہوتا ہے۔ یہ سخت ہونے کی وجہ سے شیشہ کاٹنے اور دوسرے آلات میں استعمال ہوتا ہے۔ ہیرے کے جڑاؤ سے قیمتی زیورات تیار کیے جاتے ہیں۔ یہ ڈائمنڈ کی خصوصیات ہیں۔ جو تمہارے کراؤن میں سجا ہے۔ اور تم ان خصوصیات سے یقینی طور پہ ناواقف تھیں اور ہو بھی......

اب سنو کہ گریفائیٹ کیا ہے؟ اور میں نے تم سے یہ سوال کیوں پوچھا؟ اس کی وضاحت بھی کرتا ہوں۔ گریفائیٹ سیاہی مائل بھورے رنگ کا نرم ٹھوس ہوتا ہے۔ یہ ملائم، نرم اور چکنا ہوتا ہے۔ یہ بجلی اور حرارت کا اچھا موصل ہے۔ اس کی کثافت 2.2 سے 2.5 تک ہوتی ہے۔ برقی بھٹی میں زیادہ دیر تک گرم کرنے سے اس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ گریفائیٹ بطور مارکر نشان لگانے کے کام آتا ہے۔ چکنا ہونے کی وجہ سے مشینوں میں بطور ''گریس'' استعمال ہوتا ہے۔ دراصل یہی فرق ہے گریفائیٹ اور ڈائمنڈ میں۔ اور

میرا سوال تم سے یہ ہے کہ تم خود کو ہیرا یعنی ڈائمنڈ سمجھتی ہو یا گریفائیٹ؟'' ابوبکر کی طویل تر تقریر نے ان سب کو جیسے پتھر بنا دیا تھا۔ وہ حیران تھے کھیل، کھیل میں بات کہاں سے کہاں نکل گئی تھی...... ابوبکر ابھی تک مون کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی زندگی میں یہ پہلا موقع آیا تھا جب وہ کسی سوال پہ لاجواب ہوئی تھی ورنہ وہ تو لاجواب کرتی آئی تھی۔ اس نے لاجواب ہونا کہاں سیکھا تھا؟ وہ دم بخود نہ ہوتی تو کیا کرتی؟

سب کی نظریں مون کے چہرے پہ جمی تھیں اور وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ کیا جواب دے؟ ابوبکر کچھ دیر اس کا چہرہ کھوجنے کے بعد خود ہی بولا۔

''ڈائمنڈ اور گریفائیٹ دونوں کا اپنا، اپنا مقام ہے۔ دونوں بے فائدہ نہیں۔ ایک زیورات میں سجتا ہے اور اپنا حسن اور قیمت بڑھا دیتا ہے اور ایک مشین چلانے میں کام آتا ہے۔ مگر پھر بھی ہیرا، گریفائیٹ سے افضل ہے۔ تو تم بتاؤ؟ کیا تم خود کو ''ہیرا'' سمجھتی ہو یا گریفائیٹ؟'' ابوبکر اتنی آسانی سے بخشنے والا نہیں تھا۔ اس کا سوال مون کے آس پاس ہی گھوم رہا تھا۔ شاید اس نے مون کے اندر کچھ غیر معمولی چیز پالی تھی۔ شاید ابوبکر نے اپنی ''کھوج'' مکمل کرلی تھی اور اب وہ نفسیاتی حربوں سے مون کا اندر کھنگال رہا تھا۔ وہ گویا جیسے لمحے بھر کے لیے گم صم رہ گئی۔ یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا؟ اور یہ ابوبکر کیا پوچھنا چاہتا تھا؟

''سوال مشکل تو نہیں۔ پھر بھی اتنی دیر؟'' ابوبکر معنی خیزی سے مسکرایا۔ کچھ دیر تک ماحول پہ سناٹا چھایا رہا۔ پھر جیسے طلسم خود ہی ٹوٹ گیا۔ ابوبکر نے جواب کو بھی مکمل کر دیا تھا۔ وہ اپنے تجربات کی رو سے مون حبیب کے چھکے چھڑا رہا تھا، وہ جو آج تک لوگوں کو ایک اسم سے ساکت کرتی آئی تھی لمحے بھر کے لیے خود منجمد ہوگئی تھی۔

''تم ڈائمنڈ ہو مون حبیب! اور تم اس بات سے واقف نہیں۔ تمہارے زرگر اتنے جوہر شناس نہیں تھے اور نہ ہی تم اتنی عقل مند تھیں جو غلط اور ٹھیک کی پہچان کر سکتیں۔ تمہیں اللہ نے خالص اور قدرتی حالت میں ہیرے کی شکل دی۔ تمہیں تراشنے والے ہاتھ ناکارہ اور نااہل تھے۔ ان کے پاس ہیرے کو تراشنے کا علم، ہنر اور فن نہیں تھا۔ وہ بے چارے تو بے خبری میں مارے گئے اور تم نے یوں کیا کہ خود کو زیادہ دیر تک برقی بھٹی میں رکھا، یہاں تک کہ ہیرا پگھل کر گریفائیٹ یعنی چپچپاتی گریس بن گیا۔ جو اپنا اصل اور حقیقی مقام کھو گیا۔ اب گریس اور ڈائمنڈ کا کیا مقابلہ؟ ہیرے کا مقام تو گریس سے بہت اوپر ہے۔ مگر پھر بھی دیکھو اللہ نے تمہیں گریفائیٹ بنا کر بھی بے فائدہ نہیں کیا۔ تم اب بھی فائدہ مند ہو۔ یہ باتیں ہیں ذرا حکمت اور دانائی کی۔ کبھی اکیلے میں غور و فکر کرنا کہ تم کون سا مقابلہ ہو یا زندگی کا مقابلہ...... شطرنج کی بازی ہو یا تاش کی، بھلا کس طرح سے دوسروں کو پچھاڑتی ہو؟ ایک غیر فطری عمل سے جسے عام طور پر بے ایمانی کہا جاتا ہے۔ ایسی جیت سے تو ہزار بار مات اچھی ہے......'' ابوبکر نے جیسے اپنا فصیح بیان ختم کر دیا تھا۔ اس نے سر محفل مون حبیب کو کیا، کیا جتایا تھا؟ اس کی باتوں کا مفہوم کیا تھا؟ اور اس نے مون کو پرکھنے اور کھوجنے میں کہاں تک اندازوں کی درستگی پائی تھی۔ پوری محفل کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ پھر جیسے چائے کی پیالیوں کا شور اٹھا۔ عیسیٰ اور آفاق دونوں لاؤنج کے دروازے پہ کھڑے تھے۔ اتنے ہی ساکت اور گم صم۔ جیسے مون کو اندر تک کھنگال کر اس کی ذات کے متعلق ایسی جامع تشریح پہ ابوبکر کو خراج تحسین پیش کرنا چاہتے تھے۔ ابوبکر وہ واحد بندہ تھا جس نے مون حبیب کے مقابل بیٹھ کر اس کے چھکے چھڑا دیے تھے اور مون اتنی بے بس تھی کہ کچھ بول ہی نہیں سکی تھی۔ یہاں محفل میں بیٹھے ہر ایک فرد کی کیفیات مختلف تھیں۔ جو جرأت ابوبکر نے کی تھی ایسی جرأت کا مظاہرہ نہ میکس کر سکتا تھا اور نہ ہی آفاق، حتیٰ کہ آج تک علی عیسیٰ کو بھی مون نے اپنی ذات میں مداخلت کرنے نہیں دی تھی۔ وہ ایک ترقی یافتہ ملک کی آزاد شہری تھی۔ بھلا اس کے باپ اور بھائی کی جرأت تھی جو وہ اس کی ذات پہ بات کرتے، اسے

سمجھاتے یا اس کی غلطیوں پہ ٹک یا کراس لگاتے۔ یہ تو ڈاکٹر ابوبکر تھا جس نے محفل کے ہر فرد کو حیرت سے منجمد کر دیا تھا۔ محض دو لفظوں میں پوری مون کی شخصیت کا نچوڑ نکال دیا تھا۔

''تم نے برقی بھٹی میں خود کو اتنی دیر تک رکھا۔ یہاں تک کہ تم ہیرے سے گریفائیٹ میں بدل گئیں۔ تم اپنے اصل مقام سے نیچے آگئیں۔'' یہ ڈاکٹر ابوبکر کے الفاظ تھے۔ آخر اس نے مون حبیب میں کھوجا ہی کیا تھا؟ محفل میں موجود ہر آنکھ کا سوال بڑا ہی بے چین قسم کا تھا۔ اور وہ سب ایک دوسرے کو حیران نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

پھر جیسے محفل کا اختتام ہوگیا۔ سب لوگ چائے سے لطف اندوز ہو کر اپنے، اپنے گھروں کو لوٹ گئے تھے۔ حتیٰ کے مون بھی ابوبکر سے ملنے والے جھٹکوں پر خفا ہو کر نہیں اٹھی تھی۔ وہ اپنی کمزوری غصہ ظاہر کر کے سب کو دکھانا نہیں چاہتی تھی۔ سو چائے پی کر پاپا سے ملنے کے بعد واپس چلی گئی تھی۔ آج عیسیٰ نے اسے روکا نہیں تھا۔ حبیب احمد بس اسی میں خوش تھے کہ مون آتو گئی تھی۔ محفل کے اختتام پر برتن آفاق اور عیسیٰ نے سمیٹے تھے اور وہ دونوں زیر لب نینی کو کوسنے دے رہے تھے۔

''اب یہ چنگیری بھینس آئے تو اسے فارغ کر دینا۔ ایک تو اتنی خوفناک ہے اور دوسرے اتنی چھٹیاں کرتی ہے۔ کان سے پکڑ کر نکال دینا۔'' آفاق جل بھن کر کہہ رہا تھا۔ عیسیٰ خود بھی نینی سے عاجز لگتا تھا۔ اور اس کی ''خوفناکی'' پر وہ دونوں تبصرے کیے جا رہے تھے۔

''یہ نینی خاصی خوفناک اور پُراسرار لگتی ہے۔'' عیسیٰ بھی پُرسوچ انداز میں بولا تھا۔ آفاق نے زور شور سے سر ہلایا۔

''تو اور کیا...... میں تو کہتا ہوں، اسے فارغ کر دو۔ زیادہ ''ہراس'' اس گھر میں نینی کا پھیلایا لگتا ہے۔'' وہ سمجھداری سے کہہ رہا تھا۔ آفاق سر ہلا کر رہ گیا پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''یار! وہم کا کچھ نہ کچھ حقیقت سے تعلق ضرور ہوتا ہے۔ حقیقت کچھ نہ کچھ ہو تو ''وہم'' بھی ہوتا ہے۔'' وہ برتن دھوتا بہت سنجیدہ تھا۔ عیسیٰ کے کافی سمیٹتے ہاتھ رک سے گئے تھے۔ اس نے گردن موڑ کر آفاق کو دیکھا۔

''تمہاری بات کا مفہوم یہ ہے کہ مالا کو جو کچھ دکھائی دیتا ہے یا محسوس ہوتا ہے، وہ ٹھیک ہے؟'' عیسیٰ اچنبھے سے پوچھ رہا تھا۔

اس کے تاثرات سنجیدہ تھے اور آنکھوں میں ناگواری تھی۔

''زیادہ نہ سہی مگر کچھ تو ضرور ہے۔ دیکھو بالکل بھی مالا کو غلط کہنا مناسب نہیں۔'' برتن دھل چکے تھے۔ اب وہ انہیں خشک کر رہا تھا۔ عیسیٰ کے چہرے پہ بھی ناگواری دوڑی تھی۔ اِدھر کچن میں آتی مالا ٹھٹک کر رک گئی تھی۔

''مالا کو غلط کون کہہ رہا ہے؟ ایسی بات ہوتی تو ہالہ صاحبہ کو کیوں بلایا جاتا۔'' وہ جیسے برا مان گیا تھا۔

''تم نے کبھی غور نہیں کیا یہ اچانک ہی مالا کو عجیب و غریب چیزیں نظر کیوں آنے لگی ہیں۔'' آفاق نے اس کے برا ماننے پر دھیان دیے بغیر ایک اور نکتہ اٹھالیا۔ مالا کچھ تھم سی گئی۔ یہ آفاق کی باتوں کا آخر مقصد کیا تھا؟

''پہلے ایسا نہیں تھا یعنی تمہاری شادی کے شروع دنوں میں۔'' اسے چپ کھڑا دیکھ کر آفاق نے مزید ٹکڑا لگایا پھر ریک میں خشک برتن سجا کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''یہ سلسلہ کچھ دن پہلے شروع ہوا ہے آخر وجہ تو دریافت کرنا چاہیے تھی۔'' وہ بے انتہا سنجیدہ تھا عیسیٰ بھی کچھ چونک گیا۔

''تو وجہ کس سے دریافت کروں؟'' عیسیٰ نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''خود سے۔'' آفاق کا جواب حیرت میں مبتلا کر دینے والا تھا وہ اسے مشکوک نظروں سے دیکھنے لگا۔

''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟'' عیسیٰ خفگی سے بولا۔

''سو فیصد ٹھیک ہے۔'' وہ مطمئن تھا۔

''تو پھر؟'' اس نے ناگواری سے کہا۔

''پھر یہ کہ تم اپنے تئیں یعنی خود سے کوشش کیوں نہیں کرتے، یہ کوئی معمولی بات تو نہیں ہے۔ تمہاری موجودگی میں ناگوار واقعات پیش نہیں آتے۔ تمہاری غیر موجودگی میں ہی کیوں؟'' آفاق نے بڑی گہری بات کی تھی یوں کہ عیسیٰ جیسے حیران رہ گیا مگر وہ اسے جھٹلا نہیں پایا تھا۔ اِدھر مالا حق دق رہ گئی تھی۔ اسے آفاق سے ایسی لگائی بجھائی کی امید نہیں تھی مگر اسے آفاق سے ہر قسم کی امید رکھنی چاہیے تھی۔

''یہ تو سوچنے کی بات ہے۔'' عیسیٰ نے ہنکارا سا بھرا تھا۔ مالا جیسے پتھر ہوگئی تھی تو آفاق، عیسیٰ کو بدگمان کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

''تو پھر سوچو کہ اصل معاملہ کیا ہے؟'' آفاق نے ہمدردی سے عیسیٰ کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''اور یاد رکھنا یہ معمولی واقعات نہیں۔'' وہ نرمی سے کہہ رہا تھا۔ مالا کے اندر تنفر کی لہر ابھری تھی۔ غصے سے اس کی بھویں تن گئیں اور مارے اہانت کے وہ تیورانے لگی تھی پھر وہ الٹے قدموں واپس پلٹ گئی۔ اگر مزید کھڑی رہتی تو آفاق کے گریبان تک پہنچ جاتی۔ جس کا ابھی مناسب وقت نہیں تھا۔ مالا کے آنے اور پھر جانے سے بے نیاز آفاق، عیسیٰ کو سمجھا رہا تھا۔

''جہاں تک میرا خیال ہے، یہ نادیدہ دشمن صرف مالا کا ہے۔ تمہارا نہیں کیونکہ یہ صرف مالا کو ٹیز کرتا ہے اور تمہاری غیر موجودگی میں آتا ہے۔'' آفاق نے بہت اہم نکتہ اٹھایا اب کہ عیسیٰ بھی حیران رہ گیا۔ آفاق ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں آفاق کی ذہانت کو سراہا۔ یہ ایسا پہلو تھا کہ اس نے اس پر سوچا ہی نہیں تھا بلکہ اسے سوچنے کا وقت ہی نہیں مل سکا تھا۔ پاپا کی بیماری، مالا کا ڈپریشن اور بزنس کے بکھیڑوں میں الجھ کر وہ وقتی طور پر کسی بھی طرف دھیان نہیں دے پایا تھا اور اسی بات پر مطمئن ہو چکا تھا کہ مالا کے ڈپریشن یا خود ساختہ وہم کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ اب جو آفاق نے اس کا دھیان دوسری سمت مبذول کروایا تو وہ اسی پہلو پر غور کرنے لگا تھا۔

''تو اس کا کوئی ٹھوس حل؟'' وہ بے انتہا سنجیدہ ہو چکا تھا۔

''ہے ناں۔'' آفاق جیسے پُرجوش ہوگیا۔ ''ہمیں اس نادیدہ دشمن کو کھوجنا ہے اور یہ بڑا آسان کام ہے۔'' اب وہ عیسیٰ کے کان پر جھک آیا تھا۔

''کیسے؟'' عیسیٰ بھی متجسس ہوگیا۔

''میں آج ہی کچھ حساس آلے، کیمرے اور سسٹم خریدتا ہوں جن کو گھر کے مختلف کونوں میں نصب کریں گے پھر دیکھنا نہ کوئی آسیب رہے گا اور نہ کوئی وہم یا وسوسہ۔ حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی۔'' آفاق نے بہت ٹھوس لہجے میں بڑا مضبوط حل پیش کیا تھا یوں کہ علی عیسیٰ نے آفاق کو اپنے سینے میں بھینچ لیا۔

''تو گریٹ ہے یار! آخر میں نے اس نادیدہ آسیب کو ڈھونڈنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔'' وہ اپنی نااہلی پر خود کو ملامت کر رہا تھا تب آفاق نے برجستہ چہک کر کہا۔

''اس لیے کہ تم مجھ سے زیادہ خوبرو تو ہو سکتے ہو مگر چالاک نہیں۔'' آفاق نے قہقہہ لگایا اور عیسیٰ نے اس کا بھرپور ساتھ دیا پھر پلاننگ کے پہلے آئٹم کے لیے بجٹ کے حساب سے اسے رقم دے کر وہ لائٹس آف کرتا اپنے کمرے میں پہنچ گیا تھا اور اسے کمرے میں داخل ہو کر اس بات پر حیرت ہوئی تھی کہ مالا نہ صرف جاگ رہی تھی بلکہ بیڈ پر پیر لٹکائے بیٹھی تھی حالانکہ عیسیٰ اسے سونے کی تلقین کر کے کچن میں گیا تھا۔ آج کی دعوت نے بلاشبہ مالا کو تھکا دیا تھا سو وہ نہیں چاہتا تھا کہ کھانا سمیٹتے اور برتن دھوتے ہوئے وہ اور زیادہ تھک جائے۔ اس کی طبیعت ان دنوں بہت بوجھل تھی اور اکثر وہ کسی وجہ کے بغیر بھی رونے لگتی تھی۔ عیسیٰ سمجھتا تھا، وہ اپنی ماں، باپ اور بہن بھائیوں کو بہت مس کرتی ہے اور اس نے مالا سے وعدہ کر رکھا تھا وہ ڈلیوری کے فوراً بعد اسے پاکستان لے جائے گا۔ اسے خود بھی اپنے کزنز سے ملنے کا بہت شوق تھا اور صرف تصویروں کی حد تک اس نے انہیں دیکھ رکھا تھا۔

اس وقت وہ بے آواز قدموں سے چلتا ہوا بیڈ تک آیا تھا۔ اس نے فوراً محسوس کر لیا تھا کہ وہ رو رہی تھی، وہ کیوں رو رہی تھی؟ شاید وہ بہت تھک گئی تھی یا اس کی طبیعت خراب تھی یا پھر وہ ان دنوں ویسے ہی زود رنج رہتی تھی۔ عیسیٰ کچھ بے قراری سے دوزانو اس کے قریب کارپٹ پر بیٹھ گیا تھا پھر اس نے مالا کا بھیگا چہرہ ٹٹولا۔ اس کے رخسار نم تھے عیسیٰ کا اندازہ درست نکلا تھا۔ وہ رو رہی تھی مگر عیسیٰ کو دیکھ کر عجلت میں آنسو پونچھنے لگی تھی لیکن عیسیٰ کی نظر سے اس کے آنسو پوشیدہ نہیں رہ سکے تھے۔ وہ اتنا ہی بے قرار ہوگیا تھا جس قدر بے چینی سے وہ سسکاریاں بھر رہی تھی۔

''کیوں رو رہی مالا؟ کیا گھر والے یاد آرہے ہیں؟'' اس نے فکرمندی سے پوچھا تھا۔ مالا کچھ پل کے لیے چپ رہ گئی تھی پھر بے ساختہ نفی میں سر ہلانے لگی۔

''تو پھر...... کیا بیمار ہو...... کہیں درد ہے؟'' وہ اور بھی فکرمند ہوگیا مالا نے سر کو ایک مرتبہ پھر دائیں بائیں نفی میں ہلایا۔

''کچھ بھی نہیں۔'' مالا بھینچی آواز میں بولی۔

''کچھ تو ہے۔'' وہ ذرا بھی مطمئن نہیں ہوا جانے کیوں اسے پاپا اور مالا کی طرف سے ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا جیسے کچھ ہو جائے گا...... جیسے کچھ ہو جائے گا۔

''نہیں...... میں ٹھیک ہوں۔'' مالا نے سر جھکا لیا وہ اپنی انگلیاں مروڑ رہی تھی جیسے بہت مضطرب تھی پھر عیسیٰ کیوں نہ متفکر ہوتا۔

''پھر مجھے کیوں نہیں ٹھیک لگ رہیں؟'' وہ نرمی سے جتا کر بولا تھا۔

''پتا نہیں۔'' مالا جھنجلائی۔

''کسے پتا ہے؟'' عیسیٰ بھی اسے چھوڑنے والا نہیں تھا۔ تب مالا جیسے تھک گئی۔ اسے لگا وہ کبھی عیسیٰ سے کچھ بھی نہیں چھپا سکتی۔ وہ اپنے دل میں کچھ نہیں رکھ سکتی۔ وہ عیسیٰ سے شیئر کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ دل پر بوجھ لادے وہ پہلے ہی تھکنے لگی تھی۔ اب اور ضبط اور جبر کا مظاہرہ نہیں کر سکتی تھی۔ جیسے اس کی برداشت اور صبر کی انتہا ہو چکی تھی۔ وہ ایک دم پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگی۔ دل پر صدمات کی کثافتیں جم گئی تھیں۔ اذیت کی کائی ابلنے لگی تھی دکھ کا سیل بہہ رہا تھا۔ وہ ذرا بھی تحمل کا مظاہرہ نہ کر سکی اور جذباتیت میں پھوٹ، پھوٹ کر روتی رہی۔ عیسیٰ کے لیے اس کا رونا، تڑپنا دیکھ کر چپ رہنا محال تھا۔ وہ بھی...... گھبرا اٹھا۔ جانے مالا کو اتنی سی دیر میں کیا ہوا تھا وہ کیوں رو رہی تھی جب اسے کوئی تکلیف بھی نہیں تھی اور کسی نے کچھ کہا بھی نہیں تھا پھر یہ پگھلتے آنسو......!

''مالا! بتاتی کیوں نہیں؟'' عیسیٰ عاجز آکر بول اٹھا۔ اس کے آنسو اور سسکنا، تڑپنا اس کی برداشت سے باہر تھا۔ مالا جیسے رو رو کر تھک گئی تھی پھر خود ہی سسکاریاں بھرتی چپ کر گئی۔

''بولو مالا...... ہوا کیا ہے؟'' وہ نرمی اور تحمل سے پوچھ رہا تھا تب مالا نے اپنے بھرے دل کی ساری حکایت بتا دی تھی۔

''وہ آفاق کا بچہ آپ کو میرے متعلق بدگمان کر رہا تھا۔'' اس نے بالآخر وجہ اگل ہی دی تھی جسے سن کر عیسیٰ نے اپنا سر پیٹ ڈالا۔

''نہیں تو...... تم نے کیسے سمجھ لیا، ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔'' عیسیٰ جیسے ساری بات سمجھ کر اب وضاحت کر رہا تھا یقیناً وہ ان دونوں کی کچھ باتیں سن کر بدگمان ہو رہی تھی۔ وہ غلط گمان میں پڑ رہی تھی۔ آفاق پر شک کر رہی تھی حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ دنیا میں کوئی بھی شخص کم از کم علی عیسیٰ کو اس سچے موتی جیسی لڑکی سے بدگمان نہیں کر سکتا تھا بھلا یہ بات وہ مالا کو کیسے بتاتا، کس طرح سے سمجھاتا، وہ مالا سے کبھی بدگمان نہیں ہو سکتا۔

''میں نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے وہ کہتا ہے یہاں کوئی آسیب نہیں اور جو کوئی بھی ہے آپ کی موجودگی میں ظاہر کیوں نہیں ہوتا۔'' وہ انتہا کی گرد اپنے دل پر جمائے بیٹھی تھی۔ اس نے آفاق کی باتوں کا الٹ مفہوم نکالا تھا حالانکہ آفاق تو درست مشورے دے رہا تھا۔ وہ تو انہیں مشکلات سے نکال کر ٹھیک

رہنمائی کرنے کی کوشش کررہا تھا جس بات کی طرف آفاق نے اس کا دھیان لگایا تھا وہ ایک دم ٹھیک اور پرفیکٹ تھی۔ وہ گھر میں حساس آلے فٹ کروا کر اپنے دشمن تک رسائی پاسکتا تھا جو مالا کا دشمن تھا، وہ پہلے عیسیٰ کا اپنا دشمن تھا اور ایک بات تو طے تھی اس گھر پر کسی کا آسیب یا سایہ نہیں تھا۔ یہ کوئی آستین میں چھپا دشمن تھا جس تک پہنچنا اب مشکل نہیں تھا۔

وہ مالا کی بدگمانی فی الوقت دور کرتے ہوئے وضاحت دے رہا تھا۔ اس نے آفاق کا مشورہ بھی مالا سے شیئر کیا۔ تب وہ کیمروں کا سن کر حیران رہ گئی۔ اسے امید نہیں تھی کہ آفاق ایسا بھی کوئی مشورہ دے سکتا ہے۔ کیا اسے اپنے پکڑے جانے کا خوف نہیں یا وہ خود کو ضرورت سے زیادہ شاطر سمجھتا ہے آخر وہ اتنا پُراعتماد ہو کر کیسے گھر میں کیمرے فٹ کرنے کی بات کرسکتا تھا؟ کیا اس بات کے پیچھے بھی کوئی پلاننگ تھی؟ کوئی انہونا سا منصوبہ؟ کوئی جامع پلاننگ کے ساتھ انوکھی چال؟ مالا اب آفاق پر بھروسا کرنے والی نہیں تھی اور نہ ہی وہ اس کی کسی چال میں آسکتی تھی۔ اب وہ محض تیل کی دھار دیکھ رہی تھی یا پھر وقت کی چال بھلا پانسہ کب تک الٹنے والا تھا؟

☆☆☆

کمرے میں نائٹ بلب روشن تھا ملگجا سا اندھیرا جو اتنا بھی ملگجا نہیں تھا۔ نائٹ بلب کے ساتھ ٹیبل لیمپ کی روشنی بھی غبار کے مانند پھیلی ہوئی تھی۔ گھڑی کی ٹک ٹک خاموش ماحول میں ہلکا سا ارتعاش پیدا کررہی تھی یہ رات کا دوسرا پہر تھا۔ ہیرا نے اپنی ہیروں جیسی دمکتی آنکھوں کے ساتھ گردن موڑ کر کاؤچ کی طرف دیکھا تھا۔ ڈاکٹر ابوبکر نفسیات کی کوئی بہت موٹی کتاب کھولے صفحوں پر نظر جمائے کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ ہیرا کچھ متحیر رہ گئی تھی وہ جب سے مالا کے گھر سے آئی تھی اس نے ابوبکر کو گم صم سا پایا تھا۔ وہ اتنا چپ، چپ بھی نہیں رہتا تھا مگر پچھلے کچھ گھنٹوں سے اس کی کیفیات بڑی عجیب و غریب قسم کی تھیں۔ ہیرا کے لیے یہ صورتِ حال خاصی

تشویش ناک تھی۔ وہ کہنی کے بل ذرا سا اٹھ کر اونچی ہوئی پھر اس نے کتاب کے ٹائٹل پر انگلی بجا کر جیسے ابوبکر کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ اس کی توقع کے عین مطابق ابوبکر نے گردن موڑ کر ہیرا کو دیکھا۔ وہ اسے جاگتا دیکھ کر کچھ متحیر رہ گیا تھا۔

”تم ابھی تک سوئی نہیں؟“ وہ متفکر سا بولا انداز اب بھی کچھ کھویا، کھویا سا تھا ایک دم مضطرب سا۔

”میں سو کر اٹھ بھی گئی اور تم لگتا ہے ایک دفعہ بھی نہیں سوئے۔“ ہیرا بھی فکر مند ہوگئی۔ وہ اپنے شوہر کے لیے خاصی حساس تھی۔

”آں...... ہاں، بس نیند نہیں آئی۔“ ابوبکر کچھ چونک گیا۔

”نیند کیوں نہیں آئی، خیر تو ہے؟“ ہیرا بے چین ہو کر اٹھ گئی۔ ابوبکر جاگ رہا تھا پھر وہ کیسے سو جاتی۔ ابوبکر بے چین تھا ہیرا کیسے چین پالیتی۔

”پتا نہیں تم کیوں اٹھ گئیں شاید روشنی کی وجہ سے۔ ٹھہرو میں لائٹ آف کرتا ہوں۔“ وہ لیمپ کا بٹن دبانے لگا تھا جب ہیرا نے عجلت میں اسے روک دیا۔

”اندھیرا مت کرو، روشنی ٹھیک ہے۔“ وہ تکیہ پیچھے لگائے اس رخ سے بیٹھ گئی جس سے وہ ابوبکر کا چہرہ دھیان سے دیکھ سکے۔ ہیرا کی دمکتی آنکھوں میں چھپا تفکر اور کچھ کھوج اسے حیران کررہا تھا اور کچھ کچھ جھنجلاہٹ میں بھی مبتلا کررہا تھا۔ تبھی وہ نگاہ چرا کر کتاب کے صفحے الٹنے لگا مگر ہیرا کی تکرار اس کا دھیان کتاب میں ٹکنے نہیں دے رہی تھی۔

”ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟“ ابوبکر نے الجھ کر پوچھا۔ تب ہیرا گہری سانس کھینچتی الجھتی سنبھلتی متفکر سی بول اٹھی تھی۔

”تمہیں کیا ہوا ہے؟ جب سے آئے ہو ایک دم چپ، چپ اور خاموش ہو؟“ ہیرا بے چین ہوگئی تھی تب ابوبکر کو کچھ احساس ہوا۔ وہ اپنی وجہ سے اپنی بہت لاڈلی سی نٹ کھٹ بیوی کو پریشان کررہا تھا اور یہ ٹھیک نہیں تھا۔

”تم نے کچھ نوٹ کیا ہے ہیرا؟“ تھوڑی دیر کی

خاموشی کے بعد اس نے وہی بات چھیڑ دی جو اسے کب سے مضطرب اور بے چین کررہی تھی۔ ہیرا جانتی تھی جب وہ کسی بات پر سخت سوچ و بچار میں مبتلا ہوتا تھا تب وہ اسی طرح گم صم اور خاموش ہو جاتا۔ اب چونکہ وہ ہمیشہ کی طرح اس سے کچھ شیئر کرنے والا تھا۔ وہ ہمہ تن گوش ہوگئی تھی۔

”کیا......؟“ اس کی دمکتی آنکھوں میں تجسس بھر گیا۔

”وہ جو عیسیٰ کی بہن اور مالا کی نند ہے...... وہ کس قدر مختلف سی ہے۔“ ابوبکر نے جو کچھ اتنی بچار کے بعد کہا تھا وہ ہیرا کا بے ساختہ موڈ آف کرگیا۔ اب یہاں مون نامہ شروع ہونے والا تھا۔ وہ کچھ بدمزہ سی ہوگئی۔ عیسیٰ کی بہن اور مالا کی نند اسے پسند جو نہیں آئی تھی۔

”وہ مختلف ہے ناں؟“ ابوبکر اسے خاموش پا کر جیسے تائید چاہ رہا تھا تب ہیرا کو سر ہلانا ہی پڑا۔

”مختلف نہیں، حسین ہے۔“ ہیرا نے دل پر پتھر رکھ کر کہہ ہی دیا۔ تصور میں مون کا شہزادیوں جیسا سراپا گھوم گیا۔ اللہ بھی کچھ لوگوں کو بے بہا نواز دیتا ہے۔ ہیرا کو غائبانہ سا بے ضرر قسم کا حسد ہوا۔

”شاید حسین ہے مگر بہت عجیب بھی ہے۔ کیا تمہیں وہ عجیب نہیں لگی؟“ ابوبکر نے کچھ سوچتے ہوئے ٹھہر ٹھہر کر پوچھا۔ تب ہیرا جیسے پُرجوش ہوگئی تھی۔

”ہاں...... مجھے بھی بہت عجیب لگی خصوصاً اس کی آنکھیں...... ان آنکھوں کی چمک عجیب سی بجلی جیسی لپک...... یوں لگتا تھا بیٹھے بٹھائے ہپناٹائز کردے گی۔“ ہیرا نے جذباتی انداز میں فرفر تقریر سی جھاڑ دی۔ تب ابوبکر نے گہری سانس کھینچ کر اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیے پھر اس نے ہیرا پر جیسے آسمان گرادیا۔

”اور تمہیں پتا بھی نہیں چلا، اس نے بیٹھے بٹھائے تمہیں ہپناٹائز کردیا۔“ ابوبکر نے جس سنجیدگی سے بات کی تھی وہاں مذاق کا کوئی پہلو نہیں نکلتا تھا۔ ہیرا ہکا بکا رہ گئی۔

”تم مذاق کررہے ہو؟“ وہ بے ربط سی کہہ گئی۔

”نہیں، حقیقت کہہ رہا ہوں۔“ ابوبکر اب بھی سنجیدہ تھا۔ اس نے نفسیات کی موٹی سی کتاب کو بند کرکے سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ اب وہ دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھے نیم دراز ہوگیا۔

”کک...... کیا...... یہ ٹھیک ہے؟“ ہیرا تو گھبرا اٹھی تھی اس کے نزدیک ابوبکر اس سے مذاق کررہا تھا مگر ایسا ہرگز نہیں تھا۔

”ہاں، میں نے بھی محسوس کیا۔ وہ بہت عجیب لڑکی ہے۔ میں نے ہر رنگ کے لوگ دیکھے ہیں طرح، طرح کے مریضوں سے واسطہ پڑا ہے مگر وہ بہت عجیب لگی۔“ ابوبکر اپنی کیفیات شیئر کررہا تھا۔ اس نے کیا محسوس کیا، کس طرح محسوس کیا؟ اور مون میں اس نے کیا، کیا بہت انوکھا اور عجیب دیکھا؟ وہ عام لڑکیوں سے ہٹ کر بہت مختلف تھی۔ حسن اس کی اضافی خوبی تھی اور معلومات کے لحاظ سے جیسے اس کے پاس کوئی خزانہ دفن تھا۔ وہ واجبی سی تعلیم یافتہ تھی اور یوں لگتا تھا جیسے زمانے کا علم حفظ کیے بیٹھی ہے پھر بہت دیر تک وہ دونوں مون حسیب کو ڈسکس کرتے رہے۔

ہیرا نے اسے بتایا کہ وہ چار منٹ کے لیے اونگھ گئی تھی جیسے سو گئی تھی مگر یوں لگ رہا تھا وہ فل حواسوں میں ہے۔ سوئی جاگی سی کیفیت تھی۔ اس کے تمام دماغی افعال کام کررہے تھے۔ نیند کے باعث اس کا بیرونی دنیا سے عام نیند کی طرح رابطہ منقطع نہیں تھا۔ آخر وہ چار منٹ تک اتنی بے نیاز کیوں ہوگئی تھی جس کی وجہ سے کوئز مقابلے کے آخری سوال وہ سن نہیں پائی تھی۔

ابوبکر بہت خاموشی سے ہیرا کی باتیں سن رہا تھا جیسے ...کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کررہا ہو۔ اس کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔ وہ بہت قابل ترین ماہرِ نفسیات تھا۔ اسے انسانی نفسیات کی گتھیاں سلجھانے میں بہت لطف آتا تھا۔

”وہ لڑکی صرف عجیب نہیں، بہت خطرناک ذہن کی مالک ہے۔“ ہیرا اس کی بات پر دم بخود رہ گئی۔

☆☆☆

یہ رات کا تیسرا پہر تھا باہر گھور اندھیرا اور اندر بھی گھور تاریکی تھی۔ جرمنی میں چوبیس گھنٹوں والا سسٹم رائج تھا۔ سو یہاں کے وقت اور ٹائم کے مطابق پندرہ بج کر کچھ ہی منٹ ہوئے تھے۔

رات کے سیاہ پردوں میں بہت سے بھید چھپے تھے۔ رات جو شر بھی تھی اور جس میں خیر بھی چھپا تھا۔ جو خوف بھی تھی اور امن بھی تھی اس میں راحت بھی تھی، بے چینی بھی تھی۔

رات کا تیسرا پہر پھسل رہا تھا۔ کہیں دور کسی جنگل کے کنارے مرغابیاں سر نیہوڑائے اونگھ رہی تھیں۔ تالاب کے پار کہیں آسمانی پریاں اتری تھیں۔ کوئی میاں محمد صاحب کی رباعی گا رہا تھا۔ گہری، مدہوش اور پُرسکون نیند میں گم، باہر کی دنیا سے تمام کنکشن ختم ہونے کے باوجود جانے کس احساس کے تحت اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ وہ جیسے ہڑبڑا کر اٹھ گیا تھا۔ نیند اس کی آنکھوں سے مٹ گئی تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑے اندھیرے میں دیکھ رہا تھا پھر جانے کس احساس کے تحت حلق پر ہاتھ پھیرتا سلیپر پہنے باہر نکل آیا۔

اسے شاید پانی پینا تھا، وہ کچن کی طرف جانا چاہتا تھا مگر جگر جگر کرتے لاؤنج کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ پورے لاؤنج کی لائٹس آن تھیں۔ پنکھے چل رہے تھے شدید سردی کے باوجود اے سی تک آن تھے۔ اس کی سانس جیسے اٹک اٹک کر چلنے لگی۔

”گھر میں کوئی ہے...... گھر میں کوئی ہے۔“ وہ زیرِ لب بڑبڑا رہا تھا مگر اس کے ہونٹ کسی گوند کے ساتھ ایک دوسرے سے چپک گئے تھے۔ وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا مگر زمین اس کے قدم پکڑے بیٹھی تھی۔ وہ نہ آگے بڑھ پا رہا تھا نہ پیچھے ہٹنے کی کوشش کر سکتا تھا بس ایک احساس جس نے اس کے پورے وجود پر پنجہ جما رکھا تھا اور وہ احساس تھا صرف خوف کا۔ مالا ایسے بھیانک خوف سے کئی مرتبہ گزری تھی تاہم آفاق کی باری آج آئی تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑے پورے لاؤنج میں دیکھ رہا تھا کہیں بھی بے ترتیبی نہیں تھی پھر اس کا دل داخلی دروازے کو دیکھ کر دھک سے رہ گیا تھا، دروازہ کھلا تھا۔

”تو کیا کوئی ابھی تک اندر موجود تھا؟“ اس کے دل میں پکڑ دھکڑ ہونے لگی تھی پھر کسی غیبی طاقت کے بل بوتے پر اس نے گھر کا کونا، کونا چھان مارا تھا۔ اسے کوئی بھی انسانی وجود نظر نہیں آیا پھر وہ حواس باختہ سا باہر آیا۔ اسے پھولوں کے اونچے جھنڈ کے پاس کسی وجود کا گمان ہوا، وہاں کوئی موجود تھا مگر پلک جھپکنے کی دیر میں جھنڈ جیسے خالی ہو گیا اب وہاں کوئی سایہ نہیں تھا۔ آفاق کا دل چاہا وہ سائے کا پیچھا کرے مگر عجیب سے خوف نے اسے آگے بڑھنے سے روک دیا تھا۔ وہ پسینہ، پسینہ وجود لیے واپس مڑ آیا تھا۔ اس کے حواس ٹھکانے پر نہیں تھے۔ ہر قدم پر اسے چکر آ رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا بڑھ رہا تھا حالانکہ لاؤنج کے چھوٹے بڑے فانوس جل رہے تھے۔ مالا کتنی سچی تھی، آفاق کو جیسے یقین آ گیا۔ گھر میں کوئی بھیدی آتا تھا۔ رات کی تاریکی میں...... مگر سوچنے کی بات یہ تھی وہ بھیدی رات کی تاریکی میں ہی کیوں آتا تھا؟ محض ہراس پھیلانے کے لیے۔

وہ اپنے گول، گول گھومتے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھامے عیسٰی کے کمرے تک آیا۔ اب وہ دونوں ہاتھوں سے دروازہ دھڑ دھڑا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد حواس باختہ سے عیسٰی نے دروازہ کھول دیا۔ سامنے آفاق کو کھڑا دیکھ کر وہ ہڑبڑا گیا تھا۔

”آفاق تم! خیر تو ہے؟“ عیسٰی آنکھیں مسلتا ہوا جیسے حیرانی اور بوکھلاہٹ میں پوچھ رہا تھا حالانکہ اسے سمجھ جانا چاہیے تھا کہ جس حواس باختگی سے آفاق دروازہ پیٹ رہا تھا، خیریت بھلا کہاں ممکن تھی۔

”خیر کہاں ہے...... ذرا باہر آؤ۔“ وہ اس کا بازو دبوچے لاؤنج میں گھسیٹ لایا۔ عیسٰی حیران پریشان اس کے ساتھ گھسٹتا چلا آیا تھا۔ لاؤنج کا منظر دیکھ کر اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ پورا لاؤنج روشنیوں میں نہایا تھا ہر چھوٹا بڑا فانوس جگر جگر کر رہا تھا۔ پنکھے فل اسپیڈ میں چل رہے تھے حتیٰ کہ اے سی تک آن تھے اور پھر عیسٰی کی

نگاہ دیوار پر نصب ہیٹر تک گئی۔

”یہ ہیٹر کس نے آن کیا؟“ وہ دوسرے ہی پل اے سی، پنکھے، گلوب ہیٹر بند کرتا حواس باختہ ہو رہا تھا۔

”شاباش عیسٰی صاحب، مجھ سے پوچھ رہے ہو ہیٹر کس نے آن کیا؟ یہ گلوب، پنکھے اور اے سی دکھائی نہیں دیے؟“ آفاق اتنے بڑے جھٹکے سے سنبھل کر گویا ہوا تب عیسٰی نے گردن موڑ کر دیکھا داخلی دروازہ بھی کھلا تھا۔ وہ پھر سے شاکڈ ہوا۔

”یہ کس نے کھولا ہے؟“ دوسرے ہی پل وہ دروازے کا لاک چیک کرتا متحیر تھا۔ رات کو سونے سے پہلے تمام دروازے، کھڑکیاں اس نے خود چیک کر کے لاک کیے تھے۔ چابیاں ابھی تک اس کے تکیے کے نیچے پڑی تھیں پھر یہ دروازے کا لاک بنا چابی کے کیسے کھلا تھا؟ اس کا دماغ چکرا کر رہ گیا۔ آج بہت دن بعد پھر وہی واقعہ رونما ہوا تھا فرق صرف اتنا تھا اس دفعہ مالا کے بجائے آفاق کو جھٹکے لگے تھے۔ وہ اسے کسی انسانی سائے کے متعلق بتا رہا تھا۔ وہ دونوں لاؤنج میں کارپٹ پر سر تھامے بیٹھے تھے۔ دونوں کے پاس کہنے کو جیسے کچھ نہیں بچا تھا۔ دونوں متحیر تھے کچھ، کچھ خوف زدہ بھی تھے۔ خوف محض اس لیے تھا کہ اگر ان کی موجودگی کی بھی پروا کیے بغیر کوئی گھر میں دیدہ دلیری سے گھس آیا تھا تو غیر موجودگی میں کیا کرتا؟ اگر پاپا، مالا کو کوئی نقصان پہنچا دیتا؟ اب تو اسے ہر قسم کی اس نادیدہ دشمن سے امید ہو چلی تھی۔ وہ کچھ بھی کر سکتا تھا چاہتا تو سامنے سے وار کرتا، چاہتا تو پشت میں چھرا گھونپ دیتا۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“ بہت دیر بعد عیسٰی نے ٹوٹے لہجے میں پوچھا۔ جہاں انسانی سوچ کی انتہا ہو جاتی تھی وہیں اس کے گھر میں اچانک رونما ہونے والے واقعات کی شروعات ہوتی تھی۔ وہ اتنا پریشان تھا کہ بولنا بھی محال ہو رہا تھا۔

”مجھے تو خود کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ آفاق تھکے، تھکے لہجے میں بولا۔ ابھی سونے سے پہلے ہی تو وہ کیمرے اور حساس سسٹم خریدنے کی بات کر رہا تھا۔

خواب

اسے کہنا
تمہاری یاد کے جگنو
اب میری
آنکھوں میں دکھنے لگے ہیں
درد کے سارے موسم
قلب و جاں میں
اترنے لگے ہیں
میرے اشکوں کی تپش سے
میرے سارے خواب
جلنے لگے ہیں

شاعرہ: فصیحہ آصف خان، ملتان

اب یہ کیمرے کتنے ناگزیر ہو گئے تھے۔ عیسٰی اور آفاق دونوں ان کی اہمیت سمجھتے تھے۔

”آفاق! تم کیا کہتے ہو؟ میں یہ گھر چھوڑ نہ دوں؟“ بہت دیر کی بے چینی نما خاموشی اور سوچ بچار کے بعد عیسٰی نے نہایت بے چارگی سے آفاق کو مخاطب کیا تب آفاق بھی ٹھٹک گیا۔

”تم کیوں گھر چھوڑو گے؟ یار یہ تو بزدلی ہے۔“ آفاق نے سنبھل کر اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”تو پھر کیا کروں؟ میرا چین، سکون گم گیا ہے۔“ وہ جھنجلا کر رہ گیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس صورتِ حال سے کیسے نمٹے۔ جانے وقت علی عیسٰی کے ساتھ کون سا کھیل کھیلنے والا تھا۔ وہ پہلے بھی مالا کے خوف کو معمولی خیال کر کے نظر انداز نہیں کرتا تھا مگر اب تو جیسے کسی شک و شبہے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ وہ اپنے بالوں کو نوچتا بے انتہا متفکر تھا۔ آفاق اسے پریشان دیکھ کر پریشان ہو رہا تھا۔

”عیسٰی تم پریشان نہ ہو۔ میں صبح ہی کچھ کرتا ہوں۔ دیکھنا جلد ہم اس ذہنی اذیت سے چھٹکارا پا لیں

گے۔" آفاق نے دوستی کا حق ادا کرتے اسے تسلی دی۔ وہ خود بھی بہت متفکر تھا اسے لگ رہا تھا مالا کے اکھڑے روئیے کے پیچھے بھی یہی ذہنی اذیت پوشیدہ ہے۔ وہ آفاق سے بہت اکھڑی، اکھڑی رہنے لگی تھی۔ بات، بات پر طنز کرتی۔ آفاق کو لگتا تھا وہ مینٹلی ڈسٹرب ہے تبھی اس کے ساتھ بھی اکھڑی رہتی ہے۔ ہر وقت چہرے پر ناراضی، غصہ اور ماتھے پر سلوٹیں تو عام طور پر نظر آنے لگی تھیں۔ شاید اسی جھنجلاہٹ اور ذہنی اذیت کے باعث...... آخر یہ جھٹکے کوئی معمولی تو نہ تھے۔ وہ جو مالا کے کئی دفعہ بولے گئے طنزیہ جملوں پر ڈسٹرب ہو جاتا تھا اسے آج ہر طرح کے روئیے کے لیے حق بجانب سمجھ رہا تھا۔ اس قسم کی صورتِ حال میں تو نارمل انسان پاگل ہونے لگتا ہے اور وہ نہ جانے کس حد تک ڈسٹرب تھی۔ اسے اس وقت مالا سے بہت ہمدردی ہو رہی تھی۔

"پتا نہیں، کیا ہونے والا ہے۔ میرا دل بہت گھبرا رہا ہے جیسے کچھ ہو کر رہے گا۔" عیسٰی نے دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھام رکھا تھا۔ وہ اس وقت بہت بکھرا بکھرا نظر آ رہا تھا۔

"کچھ نہیں ہوگا تم تسلی رکھو۔" آفاق نے اس کے شانے دبائے۔

"نہیں آفاق، یہ وسوسے یا واہمے نہیں، تم دیکھ لینا کوئی منحوس گھڑی تاک لگائے بیٹھی ہے۔ مجھے آنے والے وقت کی منحوس آہٹیں سنائی دے رہی ہیں۔" وہ لفظوں سے بہلنے والا نہیں تھا جو کچھ آج وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا اسے بھلا کیسے جھٹلا دیتا؟ اب تو کسی شک وشبے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔

"کیا پولیس کی مدد لوں؟" کچھ دیر بعد اس نے آفاق سے مشورہ لینا چاہا تھا تب آفاق نے نفی میں سر ہلایا۔

"میرا خیال ہے ابھی مناسب نہیں ہے...... کچھ انتظار کر لیتے ہیں...... ایک دو دن تک۔" آفاق سنجیدگی سے گویا ہوا۔

"اور ایک دو دن میں کچھ اور نہ ہو جائے کوئی ناقابلِ تلافی نقصان؟" عیسٰی کے خدشات بے بنیاد نہیں تھے۔

"اللہ رحم کرے، کچھ نہیں ہوتا۔" آفاق کا انداز بھرپور تسلی دینے والا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ تھامے بیٹھا تھا جب کسی احساس کے تحت اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ لاؤنج کے دروازے پر مالا کھڑی تھی۔ بکھرے بال لیے اور اس کی آنکھیں کچن کے رنگ جیسی سرخ تھیں۔ جیسے ابھی آنکھوں سے لہو پھوٹنے والا تھا اور تاثرات کیسے تھے؟ آفاق لفظوں میں بیان کرنے سے قاصر تھا۔ وہ کسی بپھرے طوفان کے مانند لگ رہی تھی جیسے ایک ہی جھٹکے میں تنکا، تنکا سب کچھ بکھیرنے والی تھی۔ اس کے چہرے پر غیظ بپھر رہا تھا اور لبوں سے جیسے جھاگ نکلنے والا تھا۔ وہ نپے تلے قدم اٹھاتی وہاں آئی۔ نہ جانے وہ کب سے ان کی باتیں سن رہی تھی اب جو اس کا ضبط جواب دے گیا تو پھٹ پڑی۔

"اللہ تو رحیم ہے، رحم کرتا ہے مگر اس کے بندے، بندوں پر رحم اور ترس نہیں کرتے۔ جب موقع ملتا ہے ڈس لیتے ہیں۔ نہ دوست کی پشت دیکھتے ہیں نہ دشمن کا سینہ۔ آستین میں چھپ کر ڈستے ہیں اور پھر بھی ہمدردی کا امرت ٹپکانے کا ڈراما کرتے ہیں۔ آفرین ہے ایسے آستین کے ڈلیش...... ڈلیش...... سانپوں پر۔" وہ کسی خونخوار بپھری شیرنی کی طرح غیظ وغضب سے کانپ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے شرارے نکل رہے تھے جبکہ عیسٰی اور آفاق دم بخود رہ گئے تھے۔ ان دونوں میں سب سے پہلے عیسٰی ہی سنبھل کر آگے بڑھا تھا۔

"مالا! تمہیں کیا ہوا ہے؟" عیسٰی نے گھبرا کر مالا کے دونوں شانے تھامے۔ وہ غصے اور نفرت سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ وہ اپنے حواسوں میں نہیں لگ رہی تھی۔

"مجھے کچھ نہیں ہوا۔ بس آپ کے اس غلیظ سوچ رکھنے والے دوست کی اصلیت کھل گئی ہے۔" آج جیسے یوم حساب آ چکا تھا۔ آج آفاق کے کرتوت کھلنے کا وقت آ چکا تھا۔ یہ رات سارے بھید، سارے بھرم توڑنے والی تھی۔ سارے راز کھولنے والی تھی۔ اب

کچھ بھی ڈھکا چھپا رہنے والا نہیں تھا۔ مالا، علی عیسٰی کی آستین میں آرام فرمانے والے سانپ کے سر کو کچلنے والی تھی۔ وہ اس کے گریبان کو پکڑنے والی تھی۔

"کیا بکواس ہے مالا؟" علی عیسٰی گھبرا گیا۔ "یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" وہ گردن موڑے آفاق کو دیکھ رہا تھا جو کسی پتھر کے بت میں ڈھلا نظر آ رہا تھا۔ اس کی رنگت انتہائی زرد ہو رہی تھی۔ اس کے ہونٹ نیلے ہو کر تھرتھرا رہے تھے اور اس کا پورا جسم بھی کانپ رہا تھا۔ وہ ایک مرد ہو کر بری طرح تھرتھرا رہا تھا شاید جو کچھ مالا کہنے والی تھی وہ سب کم از کم عیسٰی کے سامنے سننے کا آفاق میں حوصلہ نہیں تھا۔

"جو کہہ رہی ہوں آپ بھی سن لیں۔ ہمارے گھر پر کسی آسیب کا سایہ نہیں، نہ ہمارا کوئی دشمن موجود ہے۔ یہ سب کیا دھرا سوزن اور آفاق کا ہے اور ان کی پشت کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے یہ آپ کو آفاق خود بتائے گا۔ یہی آپ کا سب سے بڑا دشمن...... آپ کو اذیت پہنچانے والا، آپ کی آستین میں آرام فرمانے والا، عیسٰی اسے گھر سے نکال دیجیے۔ یہ ہمیں ڈس لے گا۔ ہماری خوشیوں کو نگل جائے گا۔ یہ کسی جامع سازش کو لے کر آیا ہے۔ یہ ہمارے درمیان جدائی ڈالنے آیا ہے۔" وہ عیسٰی کی شرٹ نوچے چیخ، چیخ کر رو رہی تھی۔ وہ حال سے بے حال تھی۔ وہ بے انتہا نڈھال تھی، وہ ذہنی اذیت کی انتہا پر پہنچی ہوئی تھی شاید وہ اپنے حواسوں میں بھی نہیں تھی شاید اس کے صبر، ضبط اور برداشت کی آخری حد ختم ہو چکی تھی۔

"یہ سوزن کے کہنے پر مجھے ٹارچر کرتا ہے۔ وہی سوزن جو آپ سے محبت کرتی ہے اور آپ سے شادی کرنا چاہتی ہے صرف اپنے مذہب پر قائم رہ کر اور آپ کو اپنے مذہب کی طرف راغب کر کے۔ یہ ایک بڑی سازش کے تحت ہو رہا ہے، یہ لوگ ہمارے دشمن ہیں۔ یہ ہمیں تباہ کر دیں گے، یہ ہمیں جدا کر دیں گے۔" وہ عیسٰی کا گریبان جھنجوڑ رہی تھی اور عیسٰی اتنا دم بخود تھا کہ اسے روک بھی نہیں پا رہا تھا۔ اسے چپ بھی نہیں کروا پا رہا تھا۔

"عیسٰی! یہ ہمیں الگ کر دیں گے، مجھے آپ سے دور کر دیں گے۔" وہ چیخ رہی تھی، رو رہی تھی۔ وہ نڈھال تھی، بے حال تھی اور عیسٰی کے بدن میں دوڑتا لہو جم جم جا رہا تھا وہ حواس باختہ ہو رہا تھا۔

"مالا...... ہوش کرو، کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ کوئی تمہیں مجھ سے دور نہیں کر سکتا۔" عیسٰی نے بہ مشکل اسے سنبھالا دے رکھا تھا۔ وہ اس کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔

"آپ...... آپ اسے نکالتے کیوں نہیں۔ آپ اسے ابھی گھر سے نکال دیں۔ یہ مجھے نظر نہ آئے۔ یہ ہمارا دشمن ہے۔ آپ سمجھتے کیوں نہیں؟" وہ عیسٰی کی منتیں کر رہی تھی۔ عیسٰی جیسے اس کے آنسوؤں سے پگھل رہا تھا، بے بس ہو رہا تھا اور وہ آفاق کے سامنے شرمندہ بھی تھا۔ اسے شرمندہ دیکھ کر آفاق نے سنبھل کر اسے اشارہ کیا۔

"تم فکر نہ کرو بس مالا کو دیکھو۔ میں برا ماننے والا نہیں۔" آفاق نے اسے اشارے سے سمجھایا کہ وہ مالا کو اندر لے جائے۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں اور عیسٰی کم از کم آفاق کی فکر نہ کرے۔ وہ مالا کے الفاظ کو نظر انداز کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ آفاق کی طرف سے حوصلہ افزا اشارے نے عیسٰی کی جھکی آنکھوں کو کچھ اٹھا دیا تھا۔ وہ مالا کو لے کر بہ مشکل اندر گیا۔ وہ اب بھی چیخ رہی تھی اور عیسٰی کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ ان دونوں کے اندر جاتے ہی آفاق بے دم ہو کر صوفے پر ڈھے گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام رکھا تھا اور سخت مضطرب کیفیت میں اپنے بال نوچ رہا تھا۔ اس کے دل پر کون سی قیامت گزر رہی تھی، یہ مالا نہیں جانتی تھی، علی عیسٰی بھی نہیں جانتا تھا۔

وہ بس مالا کی نفرت اور حقارت کی انتہا کو سوچ رہا تھا۔ وہ اس کے بارے میں کہاں تک نیچے جا کر سوچتی تھی۔ وہ اس کے بارے میں کیسے خیالات رکھتی تھی؟ آفاق میں ذرا بھی غیرت ہوتی تو اسی لمحے سامان اٹھا کر اس گھر پر لعنت بھیجتا، ٹھوکروں سے ہر چیز اڑاتا چلا جاتا

مگر اسے جذباتیت کا مظاہرہ نہیں کرنا تھا۔ اسے عجلت نہیں دکھانی تھی بلکہ مشن امپاسبل کو کامیابی سے ہمکنار کرنا تھا۔ وہ ناممکن نظر آنے والی ادھوری چیزوں کو... بےترتیب چیزوں کو کس طرح سے ممکن بنا سکتا تھا اسے بگڑی ترتیب کو درست کرنا تھا اور یہ درستگی بھلا کون سا طوفان اٹھانے والی تھی یہ بات آفاق نہیں جانتا تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے والی مُرّاذیت اور انتہائی اعصاب شکن سچوئشن کو بھلا کر آئندہ کی صورتِ حال پر غور کررہا تھا۔ اگلا منصوبہ؟ اگلا لائحہ عمل؟ اگلی پلاننگ یا اگلی کوئی کہانی......؟

مالا اسے گالیاں دے کر گئی تھی، طعنے مار کے گئی تھی، نفرت اور حقارت کا مظاہرہ کر کے گئی تھی۔ اسے گھر تک سے نکالنے کی عیسیٰ کے سامنے التجا کر کے گئی تھی۔ وہ غیرت مند ہوتا تو عیسیٰ کے سامنے ہر چیز کو ٹھوکر سے اڑا کر چلا جاتا مگر بس ایک احساس تھا، جس نے اسے کوئی بھی انتہائی قدم اٹھانے سے روک رکھا تھا، بس ایک جذبہ صرف ایک احساس۔

☆☆☆

صبح تک مالا جیسے نارمل ہوگئی تھی حالانکہ رات کو جس طرح وہ کسی دورے کا شکار لگ رہی تھی کسی کو بھی اس کے سنبھلنے کی امید نہیں تھی مگر صبح ہوتے ہی اس کا ذہن پُرسکون ہوگیا۔ وہ ایک ان دیکھے بوجھ سے آزاد ہوچکی تھی۔ پچھلے کچھ دنوں سے وہ جس ذہنی کرب سے گزر رہی تھی یوں لگ رہا تھا سب کچھ کہہ سن کر اس کا دماغ اور دل کپاس کے مانند ہلکے ہوگئے تھے۔ وہ عیسیٰ کو سب بتا کر جیسے آزاد ہوگئی تھی۔ اب اس کے من پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ اسے قوی امید اور بڑا مستحکم یقین تھا کہ علی عیسیٰ اب اپنے دشمنوں کی نشاندہی ہوچکنے کے بعد اب ان سے خود ہی نپٹ لے گا۔ مالا کے نزدیک کہانی مکمل کر سامنے آگئی تھی۔ آخر سوزن اور آفاق کی ملی بھگت کو مالا نے کھوج لیا تھا۔ سوزن جو اپنے رد کیے جانے کے توہین نما احساس میں جکڑی تھی۔ بظاہر مالا کے لیے بے انتہا مخلص تھی اور در پردہ آفاق کے ساتھ مل کر اسے ٹارچر کررہی تھی۔ یہاں تک کہ علی عیسیٰ، مالا کو نفسیاتی مریضہ سمجھ کر کسی اسپتال میں پھینک آتا۔ سوزن اپنے تئیں رستے صاف کررہی تھی۔ آفاق کو جانے کتنے پیسوں کا لالچ دے رکھا تھا مگر ایک بات تو مالا سمجھ چکی تھی۔ آفاق صرف سوزن کے لیے کام کرتا تھا اور سوزن کچھ تو اپنے لیے اور کچھ موِن کے حصے کا غصہ بھی مالا پر آرام سے نکال رہی تھی۔ اسے بے وقوف بنا کر اس پر غصہ اور خوف طاری کر کے وہ لوگ بس علی عیسیٰ کی نگاہ میں اسے گرانا چاہتے تھے اور مالا ان کے انتہائی غلیظ مقاصد کو سمجھ چکی تھی اور آج وہ مطمئن اس لیے تھی کہ علی عیسیٰ کی آنکھیں بھی اس نے کھول دی تھیں۔

شاید آج مالا کے سکون اور اطمینان کا دن تھا۔ اگرچہ علی عیسیٰ نے اسے کی تمام باتوں اور بدگمانیوں کے جواب میں کوئی سوال نہیں پوچھے تھے مگر وہ کسی بھی وقت مالا سے کچھ بھی پوچھ سکتا تھا۔ وہ اس سے کوئی ثبوت مانگ لیتا یا دلیل جانچتا تو مالا بھلا کیا جواب دیتی؟ اس کے پاس فی الحال کوئی ثبوت نہیں تھا اور ثبوت اکٹھا کرنے کے لیے اسے سوزن اور آفاق کی باتیں ریکارڈ کرنا تھیں۔ مالا کا یقین مستحکم تھا کہ ایک مرتبہ پھر سوزن اور آفاق نفسیاتی طور پر اسے ٹارچر کرنے کے لیے عیسیٰ کی غیر موجودگی میں آئیں گے تب اس کے پاس ایک ٹیپ ریکارڈر کا ہونا بہت ضروری تھا۔

وہ آج عیسیٰ اور آفاق کے جاتے ہی قریبی مارکیٹ اکیلی چلی آئی تھی۔ اسے ایک بہت چھوٹا سا فلیش ڈرائیو جتنا ریکارڈر چاہیے تھا جسے وہ اپنے بالوں کے پیچھے پن اپ کرسکتی۔

آج وہ اکیلی علی عیسیٰ کے من ہائیم کی چمکتی شفاف سڑکوں پر گھوم رہی تھی۔ یہ من ہائیم تھا جو مالا کے من میں بستا تھا۔ یہاں انسان نہیں طلسماتی، رومانوی کردار بسا کرتے تھے۔ کالی، چمکیلی سڑکوں پر چلتے پھرتے نظر آیا کرتے تھے۔ اس شہر کی فضا میں محبت رچی ہوئی تھی اور وفا گندھی ہوئی تھی۔

سرمئی سڑکوں پر خوش پوشاک، خوب صورت، صحت مند لوگ چلتے تھے اور شیشوں کی دکانوں میں چینی

کی گڑیا جیسی سیلز گرلز راہ چلتوں کو اپنی طرف متوجہ کرلیتی تھیں۔

اس شہر کے پس منظر میں بلند پہاڑوں کی سرمئی چوٹیاں تھیں اور انہی پہاڑوں پر کہیں کہیں سفید خوب صورت مکان، جانے ان پتھروں پر یہ مکان کھڑے کیسے تھے!

اس سرزمین پر قدم رکھتے ہی مالا کی یہی سوچ تھی، اس سرزمین سے مالا کے قدم اکھڑنے کے وقت بھی یہی سوچ تھی۔ وہ کچھ خواب کی سی کیفیت میں چلتی شیشے کے ریکس دیکھنے لگی۔ جن پر جدید قسم کے ٹیپ ریکارڈر، ریڈیو، موبائل اور مختلف قسم کا الیکٹرونکس کا سامان پڑا تھا۔ وہ ایک چھوٹے سے کرسٹل نما فش کی شیپ میں پڑے ریکارڈر کو اٹھا کر دیکھنے لگی۔ اسے جلد ہی گوہرِ مقصود مل گیا تھا۔ اس نے کرسٹل کا فش نما ریکارڈر اٹھا کر سیلز گرل کے سامنے رکھا۔

''یہ کتنے کا ہے؟'' مالا نے عجلت میں اسے مخاطب کیا۔ وہ ببل گم چباتی اپنی پونی ٹیل ہلا کر اس کی طرح ہنستی مسکراتی نہیں تھی۔ وہ ایک سنجیدہ ٹائپ کی سیلز گرل تھی۔ بہت خوب صورت، صحت مند اور اجلی اجلی سی۔ مالا عموماً اس کے پاس خریداری کے لیے آتی تھی۔ اس نے ایک ریک کے طرف ڈھیروں میگزین بھی رکھے ہوئے تھے۔ اکثر خریداری کے دوران مرد حضرات ان میگزین کی تب تک ورق گردانی کرتے تھے جب تک ان کی خواتین شاپنگ سے فارغ نہیں ہوجاتیں۔ جب وہ جانے لگتے تب یہ سیل گرل ان کو لجاجت سے مخاطب کرتی۔

''کیا میگ پیک کردوں؟ یا میگزین چاہیے؟'' اکثریت اس کی لجاجت کو دیکھتے ہوئے میگزین خریدنے کو ترجیح دیتے تاہم کچھ مالا جیسے لوگ بھی تھے جو بن دیکھے انکار کردیتے تھے۔ تاہم یہ لڑکی ہر کسی کو جاتے ہوئے میگزین خریدنے پر ضرور اکساتی تھی۔ جانے یہ میگزین کیسے تھے؟ فی الوقت مالا کو ریکارڈر خریدنے کی جلدی تھی۔ وہ اِدھر اُدھر تانک جھانک کر کے وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے سیلز گرل کو بتایا۔

''میں یہ لوں گی۔'' اس کی ڈوئچ اتنی امپرووتو ہوگئی تھی جو وہ اب انگریزی کا ٹوٹا پھوٹا سہارا لیے بغیر اور آئی وِل ٹیک اٹ بولے بنا کسی بھی دکان سے کچھ بھی خرید سکتی تھی۔ سیل گرل نے اس کا مطالبہ سن کر ریکارڈر پیک کردیا تھا۔ قیمت اوپر ہی چسپاں تھی مالا نے رقم پکڑا کر دانکے شون (آپ کا شکریہ) بولا اور پھر پلٹ کر جانے لگی تب اسی لڑکی نے عجلت میں اسے مخاطب کیا۔

''تم میگزین لوگی؟'' وہ مالا سے مخاطب تھی جب دو تین اور کسٹمر پہنچ گئے۔ وہ اسے چھوڑ کر انہیں فارغ کرنے لگی تھی۔ مالا نے اچٹتی سی نگاہ میگزین کے سرورق پر ڈالی اور دوسری نگاہ ڈالنے کا گناہ کیے بغیر استغفراللہ بولتی جھپاک سے باہر نکلنے لگی تھی معاً اپنے پیچھے ایک مانوس سی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ کون تھا؟ جو جدید قسم کے کیمروں کا پوچھ رہا تھا اور اس کی مانوس سی آواز میں ''بیتے میگزین زی میر۔'' (برائے مہربانی مجھے دکھائیے) سن کر وہ پلٹ ضرور جاتی جو لوگوں کا ایک ہجوم اس طرف امڈ نہ آتا۔ اتنے رش کا اسے گمان نہیں تھا۔ ایک دم بھانت بھانت کے لوگ آگئے تھے۔ مختلف آوازیں مگر مطالبہ اور خواہش صرف ایک تھی۔

''نیا میگ آیا ہے؟'' وہ لوگ میگزین کے ڈھیر پر مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہے تھے۔ سیل گرل کی مسکراہٹ دیکھنے کے لائق تھی۔ پہلے والی ناگواری اور سنجیدگی کا خاتمہ ہوچکا تھا۔ وہ خوش اخلاقی سے انتہائی عریاں تصویروں والا میگ ایک، ایک گاہک کو پکڑا رہی تھی۔

مالا استغفار، استغفار کا ورد کرتی کانوں کو ہاتھ لگاتی رائل روڈ پر چل رہی تھی مگر اس کے کان ابھی تک اسی مانوس آواز کی بازگشت کو سن رہے تھے بلاشبہ وہ آفاق کی آواز تھی یا تو اس نے مالا کو دیکھا نہیں تھا یا پھر دیکھ کر جان بوجھ کر نظر انداز کردیا تھا۔ آخر شرم اور شرمندگی کے باعث کیسے سامنا کرتا؟ وہ بھی اس

صورت میں جب مالا اس کی چالوں اور منصوبوں کو جان چکی تھی۔ اب اپنا کریہہ روپ اور بدنما شکل لے کر مالا کا سامنا کیسے کر پاتا؟ یوں کہ عیسیٰ بھی اسے اب گھاس ڈالنے والا نہیں تھا۔ مالا کو قوی امید تھی کہ آج نہ سہی تو اگلی سویر تک عیسیٰ، آفاق کو گھر اور جاب سے نکال دے گا۔ دراصل عیسیٰ بڑا با اصول بندہ تھا۔ دشمنوں کے ساتھ بھی ضابطے میں رہ کر کارروائی کرتا اور مالا کو پوری امید تھی کہ عیسیٰ، آفاق کے بارے میں سب کچھ جان کر بھی اس پر اندھا بھروسا ہرگز نہیں کرے گا۔ وہ اسے دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال باہر کرے گا۔ مالا کو اب صرف رات کا یا اگلی سویر تک کا انتظار تھا۔ وہ جانتی تھی عیسیٰ اس سے زیادہ آفاق کو گھر میں رکھ کر مالا کو ذہنی اذیت اور ڈپریشن کا شکار کبھی نہیں کرے گا۔ اسے مالا دنیا میں اپنے باپ اور بہن کے بعد ہر رشتے سے بڑھ کر عزیز تھی۔

وہ اپنی اسٹریٹ پر آئی تو اچانک افی کے مکان پر نظر پڑی۔ وہاں سفید نائیلون کے جالی دار پردوں والی کھڑکیوں کے بیرونی طرف پھولوں سے لدی ٹوکریوں کے ایک جانب بورڈ پر ابھی تک سمر فری یعنی روم فار رینٹ لکھا تھا۔ کرایے کے لیے ابھی تک کمرا خالی تھا اور افی کو کرایے دار آج تک نہیں ملا تھا۔ خیر افی کی یہ خواہش جلد پوری ہونے والی تھی۔ آج شام تک یا اگلی صبح تک علی عیسیٰ، آفاق کو گھر سے نکال کر جاب سے فارغ کرنے والا تھا۔ ایسے فریبی، مکار، ذلیل اور آستین کے سانپ جیسے ہم وطنوں کا علاج بھی یہی تھا۔ انہیں عزت اور رزق راس آنے والا نہیں تھا۔ دوسروں کے گھروں میں آگ لگا کر بھلا کیسے چین پا سکتے تھے؟ اب اسے خوار ہونا تھا۔ اپنی جلد بازی، کمینی فطرت اور لالچ کے باعث وہ مالا کے دل سے تو اترا ہی تھا عیسیٰ کی نگاہ اور دل سے بھی نکل گیا تھا۔ اب کیسے ماں کو حج کروائے گا، کس طرح دادی کو کڑے بنوا کر دے گا اور کیسے بہنوئیوں کو سیٹ کرے گا، بہنیں بیاہے گا؟ دوسروں کی زندگیاں اجیرن کر کے سکھ پانا کوئی آسان نہیں ہوتا، کاش کہ کم فہم آفاق جان جاتا۔ لالچ میں آ کر عیسیٰ کے دل سے نہ اترتا۔ اس کے گھر سے نہ نکلتا تو آئندہ سالوں میں اس ملک جرمنی کا باعزت شہری بن جاتا مگر عزت اور حلال رزق کسی کسی کے نصیب میں ہوتا ہے، ہر کسی کے نہیں۔

جانے کون سی ایسی طاقت تھی جو اسے مالا اپنے گھر کے بجائے افی کے گھر لے آئی تھی۔ دراصل وہ افی کو کسی دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ وہ افی کو آفاق کے ایک، ایک کرتوت، چال، منصوبے اور مکاری کے بارے میں بتانے کا پختہ ارادہ کر کے آئی تھی پھر اس نے نتائج کی پروا کیے بغیر افی کو سب کچھ بتا دیا۔ سوزن کی عیسیٰ سے محبت، سوزن کی چال، آفاق اور سوزن کی دوستی، ان کا منصوبہ اور مالا کو پے در پے خوف زدہ کرنے تک۔ وہ ایک، ایک کہانی کھول، کھول کر بتا رہی تھی۔ وہ آفاق کی بدفطرت کے ایک، ایک بھیانک پہلو کو اجاگر کر رہی تھی۔ اسے افی جیسی معصوم لڑکی کو آنے والے فریب اور دھوکے سے بچانا تھا۔ وہ صاف نیت اور خلوص لے کر آئی تھی۔ وہ افی کی ہمدرد دوست اور اچھی پڑوسن کا حق ادا کرنے آئی تھی مگر افی نے بھلا کیا سمجھا؟

وہ اسے حاسد اور بدفطرت سمجھنے لگی۔ یہ کہ مالا اس کی خوشیوں سے جلنے لگی تھی۔ آج شام ان کا نکاح تھا اور مالا رنگ میں بھنگ ڈالنے آ گئی تھی۔ وہ تو نکاح کی خبر پر ہی شاکڈ تھی لیکن افی کی بدگمانی، غصہ اور رونے دھونے کو دیکھ کر اور بھی ڈھے گئی۔ وہ افی کو بچانا چاہتی تھی مگر افی خود ہی گڑھے میں گرنے کو تیار بیٹھی تھی۔ افی نے اس کی پوری بات سن کر شاکڈ سی کیفیت میں کہا تھا۔

”مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔ تم میری خوشی میں رکاوٹ بن جاؤ گی۔ تمہیں کیا خبر یورپین کنٹریز میں پاکستانی لڑکیوں کو اچھے رشتے ملنا کتنا مشکل اور کٹھن ہوتا ہے۔ میری ماں کی نیندیں حرام ہیں اور میرا بھائی پاکستان میں رشتے داروں کے گھروں میں ہمارے لیے اچھے بر تلاشنے کے لیے مارا مارا پھر رہا ہے۔ مجھے

تمہاری سوچ پر بہت افسوس ہے، کیا اتنے عرصے بعد تمہیں اچانک آفاق اپنا دشمن نظر آنے لگا ہے؟ آخر پہلے بھی تو وہی آفاق تھا جس کے تمہارے شوہر اور تم گن گایا کرتے تھے۔ اب آفاق میں کیسے کیڑے نظر آ گئے؟ اور تم یقیناً کسی غلط گمان میں ہو، آفاق ایسا نہیں ہے۔“ افی نے دکھ کی انتہا پر پہنچ کر مالا کے سارے طبق روشن کر دیے تھے۔ وہ مالا کو برا بھلا کہہ رہی تھی، غصہ کر رہی تھی اور ناراض ہو رہی تھی۔ اس کی ممی اور امی نے بھی جیسے فساد کھڑا کر دیا تھا۔ عین نکاح والے دن مالا کا آفاق کے بارے میں برائی نامہ سن کر انہیں بھی کچھ تو کرنا چاہیے تھا۔

ادھر مالا اتنی دلبرداشتہ ہوئی کہ وہ ان لوگوں کو جہنم میں جاؤ کہہ کر واپس پلٹ آئی۔ اسے افی کی بدگمانی کا بہت دکھ تھا۔ دوستی کا لحاظ کیے بغیر اس نے مالا کو کیسے منہ پھاڑ کر حاسد کہہ دیا تھا۔ اسے رنج نہ ہوتا تو پھر وہ شادیانے بجاتی کیا؟ وہ بہت بکھری ٹوٹی حالت میں جرمنی جیسے ملک میں موجود اپنی دوسری سہیلی سے بھی ناتا توڑ آئی تھی۔ سوزن سے تو رشتہ ختم ہوا ہی تھا، آج افی بھی ہمیشہ کے لیے پرائی ہو گئی تھی۔ مالا کا دل ٹوٹ سا گیا۔ افی نے جس طرح کا رویہ اس کے ساتھ رکھا تھا وہ مالا کے لیے کسی دھچکے سے کم نہیں تھا۔ وہ اپنے ہونے والے شوہر کے متعلق ایک لفظ بھی برا نہیں سننا چاہتی تھی اسے مالا ایک نمبر کی منافق، جھوٹی، کمینی اور مکار نظر آئی تھی۔ افی کی نظر میں اس کا امیج بگڑ گیا تھا۔ مالا روتی چلاتی یا دکھی کیوں نہ ہوتی۔

وہ بھیگے چہرے کے ساتھ تالاب کے قریب سے گزر رہی تھی جب اس نے کچھ فاصلے پر پھولوں کے اونچے جھنڈ کے ایک طرف سرسراہٹ سی محسوس کی تھی۔ وہ شاید اپنے دکھوں اور رونے دھونے میں مشغول بھی نہ متوجہ ہوتی جب تک وہ ”او میرے مالک!“ جیسی آواز نہ سن لیتی۔ کوئی جھنڈ کے دوسری طرف دو زانو بیٹھا نوکیلی گھاس میں ہاتھ مارتا شاکڈ سا تھا۔

مالا نے گردن موڑ کر دیکھا۔ اسے آفاق کی جیکٹ نظر آ گئی تھی اور اس کا مخصوص لیدر بیگ جس کو اس نے کندھے سے لٹکا رکھا تھا۔ اللہ جانے وہ مارکیٹ سے سیدھا گھر آ رہا تھا یا پھر گھر سے اب دوبارہ کہیں جا رہا تھا۔ مالا کچھ ٹھٹک کر آفاق کو دیکھنے لگی۔ اس نے گھاس میں سے کچھ تلاش کر کے اسے اپنے ہاتھ میں ٹٹولا پھر ”او میرے مالک!“ بول کر اس چیز کو عجلت میں اپنے لیدر بیگ میں رکھنے لگا۔ اس کا چہرہ انتہائی سرخ تھا۔ آنکھوں میں حیرت اور عجیب سا تعجب تھا جیسے اسے امید نہیں تھی کہ وہ نوکیلی گھاس میں سے کوئی اس قسم کی چیز بھی دریافت کر سکتا تھا۔ جس کی نہ تو اسے کوئی توقع تھی اور نہ کوئی امید۔ وہ اتنا ہی شاکڈ، حیران، متحیر اور دم بخود تھا پھر جیسے وہ اس جھٹکے سے سنبھل کر اپنی جگہ سے اٹھا تھا تب اس کی مالا پر نگاہ پڑ گئی تھی۔ یہ اتفاقاً مالا سے دوسرا ٹکراؤ تھا۔ مارکیٹ کے بعد وہ اب دوبارہ اسے دیکھ رہا تھا حالانکہ فی الحال وہ اسے مخاطب کرنا نہیں چاہتا تھا مگر پھر بھی غیر ارادی طور پر اس کے منہ سے بے ساختہ پھسل گیا۔

”گھر کے اہم مقامات پر کیمرے فٹ کر دیے ہیں۔ دیکھ لینا جلد حقیقت سامنے آ جائے گی، سچ کو کھلتے دیر نہیں لگے گی۔“ وہ مالا کو ہرگز بھی نہ بلاتا مگر پھر بھی خود کو روک نہیں پایا تھا۔ رات کے ایک، ایک منظر کو ایک، ایک اذیت کی لہر دبانے کے بعد نظر انداز کرنا بہت مشکل تھا مگر آفاق نے یہ مشکل اور کٹھن مرحلہ بالآخر طے کر ہی لیا تھا۔

”سچ تو کھل گیا۔“ مالا انتہائی تنفر سے بولی تھی۔ جی چاہ رہا تھا آفاق کا مکاری بھرا چہرہ ناخنوں سے کھسوٹ ڈالے مگر اس خواہش پر عمل کرنا ممکن نہیں تھا۔

”یہ سچ آدھا ہے...... پورا کھلنے سے پہلے حتمی فیصلہ نہیں چاہیے ورنہ پچھتاوے گھیر لیتے ہیں۔“ وہ عجیب سے کاٹ دار لہجے میں کہہ رہا تھا۔ مالا کو اس کی ڈھٹائی پر غصہ آ گیا تھا۔

”ہونہہ...... پورا سچ...... اب کسے دھوکا دینا چاہتے ہو؟ عیسیٰ نے تمہارا کریہہ روپ تو دیکھ لیا ہے۔“

وہ زہر خند ہوئی۔

''عیسیٰ نے ابھی میرا ہی روپ دیکھا ہے وہ بھی تمہاری نظر سے۔ اسے اب اپنی نظر سے بھی کچھ دیکھنے دو۔ تم نے اپنی پٹی ہی اس کی آنکھوں پر باندھ رکھی ہے۔'' آفاق بھی تلخی سے بولا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ آفاق کی بات کو مذاق سمجھ کر انجوائے کرتی مگر اب تو اس کا دماغ آگ کی طرح تپنے لگا تھا۔

''عیسیٰ نے تمہارے کرتوت دیکھ لیے ہیں۔ اب تم بس فیصلے تک کا انتظار کرو۔'' مالا اسے دھمکا رہی تھی۔

آفاق کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ ابھر آئی۔

''فیصلے سے زیادہ میں اسے کچھ ایسا ضرور دکھاؤں گا جو وہ کبھی دیکھنا نہیں چاہے گا۔ تم بھی انتظار کرو۔'' اس نے گویا بدلہ اتارا تھا۔

''تمہیں غرور کس بات پر ہے؟ اپنے شاطر ذہن پر یا اعلیٰ منصوبے پر...... جو تمہارے ہی منہ پر آپڑا ہے۔'' وہ آگ بگولہ ہوگئی۔

''ایک طرف کی کہانی، فلم کا آدھا پارٹ، ناول کا پہلا حصہ، ڈرامے کی ابتدائی قسطیں...... بھلا اصل کہانی اور انجام تک پہنچنے سے پہلے تم فردِ جرم کیسے عائد کرسکتی ہو؟ کم از کم میں عیسیٰ کو تمہارے جیسا جلد باز یا جذباتی نہیں سمجھتا۔'' آفاق نے کچھ جھنجلا کر کہا تھا۔

''تو پھر آج شام یا کل صبح تک انتظار کرلینا۔ عیسیٰ تمہیں خود گھر سے باہر نکال دیں گے۔ آستین کے دشمن۔'' وہ غیظ کے مارے لرز گئی تھی۔

''عیسیٰ مجھے کیوں نکالے گا؟ میں اس کے دھکے دینے سے پہلے ہی تمہارا گھر چھوڑ دوں گا مگر عیسیٰ کو کچھ دکھانے کے بعد۔ مجھے ابھی اپنے نکاح کے وقت کوئی بدمزگی نہیں پھیلانی...... نکاح کے بعد بتادوں گا کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ۔'' آفاق غضب ناک تیور لیے لمبے لمبے ڈگ بھرتا اپنے لیدر بیگ کو سینے سے چمٹائے باہر کی طرف چلا گیا تھا جبکہ مالا سر جھٹکتی اندر آگئی۔

☆☆☆

آفاق کی باتوں نے اس کا دماغ سلگا کر رکھ دیا تھا۔ وہ جونہی کمرے میں داخل ہوئی اسے اپنے کمرے میں جگہ، جگہ کچھ میگزین بکھرے دکھائی دیے تھے۔ اس نے اردگرد نگاہ ڈالی۔ اس کے کمرے میں کوئی حساس سسٹم یا کیمرا نہیں تھا اور یہ میگزین نہ جانے کس نے پھیلا رکھے تھے۔ تقریباً بیس تیس کے قریب رسائل تھے۔ مالا شاکڈ اس لیے رہ گئی تھی کہ آخر یہ کارنامہ کس کا تھا کس نے رسائل کا انبار بیڈ، کاؤچ، کارپٹ اور صوفوں پر لگا رکھا تھا؟ وہ میگزین سے بچتی بچاتی صوفے تک آئی تھی پھر اس نے جھک کر غیر ارادی طور پر میگزین اٹھا کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں ابل کر باہر آگئی تھیں۔ یہ وہی رسائل تھے جنہیں مالا نے مارکیٹ میں دیکھا تھا۔ ایک نہیں، دو نہیں بلکہ پورا ڈھیر...... انکی فحش عریاں اور واہیات تصویریں تھیں کہ مالا کا چہرہ لال بھبھوکا ہوگیا۔ وہ آگ برساتی آنکھیں لیے نینی کے سر پر سوار ہوگئی۔

''یہ بے ہودہ رسائل کون لایا ہے؟'' مالا نے غضب ناک تیور لیے نینی سے پوچھا تھا۔ اس کی توقع کے عین مطابق نینی نے لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ آج سے پہلے بھی اِکا دُکا ایسے بے ہودہ رسائل گھر میں دکھائی دیے تھے مگر مالا تب غور نہ کرپائی تھی کہ انہیں کون لاتا ہے۔

''مجھے نہیں پتا، آفاق سر کو پتا ہوگا۔ وہی تو ابھی مارکیٹ سے آئے ہیں۔'' نینی کے سادگی بھرے جواب نے مالا کو آگ لگا دی تھی۔ آخر یہ آفاق کرنا کیا چاہتا تھا؟ اس قسم کے میگزین اس کے کمرے میں رکھنے کا مقصد کیا تھا؟ صرف اور صرف عیسیٰ کو بدگمان کرنا؟ مالا آنسو بہاتی ''اور اللہ تمہیں سمجھے آفاق'' کہتی تمام میگزین اٹھا کر کوڑے کے ڈرم میں ڈال رہی تھی۔ جب علی عیسیٰ بھی اچانک گھر آگیا۔ اب مالا کی حالت اس کی نگاہ سے چھپی نہیں رہ سکی تھی پھر جو اس نے میگزین دیکھ لیے تو اس کا پارہ بھی بِنا سوچے سمجھے چڑھ گیا تھا۔

''یہ بے ہودہ رسائل کون لایا ہے؟'' اس کی آنکھیں غصے کے مارے سرخ ہوگئی تھیں۔ اتنا تو وہ جانتا ہی تھا کہ مالا اس قسم کی نازیبا اور گھٹیا حرکات نہیں

کرسکتی اور نہ شوہر کی غیر موجودگی میں ایسی نچ سطح کی بے ہودہ تفریح سے لطف اندوز ہونے والی تھی۔ سو اسے مالا پر غصہ ہرگز نہیں آیا تھا اور یہ عجیب اتفاق تھا کہ عیسیٰ کا بھی پہلا دھیان آفاق کی طرف گیا۔

''آفاق کے علاوہ اس گھر میں کون ہے؟'' مالا، عیسیٰ کے سامنے پانی، پانی ہوگئی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے نظر چرائے کھڑے تھے اور عیسیٰ جیسے سنجیدگی اور غصے کی انتہا پر کھڑا فیصلہ سنا رہا تھا۔

''آج شام کو اس خبیث آدمی کا نکاح ہے۔ میں اسے آج ہی یہاں سے فارغ کرتا ہوں۔ بس نکاح ہونے کا انتظار ہے۔'' وہ لب بھینچے دوبارہ دفتر چلا گیا تھا جبکہ مالا گویا سر تھام کر رہ گئی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہو کیا رہا ہے۔

''اور نہ جانے ابھی کیا، کیا ہونا باقی تھا؟'' اس کے ذہن اور خیال میں تھا کہ آفاق کو گھر سے نکالتے ہی ان کی زندگیوں کا انتشار اور بے ترتیبی ختم ہوجائے گی۔ وہ بلا کی ناسمجھ اور کم فہم تھی۔ تبھی اس امید پر خود کو پُرسکون کیے ہوئے تھی۔

سہ پہر ڈھلے بالکل غیر متوقع طور پر پاکستان سے اس کی بہن بندیا کی کال آگئی۔ اس کے ہمیشہ والے شکوے اور شکایات کو سنتی مالا چند لمحوں کے لیے اپنے پُرسکون گھر میں ذہنی طور پر چلی گئی اس کے بابل کا آنگن، بجیلے، لائق فائق خوب صورت بھائی، نٹ کھٹ سی بہن، شفیق سی ممی جیسے زندگی کے رنگ مکمل ہونے لگے تھے مگر یہ مکمل رنگ ایک خواب کے علاوہ کچھ نہیں تھے۔ پلک جھپکنے کی دیر میں حقیقت پھن پھیلائے آکھڑی ہوئی تھی۔ بندیا تو شکوے کرسکتی تھی مگر وہ شکوہ بھی نہ کرسکی۔ اتنا بھی نہ کہہ سکی۔

''بابل نے مجھے کس اجنبی دیس بھیج دیا جیسے کوئی جادونگری ہو، جیسے کوئی طلسماتی دنیا ہو، جہاں سازشوں کے جال، جہاں مکاریاں اور عیاریاں ہیں، جہاں تالاب پر پریاں اترتی ہیں پر وہ پریاں بدیع الجمال کی طرح ہرگز نہیں.....'' وہ تو کچھ بھی نہیں کہہ سکی تھی۔ کوئی شکوہ نہ کرسکی، نہ حرف شکایت لبوں پر آیا۔ بندیا کے پاس مالا کو بتانے کے لیے بہت کچھ تھا۔ بہت سے انکشاف، بہت سی خبریں۔

''ذیشان بھائی کے تیور ٹھیک نہیں، آتے جاتے عینی کے گیت سناتا ہے۔ لمبی لمبی ٹیلی فونک باتیں، آج کل عینی کا بھوت ذیشان بھائی کے سر پر ناچ رہا ہے۔ شامی اور ذی شاہ کی اپنی مصروفیات، تمہارے بعد میں اکیلی ہوگئی ہوں۔'' خاندان کی چیدہ چیدہ خبریں بتاتے ہوئے وہ آخر میں دکھی ہوگئی تھی اور اپنے دکھوں میں اس نے مالا کی خاموشی کو نوٹ ہی نہیں کیا تھا۔

''تم اپنے عیسیٰ کو لے کر کب آؤ گی؟ مجھے نہیں لگتا تم جلد آپاؤ گی؟ عیسیٰ کی پوری ٹیم جب تک تیار نہ ہوگی۔'' اب وہ بڑے بھنائے سے لہجے میں کہہ رہی تھی تب مالا قدرے چونک گئی۔ اس نے بے خیالی میں اِدھر اُدھر دیکھا اسے بندیا کی آواز بہت دور سے آتی سنائی دے رہی تھی۔

''ویسے تم ایسی بے مروت تو نہ تھیں۔ ہزار مرتبہ کہا ہے، عیسیٰ کی اور اپنی فوٹو ہی بھجوا دو نہیں تو انٹرنیٹ یا فیس بک یوز کرلو پر تمہارے پاس فرصت ہی کہاں ہے؟ میں تو اپنے بھانجے کو دیکھنے کے لیے بھی ترس جاؤں گی۔'' بندیا تڑخ کر کہہ رہی تھی وہ دوسروں کی کم ہی سنتی تھی، بس اپنی سنائے جاتی۔

''ایک بات سچ، سچ بتاؤ، کیا عیسیٰ تم سے جاب کرواتا ہے؟ یا پھر گھر کے کام اتنے زیادہ ہوتے ہیں جو تمہیں فرصت نہیں ملتی؟'' وہ غصے اور ناراضی سے پوچھ رہی تھی تب مالا کو بھی چونکنا پڑا تھا۔

''ایسا کچھ بھی نہیں، مجھ پر کوئی بوجھ نہیں ہے اور تم جانتی تو ہو عیسیٰ فنانشلی کتنے اسٹرانگ ہیں۔'' مالا نے بے ساختہ وضاحت کی تھی تب بندیا جیسے مطمئن ہوگئی۔

''اچھا تو پھر میں سمجھ لیتی ہوں، عیسیٰ بھائی کی سنگت نے تمہیں اتنا خود میں محو کر رکھا ہے کہ تمہیں ہم یاد نہیں آتے۔ اچھا ہے ناں بس تم سکھی اور آباد رہو۔'' نٹ کھٹ سی بندیا شوخ لہجے میں کہتی آخر میں سنجیدہ

ہوگئی تھی تب مالا نے ڈیڈی، ممی اور بھائیوں کا حال احوال پوچھ کرفون بند کر دیا تھا۔ جانے کیوں اس کا دل بھر بھر آنے لگا۔ سب بے طرح یاد آنے لگے۔

سوچوں کے تانوں بانوں نے اسے الجھا رکھا تھا تب چاچو کی کراہ اسے حال کی دنیا میں کھینچ لائی تھی۔ وہ تقریباً بھاگتی ہوئی چاچو تک پہنچی تھی ان کی طبیعت خراب لگ رہی تھی۔ وہی سینے کا پرانا درد تھا مالا نے چاچو کو دوا دی ان کا سینہ اور بازو مسلا تو ایک دم انہیں افاقہ محسوس ہونے لگا تھا۔ مالا چاہتی تھی کہ عیسٰی کو اطلاع کردے مگر چاچو نے منع کر دیا۔ وہ اب بہتر محسوس کر رہے تھے مگر وہ ٹھیک نہیں تھے۔ مالا جانتی تھی پر چاچو اسے اٹھنے نہیں دے رہے تھے۔ ان کا دل چاہ رہا تھا مالا ان کے قریب رہے اور ان سے باتیں کرے۔ وہ گھبراہٹ محسوس کر رہے تھے۔ ان کی رنگت کتنی پھیکی تھی اور ماتھے پر بار بار ابھرتی بوندیں...... مالا کا دل خدشات میں لپٹ رہا تھا۔ جیسے کچھ ہونے والا تھا جیسے قریب، قریب کوئی خاص آہٹیں سنائی دے رہی تھی۔ چاچو بھیگی آواز میں بتا رہے تھے۔

''مون کی کال آئی تھی۔'' ان کا لہجہ بھرا بھرا تھا۔

مالا نے گہری سانس لی۔ مون کی کال جب بھی آتی وہ اسی طرح بیمار ہو جاتے تھے۔ انہیں ٹھنڈے پسینے آنے لگتے، رنگت پھیکی پڑ جاتی، سینے میں درد اٹھنے لگتا۔ جانے یہ مون کیسی بیٹی تھی؟ کیسی اولاد تھی جو ٹھنڈک بننے کے بجائے کوئی عذاب یا سزا کی طرح نازل تھی۔

''کیا کہتی ہے؟'' مالا نے حتی المقدور سرسری لہجے میں پوچھا تھا حالانکہ مون کے ذکر سے اس کا دل دھک، دھک کرنے لگتا تھا اور اندر کہیں دور گہرائی میں خوف کی لہریں ابھرنے لگتیں۔

''بس ایسے ہی۔'' انہوں نے بہ مشکل مسکرانے کی کوشش کی تھی مگر وہ مسکرا نہیں پائے تھے۔ مالا بغور انہیں دیکھنے لگی۔ وہ اپنی عمر سے ذرا بھی بڑے نہیں لگتے تھے بلکہ چار پانچ سال چھوٹے ہی لگتے۔ اونچے، لمبے، مضبوط اور بے انتہا خوب صورت۔ شاید چاچی، چاچو کے حسن میں گرفتار ہوگئی تھیں۔ چاچو کا سحر بھلا جوانی میں کیسا ہوگا؟ اس نے لمحے بھر کے لیے آنکھیں بند کیں تو علی عیسٰی کا سراپا آنکھوں کے سامنے آگیا۔

ہاں عیسٰی چاچو کی جوانی ہی تو تھا۔ انہی جیسا خوب صورت اور حلیم الطبع۔ نہ جانے چاچی مزاجاً کیسی تھیں؟ وہ تو عمر بھر پاکستان نہیں گئی تھیں نہ چاچو اور بچوں کو جانے دیا اور ان کے مرجانے کے بعد دونوں بھائیوں نے ایک تیسرا مضبوط رشتہ اپنے درمیان قائم کر لیا تھا مالا اور عیسٰی کی صورت میں۔

وہ چاچو کو بغور دیکھتی رہی تھی وہ اب بھی بہت گریس فل اور جوان لگتے تھے مگر مون کی وجہ سے مالا کو لگتا تھا وہ اندر ہی اندر کھوکھلے ہو رہے تھے پھر جیسے انہوں نے مالا کی سوچ کو زبان دے دی تھی۔

''میرا جرمنی میں ہمیشہ رہنے کا فیصلہ بہت غلط تھا بیٹا۔ ہم پاکستانی لوگ ایک عمر اجنبی دیس میں گزار کر جب اولاد کے ہاتھوں پامال ہونے لگتے ہیں تب، تب پھر اپنی قدریں، اپنی تہذیب اور اپنا وطن یاد آتا ہے۔ مجھے جلد یہاں سے لوٹ جانا چاہیے تھا مگر میں واپس پلٹ نہ سکا۔ مریم واپس نہیں جانا چاہتی تھی، اپنی ماں کو چھوڑنا اس کے لیے مشکل تھا اور میں ایسا خود غرض کے اپنی ماں کو چھوڑ آیا۔ کبھی لگتا ہے یہ ماں کے آنسوؤں کی سزا ہے۔ یہ مون میرے لیے ایک سزا ہی تو ہے۔'' ان کی آنکھوں کے گوشے بھیگ رہے تھے۔ وہ بے آواز رو رہے تھے۔ اپنی غلطیاں اب اتنا وقت بیت جانے کے بعد پہاڑ جتنی لگ رہی تھیں۔ مالا سے ان کا کرب دیکھا نہیں گیا تھا۔

''اس میں آپ کا کیا قصور چاچو، یہ تو رزق باندھ لیتا ہے۔'' اس نے ان کے دونوں ہاتھ تھام کر چوم لیے تھے۔ وہ ان کے بال سہلا رہی تھی۔ یہ بھی تو ایک بیٹی ہی تھی۔ سات سمندر پار سے اپنے اپنوں کو چھوڑ کر آئی صرف ان کے علی عیسٰی کے لیے۔ اپنے ماں، باپ کے لیے بھی ٹھنڈک، چچا کے لیے بھی ٹھنڈک اور شوہر کے دل کا چین وقرار۔ کبھی کبھی ان کا بھی دل چاہتا تھا، وہ اپنی مون کی شادی کریں۔ اسے شوہر کے ہمراہ ہنستا، بستا دیکھیں۔ اس کے بچوں کو گود میں اٹھائیں۔ ان کی قلقاریاں سنیں مگر مون ان کی کوئی خواہش پوری کرنے والی نہیں تھی۔ بس ایک دل کو ٹھیس لگی تو سارے رشتوں کی مٹھاس بھول گئی۔

''دل بہلاوے کی باتیں ہیں ساری، سچ تو یہ تھا میں واپس جانا ہی نہیں چاہتا تھا۔ یہ جرمنی کا حسن بھی بنگال کا کالا جادو ہے جو ایک دفعہ طاری ہوا تو پھر عمر بھر کے لیے نہ ٹوٹا۔'' ان کی آواز بھیگ گئی۔ وہ رندھے لہجے میں رونے لگے تھے۔ مالا کے سامنے آج تک وہ اتنے کمزور نہیں پڑے تھے۔ جانے آج کیا ہوا تھا؟ وہ اتنے زود رنج کیوں ہونے لگے؟ وہ اتنے بکھر کیوں رہے تھے پھر وہ بہت دیر تک مالا سے باتیں کرتے رہے پھر جیسے انہیں نیند آنے لگی۔ وہ اونگھ رہے تھے جب مالا احتیاط سے اٹھ کر ان کا وجود کمبل سے ڈھانپ کر باہر نکل آئی۔

آج معمول سے بڑھ کر سناٹا تھا۔ نجی جانے کہاں چلی گئی تھی۔ مالا نے سفید نائیلون کے جالی دار پردے کو ہٹا کر باہر جھانکا۔ سامنے والے گھر میں چہل پہل دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ آج روشنیوں کا شمار کوئی نہیں تھا۔ افی کی ممی پوری بجت بھلائے سارے گلوب آن کر رہی تھیں۔ مالا کو ڈھولکی کی تھاپ سنائی دی تھی۔ افی کی کزنز اور دوست آتی جاتی، بھاگتی دوڑتی، ہنستی مسکراتی نظر آرہی تھیں۔ مالا کی آنکھ میں کچھ چبھنے لگا۔ اس نے روشنیوں میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ آج روم فار رینٹ کی تختی بھی اکھڑ چکی تھی۔ انہیں مستقل کرایے دار مل چکا تھا۔ مالا کا دل بھر سا آیا۔ افی کی... اعتباری نے سینے میں پھانس گاڑ دی تھی۔ وہ اس کا بھلے سے اعتبار نہ کرتی پر اتنی رکھائی تو نہ دکھاتی، اتنی توہین تو نہ کرتی۔ مالا نے نم آنکھوں سے آخری دفعہ افی کے گھر پر نگاہ ڈال کر پردے برابر کر دیے تھے۔ اب عمر بھر کے لیے اس نے سامنے والے گھر کو نہیں دیکھنا تھا۔

وہ واپس پلٹ کر کمرے میں آئی تو کچھ ہی دیر بعد علی عیسٰی بھی چلا آیا۔ وہ دفتر سے سیدھا گھر آرہا تھا۔ گلے میں ٹائی لٹک رہی تھی۔ وہ تھکا تھکا سا پژمردہ لگ رہا تھا۔ مالا نے چاچو کی خرابی طبیعت کا بتانا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی پہلے اسے کچھ کھانے پینے کو دے گی پھر چاچو کا بتائے گی ویسے بھی اب وہ پہلے سے بہتر تھے اور اونگھ رہے تھے مگر اس کے باوجود عیسٰی چاچو کے کمرے میں جھانک کر انہیں سوتا دیکھنے کے بعد مطمئن سا واپس آیا تھا تب تک مالا گرما گرم چائے اور اسنیکس لے آئی تھی۔ چائے پیتے ہوئے جیسے وہ فریش سا ہوگیا تھا تب مالا نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے پوچھا۔

''آفاق اور افی کا آج نکاح ہے؟ وہ بھی اتنا اچانک؟'' مالا نے اپنی حیرت کا برملا اظہار کر دیا تھا۔ ابھی کچھ گھنٹے پہلے ہی تو اسے آفاق کے نکاح کا پتا چلا تھا اور وہ اسی لیے حیران بھی تھی۔

''ہاں، افی کی ممی کو بہت جلدی ہے۔ ایک لحاظ سے بہتر ہے۔ میں خود بھی چاہتا تھا کہ آفاق کا نکاح جلدی ہو جائے اور وہ یہاں سے چلا جائے۔'' گرما گرم چائے کے گھونٹ حلق میں انڈیلتے ہوئے وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔ عیسٰی کے تاثرات سپاٹ قسم کے تھے۔ مالا کو یوں لگا کہ وہ آفاق کا ذکر بھی نہیں کرنا چاہتا تاہم نکاح میں شرکت کا وہ ارادہ ضرور رکھتا تھا۔ بااصول بندہ جو تھا ہر کام ضابطے اور قاعدے سے کرتا تھا۔ مالا نے سمجھ کر سر ہلا دیا۔

''میں افی کے گھر نہیں جاؤں گی۔'' مالا نے لگے ہاتھوں طبیعت کا بہانہ بنا کر افی کی اور اپنی تلخ گفتگو کو چھپا لیا تھا۔ عیسٰی نے اس بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ تاہم وہ سر ہلا کر تائید ضرور کر رہا تھا پھر موضوع گفتگو خود بخود بدل گیا۔ عیسٰی بہت سنجیدہ اور کچھ سوچتا ہوا نظر آرہا تھا۔ جانے وہ کیا سوچ رہا تھا پھر کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ مالا سے گزرے ہوئے چیدہ، چیدہ انہونے واقعات پوچھنے لگا۔ پچھلے دنوں مالا کو کیا کچھ نظر آیا، گھر میں لائٹس آن کرنے سے لے کر وہ اجنبی غائبانہ سی

آواز تک۔ ایک، ایک بات وہ پوری جزئیات کے ساتھ پوچھ رہا تھا۔ سوال کررہا تھا اور نکتے بھی اٹھا رہا تھا پھر جب مالا نے نماز پڑھنے کے دوران اس عورت کا ذکر کیا اور تالاب پر اسے کلی مارنے کا واقعہ دوبارہ سنایا تب علی عیسٰی بری طرح سے چونک گیا تھا۔ نہ صرف وہ چونکا بلکہ پہلی مرتبہ اس کے چہرے پر بڑی بے ساختہ قسم کی مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔

''آں...... ہاں، ذرا پھر سے بتاؤ۔ تالاب پر بدیع الجمال پری آئی اور اس نے کیا کہا؟'' علی عیسٰی کی دلچسپی کا کوئی انت نہیں تھا۔ اس نے چائے کا کپ میز پر رکھ دیا تھا اور اب مسکراہٹ چھپائے بغیر پوچھ رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے والے سنجیدہ اور سپاٹ قسم کے تاثرات اب کہیں نہیں تھے۔ وہ اتنا پُرجوش نظر آرہا تھا کہ حد نہیں۔

''نہیں...... نہیں تو، بدیع الجمال نہیں تھی وہ...... بدیع الجمال وہ ہو بھی کیسے سکتی تھی؟'' مالا فوراً برا مان گئی تھی جیسے اس کے پسندیدہ کردار بدیع الجمال کو اس جھوٹی، فریبی اور ماسک زدہ چہرے والی عورت سے ملا کر عیسٰی نے کوئی جرم کر ڈالا تھا۔ تب عیسٰی نے فوراً معذرت کی۔

''تو اچھا...... وہ سیف الملوک کی بدیع الجمال نہیں تھی؟'' وہ ہونٹوں کی تراش میں مسکراہٹ چھپا کر سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔ مالا کی زبانی سفر العشق یعنی قصہ سیف الملوک و بدیع الجمال اس نے کئی ہزار مرتبہ سن رکھا تھا۔ وہ لافانی قسم کی محبت میں مبتلا تھی یعنی سیف الملوک اور بدیع الجمال کی محبت کو بڑی عقیدت کی نظر سے دیکھتی تھی۔ اب بھی عیسٰی کی شرارت محسوس کر کے اس نے فوراً تڑخ کر جواب دیا تھا۔

''وہ سیف الملوک کی بدیع الجمال نہیں بلکہ آپ کی منکوحہ تھی۔'' اس نے چڑچڑے پن سے تلخی بھرے لہجے میں کہا تب عیسٰی کا ہنس ہنس کر برا حال ہوگیا، وہ اتنی بے فکری سے ہنستا ہوا مالا کو بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ بڑی فدا ہونے والی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا عیسٰی یوں ہی بے فکری سے ہنستا رہے مگر بعض دعائیں اور بعض خواہشات کبھی پوری نہیں ہوتیں۔ اس کی یہ دعا بھی ادھوری رہ گئی۔

''ہیں...... میری منکوحہ؟'' وہ آنکھیں پھاڑے دیکھتا رہ گیا۔ مالا اس کی اداکاری پر چڑ گئی تھی۔

''وہ کہہ رہی تھی جب میرا نکاح آپ کے ساتھ ہوا تب آٹومیٹک وہ بھی آپ کے نکاح میں آگئی۔ قوم جن کی عورتوں کا شاید ایسے ہی نکاح ہوتا ہے۔'' وہ منہ پھلا کر بتانے لگی تب عیسٰی کی پھر سے ہنسی چھوٹ گئی۔

''یہ تو کمال ہوگیا، نکاح نہ ہوا آٹومیٹک لاک ہوگیا۔ ویسے میری نادیدہ بیگم ہیں کہاں؟ مجھے نظر کیوں نہیں آتی؟'' عیسٰی بے قرار سا ہوگیا تھا مالا بھنا اٹھی۔

''وہ مجھ سے ملاقات جو کرلیتی ہے۔ آپ سے شاید ڈرتی ہوگی۔'' وہ جیسے جتا کر کہہ رہی تھی۔ تب عیسٰی نے بے ساختہ نفی میں سر ہلایا۔

''مجھ سے کہاں، تمہی سے ڈرتی ہوگی۔ تم نے کلی پھینکی اور وہ ڈر ایسا بھاگی کہ دوبارہ پلٹی ہی نہیں۔'' عیسٰی دکھی سا ہوگیا تھا اور مالا اس کی مزید ایکٹنگ سنے بغیر اور نظر ڈالے بنا ہی باہر چلی گئی۔ جانتی تھی کہ اب عیسٰی اسے جان بوجھ کر تنگ کرتا رہے گا حالانکہ وہ بھی مالا کی طرح جان چکا تھا کہ پری وغیرہ کا قصہ جھوٹ ہے۔ وہ جو کوئی بھی تھی اس کی بیک پر کسی اور کا ہاتھ تھا اور عیسٰی نے اسی ہاتھ پر پنجہ گاڑنا تھا۔ اسے امید تھی وہ جلد اپنے اور مالا کے نادیدہ دشمن تک پہنچ جائے گا۔ اگرچہ پہنچ تو وہ چکا ہی تھا اب بس تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے تک کا انتظار تھا۔

محض تین چار گھنٹوں تک بہت کچھ کھل کے سامنے آنے والا تھا۔ تب وہ آفاق کا بھلا کیا حشر کرتا؟ وہ دوستوں کا دوست اور دشمنوں کا دشمن تھا۔ دوستی میں جان بھی وار دیتا اور دشمنی میں ہاتھ ڈال کر جان باہر نکال لیتا تھا۔ آفاق جانے کس بھول میں تھا کہ وہ عیسٰی کو چکما دے کر نکل بھاگے گا۔ اگر تو آفاق کے بارے میں مالا کی کہی باتیں درست نکلتیں تب وہ اسے جرمنی میں سے کتے کی موت دے کر باہر نکالتا۔ اسے آفاق پر بڑا مان تھا۔ اپنے باپ کی خواہش پر اس نے آفاق کا بڑا ساتھ دیا تھا۔ وہ ہر اجنبی پاکستانی کی مدد کرتا تھا۔ یہ اس کے باپ کی خواہش ہی نہیں حکم بھی تھا۔ اس نے آفاق پر کوئی الگ سے احسان نہیں کیے تھے۔ وہ پہلے بھی بہت سے لوگوں کو جرمنی میں سیٹل کرچکا تھا۔ ان کی مدد کرتا، پیپرز بنواتا، مکان خرید دیتا۔ پاپا کے نزدیک یہ چھوٹی موٹی نیکیاں تھیں جو اس کا نامہ اعمال سنوار سکتی تھیں۔ پاپا کے لیے تو وہ کچھ بھی کرسکتا تھا۔ اس کے باپ نے بھی بہت سے لوگوں پر احسان کیے تھے انہی میں ایک پروفیسر بشر بھی تھا مگر وہ بھی ایک خبیث اور خودغرض انسان نکلا تھا جیسا کہ آفاق ثابت ہورہا تھا۔

سوزن کے ساتھ مل کر اس کی زندگی میں تلخیاں گھول رہا تھا۔ سوزن نے اسے کون سا لالچ دیا ہوگا؟ شادی کا نہیں پیسے کا لالچ یا پھر ویزا بڑھانے کا لالچ کچھ تو سبز باغ آفاق کو بھی دکھائے گئے تھے تبھی اس نے دوست کے سینے میں خنجر گھونپ ڈالا تھا۔ اب عیسٰی کو کچھ گھنٹوں کے بعد آفاق سے ملاقات کا انتظار تھا۔ اس نے کہا تھا، نکاح کے بعد وہ عیسٰی کو کچھ دکھانے والا ہے؟ وہ کیا دکھانے والا تھا، یہ تو عیسٰی نہیں جانتا تھا تاہم اس کی چھٹی حس کسی غلط اور انہونی کی طرف اشارہ کررہی تھی۔ اسے سوزن سے ایسی توقع نہیں تھی۔ وہ اس کی پچھلی باتیں بھلا کر دوبارہ تعلقات بحال کرچکا تھا مگر سوزن نے کیا، کیا؟ اجنبی ناموں سے مالا کے لیے تحائف بھیجتی رہی۔ اسے ذہنی طور پر شکستہ کرتی رہی، خوف زدہ کرتی رہی۔ مینٹلی ٹارچر کرنا اسی کو کہتے تھے۔ وہ نفسیاتی حربوں سے مالا سے اس کو بدگمان کرنا چاہتی تھی مگر عیسٰی بھلا مالا سے بدگمان ہوسکتا تھا؟ سوزن کی اصلیت کھل چکی تھی اور اب آفاق کے چہرے سے نقاب ہٹنے والا تھا۔ اگر تو آفاق اس منصوبے میں سوزن کے ساتھ برابر کا شریک ہوا تب اس کی زندگی کا یہ آخری دن ہوسکتا تھا۔ اپنی شادی والی شام مرنے والا وہ جرمن میں پہلا دولہا ہوگا۔ دھوکے باز، منافق، احسان فراموش لوگوں کا انجام یہی ہونا چاہیے تھا۔

علی عیسٰی سلک کے پردے کو ہٹا کر اس کے دوسرے حصے یعنی سفید نائیلون کے جالی دار پردے پر ہاتھ پھیرتا گہری سوچ میں گم تھا۔ وہ شاید اگلا لائحہ عمل تیار کررہا تھا۔ آفاق سے ملاقات کے بعد اگر کوئی ثبوت اس کے ہاتھ آگیا تو اسے کیا کرنا ہوگا؟ اب وہ مڑ کر اپنے لائسنس شدہ ریوالور میں گولیاں بھر رہا تھا۔ ریوالور لوڈ ہو کر ذرا بھاری ہوگیا تھا۔ اس نے ریوالور کو احتیاط سے شرٹ کے پیچھے سے پینٹ میں اڑس لیا۔ اب وہ آفاق کے میسج پر سامنے والے گھر کی طرف جارہا تھا۔ اسے آفاق کے نکاح میں شرکت بھی تو کرنا تھی۔

☆☆☆

وقت کی تھیلی میں کس کے لیے کیا رکھا تھا؟ یہ تو کوئی نہیں جانتا تھا بظاہر سب کچھ ٹھیک تھا مگر حقیقت میں کچھ بھی ٹھیک نہیں تھا۔ کیا ہونے والا تھا؟ دل میں وسوسے تھے، کسی پل قرار نہیں تھا۔ عجیب بے چینی تھی جو بڑھتی جارہی تھی۔

اس کے دل کو پتنگے لگے تھے، وہ بے چین سی گھر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک چکر کاٹ رہی تھی۔ عیسٰی ابھی تک نہیں لوٹا تھا اور یہ انتظار بڑا اذیت ناک تھا اسے ایک کہاوت یاد آرہی تھی۔ چلتے چلتے اس کے پیر تھکنے لگے تھے۔ سانس پھول رہی تھی۔

time is too slow for those who wait

(انتظار کرنے والوں کے لیے وقت بہت سست رفتار ہوتا ہے)

اس نے گھڑی کو دیکھا، وقت بہت سست روی سے گزر رہا تھا پھر جیسے باہر کھٹکے کی آواز آئی تھی۔ مالا کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ ایک دم گھبراہٹ طاری ہونے لگی تھی۔ ہتھیلیوں میں نمی اتر آئی۔

too swift for those who fear

(جو ڈرتے ہیں ان کے لیے بہت تیز رفتار)

وہ ڈرنے لگی تو سوئیاں بھی بھاگنے لگی۔ بیس، پچیس،

تیس منٹ جیسے پھسل، پھسل گئے، وقت بھاگنے لگا تھا۔

too long for those who grieve

(جو غمزدہ ہوتے ہیں، ان کے لیے بہت طویل)

ہاں، اس کے اندر غم تھا عیسیٰ سے بچھڑ جانے کا خوف تھا، جدائی کا وسوسہ تھا۔ یہ لاشعوری غم تھے مالا نہ بھی سوچتی تب بھی یہ خوف ذہن میں پنجہ جمانے لگتے۔

too short for those who rejoice

(جو خوشی مناتے ہیں، ان کے لیے مختصر)

اس نے زمانے بھر کی خوشیاں علی عیسیٰ کی ہمراہی میں پالی تھیں۔ وقت اسی لیے مختصر ہو رہا تھا۔ مالا یہ تنگ پڑ رہا تھا۔ کاش کہ وہ وقت بدلنے کی طاقت رکھتی مگر یہ ممکن ہی کہاں تھا۔

but for those who love time is eternity.

(لیکن جو محبت کرتے ہیں ان کے لیے وقت ابد تک پھیل جاتا ہے)

اور وقت مالا علی عیسیٰ کے لیے ابد تک پھیلنے والا تھا۔ اس نے محبت کی تھی، اسے محبت ہوئی تھی۔ بالکل ایسی ہی محبت جو سیف الملوک نے بدیع الجمال سے کی تھی اور تاریخ نے اس محبت کو سنہری حرفوں کے ساتھ کتابوں میں محفوظ کر دیا تھا۔ ہمیشہ کے لیے یادگار بنا دیا تھا۔ یہ محبت جسموں سے نہیں روح کے تعلق سے ہوئی تھی۔ وہاں روحوں کا ملاپ ہوا تھا۔ یہ روح کی روح سے محبت تھی جو آج تک میاں محمود صاحب کی تصنیف میں زندہ تھی۔

راہِ عشق پل صراط سے کم نہیں جس طرح پل صراط پر چلنا محال ہے اسی طرح عشق کی منزل تک پہنچنا بھی آسان نہیں جس طرح بہشت کی آس، امید کو زندہ رکھتی ہے۔ اسی طرح وچھوڑے اور جدائی میں بھی ملن کی آس زندگی کو آگے گھسیٹنے میں مدد کرتی ہے۔

وہ چلتے چلتے علی عیسیٰ کی تصویر کے پاس آ کر رک گئی تھی۔ اس کا دل جیسے رک، رک کر چلنے لگا اور چل، چل کر تھمنے لگا۔ بن مانگے اللہ کیا، کیا عطا کرتا ہے۔ مالا کو آج پتا چلا تھا۔ اللہ نے اسے علی عیسیٰ کی صورت میں کون سا ہیرا دیا تھا اس کی دنیا مکمل کر دی۔

مالا کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے تھے، شکر گزاری کے آنسو... اسے اتنا نیک، ایمان دار اور باکردار شریک حیات ملا تھا۔ یہ اس کی کوئی نیکی کا بدل تھا یا اس کے پرکھوں کی کسی نیکی اور احسان کے بدلے اس پر نعمت پوری کی گئی تھی۔ مالا نہیں جانتی تھی وہ تو صرف اللہ کا شکر ادا کرنا جانتی تھی اور ہر گھڑی، ہر ساعت بس شکر ادا کرتی تھی۔

کتنی ساعتیں چپکے سے پھسل گئیں معا فون کی گھنٹی نے طلسم توڑ ڈالا تھا۔ وہ پیر گھسیٹتی چونک کر فون تک آئی۔ نمبر انجانا تھا اس نے کارڈلیس اٹھا کر کان سے لگایا۔ اس کے کچھ بھی کہے یا بولے بغیر ایک تکبر بھری آواز سماعتوں میں سیسہ اتارنے لگی تھی۔

”بہت جلد واپس پلٹنے والی ہو، کبھی سوچنا تو سہی جہاں سے چلی تھیں وہیں رکو گی۔ اپنے پچھلوں کو جا کر میرا ایک پیغام دینا۔ مون حسیب انتقام اور بدلہ پورا کرنے میں کمال کی مہارت رکھتی ہے۔ جو نفرت کرے، اس سے نفرت کرو۔ جو محبت کرے، اس سے محبت کرو۔ جو دھوکا دے، اسے دھوکا دو۔ جو آگ لگائے، اسے آگ لگا دو۔ جو دل کو ڈھائے، اس کے وجود کی پوری عمارت کو ڈھا دو۔ اپنا تو عمر بھر کے لیے ایک ہی اصول اور ایک ہی قانون رہا ہے۔ جس میں ترمیم تو ہو سکتی ہے اسے بدلا نہیں جا سکتا۔“ پھنکارتی ہوئی آواز آنا بند ہو گئی تھی۔ اس نے محض مالا کو اتنا ہی سمجھانا تھا۔ آگے وہ خود سمجھ دار ہوتی تو سمجھ جاتی مگر وہ سمجھدار ہی تو نہیں تھی۔

”بھلا مون نے پچھلوں کی بات کیوں کی تھی؟ کون سے پچھلے؟ آخر مون کا میرے پچھلوں کے ساتھ تعلق ہی کیا تھا؟ اور وہ کہہ رہی تھی جو آپ کو دھتکارے اسے دھتکار کر سزا دو۔“ وہ مالا کو کیا جتا رہی تھی۔ اس کی باتوں کا مفہوم کیا تھا وہ محض اسے خوف زدہ کر رہی تھی یا اس کی آگ برساتی باتوں اور لفظوں میں کوئی معنی بھی چھپے تھے۔

مالا علی عیسیٰ کارڈلیس تھامے بالکل ڈھے گئی۔ اس کا پورا وجود پسینے سے شرابور تھا۔ آخر مون حسیب اسے کس مقام پر روکنا چاہتی تھی جہاں مالا کے قدم اکھڑ جاتے یا جم جاتے وہ اسے کس کشمکش میں مبتلا کر چکی تھی؟ وہ اسے کس عذاب کے حوالے کر چکی تھی۔

مالا نے سوچا وہ اٹھ کر چاچو کے کمرے کا دروازہ بجائے اور انہیں ان کی بیٹی کے ایک، ایک کارنامے اور منصوبے کا بتائے۔ چاہے وہ یقین کریں یا نہ کریں۔ مالا نے سر کے پیچھے غیر ارادی طور پر ہاتھ مارا۔ فش کی شیپ کا ریکارڈر ساتھ نہیں تھا جانے وہ اسے کہاں رکھ آئی تھی۔ نہانے سے پہلے ڈریسنگ پر یا پھر تکیے کے نیچے۔

وہ تذبذب کے عالم میں سر جھٹکتی چاچو کے کمرے کو دیکھنے لگی۔ اسے تذبذب کی حقیقت کا ادراک بھی آج ہوا تھا۔ تذبذب کیا تھا؟ اس کی تعریف کیا تھی؟ اس کی وضاحت یا تشریح کیا تھی؟ تذبذب ایسے مقام کو کہتے ہیں جہاں آگے جانے کی ہمت نہ ہو اور واپس جانا ممکن نہ ہو......تو مالا علی عیسیٰ اسی تذبذب کا شکار تھی۔ بے دم اور ساکت تھی نہ آگے بڑھ پا رہی تھی اور نہ پیچھے ہٹنے کا حوصلہ تھا۔ وہ آج مون کے اندر کا زہر اور غلاظت بھی کھولنے کا مستحکم عہد باندھنے والی تھی مگر اس کے لیے تھوڑی ہمت بھی درکار تھی۔

اس نے کارڈلیس رکھ کر چھوٹا سا سرخ ہندسوں والا کلینڈر اٹھا لیا تھا۔ چودہ فروری کے ہندسے پر انگلی پھیر کر اس نے گردن موڑ کر باہر کی طرف دیکھا۔ انی کا گھر نظر نہیں آ رہا تھا۔ آج انی کا نکاح تھا، انی بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ آج ویلنٹائن ڈے تھا، فلمی سے ایکٹر نما آفاق نے شادی کے لیے فلمی سا رومانوی دن منتخب کیا تھا۔ اب وہ اپنی نئی زندگی میں اداکاری کر کے کتنا کامیاب ہو سکتا تھا یہ صرف وقت بتانے والا تھا۔

کلینڈر کے نیچے سفید موٹے حروف میں کچھ اور بھی لکھا تھا۔ جانے کیا؟ مالا سے پڑھا نہیں گیا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔ ویلز میں لکڑی کے ”محبتی“ چھچے تیار کر کے چودہ فروری کے روز تحفے کے طور پر دیے جاتے تھے۔ ان چھچوں کو عموماً دلوں، چابیوں اور چابی کے سوراخوں سے سجایا جاتا تھا جن کا مجموعی مطلب یہ لیا جاتا تھا کہ تم نے میرے دل کا تالا کھول دیا جبکہ آج چودہ فروری کی شام مالا نے اپنے دل کے تالے کو مضبوطی سے بند کر لیا تھا۔ یہاں اب کسی سوزن، انی، مون، آفاق یا کسی اور منافق کی گنجائش نہیں نکل سکتی تھی۔ اس نے عمر بھر کے لیے ان لوگوں سے تعلق توڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ سب مالا کو علی عیسیٰ کی زندگی سے نکالنا چاہتے تھے۔ یہ سب لوگ کتنے سفاک، بے رحم، کٹھور اور سنگ دل تھے۔ زندگی کو زندگی سے دور کرنا چاہتے تھے۔

پھر جانے کتنا وقت بیت گیا باہر شور کی آواز سنائی دی تھی۔ انی کا نکاح ہو گیا، مہمان چلے گئے تھے پھر یہ شور کیسا تھا؟ مالا نے کان لگائے تو اسے یہ شور اپنے ہی گھر کے ڈرائنگ روم میں سنائی دیا تھا۔ وہ لمحے کے ہزارویں حصے میں گرتی پڑتی بھاگتی ڈرائنگ روم کے دروازے تک آئی۔ اندر کا منظر دیکھ کر اس کا کلیجا کانپ رہا تھا۔

”آستین کے سانپ، ذلیل، کتے، نمک حرام......تو میرے ہی سینے پر خنجر چلا رہا ہے۔ میرے ہی گھر میں بندھے کتے مجھی پر بھونکتا ہے۔“ وہ علی عیسیٰ تھا مگر مالا کو وہ عیسیٰ نہیں لگا۔ اس پر حیوانیت سوار تھی۔ وہ آفاق کو لاتوں، گھونسوں اور جوتوں سے مار رہا تھا۔ اس نے پل بھر میں آفاق کو لہولہان کر دیا تھا پھر مالا نے گردن گھما کر دیکھا وہاں قریب ہی چاچو کھڑے تھے اور مالا کو پہلی نظر میں یوں لگا جیسے ان کے جسم میں سے دھیرے، دھیرے جان نکل رہی ہے۔ وہ کسی پتھریلے بت کے مانند ساکت تھے۔ نہ وہ روک رہے تھے نہ وہ عیسیٰ کو منع کر رہے تھے، نہ وہ بول رہے تھے اور عیسیٰ کو خبر ہی نہیں تھی اس کے پاپا تو دھیرے، دھیرے مر رہے تھے۔

اِدھر آفاق چلا رہا تھا۔ آگ اگل رہا تھا، چیخ رہا

تھا۔ جانے آفاق نے عیسیٰ کو کیا دکھایا تھا جو عیسیٰ کے سر پر خون سوار ہو چکا تھا۔ وہاں آفاق کا لیدر بیگ بھی کھلا پڑا تھا اور اس بیگ میں کچھ چمک رہا تھا۔ جانے کیا؟ مالا سے دیکھا نہ گیا۔

''تو مالا کی آنکھ سے دیکھتا ہے، کبھی اپنی آنکھ سے دیکھ، تیرا مجرم تیری اپنی آستین میں ہے۔'' آفاق نے چلاتے ہوئے کہا تھا۔ اس کے سر سے خون کے فوارے ابل رہے تھے۔ وہ جرمنی کا پہلا پردیسی دولھا تھا جو اپنی شادی کی شام موت کے دہانے پر کھڑا تڑپ رہا تھا۔ شاید آفاق کا یہی انجام ہونا تھا۔ لالچی اور ذلیل لوگ دنیا میں اسی طرح خوار ہوتے ہیں۔ وہ بھی خوار ہو رہا تھا۔ اس کا انجام یہی تو ہونا تھا پھر مالا کیوں خوش نہیں تھی؟ اس کے دل میں تو بس خوف نے کنڈلی مار رکھی تھی اور یہی خوف اسے چیخنے پر مجبور کر رہا تھا۔

''بس کریں...... بس کریں...... یہ مر جائے گا۔''

مالا تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔ اس سے عیسیٰ کی درندگی دیکھی نہ گئی۔ وہ اتنا صابر، حلیم اور مہذب عیسیٰ بالکل وحشی درندہ لگ رہا تھا۔ اس کے سر پر خون سوار تھا۔ وہ مالا کے حواس معطل کر رہا تھا۔

''تو اس کی جا کر گردن دبوچ...... وہ ہی تو ہے تیری آستین میں......'' آفاق سے آگے بولا نہیں گیا تھا۔ عیسیٰ نے اسے بولنے ہی نہیں دیا۔ اس کا سر فرش پر دھڑ دھڑ ٹکراتا رہا پھر اس نے اپنی شرٹ کے پیچھے پینٹ میں اڑسا ریوالور نکال لیا۔

''پھر لیا تو نے اپنی گندی زبان سے اس کا نام...... اب تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' عیسیٰ نے کف اگلتے ریوالور کا ٹریگر دبا دیا اور ٹریگر دبانے سے پہلے اس نے ایک بھیانک آواز سنی۔ یہ آواز چاچو کے منہ سے نکلی تھی۔ وہ فرش پر گرے تڑپ رہے تھے پھر جب عیسیٰ پستول پھینک کر اپنے باپ کی طرف آیا تب تک مٹی کے بت سے روح بے سکوں کب کی پرواز کر گئی تھی۔

علی عیسیٰ کے پاپا مر گئے اور وہ جیسے دیوانہ ہو گیا۔ ان کے مرے ہوئے جسم کو اٹھا کر اسپتالوں میں بھاگتا رہا مگر کسی ڈاکٹر کے پاس اس کے پاپا کی جان واپس لانے کا اسم نہیں تھا۔ تھک ہار کر انہیں سپردِ خاک کر دیا یہ تو کرنا ہی تھا۔ وہ باپ کے قدموں میں سر رکھ کر بچوں کی طرح روتا علی عیسیٰ حواس چھوڑ رہا تھا۔ اس کا پہلا عشق اس سے بچھڑ گیا تھا۔ اس کا پسندیدہ کھلونا اس سے دور ہو گیا، چھن گیا تھا وہ راتوں کو اٹھ، اٹھ کر رونے لگتا۔ اس کے دل کا چین سکون کھو گیا تھا، علی عیسیٰ جیسے کھو گیا۔ وہ شاید سنبھل ہی جاتے۔ زندگی آہستہ، آہستہ ہی سہی اپنے معمول پر آجاتی مگر پھر وہ ہو گیا جس کا تصور بھی قیامت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ہاں، قیامت مالا اور علی عیسیٰ پر بیک وقت ٹوٹ پڑی تھی۔

مالا کی کشتی ایسی تند موجوں کے بھنور میں جا پھنسی تھی جس نے دھکیل کر اسے جرمنی کی سرزمین سے پاکستان لا پٹخا تھا مگر اس دوران ہوا کیا تھا چاچو کے مر جانے کے بعد وہ ایک رات جیسے مالا کی زندگی کا رس نچوڑ گئی تھی۔ وہ ہمیشہ کے لیے علی عیسیٰ کی زندگی سے نکل گئی مگر اس رات آخر ہوا کیا تھا؟

☆☆☆

زندگی میں کبھی کبھار بہت عجیب واقعات پیش آتے ہیں۔ اتنے عجیب کہ عقل ان کے جواز ڈھونڈنے کے دوران بالکل دنگ رہ جاتی ہے۔ کبھی کبھار بہت عجیب طرح سے انہونے واقعے، حادثے یا سانحے پیش آتے ہیں اور عقلِ انسانی کو حیران کر دینے والی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ذی شاہ کے ساتھ بھی کچھ یوں ہی ہوا تھا۔ وہ سوچتا تو حیران رہ جاتا آخر اس کے ذہن میں جرمنی جانے کا انہونا خیال کیسے آیا تھا؟ حالانکہ دیکھا جائے تو جرمنی ان کے لیے ہندوستان کا کالا پانی یا خطرناک جیل کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ جی ہاں، یہ وہی جرمنی تھا جس کی طرف کوئی ایک مرتبہ رخ کر لیتا تو یا پھر وہ کبھی نہ لوٹتا ان کے اکلوتے چچا کی طرح یا اگر لوٹ تو آتا مگر ذی شاہ کی بہن جیسے حالات سے گزر کر۔ اپنا دل، دماغ اور سوچیں تک پرائی کر کے اپنے حواس اور شعور تک کو لٹا

کر پھر اسے جرمنی جانے کا کیا فائدہ تھا؟ مگر ذی شاہ ہر قسم کے فائدے اور نقصان کو ایک طرف رکھ کے صرف اپنی بہن کے مجرم کو تلاش کرنے آیا تھا۔ جس نے اس کی معصوم بہن کو طلاق دے کر گھر سے بے گھر کر دیا تھا۔ وہ دھکے کھاتی اور جانے کہاں کہاں رُلتی واپس اپنے وطن لوٹ پائی تھی اور اس کے صدمات سے چور وجود کو دیکھ کر ذی شاہ کے ڈیڈی ہارٹ اٹیک سے جاں بحق ہو گئے تھے۔ اس کی بہن مالا نے قبل از وقت ذہنی جھٹکوں کی بدولت اپنا بچہ بھی کھو دیا تھا اور خود وہ جیتی جاگتی لاش ہی تو بن گئی تھی۔ تو کیا ذی شاہ کا فرض نہیں بنتا تھا وہ پلٹ کر اپنی بہن کے مجرموں اور قاتلوں سے حساب لیتا۔

اس کے دل میں جرمنی جانے کا پہلا خیال کب آیا تھا؟ یہ کوئی بہت پرانی بات نہیں تھی کچھ مہینے پہلے وہ معمول کے مطابق جاگنگ کے لیے گھر سے نکلا تھا، وہ قریبی پارک میں ورزش کے لیے ہر روز آیا کرتا تھا۔ آج بھی معمول کے مطابق جاگنگ ٹریک پر دوڑتا کبھی کبھار رک کر ایکسر سائز کرنے لگتا۔

تب دوڑتے اور ورزش کرتے اچانک اس کے دماغ میں کلک سے کچھ روشن ہوا۔ جیسے کوئی خیال آیا تھا۔ جیسے اس کے ذہن نے کوئی پیغام وصول کیا تھا۔ وہ سر جھٹک کر اپنے کام کو جاری رکھنا چاہتا تھا مگر یہ ممکن نہیں ہو سکا۔ اس کا ذہن ایک نکتے پر جم گیا۔ آگے بڑھ سکا نہ پیچھے ہٹ سکا۔ وہ ایک ہی پیغام کو بار بار وصول کر رہا تھا۔ انسانی ذہن جو ایک موڈیم کی طرح ہوتا ہے بنیادی طور پر ان پٹ آؤٹ پٹ ڈیوائس جیسا۔ جو فون لائن کو کمپیوٹر سے جوڑتا ہے۔ اس کے ذریعے ایک کمپیوٹر سے دوسرے کمپیوٹر تک ڈیٹا حاصل کرنے اور پہنچانے کا کام لیا جاتا ہے جیسے ایک ذہن کو دوسرے ذہن کے ساتھ جوڑ لیا جائے۔ انسانی ذہن بھی کمپیوٹر کے موڈیم کی طرح ہوتا جو برقی ڈاک (ای میل) پیغامات کو 180 میل فی گھنٹا کی رفتار سے لاکھوں میل کی دوری کے باوجود ایک ذہن سے دوسرے ذہن تک پہنچا دیتا ہے مگر سوچنے کی بات یہ تھی کہ کوئی دماغ اتنی افلاطونی طاقت کیسے رکھتا ہے؟ یقیناً کروڑوں انسانوں کی اس دنیا میں بلاشبہ بے شمار لوگ ایسے تھے جنہیں اللہ نے عقل کو دنگ کر دینے والی نعمتوں سے نوازا تھا۔ کسی کو اتنا علم دیا کہ اس نے جہاز بنا کر اڑا بھی لیا، کسی کو اتنا فہم دیا کہ اس نے اپنے جسم سے بجلی پیدا کر لی، کسی کو اتنی عقل دی کہ وہ سیاروں پر پہنچ گیا۔ کسی کو اتنی ہمت دی کہ اس نے کوہسار فتح کر لیے۔ کسی کے جسم میں ایسی طاقت بھر دی کہ وہ زہریلے اور زہریلے ترین سانپ کے کاٹنے اور سیکنڈوں میں موت کے گھاٹ اتار دینے والے سانپ کے زہر کا انجکشن لگا کر بھی زندہ رہا۔ کسی کو سائنس دان بنا دیا، کسی کو خلا باز بنا دیا، کسی کو زہریلے جانوروں کا شکار کرنا سکھا دیا، کسی کو حسن کی دولت سے مالا مال کر دیا اور کسی کو انتہائی طاقتور دماغ عنایت کر دیا۔ یہ سب کرشمہ سازی اسی اللہ کی تھی جو جہانوں کا رب ہے۔ جسے چاہتا ہے نواز دیتا ہے اور اس کا شکر ادا کرنے والے بندے بہت کم ہیں لیکن وہ پھر بھی نوازتا ہے۔ اب لینے والے پر منحصر ہے کہ وہ رب کی دی گئی نعمتوں کا مثبت استعمال کتنا کرتا ہے؟ انسانی دماغ سے کیسے کام لیتا ہے کس طرح اپنی بے بہا طاقت کا استعمال کرتا ہے۔

انسانی ذہن جو کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک یا موڈیم کے مانند ہے۔ برقی ڈاک کی طرح پیغامات کو لمحوں میں وصول کرتا ہے۔ کمپیوٹر سافٹ ویئر پروگرام جس کے ذریعے ایک کمپیوٹر سے دوسرے کمپیوٹر تک پیغام کو ارسال اور وصول کیا جائے۔ تکنیکی اور مروجہ طور پر ای میل کہلاتا ہے۔ ای میل کا تصور تو اب جا کر 1960ء کی دہائی میں منظرِ عام پر آیا تھا مگر انسانی دماغ اس سے بھی پہلے ای میل کی طرح لاکھوں میل کی دوری سے پیغام ارسال اور وصول کر لیتا تھا۔ بالکل اسی طرح ذی شاہ نے ورزش کرتے ایک پیغام وصول کیا جیسے اس کے ذہن میں ایک خیال ابھرا۔

''جرمنی مجھے بلا رہا ہے۔'' یہ اس کے ذہن میں

آنے والا پہلا خیال تھا۔ وہ اپنے سر کو جھٹک کر اس خیال سے پیچھا نہ چھڑا سکا۔ جرمنی اسے بلا رہا تھا؟ جرمنی اسے کیوں بلا رہا تھا؟ مگر واپس جاتے ہوئے اس کا ذہن اس سوال کا جواب تلاشتا رہا اور گھر آنے کے بعد فوارے کے قریب سر جھکائے بیٹھی اپنی چھوٹی بہن کو دیکھ کر جیسے اسے اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا۔

''تو جرمنی مجھے اسی لیے بلا رہا ہے تاکہ میں اپنی معصوم بہن کے مجرم کا گریبان پکڑ سکوں۔'' یہ آخری خیال تھا جو روزمرہ معمول، روٹین اور کاروباری میٹنگز سے ہٹ کر تھا۔ پھر وہ دفتر چلا گیا اور دفتر جانے کے کچھ دیر بعد پھر اس کے ذہن کا کنکشن مالا کی موجودہ.... رنگ ویران زندگی کی طرف جڑ گیا تھا۔ جیسے پھر سے اس کے ذہن نے کوئی پیغام وصول کیا۔

''جرمنی تمہیں بلا رہا ہے۔'' اس کا دل بے چین ہوگیا پھر اس کا کسی بھی میٹنگ میں دل نہیں لگا تھا۔ وہ فیصلے کی اکھاڑ پچھاڑ میں لگ گیا۔ بہت دن کی سوچ بچار کے بعد آخر فیصلہ ہوگیا۔ اس نے جرمنی جانے کا ارادہ کرلیا تھا۔ مالا کی بے رنگ زندگی، گھریلو... حالات کو دیکھتے ہوئے اسے یہی مناسب لگا تھا اگرچہ ذیشان ٹھیک کہتا تھا۔ مالا کے مجرم تک پہنچنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ مالا کو طلاق دے چکا تھا مگر ذی شاہ کا یہ حق بنتا تھا کہ وہ طلاق کی وجہ تو معلوم کرے۔ محض صبر شکر کرکے بیٹھ جانا بھی عقلمندی نہیں تھی مگر ذیشان نے ایسے ہی تو کیا تھا۔ وہ اپنے فرائض سے نظر چرا کر نئی نویلی بیوی کی ناز برداریوں میں لگ گیا تھا۔ نہ بہن کی اذیت اور صدمات کی اسے کوئی پروا تھی نہ بیوہ ماں کی خاموشی اسے نظر آتی تھی۔ اب جو بھی کرنا تھا ذی شاہ کو خود ہی کرنا تھا اور اس کے لیے سب سے پہلے جرمنی کا ویزا ضروری تھا۔ چچا کے علاوہ کوئی اور رشتے دار جرمنی میں نہیں تھا اور چاچو بے چارے وفات پاگئے تھے۔ اسے اسپانسر ویزا نہیں مل سکتا تھا۔ اگر اس کا اکلوتا پیارا دوست افراہیم کوشش بھی کرتا تب بھی یہ ممکن نہیں تھا۔ افراہیم کے وسائل اتنے نہیں تھے جو وہ اسپانسر ویزا کی شرائط پوری کرسکتا۔ جرمنی میں مقیم رشتے داروں یا دوستوں سے ملنے کے لیے جانے والے کو بہت سی چیزوں پر توجہ کرنا ہوتی تھی۔ ایک تو جرمنی میں مقیم اس کا میزبان قانونی حیثیت سے وہاں کاروبار یا ملازمت کررہا ہو اور وہ کسی بینک یا مالیاتی ادارے کا مقروض بھی نہ ہو۔ اس کی مالی حیثیت بھی بہتر ہوتی اگرچہ اپنے ذاتی اخراجات کے لیے وہ افراہیم کو کبھی نہ تنگ کرتا اور نہ اس پر بوجھ ڈالتا پھر بھی بہت ساری باتوں کو نظر میں رکھنا تھا۔

جرمنی کی کمپنی کے ساتھ کاروباری خط کتابت اور کاروباری سرگرمیوں کا ثبوت، ذاتی اخراجات کے لیے بیس ہزار امریکی ڈالرز نقدی کی صورت میں جب منظر عام پر آئے اور فضائی ٹکٹوں کی کنفرمیشن کا بڑے بھائی ذیشان کو پتا چلا تو اس نے ایک طوفانِ بدتمیزی اٹھا دیا۔

''تم اتنا خرچہ کرکے جرمنی جا رہے ہو، شیئرز کی رقم الگ ادا کروگے؟ تمہارا تو دماغ چل گیا ہے۔'' ذیشان کو جیسے آگ لگ چکی تھی۔ نہ اس نے ماں کا خیال کیا نہ بہنوں کا۔ ذی شاہ کے ساتھ منہ ماری کرتے ہوئے بس ہاتھا پائی کی کسر رہ گئی تھی۔ گھر کا ماحول بگڑ گیا۔ حالات خراب ہوگئے۔ ایک تو آنیہ سے رشتے پر انکار، دوسرے ذی شاہ نے مشترکہ اکاؤنٹ سے ذاتی اخراجات کے لیے بھاری رقم نکلوالی تھی۔ بھلا ذیشان کا پارہ کیوں نہ چڑھتا۔ اسے تو آگ لگنا ہی تھی کیونکہ شعلوں کو ہوا دینے کے لیے عینی جو موجود تھی۔ اس نے بانگِ دہل اعلان کردیا۔ وہ اوپر والے پورشن میں الگ ہوجائے گی۔ اپنا کچن بھی الگ کرلے گی۔ ایسی دھمکیاں ان کے لیے نئی نہیں تھیں مگر پھر بھی ممی.... بے چاری سہم گئی تھیں۔ یہ تینوں بھائی ان کی زندگی میں ہی الگ ہوجاتے یہ ممی کو گوارا نہیں تھا۔ وہ ذی شاہ کی ایک مرتبہ پھر منتیں کرنے لگی تھیں۔

''بیٹا تم ایک مرتبہ پھر سوچ لو۔'' انہوں نے رات کو ذی شاہ کے گھر آتے ہی بڑی لجاجت سے کہا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں معمولی باتوں پر لڑائی جھگڑا بڑھنے لگے۔ وہ ابھی ابھی جرمن ایمبیسی کے ایک قونصلیٹ اور ویزا افسر کے ساتھ فون پر سر کھپا کر آرہا تھا فی الحال کسی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا تھا مگر مقابل تو ماں تھی اسے جواب دینا ہی پڑا۔

''کیا سوچ لوں ممی، میں جرمنی جانے کا فیصلہ کرچکا ہوں۔'' اس نے نرم مگر مضبوط لہجے میں کہا تھا تب ممی کرسی سے اٹھ کر اس کے قریب آگئیں۔

''میں جرمنی جانے کی بات نہیں کررہی ہوں۔'' وہ سر جھکائے کچھ پل کے لیے خاموش ہوگئی تھیں جیسے اگلے الفاظ ترتیب دینا چاہتی تھیں۔

''تو پھر؟'' ذی شاہ سوالیہ نظروں سے ماں کو دیکھتا ٹھٹک گیا تھا۔ ''او...... اچھا۔'' وہ جیسے سمجھ کر لب بھینچ گیا تب ممی نے بہت بے قراری اور لجاجت سے کہا تھا۔

''اس میں حرج کیا ہے۔ گھر کی بات گھر میں رہ جائے گی۔'' وہ ایک ماں تھیں گھر میں پھوٹ پڑتی نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ وہ اپنے بیٹوں کو جوڑے رکھنا چاہتی تھیں اگر ذی شاہ مان جاتا تو سارے مسئلے ہی حل ہوجاتے۔

''پلیز ممی، میں نے کبھی آنیہ کے لیے ایسا ویسا کچھ نہیں سوچا۔'' ذی شاہ جھنجلا گیا تھا۔ اگر ماں کی طرف سے زیادہ دباؤ بڑھ جاتا تب اسے یقیناً ماننا پڑتا اور وہ اس سے پہلے کوئی بندھ باندھنا چاہتا تھا۔

''تو اب سوچ لو، وہ عینی سے مختلف ہے۔'' انہوں نے جیسے اسے بہلانا چاہا تھا۔ اس کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ ابھر آئی۔

''مما وہ عینی کی بہن ہے، اس سے مختلف ہرگز نہیں ہوگی۔'' ذی شاہ کا ایک ہی جواب تھا۔ ماں جیسے بے بس ہوگئی۔

''ذیشان کی خواہش ہے بیٹا ورنہ وہ الگ ہوجائے گا۔'' انہوں نے متفکر لہجے میں کہا۔ ذیشان کی دھمکی نے انہیں بہت اپ سیٹ کر رکھا تھا۔ ذی شاہ کو ذیشان پر بے طرح غصہ آگیا۔

''وہ اپنی شادی بھی اپنی مرضی سے کرتا ہے اور ہماری شادیاں بھی اپنی مرضی سے کرے گا؟ اسے یہ اختیار کس نے دیا؟ وہ ڈیڈی کی جگہ اگر بڑے بھائیوں والا کردار ادا کرتا تو شاید آج میں اسے کبھی انکار نہیں کرتا۔ خامی آنیہ میں نہیں، یہی سمجھیں میں اس کے قابل نہیں۔ میں کسی کو ریجکٹ نہیں کررہا بس اپنی بہنوں سے پہلے گھر بسانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں۔ آپ کی خاطر یہ زہر پیتے ہوئے کہہ رہا ہوں۔ اگر مالا اور بندیا کی شادی ہوجانے تک ماموں لوگ انتظار کرسکتے ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ میری طرف سے جواب ہے۔'' اس نے تحمل سے بات کرتے ہوئے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا ممی پھر سے بے بس ہوگئیں۔

''اتنا انتظار تو وہ نہیں کرسکتے۔'' ممی نے تفکر بھرے لہجے میں کہا۔

''تو نہ کریں۔'' وہ رکھائی سے بولا۔

''تم منگنی تو کرلو۔'' ممی جیسے کچھ سوچ کر بولیں۔

''شادی کے وقت منگنی بھی کرلوں گا۔'' اس کا جواب نہ ہی میں تھا۔

''اور شادی کب کروگے؟'' وہ جیسے پوروں پہ حساب کتاب کرنے لگی تھیں۔

''مالا اور بندیا کو بیاہ کر۔'' ذی شاہ نے سنجیدگی سے کہا۔ اس کا فیصلہ اٹل تھا، ارادہ پختہ تھا۔ اسے کوئی توڑ نہیں سکتا تھا۔ ممی جیسے تھم سی گئیں۔

''بندیا کی تو ٹھیک ہے پر مالا کی شادی؟'' انہوں نے جیسے کوئی انہونی بات سن لی تھی تبھی کچھ حیران رہ گئیں۔

''کیا مطلب...... مالا کی شادی نہیں ہوسکتی؟'' وہ بھویں اچکا کر پوچھ رہا تھا۔ اسے ماں سے ایسی حیرانی کی توقع نہیں تھی۔

''اس کی شادی تو ہوچکی ہے؟ پھر مطلقہ سے کون کرے گا؟'' وہ بھیگی آواز میں بول رہی تھیں۔ ان کے کرب کا کوئی شمار نہیں تھا۔ وہ تو بیٹے کے منہ سے مالا کا دوبارہ گھر بسنے کا کوئی پلان یا بات سن کر ہی متحیر رہ گئی تھیں۔ یہ تو ان کے دل کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ مالا کا دوبارہ گھر بس جاتا تو وہ بھی چین سے مرسکتیں۔

''کوئی تو کرلے گا، ہم نے کون سا اس کے متعلق کچھ سوچا ہے۔ اگر سوچ لیتے تو آج وہ ماضی کی یاد میں

حال سے اتنی غافل نہ ہوتی۔'' ذی شاہ کا لہجہ بلا کا تلخ تھا، ممی کی آنکھیں بہنے لگیں۔

''تمہارا باپ ہوتا تو آج تک بہت کچھ ہو چکا ہوتا۔ بڑا بیٹا نااہل ثابت ہوا تو تم چھوٹوں کو کیا کہوں؟'' انہوں نے آنکھیں پونچھتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''یہی تو آپ کی غلطی تھی۔ نہ آپ نے ذیشان کو احساس دلایا اور نہ مجھے کچھ بتایا۔ ممی کچھ ہم جیسے کم فہم بیٹے بھی ہوتے ہیں جو بہنوں کی خاموش آنکھوں میں مچلتے آنسوؤں کو خود سے نہیں دیکھ پاتے۔ ہم جیسوں کو احساس دلانا پڑتا ہے۔'' ذی شاہ کا لہجہ ٹوٹ سا گیا۔ مالا کا کرب آمیز چہرہ آنکھوں کی پتلیوں میں عکس بنانے لگا تھا۔ اس نے ضبط کی شدت سے ہونٹ کاٹ لیے تھے۔

''میرا بیٹا تو! اللہ تم کو اس نیکی کا اجر دے۔ تمہاری راہ کی ہر رکاوٹ دور کرے۔ تمہارے لیے آسانیاں ہوں۔'' ممی نے دل سے دعا دیتے ہوئے اس کی پیشانی کو چوم لیا۔ بس اس کی کامیابی کے لیے اس دعا جتنا زادِ راہ ہی کافی تھا۔ وہ جیسے ماں کے ٹھنڈے بوسے کو محسوس کرکے مطمئن ہو گیا تھا پھر اسے ذیشان کی طرف سے ہر دھمکی بھی امرت کے مانند لگی تھی حالانکہ اس نے بزنس بھی الگ کرنے کی بات کرکے اپنے گھٹیا پن پر مہر لگادی تھی وہ گھر بھی چھوڑنا چاہتا تھا۔ اپنے تئیں وہ ذی شاہ کو فنانشلی ڈاؤن کرنا چاہتا تھا۔

''میں گھر میں سے بھی حصہ لوں گا اور بزنس بھی الگ کروں گا۔ شامی تو ابھی پڑھ رہا ہے تم اپنے حصے کا کام کسی اور کے حوالے کر جاؤ۔ اپنا کوئی بھی نائب چھوڑ جاؤ میں ہرگز بھی تمہارے آفس کا انتظام نہیں سنبھالوں گا۔'' ذیشان آخری حربے کے طور پر یہی کہہ سکتا تھا جو کچھ وہ بول چکا تھا۔ اس کے علاوہ اب اس کے پاس کوئی اور دھمکی نہیں بچی تھی۔ تب ذی شاہ نے بڑے تحمل کے ساتھ اس کے تمام طبق روشن کر دیے تھے۔

''گھر میں تم ضرور حصہ لو مگر پانچ حصے نکال کر چھٹا حصہ تمہارا بنتا ہے۔ اس کے علاوہ کاروبار میں بھی ہم سب برابر کے حصے دار ہیں۔ بہنوں کے حصے اور ماں کا حق نکال کر ہم تینوں کا جو کچھ بنے گا اسے برابر تقسیم کرلینا مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ بس اتنا سوچ لینا ہماری فرم کی ساکھ تباہ ہو جائے گی۔'' ذی شاہ کا اطمینان قابلِ دید تھا۔ وہ اپنی بات دُہرایا نہیں کرتا تھا۔ سو آرام سے اٹھ کر چلا گیا پیچھے ذیشان اور عینی تلملاتے رہ گئے تھے۔ اس رات ذیشان نے ممی سے خاصی بدتمیزی کی تھی۔ انہیں بہت پریشان کیا تھا اور ساتھ ڈیڈی کے فیصلے کو غلط قرار دیا تھا۔

''ڈیڈی نے مالا کے لیے غلط انتخاب کیا تھا۔ انہیں کیا ضرورت تھی بیٹی کو پکڑ کر جرمنی لے جانے کی۔ پھر چاچو کے بیٹے سے نکاح کر دیا۔ مڑ کر خبر بھی نہ لے سکے۔ اس کی ایک بھی تصویر نہیں ہمارے پاس۔'' ذیشان بہت دفعہ پہلے کی دُہرائی جاتے والی باتوں کو دوبارہ جتا کر اپنی کھولن نکال رہا تھا۔ عینی برابر اس کا ساتھ دے رہی تھی۔

''تو اور کیا سو فیصد غلط فیصلہ، پکڑ کر لڑکی کو داغ لگا دیا۔ چچا خیر سے مر گئے اب بندہ کس کا گریبان پکڑے؟ نہ کوئی آگے نہ پیچھے خود محترم مفرور ہو گئے جانے خبیث آدمی زندہ بھی ہے یا مر گیا۔'' عینی کی زبان کو بھلا کون روک سکتا تھا۔ اس کے سفاک لفظوں کی شدت کو محسوس کرکے کونے میں بیٹھی مالا تڑپ اٹھی تھی۔

''اللہ نہ کرے۔'' اس نے دہل کر سینے پر ہاتھ رکھا تھا۔ بندیا نے اس کی حرکت ملاحظہ کرکے گھور کر دیکھا تھا۔ گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں تنبیہ کی تھی کہ مالا اس قسم کی دعاؤں کے حقوق کھو چکی ہے اور وہ اس بدبخت کے لیے اللہ سے رحم طلب نہ کرے۔

''ممی مجھے نہیں لگتا ذی شاہ رکے گا اور جانے یہ واپس کب آئے۔ مجھے تو اس کی بہت فکر ہے۔'' ذیشان نے ممی کو خاموش دیکھ کر پینترا بدل لیا تھا۔ شاید وہ سمجھ گیا تھا ہر بحث فضول اور لاحاصل ہے تاہم اس کے دل میں گرہ ضرور پڑ گئی تھی۔

''ذی شاہ کی نہیں، آنیہ کی فکر ہے۔'' بندیا بھی

کہاں چپ رہ سکتی تھی۔ اس کے الفاظ نے عینی کو آگ لگا دی تھی۔ وہ اتنی غضب ناک ہوئی کہ حد نہیں، گورے بے داغ گال خون چھلکانے لگے، تیکھی ناک سکڑ گئی، ماتھے پر بل پڑ گئے۔

''آنیہ کو رشتوں کی کوئی کمی نہیں۔ تم لوگ نہ جانے کس زعم میں مبتلا ہو۔'' وہ حلق پھاڑ کر چلائی تھی تب مالا اور ممی دونوں سہم گئی تھیں جبکہ بندیا دوبدو مقابلے کے لیے تیار ہو چکی تھی۔ اسے کون سا لحاظ تھا کسی کا۔ جب یہ لوگ ڈھیٹ اور بے شرم تھے تو وہ بھی ڈھیٹ اور نڈر ہو گئی تھی۔

''ہم لوگ کسی زعم میں نہیں، بس لوگ ہی میرے بھائیوں کے پیچھے پڑے ہیں۔ اللہ ہی انہیں لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے۔'' بندیا بھی منہ پھاڑ کر بولی تھی۔ اسے کون سا کسی کی پروا ہوتی تھی۔ اب محاذ دونوں طرف گرم ہو چکا تھا۔ ذیشان کو ہی سیز فائر کروانا پڑا۔ بیوی پر تو زور نہیں چلتا تھا بہن پر سارا نزلہ گرا ڈالا۔

اگلی صبح معمول کے مطابق دونوں بھائی آفس چلے گئے تھے پھر ایک ہفتہ پُرامن نکل گیا۔ عینی کی انا خاصی برہم تھی۔ ناک کٹ رہی تھی سو وہ اپنی بات سے ہٹنے والی نہیں تھی۔ اس نے گھر چھوڑنے پر بالآخر ذیشان کو راضی کر ہی لیا تھا حالانکہ کم از کم وہ گھر چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ عینی کو در پردہ سمجھاتا بھی رہا تھا مگر اس پر ایک ہی دُھن سوار تھی۔ اوپر والے پورشن کے بجائے الگ گھر کا مطالبہ کر رکھا تھا۔ بالآخر جیت عینی کی ہوئی۔ ذیشان کو ماننا ہی پڑا۔ اس کے بغیر اور کوئی راستہ جو نہیں تھا۔

☆☆☆

ذیشان کے گھر چھوڑنے نے ممی کو بیمار کر دیا تھا وہ اسپتال کیا گئیں مردہ ہوئی مالا کے اندر زندگی انگڑائی لے کر جاگ اٹھی۔ ممی کی بیماری نے اسے اتنا حساس کر دیا تھا کہ وہ دن رات ممی کی پٹی سے لگی رہتی تھی۔ اسے ڈیڈی کے بعد ممی کی جدائی کے دھڑکے نے متوحش کر دیا تھا۔ وہ دن رات ان کی خدمت کرتی، طویل تر سجدے، لمبی دعاؤں میں اپنی ممی کی صحت اور

تم میرے ہو

آج لکھوں کیا سارے لفظ ہیں خفا مجھ سے
دل پہ اک بوجھ اب بھی باقی ہے
نیند سے عاری آنکھیں
اک سپنے کی تلاش میں ہاری ہیں
اس کے ہونٹوں سے کچھ سننے کی حسرت
اب بھی دل میں باقی ہے
زندگی جینے کو اک بات ہی کافی ہے
وہ اک بار جو بس یہ کہہ دے ایشل
تم میرے ہو

شاعرہ: ایشل شادیان آرائیں، گولارچی

زندگی مانگتی۔ یہ بندیا اور مالا کی دعائیں ہی تھیں جو ممی اس جھٹکے سے سنبھل کر گھر آ گئیں۔ ذی شاہ اور شامی نے گویا سکھ کی سانس لی۔ پھر انہی دنوں ذی شاہ کا ویزا لگ گیا تھا۔ سیٹ بھی کنفرم ہو گئی تھی۔ روانگی سے کچھ دیر پہلے متذبذب سی مالا اس کے کمرے میں چلی آئی تھی۔ جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ ہی نہ سکی حالانکہ ذی شاہ نے بہت دفعہ اس سے علی عیسٰی کے گھر کا ایڈریس مانگا تھا مگر مالا کو ایڈریس کی کچھ سمجھ نہیں تھی۔ ٹوٹی پھوٹی سی لوکیشن اس نے سمجھا دی تھی۔ جو ذی شاہ کو اتنی سمجھ نہیں آئی تھی۔ وہ مالا کو ڈھیروں تسلیاں دینا چاہتا تھا مگر وہ بولا تو صرف اتنا۔

''میں تیری ساری کھوئی ہوئی خوشیاں واپس لاؤں گا مالا۔ یہ تیرے بھائی کا تجھ سے وعدہ ہے۔'' ذی شاہ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو وہ گھٹی، گھٹی آواز میں رونے لگی تھی جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی تھی کون سی خوشیاں، کیسی خوشیاں؟

''وہ خوشیاں جو تجھ سے چھن گئیں۔'' ذی شاہ

نے بھرّائی آواز میں کہا تو مالا کا جھکا سر نہ اٹھ سکا۔

"تیرے ایک، ایک دکھ کا حساب لوں گا۔" وہ گویا خود کو یقین دلا رہا تھا۔ خود سے عہد باندھ رہا تھا۔

☆☆☆

اور آج کی رات ذی شاہ کے دل پر بہت بھاری تھی۔ وہ علی عیسیٰ کے من ہائیم میں تھا۔ یہ علی عیسیٰ کا شہر تھا جس کی خوشبو میں محبت کی باس اب بھی رچی تھی۔ یہاں کی فضا میں مالا کے آنسوؤں کی مہک پھیلی تھی۔ یہاں سے اس کی بہن کو دھتکار کر نکال دیا گیا تھا۔ اس کے سارے زخم ہرے ہوگئے تھے۔ سارے ٹانکے ادھڑ گئے تھے۔ مالا کی بربادی اسے رُلا رہی تھی اور آج وہ اپنے سارے خاندان سے چھپ کر دوست کے گھر میں تنہا کمرے اور خاموش ماحول کو پا کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ یہ آنسو وہ آخری مرتبہ بہا رہا تھا۔ اب رونے کی باری علی عیسیٰ کی تھی۔ مالا تو بہت خوار ہوچکی۔ اب ذلیل ہونے کی باری علی عیسیٰ کی تھی۔

وہ اپنا اگلا لائحہ عمل تیار کر رہا تھا۔ عیسیٰ تک پہنچنے کا، اس کے گریبان کو پکڑنے کا اور سب سے بڑی بات اسے جو کچھ بھی کرنا تھا۔ افراہیم اور اس کی فیملی کو ملوث کیے بغیر کرنا تھا۔ وہ اپنی وجہ سے ان مخلص لوگوں کو کسی بھی مصیبت میں نہیں پھنسا دیکھ سکتا تھا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ افراہیم کو اپنے جرمنی آنے کا مقصد ہرگز نہ بتاتا۔ افراہیم کو صرف یہی پتا تھا کہ وہ جرمنی بزنس کی غرض سے آیا ہے وہ کسی علی عیسیٰ کو نہیں جانتا اور نہ کسی کی تلاش میں آیا تھا۔ یہ افراہیم کے تحفظ کا اہم جز اور بے حد ضروری تھا۔ بس انہی سوچوں میں گم وہ سفید بے داغ، بے سلوٹ بستر پر ایسا گرا کہ صبح کا اجالا پھیلنے پر ہی اس کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ اتنی بے خبری کی نیند تو کبھی نہیں سویا تھا بھی حیران سا آنکھیں مسلتا اٹھ گیا۔ معاً اس کی نگاہ داخلی دروازے تک گئی تھی۔ جہاں چپکنے سے کارڈ پر ابھی تک "ویلکم مین ان من ہائیم" لکھا تھا۔ ذی شاہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی آگئی تھی۔ تو گویا اسے من ہائیم میں خوش آمدید کیا گیا تھا۔ ویلکم کا یہ انداز اسے پسند آیا تھا۔

وہ کمرے کی آخری نکر میں موجود باد لے سیرتک گیا تھا۔ رات کو موتر نے (افراہیم کی ماں) نے غسل خانے کی نشاندہی کردی تھی۔ وہ اپنے صاف ستھرے کپڑے نکال کر نہانے کی غرض سے آیا تھا اور چمکتے دمکتے باتھ روم کو دیکھ کر لمحے بھر کے لیے متحیر رہ گیا۔ یہ غسل خانہ تھا اتنا شفاف، معطر اور چمکیلا جیسے کوئی شیشے کا ننھا سا محل ہو۔ اجلا چمکدار نہانے کا ٹب اور انیمل، شیشوں کی جگمگاہٹ کے ساتھ کانچ کا خوب صورت فرش آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا۔ اتنے اجلے، خوشبودار باتھ کو دیکھ کر ذی شاہ کو اپنا آپ اور بھی گندا سندا اور میلا، میلا سا لگ رہا تھا۔

وہ نہا کر باہر آیا تب تک افراہیم بھی کمرے میں آچکا تھا۔ اسے فریش، فریش اور تروتازہ دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔

"سلام صبح! تم اٹھ گئے، میں تیسری دفعہ دیکھنے آیا ہوں تمہیں۔ ممی نے بریڈ کروا رکھی ہے۔ رات کو ڈنر کیے بغیر جو سو گئے تھے۔" وہ ایک ہی سانس میں بولنے کا عادی تو نہیں تھا مگر فی الحال اس کی اسپیڈ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ اسے بال بنانے کی مہلت دے کر جلدی نیچے آنے کا کہتا خود باہر نکل گیا تھا تب ذی شاہ نے اپنے سیمسو نائٹ کیس سے پرفیوم کی بوتل نکال کر خوشبو میں خود کو بھگویا اور پھر سامان سمیٹ کر کمرے کی گلاس ونڈو میں آ کھڑا ہوا۔ دراصل وہ باہر کا موسم دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے نائیلون کی جالی والا مہین سا پردہ انگلیوں کی چٹکی میں پکڑ کر پیچھے ہٹایا اور دوسرے سلک کے پھولدار ریشمی پردے کو سمیٹ دیا۔ اب وہ سلائڈ ہٹا کر باہر جرمنی کے بکھرے تروتازہ حسن کو دیکھ رہا تھا ایک دم سحر زدہ اور دم بخود، اس نے دل میں عہد کر رکھا تھا وہ جرمنی کے سحر میں نہیں پھنسے گا مگر اس کا یہ عہد جرمنی کی اس اجلی، حسین، مخملی سویر میں بھربھری ریت کی دیوار ثابت ہوگیا۔ وہ جرمن کے سحر میں گرفتار ہوگیا تھا۔

وہ یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ دی ویدراز گڈ وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکا تھا۔ اس کے ہونٹ منجمد تھے اور نگاہیں ساکت۔ دور ہوتے کوہستان آلپس، آسمان میں تیرتی مرغابیاں

رقص کرتی سنہری پریاں، ڈار سے بچھڑی اس کونج کے آس پاس محو رقصاں تھیں۔ ہاں سارے جرمنی کا حسن سمٹ کر ایک نکتے کی شکل میں دائرہ بنا گیا تھا۔

اسے یقین آگیا تھا پورے جرمنی میں ایسا خبطی آئٹم اسے ڈھونڈنے سے بھی دکھائی نہ دیتا۔ تلاش کرنے سے بھی نہ ملتا۔

وہ ایک سفید راج ہنس کو گود میں لیے بیٹھی تھی۔ پھولوں سے لدی ٹوکری آج بھی اس کے قریب رکھی تھی۔ ذی شاہ کو اس کے ہونٹ ہلتے نظر آرہے تھے۔ وہ راج ہنس جیسی سفید لڑکی راج ہنس کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ یقیناً وہ راج ہنس سے ہی ہم کلام تھی مگر اس کے بہتے رواں آنسو جیسے کسی ٹونٹی کا ہینڈل لوز ہونے کی وجہ سے مسلسل پانی ٹپک رہا ہو۔ وہ آنکھیں تھیں یا کوئی چھوٹی سی ندی، گہرا سا سمندر یا پہاڑ سے پھوٹنے والا چشمہ؟ جو خشک ہونا تو جانتا ہی نہیں تھا۔

ذی شاہ نے بس اپنی بہن مالا کو روتے ہوئے دیکھا تھا مگر اس انداز میں مالا بھی کبھی نہیں روئی تھی عموماً جب وہ روتی تھی تب کوئی نہ کوئی اسے فوراً چپ کروا دیتا۔ شروع، شروع میں اسے دورے پڑتے تھے تب وہ چیختی چلاتی تھی مگر اس انداز میں مالا کے آنسو بہتے اس نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔

ذی شاہ کو کچھ الجھن کے ساتھ عجیب سی بے چینی ہونے لگی تھی تو گویا یہ طے تھا کہ کسی بھی عورت کے آنسو اس سے دیکھے نہیں جاتے تھے۔ وہ ماں کے آنسو ہوتے یا بہن کے یا پھر کسی اجنبی خبطی آئٹم کے۔ وہ ہرگز بھی عورت کی برستی آنکھیں دیکھنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ وہ مالا کے آنسو تھے جو اسے کھینچ کر جرمنی لے آئے تھے ورنہ اس کے تو خواب و خیال میں بھی جرمنی آنے کا کوئی پلان نہیں تھا اور اب راج ہنس سے باتیں کرتی اس اجنبی لڑکی کے آنسو اسے بے قرار کر رہے تھے اور اس کا بس نہیں چل رہا تھا وہ دوسری منزل سے نیچے چھلانگ لگا دیتا اور وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ بھی ضرور پہنا دیتا اگر وہ لڑکی راج ہنس کو بازوؤں میں دبوچے اٹھ کر اندر کہیں گم نہ ہوجاتی۔

پل بھر کے لیے ذی شاہ بھونچکا رہ گیا تھا۔ اسے جیسے امید ہی نہیں تھی وہ خبطی آئٹم اس کی نگاہ سے اوجھل ہوجائے گی۔ اس کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی تھی۔ دل کیوں ایک دم بجھ گیا تھا اور من ہائیم کا حسن جیسے ماند پڑ گیا تھا۔ اب نہ کوہستانِ آلپس کی حسین چوٹیاں نگاہ کھینچ رہی تھیں نہ بادلوں سے ڈھکے آسمان پر تیرتی کونجیں متوجہ کر رہی تھیں۔ وہ دل کھینچ لینے والی ڈار سے بچھڑی کونج جو کہیں نہیں تھی ذی شاہ کو لگا وہ سارے آس پاس کے منظر کا حسن سمیٹ سمٹ کر اندر گھس گئی تھی۔ اب باہر نہ تو پھولوں کے تختے اسے اپنی طرف بلا رہے تھے نہ دور جاگنگ ٹریک کے آس پاس بکھری ہریالی اسے پکار رہی تھی۔ ہر منظر اپنا سحر کھو چکا تھا، ہر خوب صورتی اپنی ترنگ بھول گئی تھی۔ کہیں بھی کچھ نہیں تھا حالانکہ سب کچھ وہیں تھا۔ یہ تو ذی شاہ کے اپنے احساسات تھے جو سارے عہد بھلائے اسے چاروں شانے چت کر رہے تھے گویا اسے جتا رہے تھے تم تو پہلی نگاہ میں ہی دل پرایا کر گئے۔ ادھر ذی شاہ ونڈو کی سلائڈ کھینچ کر سر جھٹک رہا تھا جیسے خود کو کسی ان دیکھے سحر سے آزاد کر رہا تھا مگر یہ ممکن تھا؟ کیا یہ ممکن تھا؟

یہ دل اور نظر کے سلسلے تھے۔ ذات پات، رنگ، نسل، قومیت سے بے نیاز تو پھر ذی شاہ خود کو کیسے جھوٹے بہلاوے دے پاتا؟ وہ خود کو کیسے بے نیاز کر لیتا؟ وہ خود کو کیسے جھٹلا پاتا۔ دل تو اسی ڈار سے بچھڑی کونج کی طرف کھنچ رہا تھا۔ کھنچا جا رہا تھا۔ یہیں کہیں دل میں میٹھا میٹھا درد جگاتی اک ننھی سی خواہش انگڑائیاں لے کر جاگ رہی تھی۔

"کاش کے وہ ایک مرتبہ پھر نظر آجائے۔"

وہ اندازے سے چلتا ہوا بالکل ٹھیک جگہ یعنی طعام کے کمرے میں بغیر اس گھر کی غلام گردشوں میں کھوئے پہنچ چکا تھا۔ بلیک سوٹ میں انتہائی تروتازہ، صاف ستھرا اور بلا کا فریش...... موتر کی آنکھوں میں اسے دیکھ کر ستائش اتر آئی تھی جبکہ افراہیم کی نٹ کھٹ سی چھوٹی بہن نے گلا کھنکھار کر جانے ڈوچ میں کیا کہا تھا۔ اسے تو بس "فریوح لینگ" کی آواز آئی تھی۔ اب اس کا مطلب کیا تھا؟ یہ ذی شاہ ہرگز نہیں سمجھ پایا تھا۔ اگرچہ ڈوچ کی اسے شدھ بدھ

تو تھی ہی بہرحال اسے یہ جرمن زبان خاصی مشکل لگا کرتی تھی۔ اس سے بہتر تو ذی شاہ کی پنجابی تھی جس میں اپنائیت اور مٹھاس محسوس کی جاسکتی تھی جبکہ ڈوچ تو زبان کو تھکا ڈالنے والی نہایت روکھی اور اکھڑ قسم کی بولی تھی۔ سو 'ڈوچ بول چال کے کتابچوں کو اس نے بنا پڑھے ہی سپرد ہوا کر دیا تھا کیونکہ وہ ڈوچ نہیں بول سکتا تھا۔

''فریوح لینگ۔'' وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھا تو افراہیم کی بہن ایمل اس کے کان میں جیسے گھس گئی تھی۔ وہ تیرہ سالہ انتہائی خوب صورت بچی تھی اور بڑی پُرشوق نظروں سے ذی شاہ کو دیکھ رہی تھی۔ ذی شاہ اس کی بات پھر بھی سمجھ نہیں سکا تھا تب اس نے اشارے سے ایک سینری کا بتایا۔ ذی شاہ کو گردن گھمانا پڑی تھی پھر وہ سینری کو دیکھنے لگا تھا۔ یہ پھولوں سے لدی کوئی راہ گزر تھی جس کے آس پاس اونچے پھولوں کے درخت تھے جو ہر طرح کے رنگ برنگے پھولوں سے لدے تھے۔ آغازِ بہار کا تاثر دیتی یہ پینٹنگ بہت خوب صورت تھی پھر ایمل کے اشارے نے اسے کچھ کچھ سمجھا دیا تھا۔ وہ اسے شاید بتا رہی تھی کہ تم بہار کی طرح تر و تازہ ہو۔ دوسرے معنوں میں ایمل نے اس کی تعریف کی تھی وہ اپنی تعریف پر کچھ جھینپ سا گیا۔ کچھ دیر بعد ماں سے نظر بچا کر ایمل پھر اس کے کان میں گھس گئی تھی۔

''رائسنٹ۔'' اس نے مسکرا کر ایک گلدان کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے ایک حرفی معنی خیز لفظ ذی شاہ کے سر کے اوپر سے گزر رہے تھے۔ وہ ایک مرتبہ پھر ہونق ہو گیا تھا پھر اس نے گلدان پر غور کیا۔ سجا سنورا گلدان توجہ کے قابل تھا خصوصاً اس میں کھِلتے سفید تازہ گلاب اس نے نگاہ موڑ کر ایمل کو دیکھا۔ وہ اپنی ٹوٹی انگریزی میں اسے بتا رہی تھی ''تم بلا کے اٹریکٹو ہو۔'' ایمل کے تعریفی کلمات نے ذی شاہ کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔ رائسنٹ یعنی پُرکشش یعنی کہ اٹریکٹیو۔ وہ بے ساختہ ہنستا چلا گیا۔ اسے ایمل بہت دلچسپ لگی تھی۔ اس کی یک لفظی باتیں بھی بہت دلچسپ تھیں۔ اب وہ جھک کر رازداری سے کچھ اور پوچھنا چاہتی مگر اس سے پہلے اس نے موتر کے کچن میں چلے جانے کی تسلی کر لی تھی۔

''یونگے سلے؟'' وہ بہت بے چینی، تجسس اور عجلت میں پوچھ رہی تھی۔ اسے خوف تھا کہ ممی ناشتے کی ٹرے اٹھا کر واپس نہ آجائیں حالانکہ ابھی ان کا کچن سے نکلنا ممکن نہیں تھا۔ وہ افراہیم کے دوست کی مدارت کے لیے چیز کیک بنا رہی تھیں اور کیک بیک ہونے میں ابھی کچھ ٹائم باقی تھا۔

''یونگے سلے؟'' ایمل نے اسے چپ دیکھ کر بے چینی کے عالم میں بازو ہلایا تھا پھر جیسے اپنی پیشانی پر ہاتھ مار کر انگریزی اور ڈوچ کے مکسچر کے ساتھ بولی۔

''آر یو یونگے سلے؟'' ایمل نے انگریزی اور اطالوی کا مکسچر جو بنایا تھا وہ ذی شاہ کے پلے پھر بھی نہیں پڑا تھا۔ اس نے لفظوں پر غور کیا تو اندازہ ہوا محترمہ کوئی سوال پوچھ رہی تھیں۔ اب یونگے سلے کا مطلب کیا تھا؟ ذی شاہ کے فرشتے بھی نہیں جانتے تھے۔ سو وہ بے بس سا ہو گیا تھا تب ایمل بھاگ کر کارنس پر سجی ایک گڑیا کو اٹھا لائی۔ وہ صرف ایک گڑیا نہیں تھی اس کا دولہا دوست (کچھ بھی کہا جاسکتا ہے) ساتھ تھا۔ ایمل اب دوبارہ اپنا سوال دُہرا رہی تھی۔ ذی شاہ نے پھر سے لفظوں پر غور کیا۔

''آر یو یونگے سلے؟'' اس کا کیا مطلب ہوسکتا تھا۔ کیا تم میڈ ہو یا گونگے ہو یا جرمن سے واقف ہو؟ یونگے سلے کا مفہوم کیا ہوسکتا تھا؟ شاید ان میں سے کوئی بھی نہیں وہ گڑیا اور گڈے کی طرف اشارہ کر رہی تھی پھر اس نے گڑیا کے ہاتھ کو پکڑ کر سامنے کیا تھا۔ باربی کی انگلی میں انگوٹھی تھی۔ اس نے کرسچن برائیڈل ڈریس پہن رکھا تھا۔ سفید لباس میں وہ اپنے دولہا کے ساتھ کھڑی تھی۔ تو کیا ایمل اس سے یہ تو نہیں پوچھ رہی تھی۔

''آر یو یونگے سلے؟'' (کیا تم شادی شدہ ہو؟ یا پھر کیا تم کنوارے ہو؟) ذی شاہ کے ذہن میں کلک سے کچھ روشن ہوا۔ ابھی وہ اپنے اندازے کی درستگی پر ٹھیک سے سنبھل بھی نہیں پایا تھا جب ایمل نے سوچ سوچ کر اپنے ذہن کے کسی کونے سے یونگے سلے کا انگریزی ترجمہ ''آر یو بیچلر؟'' کے طور پر بالآخر نکال ہی لیا تھا۔

''آں...... ہاں...... نہ...... نہ......'' ذی شاہ کا منہ

حیرت سے کھل گیا۔ وہ اس کے نہ نہ کہنے پر بے ساختہ خوش ہو گئی تھی تو گویا وہ اردو سمجھ لیتی تھی مگر بول نہیں سکتی تھی اور اب بڑے جوش کے عالم میں کہہ رہی تھی۔

''ریخ تیگ (ٹھیک، ٹھیک)'' اس کی خوشی کا کوئی شمار نہ تھا۔ اگلے پندرہ منٹ میں ذی شاہ کو ایمل کے خوش ہونے کی اصل وجہ سمجھ آگئی تھی۔ ایمل کو میرڈ لوگ پسند نہیں تھے۔ بیچلر پسند تھے۔ اس کی بہن شادی شدہ ہو کر اسے چھوڑ چکی تھی۔ اب اپنے شوہر کے ساتھ رہتی تھی سو ایمل کو بہن کی جدائی کا بہت دکھ تھا۔ اسے شادی بہت بری لگتی، جو بہنوں کو پرایا کر دیتی تھی اور بھائیوں کی مصروفیت بڑھا دیتی۔ بھائی بیویوں کے ہو جاتے اور بہنیں شوہر کی بھلا سب سے چھوٹے بہن بھائی کے حصے میں کیا آتا ہے۔ ڈانٹ، غصہ، ممی کی جھڑکیاں، تنہائی، اکیلا پن سو ایمل کا شادی شدہ لوگوں پر غصہ کرنا بنتا تھا۔

اگلے پندرہ منٹ میں ایمل اس کی پکی سہیلی بن چکی تھی۔ ممی کے آنے تک ایمل نے ذی شاہ کی کلائی پر فرینڈ شپ بینڈ باندھ دیا تھا۔ اب وہ اس کی بہت اچھی دوست بن چکی تھی جس کی بات سمجھنے میں ذی شاہ کا اتنا ڈھیر سارا ٹائم ویسٹ ہو جاتا تھا۔ آنٹی کے آنے تک اس نے ٹیبل پر برتن بھی نہیں رکھے تھے جس کی وجہ سے ان کا پارہ بگڑ گیا تھا۔

''داس ازت آبر۔'' انہوں نے گھور گھور کر ایمل کو دیکھا تھا اور ایمل گویا سر پر پیر رکھ کر بھاگی تھی۔ ماں کی ڈانٹ بس اسی کو سمجھ آسکتی تھی جبکہ وہ محض مسکراتا ہی رہا تھا اگر جو ڈانٹ کے مفہوم جان جاتا تو ایمل کو ڈانٹ پڑنے پر کچھ افسردہ ہو کر نئی نئی دوستی کا حق ادا کر دیتا مگر وہ ''داس ازت آبر'' جو انگریزی کے that's a shame سے ملتے جلتے الفاظ کو سمجھ نہیں پایا تھا۔ سو انجان پنے میں بس مسکرایا تھا۔ اگلے تین چار گھنٹوں میں اس پر واضح ہو چکا تھا اس گھر میں ایمل کو سب سے خوب ڈانٹ پڑتی تھی۔ افراہیم سے لے کر ممی تک کیونکہ اس کی بچگانہ حرکتیں ناقابلِ برداشت تھیں۔

☆☆☆

وہ جس مقصد کے تحت جرمنی آیا تھا اسے بھولا ہرگز نہیں تھا مگر ہر چیز کے کچھ ضابطے ہوتے ہیں، کچھ قاعدے اور اصول ہوتے ہیں سوائے ایک قاعدے، ضابطے کے ساتھ آگے بڑھنا تھا۔ اسٹیپ بائے اسٹیپ قدم بڑھانے تھے۔ وہ عجلت اور جلد بازی میں علی عیسیٰ کو چوکنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ سو ایک جامع لائحہ عمل تیار کر رہا تھا۔

اسے آئے یہاں اڑتیس گھنٹے تو ہو چکے تھے اور ان اڑتیس گھنٹوں میں بلا مبالغہ اس نے اپنے کمرے کی گلاس ونڈو سے کوئی ایک سو نناوے مرتبہ ڈارسے بچھڑی کونج کو دیکھا تھا۔ وہ اٹھارہ دفعہ تو دروازے کی بیرونی سیڑھیوں پر بیٹھی نظر آئی تھی۔ اکتالیس دفعہ درمیانی سڑک پر چکر کاٹتی دکھائی دی۔ کوئی تیس مرتبہ اس نے اپنا سر کھجایا تھا۔ کھچڑی زدہ لمبے بالوں والا سر۔ پندرہ دفعہ اپنا جوتا اٹھا کر دیکھا شاید جوتے کے اسٹریپ تنگ کر رہے تھے۔ اس کی سوتی روک سڑک پر گھسٹتی پیروں میں رُلتی جا رہی تھی مگر اسے کسی بات کی پروا نہیں تھی۔ ناک پونچھنے کے لیے ٹشو یا رومال کا تکلف کیے بغیر آرام سے آستین کو استعمال کر لیتی اور جب پچھتّویں مرتبہ اس نے ناک آستین سے صاف کی تو ذی شاہ کا جی اوب گیا تھا۔

''ہاؤ ڈسگسٹنگ، چھی چھی۔'' وہ زیرِ لب بڑبڑایا تھا مگر نگاہیں پھر بھی موڑ نہ سکا۔ اسے بہتی ناک والے بچے بھی برے لگتے تھے یہ تو پھر اتنی بڑی لڑکی تھی جو ناک پونچھتے ہوئے بچوں کو بھی مات کر رہی تھی۔ یہ پورا دن ذی شاہ کا اسی مصروفیت میں گزرا تھا۔ ایمل اسکول چلی گئی تھی۔ آنٹی کے اپنے بہت سے کام تھے سو وہ کچھ دیر کے لیے شامی سے چیٹ کرتا رہا۔ بندیا سے بات کی اور اب سب سے حسین ترین مصروفیت میں کھو چکا تھا۔

''اور اب یہ اس کا بیالیسواں پھیرا ہوا۔'' وہ خبطی آئٹم کو نگاہوں میں سموئے پھر سے بڑبڑایا تھا۔ اس نے پوری سڑک کو جیسے اپنے پیروں تلے روندنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ اس بات سے بے خبر کہ وہ اپنے پیر ہی تھکا رہی تھی۔ پیروں کی طرف دھیان جاتے ہی ذی شاہ قدرے ٹھٹک گیا تھا۔

''ایں...... یہ کیا اتنا خون...... مگر کہاں سے

آیا؟'' اس نے گردن پوری کھڑکی سے باہر نکال لی تھی۔
اب وہ بہت غور سے سامنے چلتی لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ کیا وہ واک کر رہی تھی؟ واک اس طرح کرتے ہیں؟ پاگلوں کی طرح سڑک کے چکر کاٹنا۔ وہ حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ اس کی جوتی کہاں تھی؟ شاید اس نے اتار دی تھی اور اب ایڑھیوں سے نکلتا خون۔ جانے اسے کوئی نوکیلا پتھر لگا تھا یا کوئی کانچ مگر بھل بھل نکلتا انسانی خون دیکھنا اس کے لیے محال تھا۔ سڑک پر جگہ، جگہ خون کے دھبے بکھر رہے تھے۔ کیا اسے ذرا بھی درد نہیں ہو رہا تھا اسے ذرا بھی تکلیف نہیں تھی وہ اتنی بے حس کیوں تھی، کیا اسے ایڑھیوں سے نکلتا خون دکھائی یا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

ذی شاہ کے دل کو کچھ ہونے لگا تھا پھر جیسے ایک دم وہ کوئی فیصلہ کرتا پلٹ گیا۔ اس نے اپنے سمسونائٹ کیس سے ننھا سا فرسٹ ایڈ باکس نکالا پھر دھڑا دھڑا سیڑھیاں اترتا نیچے چلا آیا۔ آنٹی آس پاس کہیں نہیں تھیں وہ قدرے مطمئن ہو کر باہر چلا آیا۔ وہ سامنے ہی آٹھ دس فرلانگ کے فاصلے پر اونچی سی سڑک کے کنارے پڑے پتھر پر بیٹھ گئی تھی۔ ذی شاہ تقریباً بھاگتا ہوا اس تک پہنچا تھا۔

''اے...... ارے ہیلو۔'' وہ پھولی سانسوں سمیت خبطی آئٹم کے قریب پہنچ گیا تھا پھر جیسے دوزانو دھڑام سے زمین پر گرا۔ اتنی تیز رفتاری سے بھاگتے ہوئے بریک لگانا مشکل تھا مگر وہ کامیاب ہو ہی گیا تھا لیکن یہ کیا؟ وہ خبطی آئٹم کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں ہرگز بھی کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ ہلکی ہو گئی تھی۔

''اے...... مائی نیم از ذی شاہ، ہاؤ ڈو یو ڈو؟ واٹ از یور نیم؟'' اس نے ایک ہی سانس میں کئی سوال پوچھ لیے تھے مگر جواب ندارد۔ وہ گم صم بیٹھی لڑکی اس پر ایک سادہ نگاہ ڈال کر اپنے رِستے پیروں کو دیکھنے لگی تھی۔ ذی شاہ کو لگا وہ انگریزی نہیں ...جنتی۔ ظاہر ہے وہ اپنی زبان میں ہی بات سمجھ سکتی ہوگی۔ وہ تھوڑا مایوس ہو گیا تھا۔ اب کیا کرے؟ کیسے مخاطب کرے؟ بات کس طرح سے ہو؟ وہ اردو، انگریزی سمجھنے والی نہیں تھی۔

''میں تمہارے زخم کو دیکھ کر آیا ہوں...... میرا مطلب ہے یہ خون...... میں تمہیں کب سے دیکھ رہا ہوں اس کھڑکی سے۔'' وہ روانی سے بولتا ہوا سامنے گھر کی اوپر والی کھڑکی کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ اسے لگا شاید وہ لڑکی اس کی بات پر یقین نہیں کرے گی۔ یہ بات ماننے والی بھی نہیں تھی بھلا آج کے دور میں کون اتنا فارغ تھا جو کھڑکیوں سے لٹک کر تانکا جھانکی کرے پھر جرمنی جیسے تیز رفتار ملک میں۔ ذی شاہ کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ پہلی ہی ملاقات میں اس لڑکی کو اپنے محسوسات کیسے بتائے؟ اپنے جذبات، اپنی خواہش، دل کی بدلتی کیفیت، یہ میٹھا، میٹھا ابھرتا درد آخر وہ لڑکی اس کی کس، کس بات پر یقین کرے گی؟ وہ پہلی بات میں ہی اسے پاگل قرار دے دے گی پھر یا تو وہ دو چار گالیوں سے نوازے گی یا ایک عدد جھانپڑ رسید کر دے گی۔ اس کی بکواس کا انجام یہی ہونا چاہیے تھا مگر یہ بکواس کہاں تھی؟ یہ تو اس کے دل میں ابھرنے والے خالص جذبے تھے۔

پہلی نظر کی محبت جو اسے پاکستان میں تو کسی سے نہیں ہو سکی تھی۔ آنیہ سے تو چاہ کر بھی نہیں ہو پائی تھی اور اِدھر بے چارے دل بادشاہ فراڈ کھیل گیا تھا۔ وہ بے چارہ کرتا بھی کیا؟ بس فی الوقت تو اسے یقین دلانا چاہتا تھا کہ وہ دل سے تسلیم کر لے کہ جرمنی آنے کے بعد ان اڑتیس گھنٹوں کے دوران کوئی ایک سو ننانوے مرتبہ وہ اسے احمقوں کی طرح دیکھ چکا ہے۔ کبھی چلتے، کبھی روتے، کبھی روتے، کبھی خود سے باتیں کرتے۔

''تم مجھے پچھلے اڑتیس گھنٹوں میں ایک سو ننانوے مرتبہ دیکھ چکے ہو۔ نائیلون کا جالی دار مہین پردہ ہٹا کر، گردن باہر لٹکائے، میں جانتی ہوں، آگے بتاؤ۔'' گردن کو آلپس کی چوٹیوں کی طرف موڑے اس نے دھڑ دھڑ ذی شاہ کے سر پر حیرتوں کا بینڈ بجا ڈالا تھا وہ لمحے بھر کے لیے بھونچکا رہ گیا۔

اس رات اور کیا ہوا تھا' مون حسیب کا اگلا شکار کون بننے جا رہا تھا؟ یہ سب جاننے کے لیے اگلے ماہ تک کا انتظار کیجیے

ناولٹ

ترکِ وفا

نایاب جیلانی

نواں حصہ



وہ حیران کیوں نہ ہوتا اُس نے بات ہی کچھ ایسی کی تھی وہ بھی بہت رواں اردو میں..... اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ خبطی آئٹم کی ایک، ایک حرکت کو بہت اونچائی اور بلندی سے نوٹ کر سکتا تھا کیونکہ وہ ایک اونچی جگہ پر کھڑا اسے دیکھتا رہا تھا جبکہ وہ لڑکی بہت نیچے تھی۔ اور ذی شاہ لمحے بھر کے لیے اسے دیکھتے وقت چوکا نہیں تھا جو وہ لڑکی موقع سے فائدہ اٹھا کر اسے دیکھ لیتی۔ جبکہ اپنے کسی بھی عمل سے ایسا نہیں لگتا تھا کہ وہ ذی شاہ کو دیکھتی رہی تھی۔ وہ پہلے کی طرح ہی بے نیاز اور بے حس بنی بیٹھی تھی۔ اس کے پیروں سے اب بھی خون رِس رہا تھا مگر مجال تھی جو اس کے لبوں سے ہلکی سی کراہ بھی نکل آتی۔ بڑا کمال کا ضبط پایا تھا اس نے..... ذی شاہ کی زندگی میں آنے والا وہ پہلا خبطی آئٹم تھا جو اسے پل پل حیران کر رہا تھا۔ اس

لڑکی کی بے نیازی، ضبط، صبر و تحمل کمال کا تھا۔ ورنہ اس نے تو صرف سوئی چبھنے پر لڑکیوں کو چلاتے دیکھا تھا۔

ابھی آج صبح ہی تو ایمل کو آنٹی سے محض چھری کا ہلکا سا کٹ لگنے پر ڈانٹ پڑی تھی کیونکہ کٹ بہت معمولی تھا مگر وہ شور اتنا مچارہی تھی گویا سارے زمانے کا درد اس کی ننھی سی انگلی میں سمٹ آیا ہو...... چلو، ایمل تو بچی تھی، اس نے بندیا اور عینی کو ذرا، ذرا سی تکلیف پہ دھاڑیں مارتے دیکھا تھا۔ وہ تین، تین دن تک بستر نہیں چھوڑتی تھیں اور یہاں وہ ایک جرمن لڑکی کے صبر، برداشت اور حوصلے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ تین انچ لمبے اور نوکیلے کانچ کو ایڑھی میں کھبائے مطمئن سی بیٹھی تھی۔

''اللہ اکبر...... اتنا حوصلہ......'' ذی شاہ ساری سوچوں کو جھٹک کر اس کے پیر پہ جھک آیا تھا۔ وہ ایڑھی پکڑ کر زخم کا جائزہ لینا چاہتا تھا جب اس لڑکی نے اسے حلاوت سے روک دیا۔

''اسے مت چھیڑو...... اسے میری ایڑھی میں کھبا رہنے دو۔'' وہی نرم اور شیریں انداز...... وہ ذی شاہ کو دیکھے بِنا نرمی سے منع کر رہی تھی۔ اسے پھر سے حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔ رواں اردو اور شیریں لہجہ...... وہ لمحے بھر کے لیے چپ سا کر گیا تھا پھر اس سے ایڑھی سے بہتا خون دیکھا نہ گیا۔ نیچے شفاف جگہ پر خون کی ننھی سی ندی رواں ہوگئی تھی۔ اتنا خون بہنے کے باجود وہ ذرا سی کمزوری محسوس نہیں کر رہی تھی۔ وہ حقیقتاً کوئی خبطی آئٹم ہی تھی۔ افراہیم نے بالکل ٹھیک کہا تھا اور پورے مغربی جرمنی میں ذی شاہ کو ایسا خبطی آئٹم نظر نہیں آسکتا تھا۔

اس نے اس کے روکنے اور منع کرنے کے باوجود بھی فرسٹ ایڈ باکس کھول لیا تھا۔ وہ ڈیٹول کے ذریعے زخم صاف کر کے کانچ کو نکالنا چاہتا تھا جب اس لڑکی نے نرمی سے اسے مخاطب کیا۔

''میں نے کہا ناں...... اسے مت نکالو، یہ جب تک میری ایڑھی میں کھبا مجھے تکلیف دیتا رہے گا، میرا اللہ پر یقین بڑھتا جائے گا۔ تم اسے یہیں رہنے دو...... مت نکالو...... مجھے اس درد کی لذت کا احساس بہت سکون دیتا ہے۔ مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ کوئی تو ہے جو اتنا درد دیتا ہے کہ بے بس کر کے رکھ دیتا ہے اور ایسی تدبیر کرتا ہے جو حواس چھین لیتی ہے۔'' وہ بِن دیکھے اسے اپنے شیریں کلام سے متحیر کر رہی تھی۔ مغربی حسن، مغربی شکل، مشرقی باتیں اور بیچ میں اللہ کا ذکر...... وہ پھر سے بھونچکا رہ گیا تھا۔ وہ خبطی آئٹم تو جیسے اسے بھی خبطی کرنے کے موڈ میں نظر آرہا تھا۔

''تم پاکستانی ہو؟'' ذی شاہ نے حیران ہونا ترک کر کے زبردستی اس کے پیر پر اپنا پنجہ جمالیا تھا پھر اس کے منع کرنے اور روکنے کے باجود کچھ دیر پہلے کی تقریر بھلا کر اس نے بڑے آرام سے کانچ نکال لیا تھا اور شیشہ نکالتے ہی جیسے گوشت کے کئی لوتھڑے باہر آپڑے تھے۔ خون کا جیسا فوارہ چھوٹ پڑا تھا۔ وہ بغیر گھبرائے بڑی سہولت کے ساتھ خون روکنے کی کوشش کرتا رہا...... مگر یہ کوشش قطعاً ناکام تھی...... ذی شاہ کو اندازہ ہوگیا تھا خون رکنے والا ہرگز نہیں...... زخم بہت گہرا تھا۔

''آئی ایڈوائس یو ٹو گو ٹو ہاسپٹل......'' ذی شاہ نے متفکر لہجے میں کہا پھر جیسے کچھ سوچ کر اٹھ گیا۔ افراہیم کی گاڑی نہیں تھی اور یقیناً اس خبطی آئٹم کے پاس بھی گاڑی کی سہولت نہیں تھی۔ وہ اندازے سے چلتا ہوا مین روڈ تک گیا۔ تب اسے اپنے پیچھے ہی ایک آواز سنائی دی تھی۔ ذی شاہ اسے پتھر پر بیٹھا رہنے کی التجا کر کے آیا تھا جبکہ وہ اس کے پیچھے ہی دبے قدموں چلتی آگئی تھی۔ وہ جس طرح پیر زمین پر جما کر چل رہی تھی، اس کے بجائے ذی شاہ کو تکلیف ہونے لگی تھی۔ اس کا ہر زمین پر پڑتا قدم ذی شاہ کو اپنے دل پر پڑتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ کل سے اپنی کیفیات پر حیران تھا۔ وہ آج بھی اپنی کیفیات پر حیران ہو رہا تھا۔

''ٹیکسی یہاں سے نہیں ملے گی۔ بس اسٹاپ تک چلتے ہیں۔'' وہ یقیناً بڑی ہمت والی بہادر لڑکی تھی۔ ذرا سی کراہ بھی منہ سے نکالے بغیر ذی شاہ کا سہارا لینے کی ضرورت تک محسوس نہیں کی بلکہ اس کے سہارا دینے پر انکار کر کے آرام سے چلتی بس اسٹاپ تک پہنچ گئی تھی۔ دیکھا

جاتا تو ذی شاہ کو ساتھ جانے کی ضرورت نہیں تھی، وہ خود چل کر بس اسٹاپ تک آسکتی تھی تو کیا ڈاکٹر کے پاس نہیں جاسکتی تھی؟ اور ویسے بھی ذی شاہ کو تو نہ رستوں کا علم تھا نہ کلینک کی کچھ خبر تھی۔ وہ تو اس کمبخت دل کے مجبور کرنے پر بِنا سوچے سمجھے منہ اٹھا کر چلا آیا تھا۔ اور عجیب بات یہ تھی، ساتھ آنے والی محترمہ نے رسمی طور پر بھی اسے ساتھ چلنے سے منع نہیں کیا تھا، سو وہ بھی ڈھیٹوں کی طرح رکنے کے بجائے ساتھ ہی چل پڑا۔

وہ ننگے پیر تھی اور بینڈیج کے باعث خون رکا تو نہیں تھا تاہم پہلے کی طرح ٹپک نہیں رہا تھا پھر بھی اتنے صبر اور حوصلے کے ساتھ بِنا تکلیف کا واویلا کیے وہ چل پڑی تھی۔ پھر کچھ ہی دیر میں بذریعہ بس وہ لوگ ڈاکٹر کے کلینک پہنچ گئے جہاں اسے معائنے کے بعد چھوٹا سا آپریشن کر کے ٹانکے وغیرہ لگائے گئے تھے۔ اس دوران ذی شاہ بھی ساتھ، ساتھ رہا تھا۔ وہ اس لڑکی کے پہاڑ جتنے حوصلے، صبر اور ہمت کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اتنی صابر خاتون ذی شاہ نے اپنی پوری زندگی میں کوئی نہیں دیکھی تھی۔ کم از کم ذرا سی تکلیف کے آثار تو نظر آنے چاہیے تھے۔ یوں تو وہ صابر اور باہمت کے ساتھ، ساتھ کچھ کچھ بے حس بھی لگ رہی تھی۔ جو ہر قسم کے احساسات سے بے خبر تھی۔ جسے تکلیف یا درد تک محسوس نہیں ہوتا تھا۔

میڈیکل ٹریٹمنٹ کے بعد اب وہ لوگ کیمسٹ کے پاس کھڑے تھے۔ وہ اب بھی ذی شاہ کا سہارا لیے بغیر ڈاکٹر کے لکھے گئے نسخے کو دیکھ رہی تھی۔ دوائیاں لے کر اس نے ادائیگی کرنا چاہی تو ذی شاہ نے اسے روک دیا تھا۔ یقیناً وہ بے خیالی میں اِدھر اُدھر دیکھتی اپنا پاؤچ تلاش کر رہی تھی۔ اس کے پاس پاؤچ تھا ہی نہیں۔ بس کا کرایہ بھی ذی شاہ نے اسے پکڑایا تھا۔ کیمسٹ سے ہی اس نے ٹشو خریدے جو آستین سے ناک پونچھتی اس خبطی آئٹم کو بھی دیے اور وہ اب چلتے، چلتے ایک چھوٹی سپر مارکیٹ کے قریب رک کر اس کا جائزہ لے کر اندر کی طرف بڑھا۔ وہ بھی ساتھ، ساتھ تھی۔ وہ لیڈیز جوتوں کی ایک چھوٹی سی دکان میں داخل ہوا اور خوش مزاج سیلز گرل سے اس کے لیے جوتا دکھانے کو کہا۔ وہ تو اس طرح نخوت سے جوتا لے رہی تھی جیسے ذی شاہ بڑی منتوں کے بعد اسے لے کر آیا تھا۔ خیر...... آیا تو وہ اِدھر اپنی مرضی سے تھا...... مگر مجال تھی جو وہ لڑکی ذرا سا مسکرا دیتی۔ بندہ اس اخلاقی عمل کو دیکھ کر ذرا سی حوصلہ افزائی ہی کر دیتا ہے۔ ذی شاہ کے اتنے مروت بھرے فدویانہ رویے پہ محترمہ نظر ڈالے بِنا جوتے پہنے اپنی جگہ سے اٹھ گئی تھی۔ جبکہ شاپ کی مالکن کچھ الجھی اور سوچتی نظر سے اسے دیکھ رہی تھی جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو مگر...... پھر پورا رستہ خاموشی میں کٹا...... گھر کے قریب آکر ذی شاہ نے اتنے سوالوں میں پہلا اہم ترین سوال اٹھایا تھا۔ یعنی اس نے خبطی آئٹم سے اس کا نام پوچھنے کی جسارت کرلی تھی۔ یہی جسارت زیٹا (سیلز گرل) بھی کرنا چاہتی تھی مگر اس کا ارادہ بھانپ کر وہ شاپ سے بھاگ نکلی۔

''آں...... میں تمہارا نام پوچھ سکتا ہوں؟'' وہ بغیر کوئی رسمی کلمات بولے براؤن کلر کے جوتوں میں پیر پھنسائے اپنے ویلس ہاؤس کی طرف بڑھ رہی تھی جب ذی شاہ کی آواز سن کر لمحے بھر کے لیے ٹھٹک کر رک گئی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے سر جھٹک کر جواب دیا تھا۔

''منکشے......'' وہ خبطی آئٹم لمحہ بھر کی دیر میں اپنے ویلس ہاؤس کی طرف بڑھ گئی تھی۔ جاتے سمے وہ اپنا خوب صورت نام ذی شاہ کی سماعتوں میں امرت کی طرح اتار گئی تھی۔ وہ جیسے سحر زدہ رہ گیا تھا۔

''اتنا حسین مگر عجیب نام......'' وہ زیر لب... بڑبڑاتا ہوا میٹھی سی مسکان ہونٹوں پر سجائے واپسی کے لیے مڑ گیا۔ اس کے دل کی خوشی اور سکون کے لیے بس اتنا ہی کافی تھا کہ منکشے سے آج نہ صرف ملاقات ہوگئی تھی بلکہ بہت طویل بات بھی ہوئی تھی۔ جرمنی آنے کے صرف اکتالیس گھنٹوں بعد منکشے سے پہلی باضابطہ ملاقات...... وہ جو پہلی نظر میں دل کی آخری تہوں میں اتر گئی تھی۔ جو ذی شاہ کے دل کا ہر ساز اپنی بے نیازی

میں گھیر کر بجا گئی تھی۔ وہ اس کی آنکھوں میں اپنی سادگی کے باعث ہمیشہ کے لیے رچ بس گئی تھی۔ اور ایک بات تو جیسے طے تھی وہ اس کے دل کی سرزمین سے پیر اکھاڑنے والی نہیں تھی۔ وہ عجیب نام کی عجیب لڑکی......

☆☆☆

''تمہارا نام کتنا عجیب ہے......'' کرسٹل کے شفاف باؤل میں سرخ، رسیلی اسٹرابریز بھرے وہ اسٹول نما سنگی پتھر پر نزاکت سے بیٹھی تھی۔ پنک اسکرٹ کے اوپر وائٹ بلوزے پہن رکھا تھا، بالوں کی ڈھیلی سی پونی کے ساتھ وہ بہت بے پروا نظر آرہی تھی۔ اس کی اٹھان بہت اچھی تھی، ہاتھ پاؤں بڑے، بڑے تھے تاہم نسوانی نزاکت ضرور دکھائی دیتی تھی۔ اس کے بالوں کا رنگ اخروٹی تھا، آنکھیں نیلی اور جسم بہت دبلا پتلا تھا، اس کے باوجود وہ تیرہ سال کی عمر میں سترہ سالہ دوشیزہ نظر آتی تھی۔

ذی شاہ کو ایمل کی کمپنی پسند تھی اور ایمل بھی اسکول سے آکر اس کے پہلو سے چپک جاتی تھی۔ دن کا بیشتر وقت وہ ماں سے ڈانٹ کھاتی تھی جبھی بقول ایمل اسے کھایا پیا نہیں لگتا تھا۔ وہ باتوں کی شیدائی تھی اور چاہتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ اسے ہی سنا جائے۔ ٹوٹی پھوٹی انگریزی اور اچھی خاصی پنجابی میں وہ خوب چٹخارے لے کر اسے باتیں سناتی تھی۔ اپنی بہن کی لو میرج کا قصہ اس نے کوئی اٹھارہ مرتبہ تو اسے سنا رکھا تھا۔ فی الوقت ولیس ہاؤس کی مالکن پر تبصرہ کرتے ہوئے اچانک ایمل کو اس کا نام بہت عجیب لگا تھا۔ اور دل کی بات رکھنے والی تو وہ تھی نہیں۔ جبھی ننھی سی ناک سکیڑ کر بولی تھی۔

''عجیب نام ہے تمہارا ...... پہلے کبھی نہیں سنا......'' ایمل نے موٹی سی اسٹرابیری منہ میں رکھ کر دانت زور سے دبائے تو اسٹرابری کا اضافی رس اس کے ہونٹوں کی تراش اور کونوں سے باہر نکل آیا تھا جسے وہ اپنے ہونٹوں کو چوس چوس کر زبان پھیرتے ہوئے اندر کر رہی تھی۔

''ایں...... عجیب کیوں ہوا......؟'' ذی شاہ برا مان گیا......اس کی نظریں پھولوں سے لدی ٹوکریوں پر جمی تھیں۔ ایک جیسی ٹوکریاں ایک جیسے گھروں کے کونوں میں موجود چھوٹے سے سوئمنگ پول...... کھڑکیوں کے اندر لٹکے ایک ہی طرز کے سفید جالی دار نائیلون کے پردے...... اتنی مماثلت کا مقصد کیا تھا؟ یا پھر ایک ہی طرز کی کچھ چیزیں یہاں کے کلچر کا کوئی حصہ تھیں، ہر گھر کے اندر پردے ایک جیسے تھے، پھولوں کی ٹوکریاں بھی ایک جیسی...... گارڈن میں موجود پول بھی ایک ہی طرز کے...... حتیٰ کہ کھڑکیوں کا طول عرض بھی ایک سا تھا۔ یہ جرمن قوم کے مزاج کا انوکھا پہلو تھا۔ بہت ساری چیزوں میں انتہا کی یکسانیت...... ہر اجنبی کو اسی طرح حیران کر دیتی ہوگی۔

وہ اتنی ساری عجیب ...... چیزوں پر حیران ہونا ترک کر کے اپنی چھوٹی فرینڈ کی عجیب بات میں الجھ گیا تھا جسے ذی شاہ نام جانے کیوں عجیب لگا تھا۔

''میرا نام تو بہت اچھا ہے......'' ذی شاہ نے مصنوعی تفاخر سے جتا کر کہا تھا۔ تب ایمل تیسری اسٹرابری کو اپنے دانتوں تلے دبا کر پہلے والے ہی اسٹائل میں کناروں سے چھلکتا رس چوستی دلچسپی سے بولی۔

''وہ کیسے؟'' اس کی نیلی آنکھوں میں اشتیاق تھا۔

''وہ ایسے کہ میرے نام ذی شاہ کا معنی بہت خوب صورت ہے، شان اور مرتبے والا......'' وہ اپنے تفاخر کی وجہ بتا رہا تھا۔ تب ایمل نے اثبات میں سر ہلا کر جیسے تائید کی تھی۔

''اور تم لوگوں کے نام تو جیسے ہرگز بھی عجیب نہیں...... افراہیم، افریشم اور ایمل ...... اور یہ سامنے والی......'' ذی شاہ کچھ بولتے، بولتے ایک دم رک سا گیا۔ حالانکہ وہ جتانا چاہتا تھا کہ یہ سامنے والی عجیب نام کی منکشے خاتون...... ''بھلا یہ بھی کوئی نام ہوا؟''

''اچھا...... اچھا، نام سب ہی اچھے ہوتے ہیں۔'' ایمل نے فوراً سیز فائر کرنے کی کوشش میں اسٹرابیری ہاتھ سے رکھ دی تھی کیونکہ ان دونوں کی لڑائی اب متوقع

تھی۔ کچھ دیر بعد وہ اسے کوئی اور بات بتا رہی تھی۔

معاً ذی شاہ کو اچانک خیال آیا تو بولا۔

''میرے ساتھ شریب وارن تک چلوگی؟'' اس نے اپنے امپورٹڈ والٹ کو نکال کر کرنسی چیک کی تھی پھر مطمئن ہو کر ایمل کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ اس سے بھی پہلے قدرے پُر جوش ہوگئی تھی...... ہانٹ لونگ اس کی فیورٹ دکان تھی۔ اسے بھی کافی زیادہ اسٹیشنری کا سامان خریدنا تھا...... سو فوراً باؤل کو اٹھا کر اندر رکھ آئی...... واپسی پر اس کے ہاتھ میں وائٹ بلوزے جیسا ایک پاؤچ بھی تھا۔

''تمہیں ہانٹ لونگ سے کیا خریدنا ہے؟'' ایمل ببل گم چباتی تجسس بھرے لہجے میں بولی تھی۔ وہ دونوں فٹ پاتھ پر واک کے انداز میں چل رہے تھے۔ اسٹیشنری یہاں سے دس منٹ کے واکنگ ڈسٹنس پر تھی۔ ذی شاہ کو ابھی یہ علاقہ گھومنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ ورنہ وہ اکیلا ہی چلا آتا...... ایسے ہی اردگرد دیکھتے اس کے دل میں خواہش اچانک انگڑائی لے کر بیدار ہوئی تھی کہ ولیس ہاؤس کی مالکن، وہ خبطی آنٹم منکشے یہیں کہیں دکھائی دے جائے...... جانے اس کے پیر کا زخم کیسا تھا......؟ وہ اسے کل سے دکھائی نہیں دی تھی۔ اسے چلنے پھرنے میں یقیناً دشواری کا سامنا تھا۔

''مجھے خط لکھنے کے لیے پیڈ، لفافے اور قلم چاہیے۔'' وہ سنجیدگی سے جواب دیتا ابھی تک منکشے کو سوچ رہا تھا...... اور ایمل بار بار اس کا ارتکاز توڑ رہی تھی...... اسے بولنے کی بیماری تھی اور وہ چپ نہیں رہ سکتی تھی۔

''وہ تو گھر میں بھی موجود تھے۔ تم مجھے بتاتے تو سہی۔'' ایمل نے بڑے پن سے کہا تھا، تب ذی شاہ بے پروائی سے بولا۔

''اٹس اوکے یار......! اسی بہانے تھوڑی آؤٹنگ ہو جائے گی۔'' وہ بالوں میں ہاتھ پھیرتا پھر کسی سوچ کے زیرِ اثر چلا گیا تھا۔ روتی ہوئی منکشے کبھی آنکھوں کی پتلیوں کے سامنے عکس بنانے لگتی تھی۔ کبھی روڈ کے وسط میں چلتی نظر آتی، کبھی راج ہنس سے

باتیں کرتی دکھائی دینے لگتی...... پھر اس کے الفاظ، وہ چلتے، چلتے ٹھٹک گیا۔ اس نے کیسے ذی شاہ کو اتنی اونچائی پر ہونے کے باوجود دیکھا تھا۔ اس کی ایک، ایک حرکت نوٹ کی...... حتیٰ کہ گھنٹوں کا بھی حساب رکھا...... جبکہ بظاہر وہ بے نیاز نظر آتی تھی۔ کیا کمال کی زیرک نظری پائی تھی اس نے...... کیا غضب کا مشاہدہ تھا۔ وہ ابھی تک متحیر تھا، بھلا اتنے بے نیاز روپ کے ساتھ وہ آس پاس کے ماحول سے اتنی باخبر کیسے تھی؟

جانے وہ کب تک سوچوں میں محو رہتا؟ چونکا تو وہ تب جب ایمل نے خفگی سے اس کا بازو دبوچ کر روکنے کی کوشش کی تھی۔ ورنہ وہ تو اپنے ہی دھیان میں مگن بہت آگے تک چلا گیا تھا جبھی پھولی سانسوں والی ایمل نے بھاگ کر اس کا بازو دبوچ لیا۔

''اللہ...... کہاں، بھاگے جا رہے ہو......؟ ہانٹ لونگ تو پیچھے رہ گئی۔'' وہ اسے واپس موڑتے ہوئے خاصا شرمندہ کر رہی تھی۔ ذی شاہ چونک کر جیسے حقیقتاً شرمندہ ہوگیا۔ پھر اپنی شرمندگی مٹانے کی خاطر اس نے ایمل کو خاصی شاپنگ کروائی تھی پھر اس نے شاپ کیپر سے پوسٹ آفس کے بارے میں پوچھا تھا۔ وہ ایک کاغذ پر جلدی، جلدی کچھ تحریر کر رہا تھا۔

''از دی پوسٹ آفس ٹوڈے؟'' شاپ کیپر سے انگریزی میں پوچھتا وہ خود ہی ہونق ہوگیا تھا کیونکہ شاپ کیپر صاحب نے اس کی بات پر توجہ دیے بغیر اخبار اٹھا کر دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ ایمل اس عزت افزائی پر قل، قل ہنسنے لگی تھی۔ ذی شاہ بری طرح بھنا گیا۔ اس نے قلم چلانا ترک کر کے ایمل کو گھورا تھا۔

''اسے انگریزی کی سمجھ نہیں آئی۔'' ایمل نے شکستہ انگلش اور شستہ پنجابی میں اسے سمجھایا تھا۔ تب ذی شاہ پھر سے اسٹیشنر کو گھور کر رہ گیا تھا۔ اب کہ ایمل شاپ کیپر کو مخاطب کر رہی تھی۔

''از ت داس پوستامت مورگن اوفن......؟'' ایمل نے آج کے بجائے کل ڈاک خانے کے کھلے ہونے کی تصدیق کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ڈاک خانہ

آج اس وقت تک بند ہوگیا ہوگا مگر شاپ کیپر نے بتایا پوسٹ آفس آج بھی کھلا ہے۔ وہ دونوں دانکے شون (شکریہ) بولتے باہر نکل آئے تھے۔ اب انہوں نے قریبی پوسٹ آفس سے لفافوں اور ایروگراموں پر لگانے کے لیے خاص قسم کے ٹکٹ خریدے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ ایک لفافے میں چکنی سلپ پر لکھی کوئی تحریر ڈال کر ''ویئر از دی پوسٹ بکس......؟'' پوچھتا ایک کونے کی طرف چلا گیا تھا۔ خط پوسٹ کر کے اب وہ دونوں واپسی کے سفر پر گامزن تھے۔

''تم نے خط کسے بھیجا......؟'' ایمل نے اپنی بے چین فطرت کے باعث فوراً سوال اٹھایا تھا۔ وہ کب سے بے چینی چھپائے اس کی کلروائیاں دیکھ رہی تھی۔ اب صبر نہ ہوسکا تو فوراً پوچھنے لگی۔

''پاکستان اپنے گھر......'' وہ سنجیدگی سے بولا۔ اِدھر ایمل حیران رہ گئی تھی۔

''تمہارے گھر میں ٹیلی فون نہیں......؟'' اس نے آنکھیں پھاڑ کر ذی شاہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

''فون ہے......'' ذی شاہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اور انٹرنیٹ......؟'' ایک اور حیرانی بھرا سوال۔

''انٹرنیٹ بھی ہے......'' وہ اس کی بے چینی کو سمجھ رہا تھا تبھی خط اٹھاتے ہوئے بولا۔

''تو پھر خط لکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ تم فون پر بات کر لیتے یا اسکائپ پر......'' ایمل نے منہ پھلا کر ناراضی کا اظہار کیا تھا۔ اس تیز رفتار انٹرنیٹ دور میں ایک ماڈرن لڑکے کا خط لکھنا اسے سمجھ نہیں آیا تھا۔ ویسے بھی اس کی سمجھ خاصی کمزور تھی۔

''تم نہیں سمجھوگی......'' ذی شاہ نے اس کے سر پر چپت لگائی تھی۔ وہ پھر سے منہ پھلا گئی۔ اسے بات بہ بات روٹھنے کی بھی بیماری تھی۔ اسے ناراض دیکھ کر وہ پچکارنے لگا تھا پھر ایک آئس کریم کارنر کو دیکھ کر جھٹ سے بولا۔

''کون کھاؤ گی......؟'' وہ اسے لالچ دے رہا تھا مگر ایمل نے فوراً انکار کر دیا...... وہ کچھ موڈی سی تھی اور جب موڈ میں آکر کسی بات پر انکار کرتے ہوئے رہن دیوہ...... (رہنے دو) بولتی تو بہت ہی کیوٹ لگتی۔ اب بھی اس نے منہ بنا کر انکار کر دیا تھا۔

''رہن دیوہ'' وہ تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے اپنی اسٹریٹ سے ہوتی ہوئی گھر کے اندر گھس گئی تھی جبکہ ذی شاہ کے قدموں کی رفتار خود بخود سست ہوگئی۔ ویلس ہاؤس اپنی تمام تر خوب صورتی کے ساتھ اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ ذی شاہ سے آگے جایا ہی نہیں گیا تھا۔ وہ رک سا گیا، گویا تھم گیا ہو۔

''کیا اسے منکشے کی خیریت معلوم کرنے جانا چاہیے......؟'' دل اور دماغ کی دلیلوں اور جوازوں کے درمیان وہ متذبذب کھڑا تھا۔ آگے بڑھے یا پیچھے پلٹ جائے؟ آگے جانا مناسب تھا یا واپسی میں عافیت تھی؟ وہ الجھتا رہا، سوچتا رہا، بہت دیر کی ذہنی اور جذباتی کشمکش کے بعد وہ واپس پلٹ کر گھر کے اندرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ جذبات پہ سوچ حاوی ہوگئی تھی۔

وہ کس طرح بنا کسی جان پہچان کے منکشے کا دروازہ کھٹکھٹا سکتا تھا؟ محض کل کی مختصر رفاقت کے بل بوتے پر اتنی بے تکلفی یورپ میں اسے بھاری نقصان سے دوچار بھی کر سکتی تھی؟ کیا خبر منکشے اسے دیکھ کر پہچاننے سے انکار کر دیتی؟ یا پھر برا بھلا کہنے لگتی' زیادہ ہی میٹر گھومتا تو پولیس کو بلوا لیتی...... تب وہ منکشے کی طرف سے ملنے والے جھٹکے سے کیسے سنبھلے گا......؟ وہ بھی اس صورت میں جبکہ وہ منکشے کو اپنے دل میں بہت اعلیٰ مقام دے چکا تھا۔ شاید وہ اس سے یک طرفہ محبت میں مبتلا ہوگیا تھا۔ یہ اور بات تھی اس محبت کا اعتراف کرنا اس کے لیے بہت مشکل تھا۔ مگر دل کی بدلتی کیفیت اسے جھنجلاہٹ میں مبتلا کر رہی تھی۔ وہ یہاں محبتیں کرنے تو نہیں آیا تھا، نہ دل پرایا کرنے آیا تھا پھر اس کے ساتھ آخر کیا ہو رہا تھا؟

وہ عجیب کشمکش میں مبتلا بالوں میں انگلیاں پھیرتا لاؤنج میں آیا تو سامنے ہی ایمل صوفے پر چڑھی اپنی باربی کو سینے سے چمٹائے دکھائی دی تھی۔ اس کا موڈ پہلے سے بہت بہتر لگ رہا تھا تبھی ذرا چہک کر بولی تھی۔

''وہاں کیوں رک گئے تھے...... ویلس ہاؤس کے سامنے؟'' اس نے بڑے عجیب لہجے میں پوچھا تھا۔ وہ ذرا ٹھٹک گیا۔

اسے امید نہیں تھی، ایمل اندر کسی جھری میں سے اسے باہر کھڑا دیکھ رہی تھی اور نہ صرف دیکھ رہی تھی بلکہ بہت غور بھی کر چکی تھی۔ تبھی بڑے حیران کُن تاثرات سجائے بیٹھی تھی۔

''نہیں تو......'' ذی شاہ نے ہڑبڑا کر جھوٹ بولا۔

''رہن دیوہ...... جھوٹ نہ بولو، میں نے خود دیکھا ہے۔'' وہ پھر سے چہک کر بولی تھی۔

''کہاں سے؟'' ذی شاہ نے آنکھیں پھیلا کر پوچھا۔

''اس ونڈو سے'' ایمل نے سفید نائیلون کے جالی دار مہین پردے کی طرف اشارہ کیا تھا جو اس وقت تک میں اُڑا سا ہوا تھا جس کی وجہ سے باہر کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ذی شاہ بھویں اچکا کر رہ گیا۔

''میں تو ایسے ہی کچھ سوچ رہا تھا۔'' اس سے بات نہیں بن پائی تھی، اتنی سی بالشت بھر کی بچی نے اسے گھما ڈالا تھا۔

''رہن دیوہ (رہنے دو) ایسے ہی تو بلاوجہ کچھ سوچا نہیں جاتا۔'' وہ اس کے بہلاوے میں نہیں آئی تھی۔ خاصی افلاطونی بچی تھی۔ عمر کے لحاظ سے کم تاہم قد میں اتنی بانس جتنی لمبی......

''مگر میں تو بلاوجہ ہی کھڑا سوچ رہا تھا۔'' ذی شاہ کھسیا گیا۔

''ویلس ہاؤس کو دیکھ کر......؟'' وہ پھر سے چہکی...... ''کسی اور چیز کو دیکھ کر سوچ لیتے، سڑک کے بیچ میں کھڑے ہو کر ویلس ہاؤس کے داخلی دروازے پر نگاہ جما کر سوچنے سے کیا اچھی، اچھی باتیں ذہن میں آتی ہیں؟ اگر یہ کوئی میجک ہے تو اسے میں بھی آزمالوں گی۔'' ایمل کی بچی نے اس کی درگت بنا ڈالی تھی۔ بہت تیز اور حاضر دماغ لگتی تھی۔ ذی شاہ سر دُھن کر رہ گیا۔

''یہ واقعی میجک ہے...... تم بھی آزمالینا......'' وہ شرارتی انداز میں بولا تھا تب اس کے اگلے الفاظ اس کی ساری شرارت کو ہوا کر گئے تھے۔

''میں کوئی پاگل ہوں جو ویلس ہاؤس کو دیکھ کر سوچوں گی۔ پھر تو رات بھر نیند نہیں آئے گی۔'' ایمل ساری طراری بھلائے خوفزدہ ہوگئی تھی۔ عجیب سا ہراس اس کی آنکھوں میں ابھرنے لگا تھا۔

''کیوں بھلا......؟'' وہ حیران ہوا تھا...... تب ایمل جیسے گڑبڑا گئی تھی۔ گویا زیادہ بولنے کے نقصان سے دوچار ہوگئی۔ ذی شاہ کو یوں لگا تھا جیسے وہ کچھ بتاتے، بتاتے چھپا گئی تھی۔

''ایسے ہی......'' اس نے ذی شاہ کے انداز میں ہی جواب لوٹا دیا تھا۔ بالکل اسی کے اسٹائل میں کندھے اچکا کر...... پھر باربی پھینک کر کچن کی طرف بھاگ گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد بلینڈر چلنے کی آواز آئی۔ شاید وہ شیک بنا رہی تھی۔ چند منٹ تک بلینڈر چلتا رہا تھا پھر آواز آنا بند ہوگئی۔ وہ سوچتی نظروں سے اوپن کچن میں کام کرتی ایمل کو دیکھتا رہا۔ وہ جیسے اس کے متوقع سوالات سے بچنے کی غرض سے بھاگ گئی تھی۔ شیک کا تو بہانہ تھا...... کچھ دیر مزید کچن میں رکنے کے بعد وہ ٹھنڈا ٹھار شیک کانچ کے پتلے اور انتہائی لمبے اسٹرا جتنے گلاسوں میں بھر کے لے آئی تھی۔ یہ اسٹرا جتنے لمبے اور پائپ جتنے موٹے بلوریں گلاس اپنی ساخت کے لحاظ سے خاصے پُرکشش لگتے تھے۔ ایمل نے ایک گلاس اسے پکڑا دیا تھا، دوسرا گلاس خود پکڑ کر کارپٹ پر بیٹھ گئی۔

''تمہیں بھوک تو نہیں لگی......؟'' ایمل نے بڑے، بڑے گھونٹ بھرتے ہوئے فکرمندی سے پوچھا تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا کر انکار کیا تھا...... تب وہ مطمئن ہوگئی تھی۔ آج ایمل کی موتر کہیں گئی ہوئی تھیں۔ لنچ کی ذمے داری ایمل پر تھی شاید تبھی وہ متفکر سی پوچھ رہی تھی۔

''نہیں...... یہ گینز رنگ (شیک) ہی کافی ہے......'' ذی شاہ نے انکار کر دیا تھا۔ وہ اپنی وجہ سے معصوم ایمل کو مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔

''اگر بھوک لگی تو بتا دینا، میں کھانا گرم

کردوں گی۔ ممی سب بنا کر گئی ہیں۔'' اس نے بہت بے نیازی سے جواب دیا تھا۔ تب وہ چونک سا گیا۔

''آنٹی کہاں گئی ہیں؟'' وہ متفکر سا بولا۔

''افریشم کی طرف...... اس کی طبیعت خراب تھی۔'' ایمل نے بیزاری سے بتایا۔ اسے افریشم سے بہت شکوے تھے، ایک تو وہ شادی کر کے اسے چھوڑ گئی تھی اور دوسرے ممی کو بھی آئے دن بلاوا بھیج دیتی تھی۔ اب اگر ذی شاہ نہ ہوتا تو اس نے قیامت اٹھا لینی تھی کیونکہ وہ اکیلے کبھی گھر میں نہیں رہتی تھی۔

''کیا ہوا افریشم کو......؟'' ذی شاہ نے فکرمندی سے پوچھا تھا۔ یہ وہی افریشم تھی جس نے ایک خوب صورت کارڈ پہ اسے من ہائیم میں ویلکم بولا تھا۔ وہ کارڈ ابھی تک گیسٹ روم کے دروازے پر چسپاں تھا۔

''پتا نہیں......'' ایمل کی بیزاری عروج پر تھی۔ اس نے گلاس خالی کر کے ٹیبل پر رکھا تھا پھر ایمل کی طرف متوجہ ہوا۔

''تم کچھ بتا رہی تھیں۔'' وہ سلسلۂ کلام دوبارہ سے جوڑنا چاہتا تھا جہاں سے ایمل توڑ کر کچن میں چلی گئی تھی۔

''کیا......؟'' اب وہ ٹی وی لگا کر بیٹھ گئی۔ اس کے انداز میں بے پروائی محسوس کر کے ذی شاہ نے جتایا تھا۔

'' ویلس ہاؤس کے بارے میں......'' وہ سنجیدگی سے بولا تھا تب ایمل ٹھٹک گئی۔

''یہ ویلس ہاؤس تمہارے حواسوں پر سوار کیوں ہو چکا ہے؟'' ایمل چمک کر بولی تھی۔ اس کے الفاظ نے ذی شاہ کو ہکا بکا کر دیا تھا۔ کس قدر تیز لڑکی تھی، اگر اپنے منہ سے اپنی عمر نہ بتاتی تو وہ اسے اٹھارہ، انیس کی تو لازمی سمجھ لیتا۔ اب بھی اپنی عمر سے زیادہ بڑی باتیں کرتی تھی۔ ذی شاہ ''اُف اُف'' کر اٹھا۔

''ایسی بات نہیں۔'' وہ گڑبڑا گیا تھا۔

''تو پھر کیسی بات ہے؟'' ایمل صاحبہ اس پر جیسے تھانیدارنی لگ گئی تھیں۔ وہ پھر سے ہڑبڑایا۔

''میں ایسے ہی انفو کے لیے پوچھ رہا ہوں۔'' اسے بہ مشکل بات کا ٹکڑا وضاحت کے لیے مل ہی گیا تھا وہ کچھ شانت ہو گیا۔

''اچھا......'' ایمل کو کچھ مایوسی ہوئی۔ یعنی صرف انفارمیشن کی ضرورت تھی مقابل کو...... اندر سے معاملہ گڑبڑ نہیں تھا۔ وہ تو اپنے بہنوئی اور بہن جیسی رومینٹک تازہ ترین لو اسٹوری کا چکر سمجھ رہی تھی...... مگر یہاں ایسا کچھ نہیں تھا، وہ سخت بدمزہ ہوئی تھی۔

''بتاؤ ناں......؟'' ذی شاہ نے بے چینی سے کہا...... وہ منکشے کے بارے میں کچھ تفصیل جاننا چاہتا تھا، اس کی فیملی اور گھربار کے متعلق...... اس کی تعلیم، خوبیاں، قابلیت...... آخر یہ لوگ کچھ نہ کچھ تو منکشے کے بارے میں جانتے ہوں گے؟ آنا جانا نہ سہی، وہ کچھ تو منکشے کے اوقات کار، مزاج، گفتار اور رہن سہن کے متعلق جانتے ہوں گے، آخر وہ ان کے سامنے تو رہتی تھی۔

اگرچہ یہ خیال ناقص ہی تھا۔ بھلا یورپ میں کون، کسی کی خبرگیری کرتا ہے مگر اسے قوی امید تھی ایمل جیسی متجسس طبیعت لڑکی ضرور دوسروں کی ٹوہ میں رہتی ہو گی...... اور اس کی توقع کے عین مطابق وہ ذرا پُرجوش، ذرا خوف زدہ اور تھوڑی سی گھبرا کر اسے رازدارانہ لہجے میں بتانے لگی تھی۔

''تم ویلس ہاؤس کی زیادہ بات مت کیا کرو، میری ممی اور بھائی کو پسند نہیں۔'' وہ صوفے کی گدازیت میں انگلیاں کھبائے آنکھیں میچے ذرا سہمے، سہمے لہجے میں بولی تھی یوں کہ ذی شاہ قدرے متحیر رہ گیا تھا۔

''مگر کیوں......؟'' وہ بھی ایمل کے سے انداز میں سرگوشیانہ بولا تھا...... تب ایمل نے بھنچی، بھنچی آواز میں گھبرا کر بتایا۔

''ویلس ہاؤس میں مرڈر ہو گیا تھا۔ تب سے میری ممی اور بھائی کو ویلس ہاؤس کا ذکر برا لگتا ہے۔'' ایمل نے بالآخر اس کے سر پر دھماکا کر ہی دیا تھا...... وہ پھٹی، پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔ تب اچانک کوئی لاؤنج کے دروازے سے اندر داخل ہوا تھا پھر کسی نے چیتے کی سی تیزی سے ایمل کی طرف جا کر اس کے منہ پر زوردار تھپڑ دے مارا تھا۔ ماحول میں زناٹے دار تھپڑ کی گونج لہرا گئی تھی۔ جیسے پورا عالم لمحے بھر کے لیے شائیں، شائیں کرنے لگا تھا۔

☆☆☆

''چٹاخ......'' ایمل کے منہ پر بڑے زور کا تھپڑ پڑا تھا۔ وہ اتنی بری طرح سے چیخی تھی کہ ذی شاہ بھی گھبرا اٹھا تھا۔ تھپڑ مارنے والی کوئی اور نہیں ایمل کی ممی تھیں جو خونخوار نظروں سے تھرتھر کانپتی، ایمل کو گھور رہی تھیں۔ آخر ہوا کیا تھا؟ انہیں اتنا غصہ کیوں آیا؟ ایمل نے اسے بتا کر کون سا گناہ کر دیا تھا؟ وہ جیسے ہکا بکا رہ گیا تھا۔

''زبان نہیں رکتی اس کی......'' آنٹی آگ بگولا ہو رہی تھیں...... ان کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ ایمل کی پتلی سی انتہائی گوری گردن دبوچ ڈالتیں یا اسے مار، مار کر لہولہان کر دیتیں...... صورتِ حال کچھ ایسی تھی کہ ذی شاہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کیسا رویہ دکھائے...... وہ خاموش رہے یا ایمل کی حمایت میں کچھ بولے۔

''وہاٹ ہیپنڈ......؟'' اس نے حیرت و بے یقینی سے کانپتی لرزتی ایمل کو دیکھتے ہوئے آنٹی سے پوچھا تھا۔ وہ ابھی تک ایمل کو گھورنے میں مصروف تھیں تبھی اس کی طرف توجہ نہیں کر سکی تھیں۔ اور ایمل ہاتھوں میں چہرہ چھپائے (اومعافی چاہتی ہوں) جیسے الفاظ بول کر شاید آنٹی کو رام کرنا چاہتی تھی...... مگر آنٹی کا غصہ کم نہیں ہو رہا تھا۔

''مجھے افسوس ہے......'' ایمل نے سر جھکا کر کہا تھا جیسے وہ ذی شاہ کو ویلس ہاؤس میں مرڈر ہو جانے کا بتا کر سخت پشیمان تھی۔ یقیناً آنٹی کا خوف اسے ہراساں کر رہا تھا۔ وہ ان کے غصے پر زیادہ گھبرا رہی تھی۔ آنٹی کا اتنا شدید ردِعمل اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ جبکہ وہ ایمل کی پشیمانی پر سخت طنزیہ انداز میں بات کر رہی تھیں گویا ان کے نزدیک ایمل کا شرمندہ ہونا محض اداکاری تھی۔

''واقعی ہے؟'' انہوں نے غضبناک تیوروں سے اسے دیکھا تھا، گویا پس پردہ کہہ رہی تھیں کیا واقعی تمہیں افسوس ہے۔ صورتِ حال بہت کشیدہ تھی، ماحول کثیف تھا، فضا اداس تھی، ذی شاہ کا دل بھی بہت بوجھل ہونے لگا تھا۔ ایمل کے آنسو اسے تکلیف دے رہے تھے، وہی عورت کے آنسو نہ دیکھ سکنے کی بیماری...... پھر ایمل تو اس کی چھوٹی سی فرینڈ تھی اور محض اس کے اصرار پر جو کچھ بتا چکی تھی اب اس کا خمیازہ بھگت رہی تھی...... وہ ہائی اسکول میں جانے والی تھی مگر آنٹی اسے بچوں کی طرح پیٹ ڈالتی تھیں، یہ عمل درست نہیں تھا، خیر پیرنٹس کو غصہ آ بھی سکتا تھا مگر یوں...... ایک جرمن ماں کا یورپین کنٹری میں اولاد پر ہاتھ اٹھانا۔ پھر اولاد کا چپ چاپ تھپڑ سہہ جانا، پولیس کی دھمکی کے بغیر یہ ایک قابلِ ستائش عمل تھا، یقیناً ایمل کی جرمن ممی نے ان بہن بھائی کی تربیت بہت بہترین کی تھی...... اور ان کا گھرانا عام یورپین فیملیز سے ہٹ کر بہت مختلف تھا۔

آنٹی نے ایمل کو اندر بھیج دیا تھا، اب وہ خود کو کچھ نارمل کرتی ذی شاہ کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔ انہوں نے اسے کھڑا دیکھ کر بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔

''ڈُو یو لائک ٹو ڈرنک سم تھنگ......؟'' وہ بھی ایمل کی طرح تھوڑی بہت انگریزی بول لیتی تھیں۔ یقیناً انہیں اب خیال آیا کہ وہ ان کا مہمان ہے، سو وہ آدابِ میزبانی کے ساتھ زیرِلب بڑبڑاتی کچن کی طرف جانے لگی تھیں جب ذی شاہ نے انہیں روک دیا تھا۔

''شکریہ آنٹی...... میں ایمل کے بنائے شیک سے لطف اندوز ہو چکا ہوں۔'' اس نے شائستگی کا مظاہرہ کیا تھا، بہرحال ایمل کی تکلیف ایک طرف، آنٹی کے احترام میں وہ کوئی کمی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اس کی دوست افراہیم کی والدہ تھیں اور ذی شاہ بھی انہیں اپنی ماں جیسا درجہ دیتا تھا۔

''آں...... کیا ایمل نے بنایا؟'' آنٹی کچن میں جھانکتی حیران ہوئی تھیں پھر اُن کے چہرے پر نرمی سی اتر آئی۔

''ایمل تھوڑی سگھڑ ہے۔ آہستہ، آہستہ ٹھیک ہو جائے گی۔'' کچھ دیر پہلے کی بدمزگی کو بھلائے انہوں نے بڑے پیار سے ذی شاہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

''تم چاہو تو ٹی وی دیکھ لو۔ یا آرام کر لو...... تب

تک میں گرما گرم پزا ایبک کرکے لے آتی ہوں، ایمل کو بھی بہت پسند ہے۔'' وہ اب بڑی حلیم ماں دکھائی دے رہی تھیں جسے بس اپنی خفا بیٹی کی ناراضی کو ختم کرنا تھا۔ اس کی پسندیدہ ڈشز بنا کر، ممتا کا یہ مٹھاس بھرا پہلو ذی شاہ کو ستائش میں مبتلا کر گیا تھا۔ وہ ٹی وی دیکھنے کا آرام کرنے کے بجائے آنٹی کے پاس کچن میں ہی کھڑا دنیا جہاں کی باتیں کرنے لگا پھر باتوں کے دوران ہی آنٹی نے خود بخود ولیس ہاؤس کا ذکر چھیڑ دیا تھا۔ حالانکہ ذی شاہ نے بہت چاہ کر بھی کسی دلچسپی یا تجسس کے تحت ایمل کو مارے جانے والے تھپڑ کا پس منظر نہیں پوچھا تھا۔ آنٹی نے خود ہی بتا دیا تھا اور دوسرے معنوں میں جیسے یہ وضاحت کرنے کی کوشش میں ذی شاہ یہ جتایا تھا کہ آئندہ اس گھر میں دوبارہ ولیس ہاؤس کا ذکر نہیں ہوگا۔

''وہ سامنے والے گھر میں مرڈر ہوا تھا...... بہت عرصے یہاں پولیس آتی رہی، ہماری بھی شامت آئی رہی، ہر دفعہ کوئی نہ کوئی آفیسر ہماری طرف بھی انویسٹی گیشن کے لیے آجاتا تھا۔ وہ گھر ہمارے لیے صرف ڈپریشن بن گیا۔ پھر پولیس نے گھر سیل کر دیا...... کچھ مہینوں بعد شاید اصل وارثوں نے معاملہ رفع دفع کیا...... گھر پر کرائے دار آنے لگے، ہاؤس فار رینٹ کی تختی لگ گئی تھی مگر کوئی بھی کرائے دار یہاں ٹکا نہیں...... آئے اور پھر چلے گئے۔ ایک سال تک یہی سلسلہ چلتا رہا پھر یہ گھر بند ہو گیا۔'' وہ پزا بنانے کی ابتدائی تیاری کرتے ہوئے خاصی مصروف نظر آرہی تھیں۔ تب پہلی مرتبہ ذی شاہ نے کچھ چونک کر ان سے سوال کیا تھا۔

''اور اب سامنے والے گھر میں کون رہتا ہے؟''

اس کے لہجے میں واضح بے چینی اور تجسس تھا، وہ اندر کی بے قراری چھپانے میں قطعاً ناکام ثابت ہو رہا تھا۔

''مجھے نہیں پتا...... شاید کوئی نیا کرائے دار یا مالک مکان میں سے کوئی ہوگا۔'' ان کا لہجہ سپاٹ سا تھا، گویا وہ جانتی بھی تھیں تب بھی سامنے والے میں دلچسپی لینا نہیں چاہتی تھیں اور نہ مزید اس گھر پر بحث کرنے کی خواہش رکھتی تھیں۔ انہوں نے ذی شاہ سے ذکر بھی اسی لیے کر دیا تھا کہ وہ تجسس نہ رکھے۔

''ہمارے گھر میں ولیس ہاؤس کا ذکر نہیں ہوتا...... افراہیم نے سختی سے منع کر رکھا ہے، دراصل ہم لوگوں نے اس مرڈر کی وجہ سے بہت پریشانی اٹھائی ہے، بہت تفتیش بھگتی ہے، ایک عرصہ ذہنی اذیت کا شکار رہے تھے...... اب اللہ کا شکر ہے ہر طرف سکون ہو گیا۔'' انہوں نے کام کے دوران ہی پائن ایپل کاٹا، اس کے ٹکڑے کیے۔ پھر آڑو اور اسٹرابیری کے پیس کر کے باؤل اور فوک ذی شاہ کو تھما دیا تھا۔ ان کے خیال میں شاید اسے بھوک لگ رہی ہوگی۔ مگر ذی شاہ کو ہرگز بھی بھوک نہیں لگ رہی تھی۔ وہ کچھ متحیر سا انہیں سن رہا تھا۔

''اور اب جو ولیس ہاؤس میں کرائے دار رہتے ہیں، آپ کی ان سے جان پہچان نہیں؟'' اس کا سوال احمقانہ قسم کا تھا، یہاں کوئی قریب ہی تڑپ، تڑپ کر مر جاتا تب بھی کسی کو خبر نہیں ہوتی تھی۔ پڑوس میں کون رہتا ہے؟ کتنے لوگ ہیں؟ کوئی ہے بھی یا نہیں؟ سال گزر جاتے مگر کسی کو پتا نہیں چلتا...... اور وہ اتنا مشرقی ٹائپ کا ایک مغربی ملک میں کھڑا ہو کر ایک مغربی خاتون سے سوال کر رہا تھا۔ یہ اس کا پاکستان تو تھا نہیں...... جہاں ایک محلے میں کوئی چھینک بھی مارتا تب آواز اور ٹوہ میں اگلی چھ گلیوں کے لوگ دیواروں سے چپک کر کھڑے ہو جاتے...... بھلا اتنی مصروف سی افراہیم کی ممی کو کیا خبر سامنے یا دائیں، بائیں کون لوگ رہتے ہیں...... اور ان کا تعلق کہاں، کہاں سے ہے؟ ایسی کھوج پاکستانی گھرانوں میں ہوتی ہے، بھلا یہاں اس کھوج کا تصور کیا جا سکتا تھا؟

''شاید کوئی لڑکی ہے دیوانی سی...... مجھے کچھ معلوم نہیں...... اور تم بھی احتیاط برتنا......'' جانے کس رو میں انہوں نے اسے بھی محتاط رہنے کا کہہ دیا تھا۔ بھلا اسے ولیس ہاؤس کے خبطی آئٹم سے کیا خدشہ ہو سکتا تھا؟ کیا خطرہ لاحق ہو سکتا تھا؟ وہ سر جھٹک کر باؤل اٹھائے باہر نکل آیا...... کچھ دیر ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر وہ بور ہونے کی وجہ سے سیڑھیاں چڑھتا اپنے کمرے میں

آ گیا تھا...... وہی خوب صورت دودھیا دیواروں والا کمرا جیسے اس کا منتظر کھڑا تھا...... بے داغ، سفید بستر، جالی کے پردے، پھولوں سے لدی ٹوکریاں اور میز پر رکھا اس کا سیمسونائٹ کیس جس کے اوپر ننھی سی سلپ پڑی تھی، وہ عجلت میں چلتا ہوا کیس کے قریب آیا تھا جس کے اوپر کاغذ کا چکنا پیس پڑا تھا۔

''ممی کو تو عادت ہے، ان کو ایسے ہی سامنے والی پر غصہ آ جاتا ہے، میں ذرا بھی ناراض نہیں...... تم کیوں چھپ کر کمرے میں بیٹھ گئے...... باہر آ جاؤ ناں...... گیم کھیلتے ہیں۔'' تحریر پڑھتے ہوئے ذی شاہ کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔ اسے ایمل کی معصومیت پر پیار سا آ گیا...... شاید وہ سمجھ رہی تھی، ذی شاہ گلٹی فیل کر رہا ہے اور یہ بات ٹھیک بھی تھی، وہ شرمسار تھا نہ سامنے والی کے بارے میں متجسس ہوتا نہ ایمل کو تھپڑ پڑتا...... خیر، سامنے والی میں کوئی تو ایسی بات تھی جو یہاں کوئی بھی اسے پسند نہیں کرتا تھا۔ یقیناً اس میں کچھ بری عادتیں ہوں گی، اس کے بوائے فرینڈز ہوں گے، سگریٹ یا شراب پیتی ہوگی؟ یا کچھ بھی جو اس معاشرے کے ناسور جیسے بد فعل میں شامل تھے، جنہیں افراہیم کی تہذیب یافتہ نیک طبیعت ممی ناپسند کرتی تھیں...... اس کے علاوہ ذی شاہ کا ذہن کچھ اور آگے جا نہیں سکا تھا۔ وہ بس یہیں تک سوچ کر رہ گیا...... اور اگر یہ سب خوبیاں منکشے میں بدرجۂ اتم موجود ہوئیں تب وہ کیا کرے گا؟ اس سوچ نے ذی شاہ کے اندر تلاطم برپا کر دیا تھا۔ دل کو جیسے کسی نے کانٹوں پر گھسیٹ دیا تھا، وہ شدتِ ضبط سے سرخ پڑنے لگا۔ ماتھے پر پسینہ اترنے لگا تھا اور دل کی حالت بہت شکستہ تھی تب جیسے اس نے ٹوٹ، ٹوٹ کر جڑتے ہوئے خود سے سوال کیا تھا۔

''میں اتنا آگے تک چلا گیا ہوں...... بھلا کیسے؟ کس طرح؟'' اس سوال نے ذی شاہ کو دم بخود کر دیا تھا۔ وہ جیسے خود سے نگاہ ملانے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔

کیا وہ اتنا سفر کر کے یہاں آنے اور علی عیسیٰ کو ڈھونڈ کر سزا دینے والا عظیم ترین مقصد بھول گیا تھا؟ یقیناً ایسا نہیں تھا۔ وہ یہ مقصد کیسے بھول سکتا تھا؟ ہاں، بس زندگی کی رہ گزر پر چلتے، چلتے اسے اپنا گوہرِ مقصود بھی جیسے مل گیا تھا اور اب منکشے کے علاوہ کوئی نگاہ میں جچ جاتی یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ یہ دل تھا، کوئی دغا باز کرائے کا گھر اور کرائے دار تو تھا نہیں...... نہ مکین بدل سکتا تھا نہ مکان......

وہ تو اس پاگل، پاگل لڑکی کو یہ تک نہیں کہہ سکا تھا، تم آئی، تم نے دیکھا اور مجھ ذی شاہ کو فتح کر لیا...... کیسی فاتح عالم ہو...... تم...... بغیر کوشش اور جتن کیے فتح کر لیتی ہو...... مگر کیا اس خبطی، خبطی لڑکی نے کوشش نہیں کی تھی؟

سفید جالی دار مہین پردے کو دیکھتے ہوئے وہ چلتا، چلتا گلاس ونڈو میں آ کھڑا ہوا تھا...... سلائڈ ہٹائے بغیر اس نے ولیس ہاؤس کی عمارت کو دیکھا تھا۔ منکشے سامنے کہیں نہیں تھی اور اس کے بغیر جیسے ہر حسین منظر ادھورا تھا۔ کوئی بھی چیز قابلِ توجہ نہیں تھی۔ کچھ بھی نظر کو بھانے والا نہیں تھا...... کسی منظر میں اداس کونج کے حسن جیسا سحر نہیں تھا۔ رِستے خون آلود پیروالی اجنبی سی لڑکی ذی شاہ کے دل پر کیسا وار کر گئی تھی؟ یہ کون سا میٹھا درد جگا گئی تھی۔ وہ بے بس سا بستر پر ڈھے گیا تھا۔

جانے پھر کتنا وقت گزر گیا تھا، کمرے میں آہٹ ہوئی تو وہ چونکا تھا۔ افراہیم کی ممی اسے بلانے کے لیے، نیچے آنے کا کہہ کر واپس چلی گئی تھیں۔ لنچ یقیناً تیار تھا مگر اسے اتنی بھوک نہیں تھی پھر بھی اخلاقاً نیچے چلا آیا، کھانے کی میز پر ایمل سے سامنا ہو ہی گیا تھا۔ وہ بڑی خوش باش سی بیٹھی تھی، کمرے میں گرما گرم پزا کی مہک پھیلی ہوئی تھی اور وہ محترمہ دانت نکال، نکال کر پزا کے بڑے، بڑے ٹکڑے املی کی چٹنی میں بھگو، بھگو کر کھا رہی تھی، کچھ دیر پہلے والا غصہ ناراضی اور خفگی کا نام ونشان بھی نہیں تھا۔ بچوں کی ناراضی، خفگی اور غصے کی مدت بس اتنی سی ہوتی ہے؟ ذرا سے لاڈ، پیار اور پچکار سے پہلے کی طرح سب بھلا کر ہشاش بشاش ہو جاتے ہیں، بچے جو من کے سچے ہوتے ہیں...... نیت کے صاف، من کے

صاف، مخلص اور ایماندار...... وہ پزا سے لطف اندوز ہوتا مسلسل ایمل کے بارے میں سوچ رہا تھا جو ممی، ممی کرتی کچھ زیادہ ہی لاڈ کے موڈ میں نظر آ رہی تھی، کچھ دیر بعد وہ اس کے کان میں دوبارہ گھس گئی تھی۔

"وہ خبطی آئنٹم روڈ پر بیٹھا تھا۔" ایمل نے جیسے اس کی معلومات میں اضافہ کیا تھا...... وہ افراہیم کی طرح منکشے کو خبطی آئنٹم ہی کہتی تھی جانے اس نے کب افراہیم کو خبطی آئنٹم کہتے سن لیا تھا۔ اب منکشے کے بارے میں سن کر وہ قدرے چونک گیا تھا۔ یہ ایمل بھلا کیا کہہ رہی تھی؟

"وہ روڈ پر کیوں بیٹھی تھی؟" اس نے فورک میں پھنسایا پزا واپس پلیٹ میں رکھ دیا تھا، کھانے سے جی ایک دم اچاٹ ہوگیا۔

"یہ تو پتا نہیں...... اس کی عادت ہے سڑک کے چکر کاٹنا......" ایمل نے کندھے اچکا کر جواب دیا تھا۔

وہ لمحے بھر کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔

"وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوگی؟" ذی شاہ متفکر سا خود کلامی کر رہا تھا۔ وہ اتنے گھنٹوں سے لاپتا تھی۔ یعنی کہیں بھی آس پاس نظر نہیں آ رہی تھی، وہ یہی سمجھ رہا تھا، اس کے پیر کا زخم اسے باہر آنے نہیں دے رہا تھا مگر اب ایمل بتا رہی تھی اس نے منکشے کو روڈ پر بیٹھا دیکھا تھا۔ جانے وہ روڈ پر کیوں آئی تھی؟ اس کے پیر کا زخم کیسا تھا؟ وہ بے قرار سا ہوگیا۔ ایک دم دل میں خواہش ابھری تھی کہ وہ ساری احتیاطیں بھلائے بھاگ کر روڈ کراس کرے اور سامنے والے ویس ہاؤس کا دروازہ بجا ڈالے، وہ منکشے کی خیریت جاننا چاہتا تھا۔ وہ اسے روڈ پر بیٹھی نظر کیوں نہیں آئی تھی؟ حالانکہ اس نے کئی مرتبہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے جھانکا تھا مگر وہ اسے کہیں بھی نظر نہیں آئی تھی جبکہ ایمل کو وہ دکھائی دی تھی۔

"اس کے پیر پہ بینڈ یج تھی، وہ زمین پر رینگ کے چل رہی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے ترس آیا۔" ایمل نے پلیٹ میں رکھا پزا ختم کر دیا تھا، اب وہ اسپون کے ساتھ سوپ کے انداز میں املی کی چٹنی کھا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر تاسف تھا۔

"اگر ممی مجھے تھپڑ نہ مارتیں یا افراہیم کا ڈر نہ ہوتا تب میں اس کو روڈ تو لازمی کراس کروا دیتی۔ وہ قابلِ رحم حالت میں کسی کیڑے کے مانند زمین پر رینگ رہی تھی۔ اس کے پیر کا زخم اسے کھڑا ہونے نہیں دے رہا تھا۔" ایمل نے کچھ جذباتی سے انداز میں کہا تھا پھر وہ نیپکن سے منہ صاف کر کے گیم کھیلنے چلی گئی تھی۔ جانے سے پہلے اس نے ذی شاہ کو بھی گیم کھیلنے کی دعوت دی تھی مگر اس نے انکار کر دیا تھا۔ اس کا دل جیسے ہر چیز سے ایک دم اچاٹ ہوگیا۔

"کیا وہ اتنی بے بسی کی حالت میں ہے؟ اور میں اسے دیکھ بھی نہیں سکتا؟" اس کے ذہن میں آنے والی بس آخری سوچ یہی تھی۔

☆☆☆

کمرے میں لیپ ٹاپ کی روشنی کے علاوہ مکمل اندھیرا تھا۔ اور اس اندھیرے میں دروازے پر لگا چمکیلا کارڈ جس پر ویلکم مین اِن مَن ہائیم لکھا چمک رہا تھا۔ اس چمکیلے کارڈ کو بنانے والی خاتون سے ابھی اس کی ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ ویسے بھی اسے غیر متعلقہ لوگوں سے ملاقات کا کوئی شوق بھی نہیں تھا۔ بس افراہیم کی فیملی کے حوالے سے یہ سب اس کے لیے قابلِ محترم تھے۔

وہ ابھی کچھ دیر پہلے بندیا اور شامی سے بات کر رہا تھا۔ بندیا نے اسے بتایا تھا آج عینی اپنے نئے گھر کی آرائش وزیبائش کے بعد پارٹی دے رہی تھی جس میں انہیں نہیں بلایا گیا تھا۔ ممی کو اس بات کا بہت دکھ تھا جبکہ بندیا نے بانگِ دہل اعلان کر دیا تھا کہ عینی انہیں بلاتی بھی تب بھی وہ ممی کو ہرگز نہ جانے دیتے۔ شامی کو ذیشان کی بے حسی پر بہت تاؤ آ رہا تھا۔ تاہم ذی شاہ کے سمجھانے بجھانے پر وہ نرم ہونے لگا۔ وہ لوگ خود بھی ذیشان سے تعلقات بحال رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ ہمیشہ کسی نہ کسی نازک موڑ پر انہیں چھوڑ کر چلا جاتا۔ یہ اس کی آخری اعلیٰ ترین خود غرضی کی مثال نہیں تھی۔ اس سے پہلے بھی وہ بہت عظیم مثالیں قائم کر چکا تھا......

اب نئے سرے سے بھلا کیا کڑھنا......؟

ذی شاہ کا پہلے سے بوجھل دل کچھ اور ڈوب گیا تھا۔ اس نے لیپ ٹاپ بند کر دیا اور خود کھڑکی کی سلائڈ ہٹا کر باہر جھانکنے لگا۔ مَن ہائیم اندھیرے میں ڈوب چکا تھا۔ رات کی رانی کا سحر طاری تھا ماحول پر مہیب سناٹا، فضا میں دور جنگل کے جانوروں کی آہ و بکا جبکہ ہوا میں کچھ تندی تھی، درخت بڑے زور، زور سے ہل رہے تھے، سامنے ویس ہاؤس کی عمارت اندھیرے میں ڈوبی تھی۔ بس ایک کمرے کی لائٹ آن تھی۔ نچلی منزل کا کارنر والا کمرا جس کی کھڑکی کے سامنے ایک طرف جرمنی کے کلچر کو ابھارتا سفید جالی دار نائیلون کا مہین پردہ پڑا تھا اور دوسری طرف گاڑھی سلک کا پھولدار پردہ لٹک رہا تھا۔ جالی دار پردے سے کمرے کا کچھ منظر نظر آتا تھا، ایک سنگل بیڈ، جس کی شیٹ سلوٹ زدہ ضرور ہوگی۔ کیونکہ شیٹ میں بھی بے ترتیبی نمایاں تھی۔ شاید فرش پر لٹک رہی تھی، باقی کمرے کی کیا حالت ہوگی؟ اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا...... سامنے ہی ایک اسٹول نما اونچی میز پر گندے برتن رکھے تھے۔ کچھ مگ، پیالیاں، چمچے اور گندی پلیٹیں...... اس کے پاس کوئی دوربین نہیں تھی۔ وہ ایمل سے مانگ بھی سکتا تھا مگر اسے دوربین کی ضرورت نہیں تھی۔ کارنر والا کمرا سڑک کے دوسرے کنارے پر تھا، فاصلہ زیادہ تھا نہ کم تھا۔ تاہم اس سے وہ بہ آسانی کھڑکی کے اندر کا نظارہ کر سکتا تھا۔ آج سے پہلے اس کمرے کی لائٹ آن نظر نہیں آتی تھی۔ کمرا اندھیرے میں ڈوبا رہتا۔ کمرے کی مکین نے آج ہی تمام لائٹس روشن کی تھیں۔ وہ بہت دیر وہیں کھڑا رہا تھا مگر کوئی چہل پہل ہوتی نظر نہیں آ رہی تھی، تنگ آ کر اس نے پردے برابر کر دیے تھے، سلائڈ گرا دی تھی۔ پھر وہ بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ کمرے کا شفاف خوابناک اور آرام دہ ماحول اتنا پُرسکون کر دینے والا تھا کہ فوراً ہی نیند آنکھوں میں رچنے لگی تھی مگر فی الحال وہ سونا نہیں چاہتا تھا، بس علی عیسیٰ کو سوچنا چاہتا تھا، ہاتھوں کو سر کی پچھلی طرف

باندھے وہ کراؤن سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ آنکھوں کی پتلیوں میں علی عیسیٰ کے کئی طرح اور کئی رنگ کے عکس ابھر رہے تھے۔ وہ اپنے ذہن میں ڈیڈی کے تعریفی الفاظ کے پیشِ نظر ایک خاکہ تشکیل دے رہا تھا۔ جس طرح ڈیڈی، علی عیسیٰ کی تعریف کرتے تھے، اس بات سے تصدیق ہو جاتی تھی کہ یقیناً وہ بہت خوب صورت، چارمنگ اور ذہین جوان تھا۔ اب اتنی حسین سرزمین کے چپے، چپے پر پھیلے حسن میں وہ علی عیسیٰ کو کیسے تلاشتا...... یہاں تو ہر دوسرا بندہ اس نے صحت مند، خوب صورت اور خوش پوشاک دیکھا تھا۔ محض خوب صورتی کو بنیاد بنا کر علی عیسیٰ کو ڈھونڈنا آسان نہیں تھا۔ اسے کوئی تصویر چاہیے تھی، کوئی ویڈیو، کوئی موری تاکہ وہ اپنا اگلا قدم احتیاط سے اٹھا لیتا۔ مالا نے اسے کوئی ٹھوس ایڈریس نہیں سمجھایا تھا ورنہ اب تک وہ علی عیسیٰ کے گھر پہنچ چکا ہوتا...... محض مفروضوں کی بنیاد پر وہ کہاں تک کامیابی پا سکتا تھا؟ اسے افراہیم کے گھر میں اس بیڈ روم کے آرام دہ بستر پر لیٹ کر اندازہ ہو رہا تھا۔ وہ اپنی سوچوں میں جانے کہاں تک آگے نکل جاتا؟ گر جو دروازے پر ہونے والی ہلکی سی دستک اسے اپنی طرف متوجہ نہ کر لیتی۔ ذی شاہ نے سرعت سے اٹھ کر دروازہ کھولا تھا۔ سامنے افراہیم کھڑا تھا۔ جو مسکراتا ہوا اندر آ رہا تھا۔

"تم ابھی تک سوئے نہیں؟" افراہیم نے ہاتھ میں دو مگ پکڑ رکھے تھے۔ یقیناً وہ ایک لمبی نشست کے لیے آیا تھا، ذی شاہ نے نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں تو......" وہ اس کے ہاتھ سے کافی کا مگ پکڑ چکا تھا۔

"یہ تو اچھی بات ہے...... ورنہ میں خیال کر رہا تھا کہ تم سو نہ گئے ہو......" افراہیم صوفے پر جم کر بیٹھ گیا تھا۔ تب ذی شاہ نے غور کیا تھا اس نے ہاتھ میں ایک فائل بھی پکڑ رکھی تھی۔

"یار مجھے افسوس ہے، تمہیں وقت نہیں دے سکا۔ اتنی ٹف روٹین ہے کہ حد نہیں۔ موئے سارا خون نچوڑ کر

گھر بھیجتے ہیں، انگ، انگ دکھ رہا ہوتا ہے۔'' افراہیم اپنی جاب سے نالاں دوست سے بھی کچھ پشیمان تھا۔ وہ اسے وقت نہیں دے پا رہا تھا۔ نہ کہیں تفریح کے لیے جا پایا تھا۔ تبھی اسے بہت شرمندگی تھی۔ ذی شاہ سمجھتا تھا اسی لیے نارمل انداز میں سنجیدگی سے بولا۔

''آئی نو یار...... تم کیوں گلٹی فیل کرتے ہو...... میں تمہاری مجبوری سمجھتا ہوں۔'' وہ ہولے سے مسکرایا بھی تھا۔ اس کی مسکراہٹ نے افراہیم کو کچھ مطمئن کر دیا تھا۔ اور وہ نیکسٹ ویک اینڈ تک اپنی ساری مصروفیات کو ایک طرف رکھ کر ذی شاہ کو گھمانے کا کوئی پروگرام ترتیب دینا چاہتا تھا۔

''ہم سونتاگ (سنڈے) کو ہائیڈل برگ جائیں گے، وہاں کا تاریخی قلعہ اور جرمنی کی قدیم ترین یونیورسٹی دیکھیں گے، جرمنی اتنا سرسبز ہے جیسے تمہارا سوات اور کاغان...... پورے جرمنی کا سحر دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے، تم جرمنی کے حسن میں ایسے پھنسو گے کہ کبھی نکل نہ پاؤ گے۔ چاہے عمریں گزریں یا صدیاں......'' افراہیم گھونٹ، گھونٹ کافی چڑھاتا اپنے جرمنی کی شان میں قصیدے پڑھ رہا تھا۔ تب ذی شاہ لمحے بھر کے لیے اس کی بات سن کر بھونچکا رہ گیا۔

''آہ...... پھنس تو میں گیا...... کہاں گئے میرے بودے دعوے...... میں یہاں کے سحر میں مبتلا ہونے تو نہیں آیا...... اور اب پور، پور۔ گوڈے، گوڈے ڈوب چکا ہوں...... اگر افراہیم کو پتا چلے کہ وہ خبطی آئٹم میرے حواسوں پر سوار ہو چکا ہے تب یہ میرا ریکارڈ لگا دے گا۔'' ذی شاہ نے عجیب بے چارگی کے عالم میں سوچا تھا۔ جیسے اپنی بےبسی پر خود سے بھی خفا ہونے لگا تھا۔ اِدھر افراہیم جرمنی کی شان میں کلمات بول کر اب فائل کھولے اس کے حواس ٹھکانے پر لے آیا تھا۔ اس نے بات ہی کچھ ایسی کی تھی جو ذی شاہ سارا نشہ سارا عشق بھلائے اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

''تو کیا ہو گیا میرا کام......؟'' ذی شاہ نے بے تابی سے پوچھا تھا تب افراہیم نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔

''سو فیصد...... یہ رہا ہیرلخ کا ایڈریس...... بڑی اچھی ساکھ رکھنے والی کمپنی ہے، مجھے خوشی ہے کہ اس کمپنی کی طرف سے تمہیں شراکت داری کا دعوتی خط ملا...... اس کے علاوہ یہاں کے نائب مالکان میں میرا بہنوئی بھی شامل ہے۔ وہ کمپنی کا منیجنگ ڈائریکٹر ہے۔ تمہیں قطعاً پرابلم نہ ہوگی...... میں خود تمہیں ہیرلخ چھوڑ کر آؤں گا۔'' افراہیم نے مسکراتے ہوئے تمام پروگرام خود ہی ترتیب دے لیا تھا تب ذی شاہ قدرے چونک گیا۔ وہ افراہیم کو اپنے معاملات میں گھسا کر کسی مصیبت کا شکار کرنا نہیں چاہتا تھا...... پھر افراہیم جانتا بھی نہیں تھا کہ وہ یہاں صرف بزنس کرنے نہیں آیا۔ بلکہ کوئی پرانے حساب چکانے آیا ہے سو وہ کبھی نہیں چاہتا تھا افراہیم اس کے پلان کو جان جائے۔ اس نے خود ہی افراہیم کو منع کر دیا۔

''شکریہ دوست......! ہیرلخ تک پہنچنا اب مشکل نہیں رہا۔ تم نے میری بہت ہیلپ کی، میرے لیے یہی کافی ہے۔'' اس نے خلوصِ دل کے ساتھ افراہیم کا شکریہ ادا کیا تھا جس پر وہ فوراً برا مان گیا۔

''اب میرا موڈ خراب مت کرو۔'' افراہیم نے خفگی سے کہا تھا تب وہ معذرت کرتا اسے پھر سے ناراض کر گیا۔ حالانکہ اس نے بات کا آغاز تو ڈرتے، ڈرتے ہی کیا تھا۔

''یار......! اب میرے لیے کوئی کرائے کا کمرا فلیٹ یا کوئی ہوٹل بھی بتا دو، میں اتنے دن بلکہ مہینوں کے لیے تمہارا مہمان بن کر ان ایزی فیل کروں گا۔'' اس نے بڑی لجاجت سے التجا کی تھی مگر اس کی توقع کے عین مطابق وہ برا مان گیا تھا۔

''اب بکواس کی تو اس کھڑکی سے اٹھا کر باہر پھینک دوں گا۔'' افراہیم کے تیور بگڑ گئے تھے۔ وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

''یار...... پھر بھی۔'' ذی شاہ منمنایا۔

''رہن دے، کُٹ کھائے گا میرے سے۔'' افراہیم کی دھمکی پر وہ چپ سا کر گیا۔ حالانکہ وہ اب

مزید یہاں نہیں رہنا چاہتا تھا مگر افراہیم اور اس کی ممی نے اسے ہرگز بھی رینٹ پہ جانے نہیں دینا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کچھ دن بعد پھر سے یہ ذکر چھیڑ کر آنٹی کو منائے گا۔ افراہیم کے ماننے کی توقع اسے نہیں تھی۔ یہی سوچ کر وہ تھوڑا مطمئن ہو گیا تھا پھر افراہیم نے جاتے ہوئے اسے یاد دہانی کروائی تھی۔

''7:30 پر تیار رہنا...... ہم ایک ساتھ دفتر کے لیے نکلیں گے۔'' وہ اسے ''گوتے ناخت'' (شام سے رات تک کا سلام) بول کر باہر نکل گیا تھا جبکہ ذی شاہ گہری سانس کھینچتا بستر پر ڈھے گیا۔ اس کا ذہن اب ہیرلخ کے اردگرد چکر کھا رہا تھا۔

اگلی صبح جگمگاتے واش روم میں نہا کر تازہ دم ہونے کے بعد اس نے پرفیوم کی بوتل اٹھائی اور غیر ارادی طور پر چھوٹے، چھوٹے قدم اٹھاتا کھڑکی کے پاس آ گیا تھا۔ سفید جالی دار نائیلون کے مہین پردے کی ڈوری کھینچ کر اس نے باہر بکھری صبح کی نوخیز سپیدی کو دیکھا تھا۔ نورِ صبح کا عالم ہی کچھ اور تھا...... پرندوں کی خوش الحانی، آلپس کی سحر طرازی، پھولوں کی گنگناہٹ، تتلیوں کا رقص اور راج ہنسوں کی قلقاریاں...... جیسے پورا عالم ثنائے الٰہی میں مشغول تھا۔ وہ لمحے بھر کے لیے دم بخود ہو گیا۔ دور کوہستانِ آلپس کا ملگجا سا دھندلا پہاڑی سلسلہ نظر آ رہا تھا۔ جیسے نوکیلی پہاڑیوں پر سفید گھاس پگھل رہی تھی اور دور کہیں دریائے نیکر سوگوار تاثرات کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ نیکر کے شفاف پانیوں میں ابھرتی، ڈوبتی، غم کھاتی، پچھاڑتی اور دھاڑیں مارتی یہ کہانی کس کی تھی؟

من ہائیم کے علی عیسٰی کی یا پھولوں، کلیوں اور خوشبوؤں سے معطر، بھیگی، مدہوش مالا کی؟

پاکستان سے آنے والے مغرور چہرے، اکھڑ تاثرات اور کٹیلی پُرغرور آنکھوں والے ذی شاہ کی یا پھر سڑکوں پہ دیوانہ وار بہتے پیروں کے ساتھ مدہوش انداز میں چلتی اس اداس کونج کی؟ جو کسی انجان لمحے میں اپنی ڈار سے بچھڑ کر اب بھٹک رہی تھی۔

نیکر کے شفاف پانیوں پر جانے کس، کس کی کہانی بہہ رہی تھی۔ اور وہ کون جی دار آدم زاد تھا جو نیکر کی گہرائیوں میں نڈر ہو کر اتر جاتا اور علی عیسٰی کی مالا کے دورِ عروج کا صفحہ، صفحہ گیلے پانیوں سے نکال لاتا؟ آخر کون ایسا جی دار تھا جو نیکر کے پانیوں میں بے جھجک چھلانگ مار دیتا؟ آخر کون تھا جو مالا علی عیسٰی کی زندگی کے وہ چھ حسین ترین اور...... بدترین مہینے نیکر کی گہرائیوں سے نکال لاتا؟

سفید نائیلون کا جالی دار پردہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ ذی شاہ کے دل پر جیسے اداسیوں کی اوس گرنے لگی تھی۔

''کیا وہ کبھی علی عیسٰی تک پہنچ پائے گا؟'' کئی طرح کے سوالیہ نشان تھے۔ اور ہر طرح کی سوچیں تھیں...... اس کا ذہن ریشم کی گانٹھ بن گیا تھا۔ اتنے الجھاوے تھے اور سلجھتا کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ جس چیز کو سوچتا، وہ اتنی ہی کٹھن، مشکل اور ناممکن لگتی تھی۔ بے خیالی میں پرفیوم اسپرے کر کے وہ نیچے چلا آیا تھا، آنٹی سامنے کہیں نہیں تھیں۔ ان کا بیڈ روم بند تھا۔ ذی شاہ کو کچن میں سے ایمل کے زور، زور سے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔

''ہائی اسکول میں چھٹیاں ہیں...... اب میں کیا کروں؟ ممی تو آئے دن لاڈلی بیٹی کے گھر بھاگ جاتی ہیں، مجھے اتنا بور ہونا پڑتا ہے، ایک اتنا اچھا فرینڈ ملا تھا۔ جسے تم دفتر اپنے ساتھ لے جاؤ گے، میں پیچھے کیا کروں گی؟'' ایمل بچوں کی طرح ٹھنکتی بہت غصے میں نظر آ رہی تھی۔ موضوعِ گفتگو ذی شاہ کی ذات تھی، وہ گلا کھنکھارتا اندر آ گیا۔ اسے دیکھ کر ایمل کا منہ اور بھی اتر گیا تھا۔

''بن ٹھن کر آ چکے ہو...... اب صبح کے گئے منہ اٹھا کر رات کو آ جانا افراہیم کی طرح۔'' وہ بھنا، بھنا کر ٹوسٹر سے سلائس نکال رہی تھی۔ افراہیم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی جسے وہ کمالِ مہارت سے چھپا گیا تھا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں افراہیم سے معاملہ پوچھا تھا جس کی وضاحت وہ محترمہ خود ہی کر رہی تھی۔

''ذی یہاں پہ فارغ رہنے نہیں آیا۔ نہ تمہاری بوریت دور کرنے آیا ہے، اس کا یہاں کام ہے، وہ

کاروبار کرنے آیا ہے۔'' افراہیم نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔ وہ بہت زچ لگ رہا تھا۔ ایمل یقیناً بہت دیر سے بحث کررہی تھی۔

''میں کچھ نہیں جانتی، تم سارے لوگ ہی بڑے مصروف ہو، ایک میرا ہی وجود فارغ ہے۔'' اس نے جل بھن کر بالآخر ناشتے کی ٹیبل سجا دی تھی۔ افراہیم نے اسٹول کی طرف اشارہ کرکے ذی شاہ سے کہا۔

''اس کی تو عادت ہے، تم بیٹھ کے ناشتا کرو۔''

''آنٹی کہاں ہیں؟'' ذی شاہ نے آنٹی کو نہ پاکر پوچھا کیونکہ وہ ان دو تین دنوں میں اچھی طرح جان گیا تھا۔ آنٹی کو افریشم کے گھر جاتا دیکھ کر ایمل اسی طرح... جارحانہ تیور لیے سب پہ غصہ اتارتی تھی، ایک تو اسے کام کرنا پڑتا تھا، دوسرے اکیلے رہنا پڑتا۔ پھر آنٹی اسے افریشم کے گھر بھی نہیں لے کر جاتی تھیں۔ اس بات پہ اسے زیادہ غصہ آتا تھا۔

''افریشم کی طرف گئی ہیں، اس کی طبیعت ٹھیک نہیں یار...... ! ایمل بچی ہے، سمجھتی نہیں۔'' افراہیم نے سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔

''اور اس کا شوہر؟'' اس نے ایسے ہی بات برائے بات پوچھا تھا۔ کوئی خاص قسم کی ٹوہ یا تجسس نہیں تھا۔

''بتایا تو ہے...... وہ ایک بہت بڑی کمپنی کا ایم ڈی ہے...... وہی ہیرلخ کمپنی کا...... تمہاری ملاقات ہوگی اس سے، بہت نائس بندہ ہے...... میں نے اپنا ریفرنس نہیں دیا تم نے سختی سے منع جو کررکھا ہے۔ ورنہ وہ خود یہاں آکر تم سے مل لیتا۔'' افراہیم اپنے بہنوئی کا بہت محبت سے ذکر کررہا تھا۔ اس کے لہجے میں اپنے بہنوئی کے لیے واضح احترام تھا۔ اس کے دل میں جیسے ٹیس سی اٹھی تھی۔ اسی من ہائیم میں ذی شاہ کا بہنوئی بھی موجود تھا۔ اس کی بہن کا مجرم...... اس کی بہن کی خوشیوں کا قاتل...... وہ علی عیسٰی کے بارے میں سوچتا تو اس کا خون کھول اٹھتا تھا۔ جیسے اب بھی گرما گرم خون رگوں میں جوش کھانے لگا تھا۔

جانے کیسے اس نے خود پر کنٹرول رکھا تھا پھر افراہیم کے اٹھتے ہی وہ خود بھی اسٹول چھوڑ گیا تھا۔ اس کی بھوک، پیاس مٹ سی گئی تھی۔ وہ کچن سے باہر نکلا تو ایمل کی آواز سنائی دی تھی۔ ایمل جیسے خود کلامی کررہی تھی۔

''بھائی صاحب تو بیگم کی پٹی سے لگے بیٹھے ہیں، اللہ کرے، میری بہن جلدی سے ٹھیک ہوجائے۔ میری بہن اتنی حسین ہے، اتنی...... اتنی...... اور اتنی۔'' وہ بازوؤں کو پھیلا کر فرطِ محبت سے بولی تھی۔ ذی شاہ سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔ وہ ایمل کے دھوپ چھاؤں جیسے رویے کا اب عادی ہوچکا تھا۔ پل میں روتی، پل میں ہنستی، کبھی بنتی کبھی بگڑتی، وہ خوب موڈی لڑکی تھی۔ اپنے مزاج کے تابع رہتی...... بالکل بندیا کی طرح۔

☆☆☆

افراہیم کی lexus شفاف چوڑی اور انتہائی شاندار سڑک پر بھاگ رہی تھی۔ یہ ایک معروف ترین شاہراہ تھی۔ اردگرد اسٹور، بڑی، بڑی عمارتیں جن میں بینک، پلازے، سرکاری دفاتر وغیرہ شامل تھے۔ انھی میں ایک ہیرلخ فرم بھی انتہائی شاندار، بلند اور عظیم...... افراہیم نے اسے ہیرلخ کا اردو ترجمہ کرکے بتایا تھا جس کے معنی تھے عظیم الشان...... وہ حقیقتاً glorious یعنی عظیم الشان تھی۔ ڈوئچ لینڈ (جرمنی) میں ایسی عمارتوں کا کال نہیں تھا...... مگر اس نے حیرانی یوں محسوس کی تھی کہ دراصل وہ ہیرلخ کا انتخاب اس وجہ سے کرسکا تھا کیونکہ اس فرم کا اونر ایک مسلم تھا۔ دوسرے اونرز کے نام میں علی عیسٰی کا نام بھی شامل تھا۔ یہ سب معلومات اس نے پاکستان میں ہی لے لی تھیں اگرچہ علی عیسٰی کے نام سے من ہائیم کے کئی کاروباری اداروں کے اونرز کی فہرست سامنے آگئی تھی۔ مگر جانے اس کا دل ہیرلخ پہ کیوں آکر رک سا گیا تھا۔ اب اسے کتنے فیصد کامیابی ہوسکتی تھی؟ یا پھر وہ اپنے مطلوبہ مقام تک پہنچا بھی تھا یا نہیں، یہ صرف وقت بتا سکتا تھا۔

اس کی خواہش کے مطابق افراہیم اسے بلڈنگ کے داخلی دروازے تک چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ ویسے بھی وہ

اپنے دفتر سے لیٹ ہورہا تھا۔ اسے نیک تمناؤں سے رخصت کرتا وہ چلا گیا تب ذی شاہ دھڑکتے دل کے ساتھ گلاس ڈور کھولتا اندر آگیا...... ایک وسیع وعریض چمکتے، دمکتے ہال میں، جس کے ایک طرف ریسپشن تھا...... گراؤنڈ فلور پہ بے شمار دفاتر تھے، جس میں سوٹڈ بوٹڈ لوگ انتہائی مصروف نظر آرہے تھے۔ اپنے، اپنے کام میں مگن زیادہ لوگ مغربی تھے۔ اسے ارکانِ کمپنی کے دفتر جانا تھا۔ بورٹ آفس کا پوچھ کر وہ بذریعہ لفٹ دوسری اور پھر تیسری منزل پر آگیا تھا۔ تھرڈ فلور پر برٹش، آسٹرین، آسٹریلین ورکرز کے کیبن تھے۔ اسے فورتھ فلور پہ جانا پڑا...... ابھی آگے اور نہ جانے کتنے جہان باقی تھے۔

وہ کچھ، کچھ ستائشی نظروں سے اردگرد دیکھ رہا تھا۔ پاکستان میں ڈیڈی کی فرم کے دفاتر بھی اچھے تھے اور بلڈنگ بھی کمال کی تھی مگر اس کا ہیرلخ سے مقابلہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ وہ اس فرم کو ایمل کی زبان میں ڈائسنٹ (اٹریکٹو) کہہ سکتا تھا۔ بنا شور، آہٹ اور آوازیں نکالے بیاستے، منیجر، آفیسرز اپنے، اپنے کام میں مصروف تھے۔ کوئی بھی ایک دوسرے کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ یہ تھا ترقی یافتہ ملک کا ایک کاروباری ادارہ...... مالکان کی غیر موجودگی میں بھی تندہی سے کام جاری تھا۔ کہیں بھی کیمرے فٹ نہیں تھے۔ روک ٹوک، جھڑکیاں، بدنظمی یا ہنگامہ نہیں تھا۔

ریسپشن سے معلومات لے کر وہ ایم ڈی کے آپٹیل (آفس) تک پہنچ ہی گیا تھا۔ یہ تھا منیجنگ ڈائریکٹر کا دفتر...... افراہیم کے بہنوئی کا آفس...... اسے کچھ دیر کے لیے ویٹنگ روم میں بیٹھنا پڑا تھا۔ ایم ڈی فی الحال اپنے دفتر میں نہیں تھا، اسے ہنگامی طور پر باہر جانا پڑ گیا تھا۔ یورپ میں ہر کام وقت پر قاعدے اور اصول کے مطابق ہوتا ہے۔ وہ دس منٹ جلدی پہنچ گیا تھا، سو اسے دس منٹ تک انتظار کرنا پڑا۔ ایم ڈی اپنے مقررہ وقت پر آفس پہنچ گیا۔

ذی شاہ کو اندر جانے کے لیے کہا گیا تھا۔ جب وہ انتہائی شاندار اور پُرآسائش خوابناک آفس میں پہنچا تب اس کا استقبال تین لوگوں نے کیا تھا۔ ان میں سے افراہیم کا بہنوئی کون تھا؟ شاید مرکزی کرسی پر بیٹھا ہوا انتہائی وجیہہ سا بندہ افراہیم کا بہنوئی تھا۔ باقی دو لوگ انگریز تھے جو یقیناً افراہیم کے بہنوئی نہیں ہوسکتے تھے۔ ذی شاہ بس اسی جوان کو دیکھ رہا تھا۔ جس نے اپنی سحر طراز آنکھوں پر گلاسز لگا رکھے تھے۔ وہ بلاشبہ بہت خوب صورت جوان تھا۔ خوش پوشاک مگر بلا کا سنجیدہ...... اتنی خطرناک سنجیدگی کی ذی شاہ کو امید نہیں تھی۔ اس نے ذرا بھی نرمی، حلاوت یا جوش کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ وہ کسی روبوٹ کی طرح اس سے بات کرتا رہا۔ یہ ایک غیررسمی میٹنگ تھی۔ باقاعدہ معاہدے کے تحت وکیلوں کی موجودگی میں حلفیہ بیان دیے گئے تھے۔ ایگری منٹ سائن ہوا۔ اس نے شیئرز کی رقم کمپنی کے ذاتی اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروادی تھی۔ ایم ڈی خاصا محتاط تھا یقیناً مرکزی کرسی پر بیٹھ کر اتنا ہی محتاط ہونا پڑتا تھا۔ وہ خود بھی ایک بزنس مین تھا اور کاروباری پیچیدگیوں کو سمجھتا تھا۔

اسے ایکسچینج بیورو اور ایکسچینج ریٹ کے متعلق ابتدائی انفارمیشن دے دی گئی تھی۔ ایم ڈی اپنے رولز کی وضاحت کررہا تھا۔ اسے فیبرک کے بارے میں بھی بتایا گیا تھا۔ فیکٹری کس ایریا میں تھی، اسے یہ بھی بتایا گیا، وہ سائٹ پہ جاسکتا تھا۔ اس کے لیے مسٹر وان کی خدمات لینا تھی۔ کاروباری ماحول میں بات چیت مکمل ہورہی تھی۔ ڈوئچ ایم ڈی بڑی رواں انگریزی میں اپنا نقطۂ نظر واضح کررہا تھا۔

اسے ایرلا وپ نیس (licence) اور انشورنس کے لیے کیا کرنا تھا؟ اگلے دومنٹ میں بتادیا گیا تھا۔ اپنے ''پاس'' کی ایک کاپی ذی شاہ نے ڈاکومنٹس کے ساتھ جمع کروادی تھی۔ اب نیکسٹ اسٹیپ اس کی پرفارمنس پر ڈیپینڈ کرتا تھا۔ اسے باقاعدگی کے ساتھ تین ہفتے تک آفس جوائن کرنے کی آفر کردی گئی تھی۔ تین ہفتے کی مدت وہی بکواس قسم کی ڈوئچ سیکھنے کی شرط تھی۔ یہاں زیادہ ورکر ڈوئچ تھے۔ انگریزی قطعاً نہیں جانتے

تھے۔ سوذی شاہ کے لیے ڈونج سیکھنا ناگزیر تھا۔

میٹنگ کے اختتام پر مرکزی سیٹ پر بیٹھا جوان اٹھ کر رسمی انداز میں کسی مشین کی طرح نیک خواہشات کا اظہار کر کے باہر نکل گیا تھا۔ اس کے چلے جانے کے بعد مسٹر وان نے مسکرا کر اسے خوش آمدید کہا اور لنچ کی آفر کر دی تھی۔ یقیناً یہ مہمان نوازی کی ایک کوشش تھی۔ مسٹر وان ایک ہنس مکھ، ہینڈسم جوان تھا۔ یہ کمپنی کا تیسرا ایم ڈی تھا۔ یعنی عہدوں کے لحاظ سے بالترتیب تیسرے نمبر پر تھا۔ وان بہت باتونی تھا۔ لنچ کے دوران اسے بہت سی معلومات ملی تھیں۔ اس نے بتایا تھا، کمپنی کا پہلا ایم ڈی یہ تھا جس سے ابھی ذی شاہ کی ملاقات ہوئی تھی۔ یہ کبھی دفتر نہیں آتا تھا، آج نہ جانے کیسے بہت مجبور کرنے پر آ گیا تھا۔ یہ اس فرم کا مالک بھی تھا مگر دفتری امور سے خود کو الگ رکھتا تھا۔ دوسرا ایم ڈی چھٹی پر تھا اور تیسرا ذی شاہ کے سامنے بیٹھا کھلنڈرا سا جوان تھا۔ تب اس نے حیران اور کچھ، کچھ متاثر ہو کر سوچا۔ ”بہت حیران کن، افراہیم کا بہنوئی، بہت شاندار پرسنالٹی کا مالک ہے۔“ وہ بہت متاثر نظر آ رہا تھا۔ معاً اسے افراہیم کے بہنوئی کا نام پوچھنے کا خیال آیا تھا۔ تب مسٹر وان نے ہی بے پروائی سے ایم ڈی کا نام بتایا...... وہ ذی شاہ کے ڈاکومنٹس کو ترتیب دے رہا تھا۔ کچھ چونک کر سیدھا ہوا۔

”محمد علی عیسیٰ کرسچن نوم (عیسائی) نہیں ہے۔ موسیلے (مسلم) ہے۔“

☆☆☆

”علی عیسیٰ؟ تو کیا یہ افراہیم کا بہنوئی ہے؟“ وہ اتنا حیران ہوا کہ گھر واپس آ کر بھی اس کی حیرانی کم نہیں ہوئی تھی۔ جانے کیوں وہ اندر سے بہت مایوس ہوا تھا، جو کچھ وہ سوچ کر گیا تھا ایسا کچھ ہوا نہیں...... جیسے اندر سے وہ لمحے بھر کے لیے بجھ گیا تھا۔ آنکھوں کی پتلیوں میں بس ایک ہی عکس ٹھہر گیا تھا۔ پورے ماحول پر چھایا فرم کا مالک، افراہیم کا بہنوئی علی عیسیٰ۔

اسے افریشم پر درپردہ بہت رشک آیا تھا۔ اس جہان میں کیسے، کیسے بلند بخت اور خوش نصیب لوگ تھے۔ اس کا دل بھر آیا۔ مالا کی بے رنگ، ویران اور اداس زندگی نے اس کی آنکھوں میں زخم بھر دیے تھے پھر جو طلاق کا بدنما داغ لگا تھا وہ علی عیسیٰ کے گریبان تک پہنچ کر اور اسے سزا دینے کے باوجود بھی دھل نہیں سکتا تھا۔

وہ مالا کے لیے جتنا بھی سوچتا، اسی قدر زخمی ہوتا...... ہیرنج سے آ کر وہ ایسا بددل ہوا تھا کہ اگلی صبح تک باہر نہ آیا۔ تقریباً آدھی دوپہر کھسک گئی تب وہ نیچے آیا تھا یوں کہ پورا گھر...... بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ خاموشی جیسے محوِ رقصاں تھی۔ آنٹی اور ایمل کہیں نہیں تھیں۔ وہ حیران ہوتا، ادھر اُدھر جھانکنے لگا تھا۔ معاً اس کی نظر ڈائننگ میز کی چکنی سطح پر پڑی تھی۔ اس نے گردن اچکا کر دیکھا، وہاں ایک چٹ پر لکھا تھا۔

”جب اٹھ جاؤ تو اوون کھولنے کی زحمت بھی کر لینا۔ تمہارا ناشتا وہیں رکھا ہے، میں اور ممی تو شاپنگ کے لیے نکلے ہیں۔“ ایمل صاحبہ کی تحریر پڑھ کر وہ مسکرا دیا تھا۔ پھر جو اس کی اس ہدایات پر عمل کرتے ہوئے اوون کھولا تو سامنے ہی ایک ڈش میں چکن اینڈ گرین پیپر آملیٹ ڈھکا نظر آ گیا۔ وہ ٹوسٹر میں سلائس ڈالے بغیر ایک کانٹا اٹھا کر باہر آ گیا۔ آملیٹ اور جوس سے لطف اندوز ہوتا وہ ٹی وی دیکھ رہا تھا جب افراہیم کی اسے کال آئی تھی۔ بینک میں اس کا کوئی کام تھا، وہ وقت پر پہنچ نہیں سکتا تھا تبھی ذی شاہ سے کہا تھا کہ وہ مقامی بینک سے اس کا مطلوبہ سامان لے آئے۔ شاید کچھ پے منٹ کا معاملہ تھا۔ ایڈریس سمجھ کر وہ بال ہاتھوں سے سنوارتا باہر آ گیا تھا۔ یہ بینک زیادہ دور نہیں تھا۔ مگر پھر بھی اسے بس پکڑنا پڑی تھی۔ افراہیم کا کام جاتے ہی ہو گیا تھا۔ قریب، قریب بارہ منٹ لگے تھے اور اب وہ واپس گھر آ رہا تھا۔ بس اسٹاپ پہ پندرہ منٹ انتظار کرنے کے بعد مطلوبہ بس آ تو گئی تھی مگر مسافروں سے کھچا کھچ بھری تھی یعنی کوئی سیٹ نہیں تھی۔ مزید پندرہ منٹ انتظار میں نہ صرف ضائع ہوئے بلکہ

اسے غصہ بھی دلا گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ایک خوب صورت بلکہ حسین ترین دوشیزہ بھی اسٹاپ پر آ گئی۔ کیا کمال کی اللہ نے صورت بنائی تھی۔ اتنے نفیس اور حسین ترشے ہوئے نقوش تھے۔ چہرے پر بلا کی ملاحت اور نزاکت تھی۔ بڑی، بڑی گہری آنکھیں...... ذی شاہ نے دل ہی دل میں ماشاء اللہ کہا۔ اگرچہ وہ کوئی حسن پرست بندہ نہیں تھا مگر خوب صورتی کسے بری لگتی ہے؟ ذرا غور کرنے پر پتا چلا کہ محترمہ تخلیق کے مرحلے سے گزر رہی تھیں۔ چہرے پر انتظار کی کوفت رقم تھی۔ پھر ذی شاہ کی نظریں محسوس کر کے وہ کچھ سمٹ سی گئی تھی۔ پھر یوں ہوا کہ بس آئی ہی نہیں۔ وہ لڑکی تنگ آ کر فٹ پاتھ پر چل پڑی۔ اب وہ لڑکی ہو کر نازک حالت کے باوجود پیدل چلنے کو ترجیح دے رہی تھی تب ذی شاہ کو بھی تھوڑی غیرت آ گئی۔ ویسے بھی گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ تو ایویں ہی بس کا سہارا لینے کھڑا ہو گیا تھا۔ اب اس لڑکی کے پیچھے چلنا قطعاً غیر مناسب حرکت تھی۔ محترمہ مشکوک ہو کر پولیس کو بھی بلوا سکتی تھیں۔ ویسے بھی اس کے بلوزے اور اسکرٹ کا ہم رنگ شولڈر بیگ بھی موجود تھا جس میں ایک عدد موبائل تو یقینی طور پر پایا جا سکتا تھا۔ ویسے بھی وہ کسی غیر اخلاقی حرکت کے باعث اس کا پیچھا نہیں کر رہا تھا۔ دراصل اس کا رستہ ہی یہی تھا۔ کچھ دیر بعد وہ لڑکی کو پیچھے چھوڑے آگے بڑھ گیا تھا۔ اس کی رفتار تیز تھی جبکہ لڑکی بہت سست روی سے چل رہی تھی۔

اگلے دس منٹ میں وہ گھر کے اندر تھا اور افراہیم کو کال کرتے بتا رہا تھا۔

”تمہارا مال لے آیا ہوں۔“ اس نے پیکٹ احتیاط سے دراز میں ڈال دیا تھا پھر افراہیم کا شکریہ سنے بغیر فون کھٹاک سے بند کر دیا۔ اب وہ فریج سے جوس کا کین نکال لایا تھا۔ گھونٹ، گھونٹ جوس پیتے ہوئے جوں ہی اس کی نگاہ لاؤنج کے دروازے تک گئی گویا واپس پلٹنا ہی بھول گئی تھی۔ وہ ہکا بکا بوتل کو منہ سے لگائے کھڑا رہ گیا۔ اس لڑکی کے تاثرات بھی کم و بیش اسی قسم کے تھے۔ ایک دم حیران، شاکڈ اور بے یقین۔

بس اسٹاپ پر کھڑا لڑکا اس کے گھر میں موجود تھا؟ کیوں؟ کیسے اور کس طرح......؟ پھر جیسے اس کے ذہن میں کلک سے کچھ روشن ہوا تھا۔ اسے اچانک یاد آیا...... ”اچھا...... تو یہ وہ ہے؟ افراہیم کا دوست......“ ایک دم اس کے کٹیلے تاثرات بدل گئے تھے۔ اب وہ تھوڑی مطمئن سی صوفے پر ڈھے گئی تھی۔ مسلسل چلنے کی وجہ سے اس کے پیر سوج گئے تھے اور سانس پھول رہی تھی۔ وہ پانی پینا چاہتی تھی اسے پیاس لگی تھی مگر کچن تک جانے کی اب ہمت نہیں تھی۔ ذی شاہ اس کے تاثرات دیکھ کر کچھ، کچھ سمجھ رہا تھا۔ پھر جس طرح اس نے ذی شاہ کے ہاتھ میں موجود کین کو دیکھ کر حسرت محسوس کی تھی وہ فوراً سمجھ کر فریج میں سے جوس نکال لایا تھا۔ کوکونٹ جوس دیکھ کر لڑکی نے فوراً بیزار شکل بنائی تھی۔

”مجھے لیموں یا سنگترے کا جوس دو۔“ وہ اپنے پیر دباتی یقیناً بہت تھک گئی تھی، ذی شاہ کو افسوس سا ہوا۔ اسے کیا ضرورت تھی چل کر آنے کی، بس کے آنے تک کا انتظار کر لیتی۔ وہ سنگترے کا جوس لے کر آداب میزبانی بجا لایا تھا۔ لڑکی نے جوس پی کر شکریہ ادا کیا...... پھر جیسے ہی اس کے حواس ٹھکانے آئے، وہ تفتیش کے موڈ میں نظر آ گئی تھی۔ ذی شاہ نے سوچا تھا اب لمبی تفتیش بھگتنا پڑے گی مگر ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ وہ بڑے تحمل اور نرمی سے پوچھ رہی تھی۔

”تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟ دل لگ گیا؟“ اسی قسم کے بے ضرر سوال وہ پوچھ رہی تھی۔ جبکہ دل لگنے والا سوال تو اس کے دل میں بے ساختہ ٹھا کر کے گڑ گیا تھا۔ ظالم نے دل پر ہی ہاتھ ڈال دیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے منکشے کا چہرہ آ گیا۔ وہ آتے جاتے بھی آج کل دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ جانے وہ کہاں تھی؟ اس کا دل سکڑنے سمٹنے لگا تھا۔ خیر، فی الوقت منکشے کا خیال جھٹک کر وہ سامنے موجود حسینہ کی طرف متوجہ تھا جو یقیناً افراہیم کی بہن اور علی عیسیٰ کی بیوی تھی۔

”جی ہاں......“ دل تو اچھی طرح لگ گیا۔ بلکہ

لگا ہی اب ہے، کم بخت کو پاکستان میں لگنا ہی نہ آیا...... اور لگا بھی کہاں۔ وہ اثبات میں جواب دیتا باقی کی بات سوچ رہا تھا پھر سر جھٹک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''میں افریشم ہوں، افراہیم کی بہن۔'' وہ اپنا تعارف کروا رہی تھی، نہ بھی کرواتی تب وہ جان ہی چکا تھا۔

''میں جانتا ہوں۔'' اسے مسکرانا پڑا۔

''بس اسٹاپ پر تم ہی تھے ناں......؟'' وہ جانتی بھی تھی پھر بھی پوچھ رہی تھی۔ شاید تصدیق کرنا چاہ رہی تھی۔

''میں ہی تھا...... آپ کو شک ہے کیا......؟'' ذی شاہ سنجیدگی سے بولا تب وہ کچھ سوچنے لگی تھی۔

''مجھے یوں لگا، میں نے پہلے بھی تمہیں دیکھا ہے، خصوصاً تمہاری آنکھیں۔'' افریشم کا انداز کھویا کھویا سا تھا۔ جیسے وہ کسی کو یاد کرنے لگی تھی، جیسے کسی کا چہرہ آنکھوں کے سامنے آگیا تھا۔

''اچھا......'' اب کہ ذی شاہ کچھ حیران ہوا تھا۔

''شاید تمہیں ایسا لگا ہو...... خیر، کچھ کھاؤ گی؟'' اسے پھر سے افریشم کی نازک حالت کا خیال آیا تھا۔ جس کی وجہ سے اکثر آنٹی افریشم کے گھر چلی جاتی تھیں اور پیچھے ایمل کا منہ بن جاتا تھا۔

''نہیں شکریہ......'' وہ بہ مشکل مسکرائی تھی تب ذی شاہ کندھے اچکا کر رہ گیا تھا۔

''تم آج کل کیا کرتے ہو؟'' افریشم کے سوال اسے حیران کر رہے تھے۔ یعنی وہ گفتگو کو طول دینا چاہتی تھی پھر وہ خود ہی اس سے چیدہ، چیدہ سوال پوچھتی رہی تھی۔ کہاں سے ہو؟ پاکستان کے کس شہر سے ہو؟ کیا کرتے ہو؟ فیملی کہاں ہے؟ شادی ہوئی یا نہیں کچھ ہی دیر میں وہ خاصی بے تکلفی کا مظاہرہ کرتی اس کا پورا ڈیٹا معلوم کر چکی تھی۔ ویسے تو ذی شاہ اتنی جلدی کسی سے بے تکلف نہیں ہوتا تھا مگر ایمل اور افریشم میں کوئی خاص بات ضرور تھی۔ دونوں بہنیں بلا کی خوش مزاج، بے تکلف اور باتونی تھیں۔ اسے افریشم کی کمپنی بہت اچھی لگی تھی۔ بیچ میں ایک مرتبہ اس کے شوہر کا فون بھی آیا تھا۔ پھر اس نے شاید کسی ملازمہ کو ہدایت بھی دی تھی۔

''عیسیٰ کی طبیعت ٹھیک نہیں، میں سوپ بنا آئی ہوں، عیسیٰ اٹھے تو اسے سوپ دینا...... اور دیکھو، کچن میں گڑبڑ نہیں ہونی چاہیے۔'' افریشم کے لہجے میں واضح دھمکی تھی۔ یقیناً وہ کسی میڈ سے مخاطب تھی اور اپنے شوہر کے لیے بہت متفکر بھی تھی۔

''میں ممی کی طرف آئی ہوں، کچھ دیر ہو جائے گی۔ تم کھانا کھا لینا تاہم عیسیٰ کو ڈسٹرب مت کرنا۔ ٹی وی بھی نہ لگانا۔ شور عیسیٰ کو پسند نہیں۔'' افریشم نے کچھ اور ہدایات دے کر فون بند کر دیا تھا۔ اب وہ اپنے کمرے کی طرف چلی گئی تھی۔ ذی شاہ کو جیسے اس پر رشک آیا تھا۔ علی عیسیٰ کی بیوی...... خوش باش، خوش حال ہر کوئی اتنا بانصیب تو نہیں ہوتا؟ وہ یہی باتیں سوچتا اپنے کمرے میں آگیا تھا جب اس کے موبائل کی بپ بجی تھی۔ فون بندیا کا تھا جو خاصی پُرجوش لگ رہی تھی۔

''جرمنی سے ایک خط آیا ہے۔'' اس نے مارے مسرت کے چیختے ہوئے بتایا تھا۔

''اچھا...... تو کیا لکھا ہے خط میں؟'' وہ ذرا چونکتے ہوئے دیوار پر لگے کیلنڈر کو دیکھنے لگا۔ تاریخوں کے حساب سے بالکل ٹھیک وقت پر یہ خط پہنچ گیا تھا۔

''مالا کے نام ہے، اس کی خیریت پوچھی گئی ہے، ذی بھائی! کیا پتا یہ عیسیٰ نے خط بھیجا ہو؟ آخر جرمنی میں عیسیٰ کے علاوہ اور کون ہے؟'' بندیا کے جوش کی وجہ سمجھ آتی تھی، ظاہر ہے، اس کے نزدیک ذی تو خط بھیج نہیں سکتا تھا کیونکہ فون پر جو بات ہو جاتی تھی پھر یہ خط بھلا کون بھیج سکتا تھا؟ یقیناً عیسیٰ ہی۔

''یہ خط میں نے لکھا ہے، مالا کے لیے۔'' اس نے بندیا کا سارا جوش پانی میں بہا ڈالا تھا۔ وہ جیسے اپنا سا منہ لے کر رہ گئی تھی۔

''تم نے...... مگر کیوں؟'' اب کے بندیا نے بجھی بجھی آواز میں پوچھا تھا۔ ساری خوشی جو ملیا میٹ ہو گئی تھی۔ وہ جو سمجھ رہی تھی۔ ذی بھائی کے جاتے ہی عیسیٰ کی طرف سے ریسپانس آگیا ہے۔ ایک دم بجھ کر رہ گئی تھی۔

''بس مجھے تم یہ بتاؤ کہ مالا نے کیا ردِعمل ظاہر کیا؟ وہ خوش ہوئی؟'' اس کا سوال نظر انداز کر کے ذی شاہ نے بے تابی سے پوچھا۔

''ہاں، بہت...... حد نہیں...... پھر رونے لگی، پھر بے ہوش ہو گئی۔ مگر ہوش میں آنے کے بعد بھی اس نے مجھ سے خط کے بارے میں پوچھا تھا۔ وہ بہت پُرجوش تھی۔'' بندیا اب مالا کی کیفیات اور اس کے ردِعمل کے متعلق بتا رہی تھی۔ ذی شاہ جیسے مطمئن ہو گیا تھا۔ گویا محنت وصول ہو گئی۔ اس نے اسی مقصد کے تحت تو مالا کو خط لکھا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ مالا کے وجود پر چھایا جمود ٹوٹتا ہے یا نہیں......؟ اس میں کوئی تبدیلی آتی یا نہیں؟ اور بندیا بتا رہی تھی کہ اس میں بہت تبدیلی آئی تھی۔ جانے کیوں ذی شاہ کو اپنی دونوں بہنوں سے بہت محبت تھی، مالا تو اپنی پیاری، پیاری عادتوں کے باعث دل سے بہت قریب تھی جبکہ تابندہ عرف بندیا بھی نٹ کھٹ سی شرارتی ہونے کی وجہ سے اسے بہت پیاری تھی۔ یہ اور بات تھی کہ اس نے اپنی محبت بہنوں پر پہلے کبھی ظاہر نہیں کی تھی جو کہ اب خود بخود ظاہر ہو رہی تھی۔

''اور کیا دیکھا تم نے؟ مالا نے کچھ اور پوچھا؟'' وہ بڑے محتاط انداز میں بندیا سے پوچھ رہا تھا۔

''ہاں...... پوچھا بھی اور لفافے پہ لگے ٹکٹوں کو بڑی سنجیدگی سے دیکھتی رہی تھی۔ گویا تصدیق کر رہی تھی کہ جرمنی سے ہی خط آیا ہے ناں......؟'' بندیا نے سابقہ جوشیلے لہجے میں بتایا تھا۔ ذی شاہ شانت ہو گیا تھا۔ گویا اس کو پہلی کامیابی نصیب ہوئی تھی، بندیا نے اسے بتایا کہ خط پڑھنے کے بعد مالا بولتی بھی رہی اور عیسیٰ کی باتیں بھی کرتی رہی۔ حالانکہ اس سے پہلے ان لوگوں کے سروں کی ٹھیکریاں اڑ گئی تھیں مگر وہ عیسیٰ کے متعلق کوئی بات نہیں کرتی تھی۔ جیسے وہ ابھی تک شاک میں تھی کہ علی عیسیٰ نے جو کچھ اس کے ساتھ کیا تھا، کیا وہ اس سب کی حقدار تھی؟

''کیا، کیا باتیں ہوئیں؟'' ذی شاہ نے بے چینی سے پوچھا تھا۔ تب بندیا روانی میں کچھ بتاتے، بتاتے ایک دم جھینپ کر خاموش ہو گئی تھی۔ شاید بھائی سے شرم آگئی تھی۔ بھلا وہ ذی شاہ کو عیسیٰ کی محبتوں کے متعلق کیسے بتاتی؟ مالا نے جو اتنے سال بعد قفل کھولا تھا، سو بہن سے کچھ بھی نہ چھپایا، عیسیٰ کی محبتوں کا ایک، ایک صفحہ کھول، کھول کر سنایا مگر جدائی کی گھڑیوں تک وہ پہنچ نہیں سکی تھی۔ بندیا خود بھی اس کو دورِ عروج میں ہی رکھنا چاہتی تھی۔ تبھی مالا کے زوال کی طرف اس کا دھیان آنے نہیں دیتی تھی۔ اِدھر بندیا کی خاموشی سے جیسے ذی شاہ خود بخود کچھ سمجھ گیا تھا۔ سو مزید سوال نہ کر سکا۔ بس اس نے بندیا سے یہ کہا۔

''تم مالا سے کسی طرح علی عیسیٰ کا حلیہ تو پوچھ لو...... اور اسے کہو، گھر کا ایڈریس بتائے یا پھر کوئی ایک آدھ تصویر علی عیسیٰ کی مجھے سینڈ کر دو......'' وہ شدید مضطرب ہو گیا تھا۔ جیسے اس کے دل میں کچھ وسوسے سر ابھار رہے تھے۔ اس کی چھٹی حس کچھ ہنٹ دے رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا، ہیر لنخ میں ملنے والا علی عیسیٰ ہی اس کی بہن مالا کا مجرم ہو سکتا ہے اور یہ افریشم اس کی بیوی تھی۔ ذی شاہ کی بہن کو برباد کر کے کیسی عالیشان زندگی گزار رہا تھا۔ اتنی حسین ہم سفر کی موجودگی میں اسے مالا کیا یاد آتی ہو گی؟ پھر اب بچہ بھی ہو رہا تھا۔ یعنی علی عیسیٰ کو سب کچھ مل گیا۔ پھر سے بیوی بھی مل گئی اور بچہ بھی...... جبکہ مالا کے حصے میں کیا آیا تھا؟ صرف ذلت......؟ رسوائیاں؟ دکھ؟ آنسو؟ غم؟ کرب؟

ذی شاہ کے اندر باہر بھانبڑ جلنے لگے تھے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ہر چیز کو آگ لگا دے... مگر فی الوقت اسے ضبط کے مراحل سے گزرنا تھا۔ جب تک بندیا اسے عیسیٰ کی تصویر نہ بھیج دیتی...... یا اس کا حلیہ نہ بتا دیتی۔ کم از کم تب تک وہ منہ سے کچھ پھوٹ نہیں سکتا تھا۔ وہ بے صبری کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی جلد بازی میں کوئی غلط قدم اٹھانا چاہتا تھا۔ کوئی فضول اور چیپ حرکت کر کے افراہیم کی نگاہ سے گرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ کیا خبر اس کے خدشے غلط ہوں؟ وہ علی عیسیٰ کوئی اور ہو......؟ افریشم کا شوہر عیسیٰ اس کی بہن کا مجرم نہ ہو...... پھر بھلا وہ بغیر تصدیق کے افریشم کی

ازدواجی زندگی میں کوئی شعلہ بھڑکا دیتا؟ اس کے شوہر پر الزام لگاتا، اسے اپنی بہن کا بنا تصدیق کیے مجرم ٹھہراتا تو یقینی طور پہ... افریشم کی زندگی بری طرح متاثر ہوجاتی...... کیا خبر اس کا گھر ٹوٹ جاتا؟ وہ دوبارہ اپنے شوہر پر اعتبار نہیں کرسکتی۔ اگر افریشم کی زندگی اس کی وجہ سے خراب ہوتی تو کیا افراہیم، ذی شاہ کو معاف کرسکتا تھا؟ اس کی بہن اجڑ کر گھر آجاتی؟ کچھ بھی متوقع تھا، کچھ بھی ہوسکتا تھا؟ سو ذی شاہ کو ہر قدم پھونک، پھونک کر اٹھانا تھا۔ تول، تول کر بولنا تھا اور سوچ سمجھ کر چلنا تھا۔ اس کا کوئی بھی انتہائی قدم بہت سارے لوگوں کی زندگیاں تباہ کرسکتا تھا۔ اور وہ اتنا سنگدل، خودغرض یا مطلبی نہیں تھا کہ اپنے دوست کے گھرانے کو انجانے میں بھی ذرا سی ٹھیس پہنچا دیتا۔

سوچوں کے تار نہ جانے اسے کہاں تک لے جاتے جب ہوا کے دوش پر لہراتی بندیا کی آواز اسے حال کی دنیا میں واپس اٹھا لائی تھی۔

''کہاں چلے گئے؟ ہیلو...... ہیلو۔'' بندیا نے... بے تابی سے کہا تھا تب وہ بے ساختہ چونک گیا۔

''آں...... ہاں...... یہیں ہوں......'' ذی شاہ جیسے گڑبڑا گیا تھا پھر کچھ سوچتے ہوئے بندیا کو ذرا کام کی باتیں سمجھانے لگا تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ پاکستان سے علی عیسٰی کے متعلق تمام کوائف جمع کر کے لاتا مگر تب مالا کچھ بتاتی نہیں تھی۔ اب جو اس نے لبوں کا قفل توڑا ہی تھا تو ذی شاہ، بندیا کو مزید ایک سوال نامہ تھما رہا تھا۔ یہ بہت ضروری قسم کی ہدایات تھیں۔

''سنو بندیا......! تم نے اب... مالا سے کیا، کیا سوالات کرنے ہیں...... ان کو بھی ابھی سے اپنے ذہن میں ترتیب دے لو۔ تم مالا سے پوچھو، عیسٰی کی پسندیدہ کوئی ایسی چیز جس کے بغیر اس کا رہنا مشکل ہو، اس کی پسند ناپسند، اس کا مزاج، عادتیں، اس کے دفتر کا اتا پتا...... یا کوئی ایسی جگہ جہاں وہ کثرت سے جانا پسند کرتا ہو؟ مجھے کچھ ہنٹ چاہیے۔ کچھ ٹھوس ثبوت چاہیے۔ ورنہ میں یہاں اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتا بس اپنا وقت ضائع کرتا رہوں گا۔ یاد رکھنا، یہ سوالات بہت ضروری ہیں۔ انہی کی بدولت میں علی عیسٰی تک پہنچ پاؤں گا۔'' ذی شاہ کا لہجہ بلا کا سنجیدہ اور دھیما ہوگیا تھا۔ دوسری طرف بندیا ہمہ تن گوش تھی۔ اور بہت دھیان سے اسے سن رہی تھی۔

''تم فکر مت کرو بھائی! میں مالا سے باتوں باتوں کے دوران پوچھ لوں گی...... اب وہ زیادہ دیر چپ نہیں رہتی۔ بولتی بھی ہے اور ممی کے قریب سے ہٹتی بھی نہیں۔ ممی کا خیال بھی وہی زیادہ رکھتی ہے۔ اس میں تبدیلی آرہی ہے۔ وہ صدمے کے اثر سے نکل رہی ہے۔'' بندیا نے جیسے اس کے اندر بجھتی امید کو زندہ کر دیا تھا۔ وہ جیسے پھر سے پُرامید ہوگیا۔

''یہ خوش آئند عمل ہے۔'' اس نے جوش کا مظاہرہ کیا۔

''ہاں، ممی بھی حیران اور خوش ہیں۔'' بندیا خوش دلی سے بتانے لگی۔

''تم خیال رکھنا ممی اور مالا کا...... اور زیادہ سے زیادہ مالا کو وقت دینا، دیکھو، اسے تنہا مت چھوڑنا کسی بھی وقت کسی بھی لمحے۔'' وہ ہدایات دیتا رہا۔ بندیا سے بات کر کے وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ اس کے اعصاب بھی ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ آج کی رات اسے بہت اطمینان سے نیند آسکتی تھی۔ مالا کے اندر ہونے والی تبدیلی بہت خوشگوار تھی۔ وہ بدل رہی تھی۔ صدمے کے اثر سے نکل رہی تھی۔ حقیقت کو قبول کر رہی تھی۔ ذہن کے جالوں کو صاف کر رہی تھی۔ دھند سے نکل رہی تھی۔

☆☆☆

وہ واک کے لیے اکیلا ہی باہر نکلا تھا، کچھ دیر بعد ایمل بھی آگئی تھی پھر وہ لمبا راؤنڈ لے کر ایسی تھکی کہ بھاگ کر واپس گھر میں چلی گئی۔ ذی شاہ البتہ فٹ پاتھ پر چلتا ڈوبتے سورج کا سنہرا زعفرانی پن دیکھ رہا تھا۔ بھلا اس منظر سے بڑھ کر بھی کچھ حسین ہوسکتا تھا؟ ڈوبتا ہوا سورج اور زعفرانی تاروں کا بکھرا جال...... زمین جیسے سونے میں بھیگ رہی تھی۔

ولیس ہاؤس پر نظر پڑتے ہی وہ ایک دم ٹھٹک گیا تھا۔ اندھیرے میں ڈوبا سفید مکان، آس پاس سبزے کے جھنڈ، بے ترتیب کھردری شاخیں، پھولوں کے خوفناک کٹ، جو اندھیرے میں خاصے بھیانک لگ رہے تھے۔

اس نے انگلیوں پر حساب کیا تھا، پورے تین دن گزر چکے تھے، منکشے دوبارہ دکھائی نہیں دی تھی۔۔۔۔ وہ بے سوچے سمجھے کسی غیر مرئی طاقت کے زیر اثر آگے بڑھتا جارہا تھا۔ آگے بڑھتا جارہا تھا۔ پھر لاؤنج کے یا ہال کے داخلی دروازے پر رک سا گیا۔ اس نے آس پاس گھنٹی تلاشنا چاہی تھی مگر گھنٹی کہیں نہیں تھی۔

اس نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور دروازہ کھلتا چلا گیا تھا۔ ''اوہ میرے اللہ...... ایسی بے پروائی......'' کھلے دروازے کو دیکھ کر اسے اچنبھا ہوا تھا۔ پھر جیسے وہ آگے بڑھتا گیا، مگر یہ کیا؟ جگہ جگہ رکاوٹیں تھیں...... اسٹول، کرسیاں، بے ترتیب اوندھی پڑی تھیں۔ گیلری میں کیزن (تکیے) چادریں، کمبل فرش پر گرے پڑے تھے، کچھ آگے بڑھنے پر اس کے قدموں تلے رکابیاں اور چمچے بھی آنے لگے۔ وہ بچ بچا کر آگے بڑھا تو زوردار ٹھوکر لگی تھی، یہ کوئی کانچ کا گلاس تھا جو لڑھکتا ہوا نہ جانے کس طرف کھسک گیا تھا۔

پورا گھر بھاں، بھاں کر رہا تھا۔ اتنی خاموشی اور سناٹا تھا جیسے وہ کسی غار میں غلطی سے گھس آیا تھا۔

''اللہ اکبر...... کیا یہاں انسان نہیں بستے؟'' اس نے بیرونی سناٹے سے گھبرا کر اونچی آواز میں کہا تھا۔ اسے اپنی ہی آواز کانوں میں گونجتی سنائی دے رہی تھی۔ ہال، گیلری اور یہ شاید سٹنگ روم تھا۔ وہ کچھ آگے بڑھا، اب سامنے یورپین طرز کا ہی کچن نظر آرہا تھا۔ ہر طرف گھٹن ہی گھٹن تھی۔ ملگجا سا اندھیرا اب گہرے اندھیرے میں بدل گیا تھا۔ ذی شاہ تو جیسے اس جادو نگری میں آکر پچھتا رہا تھا۔ وہ کیونکر یہاں چلا آیا؟ پھر جیسے گھبراہٹ نے اس کے دل پر پنجہ مار دیا تھا۔ اتنا اندھیرا تھا کہ حد نہیں...... اس نے آگے بڑھ کر اندازے سے سوئچ بورڈ تلاشنے شروع کر دیے تھے۔

تب ایک کمزور، نسوانی آواز سنائی دی تھی۔ اس کا دل لمحے بھر کے لیے آگے پیچھے ہوا تھا۔ یہ آواز منکشے کی تھی۔

''دائیں سمت گلاس وال کے قریب کارنر شیلف پہ لیمپ رکھا ہے۔'' وہ اس کی رہنمائی کر رہی تھی۔ گویا اندھیرے میں بھی وہ ذی شاہ کی آواز پہچان چکی تھی۔ اس کی خوشی اور غرور کے لیے یہی کافی تھا۔ وہ تو جیسے نہال ہی ہوگیا۔ لمحے بھر میں یہاں آنے کا فیصلہ درست لگنے لگا تھا مگر یہ اندھیرا، بے ترتیبی، گھٹن، جگہ جگہ بکھرا سامان، یہ لڑکی اتنی گندی، بے ترتیب اور بے حس تھی؟ اسے گندگی، غلاظت اور گھٹن سے الجھن نہیں ہوئی تھی؟ وہ مزید بھی شاید کچھ سوچ لیتا مگر منکشے کی آواز نے اسے ایک مرتبہ پھر نہال کر دیا تھا۔

''ذی شاہ......! اب آچکے ہو تو اندھیرے سے مانوس ہونے مت کھڑے ہو۔ یہ اندھیرے صرف میرے لیے ہیں۔ ان میں تمہارا کوئی حصہ نہیں۔'' وہ بھیگی آواز میں بول رہی تھی۔ ذی شاہ تو اسی بات پر سرشار ہوگیا تھا کہ اسے ابھی تک اس کا نام یاد تھا۔ یقیناً وہ نہیں جانتا تھا کہ سامنے یا آس پاس موجود لڑکی کی... یادداشت غضب کی تیز تھی۔ اس کے قریب کوئی گلا کھنکھار کے گزر جاتا تو وہ بنا دیکھے اس شخص کی آواز سے اسے پہچان سکتی تھی چاہے وہ آدمی دس سال بعد اس کے قریب سے گلا کھنکھار کے گزرتا۔ وہ قیامت کا ذہن رکھنے والی لڑکی تھی مگر اب اسے بہت سی باتیں بھولنے لگی تھیں۔

وہ جیسے سانس روکے محض منکشے کو محسوس کر رہا تھا وہ روشنی میں اس اندھیرے کا طلسم توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ روشنی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ منکشے کی سانسوں کا ردھم سن رہا تھا۔ دلِ بے تاب کی نہ جانے کیا حالت تھی! کوئی اس پل ذی شاہ کے اندر اتر کر تو دیکھ لیتا۔

''ذی شاہ! سنتے نہیں ہو؟'' منکشے جیسے تھک کر بول رہی تھی۔ وہ لمحے بھر میں ٹھٹک سا گیا۔

''منکشے! تم کہاں ہو؟'' ذی شاہ بے تابی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا تھا۔ جیسے ٹٹول ٹٹول کر کچھ تلاش کر رہا تھا۔

''میں یہاں ......وہاں، کہاں، جہاں......
جہاں تم محسوس کرو، میں وہیں موجود ہوں گی۔'' آواز میں بوجھل پن اور قیامت کی اداسی اتر آئی تھی۔ ذی شاہ اپنی جگہ سے ہل نہیں پایا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکنوں میں غضب کا تلاطم تھا۔ ہر دھڑکن بڑے ترنگ کے عالم میں کچھ انوکھا راز منکشف کر رہی تھی۔

''میں تو یہاں، وہاں، ہوں تمہارے دل میں ہر جگہ، ہر کونے میں۔'' کوئی اس کے اندر بڑے جذب کے ساتھ پکارا تھا۔ اس پکار پہ ذی شاہ کے لبوں پر جیسے مسکراہٹ آگئی تھی۔

''ہاں، تم یہاں ہو۔'' اس کا روم، روم پکار اٹھا تھا، اس نے اپنے مقامِ دل پر ہاتھ رکھا۔ منکشے جیسے اپنی جگہ پہ تھم گئی تھی۔

''کیا یہ سچ ہے؟'' اِدھر دیوانگی کا عالم ہی کچھ اور تھا۔ وہ جیسے دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر ہاتھ مارنے لگی تھی۔ اسے روشنی چاہیے تھی مگر روشنی کہاں تھی۔''

''ذی شاہ! سامنے آؤ ناں......'' اس التجا پہ وہ فنا نہ ہو جاتا...... ذی شاہ کے اندر باہر روشنیاں بھر گئی تھیں۔ اب بیرونی اندھیرے کیا معنی رکھتے تھے؟ سفرِ محبت میں وہ تنہا کہاں تھا؟ یہ گندی سندی خبطی سی لڑکی بھی تو اس کے ہمراہ تھی۔ وہ بھی تو پہلی نظر کے عشق میں گرفتار ہونے والی تھی۔ وہ بھی تو بِنا سوچے عشق کے پل صراط پر چلنے والی تھی۔ جیسے کچھ پل کے لیے قیامت خیز سی خاموشی ماحول پر چھا گئی تھی۔ پھر کوئی ٹوٹے لہجے میں آرزدگی سے بولا تھا۔

''ہر دفعہ میرے لیے امتحان بن جاتے ہو۔ سامنے ہو کر بھی سامنے نہیں آتے۔ میں سایوں اور خوابوں میں تمہیں تلاش کر کر کے تھک چکی ہوں۔ تم ایسے الوژن ہو جو میرے دل کا ناسور بن گئے۔'' وہ کسی دیوار سے ٹیک لگائے بے آواز رو رہی تھی اور ذی شاہ سے اس کی آواز میں گھلے آنسوؤں کی اذیت محسوس نہ کی گئی پھر بھی جیسے اس کا دل مٹھی میں آرہا تھا۔ ہاں، عورت کے آنسو دیکھنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے، کم از کم ذی شاہ کسی روتی ہوئی عورت کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اور پھر وہ عورت جو اپنے تمام تر بے ڈھنگے پن، گندگی اور بے حسی کے باوجود اس کے حواسوں پر چھا چکی تھی۔ بھلا اسے کیسے روتے دیکھ سکتا تھا؟ وہ اندازے سے چلتا گلاس وال ٹٹولنے لگا۔ پھر اسے جلد ہی لیمپ کا بٹن نظر آ گیا تھا۔ لیمپ تک پہنچنے کے دوران نہ جانے کتنی ہی چھوٹی، چھوٹی چیزیں اس کے پیروں سے ٹکرائی تھیں۔ تاہم وہ لیمپ کا بٹن آن کر ہی چکا تھا۔ ایک بٹن دبانے سے پورا لاؤنج روشنی سے بھر گیا تھا۔ زرد مگر آنکھوں، چہروں اور چیزوں کو واضح کرتی روشنی......

جیسے گھر کی ایک، ایک الٹی پلٹی پڑی چیز دکھائی دینے لگی تھی۔ گندے کپڑوں کے ڈھیر، میلی جرابیں، جوتے، چپلوں کا ایک پہاڑ صوفے کے قریب پڑا تھا۔ دوسرے صوفے پر میلے ملبوسات کی گٹھڑی رکھی تھی جس سے کپڑے ابل، ابل کر باہر گر رہے تھے۔ یہ کمرا ڈائننگ روم تھا۔ اس سے آگے کھلا کچن جو تھوڑا اونچا بنایا گیا تھا۔ چار پانچ اسٹیپ چڑھ کر کچن میں داخل ہوتے تھے اور وہ تیسرے پر بیٹھی تھی اور جیسے رینگ کر مکوڑے کے مانند اوپر جا رہی تھی۔ اسے شاید کچن تک جانا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پانی کی خالی بوتل تھی، جس میں ایک آدھ قطرہ یقیناً پانی کا موجود تھا۔ وہ ڈھکن کھول کر بے تابی سے پانی کا ایک قطرہ زبان پر چھینکنے لگی۔ ذی شاہ جیسے دنگ رہ گیا تھا۔ وہ شدید پیاسی تھی اور پانی کے لیے شاید مر رہی تھی۔ فی الوقت وہ ذی شاہ کی موجودگی بھلائے اپنے خشک روکھے، حلق کو تر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی خاموشی سے ذی شاہ سمجھ گیا تھا۔ اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ پپڑی زدہ خشک ہونٹ، قحط زدہ سی شکل، نحیف کمزور بے جان ہوتا وجود...... بکھرے، الجھے گندے بال...... جانے وہ کب سے بالوں کو گندا رکھے ہوئے تھی۔ جوڑے کی شکل میں الجھے بالوں کا گولا گردن سے لٹک رہا تھا۔ وہ مورگن روک (رات کے چوغے) میں ملبوس تھی، شاید پنک کلر کا ڈریسنگ گاؤن تھا جو فی الحال اپنی اصلی رنگت کھو چکا

تھا۔ اپنی تمام تر گندگی کے باجود وہ بلا کے ساحر ترین نقوش رکھنے والی لڑکی تھی۔ خصوصاً اس کی اندر تک اتر جانے والی لانبی گہری آنکھیں، سفید بے داغ رنگت...... وہ مغربی عورتوں والی سفید گلابی جعلی نما رنگت نہیں رکھتی تھی بلکہ بے انتہا کشش بھی تھی۔ ترشی ہوئی مغرور سی ناک، بھرے بھرے تراشیدہ ہونٹ...... خوب صورت چہرہ مگر انتہائی اذیت سے پُر۔ ذی شاہ نے بے تابی سے اس کا پیر دیکھا تھا جس کی بینڈ یج تبدیل کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی گئی تھی۔ خون سے پٹی خشک اور اکڑ چکی تھی تو کیا اس نے دوبارہ بینڈ یج نہیں کروائی؟ وہ چلنے پھرنے سے قاصر تھی اور ضرورت کے لیے فرش پہ رینگتی تھی۔ اپنے پیروں پر کھڑا ہونا اس کے لیے بہت مشکل تھا۔ وہ کس قدر اذیت اور تکلیف میں تھی اس کی بے بسی، درد اور اذیت نے ذی شاہ کی آنکھوں میں نمی بھر دی تھی۔

''انسان اتنا بے بس ہو جاتا ہے؟'' وہ اسے رینگ کر فریج تک جاتے دیکھ رہا تھا پھر جیسے وہ ہوش میں آ کر منکشے کی طرف لپکا تھا۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں وہ فریج تک پہنچ گیا تھا پھر اسے وہیں روک دیا اور سہارا دے کر اسٹول پر بٹھایا اور فریج کھول کر اندر سے جائزہ لیا...... مگر یہ کیا......؟ فریج بھاں، بھاں کر رہا تھا۔ اندر کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک پانی کی بوتل تک نہیں تو بجا کوئی کھانے کی چیز وہ حیران ہوتا ترک کر کے نلکے تک آیا...... گلاس میں پانی بھر کے دوبارہ اس کے لبوں سے لگایا تھا۔ وہ ایک ہی سانس میں پورا گلاس چڑھا گئی تھی پھر منکشے نے اور پانی مانگا۔ کم از کم چار گلاس پانی پی کر جیسے وہ سر تھامے میز پر ڈھے گئی تھی۔ نہ جانے وہ کب سے پیاسی تھی؟ چلنے پھرنے سے معذور ہونے کے باعث پیاس سے نڈھال پڑی تھی اور جب پانی کے بغیر نہ رہا گیا تو وہ رینگ، رینگ کر پانی لینے پہنچ گئی۔ انسان اپنے خاندان اور گھر بار والوں کے بغیر کیسے ہوتا ہے؟ اگر بیمار پڑ جائے تو تنہائی میں رینگنے والا مکوڑا بن جاتا ہے۔ انسان لوگوں کے بغیر تنہا کیسے رہ سکتا ہے؟ اللہ نے خاندان، رشتے، بہن، بھائی، ماں، باپ، عزیز و اقارب اور دوست وغیرہ اسی لیے تو بنائے ہیں تاکہ دکھ سکھ میں ایک دوسرے کی مدد کریں۔ ایک دوسرے کے کام آسکیں۔

''دکھ اور سکھ میں۔'' وہ جیسے زیر لب بڑبڑایا تھا۔ اسی دکھ کی سانجھ بنائی گئی ہے تاکہ آدمی تنہا سسک، سسک کر مر نہ جائے۔ کوئی تو ہو جو دو بوند پانی ہی حلق میں ٹپکا دے، ماں، باپ، بہن، بھائی، اولاد، دوست، شوہر، اللہ نے ہر انسان کو بے شمار رشتوں سے نوازا ہے اور پھر بھی اس کروڑوں، اربوں، کھربوں لوگوں کی دنیا میں کوئی بدنصیب منکشے جیسا اکیلا بھی ہوتا ہے۔ جس کے دکھ اور سکھ کی سانجھ کرنے والا کوئی نہیں جو اسے دو بوند پانی ہی پلا دے۔ کوئی انسان اتنا بھی قلاش نہیں ہوتا کہ اس کے پاس کوئی رشتہ ہی نہ ہو؟ کیا خبر منکشے کے پاس رشتوں کی قلت ہو مگر کوئی دوست، عزیز ملنے ملانے والا بھی نہیں تھا؟ جو اس کی بیماری کے دنوں میں مدد کر دیتا؟ حتیٰ کہ کوئی پڑوسی ہی...... ذی شاہ جیسے دم بخود سوچ رہا تھا۔ ہکا بکا اور متحیر...... بے چین اور مضطرب سا...... اور وہ نڈھال سی لڑکی جیسے اس کی سوچ میں اتر گئی تھی۔

''میرا کوئی بھی نہیں...... میں تنہا ہوں، لاوارث ہوں، میرا کوئی وارث نہیں۔'' وہ میز کی گرد آلود سطح پر سر رکھے پھوٹ، پھوٹ کر رو رہی تھی۔ تب ذی شاہ نے بے قراری سے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔ منکشے کا کُرلانا اس سے دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ اس کا دل سیال بن کر منکشے کے آنسوؤں میں بہہ رہا تھا۔ وہ جیسے بے بس ہو گیا۔

''تمہارے ماں، باپ......؟'' اس نے منکشے کے سر پر ہاتھ پھیرا...... اس کے بال گرد میں لتھڑے تھے جیسے سالوں سے انہیں شیمپو نہیں کیا گیا تھا۔ وہ اپنی اصلی اور حقیقی رنگت کھو رہے تھے۔

''نہیں ہیں۔'' وہ تڑپ، تڑپ کر رو دی تھی۔

''بہن، بھائی......؟'' اس کا دل بوجھل ہو گیا تھا۔ جیسے کسی غبار میں جکڑ گیا تھا...... جیسے کسی بھاری سل

کے نیچے دب گیا تھا۔

''نہیں ہیں۔'' منکشے اونچی آواز میں رونے لگی تھی۔ اس کے آنسو جیسے کسی نے ٹونٹی کا ہینڈل کھول دیا ہو...... یا کسی کوہ سے پھوٹنے والا مسلسل چشمہ...... ''اللہ! یہ چپ کیوں نہیں ہورہی؟'' وہی بے بسی...... منکشے کے آنسو اس کا اضطراب بڑھا رہے تھے۔

''کوئی دوست، کوئی عزیز......؟'' ذی شاہ نے بے قراری سے پوچھا تھا۔

''نہیں ہے۔'' وہ اور اونچی آواز میں رونے لگی تھی۔ اپنا سر میز پر پٹخ پٹخ کر رو رہی تھی۔ اور ذی شاہ کے دل کو دھچکے لگ رہے تھے۔ ''یا اللہ......! اس کے آنسو رکتے کیوں نہیں۔''

''اور کوئی پڑوسی؟'' اس کی اپنی آواز بھی تھکنے لگی تھی۔ کوئی رشتوں کے معاملے میں اتنا بھی مفلس ہوتا ہے؟ اتنا بھی غریب ہوتا ہے؟ جس کے پاس ایک اچھا ہمسایہ بھی نہیں ہو جو مرتے وقت اس کی خبر گیری کرلے۔ کوئی اتنا کنگال بھی ہوتا ہے؟ وہ جیسے خاک خاک ہوگیا تھا اور وہ کسی کٹی پتنگ کی طرح ڈولتی جارہی تھی۔

''نہیں ہے، میرا کوئی بھی نہیں، صرف تم ہو، مجھے تمہارا قرنوں (صدیوں) سے انتظار تھا اور تم میرے پاس چلے آئے، میں شانت ہوگئی۔ میں کنگال ہوکر بھی مالا مال ہوگئی۔'' اس نے عجیب دیوانگی کے عالم میں ذی شاہ کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔ وہ کسی خواب کی کیفیت میں اسے دیکھ رہی تھی۔ مدہوش، حیران اور گم صم......

''مجھے یقین نہیں آتا...... تم میری طرف لوٹ آئے ہو۔'' اس نے پاگل پن کی انتہا کردی تھی۔ ذی شاہ جیسے دم بخود رہ گیا تھا اور وہ حیرت زدہ کیوں نہ ہوتا منکشے تو یوں بات کررہی تھی جیسے ان کا جنم جنم سے ساتھ تھا پھر بیچ میں جدائی آگئی...... اور اب دوریوں کے بعد پھر سے ملاقات ہورہی تھی۔ وہ اسے دم قدم حیران ہی تو کررہی تھی۔ وہ اس سے اپنی بے تابیوں کی باتیں کیے جارہی تھی اور وہ حیران تھا۔

''اللہ یہ پاگل تو نہیں؟ یقیناً افراہیم نے ٹھیک کہا تھا، یہ پاگل ہے، بھلا میری اور اس کی ملاقات کب ہوئی؟ کبھی نہیں، گنتی کے چند دن پہلے تو میں نے اسے دیکھا ہے اور اس نے مجھے تو پھر یہ جنم جنم کی باتیں؟''

''میں پاگل نہیں......'' منکشے بنا اس کی طرف دیکھے جیسے ذی شاہ کی سوچ پڑھ رہی تھی۔ وہ ایک مرتبہ پھر دم بخود رہ گیا تھا۔

''تم حیران ہورہے ہو... اور سمجھ رہے ہو میں پاگل ہوں، ایسا کچھ بھی نہیں، کاش میں پاگل ہوجاتی...... مگر یہ ممکن نہیں...... میری سزا میرے حواس ہیں جو میرا ساتھ کبھی نہ چھوڑیں گے...... چلو اس بات کو جانے دو...... میں تمہیں اپنی محبت کا بتاتی ہوں، تمہاری محبت میرے لیے پوائزن کے مانند ہے، اس نے مجھے میٹھا بنانے کے بجائے زہریلا کردیا۔'' وہ اونچی آواز میں پھر سے رونے لگی تھی۔

''یہ میری زندگی کا بہت بھیانک سچ ہے۔'' اس نے رونا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ تو اندر کے میل کچیل، غلاظتوں اور کثافتوں کو بہا رہی تھی پھر کیسے رونا ترک کردیتی؟

''کیا یہ بھی سچ ہے؟ کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟'' وہ سراپا سوال بن گیا تھا۔ سامنے بیٹھی عجیب لڑکی نے اسے حواس باختہ کردیا تھا۔ ابھی پچھلے ایک سو پینتالیس گھنٹوں میں وہ یہ سوچتا رہا تھا وہ اس خبطی آئٹم سے کبھی اظہار محبت کر بھی سکے گا؟ اور کیا وہ اس کی محبت پہ یقین کرے گی؟ اور اس کی سوچوں، وسوسوں، خدشوں سے الگ یہاں سب کچھ الٹ ہورہا تھا۔ اتنا الٹ کہ اس کی اپنی عقل دنگ رہ گئی تھی۔

''میں نے تمہیں دیکھا اور تم میرے حواسوں پر چھاگئے؟'' وہ ذی شاہ کو بتارہی تھی، وہ ایک مغربی لڑکی تھی۔ اظہار کے معاملے میں جھجک نہیں سکتی تھی اور وہ ایک مشرقی لڑکا تھا۔ اگرچہ تھوڑا بے باک ہی سہی...... مگر پھر بھی اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ کسی لڑکی سے بہت عجیب طرح کی باتیں اور اظہار محبت سن رہا تھا۔ وہ عام لڑکیوں سے ہٹ کر آئی لو یو والی کہانی نہیں دہرارہی

تھی۔ وہ تو بڑی عجیب ترین کہاوت سنا رہی تھی۔

اس نے ذی شاہ کو کہاں دیکھا؟ شاید سامنے والے گھر میں کہیں آتے جاتے؟ وہ اس بحث یا گہرائی میں نہیں پڑا تھا۔ اس نے سوال اور نکتے نہیں اٹھائے تھے۔ اس کی خوشی، فخر اور انبساط کے لیے اتنا ہی کافی تھا، سفر محبت میں وہ اکیلا نہیں، ڈار سے بچھڑی یہ کونج اس کے ہمراہ تھی۔ وہ اسی بات پر جیسے دل بادشاہ کے سامنے تعظیماً جھکا ہوا تھا۔

''میں حیران ہوں، تم میرے سامنے مجسم بیٹھے ہو پھر بھی بے یقینی ختم نہیں ہوتی۔'' اب وہ خود سے ہی مسکرا رہی تھی۔ بڑی حیران کردینے والی مسکراہٹ تھی پھر وہ حیران کیسے نہ ہوتا۔

''میری منزل کہیں نہیں تھی، رستہ انجانا تھا، میں پھر بھی بھاگتی رہی، اندھا دھند، بنا رستوں کی کٹھنائیاں دیکھے...... آبلے پیروں میں پڑے۔ پاؤں فگار ہوئے، آنکھیں پھوٹیں، رشتے ٹوٹے مگر میں پھر بھی نہ رکی۔ کتنی احمق تھی میں، انجانے رستوں پہ بھاگتی رہی، اس بات سے بے خبر کہ اوپر تدبیر کرنے والا منزل کو اپنے وقت پر میرے سامنے لاکھڑا کرے گا مگر میں انجان تھی، سمجھ ہی نہیں پائی۔ اپنے طور پر تدبیر کی تو وہی تدبیر میرے منہ پر الٹ دی گئی۔'' وہ ہنستے، ہنستے پھر سے رونے لگی تھی۔

''نہیں اسے اب رونا نہیں، بالکل نہیں...... یااللہ بس یہ چپ کر جائے۔'' اس کا دل پھر سے گڑگڑانے لگا تھا۔ پھر جیسے وہ خود ہی چپ کرگئی تھی۔ شاید رونے نے اس کو نڈھال کردیا تھا۔ اس کی پوری طاقت جیسے نچڑ گئی تھی۔ آنکھوں کے سامنے غبار چھانے لگا۔ ذی شاہ گھبرا گیا تھا۔ اس نے منکشے کا کندھا ہلایا۔

''کیا پانی چاہیے؟'' وہ بھاگ کر گلاس پھر سے بھرنے لگا تھا۔ منکشے ایک دو تین اور پھر چوتھا گلاس بھی پی گئی پھر اس نے چکراتے سر کو تھامتے ہوئے کہا۔

''اِدھر میرے کمرے میں یا لاؤنج میں یا پھر اُدھر کیبنٹ میں کوئی بسکٹ، نمکو یا کچھ کھانے کی چیز ڈھونڈ دو، میں تین دن سے بھوکی ہوں...... مجھ سے بولا نہیں جارہا......'' وہ میز پر سر رکھے نیم جاں سی ہوگئی تھی، ذی شاہ کا سر گھوم گیا تھا۔

''تین دن سے بھوکی......؟'' وہ جیسے خود پر لعنت بھیجتا کیبنٹ دھڑ دھڑ کھولنے لگا۔ وہ تین دن سے بھوکی تھی، فریج خالی پڑا تھا۔ گھر میں کچھ تھا نہیں، وہ چلنے پھرنے سے قاصر بھی، شاید کل وہ رینگ رینگ کر سڑک تک گئی ہوگی اسی امید پر کہ شاید ذی شاہ اسے دیکھ لے

مگر ذی شاہ اسے دیکھ نہیں سکا تھا۔ بس ایمل نے اسے دیکھا مگر ترس کھا کر اندر چلی گئی۔ اس کی مدد نہیں کی، ممی اور افراہیم کے خوف سے، وہ فرمانبردار لڑکی تھی، منکشے کی مدد کیسے کرتی؟ ذی شاہ کو اپنی غفلت پر غصہ آ رہا تھا۔ بھلا اس نے خود منکشے کی خبر گیری کیوں نہیں کی؟

کیبنٹ سارے خالی تھے، کچن میں راشن نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ حتیٰ کہ چینی، پتی تک بھی نہیں تھی۔ یہ لڑکی مسافروں کی طرح اس گھر میں رہ رہی تھی؟ مگر مسافر بھی تو اپنے زندہ رہنے کا سامان ساتھ رکھتا ہے۔ اسے منکشے کی بے حسی اور بے پروائی پر بھی تاؤ آیا تھا۔ پھر اس نے دو چار باتیں اسے سنا بھی دی تھیں۔

”یہ گھر ہے یا کوئی غار......؟ جہاں زندہ رہنے کے لیے خوراک کا ایک ٹکڑا تک نہیں۔“ وہ زیرِ لب بڑبڑاتا ایک کیبنٹ سے بسکٹ کا چورا نکال لایا تھا۔ چوہوں نے کتر، کتر کر بسکٹ کا سفوف بنا ڈالا تھا۔ اسے گھن سی آئی تھی جبکہ منکشے خوراک دیکھ کر جانوروں کی طرح پیکٹ پر جھپٹی تھی۔

”مجھے یہی دے دو......“ وہ ندیدوں کی طرح پیکٹ چھین لینا چاہتی تھی مگر ذی شاہ نے اس کی کوشش ناکام بنا دی۔ اس نے پیکٹ والا ہاتھ پیچھے کر لیا تھا پھر جیسے بہت محبت اور نرمی سے بولا۔

”یہ میری گھڑی اپنے پاس رکھو اور وقت نوٹ کرتی جاؤ، میں پورے نو منٹ بعد یہاں آ جاؤں گا۔ تم اس دوران یہاں سے ہلنا مت......“ اس نے گھڑی منکشے کے ہاتھ میں پکڑائی تھی پھر پیکٹ کو ڈسٹ بن میں پھینکنے کی غلطی کیے بغیر لمبے، لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا تھا۔ رستے میں اس نے ڈرم دیکھ کر گندا بدبو دار بسکٹ کے چورے والا پیکٹ پھینک دیا تھا۔ اسے خدشہ تھا یہ گندا چورا منکشے ڈسٹ بن سے نکال نہ لے۔ خوراک دیکھ کر اس کی حالت کچھ ایسی ہی لگ رہی تھی۔ اس نے بیکری سے کئی چیزیں لیں اور ساتھ ہی ناشتے کا کچھ سامان...... اور پھر ایک چھوٹے سے ہوٹل سے کھانا پیک کروا کر وہ نو منٹ سے بھی پہلے واپس ویلس ہاؤس پہنچ گیا تھا۔ اور وہ ابھی تک اسی اسٹول پر دونوں ہاتھوں میں اس کی رسٹ واچ کسی مقدس تبرک کی طرح عقیدت کے ساتھ تھامے بیٹھی تھی حیران، گم صم، متحیر اور بے خودی کے عالم میں دیکھتی ہوئی۔ وہ نو منٹ سے پہلے واپس آ چکا تھا۔ حالانکہ اتنی دیر میں وہ سمجھ چکی تھی۔ شاید وہ اب دوبارہ غلاظتوں کے ڈھیر میں واپس نہیں آئے۔ مگر اس کا خیال غلط ثابت ہو گیا تھا۔ وہ واپس آیا مگر اتنا سامان اٹھا کر...... کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو اسے پاگل کرنے لگی تھی۔ وہ بغیر کسی اور چیز کی طرف دھیان دیے جیسے کھانے پر ٹوٹ پڑی تھی۔

مچھلی، چوزے کے گوشت کا سالن اور گرما گرم چاول اس نے سر پلیٹ میں گھسا دیا تھا۔ وہ چمچے، کانٹے کا تکلف کیے بغیر ہاتھوں سے کھانا کھا رہی تھی۔ جبکہ ذی شاہ اسی غم میں آدھا ہوا جا رہا تھا ”جانے اس نے ہاتھ دھوئے بھی یا نہیں۔“

”ہاتھ دھلے ہوئے صاف تھے۔“ اس نے تلی ہوئی مچھلی کا بڑا سا پیس کھاتے ہوئے اطمینان سے جواب دیا تھا۔ وہ کھانے کی طرف متوجہ تھی پھر بھی اس کی سوچ میں گھس گئی تھی۔ وہ بے انتہا حیران ہوا تھا۔ منکشے ابھی تک اسے حیران ہی کرتی آئی تھی۔ وہ منکشے کی پرت در پرت شخصیت کے الجھاوے میں الجھ رہا تھا۔

”کھانا بہت مزیدار تھا۔ بہت شکریہ اے اللہ......“ اب وہ اوپر کی طرف نگاہ اٹھائے نم آنکھوں سے کہہ رہی تھی۔ پورے چار منٹ سے بھی پہلے وہ کھانا ختم کر چکی تھی۔ اب گوشت کی باقیات یعنی ہڈیاں بچی تھیں یا پھر مچھلی کا ایک آدھ قتلا...... جسے ذی شاہ نے احتیاط سے پلیٹ میں ڈھک کر فریج میں رکھنا چاہا مگر فریج بھی گندا تھا۔ کچھ سوچ کر اس نے ایک صافی کو گرم پانی سے بھگو کر گزارے لائق فریج صاف کر ہی دیا تھا پھر ایک، ایک چیز فریج میں ترتیب سے رکھ دی۔ وہ اس دوران دونوں کہنیاں میز پر سجائے ہاتھوں کے پیالے میں منہ رکھے بڑی محویت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اسی بے خودی اور دیوانگی کے عالم میں...... اسی سرشاری اور خواب کی سی کیفیت

میں۔ جیسے اسے یقین نہیں آ رہا تھا، وہ اپنے سامنے اپنے خوابوں کے شہزادے کو دیکھ رہی تھی۔ مشرق کی سرحدوں کے پار سے آنے والا شہزادہ جو مغرب کی ایک پاگل، پاگل لڑکی کا اسیر ہو گیا تھا۔ ان دونوں نے اپنے، اپنے انداز میں بڑی انوکھی محبت کی تھی۔

وہ اپنا کام ختم کر چکا، تب اس کے پیر کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ بھیگی پٹی اب خشک ہو چکی تھی اور خون کی وجہ سے اکڑ چکی تھی۔ اس نے ڈھونڈ ڈھانڈ کر قینچی دریافت کی تھی۔ لاؤنج کے بکھرے پھیلاوے کو پھاندتا منکشے کی نشاندہی پر کسی کپ بورڈ سے فرسٹ ایڈ باکس بھی نکال لایا تھا۔ اب قینچی کی مدد سے بینڈیج کاٹ رہا تھا۔ اگرچہ منکشے اپنے زخم پر مرہم لگوانے کے حق میں نہیں تھی مگر ذی شاہ کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔

اس نے زخم کا جائزہ لیا تو وہ پہلے سے بگڑا نظر آیا۔ ایک آدھ ٹانکا تو اس کے چلنے پھرنے کی کوشش کے باعث اکھڑ چکا تھا۔ اور وہ ایسی باہمت اور دیدہ دلیر تھی کہ زخم کا جی جان سے تکلیف سہہ کر مقابلہ کر رہی تھی۔ وہ تاسف سے اس کا پیر دیکھ کر بولا۔

”زخم کا بروقت علاج نہ کیا جائے تو وہ ناسور بن جاتا ہے۔“ اب وہ باریک بینی سے زخم کا جائزہ لیتا سوچ رہا تھا کہ مزید کیسے ٹریٹمنٹ دے...... کاش کہ وہ ڈاکٹر ہوتا؟ کم از کم منکشے کی تکلیف دور کر دیتا۔

”ناسور تو بن چکا......“ وہ جیسے اذیت سے مسکرا دی تھی۔ ”تم رہنے دو ناں...... یہ خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔“ اسے میٹھی نظروں سے تکتی وہ بے پروائی سے بولی تھی۔ تب ذی شاہ بگڑ گیا تھا۔

”خود کیسے ٹھیک ہو گا؟ جب تک علاج نہ ہو؟“ اس کے تیور برہم تھے۔ اب وہ کسی ڈاکٹر کو بلوانا چاہتا تھا کیونکہ صرف بینڈیج نہیں کرنا تھی، زخم کی صفائی اور ایک آدھ ٹانکے بھی دوبارہ لگنے تھے۔ اسے زخم کی گہرائی میں پیپ بھری بھی دکھائی دے رہی تھی۔

”ڈاکٹر نے جو میڈیسن دی تھیں تم نے استعمال کیں؟“ ذی شاہ نے خاصے متفکر لہجے میں پوچھا تھا۔ جبکہ جواب بے پروائی سے بھرپور تھا۔

”نہیں...... ڈرم میں الٹ دی تھیں۔“ وہ اب اسے میٹھی، میٹھی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”اللہ، یہ قاتل نظریں!“ ذی شاہ کا دل ڈول گیا۔ وہ حتی المقدور کوشش کر رہا تھا کہ منکشے کی طرف نہیں دیکھے کیا قیامت خیز نظریں تھیں۔

”اللہ اکبر......“ اس نے برہم ہو کر اسے گھورا...... ”اس سے بہتر یہ نہیں تھا کہ تم دوائی اس کیمسٹ کے یا میرے ہی منہ پر مار دیتیں۔ وہ بے چارہ خواہ مخواہ کیپسولز میں کوٹا ہوا سفوف بھر رہا تھا۔ اسے خبر نہیں تھی، اس کی بنائی ساری دوائیاں لوگ ڈرم میں الٹ دیتے ہیں۔“ وہ بھگو بھگو کر مار رہا تھا اور منکشے قاتل نظروں سے دیکھتی مسکرا رہی تھی۔

”خدایا ان قاتل نگاہوں پر کوئی دفعہ نہیں لگتی؟ ہزاروں مارتی اور ہزاروں گراتی ہوں گی، یہ قاتل آنکھیں، یہ پاگل آنکھیں۔“ وہ جیسے دل کی حالتِ زار پر بے بس سا سوچ رہا تھا۔ دوسری طرف مسکراہٹوں سے اس کا کام تمام کیا جا رہا تھا۔ پہلے آنسو اور اب مسکراہٹوں کا ہتھیار پکڑ لیا تھا۔ دونوں صورتوں میں گت ذی شاہ کی ہی بننے والی تھی۔

”میں نے دوائیاں ڈرم میں الٹ دی تھیں جبکہ تمہارے دیے ٹشو سنبھال لیے۔“ وہ اس کو مزید حیرتوں کے سمندر میں دھکیل رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں تحیر پھیل گیا۔

”کہاں سنبھالے......؟“ ذی شاہ نے چونک کر پوچھا تھا تب اس نے مورگن روک کے کھلے گھیر میں موجود ایک جیب میں سے ٹشو نکال کر دکھائے مسلے ہوئے میلے کچیلے ٹشو...... ذی شاہ کا جی متلا گیا۔

اس کا خیال تھا زکام زدہ ٹشو محترمہ نے چوغے میں اڑس رکھے تھے مگر اس کا یہ خیال غلط ثابت ہو گیا تھا۔

”یہ نزلے والے نہیں، میرے آنسوؤں میں بھیگے ہیں، مجھے بھیگی اور گیلی چیزیں پسند نہیں...... مجھے گیلے شہروں، گیلی آنکھوں سے نفرت تھی، مجھے من ہائیم سے بھی نفرت تھی۔ اُدھر سرما میں بہت برف پڑتی اور

بارشیں تو اترے ہوتیں۔ سڑکیں، گھر، لان، درخت، پودے سب بھیگ جاتے...... بارش کی وجہ سے شہر بہت گیلا اور برف کی وجہ سے غلیظ ہو جاتا ہے۔ مجھے بس بواریا پسند تھا۔ آہ، میرا بواریا مجھ سے چھن گیا۔'' وہ بولتے، بولتے کہیں کھوئی تھی۔ کانچ سی حسین رنگ بدلتی آنکھوں کا عکس اس کی روح تک میں پھیل رہا تھا۔ اس نے ٹشو کی وضاحت کر کے جتا دیا تھا کہ وہ جو سوچ رہا ہے ٹھیک نہیں، یہ ٹشوز کام زدہ نہیں بلکہ آنسوؤں میں بھیگے تھے خیر، اب تو خشک بھی ہو چکے تھے۔ اب وہ بواریا کے دکھ میں مدہوش ہو گئی تھی۔

''اُف یہ بواریا اب کون تھا؟ کسی کا اسم شریف یا؟''

''مجھے گیلی آنکھوں، غمزدہ چہروں سے بھی نفرت تھی۔ میں دوسروں کے آنسوؤں کو حقارت کی نظر سے دیکھتی تھی۔ حقارت کسی بھی صورت میں ہو، تکبر کی ایک شکل ہوتی ہے اور تکبر اللہ کو پسند نہیں...... اسی لیے آنسو میری سزا بن گئے اور عمر بھر کے لیے میری آنکھوں سے پھوٹ پڑے...... کبھی نہ رکنے کے لیے......'' وہ پھر سے بے آواز رو رہی تھی۔ اسے رونے کے لیے آواز کی ضرورت نہیں تھی۔ ہر سات، آٹھ، دس یا پندرہ منٹ بعد اس کی آنکھیں خود بخود گیلی ہونے لگتی تھیں۔ من ہائیم کی منکشے اور اس کی گیلی آنکھیں اسے گیلے شہروں اور گیلی آنکھوں سے نفرت تھی پھر وہ کیوں اس گیلے شہر میں رہ رہی تھی؟

''من ہائیم کو چھوڑ بھی دیتی تو کیا فرق پڑنا تھا؟ یہ گیلی آنکھیں تو ساتھ تھیں جنہیں خود اپنے ہاتھ سے پھوڑنے کا مجھ میں حوصلہ نہیں۔'' منکشے میٹھی نظروں سے دیکھتی اس کے تاثرات پڑھ رہی تھی، وہ نہ بھی دیکھتی تب بھی ذی شاہ کا چہرہ اور سوچ پڑھنا مشکل تو نہیں تھا؟ کھلی کتاب جیسا چہرہ، جس پر ایک، ایک لفظ لکھا تھا۔

''تم اتنی بہادر ہو کہ یہ کام بھی کر سکتی ہو۔'' ذی شاہ اس کے پیر کو چھوڑ کر ایک مرتبہ پھر بکھری چیزوں سے بچتا بچاتا فون تک گیا تھا۔ توقع تو نہیں تھی پھر بھی اسے ٹیلی فون ڈائریکٹری مل ہی گئی تھی۔ اس نے سب سے قریبی ڈاکٹر کا نمبر دیکھ کر کال کی تھی مگر اس سے بھی پہلے منکشے سے پوچھا تھا۔

''از دیئر آ ڈاکٹر ہو کین اسپیک انگلش......؟''

اس نے احتیاطاً پوچھ لیا تھا کیونکہ یہاں عام طور پر جرمن ہی بولی جاتی تھی۔ منکشے نے بتایا تھا کہ ڈاکٹر انگریزی بولنا جانتا ہے سو اس نے قریبی ڈاکٹر کو فون کر کے بلایا تھا۔ جس نے اگلے پندرہ منٹ میں اس کے زخم کی صفائی کر کے بینڈیج کر دی تھی پھر ذی شاہ کی طرح ہی بکھرے پھیلاوے سے بچتا بچاتا بڑی عجیب سی نظروں سے انہیں دیکھتا آگے بڑھ گیا تھا گویا آنکھوں میں اسے جتا کر گیا تھا۔ ''تم دونوں میاں بیوی بہت بدسلیقہ، پھوہڑ، اور گندے ہو۔''

ڈاکٹر کی نگاہوں نے اسے پانی، پانی کر دیا تھا۔ وہ جیسے اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

''بہت خبیث ڈاکٹر تھا۔'' وہ بھی زیرِ لب بڑبڑا رہی تھی۔ تب ذی شاہ اسے پکڑ کر کارنر والے کمرے تک لے آیا تھا۔ اس کمرے کا حال بھی بہت برا تھا۔ یہ وہی کمرا تھا جسے وہ اپنے کمرے کی گلاس ونڈو سے دیکھتا تھا۔ کھڑکی کے سامنے مخصوص دو پردے لٹکے تھے، ایک سفید جالی دار نائیلون کا پردہ اور دوسرا سلک کا پھولدار ریشمی...... اور سوائے پھولوں سے بھری ٹوکریوں کے کمرے کی ہر چیز بے ترتیب اور غلیظ تھی۔ گندے برتنوں سے لے کر کمرے کی آرائشی چیزوں تک اور بیڈ شیٹ تو جیسے سالوں سے دھوئی نہیں گئی تھی۔ اس کا جی بری طرح اوب گیا تھا۔ کہاں اس کا وہ بیڈ روم جو افراہیم نے سنوارا اور سجایا تھا۔ انتہائی شفاف، خوشبودار اور امپورٹڈ فرنیچر سے سجا...... غسل خانہ اتنا چمکیلا۔ دودھیا ٹائلوں اور شیشوں سے جگمگاتا ہوا۔ اگرچہ فرنیچر یہاں کا بھی بہت اعلیٰ تھا ہر چیز امپورٹڈ تھی، بس صفائی، نفاست اور ترتیب کہیں نہیں تھی۔

وہ گھر جانے لگا تو باہر ایک دم چھم، چھم مینہ برسنے لگا تھا۔ یہاں کی بارشیں ساون کی بارشوں کو مات کرتی تھیں۔ جب دل کیا، برس پڑیں...... وہ لمحہ بھر کے لیے تھم سا گیا تھا۔

''اے ابرِ کرم...... ذرا تھم کے برس......'' اس نے نائیلون کا پردہ ہٹا کر باہر دیکھا...... مینہ چھاجوں چھاج برس رہا تھا۔ باہر گہری رات نے پر پھیلا رکھے تھے، اتنا وقت بیت چکا تھا، اسے گھر بھاگنے کی بے چینی ہوئی۔ اب تک افراہیم بھی آ چکا ہوگا؟ اس نے بے تابی سے سوچا تھا۔ اس کی lexus گیرج میں کھڑی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ذی شاہ نے گردن موڑ کر پردے برابر کر دیے تھے پھر فریج سے پانی کی بوتل، دودھ، جوس اور کچھ پھل وغیرہ نکال لایا تھا۔ جسے اس نے قریب سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

''یہ تمہارے لیے رات کا سامان، صبح ناشتا میں لے آؤں گا۔ تم اٹھنے کی زحمت نہ کرنا۔'' اسے زبردستی دوائی دے کر ذی شاہ نے کچھ ہدایات کی تھیں پھر جیسے مینہ رکنے کا انتظار کرنے لگا تھا۔ اسے امید تھی کہ اگلے پانچ منٹ تک بارش رک جائے گی۔ مگر اس کی امید بارش مزید تیز تر ہوتے دیکھ کر بجھ گئی تھی۔ اس نے پردہ ہٹا کر جیسے پھر سے التجا کی تھی۔

''اے ابرِ کرم...... ذرا تھم کے برس......'' وہ اونچی آواز میں درخواست پیش کر رہا تھا۔ پھر جیسے پیچھے سے آواز آئی تھی۔ مدھم، مسکراتی، ہوش اڑاتی آواز......

''اے ابرِ کرم...... آج اتنا برس، اتنا برس کہ وہ جا نہ سکے۔'' وہ ہتھیلیوں پر نگاہ جمائے کمبل سینے تک اوڑھے دوائی کے زیرِ اثر نیم غنودگی میں تھی۔ ذی شاہ کے ہاتھ سے پردہ چھوٹ گیا تھا۔ وہ جیسے لمحے بھر کے لیے ساکت ہو گیا۔

''میں نے غلط نہیں کہا...... ویسے بھی بارش رکنے والی نہیں۔'' لمبی پلکوں کی جھالریں عارضوں پر گرائے وہ کسی منہ بند گلاب کی کلی جیسا تاثر دے رہی تھی۔ حسین، پُرکشش، اوس میں بھیگی...... ہاں، اس کی آنکھوں سے اب بھی آنسو گر رہے تھے۔ قطرہ، قطرہ، بند پلکوں کے جال میں سے موتی ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے اور اس کے ہونٹوں پر بڑی دل آویز مسکراہٹ تھی اوس گلاب کی پنکھڑیوں پہ گرتی اتنی حسین لگتی ہے؟ ذی شاہ کی نگاہ بھی جیسے منجمد ہو گئی تھی۔

''تم رک جاؤ......'' غنودگی میں اس نے جیسے التجا کی تھی۔ یا اس کی بے آرامی کے باعث کہہ رہی تھی یا پھر بارش میں بھیگ جانے کی وجہ سے؟ وہ سمجھ نہیں پایا تھا۔

''سرما کی پہلی خطرناک بارش ہے، بیمار پڑ جاؤ گے۔'' اسے ذی شاہ کی فکر تھی، وہ جیسے نہال ہو گیا۔

''میں بیمار نہیں پڑتا...... بڑا سخت جان ہوں۔ یہ نرم بوندیں کیا کہیں گی۔'' اس نے مسکرا کر کندھے اچکائے تھے پھر بڑے شرارتی انداز میں پوچھنے لگا تھا۔

''تمہیں مجھ سے ڈر نہیں لگے گا؟'' اس کی آنکھوں میں بھی شرارت بکھر گئی تھی۔ تب اس نے اپنی نم آلود، بوجھل اور موتیوں سے بھاری پلکوں کو بہ مشکل اٹھا کر ذی شاہ کی طرف دیکھا تھا۔

''نہیں......'' وہ بڑی سنجیدگی اور مستحکم انداز میں بولی۔

''کیوں......؟'' ذی شاہ حیران ہوا۔ ''تم تو کمزور بھی ہو، تنہا ہو، بے بس ہو سکتی ہو پھر مجھ پر اتنا اعتبار کیوں؟ میں فرشتہ ہرگز نہیں؟ یہ تم سوچنا بھی مت...... میری ہمدردی، خلوص اور ان عنایتوں سے یہ مت سمجھنا، میں کوئی نیک روح، فرشتہ قسم کا انسان ہوں۔'' وہ جیسے اسے خبردار کر رہا تھا اور منکشے اس پر کچھ اور منکشف کر رہی تھی۔

''میں نہیں سمجھتی، تم کسی ہمدردی، ترس یا خلوص میں اتنی عنایتیں کر رہے ہو...... یہ تو صرف محبت ہے، جسے میں نے تمہاری آنکھوں میں کھوج لیا...... ورنہ اس گھٹن زدہ، بدبودار، غلیظ ماحول میں تم کبھی نہ ٹکتے۔ میں جانتی ہوں، تم بڑے ہی نفیس، تروتازہ اور خوشبوؤں میں بسے رہنے والے انسان ہو اور تمہیں یہاں انسانیت کی تکمیل کرنے، ترس کھانے اور ہمدردی جتانے نے نہیں روکا۔ تمہیں تو مجھ سے محبت ہو گئی ہے۔'' منکشے نے کیسے دھڑ دھڑ دھڑ اس کے دل کی جاگیر پر اپنے قدموں کی دھمال ڈال دی تھی۔ وہ کتنی عجیب گہری ذہین اور اندر تک کھوج لینے والی لڑکی

تھی؟ ذی شاہ جیسے دم بخود ہو گیا تھا۔ وہ سوچتا رہ گیا تھا، کیسے؟ کس طرح......؟ اور کیوں کر اپنی محبت کا صفحہ اس لڑکی کے سامنے کھولے گا جس سے ذی شاہ کو پہلی نظر کی محبت ہو گئی تھی۔ وہ اسے کیسے یقین دلائے گا؟ کس طرح بتائے گا؟ مگر وہ تو سارے پانسے الٹے بیٹھی تھی۔ اظہار کی نوبت ہی نہیں آسکی......اور وہ دونوں ایک دوسرے کو بن کہے پڑھنے لگے تھے۔ لفظ بہ لفظ' حرف بہ حرف، صفحہ بہ صفحہ......

''اب تم جاسکتے ہو......مگر دھیان سے جانا، ٹھہرو، وہ سامنے صوفے پر ایک گٹھڑی رکھی ہے، اس میں سے رین کوٹ نکال لو، باہر بہت تیز بارش ہے، تم بیمار پڑ گئے تو میں بھوکی مر جاؤں گی۔'' وہ آنکھوں پر بازو رکھے تمام تاثرات محفوظ کر گئی تھی۔ ذی شاہ کو اس کا مشورہ بھا گیا تھا۔ اس نے باہر نکل کر لاؤنج میں صوفے پر پڑی گٹھڑی کھولی تو ہر رنگ کے کپڑے ابل کر باہر آگئے، گندے، غلیظ اور بدبودار......اس نے ناک پر ہاتھ رکھے بیڈ پر لیٹی منکشے کو گھورا تھا۔

''کانچ تو تمہارے پیر میں تین دن پہلے چبھا ہے، یہ کپڑوں کا ڈھیر تو یوں لگتا ہے پچھلے ایک سال سے نہیں دھلا۔'' وہ اتنا نفیس، باسلیقہ اور نخریلا تھا کہ حد نہیں۔ ذرا سی گرد برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اور اب پورے ایک گھنٹے سے اتنے گھٹن زدہ اور گندے ماحول میں ٹہلیں کر رہا تھا۔ اس کا طنز محسوس کر کے منکشے بند آنکھوں سے مسکرا دی تھی۔

''دو ماہ پہلے لانڈری گئی تھی پھر وقت ہی نہیں مل سکا۔'' وہ جیسے صفائی پیش کر رہی تھی۔ وضاحت دے رہی تھی، ذی شاہ نے تیور بگاڑ کر جواب دیا۔

''تم ڈوچ لینڈ کی وزیراعظم ہو جو وقت نہیں مل سکا......یہ کہو، انتہائی پھوہڑ خاتون ہو، ایک دم کام چور......میری بہن بندیا کی طرح......'' ذی شاہ زیر لب... بڑبڑاتا کپڑوں کو چھانٹتا......اب بالآخر ایک عدد رین کوٹ ڈھونڈ ہی چکا تھا۔ لیڈیز اسٹائل میں یہ غلیظ اور بوسیدہ باس چھوڑ رین کوٹ فی الوقت اسے بھیگنے سے بچا سکتا تھا۔ تاہم اسے پہن کر افراہیم کے گھر جانے تک کا حوصلہ کرنا بڑا اشکل اور کٹھن ترین تھا۔

''مجبوری میں کچھ بھی کیا جاسکتا ہے۔'' منکشے کمبل میں منہ چھپا کر آخری مرتبہ بڑبڑائی تھی پھر شاید گہری نیند میں چلی گئی۔ وہ اس کے سو جانے کی تسلی کر کے دروازہ اچھی طرح بند کرتا برستے آسمان کے نیچے آگیا تھا۔

''اے محبت......!بس تیری خاطر......'' وہ بھیگتا ہوا بھاگ کر روڈ کراس کر کے سامنے والے گھر کی طرف بڑھ گیا تھا۔ جبکہ دو آنکھیں اس کے اوجھل ہونے تک کھڑکی کے ساتھ چپکی رہی تھیں۔

☆☆☆

وہ چپکے سے لاؤنج میں داخل ہوا تھا یوں کہ کسی کو پتا نہیں چل سکے۔ افراہیم کے گھر کا لاک اندر باہر سے مخصوص نمبروں پہ کھلتا تھا جو اسے بتا دیے گئے تھے سو وہ بہ آسانی اندر آچکا تھا۔ نیچے والے کمرے اندھیرے میں ڈوبے تھے۔ آنٹی اور افراہیم دن بھر کے تھکے ہارے تھے تبھی جلدی سو چکے تھے۔ افریشم ابھی یہیں تھی جبکہ ایمل یقینی طور پر سو چکی تھی۔ وہ دبے قدموں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آگیا تھا۔ رین کوٹ اتار کر اس نے اپنے بازو پر رکھ لیا تھا۔ اس بدبودار کوٹ نے ذی شاہ کو بھیگنے سے بچا لیا تھا۔ سو وہ اسے بڑی پیار بھری نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ ویسے بھی یہ منکشے کا کوٹ تھا۔ چاہے جتنا بھی غلیظ اور بدبودار ہوتا، اسے تو پیارا ہی لگنا تھا۔

وہ اپنے دھیان میں مگن گیسٹ روم کی طرف جا رہا تھا جب اچانک ہال کی گلاس وال سے چپکی ایمل پہ اس کی نگاہ پڑی تھی۔ وہ ایک دم ٹھٹک کر رک گیا۔ ایمل گلاس وال سے ناک چپکائے ابھی تک باہر جھانک رہی تھی۔ اسے امید نہیں تھی کہ ولیس ہاؤس سے نکلتا ذی شاہ اتنی جلدی اور تیزی کے ساتھ اوپر آجائے گا۔ تبھی وہ بڑی معنی خیزی کے ساتھ دیدے گھماتی باہر جھانک رہی تھی۔ مگر یہ کیا......؟ بھاری بوٹوں کی آواز اس کے پیچھے آنے لگی۔ وہ گڑبڑا کر پیچھے ہٹی تو نگاہ ذی شاہ پر پڑی تھی۔

''حت......تم آبھی گئے؟'' ایمل بوکھلا گئی تھی۔ تبھی الٹا سیدھا بول گئی۔ حالانکہ وہ اپنے یہاں کھڑے ہونے کا کوئی جواز بھی دے سکتی تھی مگر واہ ری قسمت......! وہ پکڑی جا چکی تھی۔ کچھ اور نہیں بلکہ ذی شاہ کی جاسوسی کرتی۔

''مجھے آنا ہی تھا...... ہمیشہ کے لیے تو نہیں گیا تھا؟'' ذی شاہ نے خاصی ناگواری سے اپنی لاڈلی فرینڈ کو دیکھا تھا۔ تب ایمل نے بوکھلاتے ہوئے وضاحت کی تھی۔

''میرا مطلب ہے بچ کر آگئے......'' اب وہ بڑی مسرور نظر آرہی تھی۔ گویا وہ اس کے لیے متفکر تھی۔ ذی شاہ غصہ بھلا کر مسکرا دیا تھا۔ حالانکہ اسے مسکرانا نہیں چاہیے تھا۔ وہ ولیس ہاؤس سے نکل کر آرہا تھا۔ رات کے پچھلے پہر، اگر پاکستان ہوتا تو اب تک فسانہ بن چکا ہوتا۔ ایک جوان لڑکی کی تیمارداری کر کے آنے کا جرم معمولی تو نہیں تھا۔

''ہاں، چھپکلی......!بس بچ کر آگیا......اس رین کوٹ کی بدولت......ورنہ بارش تیز تھی۔'' اس نے مسکرا کر وضاحت کی تھی۔ ہمیشہ کی طرح ذی شاہ کے چھپکلی کہنے پر اس نے وضاحت نہیں مانگی تھی اور نہ چھپکلی کے معانی پوچھے تھے۔ ورنہ وہ اس کے پیچھے ہی پڑ جاتی تھی۔ مگر اس وقت خاصی مدبر نظر آرہی تھی جیسے کچھ سوچ رہی تھی۔

''بارش کی بات کون کر رہا ہے؟ وہ تو اندھوں کو بھی رین کوٹ نظر آسکتا ہے، جس کی بدولت بارش کے قطرے ذرا بھی نہیں بھگوتے۔ میں تو لیڈیز رین کوٹ دیکھ کر کچھ حیران ہوں......تم خبطی آنٹم کے گھر سے آرہے ہو، پھر اس کے ہاتھوں زندہ کیسے بچ گئے؟'' محترمہ نے آنکھیں میچ کر جیسے اس کے ہاتھ سے سارے طوطے، کبوتر، اڑا دیے تھے، صحیح معنوں میں چودہ طبق روشن کرنا اسی کو کہتے ہیں۔ ذی شاہ گڑبڑا کر رہ گیا تھا پھر جیسے سنبھل کر اسے ڈپٹتے ہوئے بولا۔

''خبطی آنٹم کوئی درندہ صفت انسان نہیں......بے ضرر سی بیمار لڑکی ہے۔ میں اس کی احوال پرسی کرنے گیا تھا۔'' کچھ سوچ کر ذی شاہ نے وضاحت کر دی تھی۔ ورنہ اس لسوڑی نے پیچھا نہیں چھوڑنا تھا۔

''اور تیمارداری کر کے آگئے؟ اور وہ بھی زندہ سلامت......؟'' ایمل نے ڈیلے گھما کر چالاکی سے کہا تھا۔ وہ اسے گھور کر رہ گیا تھا۔ ''اللہ، یہ یورپین تیز طرار، چالاک، ہوشیار، بچے......بابے آدم کے وقتوں کی باتیں بھی کر لیتے ہیں؟ توبہ توبہ۔''

''نظر نہیں آرہا تمہیں؟'' وہ ڈپٹ کر بولا تھا۔

''یقین نہیں آرہا...... نظر تو بہت کچھ آرہا ہے......'' اس نے معنی خیزی کی انتہا کر دی تھی۔ ذی شاہ کے ڈیلے ابل کر باہر آگئے۔

''ہیں......کیا، کچھ......دیکھ لیا تم نے چھپکلی......! بہت چالاک ہو تم تو بچ کر رہنا پڑے گا۔'' وہ جیسے خود کو آنے والے حالات کے لیے تیار کر رہا تھا۔ ورنہ یہ سفید چھپکلی تو آنکھوں میں گھسنے والی تھی۔

''مجھے بھی تو پتا چلے......؟ کیا کچھ نظر آرہا ہے؟'' ذی شاہ چبا چبا کر بولا تھا۔ تب وہ بے اختیار ہنسنے لگی۔

''غصہ کیوں کرتے ہو، میں تو تمہاری دوست ہوں......مجھ سے بھی پردہ داری......ویسے میری بہن افریشم کی لو اسٹوری بھی میرے ہاتھوں انجام کو پہنچی تھی۔'' وہ قل، قل ہنسنے لگی تھی۔ یعنی پوری طرح جاسوسی کر کے اب دلائل سے بات کر رہی تھی۔

ذی شاہ نے سر تھام لیا تھا۔ وہ ایمل کے ہاتھوں لاجواب ہو چکا تھا اور ایمل صاحبہ اپنے تکّے پر اترائے جا رہی تھیں۔

''میں نے دیکھ لیا تھا تم اتنے پیسے خرچ کر کے اس ناکارہ اور بیروزگار خبطی لڑکی کے لیے راشن کا ڈھیر خرید کر لائے تھے۔ پھر ڈاکٹر بھی اسے چیک کرنے آیا تھا۔ ڈاکٹر کو فیس بھی تمہی نے دی ہوگی۔ یہ سب ایسے تو نہیں کیا جاسکتا......'' ایمل نے کھلکھلاتے لہجے میں بتایا تھا۔ جیسے ذی شاہ کی چوری پکڑ کر بہت خوش ہو رہی تھی۔ وہ ایک دم جھنجلا گیا تھا۔

''انسانی ہمدردی بھی کسی چڑیا کا نام ہے۔ وہ بے چاری تین دن سے بھوکی پیاسی مر رہی تھی۔'' اسے دکھ

سا ہوا تھا۔ محبت ایک طرف، وہ منکشے کی بے بسی پہ اندر تک تھرا گیا تھا۔ اس قسم کے حالات سے اگر ذی شاہ کو گزرنا پڑتا تب......؟ بس یہاں آ کر اس کی سوچ بلاک ہو جاتی تھی۔

''اور ''محبت'' وہ کس چڑیا کا نام ہے؟ تم مجھے چکما نہیں دے سکتے؟'' ہر وقت تو آنکھیں چپکائے گلاس ونڈو میں کھڑے اسے تاڑتے ہو، جاگنگ پہ جاؤ یا واک کرنے، آتے جاتے ولیس ہاؤس کی زیارت ضرور کرتے ہو...... پھر میں بھلا کیوں نہ سمجھوں......''

ایمل نے آنکھیں گھما کر جیسے اسے لاجواب کر دیا تھا۔ وہ یورپ کی لڑکی تھی، مغرب کی پیدائش، انٹرنیٹ کے دور کی...... انتہائی تیز طرار ذہن رکھنے والی پھر وہ اس سے کیسی امید رکھ سکتا تھا؟ ایمل کوئی پاکستان کے کسی دیہات سے نہیں آئی تھی۔ وہ یہاں کی مٹی سے گوندھی گئی تھی۔ تیز رفتار لوگ، تیز رفتار زندگی جینے والے، تیز ترین ذہن رکھنے والے لوگ...... بھلا اس کا موازنہ وہ اپنے ہاں کے کسی تیرہ چودہ سالہ بچے کے ساتھ کر سکتا تھا۔ اور اب تو اس کے دیس، وطن اور پیارے پاکستان کے بچے بھی فطری معصومیت سے انٹرنیٹ اور آزاد میڈیا کی وجہ سے مبّرا ہو چکے تھے پھر ایمل تو یہاں کا کرشمہ تھی۔ کیسے نہ ہوشیاری کے کرشمے دکھاتی۔

''اب چپ کیوں کھڑے ہو؟ جلدی سے پھوٹ بھی چکو...... مخبطی آئٹم تمہاری فریون ون (محبوبہ) ہے ناں...... تم اس سے لو کرتے ہو؟ تبھی اتنا خیال رکھتے ہو......'' وہ سر سے لے کر پیروں تک پُریقین کھڑی تھی پھر ذی شاہ کیسے انکار کر دیتا...... اس کے کندھوں تک آتی بانس جتنی لمبی اس گوری ذرا زرد، زردی پیلی نیلی لڑکی نے ذی شاہ کو گھما ڈالا تھا۔ جھوٹ بولنے کا فائدہ کوئی نہیں تھا پھر وہ کیسے غلط بیانی کرتا؟

''ہاں...... ناں...... پر پلیز...... تم کسی کو مت بتانا......'' اس نے احتیاطاً التجا کر دی تھی۔

''نہیں بتاؤں گی...... پر تم نے دل غلط جگہ پر اٹکا لیا۔'' وہ خاصی منہ پھٹ اور باتونی تھی۔ سو فوراً اس کی ہمدردی میں بولی تھی۔ وہ کچھ چونک گیا تھا۔

''کیا مطلب......؟'' ذی شاہ چونکا۔

''وہ لڑکی بہت خطرناک...... ہے، یقین کرو، تمہیں کوئی نقصان نہ دے۔ آفٹر آل ہمارے مہمان ہو تم۔'' ایمل نے خلوص سے کہا تھا۔ اسے ذی شاہ کی فکر تھی۔ وہ اس کے بھائی کا دوست تھا۔ اور بھائی جیسا ہی پیارا ہو گیا تھا۔

''ایسا کچھ نہیں ہوگا......'' اس نے پیار سے ایمل کے گال تھپتھپائے تھے۔ ''پیاری چھپکلی! اب تم جا کر آرام کرو۔ باقی جاسوسی بعد میں کر لینا۔ رات بہت ہو چکی ہے۔'' ذی شاہ رین کوٹ کو دوسرے بازو پر منتقل کرتا مسکرا دیا تھا تب ایمل کچھ مچل گئی تھی۔

''پہلے بتاؤ، چھپکلی کسے کہتے ہیں؟ اس کا مطلب کیا ہے؟'' ایمل اب اسے چھوڑنے والی نہیں تھی۔ ذی شاہ کو جان بچانا مشکل ہو گیا تھا۔ پھر وہ کچھ سوچ، سوچ کر بتانے لگا تھا۔ جیسے دیواروں سے چپکی مخلوق کا نقشہ کھینچنے لگا۔

''ہمارے ہاں...... ایک زردی، کچھ سفید اور لجلجی سی ایک مخلوق ہے، دیکھنے میں بڑی کیوٹ نظر آتی ہے، لڑکیاں عموماً اسے دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتی ہیں۔ مگر مجھے ڈر نہیں لگتا...... بہت کیوٹ لگتی ہے، تمہاری طرح......'' وہ بہ مشکل مسکراہٹ روکے بڑی سنجیدگی کے ساتھ بتا رہا تھا جبکہ ایمل نہال ہوتی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ذی شاہ جان چھڑا کر گیسٹ روم کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جب ایمل بھی سیڑھیاں اترتے ہوئے اونچی آواز میں بولی تھی۔ وہ بہت پُرجوش اور خوش نظر آ رہی تھی۔

''اب کہ پاکستان سے آئے ناں...... تو میرے لیے چھپکلی کا ایک بچہ لے آنا۔ میں اسے بلی کے ساتھ ہی سنبھال کر پالوں گی۔ جیسے مچھلیاں پالتی ہوں......'' ایمل کی فرمائش اسے قہقہہ لگانے پر مجبور کر گئی تھی۔ وہ بیڈ پر اوندھا لیٹا ہنس، ہنس کر بے حال ہو گیا تھا۔ ایمل اس کی چھوٹی سی دوست، افراہیم کی بہن اور بندیا جیسی مشرقی، کھوجی اور حاضر دماغ یورپ کی کچھ، کچھ ہوشیار لڑکی...... مگر معصومیت اور بھولپن کمال کا۔ وہ ایمل کے لیے اب رائے بدل چکا تھا۔

ایمل کی اکثر عادتیں بندیا سے ملتی تھیں، وہ بندیا کی طرح کچھ، کچھ جھگڑالو، دوسروں کی ٹوہ میں رہنے والی مگر فطرتاً پُرخلوص لڑکی تھی۔ ایمل اگر افراہیم کی بہن نہ ہوتی تو ذی شاہ کا دل بھی یہاں نہ لگتا...... وہ جلد ہی ہوٹل میں شفٹ ہو جاتا...... مگر ایمل کی وجہ سے اس کا خوب دل لگ گیا تھا۔ وہ تھی ہی اتنی پیاری، ہنس مکھ، شوخ اور مزاحیہ......

آنٹی کہتی تھیں، ایمل کی عقل گھٹنوں سے ہوتی ہوئی ٹخنوں میں چلی گئی ہے۔ جبکہ ذی شاہ کے نزدیک وہ خاصی ذہین اور عقلمند تھی۔ اکثر اسے بڑے کمال کے مشورے دیتی تھی اور کبھی، کبھی منکشے کے متعلق چونکا دینے والی باتیں کرتی تھی۔ وہ ہر لحاظ سے معلومات کا خزانہ تھی تاہم ولیس ہاؤس کے بارے میں اکثر اپنی رائے محفوظ کر لیتی تھی۔

رات بھر بارش خوب برس کر صبح کو نہ جانے کس دیس سدھاری تھی۔ اگلا دن چمکدار تھا۔ گیلی سڑکیں خشک ہونے لگی تھیں۔ سبزہ دھل کر پہلے سے زیادہ شفاف ہو چکا تھا۔ ہریالی جوبن پر تھی۔ پھول پودے نکھر چکے تھے۔

وہ تازہ دم ہو کر پرفیوم اسپرے کرنے کے بعد آفٹر شیو لوشن منہ پر لگا رہا تھا جب افراہیم اندر چلا آیا۔

''سلامتی ہو...... پھر صبح اٹھ گئے، ہماری تو مجبوری ہے، تم تو سوتے رہا کرو۔'' وہ سلام بھیج کر بڑے خوشگوار لہجے میں بول رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی افراہیم کی آنکھوں میں ستائش بھر گئی تھی۔ اور یہ ستائش ذی شاہ کے لیے نئی نہیں تھی۔

''تم پر بھی سلامتی ہو، ایں...... یہ کیا؟ میں کیوں پوستیوں کی طرح بستر میں گھسا رہوں؟ صبح خیز ہوں، اپنی عادتیں خراب نہیں کر سکتا۔'' اس نے جواباً مسکراتے ہوئے وضاحت کی تھی۔ وہ سر ہلا کر جیسے تائید

کرنے لگا۔ پھر جس کام کے لیے آیا تھا، اسی کے متعلق پوچھنے لگا۔ اسے دفتر سے دیر ہو رہی تھی۔ اسی لیے جلدی جلدی بات ختم کرنا چاہتا تھا۔

''ڈوچ سیکھنے کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' وہ سنجیدہ تھا، ذی شاہ نے بھی سنجیدگی سے کندھے اچکا کر کہا تھا۔

''ٹھیک خیال ہے، اس دن ہیر لخ کا ڈائریکٹر بھی یہی کہہ رہا تھا۔'' وہ افراہیم کو دیکھتا بال بنانے لگا۔ افراہیم نے سر ہلا دیا تھا۔

''ڈوچ سیکھنا یہاں رہنے کے لیے ضروری ہے۔ ایک دو ہفتے لگا لو کسی انسٹی ٹیوٹ میں، تم جلدی امپروو کر جاؤ گے۔'' افراہیم نے مسکرا کر کہا تھا۔ وہ جلدی اس کا ایڈمیشن بھی کروانے والا تھا۔

''ویسے انسٹی ٹیوٹ جانا ضروری نہیں، تمہارے اپنے گھر میں اتنا بڑا انسٹی ٹیوٹ موجود ہے۔'' اس کا اشارہ ایمل کی طرف تھا۔ وہ جیسے سمجھ کر مسکرا دیا تھا۔

''ہاں، یہ تو ہے...... ایمل سے کلاسز لے لو، ایک دم ایکسپرٹ ہو جاؤ گے۔'' افراہیم بھی اسی کے انداز میں بولا تھا، تب جیسے ذی شاہ نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا تھا۔

''میری ڈوچ خاصی امپروو ہو چکی ہے، ایمل کی کلاسز میں شاید اتنی نہ ہوتی جس قدر اس کی کمپنی فائدہ مند رہی۔'' وہ ایمل کو سراہ رہا تھا۔ افراہیم نے جیسے ڈر کر کہا۔

''اب اس کے سامنے تعریف نہ کر دینا...... محترمہ اگلے تین سال تک اتراتی رہیں گی۔'' وہ کانوں کو ہاتھ لگا رہا تھا۔ ایمل کے مزاج سے سب ہی واقف تھے۔ ایمل اپنی تعریفوں پر گردن اکڑا لیتی تھی پھر یہ کلف سالوں تک نہ اترتی۔

''میں ایسی عظیم غلطی کا مرتکب کیسے ہو سکتا ہوں۔'' ذی شاہ بھی جواباً مسکرایا تھا تب اسے چوتھی مرتبہ مرر دیکھتے ہوئے افراہیم گویا چڑ گیا تھا۔ وہ کب سے اسے بار بار مرر دیکھتا، بال سنوارتا، کالر ٹھیک کرتا دیکھ رہا تھا۔ اب چڑ کر رہ نہ سکا۔

''سنگھار مکمل ہو گیا ہے تو گرما گرم ناشتا کر لو۔

میں اب آفس کے لیے نکلتا ہوں۔'' افراہیم نے اس کا کندھا ہلایا تھا۔ پھر بازو دبوچتا نیچے آنے لگا تب اس کی نگاہ زنانہ رین کوٹ پر پڑی تھی۔ وہ ایک دم ٹھٹک کر رک گیا تھا۔

''یہ رین کوٹ کس کا ہے؟'' سوال میں سادگی نہیں تھی البتہ لہجہ ضرور سادہ سا تھا۔ ٹاول اسٹینڈ پر لٹکا رین کوٹ سوالیہ نشان بن گیا تھا۔

''آں...... ہاں......'' ذی شاہ رک سا گیا۔ ''یہ کل میں لایا تھا......'' اس سے بات نہیں بن پڑی تھی۔ مگر پھر بھی افراہیم اتنی سی دلیل پر مطمئن سا ہو گیا تھا۔ اس نے مزید کوئی سوال نہیں پوچھا تھا۔ بلکہ جاتے، جاتے صرف اتنا کہا۔

''ہیرلخ کا ڈائریکٹر، میرا بہنوئی تمہیں پسند آیا؟ میں نے اسے تمہارا نہیں بتایا۔ ورنہ شاندار پروٹوکول دیتا۔ تم نے منع جو کر رکھا تھا۔'' افراہیم کو قلق سا ہوا۔ کیا تھا جو ذی شاہ بتانے دیتا۔ اس کے بہنوئی کی جرأت تھی جو وہ صرف پروفیشنل ڈیلنگ کرتا...... مگر یہ رولز یہ جان دینے والا اس کا دوست...... اس نے سختی سے منع کر رکھا تھا کہ کاروبار میں رشتے داریوں کے ڈھنڈورے نہیں بجانے...... ورنہ تو صورتِ حال کچھ مختلف ہوتی۔

''بہت اچھا کیا تم نے...... اور ویسے تمہارا بہنوئی بہت شاندار ہے۔ ایک دم چاکلیٹی ہیرو...... بس تھوڑا سنجیدہ تھا۔'' اس کی آنکھوں کے سامنے علی عیسیٰ کا شاندار سراپا جگمگا گیا۔ کیا تھا جو افراہیم کے بہنوئی کا نام علی عیسیٰ نہ ہوتا...... کچھ اور ہو جاتا مگر علی عیسیٰ نہ ہوتا...... مگر اس کے چاہنے سے بھلا کیا ہو سکتا تھا؟ ہر خواہش پوری ہونے کے لیے تو نہیں ہوتی۔

''سنجیدہ تو نہیں...... خیر آفیشل ایشوز پر بے انتہا سنجیدہ ہو جاتا ہے۔'' افراہیم کچھ سوچ کر بڑے پیار سے علی عیسیٰ کا ذکر کر رہا تھا۔ تب ذی شاہ اس کے برابر چلتے ہوئے ذرا سرسری سے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

''ہیرلخ کے علاوہ کوئی اور کمپنی ایسی نہیں، جس کا مالک پاکستانی ہو اور جس کا نام بھی علی عیسیٰ ہو۔'' وہ اگرچہ بہت سرسری انداز میں عام لہجے اور بے پروائی سے پوچھ رہا تھا پھر بھی افراہیم ذرا رک گیا۔ اس کے رکنے کی وجہ موبائل کی وائبریشن تھی۔ اس کا فون بج رہا تھا یعنی کوئی آفیشل کال آگئی تھی۔ پھر وہ ذی شاہ سے ایکسکیوز کرتا اپنے آفس چلا گیا تھا اور ذی شاہ سر جھٹک کر ڈائننگ روم میں آگیا۔ افراہیم کی ممی کچن میں تھیں، افریشم فون پر بات کر رہی تھی جبکہ ایمل کھانے میں مصروف تھی۔ اس نے مشترکہ طور پر سب کو سلام بولا تھا تب ایمل کریم کیک کھاتے ہوئے ناگ (ہیلو) کہنے کے بعد دوبارہ سے اپنے شغل میں مصروف ہو گئی تھی۔ افریشم کچھ عجلت میں دکھائی دے رہی تھی۔ اسے مسکرا کر سلام کہا اور پھر فون پہ مصروف ہو گئی۔

''عیسیٰ نے ناشتا کر لیا؟ اس کی طبیعت کیسی ہے؟ میں بس نکل رہی ہوں، عیسیٰ کو فون پکڑاؤ......'' افریشم اشارے سے سب کو چیوس بولتی باہر نکل گئی تھی۔ تب آنٹی اور ایمل بھی اس کے پیچھے بھاگیں۔

''بیٹا......! تمہارا ناشتا میز پر لگا دیا ہے۔ میں اور ایمل ذرا افریشم کو چھوڑنے جا رہی ہیں۔ تم دھیان سے ناشتا کر لینا۔'' آنٹی نے معذرت خواہانہ انداز میں اجازت چاہی تھی۔ پھر وہ اسے خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گئی تھیں۔ ذی شاہ نے ان کے چلے جانے کے بعد گہری سانس کھینچی پھر جیسے سجی سجائی میز کو دیکھ کر اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ قدرت نے اسے ایک سنہرا موقع فراہم کیا تھا۔ وہ جیسے نہال ہو کر ناشتے کے لوازمات پیک کرنے لگا۔ آج اس نے بیڈ روم کی کھڑکی کا جالی دار سفید مہین پردہ اٹھا کر ولیس ہاؤس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ جب وہ سیدھے طریقے سے جا سکتا تھا تو پھر خود کو انتظار کی کوفت میں مبتلا کیسے کرتا؟

منکشے کا رین کوٹ کندھے پر لٹکائے وہ ٹفن میں ناشتا پیک کیے دوسرے ہی لمحے ولیس ہاؤس میں موجود تھا۔ بالکل کل والا ہی منظر، گندگی، بے ترتیبی، پھیلاوا...... جوتے، کپڑے، جرابیں بکھری پڑی تھیں۔ برتن، کشن، کتابیں، اخبار تک کارپٹ پر گرے تھے۔ وہ

بچتا بچاتا کارنر والے کمرے تک گیا تھا۔ توقع کے عین مطابق بیڈ روم کی حالت بھی قابلِ رحم تھی۔ منکشے کا کمبل زمین کو سلامی دے رہا تھا۔ تکیے، کشن، زمیں بوس تھے، دودھ کی بوتل جوں کی توں پڑی تھی تاہم پانی کی بوتل خالی تھی۔ فروٹ بھی ویسا جیسا تیسا پڑا تھا، یعنی محترمہ نے کھانے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ وہ صرف اتنا ہی کھاتی تھی جس سے زندہ رہ سکے۔ مگر یہاں آکر اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا تھا۔ وہ تب کھاتی تھی جب مرنے کے قریب ہو جاتی، وجود بوجھ اٹھانے سے قاصر ہو جاتا، چلنے پھرنے میں دشواری... آجاتی، کمزوری کی وجہ سے چکر آنے لگتے۔ وہ ذی شاہ کی زندگی میں آنے والا عجیب... کردار تھی۔ اور اپنی حرکتوں سے اسے حیران کر رہی تھی۔ وہ عام لڑکیوں سے بہت مختلف تھی۔ اس نے اپنی پوری زندگی میں اتنی عجیب لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ اس نے ذی شاہ کے بے انتہا اصرار اور مجبور کرنے پر بھی ناشتا نہیں کیا تھا۔ وہ اسے بھوک نہیں ابھی کہہ کر ٹالتی رہی تھی۔ سو وہ مزید اصرار کیے بغیر خود ڈٹ کر ناشتا کر کے ایک ڈیڑھ گھنٹا گزارنے کے بعد واپس آگیا تھا۔

اگلے کچھ دن وہ تین وقت کا کھانا ریسٹورنٹ سے بکنگ کے ذریعے منگواتا رہا تھا۔ ہوم ڈیلیوری سروس کی بدولت کھانا تین وقت ولیس ہاؤس میں ڈیلیور ہو جاتا تھا۔ وہ اگلا ڈیڑھ ہفتہ ولیس ہاؤس جا ہی نہیں سکا۔ انسٹی ٹیوٹ کی مصروفیت نے اسے چکرا کر رکھ دیا تھا۔ تاہم وہ اتنا ضرور جانتا تھا منکشے کا پیر اب ٹھیک ہے، اسے چلنے پھرنے میں دشواری کا سامنا نہیں...... کھانا بھی اسے تین وقت مل رہا تھا، اپنے تئیں وہ بڑی ذمے داری کے ساتھ اپنا فرض ادا کر رہا تھا۔ مگر یہ تو اسے چھٹی کے دن پتا چلا تھا کہ اس کا بھیجا تمام کھانا اور کھانے پینے کا سامان کچھ تو پھپھوندی لگ کے خراب ہو گیا تھا اور کچھ کچھ چوہوں نے اپنے پیٹ میں اتار لیا تھا۔

ذی شاہ کو منکشے کے اس عمل نے دھچکا پہنچایا تھا۔ یعنی اسے ذی شاہ کے جذبات کی کوئی پروا نہیں تھی؟ وہ اس کی محبت اور خلوص کو ایسے خاک کر رہی تھی؟ اس کا دل جیسے بجھ گیا تھا اور دماغ گرم ہونے لگا۔ مگر منکشے کی نازک حالت اسے غصے کا بھرپور اظہار کرنے نہیں دے سکی تھی۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ نڈھال تھی۔ چلتی تو چکرا کر گر پڑتی۔ وہ لمحے کے ہزارویں حصے میں سمجھ چکا تھا۔ وہ بھوکے رہنے کی وجہ سے گرتی پھر رہی تھی۔ وہ جان بوجھ کر ہزار نعمتوں کے باوجود کچھ نہیں کھاتی تھی، چاہے کھانا ہوتا یا نہ ہوتا پھر اگر خوراک کو پھپھوندی لگ جاتی یا کھانا باسی ہو جاتا تب کہیں مرنے کے قریب پہنچ کر اسے خوراک کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ جیسے اب اتنے دن بعد اسے خوراک کی ضرورت تھی۔ جبکہ کھانا اتنے دن کا اب کھانے کے قابل نہیں تھا۔ باسی شدہ... بدبودار اور خراب ہو چکا تھا۔ کھانا ریسٹورنٹ سے آنا بند ہو چکا تھا کیونکہ ذی شاہ نے نئی بکنگ ابھی نہیں کروائی تھی۔ یہاں آکر اتنا مہنگا کھانا ڈرم میں الٹتے ہوئے اس کا دل بہت برا ہوا تھا۔ نعمتوں کی ایسی ناقدری اور ناشکری؟ اب جبکہ کھانے کو کچھ نہیں تھا، بریڈ..... اور کیک وغیرہ باسی ہو چکے تھے، کھانا ڈرم میں الٹا جا چکا تھا۔ اب اسے خوراک کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی اور وہ رس بھری کا جار پکڑے ندیدوں کی طرح مربہ کھا رہی تھی، جیم اور مربے کے علاوہ گھر میں اور کچھ نہیں تھا۔ خالی معدے میں کچھ اترا تو منکشے کے حواس بحال ہو گئے تھے۔ وہ شیرے سے لتھڑے ہونٹ چوستی ذی شاہ کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

''اتنے دن سے کہاں غائب تھے؟ جیسے بھول ہی گئے تھے۔'' وہ سر جھکائے شکوہ کر رہی تھی۔ اداس، غمگین اور نمناک......

''تم کوئی رف ہوئی فائل نہیں جسے بھول جاؤں۔'' وہ ناراضی بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا گھر میں بکھرے پھیلاوے کو دیکھ کر غصہ دوچند ہو رہا تھا۔ وہ تندرست ہونے کے باوجود گھر کی صفائی اور پھیلاوا نہیں سمیٹ سکی تھی۔ منکشے اتنی بے حس اور بے پروا کیوں تھی؟ اسے بھلا غصہ کیوں نہیں آتا؟ ایک تو کھانے کی ایسی بے حرمتی اور دوسرا گھر کی بے

ترتیبی...... اس کا پارہ چڑھتا جا رہا تھا۔ اوپر سے محترمہ کے شکوے کمال کے تھے۔

''تو پھر کہاں غائب تھے؟'' آنسو بلاوجہ ہی گرنے لگے تھے۔ پلکوں کی گھنی جھالروں میں اٹکنے لگے تھے۔ سمندر آنکھیں قطرہ، قطرہ بہہ رہی تھیں۔

''کام میں مصروف تھا۔'' وہ چڑ کر بولا۔ پھر جیسے اس پر کوئی بھوت سوار ہوگیا تھا۔ ایک دم اپنی جگہ سے اٹھ کر لاؤنج سے لے کر کچن تک ایک، ایک چیز سمیٹ ڈالی تھی۔ کپڑوں کا ڈھیر اٹھا کر لانڈرنگ کے لیے رکھ آیا تھا، جوتے سارے کیبنٹ میں گھسائے۔ برتن کچن میں سنک کے اندر رکھ کر ٹونٹی چلائی اور سارے برتن دھو دھلا کر شیلف میں سجا دیے تھے۔ فریج اور کیبنٹ تک کو دھو ڈالا۔ الماریوں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کے بیڈ شیٹ نکالی کارنر والا کمرا چمک دمک گیا تھا۔ باقی کمرے لاکڈ تھے۔ بس لاؤنج، کارنر والا کمرا سٹنگ روم کھلا تھا جس کی حالت انتہائی خراب تھی اور اب جیسے کسی نے جادو کی چھڑی پھیر کے منظر بدل دیا تھا۔

وہ نہ جانے کتنے دن سے مورگن روک پہنے ہوئے تھی۔ ڈھیلا ڈھالا سا لمبا چوغہ جو پیروں میں الجھ رہا تھا مسلی ہوئی سلوٹ زدہ جگہ جگہ سے اکھڑی جھالریں جھول رہی تھیں، کچھ فرش پر لٹک رہی تھیں۔ اس کے بال اتنے بوسیدہ اور گندے تھے جیسے صدیاں بیت چکی تھیں اور انہیں شیمپو نہیں کیا گیا تھا۔ الجھے، بے رونق مگر انتہائی لمبے، یقیناً بالوں کا رنگ بلونڈ تھا مگر خیال نہ رکھنے کی وجہ سے اپنی اصلی رنگت کھو چکے تھے۔

وہ ہکا بکا سی کچن کو جاتے اسٹیپس پر بیٹھی اسے اِدھر اُدھر گھوم کر کام کرتے دیکھ رہی تھی، اس کی آنکھوں میں تحیر اور خوشی کے آنسو تھے، گیلی آنکھوں والی لڑکی منجمد بیٹھی تھی جیسے سفید برف کا کوئی مجسمہ ہو۔

اور ذی شاہ اِک طائرانہ نظر ڈال کر جیسے مطمئن اور پُرسکون ہو کر اس کے قریب آخری کونے پر آ کر بیٹھ گیا تھا۔ اگرچہ اس کا اپنا حلیہ بگڑ چکا تھا تاہم اس کے آس پاس کا ماحول شانت کرنے کے لیے کافی تھا۔ وہ بالوں کو ہاتھوں سے سنوارتا جیسے اٹھنے کے لیے پر تول رہا تھا۔ کیونکہ اپنا رف حلیہ اسے الجھن زدہ کر رہا تھا۔ وہ تو ہر لمحہ اتنا بن ٹھن کر تیار شیار رہتا تھا جیسے ابھی کسی کا ولیمہ اٹینڈ کر کے آیا ہو۔ نہایا دھویا، ترو تازہ، مہکیلا، خوشبودار...... بہترین لباس زیب تن کیے، جس پہ شکن ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی تھی اور اب خوب میلا، میلا ہو رہا تھا مگر اسے اپنے حلیے پہ قطعاً افسوس نہیں تھا۔ وہ اپنی خوشی سے یہ سب کر چکا تھا۔ درپردہ منکشے پر یہ جتانا مقصود تھا کہ وہ کس قسم کا ماحول اپنے آس پاس بنائے ہوئے ہے؟ ایسے حالات رہے تو کون یہاں جھانکے گا؟ وہ خود ہی ایک دن دھول مٹی ہو جائے گی اور یہ کہ اپنی زندگی کی بے ترتیبی کو اسے خود ہی بدلنا ہوگا۔ وہ جیسے لفظ جوڑ رہا تھا۔ جب منکشے اپنی گیلی آنکھوں کو رگڑتے ہوئے اس کا کندھا ہلانے لگی تھی۔

''یہ سب جو تم نے کیا؟'' وہ اتنی بے خود اور حیران تھی کہ اس سے بات کرنا بھی محال تھا۔ جیسے اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ جیسے وہ بے یقینی کی کیفیت میں تھی۔

''یہ سب...... مجھے کرنا ہی تھا۔'' ذی شاہ اسی کے انداز میں بولا تھا۔ ''تاکہ تمہیں بتا سکوں، بے ترتیبی مجھے پسند نہیں۔ گندگی سے مجھے نفرت ہے اور ایسے کام پاکستان میں میرے گھر کے نوکر کیا کرتے ہیں۔'' اس نے منکشے کی گیلی آنکھوں میں خوشی اترتی دیکھی تھی۔ وہ سر جھکائے اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو دیکھ رہی تھی۔ لکیروں میں کیا لکھا تھا؟ شاید کچھ بھی نہیں...... وہ بددل ہوگئی تھی۔

''یہاں سے تمہیں کیا ملے گا؟'' اس نے گردن موڑ کر منکشے کی ہتھیلی پر نظر جمائی۔ ''اگر کچھ پانا چاہتی ہو تو عمل کی طرف توجہ دو...... عمل کے بارے میں مجھ جیسا پریکٹیکل بندہ ہی تمہیں بتا سکتا تھا۔ خود اپنے ہاتھوں سے عمل کر کے...... جب کل میں آؤں تو یہاں، وہاں کچھ بکھرا نہ ہو۔'' وہ جیسے اسے تنبیہہ کر رہا تھا۔ منکشے نے سر جھکا لیا۔ گیلی آنکھیں ایک تواتر سے بہہ رہی تھیں۔

''اللہ یہ اس کی آنکھیں کبھی خشک نہیں

ہو سکتیں۔'' وہ جیسے بے بس سا ہوگیا۔

''تم...... تم بہت اچھے ہو، میرے خیالوں سے بڑھ کے مگر میں اچھی نہیں ہوں۔'' اس کے بوجھل پن کی وجہ ذی شاہ کو سمجھ آ گئی تھی۔ وہ خود ترسی کا شکار تھی۔ تنہائی نے اس کی مثبت سوچوں کو نگل لیا تھا۔ اس کے اندر تحریک پیدا نہیں ہوتی تھی۔ ذی شاہ کو لگا تھا اس کے سامنے ایک اور مالا آ کھڑی ہوئی ہے، زندگی سے بیزار، ویران اور جیسے اپنی سانسیں پوری کرتی ہوئی۔ اس عمر میں یہاں کی لڑکیوں کے بے شمار کام اور بے انتہا مصروفیات ہوتی تھیں۔ بوائے فرینڈز، پارٹیاں، ہنگامے، فنکشن، پکنک ٹرپ مگر یہ لڑکی ہر چیز سے بیزار تھی۔ خود سے بھی، ماحول سے بھی اور زندگی سے بھی آخر ایسا کیوں تھا؟

''یہ صرف تمہاری سوچ ہے اگر تم اچھی نہ ہوتیں تو میں تمہارے قریب نہ بیٹھا ہوتا، مجھے انسانوں کی زیادہ نہ سہی، کچھ تو پہچان ہے۔'' ذی شاہ نرمی سے مسکرایا۔

''تم میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔'' وہ بے آواز رونے لگی تھی، گیلی آنکھیں، مکھن کی ٹکیہ جیسا چہرہ...... ذی شاہ کے دل کو کچھ ہونے لگا تھا۔ گندی سندی یہ لڑکی اسے کتنی عزیز ہو چکی تھی۔ وہ اسے کس طرح سے بتاتا؟ کس طرح سے سمجھاتا۔

''میں جاننے کے لیے ہی تو تمہارے پاس آیا ہوں۔'' وہ پھر سے مسکرا رہا تھا۔ نرم سی حوصلہ افزا مسکراہٹ تھی۔ منکشے کے دل کو ڈھارس سی پہنچی۔

''جان کر کیا کرو گے؟ مجھ سے نفرت......؟ جو میں برداشت نہیں کر پاؤں گی۔'' اس نے اپنا سر جھکا لیا تھا۔ وہ اپنے ننگے پیروں کو دیکھ رہی تھی۔ پیروں کے ناخن کتنے بڑھ چکے تھے۔ اسے کاٹنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ اسے تو کبھی کسی بات کا خیال نہیں آتا تھا۔

''ایسا کبھی نہیں ہوگا......'' ذی شاہ کا لہجہ مستحکم تھا اور وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا، من ہائیم کی خبطی لڑکی اس سے اتنا بڑا پہاڑ جتنا عہد لینے کھڑی ہو جائے گی۔ وہ لمحہ بھر کے لیے بھونچکا رہ گیا تھا۔ بھلا یہ پاگل، جنونی اور جذباتی لڑکی کیا کرنے والی تھی؟ وہ اسے سنک کی طرف بڑھتا دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ پھر اس نے صابن...... سے رگڑ، رگڑ کر ہاتھ دھوئے تھے۔ پھر ہاتھوں کو خشک کیا اور الماری سے کھینچ کھانچ کر صاف دُھلا ہوا کپڑا نکال کر کہیں اندر چلی گئی تھی۔ کچھ دیر بعد اس کی واپسی ہوئی تھی۔ اس نے سینے سے کچھ لگا رکھا تھا۔ اور وہ گیلے چہرے کو رگڑتی اس کے سامنے تن کے کھڑی ہوگئی تھی۔ وہ کیا کرنے والی تھی؟ اس کا ارادہ کیا تھا؟ دو سیکنڈ پہلے ذی شاہ کے گمان میں بھی نہیں تھا۔

''مقدس قرآن کی کھاؤ قسم! تم مجھ سے نفرت نہیں کرو گے، کسی بھی صورت میں، کسی بھی حال میں...... تم مجھ سے محبت کرو گے اور مجھے اکیلا نہ چھوڑو گے کم از کم میرے مرنے کی مدت تک۔'' منکشے اس کے سامنے سفید کپڑے میں لپٹا قرآن لیے کھڑی تھی، وہ جیسے سراپا حیرت بن گیا تھا۔ یہ منکشے کیا کہہ رہی تھی؟ اس کا دماغ تو ٹھیک تھا؟ حواس تو قائم تھے؟ جیسے قرآن کی ہیبت اس کے دل پر طاری ہوگئی تھی۔ وہ سر ما

نہیں رہا اب

آج غیر کی محفلوں میں وفا کا پیکر بنا ہوا ہے
کبھی وہ اپنا بھی راز داں تھا، نہیں رہا اب

اسی کے دم سے ہماری سانسیں رواں دواں تھیں
ہمارا دلبر، ہماری جاں تھا، نہیں رہا اب

غم جدائی کو رفتہ، رفتہ تھپک تھپک کر سلا دیا ہے
جو درد آنکھوں سے عیاں تھا، نہیں رہا اب

ہمارا ہر اک شوق سلامت تھا اس کے ہوتے
ہمارے سر پہ بھی سائباں تھا، نہیں رہا اب

زمانے کی ہر بلا سے ہم کو چھپا کے رکھتا، بچا کے رکھتا
جیّا جی اپنا وہ کُل جہاں تھا، نہیں رہا اب

شاعرہ: سیدہ جیّا عباس، تلہ گنگ

کے آغاز میں پسینہ، پسینہ ہوگیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کی لہر اتر گئی۔

"قرآن پر سچے مسلمان، سچی قسم اٹھاتے ہیں۔" منکشے کسی دیوار کی طرح تن کے کھڑی تھی، جیسے جواب لیے بغیر ٹلنے والی نہیں تھی۔ وہ وحشت کے عالم میں دنگ کھڑا تھا۔ جیسے نہ پیچھے ہٹ سکے گا، نہ آگے بڑھ سکے گا اور منکشے کی گیلی آنکھوں میں دھیرے، دھیرے استہزائیہ پھیلنے لگا تھا۔ جیسے اس کے بودے عہد کی کرچیاں اسے لہو، لہو کر رہی تھیں۔ وہ اندر سے خود بھی ٹوٹ رہی تھی۔

"ایسا دعویٰ کیوں کرتے ہو، جس پر قائم نہ رہا جاسکے۔ تم مجھ سے نفرت کرو گے اور ضرور کرو گے۔" منکشے نے مقدس قرآن کو سینے سے چمٹایا اور پلٹنے لگی تھی جب وہ کسی غیر مرئی قوت کے زیر اثر منکشے کے سامنے تن کر آ کھڑا ہوا تھا۔ لمحے کے آخری حصے میں فیصلہ ہوچکا تھا۔ اب بس عہد کو دُہرانا تھا اور قسم کا بار اٹھانا تھا۔

"سچے مسلمان...... قرآن پر سچی قسم اٹھاتے ہیں۔ قسم ہے قرآن کی، جو محمدؐ پر اترا...... جن کے بعد نہ کوئی نبی آیا اور نہ آئے گا...... میں قرآن کو گواہ بنا کر کہتا ہوں...... انسانوں سے نفرت کا کوئی اختیار نہیں رکھتا...... ہر بندہ خود اپنے عمل کا سزاوار ہے اور میرے پاس جزا اور سزا کا کوئی اختیار نہیں...... میں تمہیں چھوڑ دوں؟ یہ وقت پر منحصر ہے، تم مجھے مل جاؤ تو یہ میرا نصیب ہے۔ بہر حال تم سے محبت تو میں کرتا رہوں گا۔ جان رہے یا نہ رہے...... گر یقین کرسکتی ہو تو کرلو......"

ذی شاہ نے بڑی عقیدت اور محبت کے ساتھ مقدس قرآن کو اس کے ہاتھ سے لے کر چوما اور آنکھوں سے لگایا تھا پھر وہ اندر کہیں جا کر کسی الماری کی سب سے بلند جگہ پر قرآن کو جزدان میں لپیٹ کر رکھ آیا تھا۔ جب وہ واپس آیا تب بھی منکشے کسی بت کے مانند ساکت کھڑی تھی۔ دم بخود ساکت اور متحیر...... اتنی حیران کہ ہاتھ لگانے سے بھی نہ چونکتی، جھنجوڑنے سے بھی نہ چونکتی، ہلانے سے بھی نہ چونکتی۔

"میں نے زندگی بھر میں اتنے حسین الفاظ کبھی نہیں سنے۔" وہ کسی خواب کی کیفیت میں تھی۔ وہ بادلوں کے ساتھ رقص کررہی تھی۔ اس کے پیر زمین پر نہیں تھے۔ وہ نرم بگولوں کے رتھ پر سوار تھی۔ وہ زمین پر آنا چاہتی تھی مگر وہ خواب کے سفر میں تھی۔ وہ آنکھ کھولنا ہی نہیں چاہتی تھی۔

"تم بہت اچھی ہو اور اس سے بھی زیادہ اچھے الفاظ کی حقدار ہو۔" اس کے ہونٹوں پر مسکان اتر آئی تھی۔

"میں اچھی نہیں ہوں۔" وہ جیسے جھٹکا کھا کر آسمان سے اتر کر زمین پر آگئی تھی۔ اس کے دل پر قیامت کی گھڑی اتر آئی۔

"یوں مت کہا کرو۔" ذی شاہ نے نرمی سے ٹوکا تھا۔

"یہ سچ ہے۔" وہ تڑخی تھی۔

"یہ سچ نہیں ہے۔" اس کی حلاوت کا کوئی انت نہیں تھا۔

"تم نہیں جانتے۔" منکشے بے بس ہوگئی۔

"میں جاننا بھی نہیں چاہتا۔" وہ سنجیدہ تھا۔

"مگر مجھے بتانا ہے تمہیں...... بہت کچھ......" منکشے نے دونوں آنکھوں کو پھر سے رگڑا...... گیلی آنکھیں اسے الجھن میں گرفتار کررہی تھیں۔ وہ جھنجلا رہی تھی۔ اسے اپنی آنکھوں پر غصہ آرہا تھا۔

"مجھے نفرت ہے ان گیلی آنکھوں سے۔" وہ جیسے اپنی آنکھوں کو نوچ لینا چاہتی تھی۔ "من ہائیم میں برسات ہوتی تو میں بوا ریا بھاگ جاتی تھی۔ نفرت تھی مجھے بارشوں اور گیلی بستیوں سے...... اور آنکھوں کے آنسوؤں سے۔" وہ زہرخند ہورہی تھی۔

"تو پھر یہاں کیوں رکی ہو، بھاگ کیوں نہیں جاتیں؟" اس نے حیرانی کے عالم میں پوچھا تھا۔

"یہ میری سزا ہے، جس چیز سے نفرت کروں، وہیں رہوں، مجھے تو یہ ولیس ہاؤس بھی پسند نہیں۔ پھر بھی یہاں ہوں......" منکشے زخم، زخم سی بولی تھی۔ کانچ سی سرخ آنکھوں میں جیسے کوئی کہانی تیر رہی تھی۔

"تم خود ساختہ سزاؤں اور احساسِ جرم میں مبتلا ہو، تم شاید ماضی کے اثر میں ہو۔" وہ گویا لمحوں میں منکشے کے اندر تک اتر گیا تھا۔ وہ تھم سی گئی تھی۔ پھر اپنے بالوں کو کھینچ تان کے نوچنے لگی۔ ذی شاہ سے یہ منظر دیکھا نہیں گیا تھا۔

"خود پر ظلم کیوں کرتی ہو؟ اللہ نے تمہیں اتنی نعمتوں سے نواز رکھا ہے۔" وہ ٹوکے بنا رہ نہیں سکا تھا۔ منکشے جیسے لرز کر رہ گئی تھی۔ بھیانک ماضی نے چہرہ کرایا تھا۔ وہ لٹھے کے مانند سفید پڑگئی۔

"ہاں...... میں ناشکری تھی، مجھے اللہ کی عطاکردہ نعمتوں کا شکر کرنا نہیں آیا۔" اس نے پھر سے رونا شروع کردیا تھا۔ وہ گھٹنوں میں منہ دیے بیٹھ گئی بے آواز روتی ہوئی۔ ذی شاہ کو بے انتہا تکلیف ہوئی تھی، وہ اپنے دل سے قریب کسی بھی عورت کے آنسو دیکھ نہیں سکتا تھا۔

"اللہ، اس کے آنسوؤں میں، میں بہہ جاؤں گا۔" وہ انتہا کا بے بس ہوا تھا۔ منکشے چپ چاپ روتی رہی تھی۔ پھر جیسے تھک ہار گئی۔

"اب کہ میں آؤں تو مجھے ایسی مت نظر آنا......" وہ چھوٹے، چھوٹے قدم اٹھاتا باہر نکل گیا تھا جبکہ منکشے ساکت رہ گئی تھی۔

"تم مجھے کیسا دیکھنا چاہتے ہو؟" منکشے پوچھنا چاہتی تھی مگر وہ نظر سے اوجھل ہوگیا تھا۔ وہ اٹھ کر قد آور شیشے کے سامنے آ کر رکی...... اسے اپنی صورت دیکھ کر حیرت ہورہی تھی۔ وہ اپنی انگلیوں پر گنتی تو حیران رہ جاتی۔ جانے آخری مرتبہ اس نے آئینہ کب دیکھا تھا؟ کیا یہ منکشے تھی؟ طلبی، غلیظ، ویران، قحط زدہ سی...... اسے اپنی صورت سے وحشت ہونے لگی۔

☆☆☆

عام تعطیل کے دن افراہیم کی فیملی نے ہائیڈل برگ جانے کا پروگرام بنالیا تھا۔ ذی شاہ اگرچہ جانا نہیں چاہتا تھا مگر ایمل اور افراہیم کی خاطر چپ سا کر گیا۔ یہ تفریح کا پروگرام ان لوگوں نے ذی شاہ کے لیے ہی تو بنا رکھا تھا۔ وہ منع کرتا تو ان لوگوں کے دل برے ہوجاتے اور ننھی چھٹکی ناراض ہوجاتی۔ جس کی خفگی اسے گوارا نہیں تھی۔

وہ اتنے دن سے ولیس ہاؤس بھی نہیں جاسکا تھا۔ جانے منکشے کس حال میں تھی؟ انسٹی ٹیوٹ کی مصروفیت نے اسے چکرا رکھا تھا۔ اب صرف چند دن باقی تھے پھر اسے ہیرنخ کو جوائن کرنا تھا۔ اور افراہیم چاہتا تھا اس دوران وہ تھوڑا بہت تو جرمنی میں گھوم پھر لے، آخر اس کا جرمنی اتنا حسین جو تھا۔

ہائیڈل برگ کا صرف نام ہی بہت تھا۔ دریائے نیکر کے اس پار...... یہاں سے وہاں تک پھیلا ہوا...... اپنی قدامت، حسن، جمال کے باعث ہر آنکھ کو سحر زدہ کرتا...... ہائیڈل برگ کا تاریخی قلعہ اور یہاں کی قدیم ترین یونیورسٹی...... تنگ سے گنجان بازار مگر انتہائی صاف شفاف، خوش پوشاک، باوقار چلتے پھرتے لوگ، پُرسکون ماحول، نہ شور نہ ہنگامہ...... اپنی، اپنی دُھن میں جیسے مگن، کسی کو کسی سے کوئی سروکار نہ تھا۔ افراہیم اسے جرمنی کی قدیم ترین یونیورسٹی دکھانے لایا تھا۔ اپنی قدامت سے لوگوں کو متوجہ کرتی یہ یونیورسٹی بہت جلال، رعب اور شان سے کھڑی تھی اور اس کے طلبہ اور طالبات جیسے دنیا و مافیہا سے بے نیاز ایک دوسرے میں گم، مگن، مدہوش کچھ کتابیں پڑھ رہے تھے، کچھ اپنی، اپنی محبوباؤں کی بانہوں میں بانہیں ڈالے گھوم رہے تھے...... اور کچھ تو...... جیسے انہوں نے حد ہی کردی تھی۔ ذی شاہ جیسے کانوں تک سرخ ہوگیا تھا۔ اگرچہ مغرب میں ایسے مناظر کچھ اچنبھے کا باعث تو نہیں تھے مگر درسگاہوں کے کچھ اصول، لحاظ اور قواعد ہوتے ہیں پھر ایسی حرکتوں کے لیے نائٹ کلب، بار، پب جو موجود ہیں پھر یوں سرعام...... اللہ اکبر...... اس نے گردن موڑ کر ساتھ چلتی ایمل کو دیکھا تھا۔ زیادہ خفت ایمل کی وجہ سے اٹھانی پڑرہی تھی۔ بچی کے ذہن میں کیا سوچ ابھرتی ہوگی۔ وہ بے چارہ خواہ مخواہ بدحواس ہورہا تھا۔ بچی کو جیسے پروا نہیں تھی اور افراہیم بھی بے نیاز تھا۔ جیسے یہ منظر ان کی آنکھوں کے لیے نئے نہیں تھے۔ سو انہیں کوئی پروا نہیں تھی۔ ایمل بھی ایسے چل رہی تھی گویا کچھ دکھائی نہیں دیا ہو۔ اس نے اپنی بلی اٹھا رکھی تھی۔ اسی کی سیوا

میں مصروف تھی۔ ذی شاہ کے دل کو تسلی ہوئی۔ اس نے فوراً یہاں سے چلنے کی بات کر ڈالی تھی۔

اب وہ مولکن کور پر کھڑے یہاں کا تاریخی قلعہ دیکھنے کے لیے مچل رہے تھے۔ اگرچہ مغربی جرمنی کا حسن ایسا نہیں تھا جس کے سحر سے اتنی جلدی آزاد ہوا جاسکتا مگر پھر بھی اس کا من تو ولیس ہاؤس کی طرف اڑا، اڑا جارہا تھا۔ وہ جلد ہی تفریح سے بیزار ہوگیا۔ افراہیم اس کی بے دلی کو نوٹ کرتا ریسٹورنٹ سے کھانا کھلا کر واپسی کے سفر پر گامزن ہوگیا تھا۔ شاید وہ سمجھ گیا تھا، ذی شاہ تھک چکا ہے، تھکاوٹ تو ایمل کو بھی ہوگئی تھی۔ سو وہ تمام رستہ سوتی رہی تھی۔ گھر آ کر بھی نیند میں دھت ہوگئی۔

افراہیم بھی سونے کے لیے چلا گیا تھا مگر آنٹی نے اسے روک لیا۔ حالانکہ وہ بھی شاور لے کر سونا چاہتا تھا۔ مگر آنٹی کا موڈ کچھ باتیں کرنے کا تھا۔ وہ کہتے ہیں ناں...... عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے تو آج معاملہ بھی کچھ یوں کھلا تھا۔ اسے نہا دھو کر منکشے کی طرف جانے کی جلدی تھی اور آنٹی اسے رک جانے پر مجبور کر رہی تھیں۔ نیند کا تو بہانہ تھا۔ وہ خواہ مخواہ جمائیاں لے رہا تھا... اور آنٹی جیسے اس کی جمائیوں کو نظر انداز کرتی کچھ اور کہنے کے موڈ میں تھیں۔

”تم آج کل ولیس ہاؤس بہت جاتے ہو؟ وہ لڑکی...... کیا نام ہے اس کا......؟“ آنٹی نے جیسے کچھ دیر سوچنے کے بعد اس کی نیند کو آنکھوں سے ایک جھٹکے کے ساتھ نوچ لیا تھا۔ وہ ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اور حیران ہوا، یہ آج آنٹی نے کیا قصہ چھیڑ دیا تھا؟

”منکشے......“ اس نے سر جھکا کر جیسے اعترافِ جرم کرلیا۔ آنٹی کچھ پل کے لیے چپ ہوگئی تھیں۔ جیسے کسی گہری سوچ میں مبتلا ہوگئیں۔

”ہاں...... تو وہ لڑکی...... بیٹا کچھ ٹھیک نہیں وہ، تم میرے لیے افراہیم جیسے ہو...... میں تمہیں کچھ غلط کرتا...... یا کنویں میں گرتا نہیں دیکھ سکتی۔“ انہیں سمجھ نہیں آرہی تھی۔ وہ کیسے نرم، نرم الفاظ میں اسے منع کرتیں۔ وہ ان کے بیٹے کا بہت پیارا دوست تھا۔ وہ اسے کسی مشکل میں گرفتار نہیں دیکھ سکتی تھیں اور منکشے کی طرف اس کے بڑھتے قدم کو روکنا بھی محال تھا۔

”نہیں آنٹی...... ایسا کچھ بھی نہیں، منکشے بہت اچھی لڑکی ہے، بیمار ہے تو میں نے انسانی ہمدردی......“ ذی شاہ سے بھی بات بن نہیں پائی تھی۔ وہ جھوٹ بولتے، بولتے رک گیا تھا۔ جیسے جھوٹ بولنا اسے مناسب نہیں لگا تھا۔ وہ محض انسانی ہمدردی میں تو ولیس ہاؤس نہیں جاتا تھا۔ یہ تو محبت کا قصہ تھا، جسے آنٹی کے سامنے چھیڑنا مناسب ہرگز نہیں تھا۔ پھر آنٹی احتیاطی تدابیر پہ لیکچر دینا شروع کر دیتیں۔ ویسے وہ نہ بھی بتاتا تب بھی آنٹی ایک عمر کا تجربہ رکھتی تھیں۔ انہیں بھی بہت کچھ نہ سہی، کچھ تو نظر آ رہا تھا۔

”انسانیت کے ناتے مدد کرنا غلط نہیں...... پر وہ لڑکی بہت بڑی ساحرہ (جادوگرنی) ہے۔ ایک نمبر کی ڈرامہ باز ہے، بہت مکار اور ہوشیار...... تم اس سے دور رہو بیٹا!“ آنٹی نے بڑی محبت اور خلوص سے جیسے اسے سمجھانے اور خبردار کرنے کی کوشش کی تھی اور وہ بھلا سمجھانے سے سمجھنے والا تھا؟ اسے لگا، وہ روکنے اور روکے جانے کی اسٹیج سے آگے نکل گیا تھا۔ کوئی منکشے کے بارے میں کچھ بھی بتا دیتا۔ کیا وہ اس پر یقین کرسکتا تھا؟ وہ منکشے پر غلط گمان کرسکتا تھا؟ شاید بھی نہیں، اس کا دل گواہی دے رہا تھا۔ آنٹی اسے منکشے کے پاگل پن، جنون اور ڈراموں کی کہانیاں سنا رہی تھیں اور اس کا ذہن منکشے میں الجھا تھا۔ جانے اس نے کھانا کھایا یا نہیں......؟ وہ بھوکی ہوگی؟ کہیں کوچ نہ کرگئی ہو؟ آخر تین چار دن سے وہ اسے دیکھ بھی نہیں پایا تھا۔ جانے منکشے کس حال میں تھی؟ اسے یاد کرتی ہوگی؟ خفا ہوگی؟ مس تو لازمی کرتی ہوگی۔ روتی بھی ہوگی۔

”دیکھو بیٹا! تمہیں سمجھانا میرا فرض تھا۔ یقین مانو وہ لڑکی اچھی نہیں۔“ آنٹی کچھ بتاتے، بتاتے رک گئی تھیں پھر ان کا دھیان جیسے بٹ گیا تھا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی ذی شاہ کی خلاصی کروا گئی تھی۔ وہ آنٹی کو فون سنتا دیکھ کر چپکے سے اٹھ کر سیڑھیوں کی طرف جارہا تھا جب آنٹی کی خوشی سے مسرور آواز اس کے کانوں تک پہنچی تھی۔ جانے کس کا فون تھا؟ وہ رک سا گیا تھا۔

”عیسیٰ کا فون ہے...... افریشم اسپتال میں ہے، بیٹا ہوا ہے۔“ وہ مارے مسرت کے رو پڑی تھیں۔ افریشم کی طبیعت خراب رہتی تھی۔ بی پی پرابلم تھا۔ تبھی آنٹی کو دھڑکا لگا رہتا تھا۔ اب جیسے سارے وسوسے اڑنچھو ہوگئے تھے۔ وہ خوشی سے بے حال افراہیم کے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھیں۔ کچھ دیر بعد گرتی پڑتی ایمل بھی آگئی۔ خوشی سے کودتی، چھلانگیں لگاتی، افراہیم، آنٹی اور ایمل اسپتال کے لیے نکل گئے تھے۔ انہیں خوشی ہی بہت عظیم ملی تھی۔ رات سے پہلے واپسی ممکن نہیں تھی۔ اس کے کانوں میں آنٹی کی مسرور آواز اتر رہی تھی۔ جیسے اس کے اندر کوئی بھالے اتار رہا تھا۔ جیسے قطرہ، قطرہ زہر اتار رہا تھا۔ وہ اپنے اندر کرب کی لہر دل کو اٹھتا محسوس کر رہا تھا۔ ”عیسیٰ بہت خوش تھا۔“ آنٹی افراہیم کو بتا رہی تھیں۔ ان کا چہرہ جذبات سے تمتما رہا تھا۔ اس نے جیسے آنکھیں میچ کر اس منظر سے نگاہ چرالی تھی۔ وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہی ٹھنڈا ٹھار، روشن، معطر، صاف ستھرا گیسٹ روم اس کے ذہن پر بوجھ لد گیا۔ دل بوجھل اور اداس ہو رہا تھا۔ جیسے عیسیٰ کی خوشی اسے اندر سے کاٹ رہی تھی، جیسے اس کی خوشی آگ لگا رہی تھی۔ وہ سر تھامے بیڈ پر ڈھے گیا۔ بنا کسی ٹھوس ثبوت کے عیسیٰ پہ ہاتھ ڈالنا کچھ ناممکن تھا؟ جوشِ جذبات میں کوئی بھی غلط قدم اسے خود اپنی ہی نظر سے بھی گرا سکتا تھا۔ وہ جذبات میں آکر کوئی غلطی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ غصے، جوش، جذبات معاملات بگاڑ سکتے تھے۔ اور یہ تو ویسے بھی رشتوں کا پل صراط تھا۔ اسے سوچ سمجھ کر چلنا تھا۔ ایک طرف مالا تھی اور دوسری طرف افراہیم کی فیملی پھر عیسیٰ کا افراہیم کی فیملی سے بہت گہرا تعلق لگتا تھا۔ بلکہ جو اسے نظر آرہا تھا، اس پر یقین کرنے کو دل نہیں کرتا تھا۔

علی عیسیٰ، افریشم اور اب ان دونوں کا بیٹا...... ایک ہنستا، بستا خوشحال گھر...... وہ کیسے بنا ثبوت کے اس

گھر کی عمارت پر ضرب لگا دیتا؟ تھوڑا انتظار تو کرنا ہی تھا۔ کم از کم بندیا کی کال آنے تک...... اور یہ اس کی خوش نصیبی تھی جو آج ہی بندیا کی کال آگئی تھی۔ اس نے بے تابی سے ممی اور مالا کے بارے میں پوچھا تھا۔ تب بندیا نے اسے کچھ ایسی باتیں بتائی تھیں جو اسے جھنجوڑ کر رکھ گئی تھیں۔ بندیا نے بتایا تھا بلکہ وہ بہت سوچ، سوچ کر بول رہی تھی۔ جیسے مالا کی گفتگو کو ذہن میں دُہرا رہی تھی۔

”عیسیٰ کی کوئی تصویر نہیں مل سکی۔“ وہ مایوس پھر بھی نہیں تھی جبکہ ذی شاہ جیسے بجھ گیا تھا۔

”اور کچھ......؟“ ذی شاہ نے مایوسی کی لہر اپنے اندر اترتی محسوس کی تھی۔ جیسے وہ ایک دم ڈھے گیا تھا۔ اب کیا ہوگا؟ وہ کم از کم عیسیٰ کو دیکھے بغیر کیسے ڈھونڈ سکتا تھا؟ ضروری تو نہیں تھا یہی علی عیسیٰ افراہیم کا بہنوئی ہوتا اور وہی مالا کا مجرم ہوتا۔ کیا خبر، اس کی نظر دھوکا کھا رہی ہو؟ کچھ بھی تو متوقع تھا۔ کچھ بھی غلط یا صحیح ہوسکتا تھا۔ جبکہ جلد بازی اور عجلت سوائے نقصان کے کچھ نہیں دے سکتی تھی۔ اور وہ کوئی نقصان اٹھا کر بھائیوں جیسے دوست افراہیم کی نظر سے گرنا نہیں چاہتا تھا، نہ اسے کوئی دکھ دینا چاہتا تھا۔

”اور بہت کچھ ہے۔“ بندیا جیسے اس کی خاموشی کو محسوس کر کے پُرجوش ہوگئی تھی۔ وہ کچھ چونک گیا تھا۔ ذرا ٹھٹک گیا تھا۔

”کیا......؟“ اس نے بے تابی سے پوچھا۔ وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوچکا تھا، اس کا رواں، رواں کان بن گیا۔

”مالا نے بتایا ہے، علی عیسیٰ کے پاس ایک گاڑی ہے۔ اس کی لاڈلی benz جو اسے بہت پیاری ہے اور یہ کہ علی عیسیٰ کو بواریا سے بہت محبت ہے، اس کی ایک بہن مون کے متعلق بھی مالا نے بہت کچھ بتایا ہے۔ ذرا رکو میں تمہیں بتاتی ہوں۔“ بندیا تھوڑے وقفے کے بعد پھر سے بولنے لگی تھی۔ شاید فون کان سے لگائے کچن میں چلی گئی تھی۔ کھٹ پٹ کی آوازوں سے وہ یہی اندازہ لگا سکا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ لائن پر دوبارہ آگئی...... اس کی آواز میں

دریائے نیکر کی لہروں جیسی سنجیدگی تھی۔

''عیسیٰ کی بہن موں، مالا سے شدید نفرت کرتی تھی اور اسی کی وجہ سے......'' بندیا آگے کی تفصیل بتا رہی تھی۔ اس نے وقفے، وقفے سے جو مالا سے باتیں اگلوائی تھیں، وہ اب ذی شاہ کے گوش گزار کر رہی تھی۔ ذی شاہ جیسے سانس روکے سن رہا تھا۔

''تو گویا سارے فساد کی جڑ یہ موں تھی۔'' ذی شاہ نے بہت دیر کی خاموشی کے بعد نفرت سے کہا تھا۔ اگرچہ مالا نے پوری تفصیل نہیں بتائی تھی تاہم یہ بندیا کے اپنے اندازے تھے۔ جس پر تصدیق کی مہر ذی شاہ لگا رہا تھا۔ بندیا سے بات کرنے کے بعد اس کا ذہن الجھ گیا تھا۔ تو گویا کہانی کچھ، کچھ اسے سمجھ آ رہی تھی۔ مگر ابھی بہت سی الجھنیں باقی تھیں...اور بہت سے انکشافات ہونے کا وقت نہیں آیا تھا۔ تاہم اتنا وہ جان گیا تھا کہ علی عیسیٰ اور مالا کی طلاق میں موں حسیب کا بہت اہم کردار رہا تھا۔ اس کا خون جیسے ابلنے لگا تھا۔ رگوں میں کھولنے لگا تھا۔ نفرت اور غصے کا زہر اس کے دماغ پر چڑھ رہا تھا۔ علی عیسیٰ سے نفرت کا گراف کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ کانوں کا کچا مرد...... عورت کے اشارے پر ناچنے والا ......بہن کا تابع...... اس کے اندر آگ بڑھتی جا رہی تھی۔ شعلے بھڑکتے جا رہے تھے۔ اس آگ میں جل کر کون، کون خاکستر ہونے والا تھا؟ اس بات سے سب ہی انجان تھے۔

☆☆☆

رات کو ایمل اور افراہیم واپس آ گئے تھے۔ اور وہ جو اتنے گھنٹوں کی ذہنی اذیت کے بعد اب ویس ہاؤس کی طرف جا رہا تھا۔ اپنے ارادے کو پس پشت ڈال گیا تھا۔ ایمل اسپتال سے آ کر بہت خوش تھی۔ بار بار موبائل میں کھینچی تصاویر دکھاتی۔ پہلے تو وہ بے دلی سے دیکھتا رہا تھا۔ پھر جیسے ٹھٹک گیا۔ ہر تصویر میں علی عیسیٰ واضح تھا۔ ننھے سے بچے کو گود میں لیے، کمبل میں لپٹا نومولود بھلا کون دیکھ رہا تھا؟ وہ تو ہکا بکا علی عیسیٰ کو دیکھے جا رہا تھا۔ جیسے ایک دم ذہن میں کچھ کلک سے روشن ہوا تھا۔ اسے علی عیسیٰ کی ہنستی مسکراتی گہری آنکھوں میں نمی نظر آ گئی تھی۔ کچھ سوز کچھ درد، کچھ خوشی میں ڈوبی مسکراہٹ......ایمل نے کھٹ کھٹ کئی پکچرز دکھائی تھیں۔ افریشم، آنٹی، افراہیم اور کچھ مزید لوگ بھی تھے۔ یقیناً ان کے ملنے ملانے والے......مگر وہ تو ایک ٹک علی عیسیٰ کو دیکھ رہا تھا۔ ایک پکچر میں وہ اپنے کسی دوست کے ساتھ بچے کو دیکھتا کچھ کہہ رہا تھا۔ ایک تصویر میں وہ بچے کے کان میں اذان دے رہا تھا۔ ذی شاہ کو جیسے وحشت ہونے لگی تھی۔ اس کے اندر بھانبڑ جلنے لگے۔ دھواں نکلنے لگا۔ آگ بھڑکنے لگی۔

''عیسیٰ نے منے کا نام محمد موسیٰ رکھا ہے۔'' ایمل سرشاری بتا رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا۔ موبائل سے بچے کو نکال کر چوم، چوم کر ختم کر ڈالتی۔ پھر وہ موبائل اسے تھما کر اپنی شاپنگ دکھانے لگی تھی۔ وہ بچے کے لیے ڈھیروں کھلونے، کپڑے اور نہ جانے کیا کچھ اٹھا لائی تھی۔ اپنے منے سے بھانجے کے لیے وہ بہت جذباتی ہو رہی تھی۔ ایمل تو اسپتال سے آنا بھی نہیں چاہتی تھی مگر افراہیم اسے زبردستی لے آیا۔ ذی شاہ سے کچھ بھی دیکھا نہیں گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے جالے آنے لگے۔ وہ ایمل کی کوئی بات نہیں سن رہا تھا مگر پھر بھی وہ اسے سنا رہی تھی۔ ہنستی، مسکراتی، کھلکھلاتی، اس کا بس چلتا تو بچے کو افریشم کی گود سے کھینچ لاتی اور ذی شاہ کو زبردستی دکھاتی۔

''موسیٰ مجھ پر پڑا ہے، اتنی کیوٹ ہوں میں اور اتنا کیوٹ ہے وہ۔'' وہ جھوم، جھوم کر بتا رہی تھی۔ انتہائی خوش اور پُرجوش......

''عیسیٰ کو اتنی فکر تھی، میں منے کو لاڈ کر کر کے بے ہوش نہ کر دوں۔'' ایمل نے ننھے منے کھلونوں کو کارپٹ پر بکھیر دیا تھا۔ اب وہ ایک، ایک چیز کو بغور دیکھ رہی تھی۔ ذی شاہ کی نگاہ کے سامنے مالا کا چہرہ آ گیا۔ پارک میں بچے کی طرف لپکتی مالا، اسے چومتی، لاڈ کرتی۔ پھر بچوں کی ڈھیروں شاپنگ کھلونے، کپڑے، مُنّے مُنّے جوتے، جن کا عینی نے اتنا مذاق اڑایا تھا۔

ذی شاہ کی آنکھوں میں کانچ چبھنے لگے تھے۔ موبائل اسکرین پر روشن وہ یونان کے دیوتاؤں جیسا روپ سروپ رکھنے والا علی عیسیٰ محبت پاش نظروں سے منے سے بچے کی پیشانی چوم رہا تھا۔ اس کے اندر باہر جیسے آگ بھڑکنے لگی تھی۔ کوئی ایک بھی منظر اس کی آنکھوں میں جم کر نہ دیا تھا۔ اس نے موبائل اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔ اب وہ ایمل کی طرف متوجہ تھا جو اسے کچھ بتا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اب کچھ، کچھ برہمی اور غصہ تھا۔ ذی شاہ سمجھ ہی نہیں پایا۔ ایمل کو اچانک کچھ یاد آ گیا تھا۔

''میں نے منے کا نام پہلے بلی رکھا، وائٹ کیٹو...... جو کسی کو پسند نہیں آیا۔ پھر چوزا رکھا...... یہ بھی کسی کو پسند نہیں آیا...... افراہیم نے کہا ہمارا منا تو شیر جیسا ہے، بھلا شیر کوئی کیوٹ ہوتا ہے؟'' ایمل نے ناگواری سے منہ بنا، بنا کر بتایا تھا۔ ان لوگوں نے اس کے رکھے نام ناپسند کیے تھے تبھی وہ بھی ان کے رکھے نک نیم ریجیکٹ کر رہی تھی۔ ذی شاہ ذرا دھیان دینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اگر ایمل کی بات پہ غور نہ کرتا تو وہ اور بھی ناراض ہو جاتی اور ایمل کی ناراضی سہنا کچھ آسان نہ تھا۔ جبکہ فی الحال وہ سخت غصے میں لگ رہی تھی۔

''پھر عیسیٰ بولا، ہمارا منا تو چیتے جیسا ہے، ہونہہ...... چیتا بھی کوئی کیوٹ ہوتا ہے؟ چوزے، بلیاں اور مچھلیاں پیاری ہوتی ہیں۔'' ایمل جیسے تمام باتیں پھر سے دُہرا رہی تھی۔ اب کہ اس کی نیلی آنکھوں میں شدید غصہ بھر گیا تھا۔ ذی شاہ سہم سا گیا اور اس کی اداکاری کو محترمہ نے کھانے والی نظروں سے دیکھا تھا۔ اور وہ اسے ہی گھور گھور کر دیکھ رہی تھی۔ نہ جانے کیوں؟

''پھر میں نے کہا...... شیر اور چیتے تو خونخوار اور درندے ہوتے ہیں، ہمارا منا ایسا نہیں۔'' وہ آنکھوں میں آنسو بھرے پچکار کر بول رہا تھا۔

''تم نے ٹھیک کہا...... منا، شیر اور چیتا کیسے ہو سکتا ہے؟ اتنے معصوم سے بچے کو شیر اور چیتے سے تشبیہ دینا مناسب نہیں۔'' اپنے تئیں اس نے ایمل کی حمایت کی تھی مگر وہ جیسے دہاڑ کر رہ گئی۔ ذی شاہ پھر سہم گیا تھا۔ اگرچہ یہ سہمنا مصنوعی تھا پھر بھی......

''ہاں...... میں نے بھی یہی کہا تھا۔ اتنا معصوم بچہ شیر اور چیتا کیسے ہو سکتا ہے۔ منا تو چھپکلی جیسا ہے۔ وائٹ اور تجلجلا سا...... اس بات پر مجھے افریشم نے تھپڑ مارا...... افراہیم ہنستا گیا اور عیسیٰ ہنستا رہا۔ میں رو پڑی تھی تو تب افریشم کو اور غصہ آ گیا۔ اس نے کہا...... اتنی گندی مخلوق سے میرے بچے کو تشبیہ کیوں دی؟ کیا یہ دیواروں سے چپکا، ڈراؤنی چھپکلی جیسا ہے؟ تب......تب مجھے عیسیٰ کے ہنسنے کی وجہ سمجھ آ گئی۔ اور افریشم کے غصے کی بھی۔ میرا دل چاہا، میں تمہارا قیمہ بنا دوں؟'' ایمل آگ بگولا ہو کر چیخی تھی۔ تب ذی شاہ کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔ اور پھر وہ ہنس، ہنس کر بے حال ہو گیا۔ اسے لوٹ پوٹ ہوتے دیکھ کر ایمل کو اور بھی غصہ آ گیا تھا۔ اس نے کشنز کے ڈھیر کو نگاہوں کی زد میں کر لیا تھا۔

''تو کیا میں چھپکلی جیسی ہوں؟'' اس نے کشن کی برسات کر ڈالی تھی۔ ذی شاہ دم دبا کر بھاگ جانا چاہتا تھا مگر بھاگ نہ سکا۔ ایمل کے نشانے بڑے ٹھیک لگ رہے تھے۔ اسے بچاؤ کرنا مشکل ہو رہا تھا اور ایمل کی بے عقلی اور اپنے راز کھلنے پر ہنسی آ رہی تھی۔

''نہ......نہ میری پیاری بہن تو شہزادی ہے۔'' اگلے آدھے گھنٹے تک وہ ایمل کی جھوٹی سچی تعریفوں میں رطب اللسان رہا تھا۔ یہاں تک کہ ایمل کا موڈ بہتر ہو گیا۔ بالآخر اس نے غصہ تھوک دیا تھا۔ اور دوبارہ سے منے کے عشق میں فنا ہونے لگی تھی۔ جب ذی شاہ کو اچانک بندیا کی باتیں یاد آ گئیں۔ علی عیسیٰ کی بہن موں، اس کی لاڈلی benz اور بواریا...... وہ کڑی سے کڑی ملاتا رہا۔ مگر پھر بھی کچھ مسنگ تھا۔ کچھ ادھورا تھا۔ کہیں خالی پن ضرور تھا۔ کچھ نگاہ سے اوجھل بھی تھا۔ کچھ پردے کے پیچھے بھی تھا...... کچھ ایسا ضرور تھا جو کھل کر سامنے نہیں آیا تھا۔ معاً اسے خیال آیا...... ایمل سے محتاط ہو کر بھی پوچھنا

تھا۔ پھر جیسے وہ موضوعِ گفتگو بدل کر گاڑیوں کی بات کرنے لگا۔ نئے اور پرانے ماڈل کی گاڑیاں......

''تمہیں کون سی گاڑی پسند ہے؟'' اس نے منے کے کھلونوں میں سے ایک کار کو اٹھا کر ایمل کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ کارپٹ پہ مختلف رنگوں کی کاریں بکھری پڑی تھیں۔ ہر رنگ اور ہر ماڈل کی کار...... ایمل کو گاڑیوں کا شوق تھا۔ تبھی کھلونوں میں کاروں کا ڈھیر اٹھا لائی تھی۔ یقیناً یہ ایمل کا پسندیدہ ٹاپک تھا۔ وہ کچھ، کچھ پُرجوش ہو چکی تھی۔ اور بکھری کاروں کو بڑی محبت سے دیکھ رہی تھی۔

''مجھے...... ferrari پسند ہے۔ آئی لو فراری...... افراہیم کو hummar پسند تھی۔ پھر lexus اٹھا لایا۔ بڑی مشکل سے اتنے پیسے جمع کر کے خریدی تھی۔ گاڑی کی ضرورت بھی تھی اور شوق بھی۔ افریشم کا دل infinity پر آ گیا تھا مگر ہم لوگ لے ہی نہ سکے۔ افریشم نے اب اپنا شوق پورا کر لیا ہے۔ اس کے پاس دو، دو گاڑیاں ہیں...... bmw اور infinity بھی...... جب میں شادی کروں گی تو اپنے شوہر سے کہوں گی مجھے فراری لے کر دے...... تم دعا کرنا مجھے اتنا امیر شوہر مل جائے۔'' وہ ایک پیر کارپٹ پر رکھے، گھٹنا فولڈ کر کے صوفے پر رکھے، ہتھیلی کو گھٹنے پر جما کر منہ اس کے اوپر سجائے بڑے جوش کے عالم میں کہہ رہی تھی۔ تب ذی شاہ کی آنکھیں ذرا پھیل گئی تھیں۔

''افریشم کے پاس دو، دو گاڑیاں ہیں...... اور وہ پھر بھی بس سے یہاں آتی ہے؟'' اسے مطلب کی بات بالآخر مل ہی چکی تھی۔ انتہائی عام سے لہجے میں بات کرتا وہ خاصا بے پروا نظر آ رہا تھا۔ اسے اچانک بس اسٹاپ کا منظر یاد آیا تھا۔ افریشم کا بس پر آنا؟

''جب گھر میں نہ ہوں تو بس پر بھی آ جاتی ہے۔'' ایمل اس سے بھی زیادہ بے نیازی سے کہہ رہی تھی۔ وہ اس کی تفتیش کو سمجھ نہیں پائی تھی۔

''اچھا تو عیسیٰ کے پاس benz نہیں تھی؟'' اس نے بے پروائی سے کہتے ہوئے ایمل کا موبائل پھر سے اٹھا لیا تھا۔ تصویریں پھر سے روشن ہو گئی تھیں۔ علی عیسیٰ اس کے دل کا ناسور...... وہ زہر خند ہونے لگا۔ آنکھوں میں ہر عکس چبھنے لگا تھا۔ اندر زہر اترنے لگا۔

''تھی ناں...... بہت پہلے...... پھر جل گئی۔'' ایمل ایک دم دکھی سی ہو گئی تھی۔ ''عیسیٰ کو benz سے بڑا پیار تھا۔ پھر خود ہی جلا دی......'' اس کی آنکھوں میں دکھ ہلکورے لے رہا تھا۔ عیسیٰ نے benz کیوں جلائی؟ ایمل نے یہ نہیں بتایا تھا جبکہ ذی شاہ اندر تک ساکت ہو گیا تھی۔ بندیا نے بھی یہی بتایا تھا۔ علی عیسیٰ کو benz سے بڑا پیار تھا۔ benz اس کا دوسرا عشق...... جسے اس نے خود اپنے ہاتھ سے راکھ راکھ کر دیا تھا کیوں؟ کس لیے؟ عیسیٰ نے بینز کو کیوں جلا دیا تھا؟

''اچھا یار...... تم Audi, ford, opel کو چھوڑو، مجھے بواریا کے متعلق بتاؤ...... بواریا کون ہے؟ کسی کا اسم شریف ہے؟'' وہی بے پروا سا، بے نیازانہ اسٹائل، وہ ایمل کو چونکانے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ تبھی بڑے محتاط لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ ذرا بے پروا، ذرا سرسری اور ذرا بے نیاز سا، ادھر ایمل قل، قل ہنستی جیسے اس کی لاعلمی پر چوٹ کر رہی تھی۔ اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔ اور بواریا کو اسم شریف کے اسٹائل میں پوچھنے پر یا کوئی خاتون سمجھنے پر ہنس رہی تھی۔

''تمہیں بواریا کا نہیں پتا؟'' ایمل نے آنکھیں گھما کر جیسے اس کی عقل پر ماتم کیا تھا۔ ''ارے...... تم نے بواریا نہیں دیکھا تو سمجھو کچھ نہیں دیکھا...... جرمنی کا صوبہ ہے اور اس کے بے شمار حسین سرسبز دیہات......'' وہ افراہیم کی زبان میں اسے بتا رہی تھی۔ وہ چونک، چونک اٹھا۔ بواریا کا ذکر منکشے نے بھی کیا تھا۔ ہاں، وہ بھی بواریا کی بات کر رہی تھی۔

''آہ...... بواریا جانے کے لیے تو سب ہی تڑپتے ہیں۔ وہ جنت کا کوئی خطہ ہے، اتنا حسین کہ آنکھیں بھر جائیں پر منظر ختم نہ ہوں...... عیسیٰ کا سارا ننھیال بواریا میں تو ہے۔ ہم بھی عیسیٰ کے ساتھ بواریا گئے تھے۔ جسم واپس لے آئے، روح وہیں چھوڑ

آئے۔ افراہیم بتاتا ہے، پاکستان میں بھی ایک علاقہ بواریا جیسا موجود ہے۔'' ایمل بھی بواریا کے عشق میں مبتلا تھی۔ جرمنی کے سرسبز دیہات، جو پاکستانی دیہاتوں سے انتہائی مختلف تھے۔ ہر طرح کی سہولیات سے مزین...... جدید، عمدہ......

''عیسیٰ کو بواریا سے بہت محبت ہے، پر اب وہ بواریا نہیں جاتا۔ تعلق جو ٹوٹ گئے۔'' ایمل کے باتونی پن نے جیسے اس کے بے شمار مسئلے حل کر دیے تھے۔ بے شمار جالے ہٹ چکے تھے۔ بے شمار راز کھل چکے تھے۔ اب تو کوئی شک نہیں رہا تھا۔ علی عیسیٰ، اس کی مالا کا مجرم تھا اور خود ایسی خوشحال زندگی گزار رہا تھا۔ اس کی بہن کو ناکردہ گناہوں کی سزا دے کر وہ کیسے چین پا سکتا تھا؟ کیسے سکھ سے جی سکتا تھا؟ وہ اس کی زندگی جہنم بنا کر جائے گا۔ اسے تڑپا تڑپا کر مارے گا۔ اس کے سکھ چین کو چھین کر جائے گا۔ اسے عمر بھر کے لیے ایسا مزہ چکھائے گا کہ زخموں پر کبھی کھرنڈ نہ چڑھ سکیں گے۔

اس کا خون ابلنے لگا تھا پھر ایمل کے اٹھتے ہی اس نے موبائل اٹھایا۔ بلیوٹوتھ آن کر کے عیسیٰ کی تصویر اپنے موبائل پر سینڈ کیں۔ یہ خیال ابھی، ابھی اس کے ذہن میں آیا تھا۔ اب وہ ایمل کا سیل وہیں رکھ کر اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ کمرے کا دروازہ لاک کر کے اس نے لیپ ٹاپ آن کر لیا۔ اب وہ تمام تصویریں موبائل سے لیپ ٹاپ میں منتقل کر رہا تھا۔

آخر یہ خیال اسے پہلے کیوں نہیں آیا؟ عیسیٰ کی تصویریں ایمل سے مانگی بھی تو جا سکتی تھیں مگر اس کام میں رسک تھا۔ اب تو ایمل کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ ذی شاہ نے اس کے موبائل سے صرف علی عیسیٰ کی تصویریں اڑائی ہیں۔

بندیا کو علی عیسیٰ کی تصویریں سینڈ کر کے اسے ارجنٹ کال کی تھی اور فوراً آن لائن ہونے کو کہا تھا۔ بندیا نے حکم کی فوری تعمیل کی تھی۔ عیسیٰ کی تصویریں دیکھ کر وہ شاکڈ رہ گئی۔ دنگ رہ گئی تھی، کئی لمحوں تک منجمد رہی تھی۔ اس سے بولنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔

''یہ عیسیٰ ہے، حسیب چاچو کا بیٹا...... اتنا حسین...... اور یہ بچہ کون ہے؟'' بندیا نے ایک ہی سانس میں کئی سوال اگل دیے تھے۔ وہ بار، بار علی عیسیٰ کو دیکھے جا رہی تھی۔ حیران، متحیر، ستائشی نگاہوں سے۔ رشک کرتی اور دکھی ہوتی، روتی ہوئی۔

''سنو بندیا! میری بات دھیان سے سنو...... میں علی عیسیٰ تک پہنچ چکا ہوں، وہ افراہیم کا بہنوئی ہے، اس کی بہن سے دوسری شادی کر چکا ہے، یہ بچہ عیسیٰ کا ہے۔ مگر مالا کو کچھ مت بتانا...... بس مجھے تصدیق کرنی ہے، کیا یہ واقعی وہی علی عیسیٰ ہے؟ تم مالا کو تصویریں دکھاؤ۔'' کچھ دیر بعد ذی شاہ نے بہت بوجھل انداز میں بندیا سے کہا تھا۔ پھر لیپ ٹاپ آف کر کے بیڈ پر ڈھے گیا۔ اب اسے بندیا کی کال کا انتظار تھا۔ وہ لحہ، لحہ بے قرار سا انتظار کرنے پر مجبور تھا اور اس کا روم روم جیسے التجا کر رہا تھا۔ دعا کر رہا تھا۔ درخواست کر رہا تھا، تمنا کر رہا تھا، گڑگڑا رہا تھا۔

''اللہ، وہ مالا کا علی عیسیٰ نہ ہو...... میرا وہم بس وہم رہے۔ وہ افریشم کا ہی علی عیسیٰ ہو۔'' اس کے اندر سناٹے گونج رہے تھے۔ خاموشی تڑپ رہی تھی۔ اضطراب ٹھاٹیں مار رہا تھا اگر اس کے تمام خدشات درست نکلے تب وہ کیا کرے گا؟ کون سا قدم اٹھائے گا۔ افراہیم کو سچ کیسے بتائے گا؟ ان کی خوشیاں تہس نہس کیسے کرے گا؟ افریشم کی زندگی تباہ کیسے کرے گا؟ آنٹی، ایمل اور افراہیم کا سامنا کیسے کرے گا؟ وہ سچ بتا کر ان لوگوں کی ہنسی کا گلا کیسے گھونٹے گا۔ گر جو علی عیسیٰ مالا کا مجرم نکلا تب......؟ ہاں تب وہ افراہیم کو سچ بتا دے گا۔ علی عیسیٰ کی زندگی میں زہر گھول دے گا۔ اس سے اپنی بہن کے ایک، ایک آنسو کا حساب لے گا۔ قیامت آتی ہے تو بے شک آئے، اسے کسی کی پروا نہیں تھی، نہ افراہیم کی، نہ آنٹی کی نہ افریشم اور ایمل کی۔ اسے بس مالا کے مجرم کو سزا دینا تھی۔ اس کا اتنا لمبا سفر رائگاں چلا جائے...... یہ ذی شاہ کو گوارا نہیں تھا۔ وہ علی عیسیٰ سے حساب لینے آیا تھا۔ پھر کیسے نہ حساب لیتا؟ بتا

کتا بچے کھولے کیسے ناکام لوٹ جاتا۔ وہ اپنے اندر کا سارا زہر علی عیسیٰ کے من میں اتار کر ہی جانے والا تھا۔ وہ علی عیسیٰ کو زمین میں زندہ درگور کر کے ہی جانے والا تھا پھر جیسے انتظار کی گھڑیاں تھم گئی تھیں۔ وقت کی نبضیں رک رک گئیں۔ پاکستان سے بندیا کا فون آ گیا تھا۔ وہ قیامت کی خبر لائی تھی۔ ذی شاہ کی سانس تک رک گئی۔ دھڑکن تک تھم گئی تھی۔ وجود کے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔ درد انگڑائیاں لینے لگا تھا۔

''اِدھر تو قیامت آ گئی ذی بھیا......! وہ مالا کا علی عیسیٰ ہے، اس نے پہچان لیا اور پچھاڑیں کھا کر بے ہوش ہو گئی۔ ہم مالا کو اسپتال لے کر جا رہے ہیں۔'' بندیا نے روتے ہوئے اس کے جسم سے روح کو کھینچ لیا تھا۔ فون بند ہو گیا اور جیسے ذی شاہ کا دل بھی بند ہو گیا۔

☆☆☆

ایک دو تین اور چار دن گزر گئے۔ اسے ایسا بخار چڑھا کہ کئی دن ہوش نہیں آیا۔ افراہیم کی فیملی جیسے دیوانی ہو گئی۔ آنٹی کی جان کو غم لگ گیا۔ پردیسی بچہ خیر سے گھر جائے۔ یہاں کیوں بیمار پڑ گیا۔ انہیں جیسے پورا یقین تھا ولیس ہاؤس کی ساری نحوست کا اثر ذی شاہ کی جان پر پڑا تھا۔ وہ منکشے کو جی بھر کر کوستی تھیں۔ ایمل اور افراہیم اس کی پٹی سے لگ گئے تھے۔ بیچ میں افریشم بھی اس کی احوال پرسی کے لیے آئی تھی۔ منا سا بچہ اٹھا کر، ذی شاہ کا دل چاہا وہ افریشم کی گود میں سوئے بچے کی ننھی سی گردن دبوچ ڈالے کچھ ایسی نفرت سی ہو چکی تھی اسے علی عیسیٰ اور اس کے بچے سے۔ دل چاہتا تھا، پوری دنیا کو آگ لگا دے۔ جس دن اسے ڈسچارج ہونا تھا۔ یہ اسی دن کی بات تھی۔ وہ جو یہاں سے جانے کے بعد اگلا لائحہ عمل تیار کر رہا تھا۔ ایک دم منکشے کے لیے بے قرار ہو گیا۔ جانے وہ کس حال میں تھی؟ زندہ بھی تھی یا مر چکی تھی؟ اور اب تو اتنے دن ہو چکے تھے اس کی لاش تک گل سڑ چکی ہوگی۔ ذی شاہ کے دل پر بوجھ آ پڑا تھا۔ وہ اندر تک کھوکھلا ہو گیا۔ منکشے کی صورت جیسے دل پر پنجہ جما گئی تھی۔ یوں ہی اتنا ڈھیر سا وقت بیت گیا۔

افراہیم ابھی پہنچا نہیں تھا۔ ذی شاہ نے سوچا، وہ خود ہی ڈسچارج شیٹ بنوا کر گھر چلا جاتا ہے۔ آخر اس نے افراہیم کے گھر سے کوچ کرنے کی بھی تو تیاری کرنا تھی۔ اب تو وہ لمحے بھر کے لیے بھی اِدھر ٹکنے والا نہیں تھا۔ افراہیم کے گھر رہنے کا مطلب تھا، افریشم، عیسیٰ اور اس کے بچے سے بار بار سامنا ہوتا جو اس کی برداشت سے باہر تھا۔ پھر یہاں سے جا کر ہی وہ افراہیم کے سر پر بھی دھما کا کرنا چاہتا تھا۔ عیسیٰ کے کالے کرتوت بتا کر...... وہ بیڈ سے اتر کر کسی نرس یا ڈاکٹر کو تلاش کرنا چاہ رہا تھا۔ جب کوئی چپکے سے دروازہ کھول کر اندر آ گیا تھا۔ ذی شاہ نے گردن موڑ کر دیکھا تو دھک سے رہ گیا...... زمین جیسے گول، گول گھومنے لگی تھی۔ وہ جیسے کسی قبر سے اٹھ کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ وہی غلیظ سی مورگن روک پہنے، پہلے سے بھی بدحال، نڈھال اور کمزور، چلتی تو چلا نہ جاتا دیوار پکڑ، پکڑ کر بڑھ رہی تھی۔ پھر جیسے چکرا کر گرنے لگی تھی...... جب ذی شاہ نے ہاتھ بڑھا کر اسے تھام لیا۔ وہ کوئی ذی شاہ کی منکشے تھی؟ اسے یقین ہی نہیں آیا۔ اتنی بدحال، نڈھال، کمزور، اس سے بولا نہیں جا رہا تھا، وہ اس کی عیادت کرنے آئی تھی یا ایڈمٹ ہونے؟ جانے کتنے دن کی بھوکی تھی؟ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس نے سہارا دے کر منکشے کو بیڈ پر بٹھایا تھا۔ پھر جوس کا گلاس بھر کے تھمایا...... اس کا دل مٹھی میں آ رہا تھا۔

''اللہ پہلے کیا مسئلے کم تھے جو یہ ایک نیا امتحانِ محبت...... اس پرچے میں کہیں فیل نہ ہو جاؤں۔'' وہ افسردہ سا سوچ رہا تھا۔ منکشے کی حالت سخت تشویشناک تھی۔ اس کا بی پی بھی بہت لو لگتا تھا اور آنکھیں جیسے بجھتی جا رہی تھیں۔

''کتنے دن سے بھوکی ہو؟'' وہ جیسے بہت غصے اور کرب سے اسے دیکھ رہا تھا۔ منکشے کی گیلی آنکھیں، پپڑی زدہ ہونٹ، بالوں کا گھونسلا، کمزور وجود...... اس کے دل پر گھونسا سا پڑا تھا۔ وہ فق بیٹھا اسے دیکھے جا رہا تھا، حیران، متحیر......

''جب سے تم آئے نہیں...... نو دن ہو گئے، پانی اور بسکٹ...... ہاں، تمہارے لیے زندہ رہنا تھا۔ ورنہ یہ بھی نہ کھاتی...... مجھے تم تک آنا تھا۔ تمہیں کچھ بتانا تھا۔'' منکشے نے گیلی آنکھیں زور سے رگڑیں۔ وہ رو نہیں رہی تھی پھر بھی آنکھوں سے بہتا پانی...... اس کے اندر آنسوؤں کا شاید چشمہ پھوٹ پڑا تھا۔

''اللہ، یہ گیلی آنکھیں...... دم نہ نکال لیں۔'' وہ گم صم سا ہو گیا تھا۔ لمحے بھر کے لیے معنی خیز خاموشی کا جال تن گیا۔ وہ بالکل چپ بیٹھی تھی۔ جیسے کوئی ساکت، بے جان مجسمہ ہو، ذی شاہ کو خود ہی مخاطب کرنا پڑا تھا۔ اس نے مجسمے کا کندھا ہلایا۔ اسے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ اس کی خالی آنکھوں میں جھانکا۔

''منکشے! تم خود اپنے ساتھ کتنا ظلم کر رہی ہو، بھوکی رہ، رہ کر کسی دن مر جانا، کوئی دفنانے بھی نہیں آئے گا۔'' وہ کرب انگیز لہجے میں بولا تھا۔ اس کی آنکھیں لبالب بھر گئیں۔ مگر ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ بے خودی کے عالم میں آنکھیں رگڑ رگڑ کر اسے دیکھ رہی تھی۔ جیسے دیکھ، دیکھ کر دل نہیں بھر رہا تھا۔ ذی شاہ جھنجلا گیا تھا۔ کیسی بے خود، شرابی سی قاتل نظریں تھیں۔

''ایسے کیوں دیکھتی ہو؟'' وہ جز بز ہو گیا۔

''تو کیسے دیکھوں؟'' منکشے اداسی سے مسکرا دی تھی۔ وہ چپ سا رہ گیا تھا۔ معاً خیال آنے پر چونکا۔

''تم نے کچھ بتانا تھا؟'' اسے جیسے کچھ یاد آیا تھا۔ وہ بھی جانے کیا بتانے کے لیے بے چین بیٹھی تھی۔ اس کے توجہ دلانے پر چونک گئی تھی پھر جیسے لمبی، لمبی سانس لینے لگی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ کوئی ناکارہ انجن دھواں چھوڑ رہا ہے۔ اس کا وجود بھی جھٹکے کھانے لگا تھا۔ شاید کمزوری کے باعث وہ کانپ رہی تھی، وہ بنا سویٹر کے نکل آئی تھی۔ ذی شاہ کو جیسے ہی احساس ہوا تھا اس نے اپنی چادر اتار کر اسے پہنا دی تھی۔ حالانکہ کمرے میں ہیٹر بھی لگا تھا۔ پھر بھی وہ بری طرح سے لرز رہی تھی۔ لحظہ لحظہ ہونٹ کاٹتی منکشے کتنی مضطرب، بے حال اور بے قرار لگ رہی تھی۔ جانے وہ کیا بتانے والی تھی۔ ذی شاہ کا رُواں، رُواں کان بن گیا تھا۔

''میں نے بہت گناہ کیے ہیں۔'' منکشے نے سر جھکا کر جیسے پہلا انکشاف کیا تھا۔ وہ ذرا بھی نہیں چونکا۔ بس اسے سننا چاہتا تھا۔ ذی شاہ جان گیا تھا، وہ اپنے دل پر کوئی بوجھ لیے پھر رہی ہے۔ اسے کسی ایسے سامع کی ضرورت تھی جو اس کے دل کا بوجھ اتار لیتا۔ معاً منکشے نے ذی شاہ کو بری طرح ٹھٹکا دیا تھا۔ وہ اس سے کچھ پوچھ رہی تھی۔ کوئی سوال کر رہی تھی۔

''تمہارے نزدیک گناہ کیا ہے؟'' اب وہ اسے بولنے پر اکسا رہی تھی۔ وہ جیسے لحظہ بھر کے لیے متحیر رہ گیا تھا۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد بولتی رہی تھی۔ پھر ذی شاہ نے گناہوں کی ایک فہرست ذہن میں ترتیب دی تھی۔ اسے جواب تو دینا ہی تھا۔

''شراب، جوا، جھوٹ، غیبت، چوری، ڈاکا، حرام کاری، یہ سب بھاری گناہ ہیں، کیا تم ان گناہوں کے بوجھ سے شرمسار ہو؟'' اس کا دل رک رک کر چلنے لگا تھا۔ جانے وہ کیا بولتی؟ آخر مغربی لڑکی تھی۔ یہاں کیا کچھ نہیں ہوتا تھا؟ گناہ و ثواب سے قطع نظر...... موت کے خوف سے دور، بس آزادی کا ناجائز استعمال، تو جانے یہ کس قسم کے بھاری گناہ کے بوجھ تلے دبی تھی۔'' کاش کہ وہ یہ سوال نہ ہی کرتی...... وہ جیسے خود بھی کسی بوجھ تلے دب گیا تھا۔

''نہیں۔'' اس کے ایک لفظی جواب نے ذی شاہ کو اندر تک شانت کر دیا تھا۔ وہ لحہ بھر میں ہر بوجھ سے آزاد ہو گیا...... اب وہ کچھ اور پوچھ رہی تھی۔ سر جھکائے گم صم سی، کھوئے کھوئے لہجے میں، بے خودی۔ وہ اپنے آپ میں کہاں لگتی تھی۔

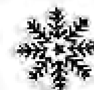
''کیا تمہارے نزدیک یہی بڑے گناہ ہیں؟'' اس کا سوال، اسی کی طرح عجیب تھا ذی شاہ پھر سے ٹھٹک گیا۔

''ہاں......'' اس کے ذہن میں گناہوں کی فہرست اب خالی ہو چکی تھی۔ تبھی اس نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

''کیا کسی کو قتل کرنا گناہ نہیں ہے؟'' گیلی آنکھوں والی لڑکی اسے دہلانے آئی تھی یا ہلانے آئی تھی؟ وہ لحہ



ناولٹ



ترکِ وفا

نایاب جیلانی

دسواں حصّہ

دریائے نیکر کی پُرسکون لہروں میں اچانک طغیانی آ گئی تھی۔ نیکر کا پانی جو کسی حساس، سوگوار ندی کی طرح خاموش، صابر اور پُرسکون رہتا تھا جو ہائیڈل برگ کی پہچان تھا.....اور خدا کی اس سرسبز زمین میں سے دنیا کی حسین ترین وادی کے نشیب میں بہتا تھا۔ جسے نرم، گداز اور سفید بادل جالوں کے مانند ڈھانکے رکھتے تھے۔ جس کے کنارے پر گنبدوں والے میناروں، عجائب گھروں، گرجوں اور چھ سو سال پرانی یونی ورسٹی کی





عمارت والا شہر آباد تھا۔ جس کے ایک طرف تنہا، اداس، غمگین، بوجھل، لٹا پٹا اور صدیوں پرانا غموں اور حوادثات کا شکار سرخ قلعہ تھا۔

وہی نیکر جو ہائیڈل برگ کے کنارے بہتا تھا۔ ہائیڈل برگ جیسا قدیم شہر، جس کی چھتیں ایک دوسرے کے ساتھ ہونٹوں کے مانند باہم ملی تھیں۔ شہر کو مقدس پہاڑی سے ملانے کے لیے ایک خاص قدیم پل تھا۔ پل کی طرف جانے سے پہلے ایک قدیم وضع کے دروازے میں سے گزرنا ہوتا تھا اور پل کے ایک سرے پر دائن، ڈینیوب، نیکر اور موزیلے دریاؤں کے مجسمے تھے اور دوسرے پر نیکی، انصاف، زراعت اور تجارت کے بت استادہ تھے۔ طوفان آتے جاتے رہتے تھے، موسم بدلتے رہتے مگر دریائے نیکر اپنی دھن میں مگن سکون کے عالم میں رواں تھا۔ جیسے اسے تہذیب کے ہنگاموں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ بدلتے موسم اسے چونکاتے نہیں تھے، اس کے پانی سے دُرِخوش آب (عمدہ چمکیلے موتی) نکلتے تھے۔ اس کے جنب، چھپاؤ اور گہرائی میں کئی طرح کے راز پڑے گہری نیند سو رہے تھے اور وہ اپنے اندر کسی کو اترنے نہیں دیتا تھا۔ پانی کی خاموش لہریں درمیان میں حائل تھیں۔ اس کے اندر اترنے کے لیے کمال کا حوصلہ درکار تھا۔ وہ جو ایک ہی حالت میں بہتا تھا، کبھی کبھار ہواؤں کے شور پر ناگواری محسوس کرلیتا۔ اسے ہنگامے اور شور پسند نہیں تھا اور کوئی اس کی لہروں کو منتشر کرتا تو اسے بہت غصہ آتا۔ تب وہ اپنے ٹھیا (مقام) سے ہٹ کر جوش کھانے لگتا تھا۔

ہوا کبھی سا ہو (دوست) بن جاتی تھی اور کبھی نیکر کو غصہ دلا دیتی۔ اسے فاسد ہواؤں پر تاؤ چڑھتا تھا۔ اس کی سرشت میں بے صبرا پن نہیں تھا مگر آتے جاتے موسم اس پر اپنا اثر ضرور چھوڑ جاتے تھے۔ جیسے اب بھی نیکر کے پُرسکون پانیوں میں تھرتھراہٹ ہونے لگی تھی۔ لہروں نے جوش کھایا تھا اور پانی کو غیظ چڑھ گیا۔ نیکر کی پُرسکون، حلیم اور پُرامن ندی میں بالآخر طغیانی آ گئی تھی۔ شفاف پانی کی لہروں میں پہلا کنکر کس نے پھینکا تھا؟ اس نے گزرتے سمے سے رک، رک کر اور ٹھہر، ٹھہر کر پوچھا تھا اور جواب جیسے اس کے اپنے اندر سے آیا۔ من ہائیم کی پاگل، پاگل منکشے نے جو ڈار سے بچھڑی کونج کی طرح تھی، اداس، ویران، خاموش، نڈھال اور بدحال۔

دریائے نیکر کی پُرسکون لہروں میں پہلا کنکر منکشے نے پھینکا تھا۔ وہ پہلے کنکر کے ساتھ ہی نیکر کی گہرائیوں سے کئی سال پہلے کا کھویا ہوا، ڈوبا ہوا، گم شدہ راز نکال کر باہر لے آئی تھی۔ وہ بڑی باہمت، دلیر اور نڈر لڑکی تھی۔ تبھی نیکر کے گہرے پانیوں میں بے جھجک اتر گئی تھی۔ وہ پیچ در پیچ خمدار، چکرالی اور مرغول بات کر رہی تھی۔ عقلِ انسانی کو منجمد کر دینے والی بات کر رہی تھی۔ سوچ کو دبنگ کر دینے والی بات کر رہی تھی۔ ذہن کو کرنٹ لگا دینے والی بات کر رہی تھی۔ وہ کیسے یقین کرلیتا۔ وہ کس طرح مان جاتا؟ اس کی سوچ جیسے تھم کر رہ گئی تھی جبکہ وہ اسے یقین دلانے کے لیے مرقومہ (تحریر شدہ) سچ بھی دکھانے پر تیار تھی۔ اور معیار (آلہ) پیمانہ، کسوٹی پر سونے جیسے سچ کو کھرا اور کھوٹا ثابت کرنے پر بھی تیار تھی۔ وہ جیسے اندر تک حبس اور گھٹن سے معمور تھی۔ ان دیکھے بوجھ تلے خود کو ہر اذیت سے نجات دلانے کے لیے اس کے سامنے اپنا دل کھولنے آئی تھی۔ اس کا یقین بڑا گمبھیر اور پختہ تھا جیسے ذی شاہ کبھی انکاری ہو ہی نہیں پائے گا۔ وہ ایسی نالشی ہی بن کر تو آئی تھی، وہ چاہ کر بھی اسے جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ اس نے اپنے دل کو آمادہ کرلیا تھا، وہ اس نالشی کی ہر بات سننے پر دل سے رضامند ہو گیا۔ اس کی سنے بغیر کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا اور منکشے جیسے نام بہ نام راز کھولنے آئی تھی۔ اس نے سب سے پہلے ذی شاہ کی چچا زاد مون حسیب کا نام لیا تھا۔ تو گویا پہلا راز وہ مون کے متعلق اگلنے والی تھی۔

علی عیسیٰ سے وابستہ اس کے گھر کے متعلقین، کنبے، رشتے داروں میں سب سے پہلے مون حسیب کا ذکر کیا گیا تھا۔ وہ مون حسیب سے ہوتی ہوئی علی عیسیٰ تک آنے والی تھی اور اس کے بعد مالا کے دکھ کا ہر بادباں جیسے کھل جاتا۔ کوئی راز، راز نہ رہتا۔ ذی شاہ کو بس انتظار کرنا تھا، منکشے کی ہر بات مکمل ہونے تک کا۔ وہ عجلت اور بے صبرے پن کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگر منکشے پل صراط پر چلنے کا فیصلہ کر کے آئی تھی تو پھر وہ اسے تنہا پل صراط پہ چلنے کے لیے کیسے چھوڑ دیتا۔

پھر اس نے منکشے کے چہرے پر وحشت ناچتی دیکھی تھی۔ وہ کوئی وحشت ناک بات کرنے کا ارادہ رکھتی تھی، اس کے چہرے کا ہر تاثر وحشت انگیز اور ہولناک تھا۔ وہ کچھ حواس باختہ، گھبرائی، خبطی بلکہ مجنون سی بھی نظر آ رہی تھی۔ اس کی وحشت بھری گیلی آنکھوں سے کئی راز گر رہے تھے۔ وہ کسی وحوش (صحرائی جانور) کے مانند دِکھنے لگی تھی۔ پھر اس نے ذی شاہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ جیسے اپنے دل کو تقویت دینا چاہتی ہو۔ اس کا گداز کپکپاتا ہاتھ ذی شاہ کے ہاتھ پر جما تھا۔ انتہائی مضبوطی سے، بڑے بھروسے کے ساتھ جیسے ذی شاہ ''کچھ بھی'' سن کر اس کا ہاتھ ہرگز نہ جھٹکے گا۔ وہ اس کے عہد کو دہرا رہی تھی، جو مقدس قرآن پر ہاتھ رکھ کر ذی شاہ نے منکشے سے کیا تھا۔ اس کا دل وجع کا گڑھ بن رہا تھا، جس سے ہر طرح کا درد اور ٹیس اٹھ رہی تھی۔ اس نے انتہائی درد میں ڈوبی آواز کے ساتھ کہا تھا۔ جیسے وہ قطرہ، قطرہ پگھل چکی تھی اور اب مزید پگھلنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

''میں نے جو بھی کیا...... اپنے ہر عمل کی سزا بھگتنے کو تیار ہوں۔ شرط یہ ہے کہ تم میری ایلچی گیری (یعنی وکالت) کرو گے۔'' منکشے کی آواز اسے بیکراں سوچوں کے سمندر سے کھینچ لائی تھی۔ وہ لمحے بھر کے لیے پھر سے ششدر رہ گیا تھا۔ یہ منکشے کیا کہہ رہی تھی؟ وہ اس کی مختار کاری کیسے کر سکتا تھا؟ وہ تو ایک ساہوکار تھا، سوداگر اور تاجر تھا، وہ کسی کی وکالت کرنا نہیں جانتا تھا اور وہ ذی شاہ کو اپنا مختارِ خاص بنانا چاہتی تھی۔ کیا یہ ممکن تھا...... اگرچہ یہ ممکن ہرگز نہیں تھا۔ پھر بھی اسے منکشے کا وکیل تو بننا تھا۔ اپنے دل کے مجبور کرنے پر۔

اب منکشے گیلی آنکھوں کو رگڑتے ہوئے وقوعہ سے پہلے کے واقعات بتانے والی تھی، واردات سے پہلے مون حسیب کے وقوعِ جرم کی کہانی سنانے والی تھی۔ اس کا ڈھانچے جیسا وجود دھیرے، دھیرے کانپ رہا تھا۔ چہرے پر پھر سے وحشت ناچنے لگی تھی۔ آنکھوں سے خوف چھن، چھن کر نکل رہا تھا۔ جیسے اپنی ہلاکت کا خود سے ذکر کرنا اس کے لیے انتہائی عذاب ناک تھا۔ سم قاتل کا جام بالآخر اسے پینا ہی پڑا۔ زہر ہلاہل اس کی رگوں کو کاٹ رہا تھا۔ سانس مشکل تھی پر لینی تو تھی ناں...... اگرچہ ہفت اندام پہ خنجر چل رہے تھے، خون رگوں سے پھوٹ رہا تھا، پھر بھی...... پھر بھی زندہ تو رہنا تھا۔ وہ جتنے بھی مخدرات (سن کر دینے والی اشیا) کا استعمال کرتی۔ مختل الحواس نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے حواس ہی اس کی اصل سزا تھے۔ وہ اس حقیقت کو دیر سے سہی مگر جان ضرور گئی تھی۔ لمحے چپ چاپ بیتتے رہے، صفحے کھلتے رہے، وہ کہانی کی ابتدا سے پہلے کچھ بتا رہی تھی جیسے ذی شاہ کے پیروں تلے سے زمین کھسکا رہی تھی۔ مون حسیب کیا تھی؟ اس کا ذہن کتنا طاقتور تھا؟ اور اسے کچھ ایسی قوتیں عطیۂ خداوندی کے طور پر ملی تھیں۔

''میں نے مون حسیب کو قتل کر دیا تھا...... وہ انتہائی خطرناک، ذہن رکھتی تھی۔ ماہرِ انتقالِ افکار تھی۔ اسے ایسا علم خدا نے عطا کیا تھا کہ جس کا تعلق انسان کی غیر مادی قوتِ متحرکہ سے تھا۔ مگر اس سے بھی پہلے تم مون حسیب کی ذات میں اترنا چاہو گے؟ چلو آؤ...... میں تمہیں مون حسیب کی زندگی کا ایک،

ایک صفحہ پڑھاتی ہوں پھر چاہے تو ان غلیظ صفحات کو نذرِ آتش کردینا اور چاہے تو دریا برد کردینا۔ تمہیں اختیار ہے۔ جو دل چاہے کرنا۔" اس نے سر جھکا کر کہنا شروع کیا تھا۔ ذی شاہ نے سانس تک روک رکھی تھی۔ وہ آج بس منکشے کو سننا چاہتا تھا۔ کوئی سوال اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔

اور منکشے نے سلسلۂ کلام وہاں سے جوڑا تھا جب مون حسیب، علی عیسیٰ کے بعد اس کے چاچو حسیب احمد کی دعا بن کر اس دنیا میں آئی تھی۔

وہ من ہائیم کے بجائے بواریا میں پیدا ہوئی۔ وہ ایک حسین صبح تھی۔ سرسبز، تروتازہ اور انتہائی خوشگوار...... یہ صبح حسیب احمد کے لیے کامیابیوں کے در وا کرگئی تھی مگر سچ تو یہ تھا کہ ان کے ہاں ایک بلند بخت بچی نے جنم لیا تھا۔ اس کی پیدائش کے ایک گھنٹے بعد حسیب احمد کو پہلی خوشخبری ملی تھی، انہیں ایکسپورٹ پروموشن بیورو کی رکنیت کا سرٹیفکیٹ مل گیا تھا۔ اب وہ جرمنی میں قدم جما کر کاروبار کرسکتے تھے۔ ڈوئچ لینڈ میں مستقل رہائش کے باوجود شہریت آسانی سے نہیں ملتی۔ شادی اور بچے ہوجانے کے باوجود شہریت ملنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ گنتی کے چند تارکینِ وطن جرمنی کی شہریت رکھتے تھے۔ ان میں جلد ہی حسیب احمد کا بھی شمار ہوگیا تھا۔ مون کی پیدائش کے ایک سال بعد انہیں رہائشی ویزا حکومت نے جاری کردیا تھا۔ بینک سے گھر خریدنے کے لیے قرضہ بھی مل گیا تھا جو انہوں نے اگلے دو سالوں میں اتار بھی دیا تھا۔ مون کی چوتھی سالگرہ پر وہ اپنی ذاتی کار کے مالک بن گئے تھے اور اس کی پانچویں سالگرہ پر انہوں نے اپنی ذاتی فرم ہیرلخ کے نام سے من ہائیم میں خرید لی تھی۔ جیسے مون کی پیدائش کے بعد ان پر ہُن برسنے لگا تھا۔ ان کی اکلوتی بیٹی بہت بلند بخت تھی۔ بڑی بانصیب تھی۔ آسمان پر چمکتے چاند کی طرح حسین اور اونچے نصیب والی۔

حسیب احمد اپنے حسین، فرمانبردار خوب صورت بچوں میں مگن دن رات کاروبار کی ترقی میں لگ چکے تھے۔ مریم، بچوں کی دیکھ بھال کرتی، ان کا خیال رکھتی، اچھی تربیت کرتی اور اس کے ساتھ، ساتھ وہ آفس میں بھی ان کی بہت مدد کرتی تھی۔ ان کا کاروبار دنوں میں پھلتا پھولتا گیا تھا۔ یہ مریم کی مدد، انتھک کوشش اور بھرپور ساتھ کا کرشمہ تھا۔ وہ بڑے کم عرصے میں شہر کے نامور بزنس مین بن گئے تھے۔ اگلے پانچ سال تک انہیں جرمنی کا پاسپورٹ جاری کردیا گیا تھا۔ اب وہ دیگر ممالک میں بغیر ویزا کے آجاسکتے تھے۔ کاروبار کی ترقی کو دیکھ کر ان کا دل اور زیادہ محنت کے لیے مچلتا تھا۔ وہ رات دن کا فرق بھلائے انتھک محنت کررہے تھے مگر اس دوران وہ اپنے بچوں سے غافل نہیں رہے تھے۔ مریم کی اعلیٰ تربیت اور سختی کی بدولت ان کے دونوں بچے نہایت فرمانبردار اور باتمیز تھے۔

عیسیٰ اسکول جاتا تھا اور مون گھر میں کلاسز لیتی تھی۔ ان دونوں نے انگلش اور عربی میں ایک، ایک مرتبہ قرآن بھی پڑھ لیا تھا بلکہ مون نے تو حفظ کیا تھا۔ دراصل مون کی غیر معمولی ذہانت نے پہلی مرتبہ انہیں ٹھٹکایا بھی اسی وقت تھا جب اس نے قرآن کی کلاس میں جو سبق لیا وہ اسے زبانی یاد ہوگیا تھا۔ پھر ہر روز وہ اپنا سبق دُہراتی تو اس کے ذہن میں جیسے جم جاتا۔ جیسے کمپیوٹر کی طرح ہر لفظ، ہر سبق یا روزمرہ کی چھوٹی موٹی بات فیڈ ہوجاتی تھی۔ وہ قرآن ناظرہ پڑھتی تھی مگر اسے زبانی یاد ہونے لگا تھا۔ پہلی مرتبہ اس کے اتالیق نے حسیب احمد کو اپنے اسلامک سینٹر میں بلا بھیجا تھا۔ یہ چھوٹی سی قرآن اکیڈمی تھی۔ یہاں بچے اور بچیاں قرآن سیکھتے، سمجھتے اور اسے یاد کرتے تھے۔

حسیب احمد، اتالیق کے بلاوے پر قرآن اکیڈمی آئے تو اتالیق نے بڑے حیران کن انکشافات کیے تھے۔ اتالیق نے بتایا تھا۔ مون عام

بچوں کی طرح سبق یاد نہیں کرتی، نہ رٹا مارتی ہے۔ نہ اونچی آواز میں پڑھتی ہے۔ بس ایک نظر دیکھ کر سیپارہ بند کرلیتی ہے مگر پھر بھی اسے سبق یاد ہوجاتا ہے اور پھر حیرت کی بات تو یہ ہے کہ وہ سبق کو دوبارہ بھولتی نہیں۔

اتالیق کی گفتگو نے حسیب احمد کو پہلے تو حیران کیا تھا پھر ان کا سینہ فخر سے پھول گیا تھا۔ ان کی بیٹی کلاس کے ہر بچے سے زیادہ ذہین، لائق اور جلدی قرآن پڑھنے والی بچی تھی۔ ان کا سینہ فخر سے کیوں نہ پھولتا! انہوں نے اتالیق کی حیرانی پر غور نہیں کیا تھا اور نہ اس کی پوری بات پر توجہ دی تھی۔ سچ تو یہ تھا کہ مون نے عیسیٰ سے بھی پہلے قرآن پڑھ لیا تھا۔ اگرچہ عیسیٰ بھی ذہین تھا مگر مون کا مقابلہ ان کی پوری نسل کا کوئی بچہ نہیں کرسکتا تھا۔ انہیں تب اس کا احساس نہیں ہوا تھا...... بلکہ بہت سال تک انہیں پتا ہی نہیں چلا۔ ان کی بیٹی کیسا قیامت کا ذہن رکھتی ہے۔

وہ اپنے تئیں سارے فرائض ادا کررہے تھے۔ بزنس اور گھر کو بھرپور توجہ دیتے...... مون انہیں جتنی پیاری تھی عیسیٰ اس سے دگنا عزیز تھا بلکہ عیسیٰ میں ان کی جان بند تھی، شاید یہ بات مون نے بہت کم عمری میں ہی محسوس کرلی تھی اور وہ سمجھ ہی نہیں سکے تھے۔ مون رفتہ، رفتہ اپنے دورِ صغر (کم سنی) میں ہی ان سے بہت دور چلی گئی تھی۔ وہ چیزوں کو بڑی جلدی اور انتہائی شدت کے ساتھ محسوس کرتی تھی وہ اپنے دور کے ہر بچے سے مختلف تھی۔ اور عجیب بات تو یہ تھی، مون حسیب کے ماں، باپ اپنی بیٹی کی اس اعلیٰ پائے کی انفرادیت کو سمجھ ہی نہیں سکے تھے۔

اتالیق کے وقتاً فوقتاً بلاوے ان کے ذہن سے نکل گئے تھے اور مون حسیب قرآن حفظ کر کے اسکول جانے لگی تھی۔ حالانکہ آٹھ سال کی عمر میں قرآن یاد کرنا اتنا معمولی واقعہ نہیں تھا مگر مریم اور حسیب نے توجہ ہی نہیں دی۔ اس کی رسم بسم اللہ سے لے کر قرآن حفظ کرنے تک وہ اتنے ہی بے پروا اور بے نیاز رہے تھے۔ جیسے مون نے قرآن پڑھ لیا تھا اور ایک ذمے داری ختم ہوچکی تھی۔ اب دوسری ذمے داری دنیاوی تعلیم کی تھی۔ عیسیٰ، مون سے بڑا تھا۔ وہ بہت سلجھا ہوا فرمانبردار بچہ تھا۔ اپنے اسکول وقت پر جاتا، ٹائم سے گھر آتا، کھانا کھاتا، آرام کرتا پھر کھیلنے کے لیے کلب چلا جاتا تھا۔ وہ لڑکا تھا اس کی ایکٹویٹیز لڑکیوں سے مختلف ہی ہوتا تھیں مگر مون کی ایکٹویٹیز عام لڑکیوں سے بہت مختلف تھیں...... وہ لڑکیوں کے کھیل نہیں کھیلتی تھی، اس کی کوئی سہیلی نہیں تھی، اسے گراؤنڈ میں جانا بھی پسند نہیں تھا۔ ٹی وی میں دلچسپی نہیں تھی۔ گیم کا موڈ نہ ہوتا پھر وہ اسکول سے آکر کیا کام کیا کرتی تھی؟ مریم اور حسیب بھی جان نہیں سکے تھے۔

وہ دونوں صبح دفتر کے لیے نکلتے، دونوں بچوں کو ان کے اسکولوں میں چھوڑتے، انہیں لنچ کرنے کی ہدایت دیتے، پیار کرتے اور آفس چلے جاتے تھے۔ واپسی ہمیشہ رات کو ہوتی تھی۔ بیچ میں مریم گھر آکر بچوں کو ہوم ورک کرواتی، کھانا وغیرہ دیتی اور پھر سلا کر دفتر نکل جاتی تھی۔ وہ شوہر پر زیادہ بوجھ نہیں ڈالنا چاہتی تھی، ان کا کام میں ہاتھ بٹاتی تھی۔ ان دونوں کی انتھک محنت کا نتیجہ ہیرلخ کی بہترین اور مضبوط ساکھ تھی۔

مریم کے دوبارہ دفتر چلے جانے کے بعد عیسیٰ تو آرام سے سوجاتا تھا مگر مون کیا کرتی تھی؟ وہ ماں کو مطمئن کرنے کے لیے آنکھیں بند کر کے سوتی بن جاتی تھی۔ پھر مریم چپکے سے مون کے سر کو چومتی اٹھ جاتی۔ پردے برابر کرتی، دروازہ بند کرتی اور آفس کے لیے روانہ ہوجاتی۔ اس دوران مون آنکھیں موندے رکھتی تھی پھر جیسے، جیسے مریم کی ہیل ٹک، ٹک کرتی دور ہوتی تھی اس کی پلکیں دھیرے، دھیرے کھلتی جاتی تھیں۔ وہ ہیل کی ٹک، ٹک سے اندازہ

لگاتی تھی۔

"مما کمرے سے نکل گئیں...... مما اب لاؤنج میں ہیں...... مما اب کچن میں ہیں۔ مما اب عیسیٰ کے کمرے کی طرف جارہی ہیں۔ مما اب دوبارہ لاؤنج میں سے گزر رہی ہیں...... اور مما اب لاؤنج کے دروازے سے نکل کر ڈرائیور وے پر چل رہی ہیں...... مما اب گیراج میں پہنچ گئیں۔ مما اب گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ گیراج سے گاڑی اب تیزی سے نکل گئی......" ٹک، ٹک کی آواز اس کے دماغ سے دور ہوتی چلی جاتی تھی پھر وہ مطمئن سی چادر پھینک کر بستر سے اٹھتی۔ اپنی روک کو جھاڑتی، بال سنوارتی پھر کوٹ شوز پہن کر باہر نکل آتی، اس کا رخ عیسیٰ کے اسٹوڈیو کی طرف ہوتا تھا۔ وہ ڈیڑھ گھنٹے تک آرام سے عیسیٰ کی پینٹنگ کے ادھورے پن کو ختم کردیتی پھر جیسے ہی گھڑی ڈیڑھ گھنٹے کا الارم بجاتی، اس کے دماغ میں کلک سے کچھ روشن ہوتا تھا۔

وہ "کچھ" کیا تھا؟ بہت عرصے بعد مون کو اس "کچھ" کی سمجھ آئی تھی۔ اس سے پہلے وہ کلک کی اس آواز کو سمجھ نہیں پاتی تھی۔ وہ کوئی غیبی قوت تھی، کوئی ایسی طاقت جو اسے خطرے سے پہلے الرٹ کردیتی تھی۔ جیسے ہی عیسیٰ کی آنکھ کھلتی، اسٹوڈیو میں موجود مون کے ہاتھ سے برش گر جاتا تھا۔ پھر وہ بستر سے اٹھتا تب مون برش کو اٹھا کر اپنی جگہ پر رکھ دیتی، کلرز سمیٹتی...... گلوز اتارتی، لائٹس آف کرتی دوبارہ اپنے کمرے میں گھس کر بستر پر لیٹنے کے بعد آنکھیں موند لیتی تھی۔

عیسیٰ چپل پہن کر واش روم سے ہو کر آتا، بال بناتا، بستر سمیٹتا، بیڈ شیٹ کی شکنیں دور کرتا پھر کچن میں سے جوس کا کین اٹھاتا اور پھر دھیرے، دھیرے اپنے اسٹوڈیو میں گھس جاتا تھا۔ لائٹس آن کرنے کے بعد اس کی آنکھیں کھل جاتیں، عیسیٰ کی ادھوری پینٹنگ انتہائی صفائی کے ساتھ مکمل ہوئی نظر آتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سراسیمگی ابھرتی، خوف مچلتا، حیرت چھلکتی اور پھر جیسے وہ شک کی بنیاد پر مون کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جھانکتا تھا۔

اس کے سونے سے پہلے پینٹنگ ادھوری تھی، سونے کے دوران مکمل ہو گئی مگر کس طرح......؟ جبکہ مون بھی اپنے بستر میں گم نظر آرہی ہوتی تھی۔ وہ شک سے نکل کر حیران ہوتا پھر ذرا خوف زدہ سا ہو کر پلٹ جاتا تھا۔ جانے یہ ماجرا کیا تھا؟ وہ سمجھ نہ پاتا۔

اور ادھر مون چپل کی چاپ سے اندازہ لگاتی۔ عیسیٰ اس کے کمرے میں آیا تھا، کچھ دیر رکا رہا پھر باہر چلا گیا۔ باہر کہاں؟ لاؤنج میں، کچن میں یا اسٹوڈیو میں...... چپل کی چاپ کا رخ لاؤنج سے باہر کی طرف ہوتا تھا۔ اس کا اندازہ بالکل ٹھیک ثابت ہوتا۔ عیسیٰ گیراج سے اپنی سائیکل نکال کر باہر نکل جاتا تھا۔

تب وہ دھیرے، دھیرے پلکیں کھول لیتی تھی۔ جیسے جان بچ جانے پر مسکرا اٹھتی۔ عیسیٰ کو چکما دینے میں وہ کامیاب ہو چکی تھی۔ اور اس طرح وہ بے شمار لوگوں کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو جاتی تھی، اکثر تو مما، پاپا بھی لپیٹ میں آجاتے تھے۔ بہت عرصے تک خطرے سے پہلے اپنے اندر بجتے الارم کو وہ کوئی نام نہیں دے سکی تھی۔ ایک مدت بعد اسے پتا چلا تھا کہ اس کے اندر جو گھنٹی سی بجتی ہے وہ E S P کی حامل کوئی قوت ہے۔ جسے عرفِ عام میں چھٹی حس بھی کہتے تھے۔

☆☆☆

چھٹی حس کیا تھی؟ اس کا ننھا ذہن جو اتنا ننھا...... ہرگز نہیں تھا...... تب بالکل سمجھ نہیں پاتا تھا۔ بہت عرصے تک اسے چھٹی حس کا پتا نہیں چل سکا تھا۔ حالانکہ چھٹی حس ہر انسان میں موجود ہوتی ہے، مون میں تھی تو اس میں کیا نیا پن تھا؟ ہر انسان کے اندر کسی مشکل یا انہونی گھڑی میں گھنٹی بج اٹھتی ہے اس گھنٹی کو

چھٹی حس کہتے ہیں جو خطرے سے پہلے خبردار کرتی ہے۔ یہ اللہ کی طرف سے انسان کے لیے ایک اور اعلیٰ قسم کی نعمت ہوتی ہے جس طرح انسان اللہ کی باقی تمام نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتا اسی طرح چھٹی حس جیسی اعلیٰ پائے کی نعمت پر بھی شکر ادا نہیں کرتا بلکہ مون کی طرح اترانے لگتا ہے۔

یہ چھٹی حس مون کے اندر عام انسانوں سے زیادہ قوت رکھتی تھی اور جلد اسے معاملے کی تہ تک ... پہنچا دیتی۔ جیسے ہی وہ خطرہ محسوس کرتی فوراً اس کا ذہن اگلی ہدایت دینے لگتا کہ... اب یہ کرنا چاہیے؟ اب یوں کرنا چاہیے۔

اس نے عیسیٰ کا اٹھ جانا محسوس کرلیا تھا۔ اس کے اندر زور، زور سے الارم بجنے لگا تھا تب وہ فوراً اسٹوڈیو میں اپنے اثرات مٹاتی کمرے میں بھاگ آئی تھی۔ تب اس نے عیسیٰ کو چکما دے دیا تھا، وہ اس کی ادھوری پینٹنگ کو مکمل کر آئی تھی۔ وہ جانتی تھی عیسیٰ اپنی چیزوں کے معاملے میں کتنا کچا ہے۔ وہ اپنے اسکول بیگ سے لے کر سائیکل تک کسی چیز کو ہاتھ لگانے نہیں دیتا تھا اور مون کی شروع سے عادت تھی وہ اپنی اعلیٰ، قیمتی اور انتہائی امپورٹنٹ چیز چھوڑ کر عیسیٰ کی منتخب کی ہوئی چیزوں پر ہاتھ رکھ دیتی تھی۔

اس کی یہ عادت مما کو پسند تھی نہ پاپا کو...... وہ اسے منع کرتے، ڈانٹتے، روکتے اور سمجھاتے تھے مگر مون کو ان کا منع کرنا برا لگتا، وہ ضد میں آکر وہی کام کرنے کی کوشش کرتی جس سے اسے روکا جاتا تھا۔

کل رات مما نے اسے عیسیٰ کے اسٹوڈیو میں گھسنے سے منع کیا تھا۔ یقیناً عیسیٰ نے شکایت لگائی تھی اور آج وہ عیسیٰ کو اس شکایت کا مزہ چکھا چکی تھی۔ وہ جان نہیں پایا تھا، اس کی ادھوری پینٹنگ کس نے مکمل کی تھی؟ وہ کبھی جان ہی نہیں سکتا تھا۔ مون جرم کرکے پھر اثرات بھی مٹا دیتی تھی اور یہ بھی تو ایک ننھا سا جرم تھا، گناہ چھوٹا ہو یا بڑا...... ہوتا تو گناہ ہے، اسی طرح جرم بھی چھوٹا ہو یا بڑا؟ ہوتا تو جرم ہے۔

غلطی یا جرم میں کامیابی حوصلہ بڑھاتی ہے۔ اور حوصلہ بڑھ جائے تو آگے کی طرف قدم خود بخود اٹھتے ہیں پھر روکے سے نہیں رکتے۔ مون کا حوصلہ ان ننھی، ننھی شرارتوں اور انتقام کے باعث بڑھتا جارہا تھا۔ مجال تھی جو کوئی اسے ڈانٹ پڑواتا۔ جب تک وہ بدلہ نہ لے لیتی اسے چین نہیں پڑتا تھا۔ وہ انتہائی ضدی، خاموش طبع اور منتقم مزاج بن چکی تھی۔ وہ کم بولتی اور کم ہنستی تھی۔ لوگوں کی طرف کم متوجہ ہوتی تھی۔ ہاں، لوگ ایسی عجیب سی بچی کو دیکھ کر خوب چونکتے تھے۔ وہ عام بچوں سے بہت مختلف تھی۔ کھیلتی نہ کودتی نہ کوئی ہنگامہ کرتی...... ٹھیک ہے، ایسے بے شمار بچے ہوتے ہیں، مریم کو اگر کوئی احساس دلاتا تب وہ بے نیازی سے کہہ دیتی تھی۔

"میری بھانجی سوزی بھی فطرتاً کم گو، خاموش طبع اور سنجیدہ بچی ہے۔" مریم کے لیے مون کی عادتیں حیران کن نہیں تھیں۔ وہ سوزی کو دیکھتی تو مون کی طرف سے مطمئن ہو جاتی۔ مریم کی بھانجی سوزی بھی بہت کم گو تھی۔ کھیلنے کودنے سے زیادہ دوسرے کاموں میں دلچسپی لیتی تھی۔ مذہب سے اسے لگاؤ تھا۔ نانی کے ساتھ چرچ جاتی، سروس میں حصہ لیتی اور مقدس انجیل پڑھتی تھی۔ خود مریم بھی بہت سنجیدہ مزاج رکھتی تھی اور بچپن کی عادتیں بدلتی نہیں۔ اس کے لیے مون کا رویہ اچنبھے کا باعث نہیں تھا۔ یہاں تک بات ٹھیک تھی، مریم کے گھر رہنے کے دوران وہ عموماً اپنے کمرے میں گھسی رہتی۔ اسٹوری بکس دیکھتی اور کبھی کوئی گیم کھیل لیتی۔ مسئلہ تو تب پیدا ہوتا جب مریم اور حبیب گھر سے چلے جاتے تھے۔ تب مون کو ان دیکھی آزادی مل جاتی تھی۔ اس کا دماغ ہر کام کرنے کے لیے تیار ہو جاتا تھا۔ وہ اپنا کوئی بھی پسندیدہ کام کرسکتی تھی۔ عیسیٰ کو زچ کرتی، اسے تنگ کرتی، ستاتی مگر بغیر اسے بتائے۔ جب وہ اپنا کوئی

الٹا ہوا کام دیکھتا پھر سخت جھنجلا تا۔ تب مون بہت حظ اٹھاتی تھی۔ اسے عیسٰی کو ستا کر لطف آتا تھا۔ وہ مون سے زیادہ پاپا کے قریب تھا۔ مون کو اس بات پر سخت قسم کی جیلسی ہوتی تھی مگر اس نے کبھی ظاہر ہونے نہیں دیا تھا۔

معاملات الجھتے تب ہیں جب ان پر توجہ نہیں دی جاتی۔ بچے بگڑتے تب ہیں جب ان پر نظر نہیں رکھی جاتی۔ اگر دیکھا جائے تو مریم اور حسیب کے بچے فرمانبردار تھے، سلجھے ہوئے سے، جھگڑالو نہیں تھے۔ پڑھائی میں بہترین تھے۔ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے تھے۔ مجموعی طور پر ان میں کوئی کجی نہیں تھی۔ سو مریم اور حسیب مطمئن تھے۔ ان کے فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا کہ مون کے ذہن میں کیسی، کیسی تحریک چلتی ہے۔ یا اس کا مینٹل لیول بہت آگے تک کسی غیر مادی قوت متحرکہ سے ملتا ہے۔ یا وہ انسانی سولہ حواس میں عام لوگوں سے زیادہ محسوس کرنے کی، کھوجنے کی، سراغ لگانے کی یا جانچنے کی قوت رکھتی ہے۔ ماہرین روحیت کے مطابق انسانی حواس سولہ شمار کیے جاتے ہیں۔ عام طور پر لوگ پانچ حواسوں کے بارے میں جانتے ہیں۔ باصرہ، سامعہ، لامسہ، ذائقہ، شامہ اس سے آگے کتنے جہان ہیں؟ ان پر توجہ کوئی نہیں دیتا حس حرارت پیا، حسِ توازن، حس قربت، حس اعضلاتی حس وزن اور سب سے اہم ترین چھٹی حس...... ان حواسوں کے ذریعے ادراک جو نتیجہ اخذ کرتا ہے اسے ”عقل“ کہتے ہیں۔

تو کیا مون حسیب عقل کے لحاظ سے بہت آگے تھی؟ اس میں کوئی شک بھی نہیں تھا وہ غیر معمولی ذہن کی مالک نہایت منفرد بچی تھی مگر اس کی اصل ذہانت کو کوئی کھوج نہیں پایا تھا۔ اسے کوئی رہنما نہ مل سکا تھا۔

دراصل مون حسیب کے ساتھ ہوا کیا تھا؟ اور وہ اپنے اندر کون سی اہم قوت عام انسانوں سے بڑھ کر پالی تھی؟ انسان کی زندگی میں روح کی حیثیت رکھنے والی چھٹی حس...... دیکھا جائے تو یہ حس انسانی زندگی کی محافظ ہوتی ہے۔ اس کا بروقت، مناسب اور درست استعمال بے شمار لوگوں کی زندگیوں کو خطرات سے بچا سکتا ہے۔ یہ حس انسان کو خطرے سے پیشگی خبردار کر دیتی ہے اور وہ مضر قوتیں جنہیں انسانی آنکھ دیکھ نہیں سکتی۔ ان سے محفوظ رکھتی ہے۔ جب کوئی حادثہ، سانحہ یا واقعہ اپنے وقوع پزیر ہونے سے پہلے انسانی دل میں، ذہن میں کوئی کھٹکا یا الارم بجا دے تو اس الارم کو چھٹی حس کا نام دیا جاتا ہے۔ اگر کوئی انسان اس خداداد صلاحیت سے آگہی پا جائے اور اس کے تمام ہنٹس (اشاروں) کو بروقت سمجھ جائے تو وہ اپنی زندگی میں بے شمار کامیابیاں پا سکتا ہے بلکہ اپنے عزیز و اقارب، بہن بھائیوں اور دوستوں کو بھی پیشگی اطلاع دے کر محو حیرت کر دیتا ہے۔

مون حسیب کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ اس اعلیٰ پائے کی قوت کو جان ہی نہیں پائی۔ وہ سمجھ ہی نہیں سکی۔ پھر ہوا کچھ یوں کہ جب ادراک کا وقت آیا تب تک اس کی طنابیں غلط ہاتھوں میں چلی گئی تھیں وہ غلط کو صحیح سمجھ کر اسی کی پیروی کرنے لگی تھی۔ وہ خود کو عقل کل کی مالک سمجھتی تھی مگر عمر بھر نادانیاں کرتی رہی۔

یہ بہت سال پہلے کی بات ہے، جب اس نے پہلی مرتبہ اپنے ماں، باپ کو اچانک چونکا ڈالا تھا۔ وہ دن اتوار کا تھا۔ اس روز ان کے گھر میں چھوٹی سی پارٹی تھی۔ پاپا کے چند دوست مدعو تھے۔ مما کی فیملی سے گروسی اور سوزن آئی تھیں۔ تانتے ان دنوں اپنے شوہر کے ساتھ جھگڑوں میں مصروف تھی، ان کی طلاق کا کوئی چکر چل رہا تھا۔ گروسی کے ساتھ سوزن آئی تھی اور سوزن اس کی دیوانی تھی، مون بھی اپنا فطری نخرہ اور غرور بھلا کر سوزن کو بہت کمپنی دیتی تھی۔ حقیقی

معنوں میں اسے سوزن سے بہت پیار تھا۔

اس پارٹی میں پاپا کے دوستوں نے مون کو جانِ محفل کہا تھا۔ وہ اتنی حسین خوب صورت اور مغرور لگ رہی تھی جیسے کسی ریاست کی شہزادی ہو۔ سلک کا پیروں تک آتا میکسی نما ستاروں سے سجا فراک پہنے...... لمبے حسین سیدھے بلونٹی بالوں کی اونچی سی پونی بنائے سر پر ہیروں اور یاقوت کا کراؤن رکھے وہ کسی اسٹیٹ کی وکٹوریہ یا کسی جاگیر کی مہارانی لگ رہی تھی۔

پارٹی جب تک چلتی رہی مون اور سوزن باتوں میں گم رہیں...... پھر مون اسے راج ہنسوں کی جوڑی دکھانے لگی۔ وہ تالاب کے کنارے آ رُکی تھیں۔ برقی قمقموں سے سجا گارڈن جگمگ جگمگ کر رہا تھا اور وہ دونوں لوگوں کے جھرمٹ سے الگ تھلگ بیٹھی تھیں۔ تب پانی پہ تیرتے سفید راج ہنس کو دیکھ کر مون نے سوزی کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

”عیسٰی کو دیکھو، کتنا برا لگ رہا ہے، منہ ایسے پھولا ہے جیسے غبارہ ہو۔“ مون نے نخوت سے سر جھٹک کر عیسٰی کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی عیسٰی اس کی اہمیت سے بہت جیلس ہو رہا ہے۔ تب سوزن نے گردن موڑ کر عیسٰی کی طرف دیکھا تھا۔ وہ کچھ کچھ بیزار نظر آ رہا تھا۔ سوزی حیران رہ گئی تھی۔

”تمہیں کیسے پتا چلا؟“ اب وہ اسی حیران چہرے کے ساتھ مون کی طرف رخ کیے بیٹھی تھی جس کی تمام تر توجہ پانی پر تیرتے راج ہنس کی تیراکی پہ تھی۔ اس نے سوزی کی طرف دیکھے بنا جھکی آنکھوں کے ساتھ جواب دیا تھا۔

”وہ بیزار ہے...... کیونکہ پاپا نے اس کے وائلن بجانے کا ذکر نہیں کیا۔ اس کی خواہش تھی وہ وائلن بجائے مگر پاپا نے اس کی بات پر دھیان نہیں دیا۔ وہ بس میری تعریف کرتے اور سنتے رہے اور مجھے اپنی تعریف اچھی لگتی ہے۔“ مون نے سابقہ

نخوت سے ناک چڑھا کر جیسے وضاحت کی تھی۔ تب سوزن کا منہ اتر گیا تھا۔

”تو کیا عیسٰی وائلن نہیں بجائے گا؟“ اس کی آنکھوں میں بھی مایوسی تیرنے لگی تھی۔ جیسے وہ خاص طور پر علی عیسٰی کے وائلن کی مٹھاس بھری دھنیں سننے آئی تھی۔ اہلِ یواریا موسیقی کے دیوانے تھے۔ مون کی مما بھی اچھا وائلن بجالیتی تھیں مگر عیسٰی کو بہت اعلیٰ قسم کا وائلن بجانا آتا تھا۔ پینٹنگ، فیدر بال، سائیکلنگ کے علاوہ اسے وائلن بجانے کا بہت شوق تھا۔ یقیناً وہ وائلن بجانے کی خواہش رکھتا تھا مگر پاپا نے اس لیے منع کر دیا کہ ایک مرتبہ موسیقی کی طرف سب متوجہ ہوگئے تو پھر تین، چار گھنٹے تک اٹھیں گے نہیں جبکہ حسیب احمد کو اگلی صبح ڈورٹ منڈ جانا تھا۔ کاروبار کے لیے دوسرے شہروں میں ان کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اب تو وہ فن لینڈ، ڈنمارک، آسٹریا اور ہالینڈ تک بھی جاسکتے تھے۔ سو طعام کی دعوت کا جلد ہی اختتام کر دیا تھا مگر پھر ہوا کیا؟

محفل میں موجود کوئی بھی شخص جان نہیں سکا تھا، تالاب کے کنگرے سے اٹھ کر وہ مغرور لڑکی بلی کی چال چلتی ہوئی گھر کے اندرونی حصے کی طرف چلی گئی تھی۔ پھر اس نے بڑے احتیاط بھرے انداز میں عیسٰی کا ریکارڈ پلیئر اٹھا کر ویوالدی اور بوڑھے باخ کی دھنیں سنی تھیں۔ تین یا چار منٹ کی یہ کوشش مون کے دماغ میں سُر کی لے کو جما گئی تھی۔ اب وہ پورے اعتماد کے ساتھ ویوالدی کی دھن وائلن پر چھیڑ سکتی تھی۔ اس نے بلی کی چال چلتے ہوئے ہال کا رخ کیا تھا۔ ہال کی گلاس وال کے ایک طرف عیسٰی کا وائلن رکھا تھا۔ وہ بڑے پُرسکون انداز میں گلاس وال کی سلائنڈ ہٹائے اسٹول گھسیٹ کر بیٹھ گئی تھی۔ وال کی شفاف سطح پر سفید جالی دار نائیلون کا مہین سا پردہ پڑا تھا اور دوسری طرف سلک کا پھولدار...... سامنے کی طرف پھولوں کی ٹوکریاں ٹنگی تھیں۔ پھولوں سے بھری بہار دکھاتیں، فضا کو معطر کرتیں...... جن کی بھینی، بھینی مہک ماحول کو خوشبودار بنا رہی تھی۔

اس نے ویوالدی کا پہلا سُر بکھیرا تو لان میں موجود ہر نفس کی سانس تک رک گئی۔ یہاں کے لوگ موسیقی کے دیوانے تھے اور موسیقی ہو یا عبادت ہر کام میں دلچسپی اور ذوق دکھاتے تھے۔ اس نے اطالوی موسیقار ویوالدی کے سُر کی نقل بکھیری تھی۔ ویوالدی وہ موسیقار تھا جب وہ وینس کے سان مارکو گرجا گھر میں وائلن بجاتا تب لوگ اسے سرخ بالوں والا پادری کہتے تھے اور جہاں کھڑے ہوتے وہیں جم جاتے تھے۔ ویوالدی کے عشق میں تو جرمن موسیقار ویوہن سیبسٹین باخ بھی مبتلا تھا اور اس چھوٹی سی لڑکی نے ویوالدی کی دھن کو اتنے مکمل، بااعتماد اور بھرپور انداز میں چھیڑا تھا کہ گارڈن میں موجود ہر فرد گردن اچکا کر گلاس وال کی طرف دیکھنے لگا۔ شہر کی کریم اس وقت ان کے گارڈن میں موجود تھی۔ سب کی نگاہوں کا فوکس وہ ہی گلاس وال تھی جس کے سلائنڈ اس وقت ہٹے ہوئے تھے اور سفید جالی دار نائلون کے مہین پردے ہل رہے تھے۔ ہوا کے دوش پر لہرا رہے تھے اور اندر سے وہ روح میں اتر جانے والی دھن ماحول کو ساکت کر رہی تھی۔ جیسے عالم پہ لمحے بھر کے لیے سکتہ طاری ہوگیا تھا۔

گارڈن میں موجود ہر متنفس حیران تھا انہوں نے عمر بھر کے طویل سالوں میں ایسا نقال کوئی نہیں دیکھا تھا۔ جس نے ویوالدی کی دھنوں کو کمال طریقے سے چرالیا تھا۔

پھر...... ویوالدی کے بعد اس نے باخ موسیقاروں کے سُر فضا کے سپرد کیے تھے۔ ایک نفیس ردھم کے ساتھ ایک اعلیٰ ترین، کمال کی مہارت کے ساتھ وہ سروں، دھنوں اور کلاسیکی موسیقی کے ساتھ کھیلتی رہی تھی۔ یہ لوگ باتہذیب، منظم اور تعلیم یافتہ تھے۔ موسیقی کے آداب سے اعلیٰ پائے کی واقفیت رکھتے تھے اور موسیقی کے درمیان بات کرنے کو گناہ خیال کرتے۔ یہ طلسم بالآخر ٹوٹ گیا تھا جب باخ کے سُر اپنے اختتام کو پہنچے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ اپنا میکسی نما فراک لہراتی بڑے تفاخر سے لبوں پر مسکراہٹ لیے شانِ بے نیازی کے ساتھ سیڑھیاں اترتی نیچے آگئی تھی تب لان میں موجود ہر شخص گویا خواب کی کیفیت سے ہڑبڑا کر نکلا تھا پھر تالیوں کی گونج سنائی دی تھی۔ اور دیر تک لوگ تالیاں بجا، بجا کر اسے سراہتے رہے تھے۔ پھر کسی نے جھومتے ہوئے اسے چراغِ شب کا نام دیا تھا۔ وہ ایسے ہیرے کے مانند تھی جو رات بے چراغ کا کام دے سکتی تھی۔

مون نے بڑے غرور کے عالم میں مما اور پاپا کو دیکھا تھا، ان کے چہروں پر خوشی اور تمتماہٹ تھی پھر اس نے سوزن کو دیکھا تھا۔ وہ بے خودی کے عالم میں تالیاں پیٹ رہی تھی۔ مون کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ اب وہ عیسٰی کو دیکھنا چاہتی تھی مگر عیسٰی کہاں تھا؟ اس نے ایک طائرانہ نگاہ پورے لان پر ڈالی۔ عیسٰی اسے دکھائی دے گیا تھا مگر اس کے چہرے پر غصہ نہیں تھا، برہمی نہیں تھی، بس حیرت تھی، ایسی حیرت جس نے مون کو بھی ورطۂ حیرت میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ بے یقین نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جیسے کچھ دیر پہلے جو کچھ بھی ہوا تھا، وہ اس کی توقع کے خلاف تھا۔ مون اسے غصے میں دیکھنا چاہتی تھی، وہ اسے زچ کرنا چاہتی تھی، جلانا چاہتی تھی مگر وہ صرف حیران تھا...... مون جیسے بددل ہوگئی جیسے برہم ہوگئی۔ ساری محنت اکارت گئی تھی۔ اس کی توقع کے خلاف ہوا تھا۔ عیسٰی کو غصہ نہیں آیا تھا بلکہ اس کی حیرانی مون کو غصہ دلا رہی تھی۔

☆☆☆

وہ حیران نہیں شاکڈ تھا، مون نے ویوالدی کے سُروں کی نقل اتاری تھی مگر کیسے......؟ اس کی حیرانی بس انہی دو سوالیہ نشانوں کے گرد گھوم رہی تھی۔ ویوالدی کے سُروں کی نقل اتارنا کوئی معمولی معرکہ تھا؟ پھر اس صورت میں جب مون نے پہلے سے کبھی ویوالدی کو سنا ہی نہیں تھا...... تو پھر کس طرح......؟ وہ اتنی اچھی، عمدہ اور اعلیٰ ترین نقل کیسے اتار رہی تھی؟ اس کا ذہن جیسے اس حقیقت کو تسلیم نہیں کر پا رہا تھا۔

پارٹی ختم ہوگئی، لوگ مون کی شان میں قصیدے پڑھ کر اپنے، اپنے گھروں کو لوٹ گئے تھے، محفل برخاست ہوگئی تھی۔ گروسی واپس چلی گئیں اور سوزی یہیں رک گئی۔

ماما، پاپا انہیں روم تک چھوڑ کر ایک، ایک دودھ کا گلاس تھمانے کے بعد اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔ پاپا نے سفر پہ صبح نکلنا تھا سو وہ جلدی سونا چاہتے تھے۔ گھر پر کچھ ہی دیر میں ہُو کا عالم طاری ہوگیا تھا۔ مون اور سوزی کمرے میں چلی گئی تھیں جبکہ عیسٰی دبے قدموں چلتا ہوا پہلے اپنے اسٹوڈیو کی طرف آیا۔ لائٹس آن کر کے وہ اپنی پینٹنگ کو دیکھنے لگا تھا۔ ادھوری تصویر جو یک دو پہر کو نیند کے دوران مکمل ہوگئی تھی مگر کس طرح؟ وہ کئی دن تک اسی شاک میں رہا تھا پھر جیسے بھول بھال گیا تھا۔ اب اگر دوبارہ سوچتا تو جیسے کئی پرتیں کھلنے لگتیں۔

وہ پینٹنگ کو ہاتھ سے چھو رہا تھا۔ یہ ایک مشکل سا منظر تھا۔ آلپس کا کوہستانی سلسلہ، ڈوبتا ہوا سورج اور ساتھ گرتی ہوئی برف دکھانا بہت کٹھن کام تھا۔ ایک طرف کونجیں اڑ رہی تھیں۔ پہاڑوں کی نوکوں پر پھر اچانک ایک کونج ڈار سے بچھڑ گئی تھی اور اب اس کونج کو اداس، ویران حالت میں دکھاتا تھا۔ وہ بس آلپس کے پہاڑ بنا کر ہی تھک گیا تھا اور جانتا تھا کہ ایک ہی دن میں پینٹنگ مکمل کبھی نہیں ہوگی، اس کے لیے دو تین دن مخصوص کرنا ہوں گے۔ وہ یہی سوچ کر سوگیا تھا پھر جب اٹھا تو منظر جیسے مکمل تھا۔ یہ منظر مکمل کس نے کیا تھا؟ اب کوئی راز، راز نہیں رہا تھا۔ وہ جان گیا

تھا کہ یہ مون کی کارستانی تھی پروہ اتنی کم مدت اور کم وقت میں اتنا مشکل منظر کیسے پینٹ کرسکتی تھی؟ اصل حیرانی بس اسی بات پر تھی......اور اب یہ حیرانی دو چند ہوگئی تھی۔ اوپر ہال کی طرف جاتے ہوئے اس نے اپنا ریکارڈ پلیئر دیکھا تھا۔ تو گویا مون نے پہلے ریکارڈ پلیئر کو استعمال کیا تھا......یعنی ویوالدی کے سر سنے تھے پھران کی نقل اتاری؟ مگر اتنی کم مدت اور مختصر سے وقت میں اس نے اتنی اعلیٰ پائے کی نقل کیسے اتار لی تھی؟ وہ پندرہ سالہ لڑکا جیسے چکرا کر رہ گیا تھا۔ اسے خبر نہیں تھی، اس کی بہن غیر معمولی ذہن رکھتی ہے، وہ جس چیز کو ایک مرتبہ دیکھ لیتی یا سن لیتی، وہ چیز اس کے ذہن سے عمر بھر کے لیے نکل نہیں سکتی تھی۔

وہ جیسے شاکڈ سا الٹے قدموں نیچے کی طرف آگیا......اب وہ مون کے بیڈ روم کا دروازہ ناک کر رہا تھا۔ پھر وہ ہینڈل گھما کر اندر آگیا۔ کمرے میں نائٹ بلب آن تھا......سوزی سنگل بیڈ پر گہری نیند سو رہی تھی تاہم مون ابھی تک جاگ رہی تھی۔ وہ جاگ نہیں رہی تھی تب بھی عیسیٰ اسے اٹھانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس کے اندر اتنی بے چینی تھی کہ وہ صبح ہونے تک کا انتظار نہیں کرسکتا تھا۔

مون نے اپنے تیز اندازوں سے سمجھ لیا تھا کہ جب سب سو جائیں گے۔ مما، پاپا اپنے کمرے میں چلے جائیں گے تب ضرور عیسیٰ اس کے کمرے میں آئے گا، وہ اسی لیے جاگ رہی تھی۔ وہ فی الحال سونا نہیں چاہتی تھی۔ اسے بھی عیسیٰ کی بے چینی سے لطف اندوز ہونے کا موقع مل رہا تھا سو اس موقع کو کیسے گنوا دیتی پھر جیسے ہی اس کی چھٹی حس نے الارم بجایا، وہ ایک دم الرٹ ہوگئی تھی۔

عیسیٰ اپنے کمرے سے نکل رہا تھا۔ عیسیٰ اب اسٹوڈیو کی طرف جا رہا تھا، عیسیٰ اب سیڑھیاں چڑھے گا پھر وائلن کو دیکھے گا، ریکارڈ پلیئر چیک کرے گا اور پھر الٹے قدموں مون کے کمرے کی طرف آئے گا......سو وہ انتظار کرنے لگی تھی۔ عیسیٰ آچکا تھا، اب ناک کر رہا تھا پھر ہینڈل گھما کر اندر آگیا تھا۔ مون نے آنکھیں کھول لیں، وہ جیسے عیسیٰ کی منتظر تھی۔

"مون تم جاگ رہی ہو تو باہر آجاؤ، مجھے نیند نہیں آرہی۔ باتیں کرتے ہیں، یہاں سوزی ڈسٹرب ہوگی۔ سفر کر کے آئی ہے۔ یقیناً تھکی ہوگی۔" عیسیٰ نے ہمیشہ کی طرح بڑے مہذب انداز میں بات کی تھی۔ وہ اسی لیے مما، پاپا کی آنکھوں کا تارہ تھا۔ وہ بہت نرم اور شائستہ لہجے میں بات کرتا تھا اور عیسیٰ یہ جانتا نہیں تھا کہ مون بھی غیر محسوس انداز میں اس کی نقل کرنے لگی تھی۔ کم گوئی، سنجیدگی اور آنکھ جھکا کر بات کرنا کچھ تو فطرتاً یہ وصف اس میں بدرجہ اتم پائے جاتے تھے اور کچھ وہ عیسیٰ کی کاپی کرتی تھی......مگر یہ بات عیسیٰ نہیں جانتا تھا۔

مون نے کچھ دیر سوچا اور پھر آرام سے بستر کو چھوڑتی اٹھ گئی تھی۔ اس نے اپنے ڈریسنگ گاؤن کا ہم رنگ اسکارف سر پر لپیٹا اور باہر آگئی۔ وہ دونوں بہن، بھائی اب لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ عیسیٰ نے لیمپ جلا دیا تھا۔ لاؤنج میں زردی ہلکی روشنی پھیل گئی تھی۔ اب وہ اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہا تھا۔ مون جانتی تھی، وہ عنقریب موضوع کی طرف آجائے گا۔ سو وہ جلد ہی موضوع کی طرف آگیا تھا۔ مگر اس سے پہلے وہ فریج سے کوک اور چاکلیٹس لانا نہیں بھولا تھا۔

"مون! تم نے کیگیے (violin) بجانا کہاں سے سیکھا؟ اور کب سیکھا؟" اس نے کوک کا ٹن مون کو پکڑا کر حیرت سے پوچھا تھا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں حیرانی کوٹ، کوٹ کر بھری تھی۔ مون کے اندر بڑی مزیدار کھد بد ہونے لگی۔ وہ ایسی بے چینی تو عیسیٰ کی آنکھوں میں، اس کے اندر دیکھنا چاہتی تھی۔ کتنے انتظار کے بعد یہ خوب صورت وقت

آیا تھا۔ بالآخر وہ عیسیٰ کو چونکانے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ اب اسے دھیرے، دھیرے اپنے آس پاس موجود ہر ایک فرد کو چونکانا تھا جیسے اسے اچانک اپنی کچھ پوشیدہ خوبیوں کا ادراک ہوگیا تھا۔ دراصل آج کی محفل میں پاپا کے فرینڈز نے اس کی بے تحاشا تعریفیں کر کے اسے احساس دلا دیا تھا کہ اس میں کچھ خاص ضرور ہے۔

"کچھ دیر پہلے...... وائلن بجانے سے چار منٹ پہلے......" مون نے شانِ بے نیازی سے کہا تھا۔ عیسیٰ ہکا بکا رہ گیا۔

"تم نے ویوالدی کی دُھن کہاں سے سنی؟ اور کیسے نقل اتاری...... مجھے یقین نہیں آرہا تھا، میں ابھی بے یقین ہوں۔" عیسیٰ نے چاکلیٹ کا ریپر پھاڑے بغیر سینٹرل ٹیبل کی طرف اچھال دی تھی۔ اس کا دل اچاٹ ہوگیا تھا۔ وہ پچھلے دو سالوں سے ویوالدی کی دُھنوں کو سن رہا تھا مگر ایک مرتبہ بھی اس کی نقل نہیں اتار سکا تھا جبکہ مون اسے شاکڈ کرنے پر تلی تھی۔ صرف چار منٹ کے دوران وہ ویوالدی کی ہر دھن کو کیسے ذہن میں ترتیب دے چکی تھی! یہ مقام حیرت تھا، وہ کیسے نہ دم بخود ہوتا۔

"تمہیں یقین نہیں آئے گا، میں تمہیں موتسارت (جرمن موسیقار) کی کوئی بھی دُھن سنا سکتی ہوں۔" مون نے عیسیٰ کی آنکھوں میں دیکھے بغیر بڑے اعتماد سے کہا تھا۔ یہ اس کی سب سے بڑی انفرادیت تھی۔ وہ لوگوں کو دیکھے بنا بات کرتی تھی۔ اس کے سامنے کوئی بھی ہوتا، وہ کسی کی نگاہ میں نگاہ ڈال کر بات کرنے کی عادی نہیں تھی۔ وہ اپنے دور کی نہایت عجیب بچی تھی۔ حالانکہ وہ بچپن چھوڑ رہی تھی، لڑکپن کی حدود میں داخل ہو رہی تھی مگر اس کے چہرے کی سنجیدگی کسی بائیس سالہ دوشیزہ سے کم نہیں تھی۔ اس کی بات سن کر عیسیٰ جیسے ٹھٹک گیا تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا، مون نے موتسارت کا ہی نام لیا ہے؟ اسے جیسے سننے میں مغالطہ ہوا تھا۔ وہ پھر سے جیسے تصدیق کر رہا تھا اور مون اس کے حواس اڑا رہی تھی۔

"تم اپنا ریکارڈ پلیئر اٹھا لاؤ، موتسارت کی موسیقی سنو، مجھے چار منٹ کا وقت دینا...... میں پیانو بجا کر تمہیں موتسارت کی نقل اتار کر دکھاؤں گی......"

مون نے بڑے تفاخر کے ساتھ جیسے اس کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ وہ اتنی پُراعتماد تھی جیسے یہ کام اس کے لیے ذرا بھی مشکل نہیں تھا۔ عیسیٰ کو دھچکا لگا......پھر جیسے مون کو جھٹلانے کی خاطر وہ اپنا ریکارڈ پلیئر اٹھا لایا تھا۔ اس نے موتسارت کی دھن سیٹ کی۔ ریکارڈ پلیئر سے سُر بکھرنے لگے تھے۔ چار منٹ گزر گئے، اب وہ ریکارڈ پلیئر آف کر رہا تھا پھر جیسے اس نے چیلنج بھری نظروں سے مون کی طرف دیکھا تھا گویا کہہ رہا ہو...... "اب کر کے دکھاؤ۔"

مون کے ہونٹوں پر ایک پُراسرار مسکراہٹ بکھر گئی تھی پھر جیسے اس نے عیسیٰ کا دیا چیلنج قبول کرلیا تھا۔ اس نے پیانو بجایا اور موتسارت کی دُھن عیسیٰ کی سماعتوں میں اترنے لگی تھی۔ مون کی قوتِ سامعہ بہت شارپ اور حساس تھی۔ وہ جیسے دم بخود رہ گیا تھا پھر مون نے عیسیٰ سے بڑے غرور بھرے لہجے میں کہا۔

"اب تم بجا کر دکھاؤ۔" وہ چاکلیٹ کھاتی بڑی مسرور تھی۔ جیسے اسے یقین تھا کہ عیسیٰ کبھی اس کا دیا چیلنج پورا نہیں کرسکے گا اور وہ حقیقتاً ناکام ہوگیا تھا۔ کیونکہ مون اسے جتا، جتا کر شرمندہ کر رہی تھی کہ وائلن کا کون سا سُر فلاں نوٹ سُر سے ہٹا ہوا تھا۔ کہاں ردھم ٹوٹا، کہاں موسیقی کی لہریں بے ہنگم شور سنانے لگی تھیں۔

اگر موتسارت صرف تین برس کی عمر میں پیانو کے سُر سمجھنے لگا تھا، چار برس کی عمر میں وائلن کے بے ترتیب نوٹ سُر پر چونکنے لگا تھا پانچ برس کی عمر میں بڑے اعتماد کے ساتھ پیانو بجانے لگا تھا اور چھ برس کی عمر میں موسیقی کمپوز کرنے لگا تھا تو بلاشبہ وہ ایک

حیران کُن تخلیق کار تھا جبکہ اس کی بہن اگر ویوالدی اور موتسارت کی نقل اتار لیتی تھی اور بنا غلطی کیے ان کی دھن بجالیتی تو یہ بھی کم حیرانی والا مقام نہیں تھا۔ علی عیسیٰ جیسے ششدر رہ گیا تھا۔

''یہ حیران کن ہے۔'' بالآخر جیسے اس نے تسلیم کر ہی لیا تھا۔ تاہم آنکھوں میں حیرت اب بھی بھری تھی۔ معاً اسے خیال آیا تھا۔

''تم نے ہی میری گیملدے (پینٹنگ) کو مکمل کیا تھا؟'' اس کی آنکھوں میں پھر سے اُلجھن تیرنے لگی۔

''یقینی طور پر اسے میں نے ہی مکمل کیا تھا۔'' مون کا تفاخر بڑھ گیا تھا۔ وہ اپنے بھائی کو متاثر کرنے اور چونکانے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ عیسیٰ جیسے رک سا گیا۔

''اتنے کم وقت میں کیسے......؟ میں تو صرف ڈیڑھ گھنٹے تک سویا رہا تھا۔'' وہ کچھ سوچ، سوچ کر بول رہا تھا۔ تب مون نے فخریہ انداز میں اپنا کارنامہ بتایا تھا۔

''میں نے ایک گھنٹا اٹھائیس منٹ میں پینٹنگ مکمل کر دی تھی۔'' مون کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی جیسے علی عیسیٰ کی حیرت اسے محظوظ کر رہی تھی۔ یہ بہت انوکھا تجربہ تھا۔ لوگوں کو چونکا کر انہیں ورطۂ حیرت میں ڈالنا اور پھر ان کی حیرت سے لطف اندوز ہونے میں اپنا ہی مزہ ہوتا ہے۔ اور ایسے ہی شایان طریقے سے مما، پاپا کو بھی تحیر کر سکتی تھی اور اپنے کلاس فیلوز اور ٹیچرز کو بھی حیران کر سکتی تھی۔ تو کیا اسے اور لوگوں کو بھی چونکا کر حظ اٹھانا چاہیے؟ جیسے فیصلہ ہو چکا تھا۔ وہ اپنے اندر موجود حسِ لطیف کو تسکین پہنچانے کے لیے کچھ بھی کر سکتی تھی اور اس کچھ بھی میں بہت کچھ شامل تھا۔ مون کے لیے یہ ایک منفرد قسم کی ایکٹوٹی تھی، ایک انوکھی طرز کا کھیل تھا۔ جسے کھیلنے میں اسے خوب لطف آنے لگا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ، ساتھ اس کی دلچسپی بڑھ رہی تھی۔ وہ ہر نئے دن میں نئی طرز کی تازگی محسوس کرتی تھی۔ اس کے نزدیک یہ ایک شائستہ کھیل تھا۔ تہذیب، لیاقت، قابلیت، اخلاق انسانیت، خوش خلقی اور زیبائش سے آراستہ...... اس کھیل میں کسی کا کوئی نقصان نہیں تھا...... وہ محض اپنی ذات کی تسکین چاہتی تھی۔ اس کھیل میں وہ لوگوں کی نگاہوں میں انفرادیت پانے لگی تھی۔ لوگ اسے دیکھ کر چونک جاتے تھے، سرگوشیاں کرتے، اسے دیکھ کر اشارے کرتے اور اسے اپنی نگاہوں میں اعلیٰ مقام دیتے۔ وہ بہت جلد اپنے حلقۂ احباب میں مقبولیت پانے والی تھی۔ اس کی قسمت کا ستارہ بہت بلند تھا اور وہ بہت چھا جانے والا مقام حاصل کرنے والی تھی۔

پھر ہوا یوں کہ عیسیٰ حیران، حیران اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا اور مون بڑے تفاخر سے مسکراتی ہوئی اپنے بیڈروم کی طرف بڑھ گئی تھی۔

اگلی صبح ناشتے کی میز پر بھی موجود تھے۔ مون، عیسیٰ، سوزن اور پاپا...... مما ناشتا بنا رہی تھیں۔ آج نمی اپنی ماں کے ساتھ نہیں آئی تھی۔ اس کی ماں اکثر بیمار رہنے لگی تھی اور وہ ماں کی جگہ کام پر آتی تھی۔ مما نے اپنی سہولت کے لیے انہیں رکھا ہوا تھا۔ ویسے ان کے گھر میں اتنا پھیلاوا نہیں ہوتا تھا۔ مون اور عیسیٰ بڑے نفیس اور مہذب بچے تھے۔ گندگی سے دور رہتے اور عام بچوں کی طرح پھیلاوا نہیں ڈالتے تھے۔ گھر کا کام صفائی وغیرہ نمی کی ماں کے ذمے تھا اور اس کی بیماری کے باعث اب نمی کام پر آتی تھی۔ مما کھانا خود بناتی تھیں اور اس معاملے میں بہت کانشس بھی رہتی تھیں۔

ہاں، تو ذکر ہو رہا تھا ۔ اس انوکھی صبح کا جو اپنے اصل ڈھنگ سے ہی طلوع ہوئی تھی۔ اس صبح میں کوئی نیا پن نہیں تھا۔ عام دنوں کی طرح عام سی سویر تھی۔ مگر یہ سویر عام کہاں تھی؟ اس صبح پاپا نے ڈورٹ منڈ جانا تھا۔ وہ آفیشل کام کے لیے جا رہے

تھے۔ اور اکثر جاتے رہتے تھے۔ اس میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ پاپا کے آفیشل ٹورز کے دوران مما ان کے آفس کو دیکھتی تھیں۔ وہ پاپا کی بہت مدد کرتی تھیں۔ وہ ایک اچھی بیوی اور اچھی ماں تھیں اور بڑے منظم طریقے سے دفتر اور گھر کو دیکھتی تھیں۔

جب پاپا ''سی یو سون'' بول کر دونوں بچوں کو پیار کر کے جانے لگے تب اچانک مون نے انہیں روک لیا تھا۔

''آپ کہاں جا رہے ہیں پاپا؟'' وہ جوس پیتی اچانک بولی تھی۔ جیسے ان کی تیاری کو بڑی حیرانی سے دیکھ رہی تھی اور ان کے اٹھنے سے پہلے اس نے غور ہی نہیں کیا تھا کہ پاپا کہیں جانے کے لیے اتنا تیار بیٹھے ہیں اب جو اس نے دھیان دیا تو پاپا کے سفری بیگ پر بھی نظر پڑ گئی تھی جسے مریم آخری مرتبہ سرسری انداز میں چیک کر رہی تھی کہ آیا کوئی چیز رہ تو نہیں گئی تھی۔

''ڈورٹ منڈ...... تم لوگوں کے چاکلٹس آ جائیں گے۔'' انہوں نے باری، باری عیسیٰ اور مون سے کہا تھا۔ جیسے انہیں یقین تھا کہ وہ چاکلیٹس کی فرمائش ہی کرے گی۔ ان دنوں مون کو چاکلیٹس کھانے کا جنون تھا۔

''کیا جانا ضروری ہے؟'' اس نے ایک مختلف بات کی تھی۔ وہ کچھ حیران ہوئے پھر گھڑی پر نگاہ ڈالی، وقت آگے کھسک رہا تھا ان کی فلائٹ کا ٹائم قریب، قریب تھا۔

''بہت ضروری ہے۔'' انہوں نے مسکرا کر بیٹی کی پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے سرخ، سنہری بال منہ پر گر رہے تھے۔

''کتنا ضروری ہے؟'' مون نے ایک بھوں اچکا کر پوچھا تھا۔ اب کہ اس کے سوال نے انہیں چونکا دیا تھا۔

''اِٹس ویری امپورٹنٹ......'' وہ کچھ، کچھ الجھ گئے تھے پھر جیسے اپنی الجھن مٹانے کی غرض سے بولے۔ ''واٹ ہیپنڈ؟'' ان کے چہرے پر تفکر کے سائے پھیل گئے تھے۔ تب اس نے جوس کا گلاس واپس میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''آپ آج سفر نہ کریں۔'' اس کی آنکھوں میں ہلکی، ہلکی پریشانی تھی، جس نے مما، پاپا کے ساتھ عیسیٰ اور سوزن کو بھی ٹھٹکا دیا تھا۔ پاپا کے بجائے مما نے قدرے برہمی سے پوچھا۔

''کیوں...... کیا وجہ ہے؟'' وہ ناشتا کر رہی تھیں۔ ایک دم خفا ہو کر کہنے لگیں۔ گویا صبح، صبح بدشگونی کی بات انہیں پسند نہیں آئی تھی۔

''بس مجھے لگتا ہے، پاپا کا آج سفر کرنا مناسب نہیں۔'' مون نے دو ٹوک بات کر کے دوبارہ سے جوس پینا شروع کر دیا تھا۔ اب وہ اپنی E S P کی حامل قوت کا ذکر کیسے کرتی؟ کیا یہاں بیٹھے افراد اس کی بات پر یقین کرنے والے تھے؟ حالانکہ ابھی، ابھی پاپا کا سفری بیگ دیکھ کر اس کے اندر مخصوص الارم بجا تھا۔ پاپا کہاں جا رہے ہیں؟ پاپا کیوں جا رہے ہیں؟ پاپا کو ہرگز نہیں جانا چاہیے۔ کم از کم آج کے دن نہیں۔

''تمہیں کیوں لگتا ہے؟ کیا تمہیں الہام ہوا ہے؟ یا کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے؟'' اب کہ مریم کا لہجہ برہم نہیں تھا۔ وہ خاصی نرمی سے پوچھ رہی تھیں۔ تاہم ناشتے سے مریم نے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ وہ ایک دم وسوسے کا شکار ہوگئی تھیں۔ کیا خبر، مون نے کوئی سپنا دیکھا ہو؟ بھیانک سپنا......

''خواب نہیں دیکھا...... پر میرا دل کہہ رہا ہے جیسے آج کچھ ہو جائے گا۔ پاپا کو نہیں جانا چاہیے۔'' مون نے کچھ بے چینی سے اپنی بات مکمل کی تھی تب پاپا نے بڑے پیار سے ان دونوں ماں، بیٹی کو سمجھایا تھا۔

''وہم نہیں کرو، کچھ بھی نہیں ہونے والا۔'' وہ

مطمئن تھے اور اب اپنا کوٹ پہن رہے تھے۔ یعنی وہ رکنے والے نہیں تھے۔ موں مضطرب سی کھڑی ہوگئی تھی پھر اس نے ماں کو اشارہ کیا۔

''آپ پاپا کو روک لیں مما......'' موں التجا کر رہی تھی۔ مریم بے چین کھڑی تھی جبکہ عیسیٰ کسی بھی چیز کی طرف دھیان دیے بغیر صرف موں کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ یک ٹک، حیرانی کے عالم میں جیسے کچھ کھوجنا چاہ رہا تھا۔ مگر موں کے تاثرات ایک دم سپاٹ تھے۔ کچھ بھی اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا۔ وہ جیسے ناکام سا ہو گیا۔

''حسیب! آپ ڈورٹ مِنڈ نہ جائیں۔'' مریم نے موں کے دل کی بات چھین لی تھی۔ وہ موں کے وہم کا شکار ہو گئی تھیں اور مریم نے حسیب کو روکنے کی پہلی کوشش بالآخر کر ہی دی تھی۔

''مریم! تم بھی......'' وہ جیسے زچ ہو گئے تھے۔ ''موں تو بچی ہے، تم تو سمجھدار ہو، جانتی بھی ہو، میرا جانا کتنا اہم ہے۔'' وہ جھنجلا کر رہ گئے تھے۔ گویا ان ماں، بیٹی نے انہیں گہری کشمکش میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ آگے جانے اور رک جانے کے درمیان پھنس گئے تھے۔

''زندگی سے زیادہ ''اہم'' کچھ نہیں ہوتا پاپا!''

ان کی چھوٹی سی بیٹی نے جیسے ایک مرتبہ پھر انہیں ٹھٹکا دیا تھا۔ وہ لمحے بھر کے لیے تھم سے گئے تھے۔ موں نے کتنی گہری اور اہم بات کی تھی۔ اتنی سی عمر میں اتنی سنجیدہ بات...... جیسے وہ کسی تجربے کی روشنی میں کہہ رہی ہو۔

''میری زندگی کو بھلا کیا خطرہ ہے؟'' حسیب نے مذاقاً گفتگو کو ختم کرنے کے لیے کہا تھا۔ مگر موں مذاق کے موڈ میں کہاں تھی۔ وہ ان کی بات سن کر عجیب نظروں سے انہیں دیکھنے لگی تھی۔ انہیں کم از کم موں کی نظریں کچھ عجیب ہی لگی تھیں۔

''پاپا! حادثے بتا کر نہیں ہوتے...... پھر بھی احتیاط ضروری ہے، آپ نے کبھی نوٹ کیا؟ ہمارے اندر کسی انہونی کے وقت کچھ گونج جاتا ہے۔ جیسے دل بجھ سا جاتا ہے یا ہلکے ہلکے وسوسے چٹکیاں بھرتے ہیں۔ میرے ساتھ ایسا ضرور ہوتا ہے؟ جانے آپ کے ساتھ ہوتا ہے یا نہیں۔'' موں نے اتنی گہری بات بہت عام سے لہجے میں ان کے گوش گزار کر دی تھی۔ حسیب اور مریم کے ساتھ عیسیٰ بھی ٹھٹک کر موں کو دیکھنے لگا تھا جبکہ سوزن پہلے ہی ورطۂ حیرت میں مبتلا بیٹھی تھی۔ اس کی اکلوتی کزن ہمیشہ سے اسے چونکاتی آئی تھی۔ آج بھی اسے چونکا رہی تھی۔ وہ ہمیشہ کوئی انہونی بات ہی کرتی تھی جسے عقل تسلیم ہی نہیں کرتی...... مگر وہ ہو کر رہتی تھی۔

''میرے ساتھ بھی ایسا ضرور ہوتا ہے، میرا دل بھی کہہ رہا ہے آپ نہ جائیں۔'' مریم نے گویا فیصلہ سنا دیا تھا۔ وہ جیسے بے بس ہو گئے تھے۔ اگرچہ ان کا اپنا دل کچھ بوجھل سا تھا۔ طبیعت بیزار تھی مگر وہ اس بوجھل پن کو نیند کی کمی سے عبارت کر رہے تھے۔ رات کو دیر سے سونے کی وجہ سے شاید طبیعت مضمحل تھی۔ ان کے دل میں بھی کچھ عجیب سی بے چینی تھی جسے وہ کوئی نام نہیں دے پا رہے تھے۔ مگر مریم اور موں اس بے چینی کو خطرہ قرار دے رہی تھیں۔ تو کیا انہیں اپنی بیوی اور بیٹی کی بات مان لینی چاہیے؟ وہ تذبذب کا شکار کھڑے سوچتے رہ گئے تھے۔

''پاپا آپ نہ جائیں۔ مما اور موں منع کر رہی ہیں۔ نقصان ہوتا ہے تو ہوتا رہے، کیا خبر یہ سفر آپ کے لیے ٹھیک نہ ہو۔'' بہت دیر بعد عیسیٰ نے بھی لب کشائی کی تھی۔ جب موں اتنا اصرار کر رہی تھی تو پھر بحث بیکار تھی۔ کیا پتا، وہ ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اس نے کوئی خواب دیکھا ہو یا پھر اس کے دل کا وسوسہ بے بنیاد نہ ہو۔ کچھ بھی تو متوقع ہو سکتا تھا۔

''اُف...... تم بھی۔'' پاپا زچ ہو اٹھے تھے۔

''میں کون سا خود کار ڈرائیو کرنے والا ہوں جو ایکسیڈنٹ کا خدشہ ہوگا۔'' وہ ذرا چڑ گئے تھے۔ سب کی ایک ہی تکرار نے انہیں عاجز کر دیا تھا۔

''اللہ نہ کرے......'' مریم دہل گئی تھی۔

''بائی ائر جا رہا ہوں...... پھر کس لیے ٹینشن ہے؟ آرام دہ سفر ہوگا۔ زیادہ طویل بھی نہیں۔'' وہ فیصلہ کن لہجے میں بولے تھے۔ تو گویا وہ قطعاً رکنے والے نہیں تھے۔ موں سخت مضطرب ہو گئی تھی۔ وہ کیسے پاپا کو روکے؟

''پاپا! میرا دل کہہ رہا ہے، آج کچھ ہو کے رہے گا۔ آپ نہ جائیں پاپا پلیز......'' موں کچھ ملتجی ہو گئی تھی۔ پاپا ان کے وسوسوں اور وہموں کو بے بنیاد کہہ رہے تھے۔ شاید ان کے وہم بے بنیاد ہی تھے۔ پاپا نے ان سب کو الوداعی مسکراہٹ سے نوازا تھا پھر موں کو خصوصی پیار کر کے باہر نکل گئے تھے۔ مریم کچھ افسردہ ہو رہی تھی، جیسے اس کا دل بجھ رہا تھا۔ موں، پاپا کے چلے جانے کے بعد دوبارہ ناشتے میں مصروف ہو گئی تھی۔ گویا اس کا تفکر اب ختم ہو چکا تھا۔ وہ انہیں خبردار کر چکی تھی۔ اب پاپا کے عمل کی ذمے داری ان کے اپنے سر تھی۔ مریم کو اب موں کی بے نیازی پسند نہیں آ رہی تھی۔ برتن سمیٹتے ہوئے مریم کن انکھیوں سے موں کے ہمیشہ والے سپاٹ تاثرات کو دیکھ رہی تھی پھر عیسیٰ اور سوزن کے اٹھتے ہی وہ موں کے برابر آ بیٹھی۔ گویا مریم کے اندر بھی کھد بد ہو رہی تھی۔ دراصل وہ موں کے وسوسے اور وہم کی کھوج کرنا چاہتی تھی۔ آخر موں نے آج کیا محسوس کیا تھا؟

''موں بیٹا......! یہ جو تم نے پاپا کو روکا، تم نے آخر کیوں روکا؟ تم نے کیا دیکھا؟'' مریم کے لہجے میں دبا، دبا تجسس اور تفکر بھی تھا۔ وہ ذہنی طور پر بہت اپ سیٹ ہو چکی تھی۔ اسے موں کی بات بہت غیر معمولی لگی تھی۔ موں کے تاثرات بھی اس لمحے کچھ ایسے ہی تھے۔

''میں نے غلط کیا جو پاپا کو روکا، اب آپ سب

قومی زبان و تشخص کی اہمیت

کیا آپ کو معلوم ہے کہ 1945ء میں جب جاپان پر تاریخ کا بدترین وقت آیا اور اس کے شہنشاہ ہیرو ہیٹو کو امریکی جنرل میک آرتھر کے سامنے لاچار انداز میں بیٹھ کر آئندہ کے لیے امریکا، جاپان تعلقات کے معاملات طے کرنا پڑے تو ہیرو ہیٹو نے واحد شرط کیا رکھی تھی؟ جی ہاں ہزیمت خوردہ شہنشاہ ہیرو ہیٹو نے کہا تھا۔

''میرے نظامِ تعلیم اور جاپانی زبان کو نہ چھیڑنا۔'' یہ انتہائی دانشمندانہ اور دور رس نتائج کا حامل فیصلہ تھا اور اس فیصلے کے ثمرات دیکھیے کہ کتنی جلد جاپان دنیا کا مضبوط ترین معیشت کا حامل ملک بن گیا۔ دانشمند قوم کے دانشمند رہنما ایسے ہی فیصلے کرتے ہیں۔ قائد اعظم بھی ہمارے دانش مند رہنما تھے۔ تبھی انہوں نے دوٹوک انداز میں اردو کو پاکستان کی سرکاری زبان بنانے کا کھل کر اظہار کیا تھا۔

چین 1949ء میں آزاد ہوا تو وہاں بے شمار ایسے اسکول و کالج تھے جہاں انگریزی رائج تھی۔ ماؤزے تنگ نے آزادی کے ساتھ اعلان کر دیا کہ ذریعۂ تعلیم بھی صرف چینی زبان ہوگا۔ چین کی ترقی آج ہمارے سامنے ہے۔ فرانس میں لفظ برگر جیسے الفاظ تک ادا کرنے پر پابندی ہے اور جو بھی الفاظ فرانسیسی زبان میں دستیاب ہوں ان کی جگہ انگریزی کا لفظ منتخب کیا جائے تو ایسے شخص پر جرمانہ عائد کر دیا جاتا ہے۔ اسرائیل کے قیام کے فوراً بعد ہی عبرانی زبان کو رائج کر دیا گیا حالانکہ یہ قوم پوری دنیا میں تقریباً ڈھائی سو سال دربدر رہی۔

انتخاب از۔ کالم جواں فکر تحریر ڈاکٹر نوید اقبال

مرسلہ: نفیسہ آرا، یو اے ای۔

میرے پیچھے پڑ جائیں گے۔ ابھی تو عیسٰی اور سوزن کی بھی تفتیش بھگتوں گی۔'' مون نے بگڑ کر انتہائی بدتمیزی سے کہا تھا پھر اپنی اسکرٹ کو جھاڑتی نخوت سے بولتی ہوئی اٹھ گئی تھی جبکہ مریم کچھ ہکا بکا ہوگئی۔ یہ مون کو بھلا کیا ہوا تھا؟ وہ ایسی تو نہیں تھی؟ مریم دق سی بیٹھی اپنی لاڈلی کو جاتا دیکھتی رہ گئی تھیں۔

مون نے مریم سے جو کہا تھا وہ غلط نہیں تھا۔ اسے عیسٰی اور سوزن کی بھی تفتیش بھگتنا پڑی تھی۔ جب وہ تیار ہو کر اسکول جانے لگی جب عیسٰی نے مون سے پوچھا۔

''تم نے پاپا سے ایسی بات کیوں کہی؟'' وہ بھی حیران تھا مگر زیادہ الجھا ہوا لگ رہا تھا۔ جیسے مون کی بات کے پس پردہ کسی وجہ کو کھوجنا چاہتا تھا۔ پہلے سے چڑی مون کچھ اور چڑ گئی تھی۔

''ایک جرم سرزد ہو گیا تھا مجھ سے...... آئندہ ایسی غلطی نہیں کروں گی......'' مون بھنائی، بھنائی سی اپنا اسکول بیگ چیک کرنے لگی تھی۔ جب پاپا کی کار کا ہارن سنائی دیا تھا۔ مون کے بیگ میں کتابیں رکھتے ہاتھ رک سے گئے تھے۔ عیسٰی ٹائی کی ناٹ لگاتا تھم گیا تھا۔ سوزن اسکول شوز پہن رہی تھی۔ لیسز بند کرتی حیران رہ گئی تھی۔ مریم کچن سے متحیر سی باہر نکل آئی۔

''حسیب واپس آ گئے......'' مریم نے جیسے سکون سے بھری سانس خارج کی۔ دل کی ساری بے چینی سمٹ کر ایک نکتے میں ڈھل گئی تھی۔ مریم جیسے مطمئن ہوگئی۔

''پاپا آ گئے......؟'' عیسٰی کے تاثرات بھی کم و بیش مریم جیسے تھے۔ وہ ٹائی کو پکڑے، پکڑے انٹرنس ڈور تک گیا تھا۔

''تو کیا واقعی پاپا آ گئے......؟'' مون نے بیگ کو ایک طرف رکھ دیا تھا۔ وہ منتظر نظروں سے لاؤنج کے انٹرنس ڈور کو دیکھ رہی تھی۔ جہاں سے کچھ دیر بعد پاپا داخل ہونے والے تھے۔ سوزن کے تاثرات ان سب سے مختلف تھے۔ اس کے انتہائی سرخ پھولے اور چکنے گالوں پر مسکراہٹ کے ننھے گڑھے پڑ رہے تھے۔ کانوں میں پڑی بالیاں جھول رہی تھیں۔ جن کے نیچے موٹا سا سنہری موتی لٹک رہا تھا۔ وہ جیسے بے یقین نظروں سے مون کو دیکھ رہی تھی۔

''انکل نے تمہاری بات مان لی۔'' سوزن اب بھی حیران اور بے انتہا حیران تھی۔ تب مون نے چونک کر اپنی بے ضرر سی کزن کو دیکھا تھا پھر جیسے سر جھٹک کر بولی۔

''لگتا ہے پاپا کی فلائٹ مس ہوگئی۔'' مون کے تاثرات اب بھی سپاٹ تھے۔ وہ دوبارہ سے اپنا اسکول بیگ چیک کرنے لگی تھی۔ گویا اسے پاپا کے آنے یا نہ آنے سے فرق نہیں پڑا تھا۔ انہوں نے کون سا اس کی بات مانی تھی۔ اب اگر واپس آئے بھی تھے تو اپنی مرضی سے...... سو وہ کندھے اچکا کر سوزن کی طرف متوجہ ہونے کے بعد موضوع گفتگو بدل رہی تھی۔ آج سوزن کا ایڈمیشن مون کے اسکول میں ہونا تھا۔ گروی اسے یہاں اسی مقصد کے تحت چھوڑ گئی تھیں۔ بواریا میں گھر کے کاموں اور نانی کے باڑے میں الجھ کر وہ پڑھائی نہیں کر سکتی تھی اسی لیے نانی اسے یہاں چھوڑ گئی تھیں تاکہ وہ پوری یکسوئی کے ساتھ پڑھ سکے۔ مون نے سوزن سے پڑھائی کے متعلق بات کرنا شروع کر دی تھی۔ در پردہ پاپا پر جتانا بھی مقصود تھا کہ وہ اس کی بات نہ مان کر چلے گئے تھے اور اب واپس اپنے ہی کسی کام کی وجہ سے آئے تھے۔ مون کی بات کے احترام میں نہیں۔

''تمہارا پسندیدہ مضمون کون سا ہے؟'' وہ پاپا کو اندر آتا دیکھ کر سوزن سے مخاطب تھی۔ عموماً ان کے گھر میں اردو بولی جاتی تھی۔ سوزن بھی بہت اچھی اردو بول لیتی تھی پھر پاپا نے سختی سے منع کر رکھا تھا کہ

گھر میں ڈوئچ نہیں بولی جائے۔ اردو بولی جائے تاکہ ان کی اردو زیادہ امپرو ہو سکے۔ ورنہ اردو سکھانے کے لیے الگ سے ٹیوٹر رکھنا پڑتا مگر اب وہ محض پاپا کو چڑانے کے لیے اونچی آواز میں سوزن سے ڈوئچ میں مخاطب تھی۔

سوزن نے کچھ حیران ہو کر ڈوئچ میں ہی جواب دیا تھا۔ تب تک پاپا اندر آ چکے تھے اور مون کی بات بھی سن چکے تھے۔ تبھی ان کے چہرے پر خفگی نمایاں تھی۔ جیسے وہ سمجھ چکے تھے کہ مون انہیں غصہ دلانے کے لیے ایسا کر رہی ہے کیونکہ انہوں نے گھر میں ڈوئچ بولنے پر سخت پابندی لگا رکھی تھی۔

''مجھے افسوس ہے۔'' انہوں نے بہت برہم لہجے میں مون کو مخاطب کیا تھا۔ وہ جیسے ان کے کچھ بولنے کی ہی منتظر تھی۔

''واپس آنے پر یا ڈورٹ منڈ نہ جانے پر؟'' مون چمک کر بولی تھی۔ اس نے بیگ میں کتابیں رکھ لی تھیں۔ اب زپ بند کر رہی تھی۔

''ڈوئچ بولنے پر......'' تب سوزن زیر لب بڑبڑائی۔ اس کی آواز مدہم تھی۔ حسیب احمد اپنا بریف کیس صوفے پر رکھ کر مریم کی طرف متوجہ ہو گئے تھے جو ان سے واپسی کی وجہ پوچھ رہی تھی۔

''فلائٹ نکل گئی۔ تم لوگوں نے صبح ہی صبح بحث اتنی لگا رکھی تھی...... گھر سے ہی لیٹ نکلا تھا میں۔'' اب وہ فون اٹھا کر ٹرین کے ٹائم کا پوچھ رہے تھے۔ یقیناً ٹرین سے ڈورٹ منڈ جانے والے تھے۔

''ہر کام میں بہتری ہوتی ہے۔'' مریم نے نرمی سے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ عیسٰی اب ٹی وی لگا کر شوز پہن رہا تھا۔ جب اچانک بریکنگ نیوز نے ان سب کو چونکا دیا تھا۔ مریم کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ گیا تھا جبکہ سوزی ہکا بکا رہ گئی۔ عیسٰی اور حسیب احمد دم بخود تھے۔ البتہ مون کے تاثرات سب سے الگ تھے۔ اس کے لیے بریکنگ نیوز میں کوئی دلچسپی والی بات نہیں تھی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

''یہ کیا ہوا......؟'' سب سے پہلے مریم نے سنبھل کر چیخ کا گلا گھونٹتے ہوئے لب کشائی کی تھی۔

''ائر کریش......'' عیسٰی زیر لب بڑبڑایا تھا۔ ڈورٹ منڈ جانے والی ڈومیسٹک فلائٹ حادثے کا شکار ہوگئی تھی۔ یہ لوگ جیسے بے جان بت بن گئے تھے۔ پتھر میں ڈھلے اور حسیب احمد صوفے پر ڈھے گئے۔ ان کے اپنے الفاظ جیسے ان کا منہ چڑا رہے تھے۔

''میں بائی ائر جا رہا ہوں...... کون سا خود کار ڈرائیو کرنے والا ہوں جو ایکسیڈنٹ کا خدشہ ہو۔'' انہوں نے اپنا سر تھام لیا تھا۔ بڑے بول جو منہ پر آ پڑے تھے۔ دل کی حالت غیر تھی جو سنبھلنے میں نہیں آ رہی تھی۔ باقی لوگ الگ شاکڈ تھے۔ ٹی وی پر حادثے کی تفصیلات چل رہی تھیں اور ان کے کانوں میں مون کے وسوسے گونج رہے تھے۔

''میرا دل کہہ رہا ہے، آج آپ سفر نہ کریں۔'' انہوں نے گردن موڑ کر اپنی لاڈلی بیٹی کی طرف دیکھا تھا جس کی بحث نے انہیں بہت دیر کرا دی تھی ورنہ وہ ٹائم سے جہاز میں سوار ہو جاتے اور اب تک ان کی ہڈیاں بھی جل چکی ہوتیں۔ جانے کیوں ان کے اندر عجیب سی فخریہ لہر اٹھی تھی۔ ایک ٹھاٹھیں مارتا عجیب سا طوفان جوش کھانے لگا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر مون کی طرف آئے تھے پھر انہوں نے مون کو اپنے سینے میں بھینچ لیا تھا۔

''میری پیاری بیٹی......! تمہاری وجہ سے، صرف تمہاری وجہ سے میں لقمۂ اجل بننے سے رہ گیا۔''

وہ آنسو بھری آنکھوں سے مون کا سر چوم رہے تھے۔ ان کے لہجے میں واضح تشکر تھا۔ وہ اللہ کا شکر ادا کر رہے تھے جو وہ واپس صحیح سلامت اپنے بچوں میں پہنچ چکے تھے اور ادھر مون کے دل کی حالت عجیب تھی۔ اس کا وہم، وسوسہ یا ESP کی حامل قوت کا اشارہ ایک ٹھوس حقیقت بنا سامنے کھڑا تھا۔

وہ خود بھی متحیر رہ گئی تھی۔ اس نے صبح، صبح الارم کی گھنٹی اپنے اندر ٹن، ٹن بجتی محسوس کی تھی۔ اسے لگا، آج کا دن اس کی فیملی کے لیے اچھا نہ ہوگا...... یا اس کے پاپا کسی نقصان سے دوچار ہونے والے تھے۔ اگرچہ نقصان ان کا اب بھی ہوا تھا۔ ایک بڑا ٹینڈر ہاتھ سے نکل گیا تھا مگر جب اللہ نے جان بچادی تھی تو پھر جہان تو مل ہی سکتا تھا۔

ایک غرور بھری مسکراہٹ لیے موں نے حاضرین کے چہروں کو دیکھا تھا۔ وہ سب جیسے ستائشی نظروں سے اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ موں کی گردن لمحے بھر میں تن سی گئی تھی۔ جیسے کلف نے اسے اکڑا دیا تھا۔ غرور نے ان سب لوگوں میں موں کو ممتاز کردیا تھا۔ آخر جو الارم موں کے اندر بجا تھا، وہ عیسیٰ، سوزن یا مما کے اندر کیوں نہیں بجا؟ وہ لوگ تو زیادہ پڑھے لکھے تھے، خصوصاً مما، پاپا...... اور عیسیٰ بھی بہت ذہین تھا، پھر اس کی ذہانت نے اسے حادثے سے پہلے خبردار کیوں نہیں کیا۔ یہ الارم صرف موں کے اندر ہی کیوں بجا تھا، اس کا مطلب تھا، موں کے اندر کوئی خاص خوبی تھی اور اسی نادیدہ خوبی نے اسے اتراہٹ میں مبتلا کردیا تھا اور یہ اتراہٹ آگے جاکر اس کے لیے کتنی خطرناک ثابت ہوئی تھی یہ کوئی نہیں جانتا تھا پھر یوں ہوا کہ گھر والوں کے علاوہ موں کے آس پاس جتنے بھی قریبی لوگ تھے سب اس کے اندازوں اور سو فیصد درست تکوں پر ہی ٹھٹکنے لگے تھے۔

ایک دفعہ بواریا میں ان کے قیام کی مختصر مدت کے دوران مریم کو بھی کچھ دن ان کے ساتھ رہنا پڑا تھا۔ جس دن مریم واپس آرہی تھی، اس دن موں نے اسے روک لیا۔

''مما! نہ جائیں، آج رک جائیں، کل اکٹھے نکلیں گے۔'' وہ لوگ چھٹیاں گزارنے آئے تھے۔ مریم کو پہلے جانے کی جلدی تھی کیونکہ وہ حسیب کے لیے بہت متفکر تھی۔ انہیں کھانے پینے میں مسئلہ نہ ہو۔ نینی کی ماں بھی نہیں آرہی تھی۔ سو وہ آج من ہائیم جانے کا ارادہ رکھتی تھی مگر موں نے روکا تو جیسے کسی خدشے کے تحت رک سی گئیں کیونکہ موں جب بھی کسی بات سے منع کرتی تھی تب کچھ نہ کچھ ضرور ہوجاتا تھا۔ سوئے اتفاق عیسیٰ بھی اس وقت ان دونوں کے قریب بیٹھا تھا اور ماں، بیٹی کی باتیں سن چکا تھا۔ تبھی مریم کی طرف دیکھ کر نرمی سے بولا۔

''آپ چلی جائیں مما......! پاپا کو مسئلہ ہوگا۔ ہم کل شام تک آجائیں گے۔'' عیسیٰ ماں کے تذبذب کو جان گیا تھا۔ کیونکہ موں نے جو ایک دو مرتبہ درست تکے مار کر انہیں ہراساں کیا تھا سو وہ اب در پردہ موں کی باتوں کو بہت اہمیت دینے لگی تھیں جو عیسیٰ کو مناسب نہیں لگتا تھا۔ مریم کے ذہن میں موں کی باتوں کا اثر گہرا ہونے لگا تھا۔ اس کو لگتا، موں جو بھی کہتی ہے، وہ سو فیصد نہ سہی مگر کچھ تو درست ہوتا ہے۔ اب بھی موں کے روکنے پر وہ رک گئی تھیں جبکہ عیسیٰ چاہتا تھا، وہ چلی جائے۔ مریم چلی جائیں تو موں کے روکنے والا وہم بھی جاتا رہتا۔ مگر مریم جاتی تو تب ناں...... وہ تو موں کے وسوسوں کا شکار ہونے لگی تھیں مریم کو لگ رہا تھا موں کی چھٹی حس جو کہہ رہی ہے، وہ بالکل ٹھیک ہے۔ ان کا جانا مناسب نہیں...... کیا خبر، کچھ ہو نہ جائے۔

''نہیں جاتی، کچھ زیادہ ضروری بھی نہیں...... کیا پتا آج کے دن میں سفر مناسب نہ ہو۔'' مریم نے کچھ سوچ کر جواب دیا تھا۔ تب عیسیٰ چڑ کر رہ گیا۔

''یہ ماہرِ فلکیات نہیں، جو دنوں، ہفتوں اور ستاروں کا حساب لگا کر لوگوں کو بتاتی ہے آج کا دن کیسا ہوگا؟ نہ اسے الہام ہوتے ہیں...... آپ اس کی باتوں میں نہ آئیں مما! اگر ایسی بات ہے تو بھی تو میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔'' وہ شدید ناگواری کے عالم میں بولتا چلا گیا تھا۔ اسے لگتا جیسے روز بروز مما، سوزی، پاپا اور تانتے وغیرہ موں کے نادر مشوروں پر

عمل کرنے لگی ہیں۔ اور وہ ہر نیا کام کرنے سے پہلے موں کو بتانا ضروری سمجھتی تھیں، اگر موں اوکے کرتی تو وہ کام کیا جاتا۔ موں اس اہمیت پر بہت مسرور تھی۔ جیسے تمام کیمروں کا رخ اس کی طرف ہوگیا تھا اور وہ گھر کے ثانوی فرد سے مرکزی حیثیت اختیار کرگئی تھی۔ اس خوبی پر وہ اتراتی پھرتی تھی۔ پہلے پاپا، عیسیٰ کو اپنے زیادہ قریب رکھتے تھے اور وہ کم عمر ناتجربہ کار ہونے کے باوجود بزنس کی سوجھ بوجھ رکھتا تھا۔ پاپا کو کئی بہترین مشورے بھی دیتا مگر موں کی اس اضافی خوبی کے باعث اب اس سے بھی کچھ نہ کچھ مشورہ ضرور کرتے۔ عیسیٰ، موں کی اہمیت پر جیلس نہیں تھا مگر وہ موں کی چھٹی حس سے ضرور خار کھانے لگا تھا۔ شاید ان دونوں بہن، بھائیوں کے درمیان دراڑ بھی اسی ESP کی حامل قوت کی وجہ سے آئی تھی کیونکہ موں نے یہ وتیرہ بنالیا تھا، جب بھی کوئی ایونٹ ہوتا، کوئی ضروری کام ہوتا، کسی نے سفر پر جانا ہوتا وہ ضرور کوئی نہ کوئی شوشا چھوڑ دیتی جو ہر دفعہ نہ سہی مگر پھر بھی خوب نشانے پر درست لگتا تھا۔ اکثر تو موں، عیسیٰ کو بھی حیران کردیتی تھی۔ اور وہ اگرچہ موں کے متاثرین میں دھیرے، دھیرے شامل ہو رہا تھا مگر تسلیم کرنے سے کتراتا رہا تھا۔

''اوکے...... میں ماہرِ فلکیات نہیں، نہ مجھے الہام ہوتے ہیں مگر میرا دل پھر بھی کہہ رہا ہے کہ آج کچھ ہو کر رہے گا۔'' وہ اپنی بات پر ڈٹی ہوئی تھی اور بہت غصے میں کہہ رہی تھی۔ جیسے عیسیٰ کی بات اسے سخت بری لگی تھی۔

''کچھ بھی نہیں ہونے والا۔ تمہارا دل، تمہاری باتیں اور تمہاری اسٹوپڈ چھٹی حس ہم سب کو محض اپنا محتاج کرلینا چاہتی ہے...... ہم تمہارے اشاروں پر ناچیں، تم سے مشورہ لے لیں اور جو تم کہو، اسے درست مانیں۔'' عیسیٰ نے تحمل سے جیسے جتا، جتا کر اس کے غصے کا گراف بڑھا دیا تھا۔ موں کی رنگت پل بھر میں متغیر ہوگئی۔

''مجھے کسی کو اپنا محتاج بنانے کی ضرورت نہیں...... اور تم...... کیوں میری امپورٹنس سے جلتے ہو؟'' موں نے انتہائی تلخ لہجے میں بہت نیچ بات کی تھی، اب کہ عیسیٰ کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔

''میں کیوں جلوں گا؟ تمہاری حرکتیں خود تمہیں مشکوک بنا رہی ہیں...... مگر تم اپنے تکبر میں کچھ سمجھتی نہیں...... جو کچھ تم کر رہی ہو، غلط ہے، اپنی اس چھٹی حس کو سمجھاؤ...... تم ہر ایک کو وہم میں مبتلا کر رہی ہو...... جو کہ ٹھیک نہیں، ہر بندہ اپنا کام چھوڑ کر نہیں بیٹھ سکتا ...... مگر تمہارے چھوڑے ہوئے وسوسے نما شوشے ذہنوں کو الجھا دیتے ہیں۔ کام نہ بھی بگڑنا ہو تب بھی بگڑ جاتا ہے۔'' عیسیٰ نے کھردرے انداز میں اپنی بات مکمل کی تھی۔ مریم ان دونوں کو جھگڑتے دیکھ کر ہونق ہو رہی تھی۔ پھر ایک دم دونوں کو ڈپٹ کر بولی۔

''کیا فضول تکرار ہے...... بس کرو اب، خواہ مخواہ بات کو طول دیتے ہو۔'' مریم کو غصہ آگیا تھا۔ وہ دونوں کچھ پل کے لیے چپ کر گئے تھے۔ موں کی آنکھوں میں شدید غصہ تھا۔

''ایک تو میں تم سب کا بھلا کرتی ہوں، اوپر سے باتیں بھی مجھے سنائی جاتی ہیں۔'' موں نے زیرِ لب بڑبڑا کر کہا۔

''ہمیں ایسا بھلا نہیں چاہیے...... جو ہمیں ہمارے مقصد سے ہٹادے۔ جو ہونا ہوتا ہے، ہو کر رہتا ہے، تم کچھ کہو یا نہ کہو...... پاپا کی فلائٹ نے ہر صورت مس ہونا تھا تم کچھ کہتی یا نہ کہتیں...... ان کا سفر بائی ائر نہیں، بائی روڈ لکھا تھا اور دوسرے اوپر سب کچھ طے ہوچکا ہے۔ اول روز سے ہی، ہمارا ہر اچھا اور ہر برا۔'' عیسیٰ اب کے کچھ رسان سے بولا تھا۔ ماں کے چہرے پر لکھی ناگواری اسے نظر آرہی تھی۔ انہیں شاید ان دونوں کی تکرار پسند نہیں آرہی تھی۔

''اور پر سب کچھ لکھا جاچکا ہے...... اس سے کون انکاری ہے؟ لیکن تم میری چھٹی حس کو جھٹلا نہیں سکتے۔ عام لوگوں سے زیادہ میرے اندر یہ قوت پائی جاتی ہے۔ اور پاپا کی فلائٹ مس ہونا ہی تھی، اللہ نے انہیں حادثے سے بچانا تھا مگر وسیلہ تو میں بنی...... میں نے پاپا کو روکا تھا۔'' مون نے زہر خند انداز میں جیسے اسے جتلایا تھا۔

''ہونہہ...... تم نے روکا تھا۔ مجھے تو لگتا ہے آج تم گوئٹے کو چھوڑ کر علم نجوم اور اس کی فلاسفی، برج اور شخصیت، برجوں کا طلسم کدہ، پریکٹیکل پامسٹری اور خوابوں کی تعبیر وغیرہ جیسی چیزوں پر ریسرچ کر رہی ہو؟'' عیسٰی استہزائیہ بولا تھا۔ حقیقتاً اسے مون پر شک تھا کیا خبر وہ لائبریری سے لے کر اس قسم کی کتابیں پڑھتی ہو۔ ویسے تو اسے گوئٹے کو پڑھنے کا جنون تھا۔ اس نے گوئٹے کا رزمیہ ڈراما ''گوٹزوان بریشن جن'' اور اس کی خودنوشت پر مشتمل ناول ''دی ساروز آف ینگ...'' پڑھ رکھا تھا۔ گوئٹے چھ زبانیں جانتا تھا اور اس نے اسٹیج کرافٹ، طبیعات، فلکیات، فلاسفی اور سائنسز سے متعلق کئی کتابوں کا جرمن زبان میں ترجمہ بھی کیا تھا۔ کل تک مون گوئٹے، موتسارت، ویوالدی، ولیم ٹاسٹا ولاڈی اور رونالڈ کی طرح کوئی عظیم کارنامہ سرانجام دینا چاہتی تھی مگر اب نہ جانے فلکیات، علم نجوم اور علم الاعداد سیکھنے کے جنون میں مبتلا ہوگئی تھی۔ حالانکہ عیسٰی کے یہ اندازے بالکل غلط تھے۔ مون نے تو کبھی اس قسم کی کوئی کتاب دیکھی تک نہیں تھی۔ حقیقتاً اس کے اندر ایسی قوت ضرور تھی اور کچھ حساس الارم عام انسانوں سے بڑھ کے تھے۔ جو خطرے سے پہلے ٹن، ٹن گھنٹی بجادیتے تھے۔ یہ ایک خدا داد صلاحیت تھی۔ اس میں کسی کی ذاتی کوشش کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ بس عیسٰی کو اس کی اتراہٹوں اور نخوت پر غصہ آتا تھا۔ جب سے تانتے، پاپا، مما، گروی نے اسے الگ قسم کا پروٹوکول دینا شروع کیا تھا، اس کا مزاج ساتویں آسمان پر پہنچ گیا تھا۔ خود کو کوئی الگ قسم کی مخلوق سمجھنے لگی تھی اور مون کا خیال تھا کہ عیسٰی اس کی اہمیت سے جلتا ہے۔ حالانکہ ایسا کچھ نہیں تھا۔ عیسٰی تو اس کے غرور سے خوفزدہ رہتا تھا۔ اسے لگتا تھا، مستقبل قریب میں مون بہت خسارہ اٹھانے والی تھی۔ بس یہی چھوٹی، چھوٹی وجوہات تھیں جن کی بنا پر دونوں بہن بھائی ایک دوسرے سے دور ہوتے جارہے تھے۔ وہ جب بھی اسے سمجھانے کی کوشش کرتا، مون الٹا ضد میں آکر وہی کام کرتی۔ جھگڑا کرنے کی دونوں کو عادت نہیں تھی، نہ شور کرتے نہ ہنگامہ کرتے، بس وہ اسے سمجھاتا اور مون اسے تاؤ دلانے کے لیے بڑے سلیقے کے ساتھ وہی کام کرلیتی۔ اس نے اب بھی تکّے مارنے اور شوشے چھوڑنے ترک نہیں کیے تھے بلکہ اس دن مریم کو من ہائیم جانے سے روک کر وہ ایک مرتبہ پھر گھر والوں کی نگاہوں میں اونچا مقام پاگئی تھی۔ سوئے اتفاق نانی کو شام کے قریب انجائنا کا ہلکا سا اٹیک ہوگیا تھا۔ صورت حال ایسی تھی کہ ایمبولینس بروقت نہیں پہنچ سکتی تھی۔ مریم کی گاڑی موجود تھی۔ سو گروی کو اٹھا کر گاڑی میں ڈالا اور بروقت اسپتال پہنچ گئے۔ ڈاکٹر نے بھی یہی کہا وہ لوگ ذرا سی دیر کرتے تو نقصان کا خدشہ تھا۔ ادھر تو جیسے کمال ہی ہوگیا۔ تانتے اور مما نے مون کو سینے سے چمٹا کر بھرپور تشکر کا اظہار کیا۔ مون نہ روکتی یا اس کی چھٹی حس الارم نہ بجاتی تو مما یقیناً من ہائیم پہنچ چکی ہوتیں۔ نانی کا بچنا بھی محال تھا۔ ان کی تکلیف بڑھ جاتی۔ خیر، اس واقعے کے بعد عیسٰی نے مون سے بحث کرنا چھوڑ دی تھی۔ ان دنوں مون نے چونکہ سب کی نظروں میں الگ سا مقام پالیا تھا۔ سو سوزن بھی اسے بڑی قابل احترام ہستی سمجھتی تھی۔

پھر یوں ہوا کہ مون نے ایک دن سوزن کی ذاتی تجوری پر حملہ کردیا تھا۔ اس دن سوزن باڑے میں مصروف تھی اور جانوروں کی دیکھ بھال کررہی تھی۔ مون پہلے تو باڑے کی طرف آئی پھر مویشیوں کی گندگی کو دیکھتی واپس اندر چلی گئی تھی۔ اس کی نفاست پسند طبیعت پر گندگی سخت گراں گزرتی تھی۔

وہ میوزک سنتی سوزن کے کمرے میں ٹہل رہی تھی۔ جب اس کے منی باکس پر مون کی نگاہ پڑی تھی، کچھ متجسس ہوکر مون نے سوزی کا منی باکس کھول لیا تھا۔ اسے اندر سے کچھ سکے ملے...... وہ حیران نہیں ہوئی تھی۔ اس نے منی باکس کو بند کردیا تھا پھر اسے اٹھا کر دراز میں رکھ آئی۔ جب اس نے دراز کھولی تب اس کی نگاہ ایک اور باکس پر پڑی۔ مون نے باکس اٹھا کر کھول لیا۔ ایک خوب صورت جگمگاتی رسٹ واچ نکل آئی تھی۔ مردانہ طرز کی یہ گھڑی مون کو حیران کرگئی۔ سوزن کے کمرے میں نئی نکور چمکتی مردانہ گھڑی کیوں رکھی تھی۔ فطری تجسس جیسے عود آیا تھا۔

''یہ کس کے لیے ہے؟'' اس نے گھڑی کو اٹھا کر ہاتھ میں لیا تھا۔ ''بھلا یہ کس کے لیے ہوسکتی ہے؟'' مون کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ جیسے کلک کے ساتھ کچھ روشن ہوگیا تھا۔ سوزن اور عیسٰی تو کیا سوزی نے یہ گھڑی عیسٰی کے لیے لے رکھی ہے؟ اسے معاملے کی تہ میں جانے کے لیے پندرہ سال کی عمر میں بھی بہت سوچ بچار اور گہرائی میں اترنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ وہ گویا لمحوں میں معاملہ سمجھ گئی تھی۔ پھر سوزی جب کمرے میں آئی تو مون نے بغیر جھجکے دوٹوک لہجے میں سوزن سے سوال کیا تھا۔

''یہ تم نے عیسٰی کے لیے خریدی ہے؟'' اس کا حملہ اتنا اچانک تھا کہ سوزی ہکا بکا رہ گئی تھی۔ اس سے کچھ بات ہی نہیں بن پائی تھی۔ وہ شاید کوئی جھوٹ بول لیتی یا بات کو گھما ڈالتی مگر مون نے اسے موقع ہی نہیں دیا تھا۔ اسے لگا، وہ سچ نہیں بولے گی تو

ہار اور جیت

کسی کی سب سے بڑی ہار......
کسی کی آنکھوں میں آنسو آپ کی وجہ سے

اور

زندگی کی سب سے بڑی جیت
کسی کی آنکھوں میں آنسو آپ کے لیے

مرسلہ: نفیسہ نہال، لاہور

اچھی بات

کسی کو کچھ دینا ہے تو اسے اچھا وقت اور دعا دو کیونکہ تم ہر چیز واپس لے سکتے ہو مگر کسی کو دیا ہوا اچھا وقت اور دعا نہیں لے سکتے۔

مرسلہ: اریبہ حسین، لاہور

مشکل میں پھنس جائے گی۔ یہ حسین آنکھوں اور خطرناک ذہن والی اس کی کزن اندر گھس کے دل کی تہوں میں چھپے اس راز کو بھی نکال لے گی جسے سوزن نے خود سے بھی چھپا رکھا تھا۔ وہ جیسے مون کے ذہن اور اندر تک کھوجتی آنکھوں سے خوفزدہ ہوگئی تھی۔ اور اسی خوف نے سوزن کو سچ بولنے پر اکسایا تھا۔

''ہاں، میں نے عیسٰی کی برتھ ڈے کا گفٹ لیا ہے۔ اپنی پاکٹ منی جمع کر کے۔'' سوزن کی آواز کپکپا گئی تھی۔ اس کا سر جھک گیا تھا۔ مون کی کھوجتی نظریں اس کے آر پار اتر رہی تھیں۔

''صرف عیسٰی کے لیے۔ میرے لیے تو آج تک کچھ نہیں لیا۔ عیسٰی کے لیے اتنا تردد......؟ پاکٹ منی جمع کی پھر گفٹ خریدا، کوئی خاص بات ہے کیا......؟'' مون نے معنی خیزی کی انتہا کردی تھی۔ وہ جیسے پھنس کر رہ گئی۔ اب بھلا کیا جواب دیتی۔ جو دل کی دھڑکنیں شور کررہی تھیں، وہ شور مون کو سنائی نہیں دے سکتا تھا پھر بھی مون نے اس کے پیروں تلے سے زمین کھسکا دی تھی۔

''عیسٰی کے لیے ہی کیوں......؟ میرے لیے

کیوں نہیں۔" وہ تن فن کررہی تھی۔ نخوت سے بول رہی تھی۔ سوزن کا سراور بھی جھک گیا تھا اور موُن اسے بھگو بھگو کر ماررہی تھی۔ بالآخر وہ نم آواز میں بول ہی پڑی۔

"عیسیٰ مجھے اچھا لگتا ہے...... بہت اچھا لگتا ہے۔" سوزن نے گویا اعترافِ جرم کرلیا تھا۔ "وہ میرے دل کو بہت اچھا لگتا ہے...... اتنا کہ حد نہیں...... میں چاہتی ہوں، وہ میری آنکھوں کے سامنے رہے۔" وہ ہونٹ کچل رہی تھی جیسے بہت غمگین تھی۔ بہت اداس تھی اور اپنے دل کی...... اختیاری پر خود سے بھی نالاں تھی۔ پندرہ سال کی عمر میں محبت کرنا اور پھر اس محبت کا اظہار کردینا، اس ملک میں کچھ انوکھا یا عجیب نہیں تھا۔ سوزن کی ہم عمر لڑکیوں کے بے شمار بوائے فرینڈ تھے۔ ان میں سے ایک آدھ تو شادی بھی کرچکی تھیں۔ اب اگر سوزی کو محبت ہوئی تو یہ کون سا انوکھا معاملہ ہوا تھا۔ مسئلہ تو یہ تھا جو اسے عیسیٰ سے محبت ہوئی تھی۔ سوزن کے اعترافِ محبت نے خلافِ توقع موُن کو غصہ نہیں دلایا تھا بلکہ وہ بہت خوش ہورہی تھی۔ سوزی جیسی دبو، مسکین اور اس کی شخصیت کے سامنے ماند پڑتی بھابی تو اسے کہیں مل ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ شادی کے بعد بھی موُن کے کنٹرول میں رہتی۔ اس کے حصار میں، اس کی خوبیوں کو سراہتی ہوئی۔ موُن کے سامنے جھکی ہوئی۔ وہ کبھی موُن کا اور اپنا موازنہ یا مقابلہ نہ کرتی۔ موُن کو ایسی ہی بھابی کی تو ضرورت تھی۔ اس پہلو پر غور کیا تھا اس نے، کچھ دن پہلے بھی...... اور اب جیسے اس کی سوچوں کو کنارہ مل گیا تھا۔

عیسیٰ کی شخصیت کے سامنے ماند پڑتی سوزن ان دونوں بہن، بھائی کے سامنے عمر بھر سر اٹھا نہیں پائے گی۔ تو پھر یہ سودا کوئی خسارے کا نہیں تھا۔ ویسے بھی سوزن اپنے ماں، باپ کے جھگڑوں، طلاق اور غربت کے باعث بہت سنجیدہ، افسردہ اور چپ چپ رہنے لگی تھی۔ وہ اندر سے ٹوٹتی جارہی تھی۔ وہ ایسی لڑکی تھی جسے ایک گھر کی خواہش تھی۔ اسے محبت بھرا پرسکون ماحول چاہیے تھا۔ اور موُن کا گھرانا اس لحاظ سے بہت آئیڈیل تھا۔ ان کے ماں، باپ کی محبت، سکون، ایک دوسرے کا احترام، اس کے علاوہ بچوں سے خصوصی لگاؤ قابلِ ستائش تھا۔ وہ موُن کے گھر کا ہمیشہ کے لیے حصہ بن جانا چاہتی تھی اور موُن نے اس کی خواہش کو اور بھڑکایا تھا۔ وہ اس کا ساتھ دینے پر جیسے تیار ہوگئی تھی۔ مگر اس دوران ایک اور عجیب واقعہ رونما ہوا تھا۔ اتنا حیران کُن، عجیب اور انوکھا کہ موُن کی پوری ہستی ہل کررہ گئی تھی۔ جیسے وہ تھرا اٹھی تھی۔ سوزن کو محبت کی راہوں پر اندھا دھند بھاگنے کا مشورہ اور ساتھ دینے کا وعدہ کرکے وہ محبت جیسی پُرتپش آنچ سے خود بھی محفوظ نہیں رہ سکی تھی۔

محبت جو دیکھنے میں پُرکشش تھی
جس کی لذت میں مٹھاس تھی
جو شبنم، صندل، اور چاندنی میں گوندھ کر سامنے آتی
سنہری پتوں میں لپٹ کر بجتی
مندروں کی گھنٹیاں بجاتی اور مسجدوں میں گھنٹے ٹیکتی
غنچوں میں کھلتی پھر صحراؤں میں بھٹکتی
بن سنور کے آتی اور ویران اجاڑ کردیتی

محبت جو ہر روپ میں موُن حسیب پر اچانک جھپٹی تھی یوں کہ وہ حواس باختہ رہ گئی۔ بھلا یہ محبت اسے ہوئی کب تھی؟ اور کس سے؟

من ہائیم پر یہ صبح اپنے معمول سے وارد ہوئی۔ بڑا مصروف سا دن تھا اور بڑی مصروف سی شام گزری تھی۔ کھانے سے کچھ دیر پہلے پاپا کے ساتھ کوئی نوجوان آیا تھا۔ خوش شکل، سنجیدہ اور بڑا ہی پُراسرار...... یہ پروفیسر بشر تھا۔ غیر قانونی طریقے سے جرمنی آنے والا۔ خیر، اب تک تو سیٹلڈ ہوچکا تھا۔ یہ انہیں بعد میں پتا چلا۔ پاپا نے پروفیسر بشر کی بہت مدد

کی تھی۔ اسے ڈیڑھ سال تک چھپائے رکھا۔ پھر اس کے پیپرز بنوائے اور اب وہ کھل کر جرمنی میں گھوم پھر سکتا تھا۔ چاہتا تو کاروبار کرلیتا یا پھر جاب وغیرہ کرلیتا۔ پاپا اس کی ہر ممکن مدد کرنے کا وعدہ کرچکے تھے۔ وہ ہر پاکستانی کی یوں ہی مدد کیا کرتے تھے۔ اس میں کوئی انوکھا پن نہیں تھا۔

کھانے کی میز پر پاپا نے پروفیسر بشر سے ان سب کا تعارف کروایا تھا۔

"یہ میری جند جان، میرا بیٹا...... میرا عشق، میری جان، میرا علی عیسیٰ...... اور یہ میری انتہائی خطرناک بیٹی...... اس سے ذرا بچ کر رہنا...... بہت خوفناک انکشاف کرتی ہے اور یہ میری بیوی کی بھانجی سوزن......" پاپا نے مسکراتے ہوئے تعارف کی رسم نبھائی تھی۔ بڑا مختصر مگر بڑا ہی جامع تعارف تھا۔ پروفیسر ایک، ایک چہرے کو غور سے تکتا لمحے بھر کے لیے منجمد رہ گیا تھا۔ حسیب احمد کیا کہہ رہے تھے؟ اس نے دوبارہ غور کیا۔

"اور یہ میری انتہائی خطرناک بیٹی، اس سے ذرا بچ کر رہنا...... بہت خوف ناک انکشاف کرتی ہے۔" پروفیسر بشر بڑے غور اور گہرائی میں جاکر اس کم عمر، خطرناک دوشیزہ کا چہرہ دیکھنے لگا تھا۔ پھر جیسے وہ ٹھٹک گیا۔ اگرچہ حسیب احمد نے مذاقاً بات کی تھی مگر پروفیسر بشر جیسے ٹھٹک کر منجمد ہوگیا تھا۔ وہ خطرناک چہرے والی خطرناک لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے ٹھٹکنے کی وجہ موُن کا نوخیز حسن ہرگز نہیں تھا۔ حسن کی پروفیسر بشر کے نزدیک کوئی اوقات تھی اور نہ کوئی اہمیت تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں بے شمار حسین چہرے دیکھے تھے۔ اسے حسن کبھی متاثر نہیں کرتا تھا۔ اور جو چیز اسے متاثر کرتی تھی وہ پروفیسر بشر کو اس لڑکی کی آنکھوں میں بخوبی نظر آرہی تھی۔ مقابل کو تسخیر کرلینے والی چمک، انوکھا سا...... پُرمغرور چہرہ...... ذہانت چھلکاتی عجیب تر آنکھیں...... مقناطیسی طاقت رکھنے والی عجیب گہری آنکھیں پروفیسر بشر کو جیسے اپنا گوہرِ مقصود اچانک مل گیا تھا۔ ذہن کی پراسرار قوتوں کو کھوج نکالنے والے ایک ماہر کے سامنے اس کا گوہرِ مقصود بیٹھا تھا۔

اس نے جیسے بیٹھے بٹھائے سامنے بیٹھی لڑکی کے ذہن کی اعلیٰ اور ادنیٰ سطح کو جانچنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اس نے اپنے دماغ سے ہر سوچ کو جھٹک کر موُن کو ذہنی پیغام دے کر اسے پرکھنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اس دوران پروفیسر بشر نے اس بات میں احتیاط کی کہ عیسیٰ اور حسیب احمد میز سے اٹھ جائیں۔ اس کی توقع کے عین مطابق حسیب احمد کی کال آگئی اور علی عیسیٰ کو اپنے ٹیسٹ کی تیاری کرنا تھی۔ وہ دونوں اٹھ کر چلے گئے تھے۔ اب ڈائننگ ہال میں تین نفوس بیٹھے تھے اور تینوں ہی ایک دوسرے سے بے نیاز تھے۔ سوزن، موُن اور پروفیسر...... تینوں سر جھکائے کھانا کھارہے تھے۔

پروفیسر کے لیے یہ موقع بڑا اہمیت کا حامل تھا۔ اس نے سنہری مواقع کبھی گنوائے نہیں تھے سو، اب بھی اپنی نگاہوں کو موُن کے کراؤن پر جما کر وہ یکسوئی کو کھینچ رہا تھا۔ ذہن کی یکسوئی اس کے عمل کی کامیابی کا اہم مہرہ تھی۔ ادراک ماورائے حواس کی تمام تر بنیاد یکسوئی اور توجہ پر قائم تھی کیونکہ ہر وہ کام جن کا تعلق ذہن سے ہوتا ہے اور ذہن کے تخلیقی حصوں سے جڑا ہوتا ہے اس وقت تک انجام نہیں پاسکتے جب تک پوری طرح ان کے مقاصد کے لیے ذہنی یکسوئی اور توجہ پیدا نہ کرلی جائے۔ محویت، استغراق اور ذہنی یکسوئی کے بعد شعور کی باقی سرگرمیوں کو بلاک کرنا ہوتا ہے۔ وہ ماہر انتقالِ افکار تھا۔ اور یہ کام اس کے لیے اتنا معمولی تھا جیسے کون آئس کریم کھاتے ہوئے اس کا کچھ حصہ پگھل جانا یا چاکلیٹ کا ریپر اتارنا...... محض لمحے بھر کی دیر میں۔

انسانی ذہن جو ایک اخباری دفتر کی طرح ہوتا

ہے جس کے ٹیلی پرنٹر پر ہر وقت طرح، طرح کی خبریں آتی رہتی ہیں۔ جسم کا ہر عصب دماغ سے ہمہ وقت کانٹیکٹ میں رہتا ہے۔ آنکھیں، کان، ناک ہر عضو اپنا، اپنا تاثر دماغ تک پہنچاتے ہیں پھر شعور تمام پیغامات وصول کرنے کے بعد اپنے طور پر ان کا تجزیہ کرتا ہے اور تراش خراش کرنے کے بعد اہم فیصلے کرواتا ہے۔

پروفیسر جانتا تھا...... انسانی شعور کی سرگرمیاں بے حد وسیع اور متنوع ہیں۔ جیسے کسی بڑے کمیشن ایجنٹ یا اسٹاک بیورو کا صدر دفتر ہو۔ اس میں دنیا جہان سے منڈی کے اتار چڑھاؤ کی رپورٹیں وقتاً فوقتاً آئے جاتی ہیں۔ ٹیلی فون کی گھنٹیاں بجتی ہیں۔ چہار طرف سے ٹیلی پرنٹر آتے ہیں۔ ہر لحہ نئی رپورٹ، نئی خبر آتی ہے۔ ایسے میں اسٹاک بیورو کا پورا اسٹاف اپنا، اپنا کام چھوڑ کر کسی اور کام میں محو ہو تو سارا نظام بگڑ جائے گا۔

سو اس کے لیے احتیاط بہت ضروری تھی۔ وہ دس سالوں کی ریاضت کے بعد چاکلیٹ سے ریپر اتارنے والی پوزیشن تک آیا تھا۔ اب یہ کام اس کے لیے بالکل معمولی تھا۔ اتنا عام اور ہلکا سا...... جیسے وہ پھونک سے کوئی کاغذ اڑانے والے انداز میں ایک ذہن سے دوسرے ذہن تک پیغام پہنچا رہا تھا۔

انتقالِ افکار کی زد میں وہی خیالات آتے ہیں جن کی کوئی تصویر یا مجسمہ نہیں بن سکتا۔ یہ خیال کائنات سے اخذ کیا جا سکتا ہے اور جس کو چاہے بھیجا جا سکتا ہے۔ ہر خیال اپنی بناوٹ کے لحاظ سے روشنی اور آواز کے مانند ہے۔ جس طرح روشنی اور آواز کی لہروں کو ٹیلی فون اور ٹی وی کے ذریعے بھیجا اور وصول کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح خیالات کی لہروں کو بھی نشر، اخذ اور دوسرے دماغ تک پہنچایا جا سکتا ہے۔

پروفیسر نے اپنی مشقوں، تجربات اور سیکھنے کے مراحل میں بے شمار سائنسدانوں کے قول حفظ کیے تھے جیسا کہ الائٹ سن کہتا ہے۔ روشنی، بجلی، حرارت اور مقناطیسیت یہ سب مادے کی مختلف اور بدلی ہوئی شکلیں ہیں۔ اور ان کو توانائی کی لہریں کہا جا سکتا ہے۔ اسی طرح انسانی خیال بھی لہروں کی شکل میں سفر کرتا ہے۔ گو ہم خیال کی لہروں کو نہ دیکھ سکتے ہیں، چھو اور نہ سونگھ سکتے ہیں تاہم محسوس ضرور کر سکتے ہیں۔ مگر اس کے لیے احساس کا قوی ہونا بے حد اہم ہے۔ ہر شخص میں احساس کو محسوس کرنے کی قدرت اور صلاحیت موجود نہیں ہوتی۔ اب سامنے بیٹھی خطرناک ذہن رکھنے والی لڑکی میں احساس کو محسوس کرنے کی کتنی صلاحیت موجود تھی؟ اس بات کو جاننے کے لیے پروفیسر نے ایک پیغام نشر کیا تھا۔ ہلکا سا...... بے ضرر پیغام...... اب دیکھنا یہ تھا کہ چمچے پر نگاہ جمائے بیٹھی لڑکی کا ذہن کتنا قوی اور مضبوط تھا؟ کیا وہ پروفیسر کے پیغام وصول کر سکتی تھی؟

پروفیسر جو مون کے چہرے پر نگاہ جما کر بیٹھا تھا، لمحے بھر میں اس کے تاثرات بدلتے دیکھ کر ٹھٹکا۔ پھر جیسے مون نے چمچ ہاتھ سے رکھ کر کچھ چونکتے ہوئے پروفیسر بشر کی طرف مسکرا کر دیکھا تھا۔ یہ خیر مقدمی مسکراہٹ تھی۔

''میں ٹھیک ہوں اور پڑھتی ہوں۔'' اس نے جس انداز میں انتہائی پُرسکون، خاموش ماحول میں گفتگو کا آغاز کیا تھا۔ اس چیز نے پروفیسر کو نہیں البتہ سوزن کو ہکا بکا کر دیا تھا۔ وہ ایسی نظروں سے مون کو دیکھ رہی تھی جیسے اس کا دماغ چل گیا تھا۔ اس سے بھلا یہ سوال پوچھا ہی کس نے تھا؟ جس کا جواب مسکرا کر دے رہی تھی۔ ابھی سوزن انہی سوچوں میں گم تھی جب پروفیسر نے انتہائی پُرجوش آواز میں ''اینجلی جینیئٹ'' بولا تھا۔ اس کے چہرے پر ستائش ابھر رہی تھی۔ جیسے وہ حیرانی کے سمندر سے نکل کر آ رہا ہو۔

اس کے بھیجے گئے پیغام کو ایک سو اسی میل فی گھنٹا کی رفتار سے بھی پہلے مون کا وصول کرنا اسے بری طرح چونکا گیا تھا۔ گویا وہ ایک قوی دماغ رکھنے والی لڑکی تھی۔ مگر ماہیتِ افکار میں ماہر نہیں تھی۔ سو اس نے جواب بول کر دیا تھا۔ اگر اس کے ذہن کو پالش کر دیا جاتا تو وہ ایک دنیا کو اپنے ذہن سے تسخیر کر سکتی تھی۔

''انسانی دماغ اپنے اندر بے شمار حیرت انگیز صلاحیتیں رکھتا ہے اور ان صلاحیتوں میں چھپی ہوئی پُراسرار قوتیں کبھی کبھار اپنا اظہار کر کے ہمیں دنگ کر دیتی ہیں۔ میں نے اپنے سامنے ایک کندن دماغ کو دیکھا ہے، میں ابھی تک ورطۂ حیرت میں مبتلا ہوں۔'' پروفیسر بشر کی آواز اسے سوچوں کے اژدہام سے کھینچ لائی تھی۔ جس بھرپور انداز میں وہ مون کو سراہ رہا تھا۔ جس طرح سے تعریف کر رہا تھا۔ مون کے لیے یہ سب بہت منفرد اور انوکھا تھا۔ تعریف بھلا کسے بری لگتی ہے! اور مون کو تو ویسے بھی تعریفوں کا فوبیا ہو گیا تھا۔ اس کی خواہش تھی پرستاروں کی طویل قطار اس کے دائیں بائیں ہو اور وہ ان کے درمیان کسی ملکہ کی طرح گردن تان کر چلتی رہے۔ کہتے ہیں تعریف اور شہرت کا نشہ، دونوں ہی زہر گھلا امرت ہے۔ جس کو چڑھ جائے تباہ کر کے ہی چھوڑتا ہے۔ مون کو بھی تعریفوں کا نشہ چڑھ رہا تھا۔ پہلے گھر والے کیا کم تھے جو اب ایک اجنبی شخص کی تعریف نے اسے آسمان پر پہنچا دیا تھا۔ پروفیسر ایک ماہرِ فلکیات بھی تھا۔ وہ خود کو پاکستان کا نیشنل کہلاتا تھا تاہم پانچ سال پہلے وہ جرمنی غیر قانونی طریقے سے داخل ہوا تھا۔ جب اس نے اپنا ملک چھوڑا تب وہ ایک مقامی یونیورسٹی میں درس و تدریس کے فرائض سرانجام دیتا تھا۔ اس کے پچھلے پاسپورٹ اور آئی ڈی کارڈ کی کاپی سے پتا چلتا تھا وہ انڈین شہریت رکھتا ہے تاہم وہ خود کو پاکستانی کہلواتا تھا۔ اسے اپنے باپ کی وجہ سے خود کو پاکستانی کہلوانا پسند نہیں تھا۔ بقول پروفیسر اس کا باپ پنجاب کے ایک زمیندار کا بیٹا تھا۔ وہ آگرہ گھومنے کے لیے گیا اور وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ پروفیسر کی ہسٹری سے مون کو ہرگز دلچسپی نہیں تھی۔ تاہم پروفیسر کی اپنی شخصیت نہایت دلچسپ تھی۔

اگلے چند دن تک پروفیسر ان کے گھر آتا رہا تھا۔ وہ عموماً اس وقت آیا کرتا تھا جب مون اسکول سے آ چکی ہوتی۔ پھر وہ ایک لمبی نشست کے بعد گھر کو لوٹتا تھا۔ اس نے ''بیدی نونگ'' کے نام سے ذاتی اکیڈمی بنائی تھی۔ جس میں نہ جانے وہ کس قسم کی باقاعدہ تعلیم دے رہا تھا۔ کچھ ہی عرصے بعد مون بیدی نونگ کی باقاعدہ ممبر بن گئی تھی۔ اور بشر نے پارٹنرشپ پہ یہ کام آگے بڑھا دیا...... بیدی نونگ ایک لینگویج انسٹی ٹیوٹ تھا جس میں بے شمار زبانوں کی تعلیم دی جاتی تھی۔ کچھ عرصہ یونہی گزر گیا اور مون کو بیدی نونگ کی اصل حقیقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ اس پُرسکون رواں ندی میں پہلا کنکر آخر کب پڑا تھا؟

جب ایک رات پاکستان سے مون کے تایا پہلی مرتبہ ان سے ملنے چلے آئے تھے۔ تایا ذوالفقار جو مون کے پاپا جانی کے سگے بھائی تھے اور جنہیں مون نے پہلی مرتبہ اپنے روبرو دیکھا تھا۔ تایا اس کے لیے ایک عام سی شخصیت تھے۔ وہ انہیں دیکھ کر اتنی ہی کٹھور اور روکھی رہی تھی جتنا اسے ہونا چاہیے تھا تاہم عیسیٰ بے انتہا خوش تھا۔ تانتے اور گروی کے بعد پہلا قریبی اور عزیز ترین پاپا کی طرف سے رشتہ میسر آیا تھا۔ وہ تو جیسے تایا سے مل کر پاگل ہو رہا تھا۔ اس کا بس چلتا تو اسکول چھوڑ کر تایا کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھ جاتا۔ تایا کی محبت میں ایسی دیوانگی کہیں دیکھی سنی نہیں لگتی تھی۔ اس کا بس چلتا تو ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر تایا کو نوالے بنا، بنا کر کھانا بھی خود کھلاتا۔ ان دنوں تایا کی پسند سے مینیو ترتیب دینے میں اسے کتنا کھپنا پڑتا تھا۔ وہ ماں سے الجھ پڑتا۔

"مما! تایا پھیکے کھانوں کے عادی نہیں ہیں۔ یہ بدمزہ ڈشز وہ کیسے نگلیں گے؟ وہ تو دیسی کھانوں کے عادی ہوں گے، کہیں۔۔۔ بیچارے بیمار نہ پڑجائیں۔" عیسیٰ کی جیسے جان پر بن آئی تھی۔ مریم خود پریشان ہوجاتی۔ سمجھ نہیں آتی تھی جیٹھ صاحب کی اعلیٰ ترین تواضع کیسے کرے؟ ایک طرف بیٹا بوکھلائے دیتا تھا۔ کچھ ان دنوں مریم کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ سینے میں ٹیس اٹھتی تو گھنٹوں وہ درد سے بے حال رہتی۔ تنگ آکر ٹیسٹ کروا آئی تھی۔ ابھی رپورٹس نہیں ملی تھیں اب جیٹھ صاحب پہلی مرتبہ آئے تھے۔ وہ کیسے بیمار بن کر بستر سنبھال لیتی۔ وہ بھلا کیا سوچتے...... اور اِدھر عیسیٰ کو کچھ بھی تایا کے شایانِ شان نہیں لگتا تھا۔ حالانکہ وہ بہت سادہ مزاج انسان تھے مگر عیسیٰ تو......

"پھر کیا کرنا ہے؟" مریم الجھ کر پوچھتی۔

"ہوٹل سے کھانا منگوا لیتے ہیں۔" اس کے ذہن میں پاکستانی ریسٹورنٹ گھومنے لگتے۔ عیسیٰ فوراً انکار کردیتا۔

"نہیں مما! تایا کیا سوچیں گے، وہ ایک آدھ دن کے لیے آئے اور ہم انہیں گھر کا کھانا بھی نہیں کھلا سکے۔" وہ مریم کو اور بھی بوکھلا دیتا، مریم پریشان ہوجاتی۔ اب کوئی اور آپشن بچتا نہیں تھا۔ پھر عیسیٰ نے ہی اس کا ٹھوس حل نکالا۔ کوکنگ کی بکس اٹھالایا۔ ایشین فوڈز ریسیپیز...... جس کی مدد سے ان ماں، بیٹے نے پُرتکلف ڈنر تیار کیا تھا۔ جسے میز پر سجا دیکھ کر تایا حیران ہی تو رہ گئے تھے۔ پھر ان کے دل میں مریم کی قدر و منزلت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ ان کا افسوس کچھ اور بھی بڑھ گیا۔

"تم نے اچھا نہیں کیا حسیب! مریم اور بچوں کو ہم سے دور رکھا۔" تایا شکوہ کیے بغیر نہیں رہ سکے تھے۔ عیسیٰ کا دل بھی رنج سے بھر گیا تھا۔ وہ اپنے پیارے تایا سے پہلے کیوں نہیں مل سکا۔ وہ لوگ کتنے عظیم رشتوں سے دور تھے۔ عیسیٰ کے دل میں اپنے پیارے رشتوں سے محبت کی ہڑک اچانک بیدار ہوگئی تھی۔ اور مون کو خواہ مخواہ غصہ آنے لگتا تھا۔ اسے عیسیٰ کی جذباتیت ایک آنکھ نہ بھاتی تھی جبکہ تایا کا عیسیٰ پر فدا ہونا تو دیکھا ہی نہیں جاتا تھا۔ تایا کو بھی عیسیٰ کے علاوہ کچھ اور نہ سوجھتا...... وہ تین دن رکے رہے تھے اور ان تین دنوں میں تایا اور عیسیٰ یک جان دو قالب ہوگئے۔

پھر یوں ہوا کہ تایا کی موجودگی کے دوران ہی ایک مرتبہ پروفیسر بشران کے گھر چلا آیا تھا۔ تایا کو وہ پُراسرار آدمی ذرا نہ بھایا۔ انہوں نے پروفیسر کے اٹھتے ہی اپنی ناگواری ظاہر کردی تھی۔

"یہ کون آدمی تھا حسیب...... مجھے تو ذرا اچھا نہیں لگا۔ اسے باہر تک ہی محدود رکھو......" تایا کی تجربہ کار نظروں نے نہ جانے کیا محسوس کرلیا تھا۔ جو وہ بگڑ کر کہہ رہے تھے۔ مون نے دیکھا تھا، عیسیٰ کے چہرے پر بھی ناگواری تھی۔

"تایا جان! مجھے بھی یہ آدمی اچھا نہیں لگتا۔" وہ بھی کہے بنا نہیں رہ سکا تھا۔ تب حسیب احمد فوراً بولے تھے۔

"میں نے اس کی بہت مدد کی ہے بھائی صاحب! اب بھی کچھ نہ کچھ پوچھنے آجاتا ہے، عجب لسوڑا ہوگیا ہے۔ جان نہیں چھوڑتا۔" گویا پاپا بھی پروفیسر بشر سے بیزار تھے اور اس سے کسی نہ کسی طریقے سے جان چھڑوانا چاہتے تھے۔ مون کو اس لمحے پاپا کچھ اچھے نہیں لگے تھے۔ جو بندہ اس کی پسندیدگی کے مرتبے پر فائز ہوجاتا اسے عموماً عیسیٰ اور پاپا ریجیکٹ کردیتے تھے۔ نہ جانے یہ مون کے ساتھ کیسا المیہ تھا۔

"اسے پہلی فرصت میں گھر آنے سے منع کرو۔ مجھے یہ بالکل اچھا نہیں لگا۔" تایا اپنی ناپسندیدگی کی وضاحت نہیں کر پارہے تھے۔ سچ تو یہ تھا اس آدمی کا

مون کو تاڑنا انہیں حد سے زیادہ برا لگا تھا۔ پھر تایا نے محسوس کیا تھا وہ صرف مون سے ہی بات کرنا چاہتا تھا اور اسی کے اردگرد طواف کرتی نظروں کا حصار کھینچے ہوئے تھے۔ تایا کی پروفیسر کے بارے میں رائے اگرچہ بالکل درست تھی مگر مون کو تایا اس لمحے حد سے زیادہ برے لگے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی برہمی چھپا نہیں پائی تھی۔

پروفیسر بہت نائس ہے۔ آپ کو شاید پروفیسر کے بارے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' مون کی حمایت نے عیسٰی کے چہرے کا رنگ متغیر کردیا تھا۔ اسے مون پر بے انتہا غصہ آیا۔ اسے کیا ضرورت تھی بڑوں کے درمیان بیٹھ کر ان کی درست بات کو غلط کہنے کی...... ان کے ناپسندیدہ بندے کو پسندیدگی کی سند دینا...... اسے بڑوں کا کچھ تو لحاظ ہونا چاہیے تھا مگر وہ تو بڑی بے دید بیٹھی تھی۔ عیسٰی کو بے انتہا غیظ چڑھا تھا اور مون اپنی اہمیت کا گراف کم از کم عیسٰی کی نظر سے گرا رہی تھی۔

''تم نہیں جانتی بیٹے!'' تایا نے بڑے شہد آگیں لہجے میں جیسے مون کو ٹوکا تھا۔ دوسرے لفظوں میں چپ رہنے کی سرزنش کی تھی مگر وہ مون ہی کیا جو سمجھ کر خاموش ہوجاتی۔

''وہ ہمارا گیسٹ تھا تایا! آپ اس کے بارے میں ایسے الفاظ مت بولیں۔'' مون کی بکواس نے عیسٰی کو تاؤ دلا دیا تھا۔ اس کے تیور بگڑ گئے تھے۔

''جسٹ شٹ اپ!'' وہ بھنچی آواز میں چیخا تھا۔ ''اٹھ کر جاؤ تم۔'' عیسٰی بہ مشکل ضبط کررہا تھا ورنہ شاید اس کا ہاتھ ہی اٹھ جاتا پھر بات زیادہ بھی بگڑ سکتی تھی۔

''تم...... مون کو بھی غیظ چڑھ گیا۔ ''یہ تم مجھ سے کس لہجے میں بات کررہے ہو؟'' وہ جیسے دہاڑی تھی۔

''بکواس بند کرو اور جاؤ یہاں سے۔'' عیسٰی نے تحمل کا مظاہرہ کیا۔ پھر بھی اسے شدید توہین کا احساس ہوا تھا۔ وہ جیسے تھرا اٹھی تھی۔ جبکہ تایا نے بہ مشکل سیز فائر کروایا تھا مگر انہیں مون کی بدزبانی اور پروفیسر کے لیے فضول کی تکرار بہت بری لگی تھی۔ اگرچہ انہوں نے اس بات کا اظہار نہیں کیا تھا پھر بھی عیسٰی جانتا تھا انہیں مون کا انداز پسند نہیں آیا تھا۔ وہ اندر ہی اندر کٹ سا گیا تھا۔ مگر مون کو کچھ کہہ نہیں پایا تھا۔ یہ بھی نہیں کہ اس کا یہ غیر مہذبانہ عمل اس کی آئندہ زندگی کے لیے بہت بڑا پہاڑ ثابت ہونے والا تھا مگر وہ کچھ سوچ لیتی تو تب ناں......

پھر رات کو موقع پاکر عیسٰی نے مون کی پھر سے کلاس لی تھی۔

''یہ تم تایا کے سامنے اتنی بک، بک کیوں کررہی تھیں؟'' اس کی آنکھوں میں غصہ بھر گیا تھا۔ حالانکہ وہ خود کو بہت سمجھا بجھا کر آیا تھا۔ وہ مون سے تلخ کلامی نہیں کرے گا مگر پھر بھی......

''کون تایا؟ میں کسی تایا کو نہیں جانتی...... نہ جانے کہاں سے رشتے دار اٹھ کر آجاتے ہیں۔'' وہ بھی تمام ہتھیاروں سے لیس بیٹھی تھی اور کوئی بھی وار خالی نہیں جانے دینا چاہتی تھی۔ وہ دونوں اس وقت سٹنگ روم میں موجود تھے اور دونوں ہی اس بات سے بے خبر تھے کہ سٹنگ روم سے ملحقہ لاؤنج میں تایا بیٹھے اخبار پڑھ رہے ہیں جو ان کے جھگڑے کی آواز پر چونک گئے تھے۔

''بکواس نہیں کرو...... تمہیں جانے کیا ہوگیا ہے؟ تم تایا کے لیے کیسے الفاظ استعمال کررہی ہو......؟ اتنے سالوں میں پہلی مرتبہ تو تایا آئے ہیں۔'' عیسٰی کو شدید صدمہ پہنچا تھا۔ وہ جیسے کچھ بول ہی نہیں پایا گنگ سا رہ گیا تھا۔

''میرے سامنے اس بڈھے کا ذکر مت کرو۔ جانے کون سا مفاد لے کر آیا ہے۔ بھوکے، ننگے پاکستانی...... سالوں بعد بھائی کی یاد آگئی۔ اپنے کسی بیٹے کا ویزا لگوانا ہوگا۔'' مون زہر خند ہوکر چلا اٹھی

تھی اور عیسٰی کے کانوں میں سے دُھواں نکلنے لگا تھا۔

وہ ہکا بکا رہ گیا تھا۔ یہ مون ہی بول رہی تھی کیا......؟

”زبان اتنی لمبی ہوگئی ہے تمہاری؟ یہ تم ... کر رہی ہو؟ تایا کے لیے ایسے گندے الفاظ......؟“ عیسٰی بے یقین نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا جو پہلے کی طرح مطمئن اور بشاش بیٹھی تھی۔

”ہاں، کچھ غلط نہیں کہا میں نے...... وہ اپنے کسی مفاد کے لیے آئے ہیں۔ آخر پہلے کیوں نہیں آئے۔“ اب وہ زہر پھونک کر مطمئن سی بول رہی تھی۔ عیسٰی پھر سے سن ہوگیا۔

”ان کا کوئی مفاد نہیں...... ہماری محبت میں چلے آئے ہیں، تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا تایا کے لیے اتنے غلیظ الفاظ بولو۔“ اس نے اپنے اندر تنفر کی لہر دباتے ہوئے بہ مشکل کہا تھا۔

”ہونہہ تایا! دیکھ لینا...... اپنے کسی بیٹے کا مستقبل سنوارنے آئے ہوں گے۔“ وہ ابھی تک اپنی بات پر ڈٹی ہوئی تھی۔

”وہ کوئی بھوکے ننگے نہیں...... اپنی ذاتی فرم چلا رہے ہیں۔“ عیسٰی کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ اس کی گردن ہی مروڑ ڈالتا۔

”یعنی ہمارے پاپا کا حصہ بھی کھا رہے ہیں۔“ مون بڑی دور کی کوڑی لائی تھی۔ وہ بھنا اٹھا تھا۔

”مون! ذرا بھی خوف خدا نہیں تمہیں...... ایسے گھٹیا الزام......“ وہ کانوں تک سرخ ہوگیا تھا۔

”دیکھ لینا...... بات یہی نکلے گی۔ تایا یا تو پیسوں کی امداد لینے آئے ہیں یا اپنے بیٹوں کے اسپانسر ویزوں کی بات کریں گے۔“ مون گویا تایا کے اندر سے ہو کے آئی تھی۔ حالانکہ وہ یہ بکواس محض عیسٰی کو تپانے کے لیے کر رہی تھی۔ اس میں یقیناً کوئی صداقت نہیں تھی۔ وہ اتنا تو جانتی تھی کہ تایا کوئی فٹ پاتھ سے اٹھ کر نہیں آئے مگر پھر بھی اپنی بھڑاس نکال رہی تھی۔ تاکہ لاؤنج میں موجود تایا سن لیں۔ درپردہ وہ اپنا بدلہ چکا رہی تھی۔

”تایا کے بیٹے ماشاء اللہ سے اسٹیبلشڈ ہیں۔ ذیشان امریکا سے پڑھ کر آیا ہے۔ ذی شاہ اور شاہی بھی بیرون ملک آتے جاتے رہتے ہیں۔ ان کے لیے جرمنی میں کوئی چارم نہیں۔“ عیسٰی نے جیسے جتلا کر اس کا منہ بند کروانا چاہا تھا مگر اس کا منہ بند نہیں ہوسکتا تھا۔

”ہونہہ...... تم نہیں سمجھ سکتے......“ مون زچ ہو کر چیخی۔

”تم تو خوب سمجھتی ہو ناں...... بنا کچھ جانے بکواس کرنے کا انجام...... اچھا نہیں ہوتا۔“ وہ تھک ہار کر بولا۔

”مجھے پروا نہیں۔“ مون نخوت سے سر جھٹک کر رہ گئی۔

”اس بات پر افسوس ہی کیا جاسکتا ہے۔“ اس نے گہرے درد بھرے لہجے میں کہا۔

”اور یہ کام تم اچھی طرح سے کرسکتے ہو۔“ اب وہ مسکرا رہی تھی۔ جیسے اپنی بھڑاس نکال کر فریش ہوچکی تھی۔

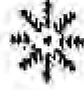
”میں تمہیں بھلا کیا کہہ سکتا ہوں۔“ عیسٰی بس سا ہو کر اٹھ گیا تھا۔ اس کا دل خوب بھر بھر آرہا تھا۔ مون کی بکواس نے اسے اپ سیٹ کردیا تھا۔ جب وہ لاؤنج سے گزرا تب تایا اپنے روم کی طرف جا رہے تھے۔ گیسٹ روم جو ان کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ عیسٰی کچھ پل کے لیے سن سا ہوگیا۔ کیا تایا نے ان کی تکرار سن لی تھی؟ وہ لاؤنج سے اٹھ کر جو جا رہے تھے۔ عیسٰی کے بدن سے جیسے جان ہی نکل گئی تھی۔ وہ اپنی ہی نظر سے جیسے گر گیا تھا۔

> مون کی ا[illegible]ن کا کیا اثر ہونے والا تھا؟ کیا یہ مالا کی زندگی کی تباہی کا آغاز تھا؟ یہ سب ضرور جانیے لیکن اگلے ماہ......

ترکِ وفا

نایاب جیلانی

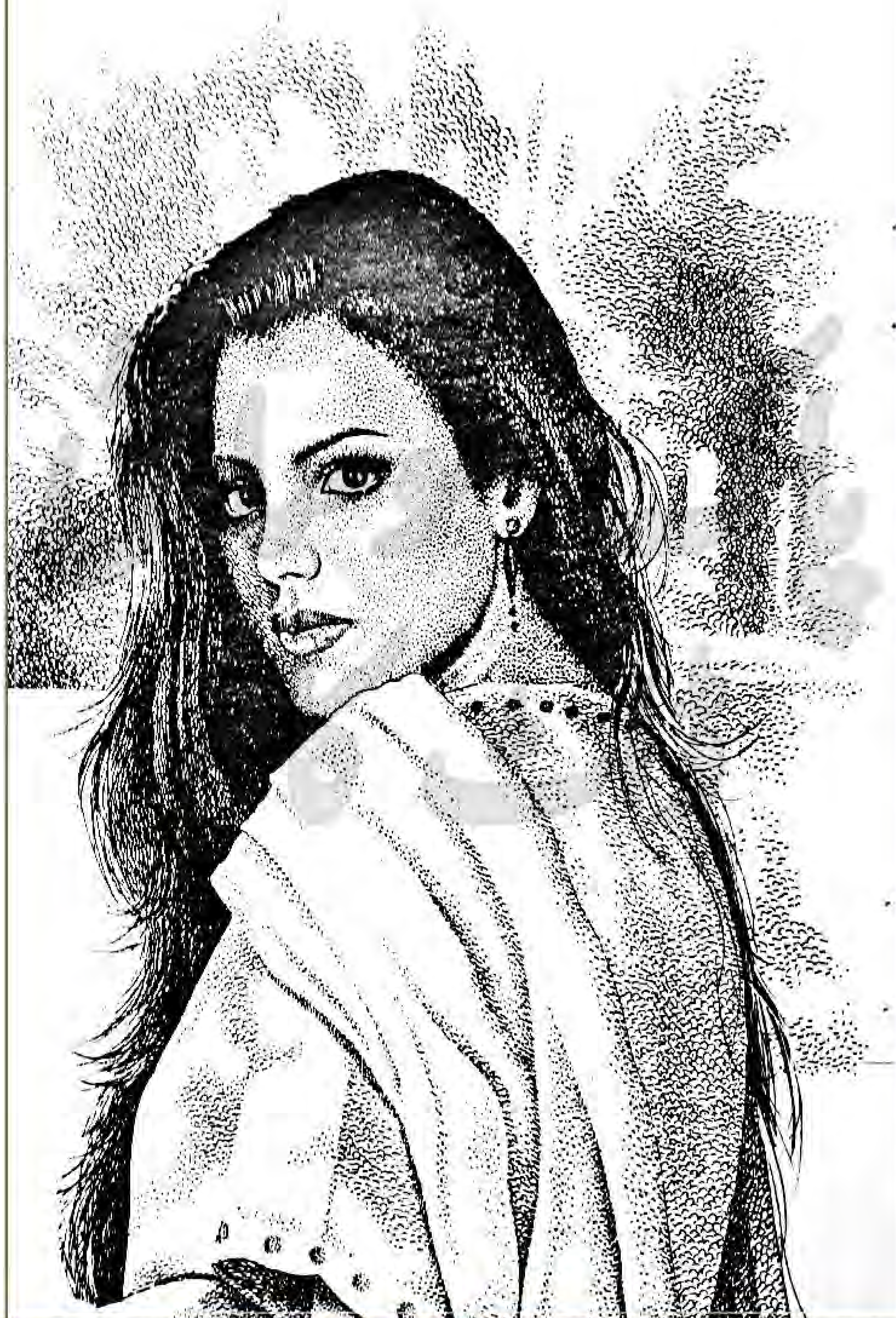
ناولٹ



گیارھواں حصہ

تایا نے اگر کچھ سنا بھی تھا تو ظاہر کچھ نہیں ہونے دیا۔ عیسیٰ کے خدشے بے بنیاد ثابت ہوئے تھے۔ وہ دل ہی دل میں شکر کرتا رہا، اگر تایا کچھ سن لیتے تو بھلا وہ کیسے ان سے نگاہ ملا سکتا تھا؟

حالانکہ اندر سے وہ کچھ بجھ سا گیا تھا۔ مون کی ... خودسرانہ باتیں اسے غصے میں مبتلا کر چکی تھیں مگر اب اس غصے پر بے بسی حاوی تھی۔ مما ان دنوں اچانک بیمار ہوگئی تھیں۔ ان کی صحت گری، گری تھی مگر وہ تایا اور



عیسیٰ کے لیے فریش نظر آتی تھیں۔ بھلا تایا ابا سوچتے؟ وہ بھی بھاران کے گھر آئے تھے اور ہاؤس فراؤ بیمار پڑ گئیں۔ مہمان نوازی کی خاطر مریم کو ہشاش بشاش رہنا پڑ رہا تھا ورنہ وہ تو اچانک اندر سے ڈھے گئی تھی۔

پھر انہی دنوں ایک عجیب واقعہ رونما ہوا تھا......

دراصل عیسیٰ کے لیے یہ ایک واقعہ یا پھر خوشگوار حادثہ تھا۔ اس دن وہ اسکول سے گھر آیا تو پاپا اور تایا کو اسٹڈی روم میں دیکھ کر اُدھر ہی چلا آیا تھا مگر اندر سے آتی آوازیں سن کر ٹھٹک گیا۔ پاپا اور تایا کسی اہم موضوع پر بات کر رہے تھے۔ آخر موضوع کیا تھا؟ وہ جیسے سن کھڑا رہ گیا۔ وہ لوگ تو عیسیٰ کی شادی کے متعلق بات کر رہے تھے مگر شادی ہو کس سے رہی تھی؟

''میری تو خواہش ہے مالا اور علی عیسیٰ کی شادی ہو اور مون کا جوڑ ذی شاہ سے بنتا ہے۔ آپ کیا کہتے ہیں بھائی صاحب......؟'' پاپا بے تابی سے بول رہے تھے۔ عیسیٰ جیسے ٹھٹک گیا تھا۔ ''مالا اور علی عیسیٰ...... مالا یعنی تایا جان کی بیٹی......'' اس کا دل خوشگوار انداز میں دھڑک اٹھا تھا۔ جیسے کوئی گھنٹی سی ہوا کے جھونکے سے اچانک بج اٹھی ہو۔

''مالا اور عیسیٰ تو ٹھیک ہیں...... عیسیٰ تو جان ہے اپنی...... پر مون کی بات رہنے دو۔'' تایا کی آواز سنجیدہ تھی۔ جیسے وہ بہت تول تول کر بول رہے تھے۔

''مون کی بات کیوں رہنے دوں...... کیا آپ کو میری بیٹی بطور بہو پسند نہیں آئی؟'' پاپا بچوں جیسی ضد سے بولے تھے۔ جیسے تایا کے انکار نے ان کے دل کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ مگر عیسیٰ تو جان گیا تھا، تایا کس وجہ سے انکار کر رہے تھے۔ مون کی زبان کے جوہر دیکھ کر انہیں انکار ہی کرنا چاہیے تھا۔

''یہ بات نہیں......'' تایا نے سابقہ سنجیدگی بھرے لہجے میں کہا۔ ''مون مجھے بہت پیاری ہے۔ تمہاری بیٹی بہت خوب صورت ہے پر مجھے نہیں لگتا ذی شاہ اور مون ایک دوسرے کے ساتھ چل سکیں گے۔ وہ بھی مزاجاً گرم ہے اور مون بھی کم نہیں۔ ہاں عیسیٰ اور مالا ایک ہی لڑی کے موتی ہیں۔ ٹھنڈے، دھیمے اور مدھم...... مجھے امید ہے، بہت اچھا زندگی کا سفر طے کریں گے ایک ساتھ۔'' انہوں نے گویا بات ہی ختم کر دی تھی مگر پاپا نے بہت بحث کی۔ وہ مون کی بکواس سے واقف ہو نہیں تھے۔ جو کچھ تایا سن چکے تھے اس کے جواب میں ان کی مون کے لیے اتنی حلاوت بھی عیسیٰ کے لیے اچنبھے کا باعث تھی۔ انہوں نے مون کی شکایت بھی نہیں کی تھی، بس کہا تو صرف اتنا......

''حسیب اپنی بیٹی کی شادی میں تاخیر مت کرنا۔''

ان کے لہجے میں جو واضح تنبیہہ تھی اسے عیسیٰ بخوبی سمجھ سکا تھا۔ وہ مون کے رنگ ڈھنگ سے خوفزدہ تھے۔ مگر پاپا اُن کی بات کو سمجھ نہیں سکے۔ وہ اپنی ضد پر اَڑے رہے تھے۔

''آپ ذی کو اِدھر بھیجیں گے تب ہی مون کا کچھ سوچ سکوں گا۔ میں نے مون کو کہیں اور نہیں صرف ذی شاہ سے ہی بیاہنا ہے۔'' پاپا کا لہجہ بھی اٹل تھا۔ ان کا انداز بچوں جیسا ضدی تھا۔ جیسے وہ ہر صورت اپنی بات منوانا چاہتے ہوں۔

''اس طرح تو وٹہ سٹہ ہو جائے گا۔'' تایا بھی بے بس سے ہو گئے۔

''تو کیا فرق پڑتا ہے......؟'' پاپا کو اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا تھا۔

''تم فی الحال اس بات کو رہنے دو...... صرف عیسیٰ اور مالا کی بات کرو......'' تایا نے بڑی محبت سے جیسے التجا کی تھی۔ وہ چپ کر گئے تھے پھر کافی دیر کی خاموشی کے بعد بولے۔

''ٹھیک ہے...... پھر میں عیسیٰ اور مالا کا رشتہ پکا سمجھوں......؟'' انہوں نے آس بھری آواز میں کہا۔

''ہاں...... کیوں نہیں......'' تایا بھی مسکرا دیے۔ ''مگر عیسیٰ سے تو پوچھو......'' انہوں نے بڑی

اہم بات کی طرف اشارہ کیا تھا۔

''میرا بیٹا، میری ہر بات مانتا ہے۔'' پاپا کا سینہ بے انتہا فخر سے پھول گیا۔

''یہ تو ٹھیک ہے...... عیسیٰ کی رضامندی زیادہ اہم ہے۔'' تایا بھی ہلکے پھلکے سے مسکرادیے...... جیسے کوئی بوجھ ہٹ گیا تھا۔

''وہ تو اب بھی شادی کے لیے تیار ہوگا... آپ بے شک بلا کر پوچھ لیں۔'' پاپا یقیناً دروازے کے پیچھے کھڑا اسے دیکھ چکے تھے۔ تبھی شرارتی انداز میں بولے تھے جبکہ عیسیٰ ایک دم جھینپ گیا تھا۔ اب چھپنے کا فائدہ نہیں تھا۔ وہ دونوں اسے دیکھ چکے تھے۔

''سامنے آجاؤ سرکار......'' پاپا نے ہانک لگائی تھی۔ وہ جھینپا جھینپا سا اندر آگیا۔

''باتیں تو سن چکے ہو تمام...... اب بتاؤ، کیا رائے ہے تمہاری؟'' پاپا نے اسے چھیڑا تھا۔

''جیسے آپ کی مرضی......'' عیسیٰ نے مشرقی بچوں کو بھی شرمانے میں مات دے ڈالی تھی۔ وہ دونوں بھائی اس کی حالت سے حظ اٹھا رہے تھے۔

''صاحبزادے! ہم آپ کی مرضی پوچھ رہے ہیں؟'' تایا بھی اسے تنگ کرنے لگے۔

''مجھے آپ کی ''مرضی'' سے بھی اختلاف نہیں......'' اب وہ ذرا پُر اعتماد ہوا تھا۔ وہ دونوں اس کی...... جی داری پر ہنس پڑے۔

''دیکھ لیا...... اب کیا کہتے ہیں......! رشتہ پکا سمجھوں......؟'' پاپا نے ہتھیلی پر سرسوں جما ڈالی تھی۔

''بالکل جناب! اب میں کیا کہوں......؟ تم باپ بیٹا بڑے جلد باز ہو......'' تایا سرشار سے ہوئے۔ گویا اک گونا سکون محسوس کررہے تھے۔ تب علی عیسیٰ اور مالا کی زندگی کا فیصلہ بڑے اچانک حالات میں ہوا...... اور موں کی بات بیچ میں رہ گئی تھی۔ موں کی بکواس اگر تایا نہ سن چکے ہوتے تو شاید حالات مختلف ہوتے اور موں کا بھی ذی شاہ سے رشتہ طے پا جاتا مگر ایسا نہیں ہوسکا تھا...... تایا نے وٹے سٹے کا بہانہ کرکے ایک طریقے سے پاپا کو ٹال دیا تھا۔ وہ موں کو اپنی بہو ہرگز نہیں بنانا چاہتے تھے۔ شاید ان کی زیرک نظری اور دور اندیشی نے بعد کے حالات بھی دیکھ لیے تھے۔ یقیناً انہیں لگتا تھا موں کبھی ان کے بیٹے کا ساتھ نہیں دے سکتی پھر رشتے داری خراب کرنے سے بہتر تھا، وہ لوگ یہ نیا رشتہ کرتے ہی نہیں۔ شاید تایا کا فیصلہ درست تھا مگر پاپا کو بھلا کون سمجھاتا...... وہ تو ہر صورت موں اور ذی شاہ کا رشتہ بھی جوڑنا چاہتے تھے۔ وہ اپنے دونوں بچوں کا مستقبل روشن اور محفوظ دیکھنے کے خواہش مند تھے اور یہ خواہش بے جا نہیں تھی۔

تایا کو جانے سے پہلے فوٹو والا البم دکھانا یاد آیا تھا۔ انہوں نے البم عیسیٰ کو پکڑا کر شرارتاً کہا۔

''اسی البم میں اپنی بھی فوٹوز لگا دینا...... پاکستان والے بھی دیکھنے کو بے تاب ہوں گے۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے عیسیٰ کو چھیڑا تھا اور وہ ہنستا ہوا البم پکڑ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اسے اپنے کزنز کو دیکھنے کی بہت بے چینی تھی۔ عیسیٰ دروانہ... بند کرکے بیڈ پر آبیٹھا...... پھر اس نے البم کھول کر جلدی سے دیکھا۔ دراصل یہ میٹھا، میٹھا اٹھنے والا اضطراب صرف مالا کو دیکھنے کے لیے اسے بے قرار کررہا تھا۔ اسے مالا کو دیکھنا تھا جو سمندروں کے فاصلے پر بیٹھی تھی مگر عیسیٰ کو لگتا اس کے آس پاس ہی کہیں ہے۔ یہ کیفیات بہت اچانک رونما ہوئی تھیں۔ وہ اپنے محسوسات میں تبدیلی پاتا تھا۔ یوں لگتا جیسے اندر کا پورا سسٹم ہی بدل گیا ہے۔ پھر مالا کو دیکھنے کے بعد تو جیسے وہ اپنے آپ میں نہیں رہا تھا۔ اس کا دل، دھڑکنوں کا ردھم بدل گیا تھا۔ حالانکہ وہ کوئی بہت حسین نہیں تھی۔ عام سی لڑکی تھی مگر عیسیٰ کو ہمیشہ خاص لگتی تھی۔ اس کا دل جیسے اس کے بس میں نہیں رہا تھا۔ وہ مالا کی محبت میں بن دیکھے گرفتار ہوگیا

تھا۔ جیسے اسے بیلے کی کلیوں سے گندھی بہت معصوم سی مالا سے محبت ہوگئی تھی۔ یہ رشتہ پاپا اور تایا نے طے کیا تھا۔ مگر ماما کو کچھ اختلاف ہوا...... انہوں نے دبے، دبے الفاظ میں انکار کرنا چاہا تھا۔ وہ سوزن کو اپنی بہو بنانا چاہتی تھیں اور یہ بات عیسیٰ کے کانوں تک بھی پہنچ گئی تھی۔

ایک طرف پاپا کی خواہش تھی اور دوسری طرف مما کی...... وہ تو جیسے بے بس ہوگیا تھا۔ اگر مما زیادہ مجبور کرتیں تب وہ بھلا انکار کرسکتا تھا؟

وہ تایا کا دیا فوٹوز والا البم کھولے افسردہ سا ہوگیا۔ اس البم میں مالا کی صرف ایک تصویر تھی۔ دو چار بندیا کی تھیں۔ ذیشان، ذی شاہ اور شامی کی زیادہ تھیں بلکہ ذی شاہ کی زیادہ تھیں شاید تایا وہ تصویریں مون کے لیے لائے تھے۔ اسے ذی شاہ کو دیکھ کر مون کی بدنصیبی پر دکھ سا ہوا۔ کاش کہ یہ رشتہ بھی طے ہوجاتا مگر ہر خواہش پوری ہونے کے لیے تو نہیں ہوتی۔ مون کی جلد بازی، تلخ کلامی اور زہریلے الفاظ نے تایا کو اس سے بددل کردیا تھا۔

مون، عیسیٰ اور مالا کے رشتے کا سن کر شاکڈ رہ گئی تھی۔ اس کا ذہن جیسے سن ہوکر رہ گیا۔ مون نے تو عیسیٰ اور سوزن کے متعلق سوچ رکھا تھا پھر یہ مالا بیچ میں کہاں سے آگئی تھی؟ مون کے اندر باہر آگ لگ گئی۔ تایا کی چالاکی پہ اسے سخت تاؤ آتا رہا مگر اب تو اسے تایا جیسے مطلبی انسان پر گویا زہر چڑھ رہا تھا۔ تایا گھر میں ہوتے تو وہ ان کو ایسی، ایسی باتیں سناتی کہ اپنی بیٹی کا رشتہ وشتہ سب بھول جاتے۔ مگر تایا کہیں نکلے ہوئے تھے۔ اور عیسیٰ جانے کہاں تھا؟ وہ عیسیٰ کی تلاش میں آگ بگولا ہوتی اس کے کمرے میں آئی تو عیسیٰ وہاں بھی نہیں تھا۔ مون کو زہر لگتا تھا۔ اس کے سامنے کوئی بھی ہوتا تو بچ نہ پاتا۔ وہ کمرے میں چکراتی غصہ پھونک رہی تھی۔ وہ عیسیٰ کے سارے طبق روشن کرنے آئی تھی اور اسے مجبور کرنے آئی تھی

تاکہ وہ تایا کے منہ پر اس رشتے سے انکار کردے۔ آخر تایا کی مطلب پرستی کھل کر سامنے آہی گئی تھی۔ بیٹا نہ سہی بیٹی کو جرمنی بھیجنے کا منصوبہ کامیاب ہو ہی رہا تھا۔ مون ایسا ہرگز بھی نہیں ہونے دے گی۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا۔ آخر اس کے خدشے اور چھٹی حس کے اشارے بے بنیاد نہیں تھے۔

یوں ہی کمرے میں چکراتی مون کی نگاہ تکیے کے نیچے البم تک گئی تھی۔ اس نے کچھ تجسس کے عالم میں تکیہ پیچھے ہٹا کر دیکھا۔ نیچے ایک البم پڑا تھا۔ وہ حیرانی کے عالم میں تصویریں ایک، ایک کرکے دیکھنے لگی۔

''تایا اور ان کے بچے......'' مون نے زیرِلب بڑبڑا کر ایک اور ننھا سا لفافہ کھولا۔ اس میں الگ سے آٹھ دس تصویریں رکھی تھیں۔ وہ تجسس کے عالم میں دیکھتی چلی گئی۔

''یہ کون ہے......'' اس کا دل جیسے دھک، دھک کررہا تھا۔ وہ ایک، ایک تصویر کو ساکت بیٹھی دیکھ رہی تھی۔ اندر دور کہیں اکھاڑ پچھاڑ ہورہی تھی۔ دل کی عمارت پر دھڑا دھڑ کچھ گر رہا تھا۔ کیا......؟ شاید اس کے بڑے بول...... شاید تکبر بھرے الفاظ، شاید حقارت، نفرت اس نے تایا کو کیا کچھ نہیں سنایا تھا۔ اپنے بیٹوں کا مستقبل سنوارنا چاہتا ہے۔ ان کے ویزے لگوانا چاہتا ہے...اور جانے کیا کیا......؟ اس کے کہے ایک، ایک لفظ نے جیسے مون کا منہ چڑانا...شروع کردیا تھا۔ ادھر دل کے اندر قیامت کا تلاطم بپا تھا۔ اور مون کی پوری ہستی تہ خاک ہورہی تھی۔ اس نے تصویر کو اٹھا کر سہ بار دیکھا۔ اس کا دل نہیں بھر رہا تھا۔ وہ اس چہرے کو بار بار دیکھنا چاہتی تھی۔ مون حسیب کو آخر ہو کیا رہا تھا؟' کیا ایسا ہونا چاہیے تھا؟

ہاں، ایسا ضرور ہونا چاہیے تھا۔ اس کے غرور کی سزا یہی تھی۔ اسے تایا کے اسی بیٹے سے محبت ہوتی، جس کے لیے انہیں مون قطعاً نامناسب لگی تھی اور

مون کے ساتھ کتنا انہونا واقعہ رونما ہوا تھا۔
کیا کبھی ایسا بھی ہوا ہے؟ تصویر دیکھ کر کسی سے محبت ہو جانا؟ تصویر دیکھ کر سوچیں، دل، جذبات، احساسات بدل جانا اور اس محبت میں سالوں کی مسافت طے کرنا۔

وہ ذی شاہ کے نقش، نقش کو دیکھ کر، دل کے اندر بسا رہی تھی...... مگر آنکھ تھی کہ ہٹتی نہیں تھی اور دل تھا کہ بھرتا ہی نہیں تھا۔

اس نے خود کو بارہا مجبور کیا...... سمجھایا، بجھایا تاویلیں اور دلیلیں دیں...... جیسے نگاہ بچا، بچا کر اور رستہ بدل، بدل کر گزرنا چاہا تھا مگر اس کے ہر رستے میں انوکھی سی یہ محبت دیوار بن کر آ کھڑی ہوئی تھی۔ ان دونوں بہن، بھائی کو بڑی عجیب سی محبت ہوئی تھی۔ وہ صرف تصویر دیکھ کر عین عشق کی سیڑھیاں چڑھنے لگے تھے۔ بھلا ایسے بھی کبھی ہوتا ہے؟ بھلا اس طرح بھی ہوتا ہے؟ مگر ان دونوں کے ساتھ بالکل ایسا ہی ہوا۔ عیسیٰ کا معاملہ پھر بھی الگ تھا مگر مون کے ساتھ تو بہت ہی عجیب ہوا۔ وہ لمحوں میں پرائی ہو گئی تھی۔ جیسے کچھ بھی اس کا اپنا نہیں رہا تھا۔ دل سمندر پار تایا کے اس بیٹے کے حصار میں چلا گیا، جو کل تک اس کی نظر میں کچھ نہیں تھا۔ اور آج پورا عالم سمیٹے بیٹھا تھا۔

مون نے چاہا کہ وہ خود کو جھٹلا دے مگر بوئے گل نے کہا۔ میں رو کے سے نہیں رکتی۔ بڑی عجیب محبت ہوں، نشے کی طرح چڑھتی ہوں، عمر بھر نہیں اترتی......

راستے بدلنے سے دل کہاں بدلتے ہیں
شہر کی فصیلوں کی جس قدر بلندی ہو
بوئے گل نہیں رکتی آنکھ موند لینے سے
جو نمی ہو آنکھوں میں وہ کبھی نہیں چھپتی
ہاتھ کے کواڑوں سے چاندنی نہیں ٹلتی
بے رحم ہواؤں سے پیار کے چراغوں کی
روشنی نہیں بجھتی، نارواتغافل کی دل شکن اداؤں سے
جذبہ ہائے الفت کو ماند کر نہیں سکتی

اور پھر ”بوئے گل“ رکی کہاں تھی! فصیلیں توڑ، توڑ کر سر چڑھنے لگی۔ نشہ بن کر مدہوش کرنے لگی تھی۔ خواب بن کر آنکھ میں اترنے لگی تھی۔ وہ خود کو جھٹلا، جھٹلا کر تھک گئی تھی اور بوئے گل کو روک، روک کر لاچار ہو گئی۔ محبت نے اپنا پنجہ اس کے دل پر بالآخر جما ہی دیا تھا اور اسے تایا کے ذی شاہ سے بڑی پاگل کر دینے والی محبت ہو گئی تھی۔

وہ ایک عجیب لڑکی تھی، اس کی زندگی عجیب تھی، اس کے احساسات عجیب تھے، اس کی محسوس کرنے والی ہر حس عجیب تھی اور اس عجیب لڑکی کو بڑی عجیب سی محبت ہو گئی تھی۔

اس نے ذی شاہ کی تصویر کو اٹھا کر اپنی آنکھ کے سامنے کر لیا تھا۔ وہ اس کا ایک، ایک نقش کھوج رہی تھی بھلا کوئی چہرہ اتنا پُرکشش اور مقناطیس جتنی صلاحیت رکھتا ہے؟ جو دل، جذبات اور احساسات کو بیک وقت کھینچ سکے؟ وہ دم بخود بے جان تصویر کو دیکھ رہی تھی مگر اسے لگتا تھا، تصویر سے نکل کر کوئی مجسم اس کے سامنے آ کھڑا ہوا ہے۔ اس کا دل جیسے توے پر رکھے مکھن کی ٹکیہ کا ایک کونا تھا جو لحظہ لحظہ پگھلتا جا رہا تھا۔

اسے اپنے متکبر الفاظ یاد آ رہے تھے...... نخوت اور غرور میں لپٹے......”کیا کبھی کوئی اتنا بھی بے بس ہو جاتا ہے؟“ اس نے اپنے پرائے ہوتے دل سے سوال کیا...... محبت جس میں فنا ہو رہی تھی۔ اور وہ اپنے آپ میں نہیں تھی۔ کیا سزائیں اتنی جلدی بھی ملا کرتی ہیں؟

مون کی چھٹی حس کہہ رہی تھی۔ محبت اس کے دل پر کوئی سزا بن کر یا عذاب بن کر نازل ہوئی ہے۔ ہاں، محبت اس کے لیے بن سنور کر نہیں آئی تھی، وہ اس کا امتحان لینے آئی تھی۔ اس کے تکبر کو مٹی میں رولنے آئی تھی۔ اسے تہ خاک کرنے آئی تھی۔ اسے

برباد کرنے ہی تو آئی تھی۔ اس نے بھیگی ہوئی آنکھوں کو تصویر پر جمایا۔

پھر اس نے ذی شاہ کی تمام تصویروں کو اسی لفافے میں بند کر دیا۔ شاید وہ تصویروں کو نظر سے اوجھل نہیں کرنا چاہتی تھی۔ خود سے جدا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

خواب پوش آنکھوں میں
آنسوؤں کا بھر جانا
حسرتوں کے ساحل پر
تتلیوں کا مر جانا
حبس کی ہواؤں میں
خوشبوؤں کا ڈر جانا
دل کے گرم صحرا میں
حشر ہی بپا ہونا
دردِ لا دوا ہونا
کیا بہت ضروری ہے
اب تیرا جدا ہونا

اس کا دل جیسے کٹ، کٹ کر گرنے لگا تھا۔ وہ اپنی کیفیات پر دم بخود تھی۔

☆☆☆

گردشِ دوراں نے اسے کس موڑ پر لا کھڑا کیا تھا......؟ وہ نہ پیچھے ہٹ سکتی تھی، نہ آگے بڑھ سکتی تھی۔ عقل، عمر کی محتاج نہیں ہوتی۔ پھر بھی وہ سمجھ نہیں پائی تھی کہ کرے کیا...... ابھی وہ انہی الجھنوں میں گرفتار تھی جب تایا کی واپسی کا دن آ گیا۔ اس نے سوچا تھا کہ جانے سے پہلے تایا کا دل اپنی طرف سے صاف کر دے گی اور اپنے گزشتہ رویّے کی معافی مانگ لے گی۔ خود غرض تو وہ بلا کی تھی۔ اپنے مفاد کے لیے کچھ بھی کر سکتی تھی۔

سو، رات کو وہ خود کو سمجھا بجھا کر گیسٹ روم کی طرف لے آئی تھی۔ مگر یہ کیا...... اندر سے پاپا اور تایا کی آوازیں آ رہی تھیں۔ موضوعِ گفتگو مون کی ذات ہی تھی۔ وہ جیسے ٹھٹک کر منجمد ہو گئی تھی۔ وہ دونوں کیا بات کر رہے تھے؟ دونوں بے انتہا سنجیدہ تھے۔ مون سانس روکے دروازے کے باہر کھڑی ہو گئی پھر جیسے دھیرے دھیرے اس کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی تھی۔

''مون کی بات مت کرو، میں نے پہلے بھی تمہیں منع کیا ہے حسیب......'' تایا نے بے انتہا سنجیدگی بھرے لہجے میں کہا۔ پھر پاپا کی بے بس سی آواز سنائی دی تھی۔ مون کی سانس تک رک گئی۔

''کیوں نہ کروں......؟ میری بیٹی میں کیا کمی ہے؟'' انہیں گہرا دکھ سا ہوا۔

''میں نے کب کہا ہے مون میں کوئی کمی ہے۔ بس ذی شاہ نہیں مانے گا۔'' صاف لگ رہا تھا وہ بجھے لہجے میں بولتے ہوئے ٹال رہے تھے۔

''کیوں نہیں مانے گا؟ آپ اسے ایک مرتبہ اِدھر بھیجیں تو سہی......'' پاپا نے افسردگی سے کہا تھا، جیسے ان کی بات مانی نہیں جائے گی۔

''وہ یہاں بھی نہیں آئے گا، بڑا مختلف مزاج ہے اس کا...... اور مون بھی کم نہیں...... یہ رشتہ غیر مناسب ہے۔'' تایا گویا تول، تول کر بول رہے تھے۔ وہ کس کے رشتے کی بات کر رہے تھے؟ مون اور ذی شاہ کی......؟ وہ جیسے تھرا اٹھی تھی۔ تو تایا اسے ریجیکٹ کر رہے تھے؟

''شادی کے بعد سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔ آپ بات تو پکی کریں۔'' پاپا کی لجاجت پر وہ تھم سی گئی تھی۔ پاپا اپنی بیٹی کے لیے گڑگڑا رہے تھے۔ کیا بوئے گل پاپا تک بھی پہنچ گئی تھی؟ کیا مون کی محبت کا اعلان ہو گیا تھا۔ خوشبو بکھر رہی تھی؟ مہک نکھر رہی تھی؟

''کچھ ٹھیک نہیں ہوتا، نہ ہو گا...... رشتے داری میں دراڑ آ جائے گی۔'' تایا بے بس ہو گئے۔

''نہیں آئے گی...... بس میں نے کہہ دیا ہے عیسٰی اور مالا...... مون اور ذی شاہ...... چند سال گزر

جانے دیں...... بچے پڑھ لکھ جائیں پھر ان کی شادیاں کردیں گے۔'' پاپا نے عجلت پسندی کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ شروع سے ہی جلد باز تھے۔ تایا کا مسلسل انکار کرنا مون کو اذیت سے دوچار کر رہا تھا مگر پاپا اصل حقیقت سے واقف نہیں تھے۔ وہ تو مون کی بدلتی کیفیت سے بھی واقف نہیں تھے۔

''تم کیوں نہیں سمجھتے حسیب! ذی شاہ نہیں مانے گا۔'' تایا نے انتہائی سنجیدگی بھرے لہجے میں کہا۔

''آخر نہ ماننے کی کوئی وجہ تو ہو......'' پاپا کو غصہ آگیا۔

''تمہاری بیٹی کا مزاج مختلف ہے۔'' تایا پھر سے بے بس ہوگئے۔ وہ کیسے بھلا مون کے مزاج کی تشریح کرتے؟ انہوں نے مون کو دیکھ کر ہی جانچ لیا تھا۔ وہ ان کی بہو بننے کے قابل نہیں تھی۔

''شادی کے بعد ٹھیک ہوجائے گی۔'' پاپا کی وہی ایک ضد...... مون کو لگا وہ اب چکرا کر گرنے ہی والی ہے۔ تایا کے الفاظ اسے دھڑام، دھڑام زمیں بوس کر رہے تھے۔

''کبھی نہیں ہوگی...... وہ انتہائی بدتمیز اور... بدلحاظ بچی ہے، تم نے اس کی تربیت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ پھر بھی مجھے لگتا ہے وہ تمہارا امتحان بن کر دنیا میں آئی ہے۔ بعض بچے والدین کو آزمانے کے لیے ہی آتے ہیں۔ وہ تمہارے لیے بہت اذیت کا باعث بنے گی۔ میں دیکھ رہا ہوں، مجھے خوف ہے...... وہ بہت خسارے اٹھانے والی ہے۔'' تایا کی آواز آنسوؤں میں بھیگ گئی تھی۔ دراصل وہ مون کی سرکشی اور خودسری کی انتہا کو کھوج چکے تھے۔ وہ بہت زیرک انسان تھے۔ مون کی ذات میں موجود کجیوں کو جانچ چکے تھے۔ اور اُدھر مون کے سر پر جیسے پہاڑ آگرے تھے۔ وہ آخری سیڑھی سے منہ کے بل گر پڑی تھی۔ تو کیا پاپا کے اس بھائی نے مون کو اپنے بیٹے سے رشتے کے قابل نہیں سمجھا تھا؟

مہکتی کلیاں

☆ اگر آپ اپنے احباب کو ایسے واقعات سناتے ہیں جن سے آپ کے دوستوں کو نیچے گرایا جائے تو آپ خود ایک گری ہوئی شخصیت ہیں۔

☆ یتیم وہ نہیں جس کے والدین نہ ہوں بلکہ وہ ہے جو حسنِ اخلاق سے محروم ہو۔

☆ کنجوس آدمی دولت کا مالک نہیں ہوتا بلکہ دولت اس کی مالک ہوتی ہے۔

☆ مٹ جانے والی چیزوں کو چھوڑ دو اور باقی رہ جانے والی چیزوں کو اختیار کرو۔

مرسلہ: انجم گلزار، کراچی

ابدی نیند

ہر گھر کے کشادہ صحن میں
کتنے کمرے اگ آتے ہیں
پھر ان کمروں کے باسی
چپکے چپکے، دھیرے دھیرے
اپنا رستہ چن لیتے ہیں
دور دیس میں جا بستے ہیں
جاتے جاتے طفل تسلی کی ایک گٹھڑی
بوڑھے ہاتھوں میں دے کر
اشک بھری آنکھوں سے نظریں چرا کر
چل دیتے ہیں
ایک دن ایسا آتا ہے کہ
بوڑھی آنکھیں، رستہ تکتے تھک جاتی ہیں
چوکھٹ پر ہی سو جاتی ہیں

شاعرہ: حجاب عباسی

مرسلہ: افتخار شوق، میاں چنوں

''خود سوچنا ذرا..... عیسیٰ مغرب زدہ ہے، مغرب کی پیداوار ......پھر بھی شریکِ حیات میں مشرقیت کی خواہش رکھتا ہے۔ پھر ذی شاہ تو ہے ہی مشرق کی پیداوار......وہ مون کی مغربیت کے ساتھ کبھی سمجھوتا نہیں کرے گا۔'' تایا سچ کہہ رہے تھے۔ مگر وہ ان کے سچ کو دھتکار بیٹھی تھی۔ تو کیا تایا نے اسے ٹھکرا دیا تھا؟ اسے دھتکار دیا تھا؟ آخر انہوں نے مون میں کون سی خرابی دیکھی تھی؟ وہ بدکردار تھی؟ شرابی تھی؟ جواری تھی؟ اس کے غیر لوگوں سے ناجائز تعلقات تھے؟ آخر انہوں نے مون میں کیا دیکھ کر اسے ٹھکرا دیا تھا؟

اس کی زخمی انا منہ کے بل گری دہاڑ رہی تھی۔ ٹھکرائے جانے کی ذلت کوئی معمولی نہیں ہوتی۔ اس کے نفرت بھرے جذبات ابل کر باہر آگئے تھے۔ غصہ بھانبڑ کی طرح جل رہا تھا اور انتقام کے شعلے اسے فنا کر رہے تھے۔ وہ ایک جلد باز باپ کی جلد باز بیٹی تھی۔ اس سے یہ ذلت، یہ ٹھوکر برداشت نہیں ہوسکی تھی۔ ابھی تو محبت اس کے دل میں اتری ہی تھی جب ذلت کی آگ نے اسے راکھ، راکھ کر دیا تھا۔

اس کا بس چلتا تو پاپا کے اس بھائی کا منہ نوچ لیتی۔ اسے گالیاں دیتی...... اور اس کے منہ پر کیچڑ پھینکتی کہ آخر وہ ہوتا ہی کون تھا جو مون کو ریجیکٹ کر رہا تھا۔

ذلت، توہین، غصہ، نفرت اور انتقام کی آگ نے اسے جھلسا رکھا تھا۔ بات اتنی بڑی تو ہرگز نہیں تھی مگر مون کی شدت پسندی نے اسے انتہا تک پہنچا دیا تھا۔ اس سے آگے بس ذلت کا سفر تھا مگر وہ نادانی میں سمجھ ہی نہیں پائی۔

تایا، اب پاپا کو بڑی محبت کے ساتھ اگلے مرحلوں کے طے کرنے کی تفصیل بتا رہے تھے۔

''عیسیٰ پڑھائی سے فارغ ہولے...... پھر تم مالا کو آکر لے جانا...... مالا اب تمہاری بیٹی ہے۔'' تایا اور پاپا مستقبل کے سہانے سپنے بُن رہے تھے اور مون ان کے سپنوں کو تار، تار کرنے کی پلاننگ کر رہی تھی۔

''عیسیٰ اور مالا...... کبھی نہیں، ہرگز نہیں...... میں انہیں کبھی ایک ہونے نہیں دوں گی...... اگر ایسا ہو بھی گیا تو غضب کی جدائی ڈالوں گی۔ عمر بھر کی ایسی ذلت، جدائی اور رسوائی کہ داغ کبھی نہ دُھل پائیں گے۔'' مون نے گویا اٹل فیصلہ کرلیا تھا۔ یہ اس کے اندر کا غصہ تھا۔ ٹھکرائے جانے کا انتقام تھا۔ جب ذی شاہ اس کے لیے نہیں تھا تو پھر مالا کیسے عیسیٰ کے لیے ہوسکتی تھی؟ ہرگز نہیں، قیامت تک نہیں...... فیصلہ تو ہو چکا تھا...... وہ اپنی ذلت کا بدلہ لینے، انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرنے اور تایا کو نیچا دکھانے کے لیے کچھ بھی کرسکتی تھی۔ کچھ بھی میں سب کچھ ہی شامل تھا...... محبت اور جنگ میں اس نے سب کچھ ہی جائز کر رکھا تھا۔ تایا کو اپنی بیٹی کی مشرقیت پر مان تھا اور مون حسیب نے اس مان کو تہ خاک کرنا تھا۔ مالا کی مشرقیت کو ذلتوں میں بدلنا تھا مگر اس کے لیے طویل ریاضت درکار تھی۔ بہت صبر اور ضبط کے ساتھ وقت گزرنے کا انتظار کرنا تھا۔ ہاں، عیسیٰ اور مالا کی شادی تک کا انتظار......

اور اس کے بعد گیم مالا کے ہاتھ سے نکل کر مون کی طرف آجاتی۔ شطرنج کی اصل بازی وہ عیسیٰ کی شادی کے بعد کھیلنے والی تھی۔ بساط پر مہرے رکھ دیے گئے تھے۔ اب بس داؤ چلنے تھے۔ مگر بیچ میں کچھ سفر ابھی باقی تھا۔ عیسیٰ اور مالا کی شادی تک کا سفر......اور مون اتنے سالوں میں نفرت کے ان جذبات کو نوچنا نہیں بلکہ اور تازہ دم کرنا چاہتی تھی۔

آخر بدلہ لیے بغیر تو وہ رہ ہی نہیں سکتی تھی پھر تایا کو مزہ بھی تو چکھانا تھا۔ جو پاپا کو اب مالا نامہ کھولے ایک، ایک لفظ کھول، کھول کر سنا رہے تھے۔ جیسے در پردہ مون کو جتا رہے ہوں۔

''مالا اتنی سادہ سی ہے، معصوم، کم گو، شریف...

باحیا دیکھنا، عیسیٰ تو عمر بھر مجھے اور تمہیں دعائیں دیتا رہے گا۔'' تایا کے لہجے میں فخر تھا۔ جو مون کو تازیانے کے مانند لگ رہا تھا۔ تو گویا وہ اسے جتلا رہے تھے پاپا کو بتا رہے تھے کہ تمہاری بیٹی ان اعلیٰ مقدس اور پاکیزہ صفات سے مبّرا ہے۔ وہ درپردہ اسے کوڑے مار رہے تھے اور مون ذلت وتوہین کے احساس سے بھڑ بھڑ جل رہی تھی۔

''ہونہہ...... پاکیزہ...... باحیا...... معصوم...... دیکھوں گی، یہاں آکر کتنی معصوم، پاکیزہ اور باحیا رہتی ہے؟'' وہ تنفر وحقارت سے زہر آلود ہو رہی تھی۔ اور تایا کا فخر بڑھتا جا رہا تھا۔

''میری بیٹی بہت بھولی ہے، سگھڑ، سمجھدار، وفا شعار، محبت کرنے والی عیسیٰ کا نام لیا تو سر جھکا کر اپنی رضامندی دے دی۔ ایسی بیٹیاں تو والدین کی آنکھوں اور سینوں میں ٹھنڈک بھرتی ہیں۔'' وہ نم آواز میں کہہ رہے تھے اور مون کے سر پر ہتھوڑے لگ رہے تھے۔ تایا کا ایک، ایک لفظ اس کے لیے تیزاب کے مانند تھا۔ وہ جیسے سر تا پا جھلس رہی تھی۔ تایا جانتے نہیں تھے۔ مالا کی بے ضرر تعریفیں اس کے لیے آئندہ زندگی میں کیسی قیامت لانے والی ہیں۔ اگر جان جاتے تو کبھی مالا کی اتنی تعریف نہ کرتے۔

مون جب الٹے قدموں پلٹ رہی تھی تب وہ پہلے والی مون نہیں تھی۔ وہ تو غصے، حسد، نفرت اور انتقام میں بھری مون تھی جس نے تایا کو نیچا دکھانا تھا۔ اپنے ٹھکرائے جانے کا حساب لینا تھا۔ حالانکہ بات بڑی نہیں تھی مگر اسے مالا کے مقابل لاکر، مالا کی شخصیت کے ساتھ موازنہ کر کے ریجیکٹ کیا گیا تھا۔ ایسی توہین مون عمر بھر نہیں بھول سکتی تھی۔ تایا نے اپنی بیٹی کے خاکے میں رکھ کر مون کا جائزہ لیا تھا...... یہ کہاں کا انصاف تھا؟ اب مون، مالا کی طرح سگھڑ نہیں تھی، اس کی طرح دبّو نہیں تھی، اس کا یہ مطلب نہیں تھا۔ مون میں سرے سے کوئی خوبی ہی نہیں تھی۔ تایا نے کتنی معمولی بنیاد پر اسے دھتکارا تھا۔ اس کا اولین محبت کا ذائقہ چکھنے والا دل بہت بری طرح سے کرچی، کرچی ہوا تھا۔ وہ اگر بے باک، نڈر، دلیر یا منہ پھٹ تھی تو یہ کوئی اتنا بڑا عیب نہیں تھا جس کی بدولت وہ سگی بھتیجی کو ٹھکرا جاتے۔ مون کے نزدیک تو کوئی بھی عیب نہیں تھا مگر ایک بات پر اسے بھی یقین ہو چلا تھا، یہ جو اس کی چھٹی حس تھی یہ کبھی غلط اشارہ نہیں دیتی تھی۔

وہ جو دل کو بڑا کر کے تایا سے اپنے سابقہ رویوں کی معافی مانگنے آرہی تھی تب ہی اس کی چھٹی حس نے الارم بجایا تھا کہ اس کے ساتھ کچھ ٹھیک نہیں ہونے والا۔ کچھ غلط اور بہت برا ہوگا...... اور ایسا ہو کر رہا تھا۔

وہ صرف تایا سے نہیں بلکہ اس شب جان چھڑکنے والے پاپا سے بھی بدظن ہوگئی تھی۔ اس کا باپ اتنا کمزور ثابت ہوا تھا جو بیٹی کے حق میں ذرا سی دلیل بھی نہیں اٹھا کر لایا تھا۔ وہ چاہتے تو تایا مان بھی سکتے تھے۔ پاپا ان پر دباؤ بھی ڈال سکتے تھے مگر پاپا نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا۔ ذرا سی کوشش بھی نہیں کی تھی اگر وہ چاہتے تو بہت کچھ کر سکتے تھے۔ کم از کم عیسیٰ اور مالا کا رشتہ توڑنے کی دھمکی ہی دے ڈالتے۔ پھر تایا کی کیا مجال تھی جو وہ انکار کرتے...... اتنا تو مون جان ہی چکی تھی۔ تایا، عیسیٰ کے لیے۔۔۔ بے انتہا حساس ہو چکے تھے اور عیسیٰ کو ہر صورت اپنا داماد بنانا چاہتے تھے۔ عیسیٰ اپنی پیاری، پیاری عادتوں کے باعث تایا کے دل میں کھب گیا تھا مگر اس کے پاپا نے بغیر لڑے ہی ہتھیار پھینک دیے تھے۔ جاتے، جاتے تایا انہیں باور کروا گئے تھے۔

''ذی شاہ کے لیے مون کو مت بٹھانا...... جلد از جلد شادی کر دینا...... بیٹیوں کو وقت کے ساتھ ہی رخصت کرنا چاہیے۔'' تایا کے یہ الفاظ تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئے تھے۔ مون کا انتقام اور

بھی بڑھ گیا تھا۔ اب تو وہ کسی بھی صورت تایا اور مالا کو معاف کرنے والی نہیں تھی۔ مالا اس کے دشمنوں کی فہرست میں ایک دم ٹاپ پر چلی گئی تھی۔ اب اسے اپنا انتقام پورا کرنا تھا۔ تایا کو نیچا دکھانا تھا مگر اس کے لیے عیسیٰ اور مالا کی شادی بہت ضروری تھی۔ مون کا منصوبہ بڑا مختصر اور جامع تھا۔ مالا کو بدنام، ذلیل اور خوار کر کے عیسیٰ کی زندگی سے بے دخل کرنا...... پھر اسے ذلتوں کے داغ لگا کر واپس پاکستان بھجوانا...... تاکہ عزت مآب تایا صاحب اپنی لاڈلی کے کرتوت دیکھ کر شرمسار ہو جاتے پھر اپنے ہی کہے الفاظ کے کوڑوں سے لہولہان ہوتے رہتے۔ ان کی لاڈلی بھولی، باحیا، باوفا بیٹی کو ذلیل کرنا مون کا اولین مقصد بن گیا۔ اس سے نہ صرف انتقام کی آگ ٹھنڈی ہو جاتی بلکہ تایا کو ان کے تکبر کی سزا بھی مل جاتی جو نیک اور فرمانبردار اولاد پر اتراتے پھرتے تھے۔ ایک جامع پلاننگ بناتے ہوئے مون حسیب بھول چکی تھی کہ اس کے پاس جزا اور سزا کا کوئی اختیار نہیں...... ہر شخص اپنے عمل کا بھگتان خود اپنی ذات پہ ہی بھگتنے والا ہے اگر کوئی غرور یا تکبر میں مبتلا بھی تھا تو بھلا مون کون ہوتی تھی اسے سزا دینے والی؟ ذرا سی غلطی، ہلکی سی سرزنش انسان کے لیے عمر بھر کا پچھتاوا بن جاتی ہے۔ اور مون کے دفتر تو ویسے بھی بھرے پڑے تھے۔ جس صفحے کو بھی کھولتی، اندر سے خسارے اور نقصان کی فہرست نکل آتی تھی مگر انسان ٹھوکر کے بنا کہاں سمجھتا ہے...... اور مون تو ٹھوکروں پہ سب کو رکھتی تھی، اسے چھوٹی موٹی ٹھوکر نے کیا کہنا تھا؟ اندھا دھند بھاگتے ہوئے انسان رائل روڈ کو بھول جاتا ہے...... پھر جب تک کوئی بریکر نہیں آتا، رکتا نہیں...... اور یہی بریکر چاہے تو گڑھے میں پھینک دے چاہے تو قبر میں......

اور مون صرف ان دو لفظوں اور ایک لائن کا مفہوم عمر بھر نہیں سمجھی تھی کہ سارے معاملے تقدیر کے آگے سرنگوں ہیں اور تدبیر جتنی بھی مضبوط سہی، تقدیر کی رسی اسے اکھاڑ کر رکھ دیتی ہے۔

محبت کو اس نے امرت نہیں، سم قاتل بنا لیا تھا پھر مرنا تو تھا ہی...... سلگنا تو تھا ہی...... محبت کو شہد سمجھ کر پینے والے ہارے ہوئے انسان بہت کم ہوتے ہیں...... جو ہار کر بھی شہد بنے رہتے ہیں۔ شہد کی دلدل میں عمر بھر ڈوبے رہتے ہیں۔ محبت کے مارے ہوئے اکثر زہر بن جاتے ہیں اور یہ زہر وہ کسی نہ کسی کی رگوں میں ضرور اتارتے ہیں، کسی نہ کسی انتقامی جذبے کے باعث۔

مون کے ساتھ بھی کچھ یوں ہی ہوا تھا۔ تایا چلے گئے مگر مون کے اندر ہمیشہ تازہ رہنے والا زخم چھوڑ گئے۔ اور ان کے چلے جانے کے بعد ان کے گھر کا ماحول بھی کچھ اچھا نہیں رہا تھا۔ مما اور پاپا کی پہلی مرتبہ زندگی میں بحث ہوئی تھی۔ مما کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ اسی وجہ سے پاپا نرمی برت رہے تھے ورنہ جو مما نے شور اٹھایا تھا وہ انہیں سخت گراں گزر رہا تھا۔ مما، مالا کو اپنی بہو نہیں بنانا چاہتی تھیں۔ یہ نہیں تھا انہیں مالا سے کوئی پرخاش تھی، وہ بس سوزن کے لیے اپنے دل میں کچھ زیادہ نرم گوشہ رکھتی تھیں۔ انہوں نے پاپا سے پہلی مرتبہ بحث کی تھی۔

''میں سوزی کے لیے موتر سے بات کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔'' مریم نے بجھے سے انداز میں کہا تھا جیسے اس کی دیرینہ خواہش پوری ہونے سے دور ہو چکی تھی۔ مون اس وقت وہیں تھی اور وہ ٹھہر کر ان کی باتیں سننا چاہتی تھی۔

''مگر بات کی تو نہیں...... اور کرنا بھی نہیں...... میں سوزی کو بہو نہیں بنا سکتا......'' پاپا کا لہجہ اٹل تھا۔ جیسے وہ فیصلہ کر چکے تھے اور اب اپنے فیصلے سے ہٹنے

والے نہیں تھے۔ اس سے مون کو پاپا بہت ہی برے لگے تھے۔

''سوزی میں کیا برائی ہے؟'' مریم دکھی سی ہوگئی۔

''میں نے یہ نہیں کہا......'' پاپا برا مان گئے۔

''تو پھر......؟'' وہ رونے لگی تھی اور ماں کے آنسو مون کے دل پر گر رہے تھے۔ اس کا دل چاہا، وہ پاپا کو روک دے مگر بے بسی کے باعث کچھ نہیں کر سکی تھی۔

''میں بھائی صاحب سے بات کر چکا ہوں مریم......'' پاپا بھی جیسے بے بس ہو گئے تھے۔ مما کے آنسوؤں نے انہیں پگھلا دیا تھا۔

''آپ معذرت کر لینا...... پلیز، میری خاطر...... میں سوزی کو بہت چاہتی ہوں...... وہ بہت اچھی بچی ہے۔ ایک ٹوٹے گھر کا درد اپنے دل میں رکھتی ہے۔ اسے یہاں محفوظ جگہ اور محبت کرنے والے لوگ مل جائیں گے۔'' مریم نے اپنے جذبات پاپا تک پہنچا دیے تھے۔ پاپا سوچ میں پڑ گئے تھے۔

''مریم! تم ایسا کیوں سوچتی ہو...... سوزی کی شادی میں خود کروں گا۔ تم سوزی کی فکر مت کرو۔'' پاپا کے لیے مما کو روتا دیکھنا بہت مشکل تھا۔ پھر مریم ان دنوں بہت بیمار تھی۔ اس کی رپورٹس کچھ بہتر نہیں آئی تھیں۔ مزید ٹیسٹ وغیرہ کروائے جا رہے تھے۔ ان حالات میں وہ اسے کوئی تکلیف نہیں دینا چاہتے تھے۔

''سوزی کے لیے عیسیٰ بہت مناسب ہے، وہ بہت تعاون کرنے والا سمجھدار لڑکا ہے۔ سوزی کے ساتھ اچھا رہے گا۔'' مریم، بھانجی کا مستقبل محفوظ دیکھنا چاہتی تھی۔ جبکہ وہ عجیب دوراہے پر کھڑے ہو گئے تھے۔ ایک طرف بھائی کو زبان دے رکھی تھی اور دوسری طرف بیمار بیوی کی خواہش تھی۔ کچھ سوچ کر انہوں نے مریم کو مژدۂ جاں فزا سنا دیا تھا۔

''ٹھیک ہے مریم......! تم عیسیٰ سے پوچھ لو...... میری بات...... چلو، خیر ہے، میں اپنے بھائی کو سمجھا لوں گا۔ پر تمہاری خواہش کیسے رد کر دوں۔'' پاپا عجیب ٹوٹے سے لہجے میں بولے تھے۔ مون کے لیے پاپا کے الفاظ بہت حیران کن تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی پاپا، مما کی خاطر تایا کو جواب دے دیں گے۔ اسے پاپا کی یہ کوئی سازش ہی لگتی تھی۔ شاید وہ مما کا دل نہیں توڑنا چاہتے تھے۔ اور یہ بھی جانتے تھے کہ عیسیٰ خود ہی انکار کر دے گا۔ کیا خبر، پاپا کی یہی پلاننگ ہو...... فی الوقت مون کوئی حتمی رائے قائم نہیں کر سکی تھی۔ پر پاپا کی دور اندیشی پہ اش اش ضرور کر اٹھی تھی۔ جیسے انہوں نے مما کو چکما دے دیا تھا۔

اب وہ انتظار میں تھی کہ مما کب عیسیٰ سے بات کرتی ہیں مگر اس سے بھی پہلے مما کی بھیانک رپورٹس آ گئیں۔ انہیں کینسر تشخیص ہوا تھا۔ شاید پاپا کے مان جانے کی وجہ بھی مما کی بیماری تھی۔ وہ مما کی تکلیف بڑھانا نہیں چاہتے تھے۔ مون نے غور کیا تو اسے احساس ہوا تھا، پاپا بہت دنوں سے بہت اجڑے، اجڑے ویران لگ رہے تھے۔ جیسے مما کی بیماری کا انہیں پہلے سے ہی شک تھا۔ پاپا کی حالت ایک طرف، عیسیٰ بھی بہت اذیت میں تھا اور خود مون بھی ماں کی بیماری کا سن کر اندر سے ٹوٹ گئی تھی۔ مریم کی اذیت، درد اور بیماری نے انہیں پھر سے جوڑ دیا تھا۔ اور مریم کی بیماری کا موضوع ایسا تھا جس پر مون اپنے تمام اختلافات اور پاپا کے لیے دل میں موجود عناد کو بھی بھلا کر بات کر لیا کرتی تھی۔ ان دنوں بس مریم کی صحت اور زندگی ان سب کے لیے اہم ہو گئی تھی۔ باقی ہر بات ثانوی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ مما کا مہنگے سے مہنگا علاج جاری تھا۔ پاپا کاروبار بھلا کر مما کی پٹی سے لگ گئے تھے اور عیسیٰ کو اپنا کالج تک بھول گیا تھا۔ دن رات ماں کے گرد گھومنے کے سوا اس کا کوئی اور دوسرا کام نہیں تھا۔ جیسے وہ کسی خدشے کا شکار تھا کہ جوں ہی وہ مما کی نگاہ سے اوجھل ہوا۔ مما ان کے درمیان نہیں رہیں گی۔

اور اِدھر مون کی مشہور زمانہ چھٹی حس بھی خطرے کا الارم بجارہی تھی۔ اسے لگتا تھا، عیسیٰ کا خدشہ مجسم کھڑا ہونے والا ہے۔ ان کے دل جس خوف کا شکار تھے۔ وہی خوف موت کی آہٹیں لیے دھیرے، دھیرے ان کے گھر میں قدم رکھ رہا تھا۔ وہ عیسیٰ سے اپنے دل کی بات کہنا، عرصہ پہلے چھوڑ چکی تھی۔ ان کے درمیان تایا کے موضوع پر آخری مرتبہ جو بحث ہوئی تھی، اس کے بعد کوئی تکرار نہیں ہوئی۔ مون خود ہی عیسیٰ سے کھنچ گئی تھی اور اس سے دور، دور رہنے کی کوشش کرتی تھی۔ حالانکہ اس نے بار ہا محسوس کیا تھا، عیسیٰ اس سے کچھ کہنا چاہتا ہے، یقیناً مما کے موضوع پر بات کر کے اپنا دل ہلکا کرنا چاہتا تھا مگر مون اس کی خواہش کو پیروں تلے روندتی رہی تھی۔ اس نے عیسیٰ سے جو فاصلہ روا رکھا تھا اس میں کمی نہیں آنے دی تھی بلکہ اسے اور ہی بڑھا لیا تھا۔

مالا کے لیے ان کے گھر میں جو چھوٹی موٹی جھڑپیں ہوئی تھیں ان کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ مما کی بیماری کے ساتھ ہی گویا ہر موضوع خود بخود بند ہو گیا تھا مگر ایک روز جب مما کو اسپتال ایڈمٹ ہوئے چوتھا دن تھا مما نے خود ہی عیسیٰ کو بلا کر سوزن کے متعلق بات کر لی تھی وہ جیسے اپنی زندگی سے مایوس ہو چکی تھیں اور بیٹے کی زندگی کا کوئی فیصلہ کر لینا چاہتی تھیں۔ اِدھر عیسیٰ جیسے عجب مشکل میں گرفتار ہو گیا تھا۔ ایک طرف مما تھیں، ان کی آخری خواہش تھی اور دوسری طرف پاپا اور اس کی پہلی محبت...... فیصلہ مشکل تھا، انتہائی پُر اذیت تھا۔ جیسے رشتوں کا پل صراط...... آخر وہ کس کا انتخاب کرتا؟ کسے چُنتا؟ ماں کی آنکھوں میں امید بجھتی دیکھنے کا بھی حوصلہ نہیں تھا اور پاپا کا سر جھکانے کی بھی ہمت نہیں تھی۔ یہ وہ گھڑی تھی جب اس نے بڑی شدت کے ساتھ اپنے اللہ کو پکارا تھا۔ وہ ٹھیک فیصلہ کرنے کی قوت نہیں رکھتا تھا۔ اسی لیے اللہ سے مدد مانگ رہا تھا...... اور اللہ جو شہ رگ سے بھی قریب تھا۔ کیسے نہ عیسیٰ کی پکار پہ پہنچتا...... یا جیسے فیصلے کی مشکل ساعت اس کے لیے آسان ہو گئی تھی۔ جیسے وہ پل صراط سے آنکھیں موند کر ہی گزر گیا تھا۔ دماغ نے ایک دلیل دی تھی اور دل نے اس پر مہر ثبت کی۔ وہ ماں کی ہتھیلیاں چومتا، ماں کے پیروں پر جھک آیا تھا۔

”آپ کی خواہش سر آنکھوں پر مما! جو آپ چاہیں گی، وہی ہوگا مگر پہلے آپ ٹھیک تو ہو جائیں۔“ اس کے الفاظ نے بسترِ مرگ پر پڑی مریم کو نہال کر دیا تھا۔ وہ جو دنوں میں بیماری کے ہاتھوں چت ہو گئی تھی۔ جانے کب سے کینسر جیسا ناسور اس کے اندر پلتا رہا تھا۔ وہ چھوٹی موٹی تکلیف کو نظر انداز کرتی آئی تھی۔ جس کا نتیجہ آج بھگت رہی تھی۔ فی الوقت علی عیسیٰ کے الفاظ نے مریم کے اندر زندگی کی برقی لہر دوڑا دی تھی۔ اس نے بیٹے کی پیشانی چوم کر کہا۔

”اتنی مہلت نہیں میری جان......! بس سوزی کی زندگی کو محفوظ دیکھنا چاہتی ہوں۔ وہ بہت اچھی اور شفاف لڑکی ہے۔ مجھے خوف ہے بھٹک نہ جائے۔“

مریم نے جیسے اپنے اندر کی خواہش کا اظہار کر دیا تھا۔ وہ اس لیے بھی سوزی کو بہو بنانا چاہتی تھی کہ کہیں ماحول کا طلسم اور حالات کی کٹھنائیاں اسے دلبرداشتہ نہ کر دیں، وہ بھٹک نہ جائے۔ یہاں کے رنگ میں رنگ نہ جائے۔ اس کا خالص پن کھو نہ جائے۔ محبت میں ناکامی اس کی راہیں نہ کھوٹی کر دے۔ وہ سوزن کے جذبات سے باخبر تھی مگر مون کے جذبات سے قطعاً بے خبر تھی۔

”سوزی نہیں بھٹکے گی مما! آپ اس وہم میں نہ پڑیں۔ وہ سچی اور اچھی لڑکی ہے۔ اپنے مذہب پر ثابت قدمی سے چل رہی ہے۔ کوئی بھی رکاوٹ اسے ڈگمگا نہیں سکتی۔“ عیسیٰ نے نرمی سے کہا تھا۔ درپردہ اس نے مریم کو احساس دلایا تھا۔ وہ سوزن کی مذہبی روح کو نظر انداز نہ کریں۔ سوزی اپنے مذہب

پہ کچھ بھی قربان کرسکتی ہے۔

''یہ تم نے ٹھیک کہا۔'' مریم جیسے گہری سوچ میں پڑ گئی تھی۔ یہ پہلو ایسا نہیں تھا جسے نظر انداز کردیا جاتا اور یہ بھی سچ تھا۔ وہ عیسائی بھولا نے کے حق میں نہیں تھی۔ وہ عیسیٰ کے بچوں کو کسی گڑھے میں کیونکر پھینکتی۔ آخر شادی کے بعد بچے تو ہونے تھے پھر ماں اور باپ کے درمیان لٹکی تلوار کو کیسے اِدھر اُدھر کرتے۔ مذہب جو واضح حقیقت تھا۔ ایک طرف باپ ہوگا...... صوم وصلوٰۃ کا پابند...... ایک کھرا اور سچا مسلمان...... اور دوسری طرف ماں ہوگی۔ ایک کٹر مذہبی، عیسائی.. بچے آخر کسے درست سمجھیں گے؟ کیا یہ باریکیاں نظر انداز کرنے والی تھیں؟ مریم لحہ بھر کے لیے گم صم رہ گئی تھی۔ لوہا گرم تھا...... پھر ذرا سی چوٹ سے اور نرم ہوجاتا۔ علی عیسیٰ نے سابقہ نرم، حلیم اور محبت بھرے لہجے میں ماں سے کہا۔

''مجھے سوزی سے شادی پر کوئی اعتراض نہیں...... شرط یہ ہے کہ وہ اسلام قبول کرلے۔ جیسے آپ نے اسلام قبول کیا تھا پھر اسی رستے کو سچا تسلیم کیا...... اور اسی راہ پر چلتی رہیں......'' عیسیٰ نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ مریم خاموش ہوکر اسی پہلو پر سوچتی رہی۔ عیسیٰ کی ڈیمانڈ کچھ غلط نہیں تھی۔ اس نے بالکل ٹھیک فیصلہ کیا تھا۔ مریم دل سے قائل ہوگئی...... پھر اس نے اپنی ماں سے بات کرنے کا ارادہ کرلیا تھا مگر اس سے بھی پہلے بلی کی چال چلنے والی مون نے ان ماں، بیٹے کی پوری بات من وعن سن کر سوزن کو فون کھڑکا دیا۔ وہ کب سے سوزن کے روبرو بیٹھ کر بات کرنا چاہتی تھی مگر ماں کی بیماری کی وجہ سے اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔ اس کا نخرہ، غرور، نخوت یا پاپا اور عیسیٰ پر غصہ ایک طرف، ماں سے مون کو بھی شدید قسم کی محبت تھی...... اور مریم کی تکلیف نے اسے کچھ عرصے تک کے لیے بہت کچھ بھلا رکھا تھا۔ حتیٰ کہ پروفیسر بشر کو بھی...... جو مریم کی عیادت کے بہانے کئی مرتبہ آیا تھا اور جسے حسیب احمد نے روبرو بلا کر دوٹوک انداز میں اپنے گھر آنے سے منع کردیا تھا۔ پاپا نے اپنے بھائی کی تنبیہ کو بھلایا نہیں تھا۔ مون کو پاپا کا رویہ برا لگا تھا۔ گھر آئے مہمان کو بے عزت کرنے کا انہیں کیا حق پہنچتا تھا۔ وہ اس وقت تو خاموش رہی تھی مگر بعد میں پاپا سے بھی الجھ گئی تھی۔ اس نے انہیں ٹھوس لفظوں میں کہا تھا کہ وہ پروفیسر کے خلاف دل میں تایا کی وجہ سے بغض نہ رکھیں...... دراصل تایا، پروفیسر کو ناپسند کرگئے تھے۔ اب زمین اِدھر سے اُدھر ہوجاتی۔ پاپا نے کبھی پروفیسر کو پسندیدگی کی سند نہیں بخشنا تھی۔ اور جسے تایا اور پاپا ناپسند کرچکے تھے، مون بس انہی کی ضد میں اس شخص کو اچھا ثابت کرنے پر تل گئی تھی۔ پاپا نے اس کی خاطر تایا سے جنگ نہیں کی تھی بلکہ ہتھیار پھینک دیے تھے اور تایا نے اسے دھتکارا تھا، اپنے بیٹے کے قابل نہیں سمجھا تھا۔ سو یہ دونوں شخص مون کے لیے باعثِ اذیت بنے تھے۔

وہ ان دونوں کو تکلیف دے کر حظ اٹھانا چاہتی تھی۔ وہ کیسی نادان، احمق اور خسارے اٹھانے والی تھی۔ خود کو عقلِ کل سمجھ کر بھی نادانیاں کرتی رہی...... فی الحال پاپا نے اسے پروفیسر کی حمایت پہ جھاڑا نہیں تھا۔ دراصل مما کی بیماری نے ان کی سدھ بدھ بھلا رکھی تھی۔ وہ بے شمار گھریلو معاملات سے دور ہوچکے تھے۔ ان دنوں پاپا کو مما کے علاوہ کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا۔ اور عیسیٰ بھی ہمہ وقت اسپتال میں رہتا تھا۔ یہ وہی دن تھے جب پروفیسر نے مون حسیب کے گرد اپنی ہمدردیوں کا جال پھینک کر اسے اپنے بس میں کرلیا تھا۔

پروفیسر روزانہ ان کے گھر آجاتا تھا۔ وہ دو تین گھنٹے بیٹھتا اور مون سے ہر ٹاپک پر بات کرتا۔ یوں ہی باتوں، باتوں میں اس نے انتقالِ افکار کی برقی لہروں کے باعث مون سے بہت کچھ اگلوالیا تھا۔ وہ کم عمر اور نادان تھی۔ پروفیسر ایک گھاگ شکاری

تھا۔ وہ موں کی کچی کلی جیسی محبت کی بُو بھی پا گیا تھا۔ اپنے پاپا، بھائی، تایا اور ہونے والی بھابی کے لیے موں کی بیزاری، بدگمانی اور نفرت بھی جانچ گیا تھا پھر اس نے موں کے گرد اپنی ہمدردی کا جال پھینکا تھا۔ وہ پوری دنیا میں پروفیسر کے علاوہ کسی اور کو اپنا ہمدرد نہیں سمجھتی تھی حالانکہ اس کی چھٹی حس اپنا مخصوص خطرے والا الارم بجاتی رہی تھی اور یہ پہلی مرتبہ ہوا تھا جو اس نے چھٹی حس کے الارم پر کان نہیں دھرے تھے۔ حالانکہ یہ اللہ کی طرف سے اسے جو صلاحیت ملی تھی وہ اس کی زندگی کو امان میں رکھے ہوئے تھی۔ خطرات سے پہلے اسے الرٹ کرتی تھی اور اس کے اعصاب کو آنے والے حالات کے لیے پہلے سے تیار کر دیتی تھی مگر یہ پہلی مرتبہ ہوا تھا جو اس نے الارم کی آواز سن کر بھی اپنے کان بند کر لیے تھے۔ جس کا مطلب تھا، وہ کچھ سننا ہی نہیں چاہتی۔

پروفیسر کو گفتگو کا فن آتا تھا۔ وہ آنکھوں میں آنسو لا کر مریم کی طویل عمری کے لیے دعائیں کرتا۔ موں کے ساتھ بیٹھ کر دکھی ہوتا اور اس کی تنہائی پر افسوس کرتا تھا۔ مما کی بیماری کے مہینوں میں پروفیسر، موں کے دل میں اپنا ایک الگ مقام پا چکا تھا۔ اب وہ پروفیسر سے ہر قسم کا مشورہ کرنے لگی تھی اور گھر کی ہر بات اسے ضرور بتاتی تھی۔

عیسیٰ اور مما کے درمیان ہونے والی گفتگو کو اس نے پروفیسر سے شیئر کیا تھا اور پروفیسر کے مشورے پر ہی اس نے سوزن کو فون کھڑکا دیا تھا۔ دراصل پروفیسر نے اسے سمجھایا تھا کہ وہ سوزن کو عیسیٰ سے اظہارِ محبت کرنے پر مجبور کرے...... اس طرح سوزن بھی موں کو اپنا خیر خواہ سمجھے گی مگر جب موں نے سوزن کو نہایت محبت اور خلوص کے ساتھ مشورہ دیا تو وہ بھتھے سے ہی اکھڑ گئی۔ سوزن نے اس کی بات ماننے سے صاف انکار کر دیا۔

''عیسیٰ سے محبت اپنی جگہ...... مگر میں اپنی انا کو زمیں بوس نہیں کر سکتی۔'' سوزن کا جواب نہایت ٹھوس تھا۔ موں کو شدید غصہ آ گیا۔ اس پل اسے سوزن کی بکواس، انا، خودداری اور عزتِ نفس پر بھی شدید تاؤ چڑھا تھا۔

''تو پھر عیسیٰ کو گنوا دینا۔'' موں نے چیخ کر کہا۔

''وہ نصیب میں ہوا تو ضرور ملے گا۔'' سوزن کا یقین بھی ہلکا نہیں تھا۔ موں لال انگارہ ہو گئی تھی۔

''تمہارا صبر...... تمہیں لے ڈوبے گا۔ جانے کس خمار میں ہو تم...... خود سے کوشش نہیں کرو گی تو عیسیٰ تمہارے قدموں میں نہیں گرے گا۔'' موں کو زہر چڑھ گیا تھا۔ یہ پروفیسر کی پڑھائی پٹیاں تھیں جنہیں وہ دُہرا رہی تھی۔

''صبر کسی کو لے کر نہیں ڈوبتا...... کیسی سوچ ہے تمہاری، جانے کن لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے لگی ہو، پہلے تو ایسی نہیں تھیں۔'' سوزن جیسے حیرانی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ موں کی پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئیں۔

''میں پہلے بھی ایسی ہی تھی۔'' اسے غیظ چڑھ گیا تھا۔

''نہیں...... اب بدل گئی ہو......'' سوزن جیسے سوچ، سوچ کر بول رہی تھی۔ موں اسے موضوع سے ہٹتا دیکھ کر بگڑ کر بولی۔

''کام کی بات کرو، جو تم کرنا نہیں چاہتیں...... عیسیٰ کا رشتہ پاپا نے طے کر دیا ہے۔'' اپنے تئیں اس نے دھماکا کیا تھا مگر سوزن جیسے نارمل ہی رہی...... بڑے کمال کا صبر رکھتی تھی۔ ایک کلمہ پڑھ لیتی تو سیدھی جنتی ہوتی مگر اس نے کہا بھی تو کیا۔

''جانتی ہوں میں...... پر کیا کر سکتی ہوں۔'' پہلی مرتبہ اس کی آواز میں نمی بھر گئی تھی۔ موں کو جیسے حوصلہ ہوا۔

''بہت کچھ کر سکتی ہو...... اگر تم چاہتی ہو تو......'' موں کا لہجہ پُر جوش تھا۔ جیسے وہ سوزن کو بہترین حل بتانے والی تھی۔ دوسری طرف سوزن

ضبط کی گہری سانسیں کھینچ رہی تھی۔ اس محبت پر صبر کرنا آسان کہاں تھا؟

"کیا......؟" سوزن غائب دماغی سے بولی۔

"تم عیسیٰ سے کہو کہ تم اس کے بغیر نہیں رہ سکتیں اور تم خودکشی کرنے کا ارادہ رکھتی ہو۔" مون نے بڑا ٹھوس حل اسے بتایا تھا۔ وہ لمحے بھر کے لیے چپ سی کر گئی تھی۔ اس کی خاموشی نے مون کو کچھ اور شہ دی تھی۔

"عیسیٰ اتنا نرم دل ہے کسی کو اپنی وجہ سے تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔ تم مرنے کی دھمکی دو گی تو وہ آسانی سے مان جائے گا۔ مجھے یقین ہے۔" مون اسے نئی راہ دکھا رہی تھی۔ یہ راہ نسبتاً آسان بھی تھی...... صرف دھمکی تو دینا تھی۔ عمل تو نہیں کرنا تھا اور سوزن کو یقین تھا، یہ دھمکی بہت کارگر ثابت ہو سکتی تھی۔ عیسیٰ کا دل بڑا ہی نرم تھا۔ بہت نرم، سچا اور خالص دل...... وہ اپنی وجہ سے سوزن کو قبر میں کبھی نہ اترنے دیتا...... وہ مالا سے محبت بھلا کر سوزن سے شادی بھی کر لیتا پھر عمر بھر کبھی جتاتا بھی نہیں کبھی طعنہ بھی نہ دیتا...... مگر سوزن بھلا اپنے ضمیر کا کیا کرتی؟ جو اسے دن رات کچوکے لگاتا۔ راتوں کو سونے نہیں دیتا۔ ذہنی طور پر اسے بے آرام کرتا اور پھر سوزن بھلا عیسیٰ کے ساتھ سے کیا خوشی پاتی؟

"میں اسے خودکشی کی دھمکی نہ بھی دوں تب بھی تانتے (مریم) کی خاطر وہ مجھ سے شادی کے لیے رضامند ہو جائے گا۔ مگر کیا ہے مون کہ میں نے عیسیٰ سے خود شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے۔" بہت دیر مون کی تقریر سن لینے کے بعد سوزن نے گویا بم مون کے سر پر بلاسٹ کیا تھا۔ وہ جیسے ہکا بکا رہ گئی تھی۔

"تم نے انکار کر دیا...... تم پاگل تو نہیں؟" مون جیسے چیخ پڑی تھی۔

"میں پاگل نہیں......" وہ مطمئن تھی۔

"تو پھر کیا ہو......؟" مون کو پھر سے غیظ چڑھ گیا تھا۔ سوزن کی حرکتیں کبھی کبھی ناقابلِ برداشت ہو جاتی تھیں۔ وہ سوزن کے لیے اتنی محنت کر رہی تھی مگر سوزن......؟

"میں صرف اپنے اندر ضمیر رکھتی ہوں۔"

سوزن کے جواب نے مون کے منہ پر طمانچہ مارا تھا۔ وہ لمحے بھر کے لیے بھونچکی رہ گئی۔ اس سے کوئی اور بات نہیں بن پائی۔ بہت دیر کی خاموشی کے بعد وہ دھیرے سے بولی۔

"تم پاگل ہو یقیناً......" مون کی آواز سرگوشیانہ قسم کی تھی۔ سوزن کے لبوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔

"میرا جواب وہی ہے۔ سوزن باضمیر ہے۔" اس نے آنکھ کے کونے صاف کر لیے تھے۔ جب فیصلہ ہو چکا تو پھر پچھتانا کیسا......؟ اس نے اس محبت کو سر کا بھوت نہیں بنایا تھا شاید اسی لیے مطمئن تھی۔

"ہونہہ...... جھوٹ مت بولو...... تمہاری محبت ہی پانی کا بلبلہ ہے۔ دراصل اہلِ مغرب کی عورتوں کو محبت کرنا ہی نہیں آتا۔ اگر کرتی بھی ہیں تو محض ڈھکوسلا......" مون نے زہرخند ہو کر کہا تھا۔ کہاں تو عیسیٰ پر وہ جان وارتی تھی۔ اوائل عمری سے ہی چپکے چپکے اسے چاہنے لگی تھی۔ بہت سالوں سے عیسیٰ کے لیے اپنے من میں محبت کا جذبہ رکھے ہوئے تھی۔ اور اب ضمیر کا ٹنٹنا لگا کر جیسے جان چھڑوانے کی کوشش کر رہی تھی۔ شاید سوزن کی نظر کسی اور پر ٹک گئی تھی۔ وہ میکس وان یا پھر کوئی اور ایرا غیرہ...... جبھی تو آج نگاہیں بدل گئی ہیں۔ "لگتا ہے، سوزن نے کوئی اور تاڑ لیا ہے جو عیسیٰ سے بڑھ کر شاندار ہو گا......؟" یہ مون کے اپنے اندازے تھے جو کسی کیچڑ میں لتھڑے جوتے کی طرح ہی مون کے منہ پر آ پڑے تھے۔ اس کے کانوں نے سوزن کی آواز سنی تھی۔ وہ جیسے لمحے بھر کے لیے دم بخود رہ گئی۔

"میں عیسیٰ کی خاطر ہر قربانی دے سکتی ہوں...... میں علی عیسیٰ کی خاطر عیسیٰ اور مقدس انجیل کو

نہیں چھوڑ سکتی۔ عیسیٰ کہتا ہے میں اسلام قبول کرلوں جبکہ میں اسلام قبول نہیں کر سکتی۔ میرے اور عیسیٰ کے رستے جدا ہیں۔ ہم کبھی مل نہیں سکتے۔ اور میں اجنبی راہوں پر اندھا دھند دوڑنے والوں میں سے نہیں ہوں۔'' سوزن نے بہت ٹھوس، مفصل اور جامع جواب دیا تھا۔ مون جیسے اپنا سامنہ لے کر رہ گئی تھی۔

''جہنم میں جاؤ۔'' جب کچھ اور نہ سوجھا تو مون نے غیظ کے عالم میں فون بند کر دیا تھا۔

☆☆☆

سوزن کا معاملہ جہاں سے شروع ہوا تھا وہیں ختم ہوگیا۔ مریم نے سوزن کو بہت سمجھایا تھا مگر اس کی نہ ہاں میں نہیں بدلی تھی۔ وہ اپنے مذہب کو ہرگز نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ اس نے محبت کو مذہب پر قربان کر دیا تھا۔ وہ بواریا کی عام لڑکیوں سے بہت مختلف تھی، اس نے سپر لگژری لائف کو ٹھوکر ماردی تھی۔ اور گروسی کے باڑے میں اپنے لیے مصروفیت ڈھونڈلی...... چرچ کے علاوہ گروسی کا باڑا اس کی واحد پناہ گاہ تھا۔ وہ خود کو بھینسوں اور بکریوں کے ساتھ مصروف رکھتی۔

مون نے اپنے تئیں سوزن پر لعنت بھیج دی تھی، جب اسے اپنی محبت کا خود احساس نہیں تھا تو پھر مون کیوں کڑھتی...... مگر پروفیسر بشر نے اسے ہتھیار پھینکنے سے منع کر دیا تھا۔ پروفیسر کا خیال تھا، سوزن وقتی طور پر جذباتیت کا شکار ہے۔ جلد اسے اپنی غلطی کا ادراک ہو جائے گا مگر تب تک کوئی رستہ نہیں بچے گا۔ سو مون کو چاہیے وہ پتھر میں سوراخ کرتی رہے۔ اور سوزن کو عیسیٰ کے حوالے سے قائل کرلے...... مون نے اپنے کریہہ منصوبے کو پروفیسر سے بھی شیئر کیا۔ مالا اور عیسیٰ کی شادی کے بعد ان کی طلاق اور پھر عیسیٰ کو سوزن کی طرف مائل کرنا...... پلاننگ ایک دم مضبوط تھی۔ کہیں بھی جھول نہیں تھا۔ وہ یقیناً جلد کامیابی پا جاتے مگر ایک صبح اچانک مریم کا انتقال

ہوگیا۔ یہ صدمہ مون کے لیے بہت بھیانک تھا۔ وہ مہینوں ٹوٹ پھوٹ کا شکار رہی تھی باقی پاپا اور عیسیٰ پر کیا بیت رہی تھی۔ ایک بیٹی اور بہن ہونے کے ناتے بھی اسے مہینوں پتا نہ چلا...... عیسیٰ شدید بیمار پڑ گیا تھا۔ مما کی جدائی نے اسے ذہنی طور پر بہت ڈسٹرب کر دیا تھا۔ پاپا، مما کا غم بھول کر عیسیٰ کی فکر میں لگ گئے تھے مگر وہ سنبھلنے میں نہیں آرہا تھا۔ اسپتال سے گھر آکر سارا دن اپنے کمرے میں بند رہتا یا پھر اسٹوڈیو میں وقت گزارتا...... پاپا کے لیے عیسیٰ کی تکلیف بہت اذیت ناک تھی پھر انہوں نے عیسیٰ کا دل بہلانے کا یوں سامان کیا کہ اسے گروسی کی طرف بواریا بجھوا دیا تھا۔ خود وہ اتنے مہینوں بعد دفتر کیا گئے کہ پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے تھے۔ اگرچہ وہ مون سے بے نیاز ہرگز نہیں تھے مگر مون خود ہی ان سے کترائی کترائی رہتی تھی۔ باپ سے ایسی بدگمان ہوئی کہ دوبارہ ان کے قریب آہی نہیں سکی تھی۔ وہ بھی خسارے میں جاتے کاروبار کے غم میں گھلنے لگے تھے۔ عدم توجہی کے باعث کاروبار میں خاصا نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ بزنس کی فکر نے انہیں گھر سے دور نہیں کیا تھا۔ وہ مون کے لیے دن میں کئی مرتبہ فون کرتے تھے۔ نینی سے پورے دن کی رپورٹ لیتے...... مون کیا کرتی ہے؟ اسکول سے کب آتی ہے؟ اور گھر میں تعزیت کے لیے کون، کون آرہا ہے؟ گھر اور کاروبار کو ایک ساتھ دیکھنا بہت مشکل تھا مگر پھر بھی زندگی کی گاڑی آگے بڑھنے لگی تھی۔

یہ وہی حالات تھے جب مون نے پروفیسر سے باقاعدہ بات چیت کا آغاز کرلیا تھا۔ پروفیسر کبھی کبھار گھر بھی آجاتا۔ مگر مون نے نینی کو سختی سے منع کر رکھا تھا کہ پاپا کو پروفیسر کے متعلق کچھ نہیں بتانا۔ وہ نینی کا منہ نوٹوں سے بھر دیتی تھی سو نینی بھی لالچ میں آکر پاپا سے بہت کچھ چھپا لیتی۔

عیسیٰ ابھی تک بواریا میں تھا...... اس کا دل

گروسی کے گھر میں خوب لگتا تھا۔ پھر گروسی ہمہ وقت مریم کی باتیں کرتی رہتی تھیں...... ”میری ایسی تھی، میری کو یہ ناپسند تھا، میری بہت باہمت لڑکی تھی، وہ شادی سے پہلے میرے ساتھ بوریا میں بہت کام کرتی تھی...... چھٹیوں میں گھر آتی اور میرے مہینے بھر کے کام کرجاتی۔“ گروسی کے لیے بھی بیٹی کی جدائی کا صدمہ معمولی نہیں تھا۔ وہ مریم کی یاد میں آبدیدہ رہتیں...... عیسیٰ بھیگی آنکھوں کے ساتھ مما کی باتیں سنتا رہتا تھا۔ اس کا دل چاہتا، وہ ہر وقت مما کی باتیں کرے...... مما کی باتیں سنے...... کبھی کبھار تانتے بھی گفتگو میں حصہ لے لیتی۔ تانتے شوہر سے علیحدگی کے باعث اب مستقل یہیں آچکی تھی۔

سوزن کا رویہ البتہ بہت مختلف تھا۔ وہ روزمرہ کام سرانجام دیتے ہوئے چپکے، چپکے علی عیسیٰ کو دیکھتی رہتی۔ عیسیٰ کی بھیگی آنکھیں...... ضبط کی شدت سے سرخ چہرہ سوزن کو بہت اذیت میں مبتلا کر دیتا تھا۔ اس کا دل چاہتا، وہ کوئی ایسا گیت گائے، کوئی ایسا نغمہ سنائے کہ علی عیسیٰ کی آنکھوں میں مسکراہٹ بھر جائے...... مگر اس کی یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہوسکتی تھی۔ اس کی یہ خواہش ہمیشہ ادھوری ہی رہی۔

ایک دن آبشار کی طرف جاتے ہوئے پھولوں کے کھیت میں سے گزرتی سوزن نے عیسیٰ سے سوال پوچھا۔

”کیا مالا نے تمہیں میری تانتے کی وفات کے لیے تعزیتی فون کیا......؟“ وہ دونوں پھولوں کی مختلف قسموں پر بات کررہے تھے۔ وہ بلب کی شکل کے ٹیولپ کو دیکھ رہا تھا جب سوزن نے موضوع کے برخلاف اِک انوکھی بات کہی تھی۔ تب عیسیٰ قدرے حیران رہ گیا تھا۔

”نہیں تو......“ وہ جو آبشار کی گھنٹیاں بجاتی آواز سن رہا تھا ایک دم ٹھٹک سا گیا۔ ”ہماری کون سا کبھی بات ہوئی ہے جو وہ مجھے فون کرتی۔“ عیسیٰ کو وضاحت دیتے ہوئے اپنا لہجہ کھوکھلا سا لگا تھا۔ کیا مالا کو اسے فون کرنا چاہیے تھا؟ آخر وہ اس کی منگیتر تھی...... اور مما کی وفات کا ایک تعزیتی فون تو کر دیتی، اس کا حق یا فرض تو بنتا تھا مگر اس نے شاید ضروری نہیں سمجھا ہوگا۔ باقی لوگوں نے تو فون کیے ہی تھے مگر مالا کی طرف سے کوئی خصوصی کال نہیں آئی تھی۔ وہ چاہے دوبارہ کبھی بات نہ کرتی مگر ایک مرتبہ مما کے لیے تو ضرور کرتی؟ عیسیٰ کے ذہن میں بھی یہ سوچ بالآخر ابھر آئی تھی...... اگرچہ سوزن کا مقصد اسے مالا سے بدگمان کرنا نہیں تھا۔ وہ تو صرف یہ جاننا چاہتی تھی کہ آیا عیسیٰ اور مالا کے درمیان کوئی ٹیلی فونک رابطہ ہے یا نہیں......؟

”تو کیا خط بھی نہیں لکھا؟ فون کرتے ہوئے شاید وہ شرماتی ہو۔ مگر خط تو ضرور لکھتی۔“ سوزن نے بے پروائی سے ٹیولپ کے ڈھیروں پھول بڑے سے ٹوکرے میں رکھتے ہوئے کہا تھا۔ وہ مشین کے ذریعے پھولوں کی کٹائی کررہی تھی۔ کچھ دیر بعد ٹرک آجاتا اور پھر انہی پھولوں کو مختلف کیمیکل لگا کر سائنٹیفک طریقے سے محفوظ کر کے مختلف شہروں اور ملکوں میں بھیجا جاتا تھا۔ وہ اپنے کام میں بہت مصروف تھی تاہم اس کا دھیان عیسیٰ کی طرف بھی ضرور تھا۔ جو ایک دم ذرا گم صم سا ہو گیا تھا۔ سوزن کو کچھ افسوس ہوا۔ اس نے مالا کا ذکر کر کے عیسیٰ کو افسردہ جو کر دیا تھا۔

”اچھا، یہ بتاؤ، واپس کب جاؤ گے؟“ سوزن نے فی الفور گفتگو کا موضوع بدل دیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا، اس نے عیسیٰ کو دکھی کر دیا ہے۔ وہ خود کو ملامت کررہی تھی۔

”لگتا ہے، تم بیزار ہو چکی ہو مجھ سے۔“ عیسیٰ پھیکے سے لہجے میں مسکرا رہا تھا۔ حقیقتاً مالا کے متعلق سوچتے ہوئے وہ کچھ ڈسٹرب ہو گیا تھا۔ یعنی مالا کے نزدیک اس کی اتنی بھی امپورٹنس نہیں تھی؟ پھر عیسیٰ نے سوچا، کیا خبر...... وہ شرماتی ہو...... اور پاکستان

میں شادی سے پہلے فیانسی (منگیتر) سے بات کرنے کو برا خیال کیا جاتا ہو۔

''ایسی بات تو نہیں...... میں تو مون کے خیال سے کہہ رہی ہوں...... وہ آج کل بہت عجیب ہو چکی ہے۔'' سوزن نے مون کا ذکر چھیڑ کر علی عیسیٰ کو.... بے قرار کر دیا تھا۔ اپنے صدمے میں گم وہ مون کو تو یکسر بھول چکا تھا۔ آخر مون کا غم بھی تو کم نہیں تھا۔ نہ جانے وہ کس حال میں ہوگی......؟ کیا کرتی ہوگی؟ وہ تو جیسے لمحوں میں بے تاب ہو گیا تھا۔

''میں آج واپس جا رہا ہوں......'' اس نے کھڑے، کھڑے جیسے فیصلہ کر لیا تھا۔ سوزن قدرے متفکر ہوئی۔

''اتنی جلدی......؟ میں نے تو ایسے ہی ایک بات کہی تھی۔ تم ابھی کچھ دن تو رہو......'' سوزن نے نرمی سے کہا تھا۔ وہ اس کی بات سن کر اچانک تیار ہو جائے گا، یہ تو سوزن نے نہیں چاہا تھا۔

''نہیں، مجھے گھر جانا ہے۔ نہ جانے مون کس حال میں ہوگی؟'' وہ بے قرار سا گھر کی طرف چلنے لگا تھا۔ سوزن مشین بند کر کے اس کے پیچھے بھاگی آئی تھی مگر عیسیٰ پھر بھی رکا نہیں تھا۔ حتیٰ کہ گروسی اور تانتے نے بھی اسے بہت روکا تھا مگر وہ اسی سہ پہر گھر چلا آیا تھا۔ سارے رستے بھی مون کے لیے سوچتا رہا تھا۔ اس کی چھوٹی بہن مما کے بعد کتنی اکیلی تھی اور وہ اپنے صدمے میں گم اس کی فکر بھلائے بوار یا کی... ہریالیوں میں ماں کی یادیں ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ حالانکہ زندہ لوگوں کو اس کی زیادہ ضرورت تھی۔ پاپا جو مما کے بعد بکھر گئے تھے اور خود کو سنبھالنے کے بجائے عیسیٰ کے غم میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اسے اچانک پاپا کی تنہائی اور مون کے اکیلے پن کا احساس بے قرار کر گیا تھا۔ اگر سوزن احساس نہ دلاتی تو وہ ابھی تک اپنے صدمے میں ہی مگن رہتا۔ اسے اب خیال آ رہا تھا۔ پاپا اور مون کو اس کی کس قدر ضرورت تھی اور وہ ان کو سنبھالنے کے بجائے خود بھی جیسے بوجھ بنا پھر رہا تھا۔

انہی سوچوں کے درمیان الجھتا جب وہ گھر پہنچا تو پہلا ٹاکرا نینی سے ہوا تھا۔ جو عیسیٰ کو دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔ جیسے اسے عیسیٰ کے چلے آنے کی امید نہیں تھی۔ عیسیٰ اس کی گھبراہٹ کو نظر انداز کرتا آگے بڑھا تو لاؤنج سے آتی پروفیسر کی بلند آواز پر ٹھٹک گیا۔

''یہ پھر یہاں آیا ہوا ہے......؟'' عیسیٰ کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ دراصل پروفیسر کو دیکھ کر اسے پہلے بھی اتنا ہی غصہ آیا کرتا تھا مگر تب وہ مروتاً خاموش ہو جاتا۔ مگر اس وقت پروفیسر کو دیکھ کر اس کا بھڑک جانا فطری عمل تھا۔ پاپا اور عیسیٰ کی غیر موجودگی میں اول تو وہ آتا ہی نہیں...... آیا بھی تھا تو پاپا کو نہ پا کر واپس چلا جاتا۔ مون کے پاس بیٹھنے کی اسے ضرورت کیا تھی؟ اور پھر مون نے اسے بٹھایا ہی کیوں تھا؟ وہ جانتی بھی تھی کہ پاپا اور عیسیٰ دونوں کو پروفیسر سے سخت نفرت ہے۔ وہ پروفیسر لشتر کے لسوڑے سے جان چھڑاتے پھر رہے تھے۔ اور مون نے اسے گھر بٹھا رکھا تھا پھر بھلا عیسیٰ کو غصہ کیوں نہ آتا۔

''تمہیں منع بھی کیا تھا، تم پھر منہ اٹھا کر پہنچ گئے ہو۔'' عیسیٰ نے غضبناک تیور لیے پروفیسر کو گھورا تھا۔ وہ ایک دم بوکھلا کر صوفے سے اٹھ گیا۔ اسے امید نہیں تھی، علی عیسیٰ اچانک آ جائے گا۔ تبھی شدید گھبراہٹ میں مبتلا ہو گیا تھا۔

''میں مون کی خبر گیری کرنے آیا ہوں...... بیچاری ماں کے بعد بہت اکیلی ہو گئی ہے۔'' پروفیسر نے مون کے لیے گہری ہمدردی جتائی تھی جبکہ اس کے الفاظ نے عیسیٰ کو اور بھی آگ بگولا کر دیا تھا۔

''بکواس بند کرو اپنی...... مون کی خبر گیری کے لیے اس کا بھائی اور باپ ابھی زندہ ہے۔ سو تمہیں تردد کرنے کی ضرورت نہیں...... نکلو میرے گھر سے۔'' عیسیٰ کا چہرہ لال بھبھوکا ہو چکا تھا۔ اس نے پروفیسر کا گریبان

پکڑ کر اسے زور سے جھٹکا دیا تھا۔ پروفیسر اپنا توازن برقرار نہیں رکھ پایا تھا۔ تبھی منہ کے بل گر پڑا۔ عیسیٰ نے جھک کر اس کی کمر پر مکا رسید کیا تھا۔

''اب دوبارہ اپنی شکل دکھائی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔'' پروفیسر کی جھکی کمر پر لاتیں، گھونسے اور مکے رسید کر کے وہ ہانپنے لگا تھا۔ دراصل پروفیسر توازن برقرار نہ رکھ سکنے کی وجہ سے اب اپنا بچاؤ بھی نہیں کر پایا تھا اور عیسیٰ کے ہاتھوں بری طرح سے پٹ رہا تھا۔ صورتِ حال کچھ ایسی تھی کہ مون دم بخود رہ چکی تھی۔ وہ عیسیٰ کو روکنا چاہتی تھی مگر روک نہیں پائی۔ بے بسی کے عالم میں پروفیسر کی دُرگت بنتی دیکھ رہی تھی۔

''اپنا یہ شیطانی وجود لے کر یہاں سے گم ہو جاؤ۔ دوبارہ کبھی مجھے کہیں بھی دکھائی مت دینا۔'' عیسیٰ کو جنون چڑھ گیا تھا سو پروفیسر کا بچنا مشکل تھا۔ وہ پروفیسر کو گھسیٹتا ہوا باہر لے آیا۔ تب پروفیسر بھی جوابی حملے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو مکے اور گھونسے مارے تھے مگر پروفیسر کو چونکہ زیادہ چوٹیں لگی تھیں تبھی وہ جلدی نڈھال ہو گیا تھا۔

''تم نے اچھا نہیں کیا عیسیٰ...... میں تمہارا وہ حشر کر دوں گا، تمہیں پاگل کر دوں گا...... تمہیں بھی اتنا ہی ذلیل کروں گا جتنا تم نے مجھے کیا......'' وہ خون آلود ناک کو پکڑے ہوئے دہاڑ رہا تھا۔ جیسے کسی زخمی کتے کی طرح بھونک رہا تھا۔ عیسیٰ نے اسے ٹھوکریں مار، مار کر سڑک پر پھینک دیا تھا۔

''یہ ذلت تمہیں ہمیشہ یاد رہے گی۔ ولیس ہاؤس کی طرف اب کبھی قیامت تک رخ نہ کرنا۔'' عیسیٰ اپنی شرٹ جھاڑتا پروفیسر پر تھوک کر اندر چلا گیا تھا جبکہ پروفیسر باہر آدھا گھنٹا بھونکتا رہا۔

''اس ذلت کو میں کبھی بھلاؤں گا نہیں...... اور تمہیں بھی اتنا ہی ذلیل کروں گا۔'' پروفیسر خون کی تھوکیں سڑک پر پھینکتا رہا۔ ''تو میری دی گئی ذلت کو عمر بھر نہ بھول پائے گا۔'' پروفیسر چیخ، چیخ کر نکل گیا تھا جبکہ علی عیسیٰ اپنے ہاتھ جھاڑتا اندر آ گیا۔ جہاں مون خونخوار تیور لیے بیٹھی تھی۔ اس کے انداز بہت غیظ بھرے تھے۔ جیسے وہ عیسیٰ پر پھٹنے ہی والی تھی۔

''تم نے گھر آئے مہمان کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔'' مون نے خون رنگ آنکھیں علی عیسیٰ پر جما دی تھیں۔ جو بڑے برہم تیور لیے مون کو گھورنے لگا تھا۔ اسے مون کا پروفیسر کی حمایت میں بولنا آگ بگولا کر گیا تھا۔

''اسے مہمان کون کہتا ہے؟ وہ تو شیطان ہے...... ایک دم ذلیل، پاپا نے تو انسان سمجھ کر انسانیت کی خاطر مدد کی تھی اس کی اور وہ تو شیطان نکل آیا......'' عیسیٰ نے غیظ کے عالم میں وضاحت کی تھی۔

''تم نے اسے مار کر اچھا نہیں کیا...... وہ پولیس کو بلوا لے گا۔'' مون اسے دھمکا رہی تھی۔ یعنی اپنے بھائی کو دھمکا رہی تھی۔

''تو بلوا لے...... مجھے پروا نہیں...... اور اب ایک بھی لفظ پروفیسر کی حمایت میں مت بولنا...... ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔'' وہ دہاڑ کر مون کو خبردار کر رہا تھا مگر مون بھلا سمجھنے والی کہاں تھی؟ عیسیٰ کے الفاظ اسے آگ بگولا کر گئے تھے۔

''تم کیا کر لوگے؟'' مون نے بے خوفی کے عالم میں عیسیٰ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال لی تھیں۔ عیسیٰ کو جیسے دھچکا لگا تھا۔ مون کی بدلحاظی اسے ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔

''میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔'' عیسیٰ نے زہر خند لہجے میں کہا۔ وہ صرف اسے خاموش کروانا چاہتا تھا مگر مون......

''اور میں تمہارے ہاتھ توڑ دوں گی۔'' مون ایک مرتبہ پھر اسے دم بخود کر چکی تھی۔ اس کے الفاظ نے عیسیٰ کو ٹھٹھرا کر رکھ دیا۔

''کیا بکتی ہو؟ تمہیں ذرا شرم، لحاظ نہیں......

میں تمہارا بڑا بھائی ہوں۔'' عیسیٰ کا ہاتھ غصے اور جذباتیت کی انتہا میں اٹھ گیا تھا اور مون جیسے پتھر کا مجسمہ بن گئی تھی۔ اس کی لمحے بھر کے لیے سانس تک رک گئی تھی۔ کیا عیسیٰ نے اس پر ہاتھ اٹھایا تھا؟ اسے مارا تھا؟ کیوں......؟ کس لیے؟ وہ جیسے صدمے اور نفرت کے جذبات سے راکھ ہوگئی تھی۔ مما کے بعد اس پر یہ بھی وقت آنا تھا؟ آج ایک تھپڑ مارا تھا، کل کئی تھپڑ مارنے لگتا...... عیسیٰ کا ہاتھ جیسے کھل گیا تھا اور مون کی زبان بھی کھل گئی تھی۔

''میں اسی طرح بکتی رہوں گی، اب مجھ پر ہاتھ اٹھایا تو پولیس کو بلوالوں گی...... جہاں تک پروفیسر کا تعلق ہے تو وہ یہاں آتا رہے گا۔ وہ میرا اتالیق ہے اور میں عنقریب اس سے ہیومن سینس اور اسٹرانگ پاور کا علم لوں گی۔ تم کون ہوتے ہو مجھے روکنے والے......؟'' مون نے جیسے بے خوفی کے عالم میں عیسیٰ کو منہ توڑ جواب دیا تھا، وہ جیسے گم صم رہ گیا۔ بہت دیر تک اس سے کچھ بولا نہیں گیا تھا۔ آخر مون کو ہوا کیا تھا؟ مما کے بعد اس کا دماغ صدمے سے چل تو نہیں گیا تھا؟ سوزن بھی ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ مون بہت عجیب ہو چکی تھی۔

''تم پروفیسر سے نہیں ملوگی...... یہ میرا حکم ہے...... تمہارے بڑے بھائی کا حکم......'' بہت دیر بعد جیسے عیسیٰ نے سنبھل، سنبھل کر بہ مشکل کہا تھا۔ دراصل مون کی بے خوفی نے اسے اندر سے سہا دیا تھا۔ وہ بظاہر بہت مضبوط نظر آرہا تھا مگر درحقیقت وہ اندر سے ٹوٹ گیا تھا۔ یہ مون اس کی بہن تو نہیں تھی، یہ تو کوئی سرکش، باغی اور خودسر لڑکی تھی جسے کم از کم علی عیسیٰ نہیں جانتا تھا۔ وہ تو کوئی اور ہی روپ لیے اس کے سامنے کھڑی تھی۔

''ٹھیک ہے...... میں پروفیسر سے نہیں ملوں گی...... پر تم بھی مالا سے منگنی توڑ کر سوزن سے شادی کروگے......'' مون نے ترپ کا پہلا پتا پھینک دیا تھا...... اب وہ عیسیٰ کی تڑپ کا مزہ لے رہی تھی۔ دراصل پروفیسر سے ہر بات شیئر کرنے کا ایک فائدہ تو یہ ہوا تھا اسے موقع کی مناسبت سے پتے کھیلنے کا فن ضرور آگیا تھا۔

''کیا بکواس ہے یہ؟ یہاں مالا کا کیا ذکر......؟'' عیسیٰ بھونچکا رہ گیا تھا۔ اسے مون کے دماغ چل جانے کا اب پورا یقین ہو چکا تھا۔

''مالا کا ذکر تو ضروری ہے، تم مالا کو بھول جاؤ، میں پروفیسر کی بات نہیں کروں گی...... تم سوزن سے شادی کرلو۔'' اس نے دوسرا پتا بھی آرام سے پھینک دیا تھا۔ وہ عیسیٰ کی متغیر رنگت کو دیکھ کر لطف اندوز ہورہی تھی۔ جیسے اس کھیل کا مزہ تو اب ہی دوبالا ہوا تھا۔

''سوزن سے کیسے شادی کرلوں؟ تم جانتی تو ہو......'' وہ برہم ہوکر چیخا تھا۔

''اپنی شرط واپس لو...... ضروری نہیں سوزن اسلام قبول کرلے...... یہاں کتنے پاکستانیوں نے عیسائی اور یہودی لڑکیوں سے شادی کررکھی ہے۔ تم بھی کرلوگے تو قیامت نہیں آجائے گی۔'' مون بھی جیسے پھنکاری تھی۔

''جتنی تمہاری عمر ہے، بس اتنی بات کیا کرو، میں پاپا کو بتاؤں گا۔ تم تو پاگل ہو چکی ہو۔'' عیسیٰ کو پھر سے غیظ چڑھ گیا تھا۔ مون کی بکواس اس کا دماغ پھر سے گرما گئی تھی۔ آخر مون کو ہوا کیا تھا؟ یہ خناس اس کے دماغ میں کس نے بھرا تھا؟ اس کے بیوار یا رہنے کے دوران آخر اِدھر کون سا انقلاب آیا تھا جو مون سرتاپا بدل گئی تھی۔ اتنی بدزبان، سرکش، باغی اور خودسر ہو چکی تھی۔ عیسیٰ کو لگا، اس کے دماغ کی کوئی شریان تو ضرور پھٹ جائے گی، اگر مون اس کے سامنے رہی تو یا وہ خود کو مار ڈالے گا یا مون کا گلا گھونٹ دے گا۔ فی الوقت اس کے دماغ پر ایسی ہی گرمی چڑھ رہی تھی۔

''تم پاپا کو کچھ مت بتاؤ...... یہ ترددو میں خود کر چکی ہوں اور اگر تم بھی میری بات مان کر سوزن سے شادی نہیں کرو گے تو پھر میرا فیصلہ بھی اٹل ہوگا۔'' مون نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

''یہ ممکن ہی نہیں......'' علی عیسیٰ نے مستحکم اور ٹھوس لہجے میں اپنی بات مکمل کی تھی...... اور مون حبیب جیسے اس کے آس پاس ایٹمی دھماکے کرتی تک، تک کی آواز پیدا کیے ہمیشہ کے لیے چلی گئی تھی۔

''تو پھر پاپا کو بتا دینا...... میں یہ گھر چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ مجھے ایسی جگہ پر نہیں رہنا۔ جہاں میری کسی خواہش کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہو۔ جہاں میری بات کو رد کر دیا جائے۔'' وہ ساڑھے سولہ سال کی عمر میں ایک معمولی بات کو پہاڑ بنا کر اپنے باپ کا گھر چھوڑ گئی تھی۔ گھر تو اسے ہر صورت چھوڑنا تھا۔ کیونکہ وہ اس گھر میں کبھی رہنا ہی نہیں چاہتی تھی جہاں ذی شاہ کی بہن راج کرنے عنقریب آنے والی تھی۔

ذی شاہ جو اس کے دل کا ناسور تھا، اس کی پہلی محبت تھا اور جسے خبر ہی نہیں تھی، من ہائیم کی مون حبیب اس کے عشق میں خود کو فنا کرنے والی تھی۔ اور پھر تاریخ گواہ تھی مون حبیب نے اپنے دل کے زہر کدے میں خود کو ڈبو کر فنا بھی کر لیا تھا۔

اس نے بڑی عجیب سی محبت کی تھی۔ کروڑوں لوگوں کی دنیا میں وہ ایک عجیب لڑکی پیدا ہوئی تھی اور اس عجیب لڑکی نے اپنی زندگی کے ساتھ بھی بڑے عجیب و غریب معاملے کیے تھے۔ بڑے عجیب و غریب کھیل کھیلے تھے۔ وہ عجیب تھی تو اس نے کچھ نہ کچھ عجیب ہی کرنا تھا۔

☆☆☆

پھر یوں ہوا کہ مون حبیب ہمیشہ کے لیے اپنا گھر چھوڑ آئی تھی۔ اس کا پہلا پڑاؤ گروسی کا مکان تھا۔ وہ اپنا سامان اٹھا کر یہیں چلی آئی تھی۔ اگر چہ تانتے، گروسی اور سوزن نے اسے بہت سمجھایا تھا۔

پھر پاپا اور عیسیٰ اسے منانے کے لیے آئے تھے۔ حتیٰ کہ عیسیٰ نے کئی مرتبہ فون کر کے معافی بھی مانگی تھی...... مگر مون نے پھر ایسا دل کو پتھر کیا کہ کسی نرمی، آنسو اور محبت نے اس کے دل کو پگھلایا نہیں تھا۔ وہ فیصلہ کر کے آئی تھی پھر اس فیصلے کو پاپا کی التجائیں تک اکھاڑ نہیں سکی تھیں۔ پاپا اور عیسیٰ کئی مرتبہ آئے اور ہر دفعہ مایوس ہو کر چلے گئے تھے۔ مون کی نہ ہاں میں نہیں بدلی تھی۔

وہ اپنے باپ اور بھائی سے ایسی بدگمان ہوئی کہ دوبارہ اس نے اپنا دل صاف ہی نہیں کیا تھا۔

ویسے بھی اب سفر کچھ پالینے کے لیے تھا۔ پروفیسر نے اسے بڑے خوش آئند خواب دکھائے تھے اور وہ نئے، نئے جہان فتح کرنے کی کوشش میں مختلف ایڈونچرز کرتی رہی...... اس کی نیچر میں تجسس تھا، اس کی جبلت میں بے چینی تھی۔ اس کے اندر کچھ مقناطیسی قوتیں اور دنیا کو تسخیر کرنے کا جذبہ تھا۔ پروفیسر نے دراصل اسے اندر تک کھوج نکالا تھا۔ اس نے ایک ہیرے کی بالکل ٹھیک پہچان کی تھی۔ وہ مون حبیب کی پرکھ میں سو فیصد کامیاب ہوا تھا۔ اسے جیسا اپنا گوہر مقصود مل گیا تھا۔

بواریا کے ہی ایک علاقے میں پروفیسر کی چھوٹی سی اکیڈمی تھی جسے مون کے تعاون سے وہ گروسی کے گاؤں میں اٹھا لایا تھا۔ بیدی ٹونگ کے نام سے اس ادارے کو پروفیسر بڑی کامیابی کے ساتھ چلا رہا تھا۔ بظاہر یہ ایک لینگویج انسٹی ٹیوٹ تھا مگر اس کنویں میں اترنے کے بعد مون کو اندازہ ہوا تھا کہ بیدی ٹونگ بالآخر ہے کیا......؟

یہ مون کے لیے بڑی ہی دلچسپ دنیا تھی۔ ایک الگ سا جہان تھا۔ بڑی مختلف سی زندگی تھی۔ یہاں سیکھنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ وہ حیران کچھ اس لیے بھی تھی کہ اس نے جو یہاں دیکھا، جانا اور سیکھا تھا وہ کہیں بھی نہیں تھا نہ کسی اسکول میں نہ کسی تعلیمی

ادارے میں۔

پروفیسر نے مون سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ پارٹنر شپ کرلے...... وہ بلڈنگ کو خریدنا چاہتا تھا۔ اور اس کے پاس اتنا سرمایہ نہیں تھا...... مون کو پروفیسر کی بات پسند آئی تھی۔ وہ کسی بھی ادارے میں کام ضرور کرتی مگر مالکانہ حقوق کے ساتھ...... اگر پاپا کی ہیر لخ عیسیٰ کے لیے تھی تو مون بھی بیدی نونگ کے ذریعے اپنا ایک الگ نام اور مقام بنانا چاہتی تھی اور اسی مقصد کے تحت اس نے پاپا سے براہِ راست بات کرلی تھی۔

''مجھے آپ کی پراپرٹی میں اپنا حصہ چاہیے......''
مون نے اگلے ہی دن پاپا کو فون کھڑکایا تھا۔ اگرچہ بات غلط نہیں تھی...... مگر اس کا طریقہ کار سراسر غلط تھا...... حسیب احمد کو جیسے دھچکا سا لگا۔ پہلے وہ گھر چھوڑ گئی تھی اور اب پراپرٹی میں حصہ مانگ رہی تھی۔ وہ کیوں نہ اپ سیٹ ہوتے...... انہیں لگتا جیسے مریم کے چلے جانے کے بعد ان کی زندگی میں بدبختی نے اودھم مچادیا تھا۔ جیسے سارا سکون و چین اور سکھ وہ اپنے ساتھ ہی سمیٹ کر لے گئی تھی۔ ان کے پاس سوائے بے سکونی، دکھ اور صدمات کے کچھ نہیں بچا تھا۔

''میرا سب کچھ تم دونوں کا تو ہے......'' بہت دیر کی خاموشی کے بعد وہ یہ مشکل بول پائے تھے۔ حالانکہ یہ شاک اتنا معمولی نہیں تھا جو وہ سنبھل پاتے مگر پھر بھی انہوں نے مون کو جواب دیا تھا۔ اگرچہ بولنا ان کے لیے آسان ہرگز نہیں تھا۔ ان کی بیٹی کیسے ان کے برابر آ کھڑی ہوئی تھی۔ انہیں یقین نہیں آیا تھا۔

''آپ صرف میری بات کریں...... مجھے حصہ دے رہے ہیں یا نہیں......؟'' مون نے انتہائی بدتمیزی کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ سنبھلتے سنبھلتے بھی ڈھے گئے تھے۔

''یہ تم کس لہجے میں بات کررہی ہو......؟'' پاپا کا لہجہ مدھم ہوگیا تھا۔ سینے کے بائیں جانب سے اچانک ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔ ان کا پورا وجود پسینہ، پسینہ ہوگیا تھا۔

''میری بات کا جواب دیں......فضول بات نہ کریں۔ میرے پاس وقت نہیں......'' مون نے انتہائی خود سری سے کہا تھا۔ پاپا جیسے بالکل ختم ہوگئے تھے۔ کیا یہ ان کی بیٹی مون ہی تھی؟

''میں تمہیں حصہ ضرور دوں گا...... مگر تمہاری شادی کے بعد......'' بہت دیر سوچنے کے بعد انہیں یہ مشکل جواب سوجھا تھا۔ اور مون دوسری طرف بھڑک اٹھی تھی۔

''مجھے آپ کی شرط منظور نہیں......'' وہ دہاڑ کر بولی تھی۔ مون بہت دھیما مزاج رکھتی تھی پھر اسے اب کیا ہوا تھا؟ اس میں اتنی تبدیلیاں کیسے آگئیں......؟ کیا ماں کی جدائی نے اس کے ذہن پر برا اثر ڈالا تھا؟ وہ جتنا بھی سوچتے، اتنا ہی الجھتے...... مون انہیں کس دوراہے پر لے آئی تھی؟ وہ ان کے لیے آزمائش کیوں بن رہی تھی؟ وہ ان کے لیے امتحان کیوں بن رہی تھی؟ اور حسیب احمد تو جانتے ہی نہیں تھے، وہ ان کے لیے سزا ہی تو بن رہی تھی۔

مون کی یہ فون کال ان کے پہلے ہارٹ اٹیک کا سبب بنی تھی مگر وہ اتنی کٹھور تھی کہ سن کر بھی علی عیسیٰ کے بے حساب اصرار پر بھی باپ کو دیکھنے نہیں آئی تھی۔ باپ کی بیماری کا سن کر بھی اس کا مطالبہ ختم نہیں ہوا تھا۔ پروفیسر نے کہا تھا، وہ اپنا حق کبھی نہ چھوڑے...... اور مون نے پروفیسر کی یہ بات بھی گرہ میں باندھ لی تھی۔

پھر جب وہ بیدی نونگ میں مالکانہ حقوق کے ساتھ داخل ہوئی تو اس کا دماغ کچھ اور آسمان پر چڑھ رہا تھا۔ بیدی نونگ ایک سرسبز و شاداب اور پُراسرار دنیا تھی۔ جو اس دنیا میں ایک مرتبہ داخل ہوجاتا تو پھر عمر بھر نہ نکل پاتا۔ دراصل یہ ـــ

پُراسراریت کی دلدل تھی جو اس میں جتنا اترتا، اسی قدر دھنستا چلا جاتا۔

وہ یہاں کچھ سیکھنے کے لیے آئی تھی۔ کچھ حاصل کرنے کے لیے آئی تھی۔ اس نے زمانے میں اپنی ایک الگ پہچان بنانی تھی۔ ایک مختلف مقام بنانا تھا۔ خود کو بہت اعلیٰ اور بلند مقام پر دیکھنا تھا۔ اسے سراہے جانے کا نشہ تھا۔ انفرادیت پر وہ جان دیتی تھی اور خود کو نکولس جیسی پہچان، عزت و مرتبے تک پہنچانا چاہتی تھی۔

وہ پُراسراریت کی ایک عظیم الشان دنیا میں پہنچ گئی تھی۔ بیدی نونگ خوابوں کا سرسبز کھیت تھا...... جس میں ذہانت، علم اور سوچ کی فصل کاشت ہوتی تھی۔ بیدی نونگ میں بڑے اعلیٰ شاہکار موجود تھے۔ وہ لوگ جو آنکھوں سے گفتگو کرتے تھے اور مقابل کی سوچ تک میں گھس جاتے ...... مقناطیسی نگاہوں سے اندر تک کھوج لیتے۔ برقی لہروں سے دماغوں میں گھس جاتے تھے۔

بیدی نونگ میں اعلیٰ ذہانت کی، اعلیٰ سوچ اور حد درجہ صحت مند دماغ کی اعلیٰ فصل تیار ہوتی تھی۔ جیسے سفید دھنکی ہوئی روئی سے تصوراتی مجسمے تیار کرنا اور پھر ان مجسموں سے برقی لہروں کے ذریعے کسی بھی انسان کے اندر تک اتر جانا...... دراصل یہ کام معمولی ذہنوں کا نہیں تھا۔ یہاں صحت مند، تروتازہ اور بہترین لہریں چھوڑنے والے دماغ تھے۔ ایسے اعلیٰ دماغ جو مثبت رخ پر بہتے تو جارج کی طرح ائیر بریک، کارل بینز کی طرح آٹو موبائل، نکولس کی طرح نظامِ شمسی، جان ڈالٹن کی طرح ایٹمی نظریہ، سر جوزف کی طرح مصنوعی فائبر، ولیم کی طرح زمین کی مقناطیسی قوت، جیمز کی طرح مشین گن اور ولیم اسٹینلے کی طرح الیکٹرک ٹرانسفارمر جیسی اعلیٰ ترین ایجادیں یا دریافتیں کرتے۔

ایسے اعلیٰ دماغ سالوں میں نہیں صدیوں میں دریافت ہوتے ہیں۔ ایسا آلہ (کمپیوٹر) جیسا دماغ جو پہلے سے مہیا کردہ منظم معلومات کو بوقتِ ضرورت فراہم کرتا ہے...... بھلا ایسے دماغ کوئی معمولی ہو سکتے ہیں اور ان کی پہچان کرنا، انہیں دریافت کرنا بھی معمولی ہرگز نہیں تھا۔

مگر پروفیسر بشر کے پاس قیراط جیسا آلہ موجود تھا۔ وہ قیمتی پتھروں اور سونے کو ناپ سکتا تھا۔ وہ ہیرے، سونے کے پتھر اور تانبے کی پہچان کر سکتا تھا اور اس نے مون حسیب جیسے ہیرے کو کھوج لیا تھا۔

وہ مون کو اپنے انداز، طریقے، اسلوب اور مرضی کے ساتھ تراشنا چاہتا تھا...... اور اس ضمن میں اس نے مون کو پہلی کلاس میں پہلا سبق پڑھایا تھا۔ مون کے لیے یہ سب بہت مختلف، منفرد اور انتہائی دلچسپ تھا۔

پروفیسر بشر جان گیا تھا کہ مون حسیب کا دماغ کوئی معمولی دماغ نہیں ہے...... بلکہ نکولس، ڈالٹن اور سر جوزف جیسا غیر معمولی اور انتہائی نایاب قسم کا دماغ ہے...... اب پروفیسر بشر پر ڈیپینڈ کرتا تھا کہ وہ مون حسیب کے دماغ سے کس قسم کا کام لینا چاہتا تھا اور وہ مون حسیب کے دماغ کو کس طرح سے استعمال کرنا چاہتا تھا۔

پہلی کلاس میں پروفیسر بشر نے مون حسیب کو اس کے اندر موجودہ پوشیدہ غیر مادی قوتِ متحرکہ کے متعلق بتا کر چونکا دیا تھا۔

”نفسیاتی لحاظ سے بہت خاص لوگوں میں پائی جانے والی سپر فزیکل قوت، جو تمہارے اندر بدرجۂ اتم موجود ہے، جسے بس تھوڑا سا پالش کرنا ہوگا...... یہ نفی قوتوں کی وہ معجزاتی قوت ہے جو اپنے مادی وجود کو چھوڑ کر غیر مادی یا روحانی وجود میں منتقل ہو کر غیر فانی کام انجام دینے کی صلاحیت سے بھرپور ہوتی ہے...... اور اس سے لاکھوں ناممکن کام بغیر کسی سہارے کے ممکن ہو جاتے ہیں۔ یہ ایسی قوت ہے

جس کا کام بندے کو مادی وجود سے الگ کر کے، ماورا کر کے کائنات کے روحانی وجود سے ملاپ کرانا اور غیر اجسام میں زندگی بیدار کر کے ان سے ناممکن العمل کام لینا ہے۔ یہ لافانی قوت جہاں انسان کو بہت بلند، اعلیٰ اور منفرد ترین مقام سے نوازتی ہے تو دوسری طرف انسان کو اس کے اصل مقام سے گرا کر شیطان بھی بنا دیتی ہے۔'' پروفیسر بشر کلاس کے بیس اسٹوڈنٹس کو بڑی سنجیدگی کے ساتھ سپر فزیکل قوت کا تعارف دے رہا تھا۔ ان میں موجود مون حبیب جیسے سانس روکے سن رہی تھی۔ اس کے دل کی کیفیت بہت عجیب تھی اور اندر کہیں چھٹی حس خطرہ، خطرہ ہے کا الارم بھی بجا رہی تھی مگر دل کہتا تھا کہ اس نئے جہان کو دریافت کر کے ہی دم لو...... وہ جیسے دم سادھے سن رہی تھی۔

''میں تم لوگوں کو انتقالِ افکار (telepathy) کا پہلا اور ابتدائی سبق دوں گا۔'' پروفیسر نے پہلا پتا پھینک دیا تھا...... اب وہ اسٹوڈنٹس کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ ان میں سے کم حیران اور زیادہ مطمئن لوگ تھے تاہم مون حبیب کے لیے کم از کم یہ انکشاف کسی دھچکے سے کم نہیں تھا۔ وہ جیسے دم بخود سانس روکے پروفیسر کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''تو کیا ہمیں بیدی نونگ میں ٹیلی پیتھی کے اسرار و رموز سکھائے جائیں گے؟'' اس کے عجیب اور احمقانہ سوال نے پوری کلاس کو متحیر کر دیا تھا۔ وہ جیسے گردن موڑ، موڑ کر اس نئی احمق ترین اسٹوڈنٹ کو دیکھ رہے تھے۔

☆☆☆

''میرا خیال ہے ہم لوگ یہاں ٹیلی پیتھی کے معانی ہی سمجھنے آئے ہیں۔'' ایک لڑکے نے اٹھ کر مون کو جواب دیا تھا۔ یہ کلاس کا سب سے خوب صورت لڑکا تھا اور پروفیسر کے ساتھ اس کی گاڑھی چھنتی تھی۔ مون کو بعد میں پتا چلا تھا یہ لڑکا میکس وان تھا۔ انڈیا میں طویل عرصہ رہ کر آیا تھا۔ اردو اور ہندی میں ایکسپرٹ تھا۔ اس کی جرمن کمزور تھی اور وہ یہاں لینگویج کورس کے لیے ہی آیا تھا مگر بیدی نونگ کی... پُراسراریت میں ایسا جکڑا کہ یہاں سے دور جا ہی نہیں سکا تھا۔ پروفیسر نے ٹھیک کہا تھا، یہ بڑی مسحور کن دنیا تھی۔ وہ اس کے سحر سے کبھی نکل ہی نہیں سکتی تھی، یہی حال میکس وان کا بھی تھا۔ وہ آیا تو کسی اور مقصد کے لیے تھا مگر پروفیسر کی شخصیت نے اسے بھی اپنے حصار میں کر لیا تھا۔ پھر پروفیسر خیالات اور تصورات کی ایسی حسین دنیا کا ذکر کرتا تھا جس میں ایک انسان کسی دوسرے انسان کے ذہن پر قابض ہو سکتا تھا۔ وہ اس کی سوچ میں گھس سکتا تھا اور اس کے خیالات کو جان سکتا تھا۔ پروفیسر نے کہا تھا۔

''تم میں سے کون، کون دلوں اور دماغوں کو... تسخیر کر کے پورے عالم پر راج کرنا چاہتا ہے؟'' قریب، قریب ہر اسٹوڈنٹ نے ہاتھ بلند کر لیا تھا مگر مون کو جیسے کوئی غیر مرئی طاقت ہاتھ اٹھانے سے روکتی تھی۔ اس کے اندر وہی الارم بجنے لگتا تھا۔ جیسے وہ ایک بڑا خطرہ مول لے کر غلطی کر رہی ہے۔ اس کے بد اثرات بھی تو ہو سکتے تھے۔ اندر بجتے الارم کو نظر انداز کر کے وہ بھی آہستہ، آہستہ ہی سہی، ان اسٹوڈنٹس میں شامل ہوگئی تھی جو روحانی طاقت یا غیر مادی قوتِ متحرکہ کی بدولت لوگوں کے ذہنوں کو تسخیر کرنا چاہتے تھے۔

دراصل یہ دنیا بڑی سحر انگیز اور پُرکشش تھی۔ کچھ ہی عرصہ گزرنے کے بعد مون کو اس علم کے اسرار میں کمال درجے کا لطف اور کشش محسوس ہونے لگی تھی۔ البتہ میکس وان بہت الجھتا تھا۔ شروع، شروع میں وہ بھی بہت پُرجوش تھا مگر مون نے محسوس کیا تھا وہ آئندہ آنے والے دنوں میں بیزار نظر آنے لگا ہے۔ جیسے وہ بہت بچار میں پڑ گیا تھا۔ بہت سوچتا، الجھتا اور سوال کرتا تھا پھر ایک دن کلاس کے

دوران ہی میکس نے پروفیسر سے کچھ سوال کیے تھے۔ جن کے جوابات دیتے ہوئے پروفیسر گھبرایا نہیں تھا۔ وہ جیسے پورا ہوم ورک کر کے ہی میدان میں اترا تھا۔

''یہ ٹیلی پیتھی ہے کیا؟ میں کس طرح کسی دوسرے انسان کی سوچ کو پڑھ سکتا ہوں اور کیسے امواج خیال کے ذریعے جان سکتا ہوں کہ مجھ سے دور بیٹھے شخص کے ذہن میں کیا ہے؟'' میکس کے اس سوال نے پوری کلاس کو بے چین کر دیا تھا۔ دراصل یہ سوال تو قریب، قریب ہر طالب علم کے ذہن میں کھدبُد ... مچاتا تھا مگر پروفیسر کی باتوں کا سحر کچھ اتنا طاقت ور ہوتا تھا کہ دوران لیکچر وہ لوگ صرف سنا کرتے تھے۔ بول سکنے کی قوت جیسے مفلوج ہو جاتی تھی۔

ٹیلی پیتھی کے فن میں ماہر کرتا پروفیسر انہیں جیسے ہپناٹائز کر دیا کرتا تھا۔ ''ٹیلی پیتھی کے معانی روحانی رابطے کے ہیں۔ اصطلاح میں اسے خیالات کی منتقلی کا نام دیتے ہیں۔ جس کا مفہوم یہ ہے۔ کافی دور سے کسی چیز کو محسوس کرنا یا ایک قلب کا بغیر کسی مادی وسیلے کے دوسرے قلب پر اثر کرنا۔'' پروفیسر بشر میکس کا سوال سن کر بڑے جذبات بھرے لہجے میں بول رہا تھا۔ جیسے میکس کا سوال اسے اپنے لیے خطرہ محسوس ہوا تھا اور وہ تمام اسٹوڈنٹس کے ذہنوں سے آج زنگ اتار دینا چاہتا تھا تاکہ پھر کوئی ٹیلی پیتھی کے حوالے سے شبہات میں نہ پڑے۔ اسے محسوس ہوا تھا، اس کے یہ بیس بائیس اسٹوڈنٹس غیر معمولی ذہین تھے۔ وہ ان پر جلد اپنا رنگ اور تسلط جمالینا چاہتا تھا، وہ انہیں بیزار کر کے بیدی نوتنگ سے دور نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''مختلف ڈاکٹرز، ماہر نفسیات، سائنس دان، یوگی، فلاسفر اور ماہرین ٹیلی پیتھی کی تعریف کچھ یوں کرتے ہیں کہ یہ ایک ذہن سے دوسرے ذہن تک خیال کی منتقلی ہے۔ اس میں انسان کے خیالات کو پڑھ کر یہ اندازہ لگانا پڑتا ہے کہ وہ کس کیفیت یا سوچ میں ہے؟ پھر ٹیلی پیتھی کا تیسرا درجہ شروع ہوتا ہے۔ جس میں ایک انسان اپنے خیال کو دوسرے کے ذہن میں منتقل کر سکے...... اور اس کے بعد ایک آخری درجہ شروع ہوتا ہے جس میں خیالات کی قوت میں دوسروں کو اپنا مفعول بنالینا ہوتا ہے۔ یعنی اس میں دوسروں کے ذہن پر قبضہ جما کر اسے مجبور کرنا ہوتا ہے کہ وہ آپ کے خیال کے عین مطابق کام کرے۔ .... یہ ٹیلی پیتھی کا کامیاب ترین مرحلہ ہے۔''

پروفیسر اپنے جادو اثر الفاظ کا سحر پھونک رہا تھا۔ وہ لوگ پھر سے ایسی ہی کیفیت میں مبتلا ہو گئے۔ جیسے کبھی سانس تک نہ لے سکیں گے یا بول نہیں سکیں گے۔ پروفیسر ان پر ایسا ہی کوئی جادو کر دیا کرتا تھا۔ سوال ان کے اندر ڈوبنے لگتے تھے اور وہ چاہ کر بھی پروفیسر سے اختلاف نہیں کر سکتے تھے۔ وہ اس کی بات ماننے، سمجھنے اور اس پر غور کرنے کے لیے مجبور ہو جاتے تھے۔

''یہ ٹیلی پیتھی آخر چیز کیا ہے؟'' پروفیسر ایک ضخیم کتاب کھولے کلاس کی طرف متوجہ تھا۔

''اونچے درجے کا کشف و ادراک رکھنے والا علم......؟''

''چھٹی حس ESP کی حامل قوت...... یا پھر ایک سپر سائیکک قوت جو ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں معلومات حاصل کر پائے یا شاید انسان کی اندرونی توانائیوں اور خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرنے والی قوت......؟'' یہ اور اس طرح کے بے شمار خیالات ان لوگوں کے ذہنوں میں تھے یا پھر مسحور کر دینے (hypnotism) اور غیب دانی (clairvoyance) کا علم یعنی ذہنی ٹیلی گرافی جس کے ذریعے دور بین سے بھی زائد دوری تک انسان دیکھنے کی قوت عمل اور علم، جن کو ماہرین نفسیات انسان کی تیسری آنکھ سے مشابہت

دیتے ہیں۔

آخر یہ ٹیلی پیتھی کوئی حقیقت بھی تھی یا محض لفاظی اور کتابیں پڑھنے تک کا صرف کتابی علم......؟ پروفیسر جو کہتا تھا جو بتاتا تھا آخر اس میں سچائی کتنی تھی؟ کیا وہ انہیں محض بے وقوف بنا رہا تھا؟ یا پھر وہ لوگ جلد کوئی جادوئی علم سیکھنے والے تھے؟

وہ لوگ ابھی حقیقت سے دور کتابوں کے علم تک محدود تھے۔ پروفیسر ان کے سامنے کوئی پریکٹیکل (عملی کارنامہ) نہیں کر پایا تھا پھر جس دن میکس نے پروفیسر کو اس نکتے کی طرف متوجہ کیا تھا، یہ اسی دن کی بات تھی۔ پروفیسر نے پوری کلاس سے کہا تھا کہ کل کوئی بھی غیر حاضر نہ ہو......وہ ان کو سکھائے گئے علم کی حقیقت کو سامنے لانے والا تھا۔" آخر پروفیسر کل کیا کر دکھانے والا تھا؟"

گروسی کے گھر میں اپنے کمرے کی بالکونی میں کھڑے ہو کر...... پھولوں کے سنسان کھیتوں کو دیکھتی وہ سوچ رہی تھی۔ پھولوں کی کٹائی ہو چکی تھی اور اب کہیں بھی خوشنما پھولوں کی چادر نہیں تھی۔ پھول اپنے موسم کے حساب سے مدت پوری کر چکے تھے۔ جیسے انسان اپنی عمر کے حساب سے مدت پوری کرتا ہے۔ بالآخر اسے اپنے ٹھکانے کی طرف جانا ہوتا ہے مگر اس بات سے واقف ہونے کے باوجود کچھ لوگ عمر بھر نادانیاں کرتے رہتے ہیں۔ وہ انہی خیالوں میں گم تھی معاً اس کے موبائل کی بیپ بج اٹھی۔ اس نے چونک کر فون اٹھایا تھا۔ عیسیٰ کی کال تھی وہ بہت اپ سیٹ تھا اور مون کو گھر آنے کے لیے بہت مجبور کر رہا تھا۔

"غصہ جانے دو مون...... پلیز، گھر آجاؤ، کسی کے گھر کتنے عرصے تک بھی رہیں، آخر اپنے گھر واپس تو آنا ہوتا ہے۔" عیسیٰ کی آواز بھرا رہی تھی۔ وہ اپنی تنہائی اور اکیلے پن کی وجہ سے سخت عاجز لگ رہا تھا۔ اسے مون کی یاد آرہی تھی۔ وہ اس کے لیے بہت بے چین تھا۔

"یہ کسی اور کا گھر نہیں...... میری نانی کا گھر ہے۔" مون جیسے جتا کر بولی تھی۔

"اپنا گھر پھر بھی نہیں......" عیسیٰ نرمی سے بولا تھا۔ وہ مون کو واپس گھر لانے کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اسے فون کالز کے ذریعے مجبور کرتا یا خود آکر لے جاتا، وہ نہ مانتی تب بار، بار چکر لگاتا، کبھی تو وہ عاجز آکر اس کے ساتھ چل پڑتی۔ اگر امید پر دنیا قائم تھی تو پھر عیسیٰ اپنی امید کو ختم کیوں کرتا۔

"میرا تو کوئی گھر نہیں۔" مون جیسے رو پڑی تھی۔ مگر اس نے ظاہر ہونے نہیں دیا تھا۔ وہ عیسیٰ پر اپنی کمزوری کیوں ظاہر کرتی۔

"ایسے مت کہو، مجھے تکلیف ہوتی ہے مون! یہ گھر تمہارا اپنا ہے، تم کیوں ایک معمولی ضد میں ہمارا چین سکون ختم کر چکی ہو۔" عیسیٰ اسے نرمی سے سمجھا رہا تھا۔ وہ اب تلخ کلامی کر کے مون کو خفا کرنا نہیں چاہتا تھا مگر مون کون سا کسی کے جذبات کو سمجھتی تھی۔ اب بھی ازلی کٹھور پن سے بول رہی تھی۔

"میں نے کسی کا چین سکون ختم نہیں کیا، میں تو آپ کی زندگیوں سے نکل آئی ہوں تاکہ آپ لوگ ڈسٹرب نہ ہوں۔" وہ زہرخند سے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ عیسیٰ کے دل کو سخت ٹھیس پہنچی تھی۔

"ایسی بات کہو گی تو سراسر تکلیف دو گی...... مگر تمہیں احساس کہاں ہے۔" عیسیٰ نے افسردگی سے کہا تھا۔ مون کا کٹھور پن اسے کتنی اذیت دیتا تھا۔ وہ اس حقیقت سے واقف نہیں تھی۔

"اور تمہیں بہت احساس ہے کیا؟" وہ بھی غضبناک ہوگئی تھی۔

"احساس ہے تو فون کر رہا ہوں ناں۔" عیسیٰ کی آواز مدھم ہوگئی تھی۔ دل پر جیسے بوجھ لد گیا تھا مون ہمیشہ دل دکھانے والی ہی بات کرتی تھی۔ اب بھی مزید اس کی سنے بغیر فون بند کر چکی تھی حالانکہ

عیسیٰ ابھی اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ وہ مون کے لیے عجیب وغریب باتیں سن رہا تھا کہ مون نے نہ جانے کس قسم کا ادارہ جوائن کر رکھا تھا جس کی شہرت کچھ اچھی نہیں تھی مگر ہمیشہ کی طرح مون نے فون بند کر دیا تھا۔

پھر بہت سارے دن گزر گئے تھے۔ پروفیسر نے انہیں پہلا کامیاب عمل کر کے دکھایا تھا جس میں اس نے میکس وان کو ہپناٹائز کیا تھا۔ پوری کلاس جیسے دم بخود رہ گئی تھی۔ پروفیسر نے میکس کو ہپناٹائز کیا اور اسے جو، جو ہدایت دیتا رہا، میکس اسے وصول کر کے وہی بولتا رہا۔ یہ پہلا پُراسرار عمل تھا کم از کم ان لوگوں کے لیے اسے پُراسراریت ہی کہنا تھا۔ یہ پُراسراریت ہی کی کوئی قسم تھی۔ گویا پوری کلاس بھی مسمرائز ہوگئی تھی۔ پروفیسر نے جیسے انہیں کوئی جادو کر کے دکھایا تھا۔ پروفیسر جیسے کوئی شعبدہ باز تھا۔

مون کے لیے یہ ایک دلچسپ ترین تجربہ تھا کیا وہ پروفیسر جیسی طاقت رکھتی تھی؟ کیا وہ کسی کو ہپناٹائز کر سکتی تھی؟ کیا وہ کسی کا ذہن کھوج سکتی تھی؟

پروفیسر اس کے دل کی بدلی کیفیات سمجھ رہا تھا۔ جیسے گرم لوہے پہ پہلی چوٹ پڑی تھی۔ کلاس میں مون کے علاوہ ایک اور لڑکی ڈیزی تھی جو مون کی طرح ہی پروفیسر سے اس کا سارا علم سیکھ لینا چاہتی تھی۔ مون کو یہ بات بھی بعد میں پتا چلی تھی۔ ڈیزی، پروفیسر کی لور بھی تھی اور پروفیسر کی خاطر کچھ بھی کر سکتی تھی۔ البتہ پروفیسر کے دل میں ڈیزی کے لیے کیا جذبات تھے اس بات سے کوئی واقف نہیں تھا۔

پروفیسر نے میکس کو ہپناٹائز کر کے کلاس کے تمام طالب علموں کا دل جیت لیا تھا۔ اب انہیں لگتا تھا وہ محض کتابی باتیں نہیں پڑھتے بلکہ کچھ عملی طور پر بھی سیکھنے والے ہیں۔

”امواجِ خیال کی کوئی مشق ہمارے سامنے کی جائے۔“ ایک دن ڈیزی نے پروفیسر سے

سوال کیا۔ ڈیزی کا سوال ان سب کے دل کی آواز بھی تھا تب میکس نے کلاس میں اٹھ کر ایک عجیب سوال کیا تھا۔

''پروفیسر! تم ٹیلی پیتھی کے بہترین عامل ہو، تم ہمیں عمل کر کے دکھاؤ کہ ایک ذہن سے خیال دوسرے کے ذہن میں کیسے اترتا ہے؟'' میکس کا سوال چونکا دینے والا تھا۔ مون کے ساتھ ڈیزی بھی ٹھٹک گئی تھی۔ میکس چاہتا تھا یہ عمل کلاس کے اسٹوڈنٹس کریں کیونکہ ٹیلی پیتھی اور ہپناٹزم کی یہ آخری مشقیں جاری تھیں۔ پروفیسر کی انتھک کوششوں کے بعد ..... کلاس کے بیس اسٹوڈنٹس میں سے صرف مون اور ڈیزی ہی اس کی توقعات پر پوری اتری تھیں۔ فائنل ایگزامز تک صرف تین لوگ ... نشریاتی رابطے کا پہلا تجربہ کر سکتے تھے۔ ان میں مون، ڈیزی اور ایک لڑکی ڈیانا تھی۔ باقی میکس سمیت تمام لوگ فیل ہو چکے تھے اور درجۂ اول کی کلاس میں صرف ڈچ سیکھنے چلے گئے تھے۔

اب یہ تین لوگ بیدی نونگ کا حقیقی ماڈل تھے۔ مون، ڈیزی اور ڈیانا...... پروفیسر انہیں شعور کی سرگرمیوں سے لے کر انتقالِ افکار، حقیقتِ احوال، امواجِ خیال اور اس کی رفتار، انتقالِ افکار کا فن، دماغی میکانزم سے لے کر سجیشن اور آٹو سجیشن تک پڑھا۔ چکا تھا۔ آٹو سجیشن یعنی خود تسخیری میں مون نے کمال درجے کی مہارت حاصل کر لی تھی اور پوسٹ ہپناٹک سجیشن میں اسے اس سال کا ایوارڈ دینے کا اعلان کر دیا تھا۔

پوسٹ ہپناٹک سجیشن کا مطلب معمول کو.... ہپناٹزم کے دوران ایسی ہدایات دینا ہے جن پر معمول سے بعد میں عمل کروانا مقصود ہوتا ہے کیونکہ جو ہدایت اس عمل کے دوران معمول کو دی جائے گی بعد میں وہ اس پر لازمی عمل کرتا ہے۔ پوسٹ ہپناٹک سجیشن کو مون حسیب نے اپنے ذاتی مفاد کے لیے انتہائی حد پر جا کر استعمال کیا تھا، جس کا نتیجہ تباہی اور بربادی نکلا...... مگر تب وہ نئے جہان دریافت کرنے کے شوق میں کچھ نہیں سمجھتی تھی اور جب تک اسے ادراک ہوا تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔

پھر ایک سبق کے دوران پروفیسر بڑے موڈ کے عالم میں تھا۔ اس دن بوار یا بارش میں بھیگ رہا تھا اور مون حسیب کو گیلے پن سے الجھن ہوتی تھی۔ اس نے سوچا، وہ کلاس سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی جائے۔ جب تک بارش نہ رکے وہ کمرے میں ہی رہے گی مگر پروفیسر کے سبق نے مون حسیب کو پھر سے سحر زدہ کر دیا تھا۔ وہ کلاس سے اٹھ ہی نہیں سکی تھی۔ آج پروفیسر انہیں علمِ تسخیر کے فائدے بتا رہا تھا۔

اس سے بہ آسانی انسان بری عادتیں ترک کر لیتا ہے۔ برائیوں اور بیماریوں کا بہترین علاج ہے یہ عمل...... والدین اپنے شرارتی بچوں کو کنٹرول کر کے انہیں تابعِ فرمان بنا سکتے ہیں۔

طالب علم قوتِ یادداشت، علمِ بصیرت اور یکسوئی حاصل کر کے اپنے، اپنے شعبے میں مہارت اور ترقی پا سکتے ہیں۔ یہ ذہنوں میں رسائی، قبضہ اور سوچ تک پہنچنے میں معاون ثابت ہے۔

شعبدے بازی کے کرشمے اور کئی طرح کے کمالات حاصل کر کے بے تحاشا دولت بھی کمائی جا سکتی ہے۔ اپنے دل پسند مرد یا عورت کی محبت، توجہ اور دوستی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اسے قابو میں کیا جا سکتا ہے۔ ہپناٹزم کے بے شمار فوائد تھے مگر مون حسیب اس آخری بات پر جیسے اٹک گئی تھی۔ اپنے دل پسند مرد سے محبت اور اس کی توجہ حاصل کرنا...... مون کے اندر جیسے محبت کی کلی چٹکنے لگی تھی۔ امید کی ننھی سی کرن چمکنے لگی تھی۔ ایک تصویر روشن سی ہو گئی۔ اس کا معمول تھا، وہ گھر آ کر ٹیلی پیتھی کی مشق ضرور دہراتی تھی گھر میں پہلے تو کوئی اس کے معمولات کو سمجھ نہیں سکا تھا مگر مون کو لگتا تھا کہ سوزن

کچھ، کچھ شکوک وشبہات میں پڑگئی ہے۔ مگر فی الحال اسے براہِ راست ٹوکا نہیں تھا۔ نہ اس موضوع پر بات ہوئی تھی۔

مون نے سیلف ہپناسز میں خود کو کئی مرتبہ کامیاب طریقے سے ہپناٹائز کرلیا تھا۔ پروفیسر اسی لیے تو اس کے متاثرین میں شامل تھا۔ وہ پروفیسر کی پہلی اسٹوڈنٹ تھی جو بہت جلد کامیابی اور ترقی کے مراحل طے کررہی تھی۔ پروفیسر نے اپنے گزشتہ لیکچرز کے درمیان اسے بہت کچھ سمجھایا تھا۔ جیسے ضمیر کا زندہ رکھنا اور اس علم سے کسی کو نقصان نہ پہنچانا اور ملک وقوم کی خدمت وغیرہ...... دراصل اس فن کو سیکھنے سے پہلے یہی بنیادی اصول تھے جن پر ہر، ہر صورت ایک ماہرِ انتقالِ افکار کو عمل کرنا ہوتا ہے۔ مگر اکثر لوگ اسے اپنے غلط مقاصد کے لیے استعمال کرنے لگتے ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ لوگ بہت جلد اپنی اس صلاحیت سے ہاتھ بھی دھو بیٹھتے تھے۔ کیا مون حسیب بھی انہی لوگوں میں سے تھی؟

فی الوقت وہ یہ اٹھارویں مشق اپنے بیڈروم کو لاک کر کے دُہرا رہی تھی۔ self-hypnosis میں اس نے کئی کامیاب تجربے کرلیے تھے۔ اپنے تئیں اس نے کئی جہان فتح کرلیے تھے۔ یہ بڑی دلچسپ، پُرکشش اور انتہائی دل لبھانے والی دنیا تھی۔ عامل خود کو کچھ لمحوں کے لیے اس جہان سے الگ سمجھنے لگتا ہے جیسا کہ وہ کسی اور ہی دنیا میں محوِ پرواز ہو۔

جب وہ عام لوگوں کو ہپناٹائز آسانی کے ساتھ کرلیتی تھی سو خود کو ہپناٹائز کرنا کہاں مشکل تھا؟ اس نے پہلی مرتبہ پروفیسر کی دی گئی سجیشن کے مطابق خود کو ہپناٹائز کرلیا تھا۔ اس نے لیپ ٹاپ پہ کچھ سوال ترتیب دیے تھے پھر لیپ ٹاپ کو اونچی جگہ پر رکھ کر خود ایک آرام کرسی پر نیم دراز ہوگئی تھی۔ یوں کہ لیپ ٹاپ اس کی آنکھوں کے عین سامنے تھا پھر مون نے خود کو پہلی سجیشن دی تھی۔

''میں اپنے بدن کو ڈھیلا چھوڑ رہی ہوں۔'' مون نے لیپ ٹاپ کی اسکرین پہ نگاہ جما کر پہلا سوال دُہرایا تھا۔

''اور میں اپنے بدن کو ڈھیلا چھوڑ رہی ہوں۔'' اس نے متعدد بار یہی لائنیں دُہرائی تھیں۔

''میرے جسم پر استراحت طاری ہورہی ہے۔'' مون نے اپنے جسم پر واضح استراحت اترتی محسوس کی تھی۔

''اور میرے ذہن پر بھی استراحت طاری ہورہی ہے۔'' اس نے کئی مرتبہ یہ لائن دُہرائی تھی۔ بغیر پلکیں جھپکائے اسکرین کی طرف دیکھنا ایک کٹھن مرحلہ تھا مگر مون حسیب نے بالآخر طے کرلیا۔ وہ کروڑوں لوگوں کی اس دنیا میں بڑا اعلیٰ قسم کا دماغ رکھتی تھی۔ اس کا ذہن اَسّی میل فی گھنٹا کی رفتار سے پیغام وصول کرنے کی طاقت رکھتا تھا۔ اس کے اعصاب بہت مضبوط تھے اور قوتِ ارادی پہاڑوں جیسی سخت تھی۔ مون حسیب کو آسانی کے ساتھ ڈھایا نہیں جاسکتا تھا۔ یہ تو پروفیسر تھا جو اسے نہ جانے کس مقناطیس سے باندھ کر اِدھر لے آیا تھا اور اب مون اسی مقناطیسی طاقت کے زیرِاثر کئی لوگوں کو ہپناٹائز کرسکتی تھی۔ اور خود کو ہپناٹائز کرنا اس کے لیے کچھ مشکل نہیں تھا پھر مون نے خود کو ایک اور سجیشن دی۔

''میرا جسم اور ذہن خوشگوار طور پر بوجھل ہورہا ہے۔'' وہ سکون کی لہروں کو اپنے دماغ میں اترتا محسوس کررہی تھی۔ مون جیسے بادلوں کے رتھ پر سوار تھی۔ وہ ہواؤں کے سنگ تیر رہی تھی مگر یہ کیا......؟

''میرے تمام اعضا وزنی ہوتے جارہے ہیں۔'' وہ پل بھر کے عرصے میں بادلوں کو چھوڑتی کسی جزیرے میں تیر رہی تھی۔

''میری ٹانگیں بھاری ہونے لگی ہیں۔'' اس نے پیروں پر واضح بوجھ پڑتا محسوس کیا تھا۔

''میرے کندھے بھی بھاری ہورہے ہیں۔'' مون کے شانوں پر بھی وزن لدرہا تھا۔

''میرا ذہن بوجھل ہورہا ہے۔'' مون کی پلکوں پر بھی وزن اتر آیا تھا۔

''اب میری آنکھیں بند ہورہی ہیں۔'' اس کی آنکھوں میں نیند بھرنے لگی تھی۔

''جب میری آنکھ بند ہوجائیں گی تب میں گہری نیند میں چلی جاؤں گی۔'' کوئی پلکوں کو مقناطیس کی طرح پپوٹوں کی طرف کھینچ رہا تھا۔

''میں تین گنوں گی اور نیند میں اتر جاؤں گی۔'' اس نے خود کو آخری ہدایات دیتے ہوئے کہا تھا۔

''میں اپنے آپ کو قابو میں رکھ سکتی ہوں۔'' وہ خود کو آخری سجیشن دے رہی تھی۔

''میں جب چاہوں اپنے آپ کو بیدار کرسکتی ہوں۔'' اس کا عمل مکمل ہوچکا تھا وہ ٹائمنگ کے مطابق نیند میں چلی گئی تھی۔ اور سیٹ ٹائمنگ کے ساتھ ہی بیدار ہوگئی۔ سلیف ہپناسز کے ذریعے جسمانی اور ذہنی تھکاوٹ دور ہوجاتی ہے۔ مون حسیب نے خود کو تروتازہ محسوس کرنا شروع کردیا تھا۔ اب وہ پوری طرح چاق وچوبند تھی اور ایک کامیاب تجربے کی خوشی محسوس کررہی تھی۔

پھر اس نے بیدی نونگ کے اسٹوڈنٹس سے ہٹ کر عام لوگوں کے چہرے چھاننے شروع کردیے تھے۔ پروفیسر نے کہا تھا، مون' ڈیزی اور ڈیانا کے ساتھ مل کر ایک دوسرے پہ تجربے کریں مگر مون ان سب سے کچھ الگ کرنا چاہتی تھی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی پروفیسر کا سکھایا علم کہاں تک عملی زندگی میں کارگر ثابت ہوتا ہے۔

مون، پروفیسر کے اسٹوڈنٹس میں سب سے کم تعلیم یافتہ تھی۔ ڈیزی اور ڈیانا تو یونیورسٹی کی پوزیشن ہولڈر تھیں۔ خود پروفیسر بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا مگر پھر بھی ڈیزی اور ڈیانا سے زیادہ مون کی دماغی کارکردگی سے متاثر تھا۔ پروفیسر کا خیال تھا، وہ جلدی کامیابی پاکر اس سے بھی زیادہ اتقال انکار میں مہارت رکھ سکتی ہے پھر ایک دن پروفیسر نے انہیں نفسیات اور ہپناٹزم کے اتالیق میلڈ کل کے طالب علموں کا ایک تجربہ بتایا تھا جو پوسٹ ہپناٹک سجیشن میں غیر اخلاقی، جنسی یا نظریاتی نقطۂ نظر سے انتہائی پست، کریہہ اور غلیظ تھا۔ پروفیسر نے ایک مثال بھی دی تھی مگر لڑکی اس عمل کے کرنے والے لڑکوں کے ناپاک عزائم سے بچ ..... گئی تھی۔ عین وقت پر اس کی نیند ٹوٹ گئی تھی کوئی بھی علم تعمیری بھی ہوتا ہے اور تخریبی بھی جب شیطانی قوتیں غالب آنے لگیں تو وہی علم منفی رخ اختیار کرلیتا ہے۔ شاید یہی سب کچھ مون حسیب کے ساتھ ہوا تھا۔

وہ ایک ٹھوس قسم کا تجربہ کرنا چاہتی تھی مگر بیدی نونگ کے اسٹوڈنٹس سے ہٹ کر......ایک دن وہ مرکز کی مارکیٹ میں سے گزر رہی تھی۔ جوتوں کی دکان کو دیکھ کر اس کے ذہن میں کلک سے کچھ روشن ہوا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ دکان کے اندر تھی۔ اسے انتہائی خوب صورت اور کم عمر مالکن کو ہپناٹائز کرنا تھا۔ وہ یہاں سے ایک جوتا چرانا چاہتی تھی۔ اگرچہ اس کا پاؤچ نوٹوں سے بھرا تھا اور وہ کوئی عادی چور بھی نہیں تھی۔ اسے تو صرف ایک تجربہ کرنا تھا اور وہ اس کے لیے خاصی پُرجوش تھی۔

دکان کی مالکن زیٹا یعنی زیتون تھی۔ اس کا شوہر آغا ایک پاکستانی لڑکا تھا۔ وہ ابتدائی معلومات کے بعد دکان میں گھسی تھی۔ اس وقت گاہک نہیں تھے اور آغا بھی آس پاس دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

مون کا مقصد..... دکان کی مالکن کو ہپناٹائز کرنا تھا، چوری کرنا نہیں......اور اس ضمن میں مون نے ایک چمکتی دمکتی انتہائی خوب صورت پین لائٹ پاؤچ میں پہلے سے رکھی تھی۔ مگر مون کا ارادہ زیتون (زیٹا) کو پین لائٹ سے ہپناٹائز کرنے کا نہیں تھا۔

وہ ہپناٹک میتھڈ کے تین بنیادی طریقوں میں سے ایک یعنی ٹکٹکی باندھ کر زیتا کو ہپناٹائز کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

اس نے زیتا پر پہلی نگاہ ڈالی تو تیز، تیز بولتی بلا کی ہنس مکھ زیتا ہنستے، ہنستے ایک دم رک سی گئی۔ وہ مون کی آنکھوں میں دیکھتی لمحے بھر کے لیے ٹھٹکی تھی پھر جیسے مون کی آنکھ میں دیکھنا اس کا معمول بن گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے وہ کاؤنٹر پر دو چار جوتے رکھے مون کو ہنس، ہنس کر بتا رہی تھی۔ یعنی اپنے جوتوں کی اعلیٰ کوالٹی کے بارے میں معلومات دے رہی تھی۔ مگر اب کسی چینی کی مورتی جیسے ساکت ہو چکی تھی۔ بنا پلک جھپکے مون کی سحر طراز آنکھوں میں دیکھنا ایک پُرکشش تجربہ تھا۔ شاید ہی زیتا نے اپنی زندگی میں اتنی گہری اور مقناطیسی آنکھیں دیکھی تھیں۔

پروفیسر نے ایک مرتبہ مون کو بتایا تھا کہ تمہاری آنکھیں قدرتی طور پر ہپناٹائز کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ مون کو اس لمحے یقین آ گیا تھا۔ ابھی اس نے کوئی کوشش بھی نہیں کی تھی پھر بھی جیسے زیتا ہپناٹائز ہو چکی تھی۔ اس نے زیتا کو پہلا حکم دیا......اور اسے معمول کی کارروائی کے بعد حالتِ نیند میں لے آئی تھی۔

''مجھے یہ جوتا پیک کر دو......'' وہ حکم دینے کے دوسرے سیکنڈ میں پیک شدہ جوتا اٹھا رہی تھی۔ زیتا نے کسی معمول کی طرح اس کے حکم پر جوتا پیک کر دیا تھا۔ پھر مون نے اسے دوسری ہدایت دی تھی۔

''میں یہ جوتا پسند کر چکی ہوں۔'' مون کے ہونٹ ہلے تھے اور آواز زیتا کی سماعتوں میں اتر گئی تھی۔ اب وہ زیتا کو ایک مختلف ہدایت دے کر بولنے پر اکسا رہی تھی۔

''کسٹمر یہ جوتا خرید چکا ہے۔ اور بل میرے پاس ہے۔'' مون نے اسے آخری سجیشن دی تھی اور اس کے بعد ہلکا سا اشارہ دے کر زیتا کی نیند کو توڑ دیا تھا۔ اب وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ گلاس ڈور کھول کر باہر نکل گئی تھی جبکہ زیتا کچھ حیران، کچھ متحیر سی خود کو دیکھنے لگی۔ وہ پہلے سے کچھ زیادہ ہی ترو تازہ اور ہشاش بشاش ہو چکی تھی۔ جیسے کھڑے، کھڑے ہلکی سی نیند نے اسے اتنا فریش اور ترو تازہ کر دیا تھا۔ زیتا کو خیال آیا۔ وہ پچھلی رات سے جاگ رہی تھی۔ آغا کچھ سامان لینے شہر سے باہر گیا تھا۔ رات سے زیتا ڈیوٹی پہ تھی کافی تھکی ہوئی، اندرونی طور پر پژمردہ تھی مگر بظاہر ہنس، ہنس کر بات کرنے پر مجبور تھی۔ مگر ان چند سیکنڈ میں اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ اس کے لبوں پر ابھی تک کچھ الفاظ تھے۔ وہ الفاظ کیا تھے؟

''کسٹمر یہ جوتا خرید چکا ہے اور بل میرے پاس ہے۔'' زیتا جیسے دھک سے رہ گئی تھی۔ گویا ہوش میں آ گئی ہو۔ کسٹمر جوتا اڑا کر لے جا چکا تھا مگر بل اس کے پاس نہیں تھا۔ اسی پل آغا اندر داخل ہوا تھا۔ اور شاید اس نے زیتا کی بڑبڑاہٹ سن لی تھی۔

''کسٹمر نے کون سا جوتا خریدا ہے؟ کہو جی میرے سوہنے! کدھر ہے بل؟'' آغا نے مسکراتے ہوئے دھواں، دھواں چہرے والی زیتا سے پوچھا تھا۔ جو ابھی تک چینی کی مورت بنی کھڑی تھی۔

''بل نہیں ہے۔'' زیتا نے رو دینے والے انداز میں کہا تھا۔ وہ جیسے ہڑبڑا کر بول رہی تھی۔

''تو پھر جوتا کہاں گیا؟'' آغا نے حیرت سے پوچھا، وہ سفر سے آ رہا تھا آتے ساتھ نقصان کا سن کر متوحش ہو گیا۔

''وہ تو کسٹمر لے گیا۔'' زیتا اب منہ بنا کر آنسو پینے کی کوشش کر رہی تھی۔

''ارے کیسے؟'' آغا دھک سے رہ گیا۔ تو گویا سچ میں نقصان ہو چکا تھا۔

''جانے کیسے، میں سو گئی تھی شاید......'' وہ کچھ سمجھ نہیں پائی تھی۔ آغا کا منہ کھل گیا۔

''تم سو گئی تھیں؟ پھر تو سمجھو، ایک کے بجائے کئی جوتے غائب ہوئے۔'' آغا سر تھام کر بیٹھ گیا تھا۔

''نہیں، صرف ایک ہی جوتا......'' زیتا نے اِدھر اُدھر دیکھ کے جیسے اپنی تسلی کرلی تھی پھر اس نے باہر نکل کر دیکھا تھا۔

گلاس ڈور کے ایک طرف رکھی کوڑے (ڈسٹ بن) میں پیک شدہ جوتا پڑا تھا۔ زیتا کی آنکھیں ابل پڑی تھیں۔

''آغا جوتا یہ رکھا ہے۔'' وہ بے ساختہ خوشی سے چیخ پڑی تھی۔ آغا بھی بھاگا بھاگا باہر کی طرف آیا۔

''ارے...... یہ کہاں سے آگیا؟'' آغا جو نقصان کا سن کر پژمردہ ہو چکا تھا ایک دم کھل اٹھا۔

''وہ لڑکی یہاں رکھ گئی ہے۔ کہیں پاگل تو نہیں تھی، پہلے چوری کی اور اب......'' وہ دونوں خوشی، خوشی جوتا اٹھا کر اندر لے جا رہے تھے۔ جب سڑک کے پار موجود ایک کیفے کی گلاس وال سے انہیں دیکھتی مون مسکرا رہی تھی۔ کافی پیتے ہوئے اپنے دوسرے کامیاب تجربے سے لطف اٹھانے کا اپنا ہی الگ مزہ تھا۔ وہ مسرور سی شیشے کے پار کا منظر دیکھتی رہی تھی۔ وہ چوری کرنے نہیں آئی تھی جو کام وہ کرنے آئی تھی اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا تھا اب اسے دوبارہ زیتا کی شاپ پر کبھی نہیں آنا تھا۔ ایک بات تو طے تھی۔

☆☆☆

مون کو گھر چھوڑے اسی طرح کئی سال گزر گئے تھے۔ شاید پانچ یا چھ سال......وہ اپنی زندگی میں بہت مطمئن تھی اور اب پروفیسر کے ساتھ مل کر بڑے بڑے اہم پروجیکٹ پر کام کر رہی تھی۔ سیکنڈ ٹائم میں ٹیلی پیتھی کی کلاسز لیتی تھی۔ صحیح معنوں میں مون نے پروفیسر کا سارا علم گھول کر پی رکھا تھا۔ وہ مون کو اپنا جانشین سمجھتا تھا۔

اس نے کچھ ہی عرصے میں بڑے کامیاب تجربے کیے تھے اور پروفیسر کے ساتھ مل کر ایک غیر ملکی ایجنسی کے لیے ایک بڑا اہم پروجیکٹ ہاتھ میں لے کر اس پر کام کیا تھا اور ایک بڑے کینگ پر ہاتھ ڈالا تھا۔ یوں بیدی لونگ کو راتوں رات شہرت مل گئی تھی اور کئی غیر ملکی ایجنسیاں ان سے کانٹیکٹ کی کوشش میں رہتی تھیں۔ مون پر دھن برسنے لگا تھا اور پروفیسر اس دولت سے خوب فائدہ اٹھا رہا تھا بلکہ دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہا تھا۔

انہی دنوں سوزن کو مون کی خفیہ کارروائیاں جاننے کا موقع ملا تھا۔ دراصل ہوا کچھ یوں تھا کہ پاکستان سے ایک لڑکا آفاق، عیسیٰ سے ٹکرا گیا۔ وہ لڑکا خاصا محنتی تھا اور اچھے مستقبل کی تلاش میں یہاں آیا تھا۔ کوئی پاکستانی عیسیٰ کے کانٹیکٹ میں ہو اور وہ اس کی مدد نہ کرے......یہ تو ممکن ہی نہیں تھا۔ علی عیسیٰ نے اسے اپنے پاپا کی خواہش پر گھر میں ہی ٹھہرا لیا تھا اور اب اس کے لیے کسی انسٹی ٹیوٹ کا بندوبست کر رہا تھا۔ انہی دنوں سوزن نے عیسیٰ کو مشورہ دیا تھا کہ آفاق کا مون کے انسٹی ٹیوٹ میں ایڈمشن کروا دے۔ تاکہ وہ جرمن زبان پر عبور حاصل کرلے۔ عیسیٰ نے آفاق کو بواریا بھیج دیا تھا۔ یوں آفاق کی مون سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ پہلی نظر میں ہی اس ساحرہ سے بڑا متاثر ہوا تھا۔ وہ بیدی لونگ کے جس حصے میں پڑھ رہا تھا وہاں صرف ڈچ سکھائی جاتی تھی۔ ایک مرتبہ اتفاقاً وہ میکس وان (جو اس کا کلاس ٹیچر تھا) کے ساتھ ایک دوسرے ڈپارٹمنٹ میں آیا تھا کاریڈور سے گزرتے ہوئے وہ ایک ہال کمرے میں آگئے تھے......مگر یہاں کا منظر دیکھ کر آفاق دنگ رہ گیا تھا۔ یہاں کوئی عجیب سا پُراسرار ماحول طاری تھا۔ آفاق کے دل پر جیسے ہیبت طاری ہوگئی تھی۔

کیا مون حسیب نے اسی ٹیلی پیتھی کے ذریعے عیسیٰ اور مالا کی زندگی میں دراڑ ڈالی مگر اس کا انجام کیا ہوا یہ جاننے کے لیے پڑھیے آخری قسط انشاء اللہ اگلے ماہ!